

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرون ملک مقیم ہیں
مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔

منجانب۔

سبیل سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدرآباد پاکستان

اشرنگارش
اہلِ تسلیم کی ایک جماعت

زیرِ نظر
استاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ

جلد ۹

ترجمہ
حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی مؤید اللہ علیہ

زیرِ نظر

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضا ستانی مدظلہ

مصباح القرآن ٹرسٹ



پیشکش: حوزہ علمیہ جامعہ المنتظر لاہور

مجلد حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب _____ تفسیر نمونہ

جلد _____ ۹

زیر نظر _____ آیت اللہ العظمی ناصر مکارم شیرازی

مترجم _____ حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی

ناشر _____ مصباح القرآن ٹرسٹ۔ ۱۰، رنگھارام بلڈنگ

شاہراہ قائد اعظم، لاہور

مطبع _____ اظہار سنٹر پرنٹرز، لاہور

تاریخ اشاعت _____ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ

ہدیہ _____

ملنے کا پتہ:

قرآن سنٹر

۲۴ الفضل مارکیٹ اردو بازار، لاہور

فون: ۳۱۲۲۲۳۳ - ۳۱۲۳۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَرَضِ نَاشِرٍ

قارئین محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ -

الحمد للہ! مصباح القرآن ٹرسٹ۔ کلام حکیم اور عبد حاضر کی بعض عظیم تفسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت سے اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی یہ شہرت حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ حضرات کی تائید و اعانت کا ثمرہ ہے۔

اس ٹرسٹ نے اپنے آغاز کار میں موجودہ دور کی شہو آفاق تفسیر۔ تفسیر نمونہ۔ کو فارسی سے اردو زبان میں ترجمہ کروانے کے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور پھر محسن ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ کی غیر معمولی مساعی، مالی معاذین کی فراخ دلانہ اعانت اور کارکنان کی شبانہ روز محنت کی بدولت پانچ ہی سال کے قلیل عرصے میں کم و بیش دس ہزار صفحات پر محیط یہ تفسیر صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ تالیفیں جلدوں میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر لی۔ شکرًا للہ۔

اس ادارے نے نہ صرف تفسیر نمونہ کے عظیم منصوبے کو حیرت انگیز سرعت کے ساتھ پایا تکمیل تک پہنچایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بیسیوں علمی کتب کے علاوہ سید العلماء السید علی نقی نقوی اعلیٰ اللہ مقامہ کی سات جلدوں پر مشتمل تفسیر فصل الخطاب شائع کی۔ اردو زبان کو پہلی مرتبہ تفسیر قرآن کے جدید اسلوب سے روشناس کراتے ہوئے تفسیر موضوعی کے دو طویل سلسلوں یعنی ”پیام قرآن“ از آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی اور ”قرآن کا دائمی منشور“ از آیت اللہ جعفر سبحانی کی اشاعت کو بھی تیزی سے آگے بڑھا رہا ہے۔

تفسیری حواشی پر مشتمل ایک جلدی قرآن پاک عبد حاضر کے مقبول اردو تراجم کے ساتھ زیر طباعت ہیں۔ اس سلسلے میں روشن فکر اور جدید عالم دین حضرت علامہ ذیشان حیدر جوادی مدظلہ کا ترجمہ ”انوار القرآن“ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

تفسیر نمونہ چونکہ بلا امتیاز پوری امت مسلمہ کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بیدار و تیار کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، لہذا سبھی مسلمانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہونے کے باوجود اس کی

با روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

یہی ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کا یہ ادارہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہا ہے۔ بعض باذوق اہل علم پر ہم تفسیر نمونہ کی طباعت کے ضمن میں ایک مفید تبدیلی کر رہے ہیں، چنانچہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اسے موجودہ جلدوں کی بجائے پندرہ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا جائے تاکہ قارئین محترم کے لیے مزید آسانیاں پاسکیں۔

تفسیر نمونہ کی اس ترتیب نو کا ایک عام طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جلد میں دو دو پاروں کی تفسیر ہو اور یوں اس کی پندرہ جلدیں ہو جائیں لیکن اس میں یہ سقم رہ جاتا ہے کہ بہت سی قرآنی سورتوں کا کچھ حصہ ایک جلد میں اور بقایا حصہ اگلی جلد میں چلا جاتا ہے جس سے مطالعے کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، لہذا ہم نے اپنے قارئین کو اس زحمت نئے کی خاطر اس تفسیر کو سورتوں کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے۔ اس طرح کوئی قرآنی سورت دو حصوں میں تقسیم نہ پائی اور ہر جلد کسی نہ کسی سورت کی کامل تفسیر پر ختم ہو گئی۔ اس طرح پوری تفسیر نمونہ پندرہ جلدوں میں

اس جدید اشاعت کے سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد ۹ اس وقت آپ کے پیش نگاہ ہے جس میں سابقہ جلد ۱۶ ایجا کر دی گئی ہیں، چنانچہ یہ جلد سورتہ قصص، سورتہ عنکبوت، سورتہ روم، سورتہ آلہ سجده اور سورتہ احزاب کی تفسیر پر مشتمل ہے۔

ہم نے زیر نظر کتاب کو بہتر انداز میں پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، تاہم اس بارے میں آپ کی رائے کے لیے بہترین رہنما ہوا کرتی ہیں کہ جن کی روشنی میں ہم اپنی مطبوعات کو مزید بہتر بنا کر پیش کرنے کے تہ ہیں۔ امید ہے کہ آپ ہماری اس پیشکش کا بغور مطالعہ فرمانے کے بعد اس کا معیار مزید بلند کرنے میں اپنی قیمتی آراء سے لائیں گے۔ ہم مفید تنقید اور آراء کے لیے منتظر رہتے ہیں۔

خبریں ہم لاہور کے ایک مخلص و فخریہ مومن الحاج شیخ ظہور علی منگلا سے اظہار تشکر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ تعاون سے تفسیر نمونہ کی یہ جدید اشاعت تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے، ہم دعا گو ہیں کہ خدا تعالیٰ موئین ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔ والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اہداء

”مرکز مطالعات اسلامی و نجات نسل جوان“

جو تمام طبقات میں عموماً اور

نوجوانوں میں خصوصاً

اسلام کی حیات بخش تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا ہے۔

اس نفیس تالیف کو

ان اہل مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو قرآن مجید کے متعلق

بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات

حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

حذوہ علیہ وسلم



یہ تفسیر

حسب ذیل علما و مجتہدین کی باہمی کاوش قلم کا نتیجہ ہے

- حجة الاسلام دالین آقائے محمد رضا آشتیانی
- حجة الاسلام دالین آقائے محمد جعفر امامی
- حجة الاسلام دالین آقائے داؤد الماسی
- حجة الاسلام دالین آقائے اسد اللہ ایبانی
- حجة الاسلام دالین آقائے عبد الرسول حسینی
- حجة الاسلام دالین آقائے سید حسن شجاعی
- حجة الاسلام دالین آقائے سید نور اللہ طباطبائی
- حجة الاسلام دالین آقائے محمود عبد اللہی
- حجة الاسلام دالین آقائے محسن قرآنی
- حجة الاسلام دالین آقائے محمد محمدی

پندرہ تفسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے

- | | | |
|--|----|-------------------------|
| مشہور مفسر علامہ طبرسی | از | ۱- تفسیر مجمع البیان |
| دانشمند فقید بزرگ شیخ طوسی | از | ۲- تفسیر تبیان |
| علامہ طباطبائی | از | ۳- تفسیر المیزان |
| علامہ محسن فیض کاشانی | از | ۴- تفسیر صافی |
| مرحوم عبد علی بن جمعة الحویزی | از | ۵- تفسیر نور الثقلین |
| مرحوم سید ہاشم بحرینی | از | ۶- تفسیر زبیر |
| علامہ شہاب الدین محمود آلوسی | از | ۷- تفسیر روح المعانی |
| محمد رشید رضا تقریرات درس تفسیر شیخ محمد عبد | از | ۸- تفسیر المنار |
| سید قطب مصری | از | ۹- تفسیر فی ظلال القرآن |
| محمد بن احمد انصاری قرطبی | از | ۱۰- تفسیر قرطبی |
| واحدی (ابو الحسن علی بن مقویہ نیشاپوری) | از | ۱۱- اسباب النزول |
| احمد مصطفیٰ مراغی | از | ۱۲- تفسیر مراغی |
| فخر رازی | از | ۱۳- تفسیر مفاتیح الغیب |
| ابو الفتح رازی | از | ۱۴- تفسیر روح البیان |



گزارش

تفسیر نمونہ (فارسی) ستائیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے اردو ترجمے کے متعدد وائڈیشن بھی ستائیس جلدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ محسن ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی اعلیٰ اللہ مقامہ کا اختتامی نوٹ اسی ترتیب کے مطابق جلد کے آخر میں تحریر کیا گیا تھا۔ نئی ترتیب میں بھی اسے تبدیل نہیں کیا گیا۔ خداوند کریم مولانا مرحوم کو جوار مصطفیٰ میں بلند درجات عطا فرمائے۔

(ادارہ)

اس تفسیر میں مد نظر اہداف

پوری دنیا، جس کی نظریں اسلام کی طرف لگی ہیں، چاہتی ہے کہ اسلام کون سے سرے سے پہچانے۔ یہاں تک کہ خود مسلمان یہی چاہتے ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ جن میں سے ایک "ایران کا اسلامی انقلاب" اور "دنیا کے مختلف خطوں میں اسلامی تحریکیں" ہیں۔ جنہوں نے تمام لوگوں کے افکار خصوصاً نوجوان نسل کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ معرفت کا پیا سا بنا دیا ہے۔

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسلام کی شناخت کے لیے نزدیک ترین راستہ اور مطمئن ترین وسیلہ ذریعہ عظیم اسلامی کتاب قرآن مجید میں غور و فکر اور اس کا مطالعہ ہے۔

دوسری جانب قرآن مجید جو ایک عظیم اور جامع ترین کتاب ہے، عام کتب کی مانند کسی ایک مسئلہ کی گہرائی پر مشتمل نہیں بلکہ اصطلاح کے مطابق اس میں کئی بطنوں ہیں اور ہر بطن میں دوسرا بطن مضمر ہے۔

بالفاظ دیگر ہر شخص اپنی فکری گہرائی، فہم و آگہی اور لیاقت کے مطابق قرآن سے استفادہ کرتا ہے اور یہ مسلم ہے کہ کوئی شخص بھی قرآن کے چشمہ علم سے محروم نہیں ہوتا۔

متذکرہ بالا گفتگو کی روشنی میں ایسی تفاسیر کی ضرورت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے جو انکار علماء میں موجود رشتوں کو ایک دوسرے سے منسلک کریں اور محققین اسلام کی محنتوں اور حاصل فکر سے استفادہ کر کے لکھی جائیں اور جو مختلف قرآنی اسرار کی گہرائی کھول سکیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی تفسیر اور کونسا مفسر...؟ وہ تفسیر، کہ جو کچھ قرآن کہتا ہے اسے واضح کرے، نہ کہ جو کچھ مفسر چاہے اور پسند کرے اسے پیش کرے۔ اور وہ مفسر جو اپنے آپ کو قرآن کے سپرد کرے اور اسی سے درس لے، نہ وہ کہ جو نہ جانتے ہوتے یا جان بوجھ کر اپنے پہلے سے کیے گئے فیصلوں اور نظریات کے مطابق جھجھکرے اور جو قرآن کا طالب علم بننے کی بجائے اس کا استاد بن جائے۔

البتہ عظیم مفسرین اور عالی قدر محققین اسلام نے آغاز اسلام سے آج تک اس سلسلہ میں قابل قدر کوششیں کی ہیں اور زحمات اٹھائی ہیں، انہوں نے عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں بہت سی تفسیریں تحریر کی ہیں کہ جن کے پڑھنے میں اس عظیم اسلامی کتاب کے بعض حیران کن مطالب تک رسائی ہو سکتی ہے (مشکر اللہ سبھم)

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی لوگوں کو

اس میں ہم آہنگی نہیں ہوگی۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ ابتدا میں معاملہ اسی طرح تھا۔ لیکن پھر اس صورت حال کو نظر رکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ تفسیر میں قلم ہر جگہ میرا ہی ہو اور دوسرے دوست صرف مطالب کی جمع آوری میں مدد کریں۔ ان حضرات میں سے بھی ہر ایک اپنے کام کو پہلے انفرادی طور پر سرانجام دیتے ہیں اور ضروری یادداشتیں جمع کرتے ہیں۔ بعد میں اجتماعی نشستوں میں ضروری ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تاکہ مختلف مباحث، گونا گوں مسائل اور تفسیر کی روانی میں سبے ربطی پیدا نہ ہو اور ساری تفسیر ایک ہی طرز و روش پر ہو۔

انشاء اللہ امید ہے اس تفسیر سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے اس کا نہ صرف عربی بلکہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جائے گا تاکہ اور لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔
(یہ تجویز قارئین محترم کی جانب سے بھی آئی ہے)۔

خداوند!

ہماری آنکھوں کو بینا۔ کانوں کو شنوا اور ہماری فکر کو صائب، کار ساز اور ارتقائی فرما تاکہ تیری کتاب کی تعلیمات کی گہرائیوں سمجھ سکیں اور اپنے اور دوسروں کے لیے روشن چراغ فراہم کر سکیں۔
خداوند!

جو آگ ہمارے انقلاب کے دشمنوں نے خصوصاً اور دشمنان اسلام نے عموماً ہمارے خلاف لگائی رکھی ہے اور جس کی وجہ سے ہماری توجہ مسلسل ان کی طرف بٹی ہے، اس امت اسلامی کے مسلسل جہاد اور انتھک سعی و کوششوں کے نتیجے میں اسے خاموش کر دے تاکہ ایک ہی جگہ تجھ سے دل لگائیں اور تیرے راستے اور تیرے مستضعف بندگان کی خدمت کے لیے قدم اٹھائیں۔

بارالہ!

ہمیں توفیق اور زندگی عطا فرما کہ اس تفسیر کو مکمل کر سکیں۔ اس ناچیز و حقیر خدمت کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکیں اور بجا و مجموعہ تیری بارگاہ میں پیش کر سکیں۔

اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (تو ہر چیز پر قادر ہے)۔

ناصر مکارم شیرازی

حوزہ علمیہ قم۔ ایران

نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختلف مکاتب فکر کے تضادات اور ٹکراؤ کے باعث اور بعض اوقات منافقین و منافقین کے دوسوں کی وجہ سے، اور کبھی اس عظیم آسمانی کتاب کی تعلیمات کو ضروریاتِ زمانہ پر منطبق کرنے کے حوالے سے کچھ ایسے سوالات سامنے آتے ہیں جن کا جواب موجودہ دور کی تفاسیر کو دینا ہوگا۔

دوسری جانب تمام تفاسیر کو عوام الناس کے لیے ناستابل اور آگے گونا گوں اقوال اور پیچیدہ مباحث کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اس وقت ایسی تفاسیر کی ضرورت ہے جن سے خود قرآن کی طرح تمام طبقے استفادہ کر سکیں (اس کی وسعت اور اہمیت میں کمی کیے بغیر)۔

ان امور کے پیش نظر مختلف گروہوں نے ہم سے ایک ایسی تفسیر لکھنے کی خواہش کی جو ان ضروریات کو پورا کر سکے۔ چونکہ یہ کام خاصا مشکل تھا لہذا میں نے ان تمام فضلاء کو مدد و تعاون کی دعوت دنا جو اس طویل اور نشیب و فراز کے حامل سفر میں اچھے ہمدرد اور ساتھی تھے اور میں تاکہ مشترکہ مساعی سے یہ مشکل حل ہو سکے۔ الحمد للہ! اس کام کے لیے توفیق شایہ حال ہوئی اور ایسا ثمرہ نتیجہ ملا کہ جس کا ہر طبقہ نے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ اکثر علاقوں کے لوگ مختلف سطحوں پر اس تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی پہلی جلدیں جو اس وقت تک منظر عام پر آچکی ہیں (اور یہ اس کی سوہوں جلد ہے) بار بار پھیس اور تقسیم ہوئیں۔ اس توفیق الہی کا میں از حد شکر گزار ہوں۔

یہاں یہ بات میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جلد کے مقدمہ میں اپنے قارئین کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراؤں۔

۱- بار بار یہ سوال ہوتا ہے کہ مجموعاً یہ تفسیر کتنی جلدوں پر مشتمل ہوگی؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ظاہراً بیس جلدوں سے کم اور چوبیس جلدوں سے زیادہ نہ ہوگی۔

۲- اکثر یہ شکوہ بھی کیا جاتا ہے کہ تفسیر کی جلدیں تاخیر سے کیوں شائع ہوتی ہیں؟ عرض خدمت ہے کہ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کام جلد از جلد ہو، یہاں تک کہ سفر و حضر میں، بعض اوقات بلا وطنی کے مقام پر، حتیٰ کہ بہتر بیماری پر بھی میں نے یہ کام جاری رکھا ہے۔

چونکہ مباحث کے نظم و نسق اور متن و گہرائی کو جلد بازی پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا اس طرح سے کام کرنا چاہیے کہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ سمٹتا جائے۔ دوسری جانب طباعت و اشاعت کی مشکلات (خصوصاً جنگ کے زمانے میں) کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ جو تاخیر کے اہم عوامل میں سے ایک ہے۔

۳- بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ تفسیر مختلف افراد کے قلم سے تحریر ہو رہی ہے تو

بعد ازاں تعداد ۲۷ تک جا پہنچی۔ (مترجم)

بقیہ شاہ ایران معدوم کے دور میں تولد کو جلا وطنی کا سامنا کرنا پڑا۔ (مترجم)

فہرست جلد ۹

سورہ قصص

۲۴	مندرجات سورہ قصص
۲۵	فضیلت تلاوت سورہ قصص
۲۷	آیت ۶ تا ۶
۲۸	ارادہ الہی ہے کہ مستضعفین کامیاب ہوں
۲۹	چند اہم نکات
۳۰	۱۔ مستضعفین کی عالمگیر حکومت
۳۱	۲۔ "مستضعفین" اور "مشکبرین" کون ہیں؟
۳۲	۳۔ مشکبرین کی عام روش
۳۳	آیت ۷ تا ۹
۳۴	فرعون کی آنکوش
۳۵	اللہ کی عجیب قدرت
۳۶	آیت ۱۰ تا ۱۳
۳۷	موسیٰ پھر آنکوش مادر میں
۳۸	آیت ۱۴ تا ۱۷
۳۹	موسیٰ مظلوموں کے مددگار کے طور پر
۴۰	چند اہم نکات
۴۱	۱۔ حضرت موسیٰ کا یہ کام اور
۴۲	مقام عصمت
۴۳	۲۔ مجرموں کی مدد کرنا بہت بڑا گناہ ہے
۴۴	آیت ۱۸ تا ۲۲
۴۵	موسیٰ کی منجیاندین روانگی
۴۶	آیت ۲۳ تا ۲۵
۴۷	ایک نیک عمل نے موسیٰ پر بھلائیوں کے دروازے کھول دیے۔
۴۸	چند اہم نکات
۴۹	۱۔ مدین کہاں تھا؟
۵۰	۲۔ بہت سی سبق آموز باتیں
۵۱	آیت ۲۶ تا ۲۸
۵۲	حضرت موسیٰ حضرت شعیبؑ کے گھر میں
۵۳	چند اہم نکات
۵۴	۱۔ ادارت کار کی درستگی کے لیے دو بنیادی شرائط۔
۵۵	۲۔ حضرت شعیبؑ کا حضرت موسیٰ کے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح
۵۶	۳۔ ایک مرد جو رسم کی نفی کرتے تھے
۵۷	آیت ۲۹ تا ۳۵
۵۸	وحی کی تابلیش اول
۵۹	آیت ۳۶ تا ۴۱
۶۰	موسیٰ فرعون کے مقابلے میں

۸۶	آیت ۳۸ تا ۴۲
۸۷	ظالموں کا انجام
۸۸	چند اہم نکات
۸۹	آیت ۴۳ تا ۴۶
۹۰	یہ غیبی خبریں اللہ نے دی ہیں
۹۱	آیت ۴۷ تا ۵۰
۹۲	گریز از حق کے لیے نوبہ نوبہ ہانے خواہشات پرستی گراہی کا سبب ہے
۹۳	آیت ۵۱ تا ۵۵
۹۴	شان نزول
۹۵	حق طلب اہل کتاب
۹۶	قلوب با ایمان
۹۷	آیت ۵۶، ۵۷
۹۸	ہدایت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے
۹۹	حضرت ابوطالب کا ایمان اور معاندین کا مشور۔
۱۰۰	آیت ۵۸ تا ۶۰
۱۰۱	دنیا کی دلچسپیاں تمہیں فریب نہ دیں
۱۰۲	آیت ۶۱ تا ۶۴
۱۰۳	وہ لوگ صرف اپنی ہوائے نفس کی پریشانی کرتے تھے
۱۰۴	آیت ۶۵ تا ۷۰
۱۰۵	آیت ۷۱ تا ۷۵
۱۰۶	رات اور دن کا وجود عظیم نعمت ہے
۱۰۷	آیت ۷۶ تا ۷۸
۱۰۸	بنی اسرائیل کے خود پرست سرمایہ دار
۱۰۹	آیت ۷۹ تا ۸۲
۱۱۰	نمائش ثروت کا جنوں
۱۱۱	چند اہم نکات
۱۱۲	۱۔ ماضی اور حال کے قارون
۱۱۳	۲۔ قارون یہ دولت کہاں سے لایا تھا؟
۱۱۴	۳۔ دولت کے بارے میں اسلام کا موقف
۱۱۵	آیت ۸۳، ۸۴
۱۱۶	"فساد فی الارض" اور ہوس اقتدار کا نتیجہ
۱۱۷	آیت ۸۵ تا ۸۸
۱۱۸	شان نزول
۱۱۹	حرم امن خدا کی طرف بازگشت کا وعدہ
۱۲۰	"کل شیء ہا لک الا وجهہ"
۱۲۱	چند نکات
۱۲۲	۱۔ تمام اشیاء کس طرح فنا ہوں گی؟
۱۲۳	۲۔ "دلائع مع اللہ الہا الخسر"
۱۲۴	سورہ عنکبوت
۱۲۵	سورہ عنکبوت کے مضامین
۱۲۶	اس سورہ کی فضیلت
۱۲۷	آیت ۱ تا ۳
۱۲۸	شان نزول
۱۲۹	آزمائش ایک دائمی سنت الہی ہے

۱۴۷	آزمائش مختلف رنگ میں
۱۸۰	آیت ۴ تا ۷
۱۸۱	قدرتِ خدا کی حدود سے فرار ممکن نہیں
۱۸۳	آیت ۹، ۸
۱۸۳	شانِ نزول
۱۸۵	مالِ باپ کی نسبت بہترین نصیحت
۱۸۷	مالِ باپ سے حسنِ سلوک
۱۸۹	آیت ۱۰ تا ۱۳
	وہ لوگ جو کامیابیوں میں شریک ہیں مگر
۱۹۰	مشکلات میں نہیں
۱۹۳	چند اہم نکات
۱۹۳	۱۔ اچھی اور بُری رسمیں
۱۹۳	۲۔ ایک سوال کا جواب
۱۹۵	آیت ۱۴ تا ۱۹
۱۹۶	سرگذشتِ نوح اور ابراہیم کا ذکر
۲۰۲	آیت ۲۰ تا ۲۳
۲۰۳	خدا کی رحمت سے مایوس لوگ
۲۰۵	دوسوال اور ان کا جواب
۲۰۷	آیت ۲۴ تا ۲۷
۲۰۸	حضرت ابراہیم کو مستکبرین کا طرزِ جواب
۲۱۲	چند اہم نکات
۲۱۲	۱۔ عظیم ترین افتخار
۲۱۳	۲۔ حضرت ابراہیم پر خدا کی عظیم برکات
۲۱۵	آیت ۲۸ تا ۳۰

۲۱۵	بے شرم گناہ گار
۲۱۷	ہم جنسی کارِ حجام بدترین لعنت ہے
۲۱۹	آیت ۳۱ تا ۳۵
۲۲۰	گناہ گاروں کا انجام
۲۲۵	آیت ۳۶ تا ۴۰
۲۲۶	ظالموں کے ہر گروہ کی سزا مختلف تھی
۲۳۱	آیت ۴۱ تا ۴۴
۲۳۲	مکڑی کے جالے کی مانند کمزور امید گاہیں
۲۳۶	آیت ۴۵
۲۳۶	نماز اعمالِ قیام سے روکتی ہے
۲۳۸	چند توہم طلب احادیث
۲۴۵	فرد اور جماعت کی ترتیب میں نماز کا اثر
۲۴۶	آیت ۴۶ تا ۴۹
۲۴۷	بحث کے لیے بہترین روش اختیار کرو
۲۵۳	چند اہم نکات
	۱۔ ہمارے محبوب پیغمبرؐ جو کبھی مکتب میں
	نہیں گئے۔ [۲۵۳]
۲۵۴	۲۔ دوسروں کے دلوں میں نفوذ کا طریقہ
۲۵۷	۳۔ کفار اور ظالمین
۲۵۸	آیت ۵۰ تا ۵۵
۲۶۰	کیا قرآن بطورِ معجزہ کافی نہیں ہے؟
۲۶۶	چند اہم نکات
۲۶۶	۱۔ دلائلِ اعجازِ قرآن
۲۶۶	۲۔ انکارِ معجزات کا ثبوت
۲۶۶	آیت ۵۶ تا ۶۰
۲۶۹	شانِ نزول
۲۶۹	ہجرت کرنی چاہیے
۲۷۵	آیت ۶۱ تا ۶۶
۲۷۷	دل میں خدا زبان پر بُریت
۲۸۲	سخنیوں میں فطرتِ انسانی کے جوہر کھلتے ہیں
۲۸۴	آیت ۶۷ تا ۶۹
۲۸۵	شانِ نزول
۲۸۸	چند اہم نکات
۲۸۸	۱۔ جہاد و اخلاص
۲۸۹	۲۔ لوگ تین قسم کے ہوتے ہیں
	سُورَةُ رُومٍ
۲۹۱	سُورہ روم کے مندرجات
۲۹۲	فضیلتِ سُورہ روم
۲۹۳	آیت ۱ تا ۷
۲۹۴	شانِ نزول
۲۹۵	ایک عجیب پیش گوئی
۲۹۶	چند اہم نکات
۳۰۰	۱۔ اعجازِ قرآن
۳۰۰	۲۔ ظاہر بین لوگ
۳۰۱	۳۔ تاریخی مطابقت
۳۰۲	آیت ۸ تا ۱۰
۳۰۳	آیت ۱۱ تا ۱۶
۳۰۳	قیامت میں مجرمین پر کیا گزرسے گی
۳۰۳	قیامت کا ایک نام "ساعت" کیوں ہے؟
۳۰۵	آیت ۱۷ تا ۱۹
۳۰۵	تسبیح و تہجد ہر حال میں خدا کیلئے ہے
۳۲۰	آیت ۲۰ تا ۲۲
۳۲۱	انفس و افاق میں خدا کی آیات
۳۲۷	آیت ۲۳ تا ۲۵
	انسان کے نفس اور خارجی دنیا میں خدا
۳۲۸	کی عظمت کی نشانیاں
۳۳۱	چند اہم نکات
	۱۔ درسِ خدا شناسی کا ایک مکمل نصاب
	۲۔ کون لوگ ان آیات سے کسبِ
۳۳۲	حکمت کرتے ہیں۔
۳۳۳	۳۔ عالمِ خواب کے عجائبات
۳۳۴	۴۔ میاں بیوی کی باہمی محبت
۳۳۵	آیت ۲۶ تا ۲۹
۳۳۶	خدا سے واحد ہی مالکِ حقیقی ہے
۳۴۲	آیت ۳۰ تا ۳۲
۳۴۷	چند اہم نکات
	۱۔ توحیدِ انسان کی داخلی قوی قوت
۳۴۷	جاذبہ ہے
	۲۔ احادیثِ اسلامی میں فطرتِ خدا شناسی کا ذکر

۲۱۳	چند قابل توجہ نکات	۳۵۳	بت ۳۳ تا ۳۶
۲۱۴	۱۔ غنا کی حرمت	۳۶۰	بت ۳۷ تا ۴۰
۲۱۶	۲۔ غنا کیا ہے؟	۳۶۹	بت ۴۱ تا ۴۵
۲۱۷	۳۔ حرمت غنا کا فلسفہ	۳۷۰	دل کے اعمال ہی سرچشمہ فساد ہیں
۲۱۷	(الف) اخلاقی تباہ کاریوں کی رغبت	۳۷۴	نہاہم نکات
۲۱۸	(ب) یاد خدا سے غفلت	۳۷۴	۱۔ گناہ و فساد کا باہمی ربط
۲۱۸	(ج) اعصاب پر اس کے مضر اثرات	۳۷۶	۲۔ زمین پر سیاحت میں پوشیدہ حکمتیں
۲۱۹	۴۔ غنا، استعمار کا ایک حربہ ہے	۳۷۷	۳۔ دینِ قیم اور آئینِ محکم
۲۲۰	آیت ۱۰ تا ۱۱	۳۷۸	۴۔ روزِ قیامت ٹل نہیں سکتا
۲۲۰	دوسروں نے کیا پیدا کیا؟	۳۷۹	بت ۳۶ تا ۵۰
۲۲۳	آیت ۱۲ تا ۱۵	۳۸۱	راکے آثارِ رحمت کو دیکھو
۲۲۵	مالِ باپ کا احترام	۳۸۲	بت ۵۱ تا ۵۲
۲۳۰	چند اہم نکات	۳۸۸	رے اور ہرے تیری بات نہیں سنتے
۲۳۰	۱۔ لقمان کون تھے؟	۳۹۲	بت ۵۵ تا ۶۰
۲۳۲	۲۔ لقمان کی حکمت کا ایک نمونہ	۳۹۵	دن کہ جب عذر خواہی بے سود ہوگی
۲۳۵	آیت ۱۶ تا ۱۹		
	پہاڑ کی طرح ڈٹ جاؤ اور لوگوں کے ساتھ	۴۰۳	
	حسُن سلوک کرو۔	۴۰۳	
	چند اہم نکات	۴۰۵	
۴۴۰	۱۔ چلنے پھرنے کے آداب	۴۰۶	بت آتا ۵
۴۴۱	۲۔ گفتگو کے آداب	۴۰۶	بوکار کون لوگ ہیں
۴۴۱	۳۔ معاشرتی آداب	۴۰۹	بت ۶ تا ۹
۴۴۲	آیت ۲۰ تا ۲۲	۴۰۹	ماںِ نزول
۴۴۲	قابلِ اطمینان سہارا	۴۱۰	اشیا طین کے بڑے جاوں میں سے ایک جال

سورہ لقمان

ورہ لقمان کے مضامین

ورہ لقمان کی فضیلت

بت آتا ۵

بوکار کون لوگ ہیں

بت ۶ تا ۹

ماںِ نزول

اشیا طین کے بڑے جاوں میں سے ایک جال

۵۰۲	چند اہم نکات	۳۵۰	آیت ۲۵ تا ۳۰
۵۰۳	۱۔ رُوح کا استقلال اور اسکی اصلیت	۳۵۲	پروردگار کی دس صفات
۵۰۳	۲۔ موت کا فرشتہ	۳۵۹	آیت ۳۱، ۳۲
۵۰۷	آیت ۱۵ تا ۲۰	۳۶۰	گردابِ بلا میں
۵۰۹	عظیم جہنمیں جنہیں کوئی نہیں جانتا	۳۶۳	آیت ۳۳، ۳۴
۵۱۶	ایک نکتہ	۳۶۵	خدا کے علم کی وسعت
۵۱۶	عابد شب زندہ دار	۳۶۸	چند اہم نکات
۵۱۹	آیت ۲۱، ۲۲	۳۶۸	۱۔ غرور و فریب کی قسمیں
۵۱۹	تربیتی اور اصلاحی سزائیں	۳۶۸	۲۔ دُنیا کی فریب کاری
۵۲۳	آیت ۲۳ تا ۲۵	۳۷۰	۳۔ یر پانچ علومِ خدا کے ساتھ مخصوص ہیں
۵۲۳	انامت کا اہم ترین سرمایہ		
۵۲۸	ایک نکتہ	۳۷۳	
۵۲۸	خدائی رہبروں کا صبر و استقامت	۳۷۳	اس سورہ کے نام
۵۳۱	آیت ۲۶ تا ۳۰	۳۷۳	تلاوت کی فضیلت
۵۳۲	ہجرتِ کامیابی کا دن	۳۷۵	سورہ سجدہ کے مندرجات
		۳۷۷	آیت آتا ۵
۵۳۷		۳۷۸	عظمتِ قرآن اور مبداء و معاد
۵۳۸	سورہ احزاب کی وجہ تسمیہ اور فضیلت	۳۸۶	چند ایک نکات
۵۳۹	سورہ احزاب کے مندرجات	۳۹۰	آیت ۶ تا ۹
۵۴۱	آیت آتا ۳	۳۹۱	خلقت انسان کے حیران کن مراحل
۵۴۱	شانِ نزول	۳۹۲	خلاصہ
۵۴۲	صرف وحی الہی کی پیروی کریں	۳۹۶	ایک نکتہ
۵۴۵	آیت ۴ تا ۶	۳۹۸	آیت ۱۰ تا ۱۳
۵۴۷	فضول و عوے	۳۹۹	ندامت اور بازگشت کا تقاضا

سورہ آلم سجدہ

اس سورہ کے نام

تلاوت کی فضیلت

سورہ سجدہ کے مندرجات

آیت آتا ۵

عظمتِ قرآن اور مبداء و معاد

چند ایک نکات

آیت ۶ تا ۹

خلقت انسان کے حیران کن مراحل

خلاصہ

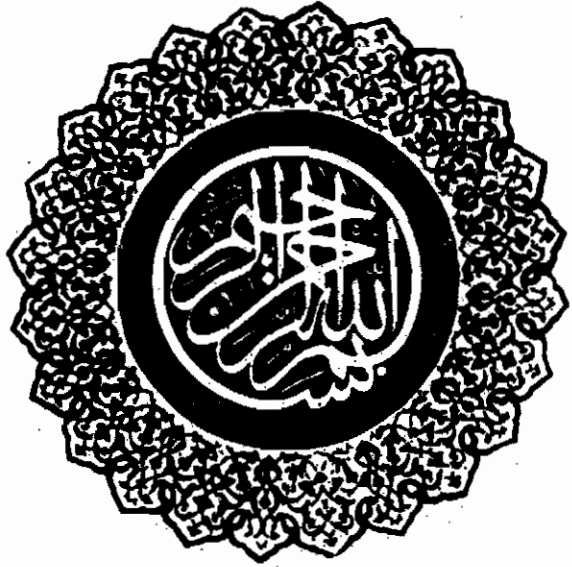
ایک نکتہ

آیت ۱۰ تا ۱۳

ندامت اور بازگشت کا تقاضا

۶۰۲	رسول اللہ "اسوہ" اور "قدوہ" ہیں	۵۵۸	ایک نکتہ
۶۰۳	خدا کو بہت یاد کرو	۵۶۰	آیت ۸۰۷
۶۰۶	آیت ۲۷، ۲۸	۵۶۰	خدا کا محکم عہد و پیمانہ
۶۰۷	ایک اور عظیم کامیابی	۵۶۵	آیت ۹ تا ۱۱
۶۰۹	چند اہم نکات	۵۶۶	میدانِ احزاب میں کڑی آزمائش
۶۰۹	۱- جنگِ بنی قریظہ کے علل و اسباب	۵۶۸	چند قابلِ غور مطلب
۶۱۰	۲- جنگِ بنی قریظہ کے واقعات	۵۷۱	آیت ۱۲ تا ۱۷
۶۱۱	۳- جنگِ بنی قریظہ کے نتائج		منافقین اور ضعیف الایمان میدانِ
۶۱۱	۴- آیات کی معنی خیز تفسیریں	۵۷۲	احزاب میں -
۶۱۲	آیت ۲۸ تا ۳۱	۵۷۹	آیت ۱۸ تا ۲۰
۶۱۲	شانِ نزول	۵۸۱	روکنے کا ٹولہ
۶۱۵	سعادتِ ابدی یا دنیاوی ٹھاٹھ باٹھ	۵۸۵	آیت ۲۱ تا ۲۵
۶۱۸	گناہ اور ثواب دو گنا کیوں؟	۵۸۷	جنگِ احزاب میں سچے مومنین کا کردار
۶۲۱	آیت ۳۲ تا ۳۳	۵۹۲	جنگِ احزاب کے چند اہم پہلو
۶۲۲	ازواجِ نبویؐ کو کیسا ہونا چاہیے	۵۹۲	۱- جنگ کی اہمیت
۶۲۷	چند اہم نکات	۵۹۲	۲- لشکروں کی تعداد
۶۲۷	۱- آیتِ تطہیرِ عصمت کی واضح دلیل	۵۹۲	۳- خندق کی کھدائی
۶۲۸	۲- آیتِ تطہیر کن افراد کے بارے میں ہے	۵۹۵	۴- بہت بڑی آزمائش کا میدان
۶۳۲	۳- خدا کا ارادہ تشریحی ہے یا کونوی؟	۵۹۵	۵- حضرت علیؑ کی تاریخی جنگ
۶۳۳	۴- بیسویں صدی کی جاہلیت	۵۹۸	۶- پیغمبرِ اسلامؐ کے فوجی اور سیاسی اقدام
۶۳۵	آیت ۳۵		۷- نعیم بن مسعود کی داستان اور دشمن
۶۳۶	شانِ نزول	۵۹۹	کے لشکر میں پھوٹ
۶۳۶	اسلام میں عورت کا مقام	۶۰۱	۸- حذیفہ کا واقعہ
۶۳۰	خدا کی بارگاہ میں مرد اور عورت برابر ہیں	۶۰۲	۹- جنگِ احزاب کے نتائج

۶۳۲	آیت ۳۶ تا ۳۸	۶۳۲	آیت ۳۹
۶۳۳	شانِ نزول	۶۵۲	سچے مبلغ کون ہیں؟
۶۳۳	ایک بہت بڑی رسم لڑتی ہے	۶۵۲	چند اہم نکات
۶۳۹	چند اہم نکات	۶۵۲	۱- "تبلیغ" سے مراد
۶۳۹	۱- جھوٹے فسانے	۶۵۲	۲- "خشیت" کا معنی
۶۵۱	۲- سچی کے سامنے جھک جانا ہی عین	۶۵۲	۳- ایک سوال کا جواب
۶۵۱	اسلام ہے	۶۵۵	۴- کیا انبیاء بھی تقیہ کرتے ہیں
۶۵۲	آیت ۳۹	۶۵۶	۵- تبلیغی امور میں کامیابی کی شرط
۶۵۲	سچے مبلغ کون ہیں؟	۶۵۸	آیت ۴۰
۶۵۲	چند اہم نکات	۶۵۸	ختمِ نبوت
۶۵۲	۱- "تبلیغ" سے مراد	۶۶۰	چند اہم نکات
۶۵۲	۲- "خشیت" کا معنی	۶۶۰	"۱- "خاتم" کیا ہے
۶۵۲	۳- ایک سوال کا جواب	۶۶۱	۲- ختمِ نبوت کے دلائل
۶۵۵	۴- کیا انبیاء بھی تقیہ کرتے ہیں	۶۶۵	۳- چند سوال اور ان کے جواب
۶۵۶	۵- تبلیغی امور میں کامیابی کی شرط	۶۶۵	۴- ختمِ نبوت ارتقاء سے کیوں کر
۶۵۸	آیت ۴۰	۶۶۵	ہم آہنگ ہے۔
۶۵۸	ختمِ نبوت	۶۶۶	۵- شابت قانون اور بدلتی ضرورتیں
۶۶۰	چند اہم نکات		
۶۶۰	"۱- "خاتم" کیا ہے		
۶۶۱	۲- ختمِ نبوت کے دلائل		
۶۶۵	۳- چند سوال اور ان کے جواب		
۶۶۵	۴- ختمِ نبوت ارتقاء سے کیوں کر		
۶۶۶	ہم آہنگ ہے۔		
۶۶۶	۵- شابت قانون اور بدلتی ضرورتیں		



۴۱۷	قانونِ مجاب سے مستثنیٰ موارد	۶۹۵	آیت ۵۱
۴۲۰	آیت ۵۶ تا ۵۸	۶۹۵	شانِ نزول
۴۲۱	آنحضرتؐ پر زور و دو سلام	۶۹۶	ایک اور مشکل آسان ہوتی ہے
۴۲۱	چند قابل توجہ نکات		کیا یہ حکم آپؐ کی سب بیویوں کے بارے میں تھا!
۴۲۸	آیت ۵۹ تا ۶۲	۶۹۸	آیت ۵۲
۴۲۹	شانِ نزول	۷۰۰	ازواجِ رسولؐ کے بارے میں ایک اور اہم حکم
۴۳۰	زبردست انتباہ	۷۰۰	چند ایک نکات
۴۳۲	چند ایک نکات	۷۰۱	۱۔ اس حکم کا فلسفہ
۴۳۲	۱۔ پہل خود سے کرنا چاہیے	۷۰۱	۲۔ مخالف روایات
۴۳۳	۲۔ دونوں طریقوں سے بچاؤ	۷۰۲	۳۔ آیا نکاح سے پہلے عورت کو دیکھا جا سکتا ہے۔
۴۳۴	۳۔ مسلمانوں کی طاقتور پوزیشن	۷۰۳	آیت ۵۳، ۵۴
۴۳۴	۴۔ فساد کو جڑ سے کاٹ دو	۷۰۴	شانِ نزول
۴۳۴	۵۔ خدا کی اہل سنتیں	۷۰۶	چند اہم نکات
۴۳۷	آیت ۶۳ تا ۶۸	۷۱۲	۱۔ مہمان نوازی
۴۳۸	قیامت کب آئے گی	۷۱۲	۲۔ میزبانی میں سادگی
۴۴۲	آیت ۶۹ تا ۷۱	۷۱۳	۳۔ مہمان کا حق
۴۴۳	حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ناروا آہمتیں	۷۱۵	۴۔ مہمان کی ذمہ داری
۴۴۵	اعمال کی درستی کے لیے حق بات کیا کرو	۷۱۷	آیت ۵۵
۴۴۸	آیت ۷۲، ۷۳	۷۱۷	شانِ نزول
۴۴۹	نوع بشر کا بہت بڑا اعزاز	۷۱۷	
۴۵۱	چند اہم نکات		

تفسیر نمونہ جلد ۹

اس میں مندرجہ ذیل سورتیں شامل ہیں۔

۱۔ سورہ قصص ۲۔ سورہ عنکبوت ۳۔ سورہ روم ۴۔ سورہ لقمان ۵۔ سورہ الم سجدہ
سورہ احزاب

سورہ قصص: مکی سورت ہے اور اس کی ۸۸ آیات ہیں۔

پارہ ۲۰۔

سورہ عنکبوت: مکی سورت ہے اور اس کی ۶۹ آیات ہیں۔

پارہ ۲۰۔ آتا ۴۴۔ پارہ ۲۱۔ آیت ۴۵ تا ۶۹

سورہ روم: مکی سورت ہے اور اس کی ۶۰ آیات ہیں۔

پارہ ۲۱۔

سورہ لقمان: مکی سورت ہے اور اس کی ۳۴ آیات ہیں۔

پارہ ۲۱۔

سورہ الم سجدہ: مکی سورت ہے اور اس کی ۳ آیات ہیں۔

پارہ ۲۱۔

سورہ احزاب: مدنی سورت ہے اور اس کی ۷۳ آیات ہیں۔

پارہ ۲۱۔ آتا ۳۰۔ پارہ ۲۲۔ آیت ۳۱ تا ۷۳

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ

مندرجت سُوْرَة قصص :

مشور یہ ہے کہ یہ سُوْرَة مکہ میں نازل ہوئی تھی۔ اس وجہ سے اس کے مندرجات اور اس کا اسلوب وہی ہے جیسا کہ دیگر کئی سُوْرَتوں کا ہے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے اس سُوْرَة کی آیت نمبر ۸۵ یا ۵۲ سے ۵۵ تک کو اس سے مشتقی کیا ہے۔ اُن کا نظریہ یہ ہے۔ آیہ ۸۵ جحفہ (جو کہ مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام ہے) میں نازل ہوئی اور باقی چار آیات مدینہ میں نازل ہوئیں۔ لیکن اُن کے قول پر کوئی حکم دلیل نہیں ہے۔ لیکن ہے کہ اہل تفسیر کے اس خیال کا سبب یہ ہے کہ ان پانچ آیات میں اہل کتاب کا ذکر ہے۔ اور اہل کتاب کثرت سے مدینہ میں رہتے تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے کہ قرآن کا جو حصہ مکہ میں نازل ہوا ہے، اُس میں صرف مشرکین مکہ ہی کا ذکر ہو۔ جب کہ مکہ اور مدینہ کے لوگوں کا ایک دوسرے کے ہاں بہت آنا جانا تھا۔ البتہ مفسرین نے آیات ۵۲ تا ۵۵ کی شان نزول کا جو ذکر کیا ہے وہ ان آیات کے مدنی ہونے سے مناسبت رکھتی ہے۔ ان شاء اللہ ہم مناسب مقام پر اُس کا ذکر کریں گے۔

آیت نمبر پچاسی میں پیغمبر خدا کے اپنے اصلی وطن یعنی مکہ کا ذکر ہے اس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ یہ آیت ہجرت کے وقت جب کہ آپؐ مکہ سے باہر تشریف لیے جا رہے تھے، اسی مقدس سرزمین پر نازل ہوئی ہو۔ کیونکہ جناب رسالتؐ کو سرزمین مکہ سے جو کہ حرم امن خدا اور مرکز توحید تھا بہت محبت تھی۔ چنانچہ اس آیت میں اللہ انھیں بشارت دیتا ہے کہ آخر کار میں تم کو اس شہر میں واپس لے آؤں گا۔

مذکورہ بالا مفہوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ آیت کئی ہو۔ اور اگر بالفرض یہ آیت جحفہ میں بھی نازل ہوئی تُو وہ مقام بھی بہ نسبت مدینہ کے مکہ سے نزدیک تر ہے۔

بنا برائیں جب ہم آیات قرآنی کو کئی اور مدنی میں تفسیر کرتے ہیں تو اس آیت نمبر پچاسی کو خیر آیات کئی میں جگہ نہیں دے سکتے۔ مستلماً یہ سُوْرَة مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ ان حالات میں جب کہ با ایمان افراد قوی دشمنوں کے پنجے میں پھنسے ہوئے تھے۔ وہ دشمن بھی ایسے تھے جو اپنی جمعیت و تعداد اور قدرت و قوت ہر دو لحاظ سے مسلمانوں پر برتری رکھتے تھے۔ یہ مسلمان اقلیت اُس اُکرت کے تحت ایسی دبی ہوئی تھی کہ اُن میں کچھ لوگ اسلام کے مستقبل کے متعلق خوف زدہ اور فکر مند رہتے تھے۔

چونکہ مسلمانوں کی یہ حالت بنی اسرائیل کی اُس وضع کے زیادہ مشابہہ تھی جب کہ وہ حکومت فرعون کے پنجے میں گرفتار تھے۔ اس لیے اس سُوْرَة کے ایک حصہ میں حضرت موسیٰؑ، بنی اسرائیل اور فرعون کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ حصہ اتنا طویل ہے کہ

۱ دیکھیے "تاریخ اہل بیت" ابن عبد اللہ زہری، اور "فرست" ابن تیمیہ اور کتب تفسیر۔

سُوْرَة قصص

☆ مکہ میں نازل ہوئی
☆ اس میں ۸۸ آیتیں ہیں

سورۃ مذکورہ کے قریباً نصف حصہ پر مشتمل ہے۔

اس میں خصوصاً حضرت موسیٰ کی زندگی کے اس حصہ کا ذکر ہے جب کہ وہ ایک طفل ضعیف شیرخوار اور فرعون کے گھر میں پرورش پا رہے تھے۔ مگر قادر مطلق کی اس شکست ناپذیر قدرت نے، جو تمام کائنات پر سایہ نگین ہے، اس کمزور بچے کو طاقتور دشمنوں کے زیر دامن پرورش کرا کے بڑا کر دیا اور آخر کار خدائے اسی نے اس قدر قوت عطا فرمائی کہ اس نے فرعون کی تمام شوکت و ثروت کا خاتمہ کر دیا اور اس کے ظلم کے عمل کو سہارا کر دیا۔

یہ قصہ اس لیے بیان کیا گیا ہے تاکہ مسلمان پروردگار کے لطف و رحم کے امیدوار رہیں اور اس کی لامحدود قدرت پر اعتماد کر کے اپنے دل کو مطمئن رکھیں۔ اور دشمن کی تعداد کثیر اور اس کی طاقت سے ہرگز خوف زدہ نہ ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ اس سورۃ کا ابتدائی حصہ اسی پر معنی اور دانش آموز تاریخی واقعہ پر مشتمل ہے۔ بالخصوص آغاز بیان میں مستضعفین کے لیے حق و عدالت پر مبنی حکومت کی نوید ہے اور ظالمین کی شان و شوکت کے برباد ہونے کی بشارت ہے۔ یہ بشارت مظلومین کے لیے آرام بخش اور قدرت آفرین ہے۔

اس سورۃ کا مغز بیان یہ ہے کہ جس وقت تک بنی اسرائیل رہبر و پیشوا سے محروم رہے اور ان کے سروں پر سائبانِ ایمان توجید کا سایہ نہ ہوا تھا، اس وقت تک نہ تو ان میں کوئی ایسی تحریک رونما ہوئی اور نہ وہ کوئی ایسی سعی و کوشش کر سکے جو انہیں من حیث القوم منظم و متحد کر دے۔ اندر میں حال وہ غلامی اور اسیری کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ مگر جیسے ہی انہیں ایک رہبر مل گیا اور ان کا دل نور علم و توحید سے روشن ہو گیا، وہ فرعون اور آل فرعون پر اس طرح حملہ آور ہوئے کہ ہمیشہ کے لیے حکومت ان کے ہاتھ سے نکل گئی اور بنی اسرائیل آزاد ہو گئے۔

اس سورۃ کے حصہ دوم میں اس دولت مند اور مجتہدان کا ذکر ہے جسے اپنے علم اور دولت پر بڑا بھروسہ تھا۔ اس غرور و تکبر کے نتیجے میں اس کا انجام بھی بالکل فرعون جیسا ہوا۔ فرعون پانی میں غرق ہوا، اور یہی میں فرعون کو اپنی فوجی طاقت پر گھمنے لگا اور قادران کو اپنی دولت پر۔

خدا کے حکم نے یہ واقعات اس لیے بیان کیے ہیں تاکہ اہل عالم پر یہ واضح ہو جائے کہ :-

خواہ وہ کتے کے اہل ثروت ہوں، اس علاقہ کے مشرک صاحبان اقتدار ہوں یا اس دور کے سیاسی بازیگر ہوں، ان میں سے کسی میں بھی یہ قدرت نہیں ہے کہ مشرکین پر مستضعفین کے غلبے کے باوجود جو ارادۃ الہی ہے اس کا مقابلہ کر سکیں۔ یہ واقعات اس سورہ کے آخری حصہ میں بیان کیے گئے ہیں۔

ان دو حصوں کے درمیان توحید، مبادی، اہمیت قرآن، قیامت میں مشرکین کی حالت، مسلک ہدایت و ضلالت اور کمزور افراد کی ہمانہ جہتی کا جواب مذکور ہے۔ یہ بیان نہایت قیمتی اور سبق آموز ہے۔ درحقیقت یہ بیان سورۃ کے حصہ اول کا نتیجہ اور حصہ دوم کے لیے بہتر کا حکم رکھتا ہے۔

فضیلت تلاوت سورۃ قصص

جناب رسالتؐ سے مروی ایک حدیث میں ہم یوں پڑھتے ہیں :

من قرء طسوما القصص اعطی من الاجر عشر حسنات بعدد
من صدق بموسى وكذب به ، ولعوبق ملك في السماوات والارض
الاشهد له يوم القيامة انه كان صادقاً

جو آدمی سورۃ قصص کو پڑھے گا تو اسے ان لوگوں کی تمہیلوں نے حضرت موسیٰ کی تصدیق
یا تکذیب کی تعداد کی نسبت سے دس نیکیوں کا ثواب دیا جائے گا۔ اور زمین اور آسمان
میں کوئی فرشتہ ایسا نہ ہوگا جو بروز قیامت اس شخص کی صداقت پر گواہی نہ دے۔

حضرت امام جعفر صادق سے ایک اور حدیث مروی ہے کہ :

جو شخص طواسین ثلاثہ یعنی سورۃ قصص، نمل اور شعرا کو ہر شیب جمع میں پڑھے گا، اس
کا شمار دوستانِ خدا میں ہوگا اور وہ جوار الہی اور اس کے سایہ حمایت میں رہے گا۔
وہ دنیا میں کبھی بے اسن، ناراحت اور فقیر نہ رہے گا۔ اور آخرت میں خدا اس کو اس قدر
انعامات عنایت کرے گا کہ وہ نہ صرف راضی ہو جائے گا بلکہ اس کی مسرت کی کیفیت
اس سے بھی زیادہ ہوگی۔

یہ امر یہی ہے کہ یہ تمام اجود ثواب ان لوگوں کے لیے ہے جو اس سورۃ کو پڑھ کر دنیا کے قارونوں اور فرعونوں کے مقابلہ میں
حضرت موسیٰ اور راست باز مومنین کی صف میں کھڑے ہو کر باطل کے خلاف جہاد کرتے ہیں اور مشکلات کے وقت دشمن کے
مقابلہ میں ہار نہیں مانتے اور شکست کی ذلت کو گوارا نہیں کرتے۔ کیونکہ نعمات الہی کسی کو نعمت میں نہیں مل سکتی ہیں۔ یہ نعمات دیرگیا
انہیں لوگوں کے لیے مخصوص ہیں جو کلام الہی کو پڑھتے ہیں، اس پر غور کرتے ہیں اور اس کی تعلیم کو اپنی زندگی کا دستور العمل بناتے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱۔ طَسَمَ

۲۔ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ

۳۔ نَتْلُوْا عَلَیْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوسٰی وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ

لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ

۴۔ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلٰی فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِیْعًا یَّسْتَضِعُّ

طَائِفَةً مِنْهُمْ یُدِّیْحُ اَبْنَاءَهُمْ وَیَسْتَحِیْ نِسَاءَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ

مِنَ الْمَفْسِدِیْنَ

۵۔ وَنُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ اسْتَضَعُّوْا فِی الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ

اُمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِیْنَ

۶۔ وَنُمْكِنَ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ وَنُرِیْ فِرْعَوْنَ وَاهْمَانَ وَجُنُوْدَهُمَا

مِنْهُمْ مَا كَانُوْا یَحْذَرُوْنَ

ترجمہ

اللہ کے نام سے شروع جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ طَسَمَ

۲۔ یہ کتابِ مبین کی آیات ہیں۔

۳۔ ہم تجھ سے موسیٰ اور فرعون کا مبنی برحق کچھ قصہ ایمان لانے والوں کے لیے بیان کرتے ہیں۔

۴۔ فرعون نے زمین میں اپنے آپ کو برتر سمجھ لیا تھا۔ اور وہاں کے رہنے والوں کو مختلف

گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس نے ان میں سے ایک گروہ کو کمزور کر دیا تھا۔ ان کے لڑکوں کو قتل کر دیتا تھا اور ان کی لڑکیوں کو (کنیزی کے لیے) زندہ رہنے دیتا تھا۔ یقیناً وہ مفسدین میں سے تھا۔

۵۔ ہمارا ارادہ یہ ہے کہ ان لوگوں پر ہم احسان کریں جو زمین میں کمزور کر دیے گئے ہیں اور

انہیں زمین کا وارث اور اہل زمین کا پیشوا بنا دیں۔

۶۔ انہیں زمین میں ثبات قدم عطا کریں (ان کی حکومت کو مستحکم کر دیں) اور فرعون، ہامان

اور ان کے لشکر کو وہ چیز دکھائیں جس کا انہیں خوف ہے۔

اور سورہ خود کی اس آیت میں :

کل فی کتاب مبین

”لوح محفوظ“ کے معنی لیے گئے ہیں۔ لیکن یہ آیت جو اس وقت زیر بحث ہے اس میں کلمہ ”آیات“ استعمال ہوا اور اسی طرح اگلی آیت میں جملہ ”نتلوا علیک“ آیا ہے۔ ان الفاظ کے قرینہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہاں ”کتاب مبین“ سے مراد قرآن ہے۔

اس مقام پر قرآن کی صفت ”مبین“ ذکر کی گئی ہے۔ کلمہ ”مبین“ لغوی لحاظ سے لازم اور مستوی دونوں معنی میں آیا ہے۔ یعنی وہ چیز جو خود بھی واضح ہے اور دوسری شے کو بھی آشکار کرتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنے روشن پیغام اور مطالب کے ذریعہ حق کو باطل سے آشکار کرتا ہے اور راہ راست کو گمراہی سے منتقل کر دیتا ہے۔

قرآن اس مختصر سے مقدمہ کے بعد موسیٰ اور فرعون کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے یوں فرماتا ہے :

”ہم گردہ مومنین کے لیے تجھ سے موسیٰ اور فرعون کی کچی داستان کا کچھ حصہ بیان کرتے ہیں“ (نتلوا علیک من نبأ موسیٰ وفرعون بالحق لقوم یؤمنون)۔

آیت میں حرف جار ”من“ استعمال ہوا ہے۔ اصطلاح نحو میں اسے ”تبعیضیہ“ کہتے ہیں۔ اس کے معنی قدمے یا تھوڑا سا کے ہیں۔ حرف ”من“ استعمال کرنے میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ جو کچھ اس مقام پر ذکر کیا جا رہا ہے وہ اس طویل داستان کا صرف ایک گوشہ ہے جو مناسبت مقام کے لحاظ سے بیان کیا گیا ہے۔

آیت میں کلمہ ”بالحق“ سے اس امر کی تاکید ہوتی ہے کہ جو کچھ یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ ہر قسم کی خرافات، اباطیل، اساطیر اور غیر واقعی مطالب سے پاک و منزه ہے۔ ”بالحق“ کے معنی ہیں ”قوائم باحق“ یعنی عین واقعیت۔

کلمہ ”لقوم یؤمنون“ یہ ایک توضیح ہے اور تاکید ہے اس حقیقت پر کہ اُس وقت کہ جس جو مومنین کفار کے ظلم و ستم سہہ رہے تھے یا اُن جیسے لوگ جو کہیں اور ہوں اس داستان کو سُن کر اُن پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ خواہ دشمن کی طاقت کتنی ہی زیادہ ہو اور اُن کی جمعیت، شمار اور وسائل کتنے ہی وسیع کیوں نہ ہوں۔ اُن کے مقابلہ میں اہل ایمان خواہ کتنے ہی قلیل استعداد، بظاہر کم طاقت اور اُن کے نیچے پس رہے ہوں، اُنھیں ہرگز خوف زدہ و ہراساں نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ اُس قادر مطلق کے لیے ہر چیز آسان ہے۔ مومنین پر یہ امر روشن رہے کہ :

وہ خدا جس نے فرعون کو نابود کرنے کے لیے موسیٰ کو اُسی کے گھر میں پرورش دلوائی۔
وہ خدا جس نے مظلوم غلاموں کو رُوئے زمین کی سلطنت عطا کی۔ اور مغرور ظالموں کو ذلیل و خوار اور نابود کر دیا۔ وہ خدا جس نے ایک شیر خوار بچے کی پرورش لہروں میں حفاظت کی اور فرعون اور اُس کے لاکھوں پُروردہ ساتھیوں کو نیل کی موجوں میں دفن کر دیا۔ تمہیں بھی ان مصائب سے نجات دینے کی قدرت رکھتا ہے۔

یقیناً ان آیات کے اصلی مخاطب مومنین ہی ہیں۔ اُنھیں کے لیے یہ آیات نازل ہوئی ہیں۔ اُن مومنین کے لیے جو ان

تفسیر

ارادۃ الہی ہے کہ مستضعفین کا میاب ہوں :

اس دفعہ قرآن کی سورتوں کے آغاز میں ”حروف مقطعه“ سے ہمارا چودھویں بار سابقہ پڑ رہا ہے۔ ان میں ظلم تیسری اور آخری مرتبہ ہے۔

جیسا کہ ہم نے بار بار کہا ہے کہ قرآن کے حروف مقطعه کی مختلف تفاسیر کی گئی ہیں۔ اس موضوع پر ہم نے سورہ بقرہ، سورہ آل عمران اور سورہ اعراف کے آغاز میں مشرح بحث کی ہے۔ جہاں تک ”طس“ کا تعلق ہے مختلف روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حروف صفات باری تعالیٰ کی مختصر علامات ہیں۔ یا ان سے مراد مقدس مقامات ہیں۔

تاہم یہ امر اس معروف تفسیر کے جس پر ہم نے بار بار زور دیا ہے مانع نہیں ہے کہ خدا اس حقیقت کو سب پر روشن کر دینا چاہتا ہے کہ یہ کتاب مقدس آسمانی جو انسان کی ارتقائی تاریخ میں عظیم انقلاب کا سرچشمہ ثابت ہوئی اور جس میں انسان کی ہر حیات کے لیے ایک سعادت بخش پروگرام موجود ہے، اس کی تشکیل بھی ”الف با“ جیسے سادہ حروف سے ہوئی ہے۔ ہر پختہ اس کے کلمات کا تلفظ کر سکتا ہے۔ یہ کتنی اہم اور غیر معمولی بات ہے کہ ایسے سادہ وسائل کی ترتیب و تنظیم کا نتیجہ ایسی عظیم المرتبت کتاب ہو کہ جو سب لوگوں کی دسترس میں ہے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ حروف مقطعه کے بعد بلافاصلہ عظمت قرآن کا ذکر ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے :

”یہ با عظمت آیات کتاب مبین کی آیات ہیں“ یہ ایسی کتاب ہے کہ جو خود بھی روشن ہے اور انسانوں کے لیے راہ سعادت کو بھی روشن کرنے والی ہے : (تلك آیات الكتاب المبین)۔

اگرچہ کلمہ ”کتاب مبین“ بعض آیات قرآن میں مثلاً سورہ یونس کی آکھوں آیت :

ولا اصغر من ذلك ولا اکبر الا فی کتاب مبین

”تلك“ اہم اشارہ دُور کے لیے ہے۔ جیسا کہ ہم کہ چکے ہیں اس سے ان آیات کی عظمت مراد ہے۔

آیات کے منشا کو اپنے قلب میں بگڑ دیتے ہیں اور جرم مصائب میں بھی اپنی منزل مقصود کی طرف راہ روہتے ہیں۔

درحقیقت یہ ایک ٹھل بیان تھا۔ آئندہ آیات میں اس کی تفصیل آتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: فرعون نے خدا کی زمین پر تکبر، آمریت اور خود سری اختیار کی (ان فرعون علف الارض)۔

حالانکہ وہ اپنے چیراں انسان تھا مگر اس نے اپنی جمالت اور ناطق کی وجہ سے اپنی ہستی کو پہچانا اور اپنی حد سے یہاں تک بڑھ گیا کہ ضلن کا دعویٰ کر بیٹھا۔

اس آیت میں الارض سے مراد ملک مصر اور اس کے اطراف کا علاقہ ہے۔ اور چونکہ اس زمانہ میں زمین کا وہی حصہ آباد تھا اس لیے قرآن میں یہ کلمہ بصورت عام استعمال کر کے خاص معنی مراد لیے گئے ہیں۔

اس کلمہ کے عمل استعمال سے یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ "ارض" سے پہلے "ال" اس عہد کی تخصیص کے لیے آیا ہو اور زمین مصر کی طرف اشارہ ہو۔

بہر حال فرعون نے اپنی منکوبہ حکومت کے استقلال کے لیے چند گنا مان عظیم کا ارتکاب کیا۔

اول تو اس نے یہ چال چلی کہ سکنان مصر کے درمیان لفاق پیدا کر دیا (وَجَعَلَ اٰهْلَهَا شِيْعًا)۔

یہ وہی سیاست تھی جس کے ذریعہ جابر اور طوگیت پرستانہ حکومتیں اپنی بنیاد کو مستحکم کرتی رہی ہیں کیونکہ کسی اکثریت پر کسی اقلیت کی حکومت کا پائیدار رہنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک وہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے پروگرام پر عمل نہ کرے۔

اس قسم کی جابر حکومتیں ہمیشہ "توحید کلمہ" اور "کلمہ توحید" سے خائف رہتی ہیں۔ ایسی حکومتیں عوام میں اتفاق و اتحاد کے جذبات سے ہمیشہ ڈرتی رہتی ہیں۔ اسی لیے وہ اپنا تحفظ اسی میں سمجھتی ہیں کہ حکومت طبقاتی بنیادوں پر رہے۔ یہی پالیسی ہے جس پر تاریخ کے ہر عہد اور ہر زمانے کے فراعنہ کار بند رہے ہیں۔

البتہ فرعون نے خصوصیت سے باشندگان مصر کو دو طبقات میں تقسیم کر دیا تھا۔ اول قبلی جو ملک کے اصل باشندے تھے اور ملک کے تمام رفاہی وسائل، دولت و عملات اور کلیدی اساسیاں ان کے اختیار میں تھیں۔ دوسرے سبطی یعنی مہاجر بنی اسرائیل جو ان قبلیوں کے ہاتھ میں غلاموں اور کنیزوں کی طرح پھینے ہوئے تھے۔

ان بنی اسرائیل کا یہ حال تھا کہ یہ انتہائی فقر و ناداری میں گرفتار تھے۔ ان سے نہایت سخت مشقت لی جاتی تھی مگر انھیں اس کا اجر کچھ نہ ملتا تھا۔ کلمہ "اهلہا" میں قبلی اور بنی اسرائیل دونوں شامل ہیں۔ اس اعتبار سے کہ بنی اسرائیل ملک مصر میں ایک طویل مدت سے رہتے تھے۔ تاہم وہ وہیں کے باشندے ہو گئے تھے۔

تاریخ کہتی ہے کہ ملوک فراعنہ میں سے بعض نے اپنے لیے ایک "ہرم" بنانے کے لیے ایک لاکھ غلاموں کو بیس سال تک کام پر لگائے رکھا (مثلاً خوف بادشاہ کا مشورہم جو موجودہ ڈیڑھ تخت قاہرہ کے نزدیک ہے) اور ان میں سے ہزاروں آدمیوں کو دوران کار میں سخت کام لے کر یا کوڑے مار مار کر قتل کر دیا۔ بنی اسرائیل کے مصائب کا اس منظر واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کے لیے حدیث کے کتابوں سے رجوع کرنا چاہیے۔

فرعون کا دوسرا جرم یہ تھا کہ اس نے اس ملک کے ایک طبقہ پر ظلم و قہر کے پہاڑ توڑ کر انھیں بالکل بے دست دبا کر دیا تھا اس حالت کو قرآن شریف میں یوں بیان کیا گیا ہے:

(يَتَضَعُ طَائِفَةٌ مِّنْهُم مَّيْذِينَ ابْنَاءَهُمْ وَيَسْتَجِ نِسَاءَهُمْ)۔

فرعون نے اس گروہ کو اتنا ضعیف اور ناتوان کر دیا تھا کہ ان کی اولاد نرینہ کو قتل کرتا تھا۔

اور ان کی لڑکیوں کو اپنی خدمت کے لیے زندہ رکھتا تھا۔

اس نے یہ حکم دے دیا تھا کہ اچھی طرح خیال رکھو۔ بنی اسرائیل میں جو بچے بھی پیدا ہو۔ اگر وہ لڑکا ہو تو اسے اسی وقت قتل کر دو۔ اور اگر لڑکی ہو تو اسے کنیزی اور خدمت گاری کے لیے زندہ رکھو۔

دیکھنا یہ ہے کہ وہ اپنے اس فعل سے کونسا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا؟

مشہور یہ ہے کہ اس نے عالم خراب میں یہ دیکھا تھا کہ بیت المقدس کی طرف سے آگ کا ایک شعلہ بلند ہوا ہے جس نے مصر کے تمام گھروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ قبلیوں کے تو تمام گھر جل گئے ہیں مگر بنی اسرائیل کے گھر سلامت رہے ہیں۔

اس نے علما اور خواب کی تعبیر بتانے والوں سے اس خواب کی تعبیر پوچھی۔ انھوں نے کہا:

بیت المقدس کی سرزمین سے ایک آدمی خروج کرے گا۔ اس کے ہاتھ سے فراعنہ

کی حکومت اور ملک مصر تباہ ہو جائے گا۔

نیز یہ بھی روایت ہے کہ بعض کاہنوں نے اس سے کہا تھا کہ:

بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تیری حکومت کو برباد کر دے گا۔

بالآخر اسی سبب نے فرعون کو اس امر پر آمادہ کیا کہ اس نے بنی اسرائیل کے نومولود فرزند ان نرینہ کے قتل کا حکم اولاد کر لیا۔

بعض مفسرین نے فرعون کے آمادہ بہ تقدی ہونے کے متعلق ایک اور بھی احتمال ظاہر کیا ہے کہ:

"گزشتہ پیغمبروں نے حضرت موسیٰ کی پیدائش اور ان کی خصوصیات کے متعلق پیش گوئی کی تھی اور خاندان فراعنہ

ان سے واقف ہو کر خوف زدہ رہتا تھا۔ اس وجہ سے وہ لوگ بنی اسرائیل کے دشمن ہو گئے۔"

لیکن "یذبح ابناؤہم" کا جملہ جو "يَتَضَعُ طَائِفَةٌ مِّنْهُم" کے بعد آیا ہے، اس سے ایک اور مفہوم

بھی مترشح ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ حکومت فرعون نے بنی اسرائیل کو قوی حیثیت سے کمزور اور ناتواں کرنے کے لیے یہ پالیسی اختیار

کی تھی۔ تاکہ ان کی اولاد و ذکور کو (جس کے متعلق اندیشہ تھا کہ کسی وقت بغاوت کر کے فرعون کا تختہ الٹ دے) ختم کر دے اور

صرف عورتوں اور لڑکیوں کو کہ جن میں بغاوت اور جنگ کی طاقت نہیں ہوتی، اپنی خدمت کے لیے زندہ رکھے۔

قول بالا کی تائید "سودہ سورمن" کی آیت نمبر پچیس سے ہوتی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عہد فرعون میں اولاد و ذکور کو

قتل کرنے اور اولاد اناٹا کو زندہ رہنے دینے کا طرز عمل حضرت موسیٰ کے دعویٰ نبوت کے بعد بھی جاری رہا۔ آیت یوں ہے:

لہذا تفسیر مجمع البیان - جلد ۷ - صفحہ ۳۳۹ - فخر رازی۔

تفسیر کبیر فخر رازی - ذیل آیت سورہ بحت۔

فلما جاء هو بالحق من عندنا قالوا اقتلوا أبناء الذين آمنوا معه
واستحيوا نساءَهُ هو وما كيد الكافرين الا في ضلّل
پس جب موئی ہمارے پاس سے حق لے کر ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا کہ ان لوگوں
کے لڑکوں کو جو موئی پر ایمان لائے ہیں قتل کر دو اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دو لیکن
کافروں کی تدبیریں ہمیشہ گمراہی میں رہیں گی۔

آیہ زیر بحث کا جملہ "یستحي نساءَهُ" (ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دو) یہ واضح کرتا ہے کہ فرعون کا عورتوں کی بقائے حیات
اصرار یا تو ان سے خدمت لینے کے لیے تھا یا جنسی ہوس رانی کے لیے۔
آیہ کے آخری کلمات میں بطور مجموعی اور بیان علت کے طور پر فرمایا گیا ہے: بطور مسلم وہ مشرکوں میں سے تھا (انہ کان
من المفسدین)۔

فرعون کے اعمال کا خلاصہ صرف ان الفاظ میں کیا جا سکتا ہے کہ "اُس کا کام ڈوٹے زمین پر فساد کرنا تھا۔"
اپنے آپ کو مخلوق سے برتر سمجھنا ایک فساد تھا۔ دوسرا فساد یہ تھا کہ اُس نے مصر میں بطعاقی زندگی پیدا کر دی تھی۔ بنی اسرائیل
رنج و عذاب میں مبتلا کرنا، ان کے لڑکوں کو قتل کرنا اور ان کی لڑکیوں کو کنیز بنانا تیسرا فساد تھا۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے
ساد اور بُرائیاں تھیں۔

یہ امر قدرتی ہے کہ خود پرست اور جاہ پسند لوگ صرف اپنی ذاتی منفعت کے تحفظ کا خیال رکھتے ہیں۔ اور یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ
ہی منافع کا خود غرضانہ تحفظ، انسانی معاشرہ کے مفادات کے تحفظ (جس کے لیے عدالت، قربانی اور ایثار کی ضرورت ہے) سے
انگٹ ہو۔ خود غرضی کا نتیجہ ہر شعبہ زندگی میں بصورت فساد نمودار ہوتا ہے۔

آیت میں کلمہ "یذبح" استعمال ہوا ہے۔ تجز و جح سے مشتق ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ آل فرعون کا سلوک بنی اسرائیل
سے ساتھ ایسا تھا جیسا کہ بیٹروں اور جوہاویوں کے ساتھ ہو۔ یعنی وہ ظالم ان بے گناہوں کو حیوانات کی طرح ذبح کرتے تھے۔
دائستگان فرعون کی مساکینوں کے متعلق بہت سے قصے بیان کیے گئے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ:-

فرعون نے حکم دیا تھا کہ بنی اسرائیل کی حاملہ عورتوں کی نگرانی کی جائے اور صرف قبلی اور فرعون کی نامزد وائیاں ہی وضع حمل میں
ریں۔ تاکہ اگر طفل نوزاد لڑکا ہو تو فرزند مصری حکومت کے دفتر میں اطلاع دیں۔ تاکہ جلد آئیں اور اسے ذبح کر دیں۔

یہ قطعی واضح نہیں ہے کہ کتنے نوزاد بچے اس پروگرام کے مطابق قربان کیے گئے۔ بعض لوگوں نے ان کی تعداد نوے ہزار اور بعض
لاکھوں لکھی ہے۔ فرعون اور اُس کے بڑا خواہ یہ خیال کرتے تھے کہ وہ ان ہولناک مظالم کے ذریعے قوم بنی اسرائیل کے قیام اور شہیت لہی
پورا ہونے کی راہ مسدود کر دیں گے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ "ذبح" کا مادہ فعل ثنائی مجرد میں متعدی ہے۔ لیکن اس معنی پر وہ باب تعدیل میں استعمال ہوا ہے تاکہ کثرت کے مفہوم
کو ظاہر کرے۔ نیز یہاں فعل مضارع کا استعمال اس جرم کے استزاک دلیل ہے۔

تفسیر کبیر از فخر رازی زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

اس آیت کے بعد بلافاصلہ یہ بیان کیا گیا ہے: ہمارے ارادہ اور ہماری مشیت نے یہ طے کیا ہے کہ زمین پر جو
ضعیف الحال اور مظلوم ہیں ہم ان پر احسان کریں اور انہیں اپنی عنایات اور نوازشات سے سرفراز کریں: (و نرید ان نمن علی
الذین استضعفوا فی الارض)۔
اور ہم ان کو فوج انسانی کا پیشوا اور ڈوٹے زمین کا وارث بنا دیں: (ونجعلہم ائمة ونجعلہم الوارثین)۔

ہم ان کو قومی، صاحبِ قدرت اور توانا کر دیں گے اور ان کی حکومت کو ثبات بخشیں گے: (ونکن لہم فی الارض)۔
اور ہم فرعون، ہامان اور اُس کی فوج کو اسی انجام سے دو چار کریں گے جس کا اُنہیں ان کمزور لوگوں کی طرف سے خطرہ لگا رہتا تھا
(و نری فرعون و ہامان وجنودہما منہم ما کانوا یحذرون)۔

یہ دونوں آیات کس قدر اپنے مطلب میں واضح اور امید بخش ہیں جو بھی امید افزا وعدہ ہے وہ ایک قانون
ظہری کی شکل میں، فعل مضارع کے ساتھ بیان ہوا ہے جس میں استمرار کا مفہوم شامل ہے۔ تاکہ ان مومنین کو (جو قرآن کے مخاطب ہیں) یہ
تصور نہ ہو کہ یہ وعدہ صرف بنی اسرائیل کے ظلم کشیہ اور تم دیرہ لوگوں کے لیے ہے اور یہ وہی محض فرعون اور اُس کے ساتھیوں کے
لیے ہے۔ کیونکہ قرآن میں یہ الفاظ ہیں کہ "ہم ایسا کرنا چاہتے ہیں:"

یعنی فرعون کا ارادہ یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو تباہ و برباد کر دے اور ان کی قدرت و شوکت کو نابود کر کے رکھ دے۔
لیکن "ہم یہ چاہتے تھے کہ وہ قومی اور کامیاب ہوں۔"

وہ چاہتا تھا کہ حکومت ہمیشہ مستحکم رہے۔ لیکن ہم نے ارادہ کر لیا تھا کہ حکومت کمزوروں اور مستضعفوں
کے سپرد کر دیں اور آخر کار ایسا ہی ہوا۔

اس مقام پر کلمہ "بنت" جیسا کہ ہم نے اس سے قبل بھی کہا ہے "نعمت اور عطا" کے بخشنے کے معنی میں ہے۔
"بنت" کے یہ معنی اُس مفہوم سے مختلف ہیں جو اس کا روزمرہ کی بول چال میں لیا جاتا ہے یعنی کسی کو کچھ دے کے اُس پر احسان کرنا۔
اس مفہوم میں طرف ثنائی کی تحقیر ہوتی ہے جو یقیناً مذموم ہے۔

ان دو آیتوں میں خدا نے کمزوروں اور پسے ہوئے لوگوں کے بارے میں اپنے ارادے کو بے نقاب کیا ہے اور ان میں
میں پانچ باتوں کا ذکر کیا ہے جو باہم مربوط اور متعلق یک دگر ہیں:

اول یہ کہ: ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہماری نعمتوں سے فیض یاب ہوں: (و نرید ان نمن ...)

دوسرے یہ کہ: ہم چاہتے ہیں کہ اُنہیں پیشوا بنائیں: (ونجعلہم ائمة)۔

تیسرے یہ کہ: ہم چاہتے ہیں کہ اُنہیں جاہلوں اور سنگاروں کی حکومت کا وارث بنا دیں: (ونجعلہم الوارثین)۔

چوتھے یہ کہ: ہم اُنہیں ایک مستقل اور پائیدار حکومت دیں گے: (ونکن لہم فی الارض)۔

آخری اور پانچویں بات یہ ہے کہ: وہ پیش آمد جس کا ان کے دشمنوں کو خوف تھا اور اپنی تمام قوتوں اور وسائل کو اس
کے ٹالنے پر صرف کر رہے تھے، ہم اُس حادثے سے اُنہیں ضرور دو چار کریں گے:

(و نری فرعون و هامان و جنودہما منہم ما كانوا یحذرون)۔

ستم دیدہ اور مظلوم لوگوں پر خدا کی عنایت و الطاف اسی طرح نازل ہوتے ہیں۔ لیکن وہ کون لوگ ہیں؟ اور ان کی ت کیا ہیں؟ آئندہ نکات کی بحث میں ان شاء اللہ ہم ان پر تفصیلی گفتگو کریں گے۔

ہامان فرعون کا مشور و معروف وزیر تھا اور فرعون کی حکومت میں اس کا اتنا اثر تھا کہ آیت منکرہ بالا میں حکم صریحاً لڑ جنود فرعون و هامان " کہا گیا ہے۔

(ہامان کے متعلق آیت ۳۸ کی تفسیر میں تشریحاً بیان کیا جائے گا)۔

چند اہم نکات

مستضعفین کی عالمگیر حکومت : سطور بالا میں ہم نے یہ کہا ہے کہ آیات بالا میں خدا کا پروگرام کوئی سنگینی نہ بنی اسرائیل سے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ ان آیات میں ایک کلی قانون بیان کیا گیا ہے جو تمام قرون و اعصار اور جملہ اقوام اور ممالک پر لایا گیا ہے۔ چنانچہ الفاظ یہ ہیں کہ : ہم یہ ارادہ رکھتے ہیں کہ ستم رسیدہ اور مستضعف لوگوں کو اپنی نعمات عطا کریں اور ہم انھیں کا پیشوا اور زمین کی حکومت کا وارث قرار دیں۔

درحقیقت یہ ایک بشارت ہے کہ " حق ، باطل پر اور ایمان ، کفر پر غالب ہو کے رہے گا۔ "

نیز یہ کہ :- یہ ان تمام آزاد لوگوں کے لیے بشارت ہے جو یہ چاہتے ہیں کہ ظلم و جور کی بساط اٹان کر عدل و انصاف کی حکومت قائم ہو۔

اس مشیت الہی کے بروئے کار آنے کا ایک نمونہ خاندان فرعون کی حکومت کا زوال اور بنی اسرائیل کی حکومت کا قیام تھا۔ اور اس بشارت کا کامل تر ثبوت ظہور اسلام کے بعد پیغمبر اسلام اور ان کے اصحاب کی حکومت کا قیام تھا۔ یہ حکومت برہنہ، تہی دست، مظلوم اور پاک دل مومنین کی تھی جو ہمیشہ اپنے زمانے کے فرعونوں کی طرف سے تحقیر اور تمسخر کا نشانہ بنتے تھے اور ان کے ظلم و ستم برداشت کرتے رہتے تھے۔

لیکن ایک دن وہ بھی آیا کہ خدا نے اسی واما نہ اور آفتابہ گردہ کے ہاتھ سے قیصر و کسریٰ کے مملکت کے دروازے شکستہ نئے انھیں زور اور قدرت کے تحت سے محروم کر دیا اور ان مستعجزین کی ناک کو زمین پر رگڑ دیا۔

اس بشارت کا وسیع ترین نمونہ وہ مبنی برحق و عدالت حکومت ہوگی جو امام مہدی (ہماری جانبیں ان پر فدا ہوں) کے نام لڑنے زمین پر برپا ہوگی۔

یہ آیات من جملہ ان آیات کے ہیں جن میں واضح طور پر ایک ایسی حکومت کے ظہور کی خوش خبری دی گئی ہے۔ اسلامی مملکتوں کی نظر سے وہ ارشادات گزرتے ہیں جو اس آیت کی تفسیر میں اس " ظہور عظیم " کے متعلق ہیں۔

نوح البلاغہ میں امیر المؤمنین حضرت علی ابن ابی طالب سے یوں منقول ہے :

لتعطفن الدنیا علینا بعد شماسہا عطف الضروس علی ولدہا وتلی

عقیب ذلک ونرید ان نمّن علی الذین استضعفوا فی الارض

دنیا اپنی لکڑنی اور سرکشی کے بعد " اس آؤٹینی کی طرح جو دودھ دھننے والے سے اپنے دودھ کو اپنے بچہ کے لیے بچا لیتی ہے " ہماری طرف رخ کرے گی۔

اس کے بعد آپ نے آیت " ونرید ان نمّن " کی تلاوت فرمائی۔

ایک اور حدیث میں جو امام علی علیہ السلام ہی سے مروی ہے ہم یوں پڑھتے ہیں کہ آیت فوق کی تفسیر میں فرمایا :

هو ال محمد یبعث اللہ مہدیہو بعد جہدہو فیقرہو و یدل عدوہو۔

وہ آل محمد ہیں کہ ان زہمت و مصائب کے بعد جو ان پر وارد ہوں گے ان میں سے خدا مہدی کو پیدا کرے گا۔ جو ان کو عزت دے گا اور ان کے دشمنوں کو ذلیل و خوار کرے گا۔

ایک اور حدیث میں جو جناب امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول ہے، اس میں ہے :

والذی بعث محمدتدا بالحق بشیراً و نذیراً ، انت الابرار منا اهل البیت و شیعتہو بمنزلۃ موسیٰ و شیعتہ ، وان عدونا و اشیاعہو بمنزلۃ فرعون و اشیاعہ

تم ہے اس خدا کی جس نے محمد کو حق کے ساتھ بشیر و نذیر بنا کر مبعوث فرمایا کہ ہم اہلیت میں ابرار اور ان کے پیروں میں موٹی کے ہیں اور ہمارے دشمن اور ان کے پیروں فرعون اور اس کے متقلدین کے ہیں۔

امام کا مقصد یہ ہے کہ آخر کار ہم کامیاب اور فتح مند ہوں گے اور ہمارے دشمن نابود ہو جائیں گے اور ہم ہی حق و عدل پر مبنی حکومت قائم کریں گے۔

ابتر حضرت امام مہدی علیہ السلام کی عالمگیر حکومت ان حکومتوں کے خلاف اور مانع نہ ہوگی جو مظلوم لوگ ظالموں کے خلاف محدود علاقوں میں قائم کریں گے اور یہ مستضعف لوگ جس وقت مبنی برحق و عدل حکومت کی شرائط کو پورا کریں گے تو خدا کا سنتی وعدہ اور اس کی مشیت ان کے حق میں پوری ہو جائے گی اور انھیں یہ کامیابی حاصل ہو جائے گی۔

۲۔ " مستضعفین " اور " مستعجزین " کون ہیں؟ ہم جانتے ہیں کہ کلمہ " مستضعف " مادہ " ضعت " سے مشتق ہے۔ لیکن چونکہ اس مادہ کو باب استفعال میں لے جایا گیا ہے (لہذا خاصیت باب کی وجہ سے) اس کے معنی میں وہ

۱۔ نوح البلاغہ کلمات تصار ۲۰۹۔

۲۔ " غیب شیخ طوس " مطابقت نقل تفسیر تراشستلین ج ۴ ص ۱۱۱۔

۳۔ " مجمع البیان " زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

س جسے کمزور کر دیا گیا ہو اور اُسے بیڑیاں پہنا کر قید کر دیا گیا ہو۔

ایک اور تفسیر کے مطابق "مستضعف" وہ نہیں ہے کہ جہانی لحاظ سے کمزور و ناتواں ہو اور کسی قسم کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ ملاحظاً "مستضعف" وہ ہے کہ اُس میں بالقرۃ اور بالفعل کام کرنے کی استعداد تو موجود ہو، مگر وہ ظالموں کے ظلم اور جبر کے نیچے ہوا ہو۔ لیکن بایں حال کہ اُس کے دست و پا قید و بند میں گرفتار ہیں وہ اس حالت پر غاموش اور مطیع نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ ایسے حق کی تلاش میں رہتا ہے کہ غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہو جائے۔ جابروں اور ستمگروں کے ہاتھ کاٹ دے اور دنیا میں ایسا قانون کرے جو حق اور عدل پر مبنی ہو۔

اللہ نے ایسے گروہ سے اُن کی مدد کرنے اور اُنہیں زمین کی حکومت عطا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ خدا کا یہ وعدہ اُن بے دست و پا اور ڈرپوک لوگوں کے لیے نہیں ہے جو ظلم کے خلاف فریاد کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ جہلاً، اُن سے اس بات کی توقع ہو سکتی ہے کہ وہ میدان نبرد میں آئیں اور قربانی دیں۔

نبی اسرائیل بھی فرعونوں کی حکومت کے وارث اُس وقت ہو سکے جب وہ اپنے رہبر حضرت موسیٰ کے حلقہ اطاعت میں تھے۔ اپنے وسائل کو جمع کیا اور سب کے سب من حیث القوم ایک مرکز پر اکٹھے ہو گئے۔ وہ ایمانی اثرات جو اُنہیں حضرت یسٰی سے ورثے میں ملے تھے، حضرت موسیٰ کی تبلیغ و تعلیم نے اُنہیں تازہ اور مکمل کیا، خرافات کو اپنے ذہن سے نکال دیا اور اسکے لیے تیار ہو گئے۔

البتہ "مستضعف" بھی کسی قسم کے ہیں مثلاً مستضعف فکری و علمی و ادبی، مستضعف اقتصادی، مستضعف اخلاقی اور صحت سیاسی، قرآن مجید میں یہ کلمہ عام طور پر مستضعفین سیاسی و اخلاقی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جب آمرانہ ظالم سلسلہ ہوتے ہیں تو وہ سب سے پہلے اپنی تسلط پسندانہ سیاست کو مستحکم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنے محکموں کے علوم و تہذیب کو تباہ اور اُن کی نخر کو ضعیف کر دیتے ہیں۔ اُس کے بعد وہ، اُن کی اقتصادی حالت پر دیکر دیکھتے ہیں تاکہ اُن میں یہ قوت و توانائی باقی نہ رہے کہ وہ کبھی یہ سوچ سکیں کہ بغاوت کر کے مستحکم دظلم، آمر کے ہاتھ سے حکومت چھین لی جائے۔

قرآن مجید میں پانچ مقامات پر "مستضعفین" کا ذکر آیا ہے۔ ان سب مقامات پر اس کلمے سے مراد وہ مومنین ہیں جو اسکے جبر کے نیچے دبے ہوئے تھے۔

قرآن مجید میں ایک مقام پر مومنین کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ وہ خدا کی راہ میں اور مستضعفین کی نجات کے لیے جہاد کریں۔ فرمایا گیا ہے:

تم خدا کی راہ میں اور اُن لوگوں کی نجات کے لیے جو قبر و دستم کا شکار ہیں، جہاد کریں
نہیں کرتے؟ جب کہ یہ ستم ویدہ لوگ کہتے ہیں:-
اے خدا! تو ہمیں اس شہر (مکہ) سے جس کے باشندے ستم گر ہیں باہر لے جا۔ اور
ایک مددگار مقرر کر۔ (نسا ۷)

قرآن میں صرف ایک جگہ اُن لوگوں کا ذکر آیا ہے جو ظالم ہیں اور کافروں سے میل جول رکھتے ہیں اور ریا کاری سے اپنے کو مستضعف کہتے ہیں۔ قرآن نے اُن کے اس ادعا کی نفی کی ہے اور کہا ہے:-

"تم یہ کہہ سکتے تھے کہ کمزور و فساد کے علاقے سے ہجرت کر کے اُن ظالموں کے نیچے سے رہائی حاصل کر لیتے۔ مگر، چونکہ تم نے ایسا نہیں کیا اس لیے تمہاری جگہ دوزخ میں ہے۔"

(نسا: ۹۰)

تاہم، قرآن مجید میں ہر مقام پر مستضعفین کی حمایت کی گئی ہے اور ان کا ذکر بھلائی کے ساتھ کیا گیا ہے اور اُنہیں ایسے مومنین شمار کیا گیا ہے جو زیر تسلط پس رہے ہیں۔ یہ مومن مجاہد اور دین خدا کے لیے سعی و کوشش کرنے والے ہیں اور ظلم و جور ان کے شامل حال ہے۔

۳۔ مستحکم ترین کی عام روشش: صرف یہ فرعون کی خصوصیت نہ تھی کہ وہ بنی اسرائیل کو اسیر رکھنے کے لیے اُن کے مردوں کو قتل کرتا تھا اور اُن کی عورتوں کو اپنی خدمت کے لیے زندہ رکھتا تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ تمام جابروں کا یہی طریقہ رہا ہے کہ وہ اپنے محکموں کی عملی قوتوں کو ختم کرتے رہے ہیں۔

اُن میں سے جو جابر حکمران مردوں کو قتل نہ کر سکتے تھے وہ اُن کے جوہر مرواچی کو قتل کر دیتے تھے۔ وہ لوگ بُرائی کے وسائل کے ذریعے یعنی لہو و لعب کو پھیلا کر، منشیات کا عادی بنا کر فحشیت کو عام کر کے، جنسی لہذاؤ کو بے لگام کر کے، شراب اور بڑے باہمی کو جائز کر کے اور طرح طرح کے غیر صحت مندانہ مشاغل کی ترغیب و دلا کے اپنی محکوم قوم کی غیرت و حیثیت، دلاوری، جنگی رُوح اور قوت ایمانی کا گلا گھونٹ دیتے تھے۔ تاکہ بالکل مطمئن ہو کر اپنی استعمالی حکومت کو دوام دے سکیں۔

لیکن پیغمبران الہی، بالخصوص پیغمبر اسلام نے یہ کوشش کی کہ جوانوں کی خفیہ صلاحیتوں کو بیدار کریں۔ یہاں تک کہ عورتوں کو بھی بہادری کا سبق سکھائیں اور اُنہیں مسکین کے مقابلے میں مردوں کی صف میں لاکھڑا کریں۔

ان دونوں چیزوں کے شواہد گزشتہ تاریخ میں اور زمانہ حال میں تمام اسلامی ملکوں میں اچھی طرح نمایاں ہیں۔ ہم اس مقام پر اُن کے ذکر کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

تفسیر فرعون کی آغوش میں :

اس جگہ سے قرآن مستحکم پر متضعفین کی فتح و غلبہ کو ذہن نشین کرنے کے لیے موسیٰ اور فرعون کے قصہ کو بالشرح بیان کرتا ہے۔ بالخصوص واقعہ کا وہ حصہ جس میں حضرت موسیٰ ضعیف ترین حالت میں تھے اور فرعون قوی ترین اسباب و شرائط کا حامل تھا، وضاحت سے بیان کیا گیا ہے تاکہ جاہلوں اور ظالموں کے ارادے پر شہیت الہی کے غلبے کو آشکار کیا جاسکے۔

اس سلسلے میں قرآن شریف میں پہلی بات یہ کہی گئی ہے کہ ”ہم نے موسیٰ کی والدہ کو دچی کی کہ موسیٰ کو دودھ پلا اور جس وقت ہمیں اُس کے بارے میں کچھ خوف ہو تو اُسے دریا میں ڈال دو۔“ (واوحینا الی ام موسیٰ ان ارضعیہ فاذا خفت علیہ فالقیہ فی الیو)۔ اور تم اپنے دل میں کسی قسم کا خوف اور طمانہ نہ آنے دینا: (ولا تخافی ولا تحزنی)۔ کیونکہ ہم اُسے یقیناً تمہارے پاس لوٹا دیں گے اور اُسے رسولوں میں سے قرار دیں گے: (انا رآدوہ الیک وجاعلوہ من المرسلین)۔

اس مختصر سی آیت میں دو ”امر“ ہیں، دو ”نہی“ ہیں اور دو بشارتیں ہیں۔ یہ آیت بحیثیت مجموعی خلاصہ ہے ایک پکاراواقت داستان کا، جس کا حاصل یہ ہے:

حکومت فرعون نے بنی اسرائیل کے ہاں جو نو مولود بیٹے ہوتے تھے انہیں قتل کرنے کا ایک وسیع پروگرام بنایا تھا۔ یہاں تک کہ فرعون کی مقرر کردہ دائیاں بنی اسرائیل کی باردار عورتوں کی مخدانی کرتی رہتی تھیں۔

ان دائیوں میں سے ایک والدہ موسیٰ کی دوست بن گئی تھی۔ شکم مادر میں موسیٰ کا حمل نفی رہا اور اُس کے آثار ظاہر نہ ہوئے۔ جس وقت مادر بخوبی کو یہ احساس ہوا کہ بچے کی دلاوت کا وقت قریب ہے تو اُس نے کسی کو اپنی دوست دانی کو بلانے بھیجا جب وہ آگئی تو اُس سے کہا۔ تم میرے پیٹ میں ایک فرزند ہے آج مجھے تمہاری دوستی اور محبت کی ضرورت ہے۔

جس وقت حضرت موسیٰ پیدا ہوئے تو آپ کی آنکھوں سے ایک خاص نور چمک رہا تھا۔ چنانچہ اُسے دیکھ کر وہ دایہ کا بچنے لگا اور اُس کے دل کی گہرائی میں محبت کی ایک بجلی سما گئی، جس نے اُس کے دل کی تمام فضا کو روشن کر دیا۔

یہ دیکھ کر وہ دایہ مادر موسیٰ سے مخاطب ہو کر بولی کہ میرا یہ خیال تھا کہ حکومت کے دفتر میں جا کے اس بچے کے پیدا ہونے کی خبر دوں تاکہ جلاو آئیں اور اسے قتل کر دیں اور میں اپنا انعام پالوں۔ مگر میں کیا کر دوں کہ میں اپنے دل میں اس نوزائیدہ بچے کی شدید محبت محسوس کرتی ہوں۔ یہاں تک کہ میں یہ نہیں چاہتی کہ اس کا بال بھی بیکا ہو۔ اس کی اچھی طرح حفاظت کرو۔ میرا خیال ہے کہ آخر کار یہی ہمارا دشمن ہوگا۔

وہ دایہ مادر موسیٰ کے گھر سے باہر نکلی۔ تو حکومت کے بعض جاہلوں نے اُسے دیکھ لیا انہوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ گھر میں داخل ہو جائیں گے۔ موسیٰ کی بہن نے اپنی ماں کو اس خطرے سے آگاہ کر دیا۔ ماں یہ سن کے گھبرا گئی۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کیا کرے۔

۴ - وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِعِيهِ ۖ فَاذْخِفْتِ عَلَيْهِ
فَالْقِيَةَ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِي وَلَا تَحْزَنِي ۗ إِنَّا رَأَيْنَاهُ إِلَيْكَ
وَجَاعَلُوهُ مِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝

۸ - فَالْقِطَّةَ الْفِرْعَوْنِ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا ۗ إِنَّ
فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا كَانُوا خَاطِبِينَ ۝

۹ - وَقَالَتِ امْرَأَتُ فِرْعَوْنَ قُرْتُ عَيْنِي لِئَلَّا يَتَّبِعُنِي وَلَكِنِّي
أَنْتِ تَقْتُلُونَ عِبَادِي ۗ وَكَلَّمَنِ اللَّهُ وَلَوْلَا إِسْرَافِي
لَآتَيْتُكَ بِبَنَاتٍ مُّطَهَّرَاتٍ ۚ وَالْجَنَّةُ لَا يَصْلَاهَا إِلَّا الْأَنْبِيَاءُ
وَالصَّالِحِينَ ۝

ترجمہ

۴ - ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی کی کہ اسے دودھ پلا اور جب تجھے اس کے بارے میں کچھ خوف پیدا ہو تو اسے دریا میں ڈال دینا اور ڈرنا نہیں اور نہ غمگین ہونا کیونکہ ہم اُسے تیرے پاس لوٹا دیں گے اور اُسے رسولوں میں سے قرار دیں گے۔

۸ - (جب ماں کو بچے کے بارے میں سخت تشویش ہوئی تو اُس نے حکم خدا سے اُسے دریا میں ڈال دیا) فرعون کے خاندان والوں نے اُسے پانی میں سے اٹھالیا۔ تاکہ انجام کار وہ اُن کا دشمن اور باعث اندوہ ہو جائے۔ مسلمانا فرعون، هامان اور اُن کا لشکر خطا کار تھے۔

۹ - اور فرعون کی بیوی نے (جب دیکھا کہ وہ بچے کو قتل کر دینا چاہتے ہیں تو) کہا کہ میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اسے قتل نہ کرو۔ ممکن ہے کہ یہ ہمیں نفع پہنچائے یا ہم اسے بیٹا بنا لیں اور وہ انجام سے بچے خیر ہے (انہیں معلوم نہ تھا کہ جسے وہ اپنی آغوش میں پال رہے ہیں وہی ان کا اصلی دشمن ہے)۔

اس شدید پریشانی کے عالم میں جب کہ وہ باطل حواس باختہ ہو رہی تھی، اُس نے بچے کو ایک کپڑے میں لپیٹا اور تھور میں ال دیا۔ اس دوران میں حکومت کے آدمی آگئے۔ مگر وہاں اُنھوں نے روشن تھور کے سوا کچھ نہ دیکھا۔ اُنھوں نے مادر موسیٰ سے تفتیش شروع کر دی۔ پوچھا۔ دایہ یہاں کیا کر رہی تھی؟ موسیٰ کی ماں نے کہا کہ وہ میری سیلی ہے مجھے ملنے آئی تھی حکومت کے ہارنڈے مایوس ہو کے واپس ہو گئے۔

اب موسیٰ کی ماں کو ہوش آیا۔ اُس نے اپنی بیٹی سے پوچھا کہ بچہ کہاں ہے؟ اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ناگاہ تھور کے در سے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ اب ماں تھور کی طرف دوڑی۔ کیا دیکھتی ہے کہ خدا نے اُس کے لیے آتش تھور کو ٹھنڈا اور سلامتی بنا دیا ہے، وہی خدا جس نے حضرت ابراہیم کے لیے آتش فرود کو "برود سلام" بنا دیا تھا۔ اُس نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور بچے کو صبح دسالم باہر نکال لیا۔

لیکن پھر بھی ماں محفوظ نہ تھی۔ کیونکہ حکومت کے کارندے دائیں بائیں پھرتے رہتے اور جستجو میں لگے رہتے تھے کسی بڑے درے کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ ایک نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز سن لیتے۔

اس حالت میں خدا کے ایک الہام نے ماں کے قلب کو روشن کر دیا۔ وہ الہام ایسا تھا کہ ماں کو بظاہر ایک خطرناک کام پر راہ کر رہا تھا۔ مگر پھر بھی ماں اُس ارادے سے اپنے دل میں سکون محسوس کرتی تھی۔

اُس نے کہا۔ "خدا کی طرف سے مجھ پر یہ فرض عائد ہوا ہے۔ میں اسے ضرور انجام دوں گی"۔ اُس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ ان اس الہام کو ضرور عملی جامہ پہناؤں گی اور اپنے نوزائیدہ بچے کو دریائے نیل میں ڈال دوں گی۔

اُس نے ایک مصری بڑھی کو تلاش کیا (وہ بڑھی قبلی اور فرعون کی قوم میں سے تھا) اُس نے اُس بڑھی سے درخواست کی کہ میرے لیے ایک چھوٹا سا صندوق بنا دے۔

بڑھی نے پوچھا: جس قسم کا صندوق تم بنوانا چاہتی ہو اُسے کس کام میں لاؤ گی؟

موسیٰ کی ماں جو دروغ گوئی کی عادی نہ تھی اس نازک مقام پر بھی سچ بولنے سے باز نہ رہی۔ اُس نے کہا:۔ میں بنی اسرائیل کی ایک عورت ہوں۔ میرا ایک نوزائیدہ بچہ لڑکا ہے۔ میں اُس بچے کو اُس صندوق میں چھپانا چاہتی ہوں۔

اُس قبلی بڑھی نے اپنے دل میں یہ پختہ ارادہ کر لیا کہ جلا دوں کہ یہ خبر پہنچا دے گا۔ وہ تلاش کر کے اُن کے پاس پہنچ گیا۔ رجب وہ اُنھیں یہ خبر سنانے لگا تو اُس کے دل پر ایسی دشت طاری ہوئی کہ اُس کی زبان بند ہو گئی۔ وہ صرف باتوں سے شاکے

رتا تھا اور چاہتا تھا کہ اُن علامتوں سے اُنھیں اپنا مطلب سمجھا دے۔ حکومت کے کارندوں نے اُس کی حرکات دیکھ کر کچھ شخص پر سے ناز کر رہا ہے۔ اس لیے اُسے مارا اور باہر نکال دیا۔

جیسے ہی وہ اُس دفتر سے باہر نکلا اُس کے ہوش و حواس بجا ہو گئے۔ وہ پھر جلا دوں کے پاس گیا اور اپنی حرکات سے پھر کھائی۔ آخر اُس نے یہ سمجھا کہ اس واقعے میں ضرور کوئی الہی راز پوشیدہ ہے۔ چنانچہ اُس نے صندوق بنا کے حضرت موسیٰ کی والدہ کو سے دیا۔

غالب صبح کا وقت تھا۔ ابھی اہل مصر خواب تھے۔ مغرب سے لڑ پھٹ رہی تھی۔ ماں اپنے نوزائیدہ بچے اور صندوق کو دریائے نیل

کے کنارے لائی۔ بچے کو آخری مرتبہ دودھ پلایا۔ پھر اُسے، اُس مخصوص صندوق میں رکھا (جس میں یہ خصوصیت تھی کہ ایک چھوٹی کشتی کی طرح پانی بھرتی رہے) پھر اُس صندوق کو نیل کی موجوں کے سپرد کر دیا۔

نیل کی پُرشور موجوں نے اُس صندوق کو جلد ہی ساحل سے دُور کر دیا۔ ماں کنارے پر کھڑی دیکھ رہی تھی۔ سنا اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا دل سینے سے نکل کر موجوں کے اوپر تیر رہا ہے۔ اُس وقت، اگر اطفال الہی اُس کے دل کو سکون و قرار بخش تو یقیناً وہ زور زور سے رونے لگتی۔ اور پھر سارا راز فاش ہو جاتا۔

کسی آدمی میں یہ قدرت نہیں ہے کہ اُن حساس لمحات میں ماں پر جو گزر رہی تھی۔ الفاظ میں اُس کا نقشہ کھینچ سکے۔ مگر۔ ایک فارسی شاعر نے کسی حد تک اُس منظر کو اپنے فصیح اور پُر از جذبات اشعار میں مجسم کیا ہے:۔

۱. مادر موسیٰ چو موسیٰ را بہ نیل
در گلند از گفتہ ربّ جلیل
۲. خود ز ساحل کرد با حسرت نگاہ
گفت کای فرزند فرد بی گناہ!
۳. گر فراموشت کند لطفِ خدای
چون رہی زین کشتی بی ناخدای
۴. دجی آمد کاین چہ فکر باطل است
رہرد ما اینک اند منزل است
۵. ما گرفتیم آنچه را انداختی
دست حق را دیدی دشت سختی
۶. سلح آب از گاہوارش خوشتر است
دایہ اش سیلاب دموجش مادراست
۷. رودها از خود نہ طغیاں می کنند
آنچه می گوئیم ما آن می کنند
۸. ما بہ دریا حکم طوفان می دہیم
ما بہ سیل دسوج فرماں می دہیم
۹. نقش ہستی نقش از ایوان ما است
خاک دباد و آب سرگردان ما است
۱۰. بہ کہ برگردی بہ ما پپاریشش
کی تو از ما دستبری داریش؟

- ۱- جب موسیٰ کی ماں نے حکم الہی کے مطابق موسیٰ کو دریائے نیل میں ڈال دیا۔
- ۲- وہ ساحل پر کھڑی ہوئی حسرت سے دیکھ رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ اے میرے بے گناہ ننھے بیٹے!
- ۳- اگر لطف الہی تیرے شامل حال نہ ہوتا، تو اس کشتی میں کیسے سلامت رہ سکتا جس کا کوئی نا خدا نہیں ہے۔
- ۴- حضرت موسیٰ کی ماں کو اس وقت وحی ہوئی کہ تیری یہ کیا خام خیالی ہے۔ ہمارا مسافر تو سونے سے نازل رواں ہے۔
- ۵- تو نے جب اس بچے کو دریا میں ڈالا تھا تو ہم نے اُسے اُسی وقت سنبھال لیا تھا۔ تو نے خدا کا ہاتھ دیکھا مگر اُسے پہچانا نہیں۔
- ۶- اس وقت پانی کی سطح (اُس کے لیے) اُس کے گہوارے سے زیادہ راست ہوئی اور دیا کا سیلاب اُس کی دائرہ گیری کر رہا ہے اور اُس کی موجیں آغوشِ مادرِ بی ہوئی ہیں۔
- ۷- دیکھو دریائے نیل میں اُن کے ارادہ و اختیار سے طغیانی نہیں آتی۔ وہ ہمارے حکم کے مطیع ہیں وہ وہی کرتے ہیں جو ہمارا امر ہو تاکہ۔
- ۸- ہم ہی سمندروں کو طوفانی ہونے کا حکم دیتے ہیں اور ہم ہی سیل دریا کو روانی اور امواج بجز کو تلاطم کا فرمان بھیجتے ہیں۔
- ۹- ہستی کا نقش ہمارے ایمان کے نقوش میں سے ایک نقش ہے جو کچھ ہے وہی کائنات تو اُس کا شیفے از فروری نمونہ ہے۔ اور خاک، پانی، ہوا اور آتش ہلکے ہی اشارے سے متحرک ہیں۔
- ۱۰- بستر ہی ہے کہ تو بچے کو ہمارے سپرد کر دے اور خود واپس چلی جا۔ کیونکہ تو اُس سے ہم سے زیادہ محبت نہیں کرتی۔

یہ منظر تو یہیں ختم ہوتا ہے۔

اب دیکھنا چاہیے کہ فرعون کے محل میں کیا ہو رہا تھا؟

روایات میں مذکور ہے کہ فرعون کی ایک اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ ایک سخت بیماری سے شدید تکلیف میں تھی۔ فرعون نے اُس کا بہت کچھ علاج کرایا مگر بے سود۔ اُس نے کاہنوں سے پوچھا۔ اُنھوں نے کہا: "اے فرعون ہم پیش گوئی کرتے ہیں کہ اس دریا میں سے ایک آدمی تیرے محل میں داخل ہوگا۔ اگر اُس کے منہ کی رال اس بیمار کے جسم پر ملی جائے گی تو اسے شفا ہو جائیگی۔ چنانچہ فرعون اور اُس کی ملکہ اسی لیے واقعے کے انتظار میں تھے کہ ناگہان ایک روز اُنھیں ایک صندوق نظر آیا جو موجوں کی سطح پر تیر رہا تھا۔ فرعون نے حکم دیا کہ سرکاری ملازمین فرادہ دیکھیں کہ یہ صندوق کیسا ہے اور اسے پانی میں سے نکال لیں۔ دیکھیں

اُس میں کیا ہے؟

لو کہوں نے وہ عجیب صندوق فرعون کے سامنے لاکے رکھ دیا۔ کسی کو اُس کا ڈھکنا کھولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ مطابق شہادت الہی، یہ لازمی تھا کہ حضرت موسیٰ کی نجات کے لیے صندوق کا ڈھکنا فرعون ہی کے ہاتھ سے کھولا جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

جس وقت فرعون کی ملکہ نے اُس بچے کو دیکھا تو اُسے یوں محسوس ہوا کہ ایک مہلی چکی ہے جس نے اُس کے دل کو متور کر دیا ہے۔

اُن دونوں۔ بالخصوص فرعون کی ملکہ کے دل میں اُس بچے کی محبت نے گھر کر لیا اور جب اس بچے کا آپ دہن اُس کی لڑکی کے لیے موجب شفا ہو گیا تو یہ محبت اور بھی زیادہ ہو گئی۔ اب ہم پھر قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس سرگزشت کا خلاصہ قرآن کی زبان سے سنتے ہیں۔

قرآن میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے کہ: فرعون کے اہل خانہ نے موسیٰ کو نیل کی موجوں کے اوپر سے پکڑ لیا۔ تاکہ وہ اُن کا دشمن اور اُن کے لیے باعثِ اندوہ ہو جائے: (فالتقطه آل فرعون لیکون لہم وعدواً وحزناً)۔ "التقط" مادہ "التقاط" سے مشتق ہے۔ جس کے وضعی معنی ہیں۔ "کسی شی کو بغیر تلاش و کوشش پالینا" اسی درجہ سے اگر انسان کسی گمشدہ چیز کو پالے تو اُسے "لقطہ" کہتے ہیں۔

یہ امر بدیہی ہے کہ فرعون کے اہل خانہ نے اس بچے کے قتل (وہ پکڑا جس میں بچہ کو لپیٹتے ہیں) کو اس نیت سے فریا سے نہیں نکالا تھا کہ اپنے جانی دشمن کو اپنی گود میں پالیں۔ بلکہ وہ لوگ بقول ملکہ فرعون اپنے لیے ایک نوری چشم حاصل کرنا، چاہتے تھے۔

لیکن انجام کار ایسا ہی ہوا۔ علمائے ادب کی اصطلاح میں "لیکون" میں جو "لام" سا ہے۔ وہ "لام" قہت کہلاتا ہے۔ ذکر "لام علت" اور اس معنی و مراد کی تعبیر میں لطافت یہی ہے کہ خدا اپنی قدرت کا اظہار کرنا چاہتا ہے کہ وہ کس طرح اس گروہ کو جنھوں نے اپنی تمام قوتیں اور وسائل، بنی اسرائیل کی اولاد کو قتل کرنے کے لیے دقت کر دیئے تھے، اس خدمت پر مامور کرے کہ جس بچے کو نابود کرنے کے لیے اُنھوں نے یہ پروگرام بنایا تھا، اسی کو وہ اپنی جان کی طرح عزیز رکھیں اور اسی کی پرورش کریں۔

قرآن مجید میں کلمہ "آل فرعون" استعمال ہوا ہے۔ یہ اس امر کی علامت ہے کہ صندوق موسیٰ کو صرف ایک آدمی نے نہیں نکالا، بلکہ اُس کے نکلنے میں خاندان فرعون کے متعدد افراد شریک تھے۔ اور یہ عمل اس امر کا شاہد ہے کہ وہ کسی ایسے واقعے کے منتظر تھے۔

۱- روایت کا یہ حصہ ابن عباس سے منقول ہے جو تفسیر غمہ رازی میں مذکور ہے۔ دوسری روایت، تفسیر ابوامتیاح اور مجمع البیان میں سے لی گئی ہیں۔

آیت کا اختتام ان کلمات پر ہوتا ہے کہ " مُسَلِّمًا فِرْعَوْنَ ، حَامَانٌ اِدْرَاؤُنْ دَوْلُوں كَے اِبِلْ لَشْكِرْ خَطَارْ كَارْتَقْتِ ؟ اَنْ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجَنُودَهُمَا كَانُوا خَاطِئِينَ ۔"

وہ دونوں ہر جہت سے خطا کا رشتے۔ اس سے بڑی خطا اور کیا ہوگی کہ انھوں نے حق و عدالت کی راہ سے نروگردانی کر کے اپنی حکومت کی بنیاد، ظلم، جبر اور شرک پر رکھی تھی۔ اس سے زیادہ ظریاں خطا اور کیا ہوگی کہ انھوں نے ہزاروں بچوں کے سر قلم کر دینے کے لیے "عظیم الشان" کو صنم ہستی سے مٹا دیں مگر خدا نے اُسے اُنھیں کے سپرد کیا اور فرمایا : اپنے اس دشمن کو لو ، اُسے پاؤ اور بڑا کر دو۔

اس کے بعد کی آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس بچے کی بابت فرعون، اُس کی مہک اور دیگر اہل خاندان میں باہم نزاع اور لاف بھی ہوا تھا۔ کیونکہ قرآن شریف میں یہ بیان ہے : فرعون کی بیوی نے کہا کہ یہ بچہ میری اور تیری آنکھوں کا ڈوبے سے قتل نہ کر دو۔ لیکن ہے یہ ہمارے لیے نفع بخش ہو یا ہم اسے متنبی کر لیں : (وقالت امرأت فرعون قرت عین ابیہ لئلا تفتلوه علی ان یضغنا ویتخذہ ولداً)۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرعون بچے کے چہرے اور دیگر علامات سے، من جملہ اُن کے اُسے صندوق میں رکھنے اور دریائے نیل میں بہا دینے سے یہ سمجھ گیا تھا کہ یہ بنی اسرائیل میں سے کسی کا بچہ ہے۔

یہ سمجھ کر انہماں، بنی اسرائیل میں سے ایک آدمی کی بغاوت اور اُس کی سلطنت کے زوال کا کابوس اُس کی روح پر مسلط ہو گیا۔ وہ اس امر کا خواہاں ہوا کہ اُس کا وہ خالما نہ قانون، جو بنی اسرائیل کے تمام نوزائیدہ اطفال کے لیے جاری کیا گیا تھا اس بچے پر بھی لاگو ہو۔

فرعون کے خوشامدی درباریوں اور رشتہ داروں نے بھی اس امر میں فرعون کی تائید و حمایت کی اور کہا اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ بچہ قانون سے مستثنیٰ رہے۔

لیکن فرعون کی بیوی آسیہ جس کے بطن سے کوئی لڑکا نہ تھا اور اُس کا پاک دل فرعون کے درباریوں کی مانند نہ تھا، اس بچے کے لیے جنت کی کان بن گیا تھا۔ چنانچہ وہ اُن سب کی مخالفت پر آمادہ ہو گئی اور چونکہ اس قسم کے گھریلو اختلافات میں فتح ہمیشہ بڑوں کی ہوتی ہے، وہ بھی جیت گئی۔

اگر اس گھریلو جھگڑے پر، دستر فرعون کی شفا یابی کے واقعے کا بھی اضافہ کر لیا جائے تو اس اختلاف باہمی میں آسیہ کی فتح امکان روشن تر ہو جاتا ہے۔

مگر آیت کے اخیر میں ایک بہت ہی پُر معنی فقرہ ہے : "وہ نہیں جانتے تھے کہ کیا کر رہے ہیں : (وہم لایشعرون)۔ البتہ وہ بائبل بے خبر تھے کہ خدا کا واجب انفرقہ فرمان اور اُس کی شکست ناپذیر مشیت نے یہ تہیکر لیا ہے کہ یہ طفل نوزاد انتہائی امام راجع، اسمانی نے سفوات میں کھا ہے کہ "خالق" اور "مخلوق" میں یہ فرق ہے کہ "خالق" وہ شخص ہے جو کسی کام کا بھی طرح طرح کے اور "مخلوق" اپنے کام کو اچھی طرح کرتا ہے مگر اُس سے اتفاقاً مخلوق ہوتی ہے۔

خزرات میں پرورش پائے۔ اور کسی آدمی میں بھی اداوہ و مشیت الہی سے سر تابی کی طاقت و جرات نہیں ہے۔

اللہ کی عجیب قدرت :

اس چیز کا نام قدرت نمائی نہیں ہے کہ خدا آسمان و زمین کے لشکروں کو مامور کر کے کسی پُر قوت اور ظالم قوم کو نیست نابود کر دے۔

بلکہ قدرت نمائی یہ ہے کہ اُن ہی جباران مسخبر سے یہ کام لے کر وہ اپنے آپ کو خود ہی نیست و نابود کر لیں اور اُن کے دل و دماغ میں ایسے خیالات پیدا ہو جائیں کہ بڑے شوق سے گلزلیاں جھگڑیں اور اُن کی آگ میں جل مریں، اپنے لیے خودی قید خانہ بنائیں اور اُس میں اسیر ہو کے جان دے دیں، اپنے لیے خود ہی صلیب کھڑی کریں اور اُس پر پڑھ مریں۔ فرعون اور اُس کے زور مند اور ظالم ساتھیوں کے ساتھ بھی یہی پیش آیا۔ چنانچہ تمام مراحل میں حضرت موسیٰ کی نجات اور پرورش اُن ہی کے ہاتھوں سے ہوئی :

حضرت موسیٰ کی وایہ قبیلوں میں سے تھی ،

صندوق موسیٰ کو امواج نیل سے نکالنے اور نجات دہینے والے مستعلقین فرعون تھے ۔

صندوق کا ڈھکن کھولنے والا خود فرعون یا اُس کی اہلیہ تھی ،

اور — آخر کار فرعون شمن اور ماگک غلبہ و اقتدار موسیٰ کے لیے امن و آرام اور پرورش کی جگہ خود فرعون ہی کا محل قرار پایا ۔

یہ ہے پروردگار عالم خدا کی قدرت !

- ۱۰- وَأَصْبَحَ فُؤَادُ أُمِّ مُوسَىٰ فَرِحًا إِنَّ كَادَتْ لِتُبَدِّيَ بِهِ لَوْلَا أَنْ رَبَّنَا عَلَىٰ قَلْبِهَا لِتَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝
- ۱۱- وَقَالَتْ لِأُخْتِهِ قُصِّيهِ فَبَصَّرَتْ بِهِ عَنْ جُنُبٍ وَهُوَ لَا يُشْعُرُونَ ۝
- ۱۲- وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ أَهْلِ بَيْتٍ يَكْفُلُونَهُ لَكُمْ وَهُوَ لَهُ نَصْحُونَ ۝
- ۱۳- فَرَدَدْنَاهُ إِلَىٰ أُمِّهِ كَمَا تَفَرَّعْتِنَاهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَكِنَّ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝

ترجمہ

- ۱۰- موسیٰ کی ماں کا دل (اپنے بیٹے کی یاد کے سوا) ہر چیز سے خالی ہو گیا۔ اگر ہم اُس کا دل ایمان اور امید سے محکم نہ کر دیتے تو قریب تھا کہ وہ راز فاش کر دیتی۔ (مگر ہماری) غرض یہ تھی کہ وہ مومنین میں سے رہے۔
- ۱۱- ماں نے موسیٰ کی بہن سے کہا تو اُس کے پیچھے پیچھے چلی جا۔ پس وہ اُسے دُور سے دیکھتی رہی اور وہ لوگ اس حال سے بے خبر تھے۔
- ۱۲- اور ہم نے پہلے ہی سے اُس پر دُدھ پلانے والیوں کے دودھ اُس پر حرام کر دیتے تھے (تاکہ وہ اپنی ماں ہی کی گود میں پھر سے آجائے) پس موسیٰ کی بہن نے (جب دیکھا کہ حکام کسی دایہ کی تلاش میں بے تاب ہیں) کہا۔ کیا میں تمہیں ایسے گھر والے بتاؤں جو اس نوسلو کو کفالت کریں اور اُس کے خیر خواہ بھی ہوں؟
- ۱۳- پس ہم نے اُس (موسیٰ) کو اُس کی ماں کی طرف لوٹا دیا تاکہ اُس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ ہو نیز وہ جاہلے کہ خدا کا وعدہ سچا ہے، مگر اُن میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔

تفسیر

موسیٰ پھر آغوشِ مادر میں :

- ان آیات میں اس داستان کا ایک اور حصہ بیان کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ کی ماں نے اُس طرح سے جیسا کہ ہم نے پیشتر بیان کیا ہے، اپنے فرزند کو دریائے نیل کی لہروں کے سپرد کر دیا۔ مگر اس عمل کے بعد اُس کے دل میں جذبات کا ایک شدید طوفان اُٹھ گیا۔ نوزائیدہ بیٹے کی یاد، جس کے سوا اُس کے دل میں کچھ نہ تھا اُس کے احساسات پر غالب آگئی تھی۔
- قریب تھا کہ وہ دعاؤں مار مار کر رونے لگے اور اپنا راز فاش کرنے سے قریب تھا کہ چیخ مارے اور اپنے بیٹے کی جھائی میں نالے کرے۔
- لیکن غایتِ خداوندی اُس کے شامل حال رہی جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے: موسیٰ کی ماں کا دل اپنے فرزند کی یاد کے سوا ہر چیز سے خالی ہو گیا۔
- اگر ہم نے اُس کا دل ایمان اور امید کے فور سے روشن کیا، تو قریب تھا کہ وہ راز فاش کر دیتی۔ لیکن ہم نے اس لیے کیا تاکہ وہ اہل ایمان میں سے رہے (و اصبح فؤاد اُمِّ موسیٰ فرحاً ان کادت لتبدي به لولا ان ربنا على قلبها لتكون من المومنين)۔
- ”فارغ“ کے معنی ہیں خالی۔ اس جگہ ”ہر چیز سے خالی“ سے مراد یہ ہے کہ ”بجز یادِ فرزند ہر شے سے خالی تھا۔“
- ہر چند کہ بعض مفسرین نے یہ مراد لی ہے کہ مادر موسیٰ کا راز فاش نہ ہونے سے خالی تھا۔
- یا۔ اُس الہام اور خوش خبری سے خالی تھا جو اُسے پہلے دینی حق تعالیٰ میں اگر سیاقِ عبارت پر غور کیا جائے تو یہ سنا ہم درست نہیں معلوم ہوتے۔
- یہ قطعی فطری امر ہے کہ۔ ایک ماں جو اپنے بچے کو اس سمتِ حال سے اپنے پاس سے جدا کرے وہ اپنی اولاد کے سوا ہر شے کو بھول جائے گی۔ اور اُس کے حواس ایسے باختر ہو جاتے ہیں۔ ان خطرات کا لحاظ کیے بغیر جو اُس کے اور اس کے بیٹے دونوں کے سر پر مثلاً رہتے تھے فریاد کرے اور اپنے دل کا راز فاش کر دے۔
- لیکن۔ وہ خدا جس نے اس ماں کے سپرد یہ اہم فریضہ کیا تھا۔ اسی نے اس کے دل کو ایسا حوصلہ بھی بخشا کہ وہ صالحی پر اُس کا ایمان ثابت رہے اور اُسے یہ یقین رہے کہ اُس کا بچہ نہ بچے نہ بچے۔ یہاں تک کہ اُس کے پاس آجائے گا اور پیغمبر بنے گا۔
- ”ربطنا“ کا مادہ ”ربط“ ہے۔ اس لفظ کے وضعی معنی ہیں۔ تیز رفتاری سے کسی ایسی جگہ باندھنا جہاں وہ اطمینان سے اپنی جگہ محفوظ رہیں۔ اس قسم کی جگہ کو ”رابطہ“ کہتے ہیں۔ مجازاً حفظ و تقویت و استحکام بخشنے کے معنی میں آتا ہے۔ اس آیت میں جو

بطنا علی قلبہا "کہا گیا ہے تو اس سے مراد یہی ہے کہ ہم نے اس کے دل کو قوی کر دیا تاکہ وہ خدا کی وحی پر ایمان لائے اور اس نفیم واقعے کا صدر برداشت کرے۔

اس لطف خداوندی کے طفیل ماں کے دل کا سکون لوٹ آیا مگر اُسے آرزو رہی کہ وہ اپنے فرزند کے حال سے باخبر رہے۔ اس لیے اُس نے موسیٰ کی بہن سے کہا کہ جاتو دیکھتی رہ کہ اس پر کیا گزرتی ہے: (و قالت لاحتہ قصیہ)۔ "قصیہ" مادہ "قص" سے مشتق ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کی کیفیت کی جستجو۔ عرف عام میں جو لفظ "قصہ" ہے نام اس وجہ سے ہوا کہ اُس میں ہی قسم قسم کے واقعات کی جستجو ہوتی ہے۔ موسیٰ کی بہن ماں کا حکم بجالائی اور اتنے فاصلہ سے جہاں سے سب کچھ نظر آتا تھا دیکھتی رہی۔ اُس نے دُور سے دیکھا کہ فرعون کے عمال اُس کے بھائی کے صندوق کو پانی میں سے نکال رہے ہیں اور موسیٰ کو صندوق میں سے نکال کر گود میں لے رہے ہیں: فبصرت بہ عن جنب۔

مگر وہ لوگ اس بہن کی اس کیفیت حال سے بے خبر تھے، (وہو لا یشرعون)۔

اس واقعے کے متعلق بعض لوگوں کا قول یہ ہے کہ فرعون کے مخصوص خدمت گار اس بچے کو لے کر عمل سے باہر آئے تھے تاکہ اس کے لیے کوئی دُودھ پلانے والی تلاش کریں۔ ٹھیک اسی وقت موسیٰ کی بہن نے دُور سے اپنے بھائی کو دیکھ لیا تھا۔ پہلی توجیہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ اس توجیہ کی بنا پر جب موسیٰ کی ماں بچے کے صندوق کو دیکھنے کے لیے پُرد کر کے گھر لوٹ آئی تو موسیٰ کی بہن دریا کے کنارے کھڑی دُور سے دیکھتی رہی کہ دیکھیے اب کیا ہوتا ہے! اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ عمال فرعون نے اُسے پانی میں سے نکال لیا ہے اور بچہ اُس ظہیم خطرے سے جو اُسے درپیش تھا نجات پا گیا ہے۔ "ہو لا یشرعون" کی اور بھی تفاسیر بیان کی گئی ہیں۔ مجرم علامہ طبری اس احتمال کو بعید نہیں سمجھتے کہ اس جگہ روایات اقبل میں اس جملے کی جو تکرار فرعون کے متعلق ہوتی ہے، اس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جب کہ وہ حالات سے اس مذہک لاطم تھا تو پھر کس طرح خدائی کا دعویٰ کرتا تھا؟ وہ اولادہ النبی اور اُس کی شہیت سے کس طرح نبرد آزما ہونا چاہتا تھا؟

بہر حال ارادہ الہی یہ تھا کہ یہ طفل نوزاد جلد اپنی ماں کے پاس واپس جائے اور اُس کے دل کو قرار آئے۔ اس لیے فرمایا گیا: ہم نے تمام دُودھ پلانے والی عورتوں کو اُس پر حرام کر دیا تھا: (وحرمتنا علیہ المرضع من قبل)۔ یہ اسرطبی ہے کہ شیر خوار نوزاد چند گھنٹے گزرتے ہی بھوک سے رونے لگتا ہے اور بے تاب ہو جاتا ہے۔ اندر میں مال لازم تھا کہ موسیٰ کو دُودھ پلانے کے لیے کسی عورت کی تلاش کی جاتی۔ خصوصاً جبکہ مکہ مصر اُس بچے سے نہایت دل بستگی رکھتی تھی اور اُسے اپنی جان کے برابر عزیز رکھتی تھی۔

۱۔ "مرضع" جمع ہے "مرضع" و "بروزن کجبر" کی۔ اس کا معنی ہے "دُودھ پلانے والی عورت"۔ لیکن کے نزدیک یہ "مرضع" (بروزن کجبر) کی جمع ہے۔ یعنی دُودھ پلانے کی جگہ یعنی پستان اور۔ اس کے متعلق یہ احتمال بھی ہے کہ یہ معنی ہے۔ یعنی "رضاع" دُودھ پانا مگر پلانے زیادہ مناسب ہے۔

عمل کے خدام حرکت میں آ گئے اور در بدر کسی دُودھ پلانے والی کو تلاش کرنے لگے۔ مگر یہ عجیب بات تھی کہ وہ کسی کا دُودھ پیتا ہی نہ تھا۔

ممکن ہے کہ وہ بچہ ان عورتوں کی صورت ہی سے ڈرتا ہو اور ان کے دُودھ کا مزہ (جس سے وہ آشنا نہ تھا) اسے اس کا ذائقہ ناگوار اور تلخ محسوس ہوتا ہو۔ اُس بچے کا طور کچھ اس طرح کا تھا گویا کہ اُن (دُودھ پلانے والی) عورتوں کی گود سے اُچھل کے دُور جاگے دراصل یہ خدا کی طرف سے "تحريم کونین" تھی کہ اُس نے تمام عورتوں کو اُس پر حرام کر دیا تھا۔ بچہ لفظ بہ لفظ زیادہ جھوٹا اور زیادہ بیٹاب ہوتا جاتا تھا۔ بار بار رو رہا تھا اور اُس کی آواز سے فرعون کے عمل میں شور ہو رہا تھا۔ او ملکہ کا دل لرز رہا تھا۔

خدمت پر مامور لوگوں نے اپنی تلاش کو تیز کر دیا۔ ناگہاں قریب ہی انھیں ایک لڑکی مل جاتی ہے۔ وہ اُن سے یہ کہتی ہے: میں ایک ایسے خاندان کو جانتی ہوں جو اس بچے کی کفالت کر سکتا ہے۔ وہ لوگ اُس کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے۔ کیا تم لوگ یہ پسند کر گے کہ میں تمہیں وہاں لے چلوں؟ (فقالت هل ادآکوا علی اهل بیت یکفلونہ لکم وھولہ ناصحون)۔

"میں بھی اسرائیل میں سے ایک ایسی عورت کو جانتی ہوں جس کی پھاتیروں میں دُودھ ہے اور اُس کا دل محبت سے بھرا ہوا ہے۔ اُس کا ایک بچہ تھا وہ اُسے کھو چکا ہے۔ وہ ضرور اس بچے کو جو عمل میں پیدا ہوا ہے، دُودھ پلانے پر آمادہ ہو جائے گی۔" وہ تلاش کرنے والے خدام یہ سن کر خوش ہو گئے اور موسیٰ کی ماں کو فرعون کے عمل میں لے گئے۔ اُس بچے نے جو نبی اپنی ماں کی خوشبو سونگھی اُس کا دُودھ پینے لگا۔ اور اپنی ماں کا دُعا مان دس پوس کر اس میں جان نازہ آگئی۔ اُس کی آنکھوں میں خوشی کا نور چمکنے لگا۔ اُس وقت وہ خدام جو ڈھونڈ ڈھونڈ کے تھک گئے تھے۔ بہت ہی زیادہ خوش و خرم تھے۔ فرعون کی بیوی بھی اُس وقت اپنی خوشی کو نہ چھپا سکی۔ لیکن ہے اُس وقت لوگوں نے کہا ہوا کہ تو کہاں چلی گئی تھی۔ ہم تو تجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کے تھک گئے۔ تجھ پر اور تیرے شیر منسلک کشمیر آفرین ہے۔

بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰؑ ماں کا دُودھ پینے لگے، فرعون کے وزیر ہامان نے کہا:۔۔۔ مجھے لگتا ہے کہ تو ہی اس کی ماں ہے۔ بچے نے ان تمام عورتوں میں سے صرف تیرا ہی دُودھ کیوں قبول کر لیا؟ ماں نے کہا:۔۔۔

اُس کی وجہ یہ ہے کہ میں ایسی عورت ہوں جس کے دُودھ میں سے خوشبو آتی ہے، میرا دُودھ نہایت شیریں ہے۔ اب تک جو بچہ بھی مجھے سپرد کیا گیا ہے۔ وہ فوراً ہی میرا دُودھ پینے لگتا ہے۔

حاضرین دربار نے اس قول کی صداقت کو تسلیم کر لیا اور ہر ایک نے حضرت موسیٰؑ کی ماں کو گراں بہا ہدیے اور تحفے دیے۔ ایک حدیث جو امام باقر علیہ السلام سے مروی ہے اس میں منقول ہے کہ:۔۔۔

۱۔ تفسیر قرآن، رازی، جلد ۲۲، صفحہ ۲۲۱۔

”تین روز سے زیادہ کا عرصہ نہیں گزرا کہ خزانے بچے کو اُس کی ماں کے پاس لوٹا دیا۔“

بعض اہل دانش کا قول ہے کہ حضرت موسیٰ کے لیے یہ ”تحريم تکوینی“ (یعنی دوسری عورتوں کا حرام کر دینا) اس سبب سے سختی ندر یہ نہیں چاہتا تھا کہ میرا فرستادہ پیغمبر ایسا دودھ پیئے جو حرام سے آلودہ ہو اور ایسا مال کھا کے بنا ہو جو چوری، ناجائز ذرائع، رشوت و غیر انسانی کو نصب کر کے حاصل کیا گیا ہو۔ خدا کی مشیت یہ تھی کہ حضرت موسیٰ اپنی صالح ماں کے پاک دودھ سے غذا حاصل کریں۔ وہ اہل دنیا کے شر کے خلاف ڈٹ جائیں اور اہل شر و فساد سے نبرد آزما بن کر سکیں۔

ہم نے اس طرح موسیٰ کو اُس کی ماں کے پاس لوٹا دیا۔ تاکہ اس کی آنکھیں روشن ہو جائیں اور اُس کے دل میں غم و اندوہ باقی نہ رہے۔ وہ یہ جان لے کہ خدا کا وعدہ حق ہے۔ اگرچہ اکثر لوگ یہ نہیں جانتے۔ (فردد ناہ الی امہ کی تفسیر عینہا ولا تحزن ولتعلم وعد اللہ حق ولكن اکثرہم ولا یعلمون)۔

اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ:-
کیا وابستگی فرعون نے موسیٰ کو کلیتہً ماں کے سپرد کر دیا تھا کہ وہ اسے گھلے جائے اور دودھ پلایا کرے اور دوران رضاعت بڑا بھی کبھی بچے کو فرعون کے عمل میں لایا کرے تاکہ حکم صراحت سے دیکھ لیا کرے۔ یا۔۔۔ یہ کہ بچہ عمل ہی میں رہتا تھا اور موسیٰ کی ماں معتبرانہ تھا، اگر اُسے دودھ پلا جاتی تھی؟

مذکورہ بالا دونوں احتمالات کے لیے ہمارے پاس کوئی واضح دلیل نہیں ہے۔ لیکن احتمال اول زیادہ قویں قیاس ہے۔

ایک اور سوال یہ ہے کہ:-

آیا۔۔۔ عرصہ شیر خوارگی کے بعد حضرت موسیٰ فرعون کے محل میں چلے گئے یا اُن کا تعلق اپنی ماں اور خاندان کے ساتھ باقی رہا اور محل سے وہاں آتے جاتے رہے؟

اس مسئلے کے متعلق بعض صاحبان نے یہ کہا ہے کہ شیر خوارگی کے بعد آپ کی ماں نے اُنھیں فرعون اور اُس کی بیوی آسیہ کے سپرد کر دیا تھا اور حضرت موسیٰ اُن دونوں کے پاس پرورش پاتے رہے۔

اس ضمن میں راویوں نے فرعون کے ساتھ حضرت موسیٰ کی طلاق (مگر بمعنی) باتوں کا ذکر کیا ہے کہ اس مقام پر ہم ان کو بند طول کلام کے پیش نظر قلم انداز کرتے ہیں۔ لیکن فرعون کا یہ جملہ جبر اُس نے بشت موسیٰ کے بعد کہا:

”الو نربک فینا ولیداً ولبت فینا من عموک مستین“ (شورہ: ۱۵)

کیا ہم نے تجھے بچپن میں پرورش نہیں کیا اور کیا تو برسوں تک ہمارے درمیان نہیں رہا۔

یہ ثابت کرتا ہے کہ حضرت موسیٰ فرعون کے محل میں مدتوں رہے تھے۔

علی ابن ابراہیم کی تفسیر سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ تا زائد بلوغ فرعون کے محل میں نہایت احترام کے ساتھ رہے۔ لہذا اُن کی توجیہ آشکار بائیں فرعون کو سخت ناگوار ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ اُس نے اُنھیں قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ حضرت موسیٰ اس نظر سے

لہ ”تفسیر عینہا“ کے لغوی مادہ کے متعلق اس کتاب کی انھوں جلد میں۔ سورہ فرقان کی آیت نمبر ۷۴ کے تحت ذکر ہو چکا ہے۔

کو بچاپ گئے اور بھاگ کر شہر میں آگئے۔ یہاں وہ اس واقعے سے دوچار ہوئے کہ دو آدمی لڑ رہے تھے جن میں سے ایک قبیلہ ادراک سے تھی (اس واقعے کی تفصیل آئندہ آتی ہے)۔

۱۳۔ وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَاسْتَوَىٰ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ۗ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝

۱۵۔ وَدَخَلَ الْمَدِينَةَ عَلَىٰ حِينِ غَفْلَةٍ مِّنْ أَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ هَٰذَا مِنْ شِيعَتِهِ وَهَٰذَا مِنْ عَدُوِّهِ فَاسْتَأْذَنَهُ الَّذِي مِنْ شِيعَتِهِ عَلَى الَّذِي مِنْ عَدُوِّهِ ۖ فَوَكَرَهُ مُوسَىٰ فَقَضَىٰ عَلَيْهِ ۖ قَالَ هَٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ ۖ إِنَّهُ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِينٌ ۝

۱۶۔ قَالَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي فَغَفَرَهُ ۗ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝

۱۷۔ قَالَ رَبِّ بِمَا أَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ أَكُونَ ظَهِيرًا لِلْمُجْرِمِينَ ۝

ترجمہ

۱۳۔ اور جب وہ (موسیٰ) بھر پور جوان اور طاقتور ہو گیا تو ہم نے اسے حکمت اور دانش عطا کی اور ہم نیکو کاروں کو ایسی ہی جزا دیا کرتے ہیں۔

۱۵۔ اور وہ ایسے وقت جب اہل شہر غافل تھے شہر میں داخل ہوا تو ناگہاں اس نے دو آدمیوں کو دیکھا جو باہم لڑ رہے تھے۔ اُن میں سے ایک اُس کے پیروکاروں میں سے تھا اور دوسرا اُس کے دشمنوں میں سے تھا اُن میں سے ایک نے جو اُس کا طرفدار تھا، دشمن کے مقابلے میں اس سے امداد طلب کی۔ موسیٰ نے اُس کے سینے پر ایک ٹکٹا مارا اور اُس کا کام تمام کر دیا (اور وہ زمین پر گرا اور مر گیا) موسیٰ نے کہا کہ یہ ایک عمل شیطانی تھا، بیشک وہ دشمن اور صریح بھگانے والا ہے۔

لہ تفسیر علی بن ابراہیم طبع ذراعتین، جلد ۴، صفحہ ۱۱۷۔

- ۱۰۔ اُس نے کہا : اے میرے پروردگار ! میں نے اپنے اور پر ظلم کیا تو مجھے بخش دے۔ پس خدا نے اُسے بخش دیا کہ وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔
- ۱۱۔ اُس نے عرض کی : اے پروردگار ! میں اُس نعمت کے شکر ادا کرنے میں جو تو نے مجھے عطا کی ہے، میں کبھی مجرموں کی مدد نہ کروں گا۔

تفسیر

موسٰی مظلوموں کے مددگار کے طور پر :

اب ہم حضرت موسٰیؑ کی بھرپور زندگی کے تیسرے دور سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس دور میں اُن کے وہ واقعات ہیں جو انھیں بدورانِ بلوغ اور صغر سے مدین کو سفر کرنے سے پہلے پیش آنے اور یہ وہ سب ہیں جو ان کی ہجرت کا باعث ہوئے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ فرماتا ہے : موسٰی جب طاقتور اور کامل ہو گئے تو ہم نے اُنہیں حکمت اُتھا کیا اور ہم نیکو کاروں کو اس طرح جزا دیتے ہیں : (ولمّا بلغ أشدّه واستویٰ آتیناهُ حکمًا وعلماً وکذلک بجزی المحسنین)۔

"أشدّ" کا مادہ "شدت" ہے، یعنی طاقتور ہونا۔ "استویٰ" کا مادہ "استواء" ہے یعنی کمال خلقت اور اس اعتدال۔

ان دونوں الفاظ کے مفہوم میں کیا فرق ہے؟ اس پر مفسرین میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ "بلوغ اشدّ" کے معنی "کمال جسمانی" اور "استواء" کے معنی "کمال عقلی و فکری" سمجھتے ہیں۔ کتاب معانی الاخبار میں امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث منقول ہے کہ "اشدّ" اٹھارہ سال کی عمر ہے اور "استواء" عمر کا نصاب ہے جب داڑھی موچھ نمودار ہو جائے۔

ان تعبیرات بالابین کچھ بہت زیادہ فرق نہیں ہے اور ان دونوں کلمات کے لغوی معنی پر توجہ کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ "حکم" اور "علم" میں ممکن ہے کہ یہ فرق ہو کہ "حکم" سے مراد عقل و فہم اور صحیح فیصلہ کرنے کی استعداد ہے اور علم کے معنی ن آگاہی اور دانش ہے جس میں جہل کا شائبہ نہ ہو۔

"کذلک نجزی المحسنین" کے الفاظ اس امر کے شاہد ہیں کہ حضرت موسٰیؑ میں اپنے تقویٰ اور طہارت قلب اور پاکیزہ اعمال کے سبب یہ استحقاق پیدا ہو گیا تھا کہ خدا انھیں بطور جزا علم و حکمت عطا فرمائے اور یہی ہے کہ اس علم و حکمت سے مراد وحی اور نبوت نہیں ہے۔ کیونکہ اس زمانے کے بعد حضرت موسٰیؑ پر وحی نازل ہوئی اور نبوت ملی۔

بلکہ اس مقام پر علم و حکمت سے مراد وہی آگاہی، روشن بینی، صحیح فہم اور اسی قسم کے اوصاف ہیں جو خدا نے موسٰیؑ کو اُن کی پاک دامنی، نیک اور صالح زندگی کے صلہ میں عطا کیے تھے۔ اس صورت حال سے اجمالاً یہ نتیجہ بھی برآمد ہوتا ہے کہ اگرچہ موسٰیؑ فرعون کے محل میں رہے مگر اُس ماحول کی فضا سے قطعی متاثر نہیں ہوئے۔ یہاں تک کہ اُن سے جتنا بھی ہو سکتا تھا وہ اجیہا حق و عدالت میں سہی کرتے رہے۔ ہر چند کہ آپ کی مصروفیات کا حال تشریحاً ہمیں معلوم نہیں ہے۔

بہر حال حضرت موسٰیؑ شہر میں اُس وقت داخل ہوئے جب تمام اہل شہر غافل تھے : (ودخل المدینة علیٰ حین غفلة من اهلها)۔

یہ واضح نہیں ہے کہ یہ کونسا شہر تھا۔ لیکن احتمال قوی یہ ہے کہ یہ مصر کا پایہ تخت تھا۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ حضرت موسٰیؑ کو اُس مخالفت کی وجہ سے جو اُن میں فرعون اور اُس کے دربار میں تھی اور بڑھتی جا رہی تھی، مصر کے پایہ تخت سے نکال دیا گیا تھا۔ مگر جب لوگ غفلت میں تھے۔ حضرت موسٰیؑ کو موقع مل گیا اور وہ شہر میں آ گئے۔

اس احتمال کی بھی گنجائش ہے کہ حضرت موسٰیؑ فرعون کے محل سے نکل کر شہر میں آئے ہوں کیونکہ عام طور پر فرعونوں کے محلات شہر کے ایک کنارے پر ایسی جگہ بنائے جاتے تھے جہاں سے وہ شہر کی طرف آمد و رفت کے راستوں کی نگرانی کر سکیں۔

"علیٰ حین غفلة من اهلها" سے مراد ایسا وقت ہے کہ شہر کے لوگ اپنے مشاغل معمول سے فارغ ہو چکے تھے اور کوئی بھی شہر کی حالت کی طرف متوجہ نہ تھا۔ مگر یہ کہ وہ وقت کونسا تھا؟ بعض کا خیال ہے کہ "ابتدائے شب" تھی، جب کہ لوگ اپنے کاروبار سے فارغ ہو جاتے ہیں ایسے میں کچھ تو اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتے ہیں۔ کچھ تفریح اور رات کو بیٹھنے کے باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اس وقت کو بعض اسلامی روایات میں "ساعت غفلت" کہا گیا ہے۔ چنانچہ جناب رسالت مآب سے ایک حدیث منقول ہے :

"تففلوا فی ساعة الغفلة ولو برکعتین خفیفین"

ساعت غفلت میں نماز نافلہ پڑھو خواہ وہ دو رکعت مختصر ہی کیوں نہ ہو۔

اس حدیث میں جو "ساعت غفلت" کا لفظ آیا ہے اُس کی یہ تعبیر کی گئی ہے :-

"ساعة الغفلة ما بین المغرب والعشاء"

ساعت غفلت مغرب اور عشاء کے درمیان کا وقت ہے۔

حقیقت میں وہ وقت غفلت کا ہوتا ہے۔ بہت سے گناہوں، بدچلنیوں اور اخلاقی انحرافات کا اسی وقت یعنی آغاز شب ہی میں ارتکاب کیا جاتا ہے۔

اُس وقت لوگ نہ تو اپنے کسب و کار میں مشغول ہوتے ہیں نہ بستر خواب و استراحت میں ہوتے ہیں بلکہ شہرول پر معمولاً عام غفلت کی حالت چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ اور بد اخلاقی کے مرکزوں میں اسی وقت رونق ہوتی ہے۔ بعض اہل دانش کا خیال ہے کہ "ساعت غفلت" سے مراد وقت دوپہر ہے جبکہ نصف روز کام کرنے کے بعد چھٹی ہوتی ہے۔

مگر اس موضوع میں پہلی رستے زیادہ درست اور پُر معنی معلوم ہوتی ہے۔

بہر کیف حضرت موسیٰؑ شہر میں آئے اور وہاں ایک ماجرے سے دوچار ہوئے دیکھا کہ دو آدمی آپس میں پھڑے پھڑے ہیں۔ ایک دوسرے کو مار رہے ہیں۔ اُن میں سے ایک حضرت موسیٰؑ کا طرفدار اور اُن کا پیر و تھا اور دوسرا اُن کا دشمن تھا۔ (فوجد ہار جلیین لیقتلان ہذا من شیعتہم و ہذا من عدوہ)۔

کلمہ "شیعتہم" اس امر کا غماز ہے کہ جناب موسیٰؑ اور بنی اسرائیل میں اسی زمانے سے مراسم ہو گئے تھے اور کچھ لوگ اُن کے یرو بھی تھے۔ احتمال یہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ اپنے متقلدین اور شیعوں کے گروہ کو فرعون کی جابرانہ حکومت کے خلاف لڑنے کے لیے ثور ایک مرکزی طاقت کے تیار کر رہے تھے۔

جس وقت بنی اسرائیل کے اُس آدمی نے موسیٰؑ کو دیکھا تو اُن سے اپنے دشمن کے مقابلے میں امداد چاہی۔ (فاستغاثہ نذی من شیعتہ علی الذی من عدوہ)۔

حضرت موسیٰؑ اُس کی مدد کرنے کے لیے تیار ہو گئے تاکہ اُسے اس ظالم دشمن کے ہاتھ سے نجات دلائیں۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ وہ قبیل فرعون کا ایک بادچی تھا اور چاہتا تھا کہ اُس بنی اسرائیل کو بیگار میں بچو کے اُس سے کڑیاں اُٹھائے۔ حضرت موسیٰؑ نے اُس فرعون کے سینے پر ایک ٹکٹا مارا وہ ایک ہی ٹکٹے میں مر گیا اور زمین پر گر پڑا۔ (فوحکہ مؤمنی ففضلی علیہ)۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت موسیٰؑ کا اُس فرعون کو جان سے مار دینے کا ارادہ نہ تھا۔ آیات مابعد سے بھی یہ مطلب خوب واضح ہو جاتا ہے۔ ایسا اس لیے نہ تھا کہ وہ لوگ مستحق قتل نہ تھے بلکہ اُنھیں اُن نتائج کا خیال تھا جو خود حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کو پیش آ سکتے تھے۔

لہذا حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ یہ کام شیطان نے کرایا ہے کیونکہ وہ انسانوں کا دشمن اور واضح گمراہ کرنے والا ہے۔ (قال ہذا من عمل الشیطان انہ عدو مصل مبین)۔

اس واقعے کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ چاہتے تھے کہ بنی اسرائیل کا گریبان اُس فرعون کے ہاتھ سے چھڑا دیں۔ بہر حال دابستان فرعون اس سے زیادہ سخت سلوک کے مستحق تھے لیکن اُن حالات میں ایسا کام کر بیٹھنا تو بہر صحت نہ تھا اور جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے کہ حضرت موسیٰؑ اسی عمل کے نتیجے میں پھر مصر میں نہ ٹھہر سکے اور مرن چلے گئے۔

پھر قرآن میں حضرت موسیٰؑ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے۔ اُس نے کہا: پروردگار! میں نے اپنے اوپر ظلم کیا۔ تجھے معاف کر دے اور خدا نے اُسے بخش دیا۔ کیونکہ وہ غفور رحیم ہے۔ (قال رب انی ظلمت نفسی فاغفر لی ففعلہ انک ہوا الغفور الرحیم)۔

لہذا وہ کسی نیکو شخص کے ہونے کے لیے اس لیے کہ کچھ اور سنی بھی بتائے گئے ہیں جو درست نہیں معلوم ہوتے۔

یقیناً حضرت موسیٰؑ اس معاملے میں کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے۔ بلکہ حقیقت میں اُن سے ترک اولیٰ سرزد ہوا۔ کیونکہ انہیں ایسی بے اعتیاطی نہیں کرنی چاہیے تھی جس کے نتیجے میں وہ زحمت و تکلیف میں مبتلا ہوں۔ حضرت موسیٰؑ نے اسی ترک اولیٰ کے لیے خدا سے طلب عفو کیا اور خدا نے بھی اُنھیں اپنے لطف و عنایت سے بہرہ مند کیا۔

حضرت موسیٰؑ نے کہا: خداوند تیرے اس احسان کے شکر ادا کرنے میں کہ تو نے میرے قصور کو معاف کر دیا اور دشمنوں کے پیچھے میں گرفتار نہ کیا اور اُن تمام نعمتوں کے شکر ادا کرنے میں مجھے ابتدا سے اب تک مرحمت کرتا رہا ہے، میں عہد کرتا ہوں کہ ہرگز مجرموں کی مدد نہ کروں گا اور ظالموں کا طرفدار نہ ہوں گا۔ (قال رب بما انعمت علی فلن اکون ظہیراً للمجرمین)۔

بلکہ ہمیشہ مظلومین اور ستم دیدہ لوگوں کا مددگار رہوں گا۔

اس جملے سے حضرت موسیٰؑ کا مقصود یہ تھا کہ: میں آئندہ ہرگز مجرم اور گنہگار و ابستگان فرعون کا شریک کار نہ ہوں گا۔ بلکہ میں بنی اسرائیل کے ستم دیدہ لوگوں کا مددگار رہوں گا۔

بعض لوگوں نے آیت میں کلمہ "مجرمین" سے وہ اسرائیلی شخص مراد لیا ہے جو قبیلے سے لڑ رہا تھا۔ یہ قیاس حقیقت سے بعید ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ حضرت موسیٰؑ کا یہ کام اور مقام عصمت: مشہور ہے، اُس قبیلے اور بنی اسرائیل کی باہمی نزاع اور حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ سے مرد قبیلے کے مارے جانے کے بارے میں بڑی طویل بحثیں کی ہیں۔

درحقیقت یہ معاملہ کوئی اہم اور بحث طلب تھا ہی نہیں کیونکہ ستم پسند و ابستگان فرعون نہایت بے رحم اور مُفسد تھے۔ انہوں نے بنی اسرائیل کے ہزاروں بچوں کے سر قلم کیے اور بنی اسرائیل پر کسی قسم کا ظلم کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ اس بہت سے یہ لوگ اس قابل نہ تھے کہ بنی اسرائیل کے لیے اُن کا قتل احترام انسانیت کے خلاف ہو۔

البتہ مشہور ہے کہ یہ چیز نے دشواریاں پیدا کی ہیں وہ اس واقعے کی وہ مختلف تعبیرات ہیں جو خود حضرت موسیٰؑ نے کی ہیں۔ چنانچہ وہ ایک جگہ تو یہ کہتے ہیں:

ہذا من عمل الشیطان

یہ شیطان عمل ہے۔

اور دوسری جگہ یہ فرمایا:

رب انی ظلمت نفسی فاغفر لی

خدا یا میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا تجھے معاف فرما دے۔

جناب موسیٰؑ کی یہ دونوں تعبیرات اس ستم حقیقت سے کیونکہ مطابقت رکھتی ہیں کہ:

”عصمت انبیا کا مفہوم یہ ہے کہ انبیا ماقبل بشت اور مابعد عطاءے رسالت ہر دو حالات میں معصوم ہوتے ہیں“

لیکن حضرت موسیٰ کے اس عمل کی جو توضیح ہم نے آیات فوق کی روشنی میں پیش کی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ سے جو کچھ سرزد ہوا وہ ترکِ اولیٰ سے زیادہ نہ تھا۔ انھوں نے اس عمل سے اپنے آپ کو زحمت میں مبتلا کر لیا کیونکہ حضرت موسیٰ کے ہاتھ سے ایک قبلی کا قتل ایسی بات نہ تھی کہ دالیتگان فرعون اُسے آسانی سے برداشت کر لیتے۔

نیز، ہم جانتے ہیں کہ ”ترکِ اولیٰ“ کے معنی ایسا کام ہے جو بابتِ خردِ حرام میں سے ہے۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ”عملِ احسن“ ترک ہو گیا۔ بغیر اس کے کہ کوئی عمل خلاف حکمِ الہی سرزد ہوا ہو۔

اس قسم کے واقعات کا دوسرے انبیا کے احوالِ حیات میں بھی نشان ملتا ہے۔ ان میں سے ایک حضرت آدمؑ بھی ہیں۔ جن کے متعلق سورۃ اعراف آیت نمبر ۱۹ کے تحت (جلد ۳ تفسیر ہذا میں) منفصلاً ذکر ہوا ہے۔

ان آیات کی تفسیر میں ”عیون الانخبار“ میں جناب امام علی رضا علیہ السلام سے ایک تفسیر مروی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

”هَذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ“ سے مراد ”اُن دونوں آدمیوں کی ایک دوسرے سے لڑائی ہے۔ (جو عملِ شیطانی شمار ہوتا ہے) ذکرِ عملِ موسیٰ اور اس جملہ ”رَبِّ اَنْظَمْتَ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي“ سے مراد یہ ہے کہ موسیٰ کو رہے ہیں کہ خدایا جس مقام پر مجھے آنا نہیں چاہتے تھا میں وہاں پہنچ گیا۔ مجھے اس شہر میں ہرگز داخل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اور ”فَاغْفِرْ لِي“ سے مراد یہ ہے کہ: ”مجھے دشمنوں سے چھپا“ تاکہ وہ مجھ پر غالب نہ آجائیں (کیونکہ کلمہ ”غفران“ چھپانے کے معنی میں بھی آتا ہے)۔

۲۔ مجرموں کی مدد کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ اسلامی فقہ میں ارتکابِ گناہ میں کسی کی اعانت کرنے اور ظالمین کی مدد کرنے کے بارے میں ایک منقول باب ہے، جس میں احادیثِ کثیرہ کے حوالے سے ثابت کیا گیا ہے کہ بدترین گناہوں میں سے ایک گناہ ظالموں، ستمگاہوں اور مجرموں کی اعانت کرنا بھی ہے۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اس کا یہ عمل اس امر کا باعث بنتا ہے کہ اُس کا (مددگار کا) حشر اور عاقبت بھی اُن ہی ستمگاہوں کے ساتھ ہوگی۔

یہ امر مسلم ہے کہ ہر معاشرے میں ظالم، ستمگار اور فرعون جیسے کچھ لوگ ہوتے ہیں۔ اگر اُس معاشرے کے عوام اُن لوگوں کے کاموں کی تائید نہ کریں (یعنی خاموش نہ رہیں اور اہلکارِ ناپسندیدگی کریں) تو پھر کوئی بھی فرعون نہ بن سکے۔

ان ظالم فرعونوں کے ٹوٹنے میں عام طور پر کینے، مخلوکِ الحال یا ابنِ الوقت دنیا پرست لوگ ہوتے ہیں، جو اُن کے گرد جمع ہوجاتے ہیں اور اُن کے دست و بازو یا کم از کم اُن کے لشکر اور جمعیت میں اضافے کا سبب بن جاتے ہیں تاکہ اُن ستم شکاروں کے لیے شیطانی قوت فراہم کریں۔

قرآن مجید میں اخلاق کے اس بنیادی اصول کے متعلق بتکرارِ ہدایات موجود ہیں۔ چنانچہ سورۃ مادہ کی دوسری آیت میں مذکور ہے:

”وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ“

ایک دوسرے سے نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرو مگر گناہ اور تعدي کے کاموں میں مدد نہ کرو۔

قرآن میں بصراحت مذکور ہے کہ ظالموں کے ساتھ ”رکون“ عذابِ بہنم کا سبب ہے۔

”رکون“ کے معنی خواہ قلبی میلان ہوں یا کسی کے ساتھ اُس کے کام میں ظاہری شرکت، یا کسی کے فعل پر اظہارِ رضایت؛ دوستی وغیر خواہی یا اطاعت، مفسرین نے ان میں سے ہر معنی کی تفسیر کی ہے۔ اس کلمہ کا ایک اور مفہوم بھی ہے جو ان معانی کا جامع ہے اور وہ بھروسہ، اعتماد اور وابستگی ہے۔ یہ مفہوم ہمارے مقصود کا زندہ گواہ ہے۔

امام زین العابدین علی ابن الحسینؑ سے ایک حدیث منقول ہے :-

”محدثین سلم زہری ایک عالم شخص تھا۔ وہ بنی امیہ کی حکومت بالخصوص ہشام بن عبدالملک کے ساتھ تعاون کیا کرتا تھا۔ امام علیہ السلام نے جب اُس کو ظالمین کی اعانت کرنے سے پرہیز کرنے کی ہدایت فرمائی تو اسے حینہ کرنے کے لیے یہ الفاظ فرمائے،

اولیس بدعائھو ایاک حین دعوک جعلوک قطباً ادار و سرتک
رحی مظالمھو، وجسراً یعبرون علیک الی بلا یاھوسلماً الی
ضلاتھو داعیاً الی عینھو، سالکاً سیلھو، یدخلون
بک الشک علی العلماء ویقتادون بک قلوب الجھال الیھو!۔۔۔
فما اقل ما اعطوک فی قدر ما اخذوا منک! وما الیسر ما عمرنا
لک فی جنب ما حزلوا علیک! فانظر لنفسک فانه لا ینظر لھما
غیرک وحاسبھما حساب رجل مسؤل!

کیا انھوں نے (بنی امیہ نے) تجھے اپنے گرد مجتمع ہونے کی دعوت نہیں دی؛ اور کیا تجھے انھوں نے وہ محور نہیں بنایا جس کے گرد اُن کے ظلم کی جگہ گھومتی ہے۔ اور کیا انھوں نے تجھے وہ پل قرار نہیں دیا جس پر سے عبور کر کے وہ اپنی بلاؤں کی طرف جلتے ہیں۔

اور کیا انھوں نے تجھے اپنی ضلالت کے لیے سریر بھی نہیں بنایا۔ اور کیا انھوں نے تجھے اپنی جہالت اور گمراہی کی طرف داعی اور اپنی شرمناک راہ کا راہرو قرار نہیں دیا؟ وہ تیرے ذریعے سے علماء کو شک میں مبتلا کرتے ہیں اور جہلاکے قلوب کو اپنے جال میں پھنساتے ہیں۔ وہ جو کچھ تجھ سے لیتے ہیں اُس کے عوض تجھے کس قدر قلیل معاوضہ دیتے ہیں اور تیرے ذریعے وہ جتنا برباد کرتے ہیں اُس کے مقابلے میں کتنا کم آباد کرتے ہیں۔

پس تو اپنے نفس پر غور کر کیونکہ خود تجھ سے زیادہ، تیرا کوئی ہمدر نہیں ہے۔

اور ایک شخص مسؤل کی طرح تو خود اپنے نفس کا حساب لے۔

حقیقت یہ ہے کہ امام کی یہ معنی آشکار اور روشن منطبق ہے اُس عالم کو جو دربارِ رس اور اہل بیتِ حکومت ہوں گے بارے میں ہے اور واضح کرتی ہے کہ اس کے نتائج کس قدر بُرے اور نفس ہوتے ہیں۔

ابن عباس کہتے ہیں: کہ یہ آیت "رب بما انعمت علیٰ فلن اكون ظهیراً للمجرمین"

من جملان آیات کے ہے جو یہ گواہی دیتی ہیں کہ مجرمین کی مدد کرنا جرم و گناہ ہے اور مومنین کی اعانت کرنا فرمان الہی کی اطاعت کہتے ہیں کہ لوگوں نے کسی عالم سے کہا کہ :-

"فلاں آدمی فلاں ظالم کا ٹھہر ہو گیا ہے اور صرف اُس کی آمدنی اور خرچ کا حساب لکھتا ہے۔ اگر وہ اس کام کے معاوضے میں کچھ معاوضہ لے تو اُس کی گزر بسر ہو جائے گی ورنہ وہ خود اور اُس کے عیال فقر و فاقہ میں مبتلا ہو جائیں گے"

اُس عالم نے اس سوال کے جواب میں صرف ایک جملہ کہا :
کیا تم نے اُس مرد صالح (حضرت موسیٰ) کا قتل نہیں سنا؟

رب بما انعمت علیٰ فلن اكون ظهیراً للمجرمین

خداوند! ان نعمتوں کے شکر اُنے میں جو تو نے مجھے بخشی ہیں میں ہرگز مجرمین کی اعانت نہیں کروں گا۔

۱۸- فَاصْبِرْ فِي الْمَدِينَةِ خَائِفًا يَتَرَقَّبُ فَإِذَا الَّذِي اسْتَنْصَرُوا بِالْأَمْسِ لَيْسَتْ صُخْرُهُ ۗ قَالَ لَهُ مُوسَىٰ إِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِينٌ ۝

۱۹- فَلَمَّا أَنْ أَرَادَ أَنْ يَبْطِشَ بِالَّذِي هُوَ عَدُوٌّ لَهُمَا ۗ قَالَ يَمُوسَىٰ

أَتُرِيدُ أَنْ تَقْتُلَنِي كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْأَمْسِ ۗ إِنَّ تُرِيدُ إِلَّا أَنْ

تَكُونَ جَبَّارًا فِي الْأَرْضِ وَمَا تُرِيدُ أَنْ تَكُونَ مِنَ

الْمُصْلِحِينَ ۝

۲۰- وَجَاءَ رَجُلٌ مِّنْ أَقْصَا الْمَدِينَةِ يَسْعَىٰ قَالَ يَمُوسَىٰ إِنَّ الْمَلَأَ

يَأْتِمُرُونَ بِكَ لِيَقْتُلُوكَ فَاخْرُجْ أَتِيكَ مِنَ التَّصْحِينِ ۝

۲۱- فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝

۲۲- وَلَمَّا تَوَجَّهَ تَلَفَاءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسَىٰ رَبِّي أَنْ يَهْدِيَنِي سَوَاءَ السَّبِيلِ ۝

ترجمہ

۱۸- موسیٰ نے شہر میں بحالت خوف صبح کی جبکہ ہر لحظہ وہ کسی حادثے (اور کسی خبر) کے انتظار میں تھا۔ ناگہاں اس نے دیکھا کہ وہی شخص جس نے کل اس سے مدد مانگی تھی، آج پھر اسے پکار رہا ہے اور اس سے نصرت طلب کر رہا ہے۔ موسیٰ نے اُس سے کہا کہ تو آشکارا طرد پر گمراہ ہے۔

۱۹- پس جب اُس (موسیٰ) نے ارادہ کیا کہ اُس شخص کو جو اُن دونوں کا دشمن تھا پکڑ لے تو اُس نے کہا : اے موسیٰ! کیا تو آج مجھے بھی اسی طرح قتل کرنا چاہتا ہے جس طرح تو نے کل ایک شخص کو قتل کیا تھا۔

۲۰- کیا تو چاہتا ہے کہ تو زمین میں ظالم بن کر رہے اور کیا تو مسلمین میں سے نہیں ہونا چاہتا؟ (اُس وقت) ایک شخص شہر کے دُور کے حصّے سے (فرعونوں کے مرکز سے) تیزی سے آیا اور کہا کہ سردار تیرے

۲۱- بارے میں مشورہ کر رہے ہیں کہ تجھے قتل کر دیں۔ پس تو فوراً شہر سے نکل جا کہ میں تیرا خیر خواہ ہوں۔

۲۲- وہ شہر سے دُرتے ہوئے نکلا اور ہر لحظہ کسی حادثے کا کھٹکا تھا۔

۱ ظالموں کی اعانت کے بارے میں ہم پہلے ہی دو تفصیلی احادیث ذکر کر چکے ہیں۔ دیکھیے تفسیر تہذیب ۳، سورہ مائدہ کی آیت ۲ کی تفسیر کے ذیل میں اور ج ۵ سورہ بقرہ کی آیت ۱۱۳ کی تفسیر کے ذیل میں۔

اُس نے خدا سے دعا کی، اور کہا: اے میرے رب! تو مجھے ان ظالم لوگوں سے نجات دے۔
۲۲۔ اور جب اُس نے مدین کی طرف رخ کیا تو کہا: مجھے امید ہے کہ میرا رب مجھے راہِ راست کی ہدایت کریگا۔

تفسیر

موسٰی کی مخفیانہ مدین کی طرف روانگی:

ان آیات میں اس پر حادث سرگزشت کا چوتھا حصہ بیان کیا گیا ہے۔ فرعونوں میں سے ایک آدمی کے قتل کی خبر شہر میں بڑی زبردستی سے پھیل گئی۔ قرآن سے شاید لوگ یہ سمجھ گئے تھے کہ اُس کا قاتل ایک بنی اسرائیل ہے اور شاید اس سلسلے میں لوگ موسٰی کا نام بھی لیتے تھے۔

البتہ یہ قتل کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اسے انقلاب کی ایک چمکاری یا اُس کا مقدمہ شمار کیا جاتا تھا۔ اور حکومت کی مشینری اسے سب معمولی واقعہ سمجھ کر اسے چھوڑنے والی نہ تھی کہ بنی اسرائیل کے غلام اپنے آقاؤں کی جان لینے کا ارادہ کرنے لگیں۔

لہذا ہم زیر بحث پہلی ہی آیت میں یہ پڑھتے ہیں کہ اس واقعے کے بعد موسٰی شہر میں ڈر رہے تھے اور ہر لحظہ اُنہیں کسی حادثے کا کھٹکا تھا اور وہ نئی خبروں کی جستجو میں تھے: (فَاَصْحَبِ فِي الْمَدِينَةِ خَائِفًا يَتَرَقَّبُ) ۱

ناگہاں اُنہیں ایک معاملہ پیش آیا۔ آپسے دیکھا کر وہ بنی اسرائیلی جس نے گزشتہ روز اُن سے مدد طلب کی تھی اُنھیں پھر روکا تھا اور مدد طلب کر رہا تھا (وہ ایک قبلی سے لڑ رہا تھا): (فَاذِلَّذِي اسْتَصْرَفَ بِالْاَمْسِ يَسْتَصْرِخُ) ۲

لیکن حضرت موسٰی نے اُس سے کہا کہ تو آشکارا طور پر ایک جاہل اور گمراہ شخص ہے۔ (قَالَ لَهُ مُوسٰى اِنَّكَ لَعَفْوٰى عَمِيْنٌ)۔ تو ہر روز کسی نہ کسی سے جھگڑ پڑتا ہے اور اپنے لیے مصیبت پیدا کر لیتا ہے اور ایسے کام شروع کر دیتا ہے، جن کا ابھی بوقوع نہیں ہے۔ کل جو کچھ گزری ہے میں تو ابھی اُس کے عواقب کا انتظار کر رہا ہوں۔ اور تُو نے وہی کام از سر نو شروع کر دیا ہے۔

بہر حال وہ ایک مظلوم تھا جو ایک ظالم کے پیچھے میں پھنسا ہوا تھا۔ (خواہ ابتداءً اُس سے کچھ قصور ہوا ہو یا نہ ہوا ہو) اس لیے رب موسٰی کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ اُس کی مدد کریں اور اُسے اُس قبلی کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ دیں۔ لیکن جیسے ہی حضرت موسٰی نے یہ ارادہ کیا کہ اُس قبلی آدمی کو (جو اُن دونوں کا دشمن تھا) پکڑ کر اس بنی اسرائیلی سے بھڑا کریں، وہ قبلی چلا آیا، اُس نے کہا:

۱۔ "میتربق" کا مادہ "ترقب" ہے۔ اس کا معنی ہے "انتظار کرنا"۔ اس مقام پر موسٰی اُس حادثے کے نتائج کا انتظار کر رہے تھے اور جانتا پھرتے

۲۔ کہ شہر میں کیا خبر ہے۔ یہ جملہ جملہ احوال احوال ایک خبر کے بعد خبر ہے اگرچہ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ حال کے بعد حال ہے مگر یہ احتمال بہت بعید ہے۔

۳۔ "يستصيح" کا مادہ "استصراخ" ہے جس کے معنی ہیں مدد کے لیے پکارنا۔ حقیقت میں اس کے معنی شرمیلانے کے ہیں اور شور مچانا مدد مانگنے کے لیے لازم ہے۔

بالذی هو عِدُوٌّ لِّہَا قَالَ یَا مُوسٰى اترید ان تقتلنی کما قتلت نفساً بالامس۔

تیری حرکات سے تو ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ تو زمین پر ایک ظالم بن کر رہے گا اور یہ نہیں چاہتا کہ مصلحین میں سے ہو:

(ان ترید الا ان تکون جباراً فی الارض وما ترید ان تکون من المصلحین) ۱

اس جملے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسٰی نے فرعون کے عمل اور اُس کے باہر ہر دو جگہ اپنے مصلحانہ خیالات کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر اُن کے فرعون سے اختلافات بھی پیدا ہو گئے تھے۔ اسی لیے تو اُس قبلی آدمی نے یہ کہا:

۱۔ یہ کسی اصلاح طلبی ہے کہ تو ہر روز ایک آدمی کو قتل کرتا ہے؟

حالانکہ اگر حضرت موسٰی کا یہ ارادہ ہوتا کہ اُس ظالم کو بھی قتل کر دیں تو یہ بھی راہِ اصلاح میں ایک قدم ہوتا۔

بہر کیف حضرت موسٰی کو یہ احساس ہوا کہ گزشتہ روز کا واقعہ طشت از باہم ہو گیا ہے۔ اور اس خوف سے کہ اور زیادہ مشکلات پیدا نہ ہوں، اُنھوں نے اس معاملے میں دخل نہ دیا۔

اس واقعے کی فرعون اور اُس کے اہل و عیال کو اطلاع پہنچ گئی۔ اُنھوں نے حضرت موسٰی سے اس عمل کے مکرر سرزد ہونے کو اپنی شانِ سلطنت کے لیے ایک تہدید سمجھا۔ وہ باہم مشورے کے لیے جمع ہوئے اور حضرت موسٰی کے قتل کا حکم صادر کر دیا۔

اُس وقت ایک غیر متوقع واقعے نے حضرت موسٰی کو موت سے نجات بخشی۔ ہوائیوں کو ایک آدمی شہر کے ڈور دراز حصے سے (جہاں فرعون اور اُس کے اہل خانہ رہتے تھے) تیزی کے ساتھ حضرت موسٰی کے پاس آیا اور اُنھیں مطلع کیا کہ آپ کو قتل کرنے کا مشورہ ہو رہا ہے، آپ فوراً شہر سے نکل جائیں، میں آپ کا خیر خواہ ہوں: (وَجَاءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ یَسْتَفِیْ قَالَ یَا مُوسٰى اِنَّ الْمَلَاَیْمَ لَیَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ النَّاصِحِیْنَ)۔

یہ آدمی بظاہر وہی تھا جو بعد میں "مومن آل فرعون" کے نام سے مشہور ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کا نام حزقیل تھا۔ وہ فرعون کے قریبی رشتہ داروں میں سے تھا اور اُن لوگوں سے اُس کے ایسے قریبی روابط تھے کہ ایسے مشوروں میں شریک ہوتا تھا۔

اُسے فرعون کے جرائم اور اُس کی کرتوتوں سے بڑا دکھ ہوتا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ کوئی شخص اُس کے خلاف بغاوت کرے اور وہ اس کا خیر میں شریک ہو جائے۔

بظاہر وہ حضرت موسٰی سے یہ آس لگائے ہوئے تھا اور اُن کی پیشانی میں بہن جانب اللہ ایک انقلابی ہستی کی علامات دیکھ رہا تھا اسی وجہ سے جیسے ہی اُسے یہ احساس ہوا کہ حضرت موسٰی خطرے میں ہیں، نہایت شریعت سے اُن کے پاس پہنچا اور اُنھیں خطرے سے بچایا۔

ہم بعد میں دیکھیں گے کہ وہ شخص صرف اسی واقعے میں نہیں، بلکہ دیگر خطرناک مواقع پر بھی حضرت موسٰی کے لیے با اعتماد ہمدرد ثابت ہوا۔ فرعون کے عمل میں وہ بنی اسرائیل کے لیے گویا ایک دیدہ تیز بین تھا۔

۱۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ اس اسرائیلی شخص کا ٹیڈلہ ہے جس نے قتل کیا تھا۔ موسٰی نے قتل کیا ہے تاہم آیت میں ایسے اشارے موجود ہیں جو اس منہوم کی نفی کرتے ہیں۔

حضرت موسیٰ نے اس خبر کو قطعی درست سمجھا اور اس ایمان راہی کی خیر خواہی کو بہ نگاہ قدر دیکھا اور اس کی نصیحت کے مطابق شہر سے نکل گئے۔ اس وقت آپ خوف زدہ تھے اور ہر گھڑی انہیں کسی حادثے کا کھٹکا تھا؛ (فخرج منها خائفاً يترقب)۔ حضرت موسیٰ نے نہایت حضور قلب کے ساتھ متوجہ الی اللہ ہو کر اس بلا کو ٹالنے کے لیے اس کے لطف و کرم کی درخواست کی اسے میرے پروردگار! تو مجھے اس ظالم قوم سے رہائی بخش؛ (قال رب انجني من القوم الظالمين)۔ میں جانتا ہوں کہ وہ ظالم اور بے رحم ہیں۔ میں تو مظلوموں کی مدافعت کر رہا تھا اور ظالموں سے میرا کچھ تعلق نہ تھا اور جس طرح سے میں نے اپنی توانائی کے مطابق مظلوموں سے ظالموں کے شر کو دور کیا ہے تو بھی اسے خدائے بزرگ! ظالموں کے شر کو مجھ سے دور رکھ۔

حضرت موسیٰ نے پستہ ارادہ کر لیا کہ وہ شہر مدین کو چلے جائیں۔ یہ شہر شام کے جنوب اور حجاز کے شمال میں تھا اور علم و مہر اور فراغت کی حکومت میں شامل نہ تھا۔

لیکن وہ جوان بوجہ عمل کے اندر ناز و نعم میں پلا تھا۔ ایک ایسے سفر پر روانہ ہو رہا تھا جیسا کہ سفر اُسے کبھی زندگی میں پیش نہ آیا تھا۔ اُس کے پاس نہ زادراہ تھا، نہ تو شہر سفر، نہ کوئی سواری، نہ رفیق راہ اور نہ کوئی راستہ بتانے والا ہر دم یہ غمہ لاتی تھا کہ حکومت کے اہلکار بھنگ بھنج جائیں اور کپڑے قتل کر دیں اس حالت میں ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ کا کیا حال ہوگا۔

لیکن حضرت موسیٰ کے لیے یہ مقدر ہو چکا تھا کہ وہ سختی اور شدت کے دلوں کو پیچھے چھوڑ دیں اور تضرع فرمائیں انہیں جس حال میں پھنسانا چاہتا تھا اُسے توڑ کر باہر نکل آئیں اور وہ کمزور اور ستم دیدہ لوگوں کے پاس رہیں۔ اُن کے درد و غم کا بہ شدت احساس کر لیا۔ مستحضرین کے خلاف اُن کی مغفرت کے لیے حکم الہی قیام فرمائیں۔

اس طریق، بے زاد و راحلہ اور بے رفیق و رہنما سفر میں ایک عظیم سرمایہ اُن کے پاس تھا اور وہ تھا ایمان اور توکل بر خدا۔ لہذا جب وہ مدین کی طرف چلے تو کہا: خدا سے امید ہے کہ وہ مجھے راہ راست کی طرف ہدایت کرے گا؛ (ولمّا توجه تلقاهم مدین قال عسوّ ربّی ان ینھدینی سوا السبیل)۔

۲۳ - وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْتُونَ

وَوَجَدَ مِنْ دُونِهِمَا امْرَأَتَيْنِ تَذُودَانِ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا

قَالَتَا لَا نَسْتَعِي حَتَّىٰ يُصَدَرَ الرَّعَاءُ وَأَبُونَا شَيْخٌ كَبِيرٌ

۲۴ - فَسَأَلَهُمَا تَمَوُّلٌ إِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ إِنِّي لَمَّا أَنْزَلْتَ إِلَيَّ مِنَ

خَيْرٍ فَفَتِيرٌ

۲۵ - وَجَاءَتْهُ إِحْدَاهُمَا تَمَشِي عَلَىٰ اسْتِحْيَاءٍ قَالَتْ إِنَّ أَبِي يَدْعُوكَ

لِيَجْزِيَكَ أَجْرًا مَا سَقَيْتَ لَنَا فَلَمَّا جَاءَهُ وَقَصَّ عَلَيْهِ

الْقَصَصَ قَالَ لَا تَخَفْ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ

ترجمہ

۲۳ - اور جب موسیٰ مدین میں پانی (کے کنوئیں) کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ لوگ اپنے چرواہوں کو پانی پلا رہے ہیں اور اُن کے ایک طرف دو عورتیں اپنی بکریوں کو لیے کھڑی ہیں اور (کنوئیں کے نزدیک نہیں آئیں) اُن سے موسیٰ نے پوچھا تمہیں کیا مسئلہ درپیش ہے؟ اُن دونوں نے کہا کہ ہم انہیں اُس وقت تک پانی نہیں پلا سکتیں جب تک تمام چرواہے یہاں سے نکل نہ جائیں اور ہمارا والد بہت ہی بوڑھا ہے۔

۲۴ - پس موسیٰ نے اُن (بکریوں) کو پانی پلایا پھر وہ سائے کی جگہ جا بیٹھا اور کہا: پروردگار! مجھے جو بھی نعمت عطا کرے گا، میں اُس کا حاجت مند ہوں۔

۲۵ - (ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ) اُن میں سے ایک حیا اور شرم کے ساتھ چلتی ہوئی موسیٰ کے پاس آئی۔ اور کہا میرے والد تجھے بلا لیتے ہیں تاکہ تو نے جو ہماری بکریوں کو پانی پلایا تھا اُس کی تجھے اجرت دے۔ پس موسیٰ اُس کے (شعیب کے) پاس آئے، اس سے سارا ماجرا بیان کیا تو شعیب نے کہا کہ ڈرنہیں تو نے ظالموں سے نجات پالی ہے۔

تفسیر

ایک نیک عمل نے موسیٰ پر بھلائیوں کے دروازے کھول دیئے :

اس مقام پر ہم اس سرگزشت کے پانچویں حصے پر پہنچ گئے ہیں اور وہ موقع یہ ہے کہ حضرت موسیٰ شہر مدین میں پہنچ گئے ہیں۔ یہ جوان پاکباز انسان کئی روز تک تنہا چلتا رہا۔ یہ راستہ وہ تھا جو نہ کبھی اُس نے دیکھا تھا اسے طے کیا تھا۔ بعض لوگوں کے قول کے مطابق حضرت موسیٰ مجبور تھے کہ پابریہ نہ راستے طے کریں۔ بیان کیا گیا ہے کہ مسلسل آٹھ روز تک چلتے رہے۔ یہاں تک کہ چلتے چلتے ن کے پادوں میں آبلے پڑ گئے۔

جب جھوک گئی تھی تو جنگل کی گھاس اور درختوں کے پتے کھا لیتے تھے۔ ان تمام مشکلات اور زحمت میں صرف ایک خیال سے اُن کے دل کو راحت رہتی تھی کہ اُنہیں فرعون کے بیٹے ظلم سے رہائی مل گئی ہے۔

رفتہ رفتہ اُنہیں آفت میں شہر مدین کا منظر نظر آنے لگا۔ اُن کے دل میں اُس وقت کی ایک لہر اٹھنے لگی۔ وہ شہر کے قریب پہنچے۔ اُنہوں نے لوگوں کو دیکھا اور دیکھا۔ وہ خزا سمجھ گئے کہ یہ لوگ چرواہے ہیں جو اونٹوں کے پاس اپنی بیڑوں کو پانی پلانے آئے ہیں۔

جب حضرت موسیٰ ان لوگوں کے قریب آئے تو اُنہوں نے وہاں بہت سے آدمیوں کو دیکھا جو اونٹوں سے پانی بھر کے اپنے چرواہوں کو رہتے تھے۔ (ولما ورد مائتہ مدین وجد علیہ امتۃ من الناس یسقون)۔

اُنہوں نے اُس اونٹوں کے پاس دو درختوں کو دیکھا کہ وہ اپنی بیڑوں کو لیے کھڑی تھیں۔ مگر اونٹوں کے قریب نہیں آتی تھیں۔

وجد من دونہما امرأتین تذودان ۱۰

ان باعقت لڑکیوں کی حالت قابلِ رحم تھی جو ایک گوشے میں کھڑی تھیں اور کوئی آدمی بھی اُن سے انصاف نہیں کرتا تھا۔ چرواہے صرف اپنی بیڑوں کی فکر میں تھے اور کسی اور کو موقع نہیں دیتے تھے۔ حضرت موسیٰ نے ان لڑکیوں کی یہ حالت دیکھی تو اُن کے نزدیک آئے اور پوچھا :

یہاں کیسے کھڑی ہو : (قال ما خطبکما) ۱۱

تم آگے کیوں نہیں بڑھتیں اور اپنی بیڑوں کو پانی کیوں نہیں پلاتیں ؟

حضرت موسیٰ کے لیے یہ سچی کٹھنی ظلم و ستم، سبے عدالتی اور ظلموں کے حقوق کی عدم پاسداری جو اُنہوں نے شہر مدین میں دیکھی قابلِ ہتاشا تھی۔

ظلموں کو ظلم سے بچانا اُن کی فطرت تھی۔ اسی وجہ سے اُنہوں نے فرعون کے محل اور اس کی نعمتوں کو ٹھکرا دیا تھا اور وطن سے بے وطن ہو گئے تھے۔ وہ اپنی اس روشِ حیات کو ترک نہیں کر سکتے تھے اور ظلم کو دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔

لڑکیوں نے حضرت موسیٰ سے جواب میں کہا : ہم اس وقت تک اپنی بیڑوں کو پانی نہیں پلا سکتیں، جب تک تمام چرواہے اپنے

تیرا مات کو پانی پلا کر نکل نہ جائیں، ا قالت لا نستقی حتی یصدر الرعاء ۱۲

اُن لڑکیوں نے اس بات کی وضاحت کے لیے کہ ان باعقت لڑکیوں کے باپ نے اُنہیں تنہا اس کام کے لیے کیوں بھیج دیا ہے۔ یہ بھی اضافہ کیا کہ ہمارا باپ نہایت ضعیف العزبے : (والیونا شیخ حکیم)۔

ن تو اُس میں اتنی طاقت ہے کہ جیڑوں کو پانی پلا سکے اور نہ ہمارا کوئی بھائی ہے جو یہ کام کرے۔ اس خیال سے کہ کسی پر بار نہ ہوں۔ ہم خود ہی یہ کام کرتی ہیں۔

حضرت موسیٰ کو یہ باتیں سن کر بہت کوفت ہوئی اور دل میں کہا کہ یہ کیسے بے انصاف لوگ ہیں کہ اُنہیں صرف اپنی فکر سے اور کسی ظلم کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتے۔

وہ آگے آئے، بھاری ڈول اٹھایا اور اسے کونٹوں میں ڈالا۔ کہتے ہیں کہ وہ ڈول اتنا بڑا تھا کہ چند آدمی مل کر اسے کھینچ سکتے تھے۔ لیکن حضرت موسیٰ نے اپنے قوی بازوؤں سے اُسے اکیلے ہی کھینچ لیا اور اُن دونوں عورتوں کی بیڑوں کو پانی پلا دیا۔ (فخطی لہما)۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ ان لوگوں کے قریب آئے اور لوگوں کو ایک طرف کیا تو اُن سے کہا : "تم کیسے لوگ ہو کہ اپنے سوا کسی اور کی پرواہ ہی نہیں کرتے" !

یہ سن کر لوگ ایک طرف ہٹ گئے اور ڈول حضرت موسیٰ کے حوالے کر کے بولے :

"یٰحییٰ، بسم اللہ، اگر آپ پانی کھینچ سکتے ہیں، اُنہوں نے حضرت موسیٰ کو تنہا چھوڑ دیا۔ لیکن حضرت موسیٰ اس وقت اگرچہ تھکے ہوئے تھے اور اُنہیں جھوک لگ رہی تھی مگر قوتِ ایمانی اُن کی مددگار ہوئی، جس نے اُن کی جمالی قوت میں اضافہ کر دیا اور کونٹوں سے ایک ہی ڈول کھینچ کر اُن دونوں عورتوں کی بیڑوں کو پانی پلا دیا۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ سائے میں آ بیٹھے۔ اور بارگاہِ ایزدی میں عرض کرنے لگے : خداوند ! تو مجھے جو بھی خیر اور نیکی بخشے، میں اس کا محتاج ہوں : (تسوتولی الی الظل فقال ربتی لہا انزلت الی من خیر فقیہ)۔

حضرت موسیٰ (اس وقت) تھکے ہوئے اور بھوکے تھے۔ اُس شہر میں اجنبی اور تنہا تھے اور اُن کے لیے کوئی سر چھپانے کی جگہ بھی نہ تھی۔ مگر بھی وہ بے قرار نہ تھے۔ آپ کا نفس ایسا مطمئن تھا کہ دعا کے وقت بھی یہ نہیں کہا کہ "خدا یا تو میرے لیے ایسا یادگار کر" بلکہ یہ کہا کہ : "تو جو خیر بھی مجھے بخشے میں اُس کا محتاج ہوں"۔

یعنی صرف اپنی احتیاج اور نیاز کو عرض کرتے ہیں اور باقی امور الطافِ خداوندی پر چھوڑ دیتے ہیں۔

لیکن — دیکھو کہ کار خیر کیا قدرت نمائی کرتا ہے اور اس میں کتنی عجیب برکات ہیں صرف لوجه اللہ ایک قدم اٹھانے اور ایک آنا مشا ظلم کی حمایت میں کونٹوں سے پانی کے ایک ڈول کھینچنے سے حضرت موسیٰ کی زندگی میں ایک نیا باب کھل گیا اور یہاں خیر اُن کے لیے برکاتِ ماقوی اور روحانی کی ایک دُنیا بطور تحفہ لایا۔ اور وہ ناپیدا نعمت (جس کے حصول کے لیے اُنہیں برسوں کوشش کرنا پڑتی) اللہ نے اُنہیں بے خبر ہی

۱۰ "یصدر" مشتق ہے "صدر" سے اس کے معنی ہیں "خارج ہونا" اور

۱۱ "رعاء" جمع "رعی" کی بمعنی چرواہا۔

حضرت موسیٰ کے لیے اس خوش نصیبی کا دور اس وقت شروع ہوا جب انھوں نے یہ دیکھا کہ ان دونوں بسوں میں سے ایک نہایت حیا سے قدم اٹھاتی ہوئی آ رہی ہے۔ اس کی وضع سے ظاہر تھا کہ اسے ایک جوان سے باتیں کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ وہ لڑکی حضرت موسیٰ کے قریب آئی اور صرف ایک جملہ کہا: میرے والد صاحب آپ کو بلا تے ہیں تاکہ آپ نے ہماری بکریوں کے لیے کنویں سے جو پانی کھینچا تھا، اس کا معاوضہ دیں: (فجالتہ احدھا ماتشی علی استحياء قالت ان ابی یدعوک لیجزيک اجر ما سئیت لنا)۔

یہ سن کر حضرت موسیٰ کے دل میں امید کی بجلی چمکی۔ گویا انھیں یہ اوراگ ہوا کہ ان کے لیے ایک عظیم خوش نصیبی کے اسباب فراہم ہو رہے ہیں۔ وہ ایک بزرگ انسان سے ملیں گے۔ وہ ایک ایسا حق شناس انسان معلوم ہوتا ہے جو یہ بات پسند نہیں کرتا کہ انسان کی کسی نعمت کا یہاں تک کہ پانی کے ایک ڈول کھینچنے کا بھی معاوضہ نہ دے۔ یہ ضرور کوئی ملکوتی اور الہی انسان ہو گا۔ یا اللہ! یہ کیسا عجیب اور نادر واقعہ ہے! بیشک وہ بیبر مرد و حضرت شعیب پیغمبر تھے۔ انہوں نے برسوں تک اس شہر کے لوگوں کو رجوع الی اللہ کی دعوت دی تھی۔ وہ حق پرستی اور حق شناسی کا نمونہ تھے۔

جب حضرت شعیب نے یہ دیکھا کہ آج میری لڑکیاں ہر روز کے معمول سے قبل گھراگئی ہیں تو انھوں نے لڑکیوں سے اس کا سبب پوچھا۔ جب انھیں گل واقعے کا علم ہوا تو انھوں نے تمہیں کہہ دیا کہ اس اجنبی جوان کو اپنے دین کی تبلیغ کریں گے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ اس جگہ سے حضرت شعیب کے مکان کی طرف روانہ ہوئے۔

بعض روایات کے مطابق وہ لڑکی رہنمائی کے لیے ان کے آگے آگے چل رہی تھی اور حضرت موسیٰ اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ اس وقت تیز ہوا سے اس لڑکی کا لباس اڑ رہا تھا اور ممکن تھا کہ ہوا کی تیزی لباس کو اس کے جسم سے اٹھا دے۔ حضرت موسیٰ کی پاکیزہ طبیعت اس منظر کو دیکھنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اس لیے انھوں نے لڑکی سے کہا کہ میں آگے آگے چلتا ہوں۔ تم کسی دور لہے یا چند راہے پر مجھے راستہ بتاؤ۔ چنانچہ حضرت موسیٰ، حضرت شعیب کے گھر پہنچ گئے۔ ایسا گھر جس سے فخر و عزت ساطع تھا اور اس کے ہر گوشے سے روحانیت نمایاں تھی انھوں نے دیکھا کہ ایک بیبر مرد، جس کے بال سفید ہیں ایک گوشے میں بیٹھا ہے۔ اس نے حضرت موسیٰ کو خوش آمدید کہا۔ اور پوچھا:

”تم کون ہو؟ کہاں سے آ رہے ہو؟ کیا کرتے ہو؟ اس شہر میں کیا کرتے ہو؟ اور آنے کا مقصد کیا ہے؟ تمہا کیوں ہو؟“

حضرت موسیٰ نے حضرت شعیب کو اپنی پوری داستان سنائی۔

قرآن کے الفاظ یہ ہیں کہ جب موسیٰ حضرت شعیب کے پاس پہنچے اور انھیں اپنی سرگزشت سنائی تو حضرت شعیب نے کہا مت ڈرو تمہیں ظالموں کے گروہ سے نجات مل گئی ہے۔ (فلماجلہ و قصص علیہ القصص قال لا تخف نجوت من القوم الظالمین)۔

ہماری سرزمین ان کی حدود سلطنت سے باہر ہے۔ یہاں ان کا کوئی اختیار نہیں چلتا۔ اپنے دل میں ذرہ بھر پریشانی کو رکھ نہ دینا۔ تم اس زمانہ سے بچ گئے ہو۔ مسافرت اور تنہائی کا بھی علم نہ کرو۔ یہ تمام مشکلات خدا کے رحم سے دور ہو جائیں گی۔

حضرت موسیٰ ذرا کھنگھڑا کر انھیں ایک عالی مرتبہ استاد مل گیا ہے، جس کے دُور سے روحانیت، تقویٰ، معرفت اور زلال عظیم کے چشمے

پیوٹ رہے ہیں اور یہ استاد ان کی تشنگی تحصیل علم و معرفت کو سیراب کر سکتا ہے۔

حضرت شعیب نے بھی یہ سمجھ لیا کہ انھیں ایک لائق اور مستعد شاگرد مل گیا ہے، جسے وہ اپنے علم و دانش اور زندگی بھر کے تجربات سے فیض پہنچا کر سکتے ہیں۔

یہ مسلم ہے کہ ایک شاگرد کو جس قدر ایک بزرگ اور قابل استاد یا کرہتی مستر ہوتی ہے، استاد کو بھی ایک لائق شاگرد پا کر اتنی ہی خوشی ہوتی ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ مدین کہاں تھا؟ ”مدین“ ایک شہر کا نام تھا جس میں حضرت شعیب اور ان کا قبیلہ رہتا تھا۔ یہ شہر خلیج عقبہ کے مشرق میں تھا (یعنی حجاز کے شمال اور شامات کے جنوب میں) وہاں کے باشندے حضرت اسماعیل کی نسل سے تھے۔ وہ مصر، لبنان اور فلسطین سے تجارت کرتے تھے۔ آج کل اس شہر کا نام ممان ہے۔

بعض لوگ کلمہ ”مدین“ کا اطلاق اس قوم پر کرتے ہیں جو خلیج عقبہ سے کہ سینا تک سکونت پذیر تھی۔ تو ریت میں بھی اس قوم کو مدینا کہا گیا ہے۔

بعض اہل تحقیق نے اس شہر کی وجہ تسمیہ یہ لکھی ہے کہ حضرت ابراہیم کا ایک بیٹا جس کا نام ”مدین“ تھا اس شہر میں رہتا تھا۔ اگر جغرافیائی نقشے کو غور سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کا حصے کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہے اس لیے حضرت موسیٰ چند روز میں وہاں پہنچ گئے ہوں گے۔

ملک اردن کے جغرافیائی نقشے میں، جنوب غربی شہروں میں سے ایک شہر ”ممان“ نام کا ملتا ہے، جس کا محل وقوع ہمارے مذکورہ بالا بیان کے مطابق ہے۔

۲۔ بہت سی سبق آموز باتیں: حضرت موسیٰ کی سرگزشت کے اس حصے میں کثرت سبق آموز باتیں ہیں:

(ا)۔ بیبران خدا ہمیشہ مظلوموں کے حامی رہے ہیں۔ حضرت موسیٰ اس زمانے میں بھی جبکہ وہ مصر میں تھے اور اس وقت بھی جبکہ وہ مدین میں آگئے، عرض جہاں بھی وہ ظلم و ستم کا منظر دیکھتے تھے بے چین ہو جاتے تھے۔ ان کا یہ عمل عین حق تھا کیونکہ بکثرت انبیاء سے خدا کا ایک مقصد یہ بھی ہے۔

(ب)۔ بعض اوقات انسان کا معمولی سا عمل خیر کتنا بڑی برکت ثابت ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ نے کنویں سے پانی کا صرف ایک ڈول کھینچا۔ اس عمل سے ان کا مقصد رضائے الہی کے حصول کے علاوہ کچھ نہ تھا لیکن یہ چھوٹا سا کام کس قدر بڑی برکت ثابت ہوا! کیونکہ یہی عمل خیر اس امر کا سبب ہوا کہ وہ پیغمبر خدا حضرت شعیب کے مکان پر پہنچ گئے۔ انھیں احساس مسافرت سے نجات ملی اور ایک اطمینان بخش پناہ گاہ مل گئی۔ انھیں خدا، لباس اور ایک پاکدامن زوجہ بھی نصیب ہوئی۔ علاوہ بریں افضل ترین نعمت نصیب ہوئی کہ وہ دس سال کی مدت تک

نرت شعیب جیسے پیر روشن ضمیر کے انسان ساز مکتب تربیت میں رہ کر فلون کی رہبری کے لیے تیار ہو گئے۔

(ج) مردان خدا کسی کی خدمت کو بھی بالخصوص مزدوروں کی خدمت کو بیے اجرو بے معاوضہ نہیں رہنے دیتے۔ اسی وجہ سے جب نرت شعیب نے اس اجنبی جوان کے متعلق سنا کہ اس نے میری بھیڑوں کو پانی پلایا ہے تو جین سے نہ بیٹھے۔ فوراً اپنی بیٹی کو اس کی تلاش نہ بھیجا تاکہ اس کی مزدوری ادا کریں۔

(د) حضرت موسیٰ کی زندگی میں یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ وہ ہمیشہ باوجود خدا میں مشغول رہتے تھے اور ہر مشکل کے حل کے لیے اسی سے عا کرتے تھے۔

جس وقت ایک قبلی ان کے ہاتھ سے مارا گیا اور ترک اولیٰ سرزد ہوا تو انھوں نے خدا سے فرما عفو اور مغفرت کی دعا کی:

قَالَ رَبِّ انْفِ ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي

خدا یا میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے تجھے معاف کر دے۔

اور جس وقت وہ ملک مصر سے باہر آئے تو دعا کی:

قَالَ رَبِّ بَخْتِ مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ

خدا یا تجھے اس سنگار قوم سے نجات دے۔

اور جس وقت وہ شہر مدین کی طرف روانہ ہوئے تو متوجہ الی اللہ ہو کر کہا:

قَالَ عَلِيُّ رَبِّ انْ يَهْدِنِي سُبُلَ السَّبِيلِ

مجھے اُسید ہے کہ خدا مجھے راہ راست کی ہدایت کرے گا۔

اور جس وقت حضرت شعیب کی بھیڑوں کو سیراب کیا اور سائے میں آرام کرنے گئے تو خدا سے عرض کیا:

فَقَالَ رَبِّ انْفِ لِمَا انْزَلْتَ الِي مِنْ خَيْرٍ فَاقْبَلْ

اے پروردگار تجھے جو بھی نعمت عطا کرے گا میں اس کا محتاج ہوں۔

خصوصاً یہ آخری دعا جو انھوں نے زندگی کے بھاری ترین وقت میں مانگی، نہایت متوجہانہ، پراطمینان اور سکون آمیز تھی۔ انھوں نے یہ نہیں مانا کہ خدا یا میری حاجات کو رد فرما۔ بلکہ صرف یہ کہا کہ "میں تیرے احسان اور خیر کا محتاج ہوں۔"

(س) یہ خیال نہ کیا جائے کہ حضرت موسیٰ صرف سختی کے وقت ہی خدا کو یاد کرتے تھے بلکہ تھوڑے دنوں میں بھی جبکہ ان کا وقت رونق میں گزر رہا تھا وہ خدا کو نہ بھولے۔ ہم روایات میں پڑھتے ہیں کہ ایک روز فرعون کے سامنے انھیں جھیک آگئی۔ تو انھوں نے فرما الحمد للہ رب العالمین۔ کہا۔ فرعون یہ بات سن کر ناراض ہو گیا اور ان کے ایک ہتھیار مارا۔ حضرت موسیٰ نے بھی جواب میں اس کی لمبی داڑھی پکڑ کر کہنے لگے کہ اس پر سخت غصہ آیا اور انھیں تھل کرنے کا ارادہ کر لیا مگر اس کی بیوی نے انھیں یہ کہہ کر بچالیا کہ یہ ابھی پتہ ہے اُسے ابھی کیا پیرتا ہے۔

۲۶ - قَالَتْ اِحْدُهُمَا يَا بَتِ اسْتَا جِرُهُ اِنْ خَيْرٍ مِّنْ اسْتَا جِرَتْ الْقَوِيَّ الْاَمِينُ

۲۷ - قَالَ اِنِّي اُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتِي هَتَيْنِ عَلٰى اَنْ تَلْجُرِي نَمْنِي حِجْجًا ۚ فَاِنْ اَتَمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَمَا اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ ۚ سَتَجِدُنِي اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ

۲۸ - قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ ۚ اَيُّمَا الْاَجْلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُولُ وَكِيلٌ

ترجمہ

۲۶ - اُن دو لڑکیوں میں سے ایک نے کہا کہ اے ابا جان آپ اسے ملازم رکھ لیجئے۔ کیونکہ بہترین ملازم جو آپ رکھ سکیں اسے توانا اور امین ہونا چاہیئے۔

۲۷ - (شعیب نے موسیٰ سے) کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنی دو بیٹیوں میں سے ایک کا تم سے نکاح کروں۔ اس شرط پر کہ تم آٹھ سال تک میری خدمت کرو اور اگر دس سال پورے کرو تو وہ تمہاری طرف سے احسان ہے۔ میں تم سے کوئی سخت کام لینا نہیں چاہتا۔ ان شاء اللہ مجھے صالحین میں سے پاؤ گے۔

۲۸ - (موسیٰ نے) کہا (کوئی عرج نہیں۔ البتہ میرے اور تمہارے درمیان یہ عہد ہے کہ میں ان مدتوں میں سے جو موسیٰ بھی میں تمام کروں، مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہوگی (اور اس انتخاب مدت میں میں آزاد ہوں گا) اور ہم جو معاہدہ کرے ہیں، خدا اُس پر گواہ ہے۔

تفسیر

حضرت موسیٰ حضرت شعیب کے گھر میں:

اب حضرت موسیٰ کی زندگی کے چھٹے دور کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ جناب شعیب کے گھر آئے۔ یہ ایک سادہ سادہ مادیاتی مکان تھا، مکان صاف ستھرا تھا اور روحانیت سے معمور تھا۔ جب حضرت موسیٰ نے جناب شعیب کو اپنی سرگذشت سنانی تو ان کی ایک لڑکی

ایک منقرض محو پڑھنی عبارت میں اپنے والد کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ موٹی کوبھیڑوں کی حفاظت کے لیے ملازم رکھ لیں۔ وہ الفاظ یہ تھے :
اسے بابا ! آپ اس جوان کو ملازم رکھ لیں۔ کیونکہ ایک بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھ سکتے ہیں، وہ ایسا ہونا چاہیے جو قوی اور
نہ ہر اور اس نے اپنی طاقت اور نیک نسلت دونوں کا امتحان دے دیا ہے : (قالت لحدھا ما یا بابت استأجره ان خیر
ن استأجرت القوی الامین)۔

جس لڑکی نے ایک پیغمبر کے زیر سایہ تربیت پائی ہو اسے ایسی ہی نوبانہ اور سوچ سمجھی بات کہنی چاہیے نیز جیسے کہ مختصر الفاظ اور تھوڑی
عبارت میں اپنا مطلب ادا کر دے۔

اس لڑکی کو کیسے معلوم تھا کہ یہ جوان طاقتور بھی ہے اور نیک نسلت بھی۔ کیونکہ اس نے پہلی بار کنوئیں پر ہی اسے دیکھا تھا اور اس کی
شہ زنگی کے حالات سے وہ بے خبر تھی ؟

اس سوال کا جواب واضح ہے۔ اس لڑکی نے اس جوان کی قوت کو تو اسی وقت سمجھ لیا تھا جب اس نے ان مظلوم لڑکیوں کا تھلا لے
لیے پورا ہوں کر کنوئیں سے ایک طرف ہٹایا تھا۔ اور اس بھاری ڈول کو اکیلے ہی کنوئیں سے کھینچ لیا تھا اور اس کی امانت اور نیک چلنی
وقت معلوم ہو گئی تھی کہ حضرت شعیب کے گھر کی لہ میں اس نے یہ گوارا نہ کیا کہ ایک جوان لڑکی اس کے آگے آگے چلے۔ کیونکہ ممکن تھا کہ
ہو اسے اس کا لباس جسم سے ہٹ جائے۔

علاوہ بریں اس نوجوان نے اپنی جو سرگزشت سنا ہی تھی اس کے ضمن میں قبیلوں سے لڑائی کے ذکر میں اس کی قوت کا حال معلوم ہو گیا تھا۔
اس کی امانت و دیانت کی یہ شہادت کافی تھی کہ اس نے ظالموں کی ہم نوائی نہ کی اور ان کی ستم رانی پر اظہارِ رضامندی نہ کیا۔

حضرت شعیب نے اپنی بیٹی کی تجویز کو قبول کر لیا۔ انھوں نے موٹی کی طرف رخ کر کے یوں کہا : سیرا الزوہ ہے کہ اپنی ان دو لڑکیوں
سے ایک کا تیرے ساتھ نکاح کر دوں۔ اس شرط کے ساتھ کہ تو آٹھ سال تک میری خدمت کرے : (قال انی ارید ان
کحک احدی ابنتی ہاتین علی ان تأجرنی ثمنی حجج یرک)

اس کے بعد یہ اضافہ کیا : " اگر تو آٹھ سال کی بجائے یہ خدمت دس سال کر دے تو یہ تیرا احسان ہوگا۔ مگر تجھ پر واجب نہیں ہے :
ان اتمت عشرًا فمن عندک)۔

بہر حال میں یہ نہیں چاہتا کہ تم سے کوئی مشکل کام لوں۔ ان شاء اللہ تم جلد دیکھو گے کہ میں صالحین میں سے ہوں، اپنے عہد و پیمان میں
ارہوں۔ تیرے ساتھ ہرگز سخت گیری نہ کروں گا اور تیرے ساتھ خیر اور نیکی کا سلوک کروں گا : (وما ارید ان اشق علیک سجدتی
شاء اللہ من الصالحین)۔

علی بن ابیہم کی تفسیر میں یہ روایت نقل ہوئی ہے کہ جب حضرت شعیب نے اپنی بیٹی سے یہ سوال کیا کہ اس جوان کی قوت کا حال تو کنوئیں سے
بلا ڈول کیسے سمجھنے سے معلوم ہو گیا، تب اس کی امانت کا حال کیسے معلوم ہوا تو لڑکی نے جواب دیا کہ اس نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ عہدہ کی کر پر بھی نگاہ
ٹالے۔ (تفسیر ذراشتین، ج ۲ ص ۱۳۳)

حجج، حج "حجہ" کی جو کہ سن میں ایک سال "مرفوں کا عمل ہے تاکہ ہر سال کے بعد ایک حج کستے۔ یہ رسم حضرت ابراہیم کے وقت سے چلی آئی تھی۔

حضرت شعیب کی طرف سے اس تجویز کے ضمن میں، ازدواج، ہر اور اس کی جملہ خصوصیات کے متعلق بہت سے سوالات پیدا
ہوتے ہیں، جن پر ان شاء اللہ نکات کے ضمن میں بحث ہوگی۔

حضرت موٹی نے اس تجویز اور شرط سے موافقت کرتے ہوئے اور عند کو قبول کرتے ہوئے کہا : " میرے اور آپ کے درمیان
یہ عہد ہے : (قال ذلک بینی و بینک)۔

البتہ ان دونوں میں سے (آٹھ سال یا دس سال) جس مدت تک بھی خدمت کر دوں، مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہوگی اور میں اس کے انتخاب
میں آزاد ہوں : (ایما الاجلین قضیت فلا عدوان علی)۔

عہد کو پختہ اور خدا کے نام سے طلب مدد کے لیے یہ اضافہ کیا : جو کچھ ہم کہتے ہیں خدا اس پر شاہد ہے : (واللہ علی ما
نفعل وکیل)۔

چند اہم نکات

۱۔ ادارت کار کی دستی کے لیے دو بنیادی شرائط : آیات مذکورہ بالا میں 'حضرت موٹی' کو ملازم رکھنے کے
بارے میں، حضرت شعیب کی دختر کی زبان سے جو الفاظ ادا ہوئے ہیں، ان میں کسی کام کو ذمہ داری کے ساتھ ادا کرنے کے لیے دو اہم ترین
شرائط نہایت مختصر اور جامع صورت میں بیان ہوئی ہیں۔ اور وہ ہیں " قدرت اور امانت "۔

یہ امر بدیہی ہے کہ قدرت سے مراد صرف جسمانی قوت ہی نہیں ہے، بلکہ اس میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ انسان میں جو کلام
کو سر انجام دینے کی استعداد ہو۔ مثلاً ایک قوی اور امین طبیب وہ ہے جو اپنے کام سے آگاہ اور اس پر حاوی ہو۔

ایک قوی سربراہ ادارہ وہ ہے جو اپنے فرائض منصبی سے خوب واقف ہو، دفتری کام کے مقاصد سے باخبر ہو، ترتیب کار کا
پرگرام بنانے میں ماہر ہو، اس میں بقدر کافی ایجاد و اختراع کی قابلیت ہو، کام کو منظم کرنے کی مہارت رکھتا ہو، اس کے ذہن میں غایت کار
واضح ہو اور اپنی تمام طاقتوں کو مقصد تک پہنچانے کے لیے استعمال میں لائے۔ ان تمام خصوصیات کے باوجود وہ ہمدرد، خیر خواہ، امین اور
اپنے کام میں دیانتدار بھی ہو۔

وہ لوگ جو کسی کو کوئی ذمہ داری سپرد کرتے وقت صرف اس کی امانت اور درست کرداری پر قناعت کر لیتے ہیں وہ بھی اسی طرح غلطی
میں ہیں جیسے کہ وہ لوگ جو کسی کی مہارت خصوصی دیکھ کر اس پر بھروسہ کر لیتے ہیں۔

خائن ماہرین خصوصی اور بد دیانت واقفان کار ویسا ہی نقصان پہنچاتے ہیں جیسا کہ نا اہل اور نادان واقفان کار ایسا نادر لوگ۔
اگر ہم کسی ملک کو برباد کرنا چاہتے ہیں تو اس کے انتظامی فرائض کو مذکورہ بالا گروہوں میں سے کسی ایک کے سپرد کر دینا چاہیے۔ سربراہ ادارہ

خائن ہو اور مصالح کار کے گروں کو ذمہ داریوں سے محروم رکھا جائے۔ نتیجہ دونوں حالتوں میں ایک ہے۔

اسلامی مصالح کا تقاضا یہ ہے کہ ہر کام اس کے اہل اور امانت دار آدمی کے ہاتھ میں ہو تاکہ معاشرے کا نظام درست رہے مگر
ہم لہری تاریخ میں حکومتوں کے زوال کے اسباب پر غور کریں تو ان کی بنیادی علت یہی پائیں گے کہ کاروبار سلطنت مذکورہ بالا دو گروہوں میں سے

یہ ایک کے سپرد کر دیا گیا تھا۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ اسلام میں اہلیت کار کی خصوصیات میں ہر جگہ "علم اور تقویٰ" کو ہم دوش لازم قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً تاریخ کو مجتہد اور عادل ہونا چاہیے۔ قاضی اور رہنمائے قوم کو مجتہد اور عادل ہونا چاہیے (ان شرائط کے علاوہ کچھ اور بھی شرائط ہیں، مگر بنیادی شرائط ہی دونوں میں یعنی "عدالت و تقویٰ اور علم و انگی")۔

۲۔ حضرت شعیب کا حضرت موسیٰ کے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح : مذکورہ بالا آیات کو پڑھ کر ذہن میں متعدد سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ہم جن کے بے کم و کاست جوابات دیتے ہیں۔

۱۔ کیا فقہی اعتبار سے یہ درست ہے کہ وہ لڑکی جس کا کسی کے ساتھ نکاح کرنا ہے اس کا ما قبل تعیین نہ ہو۔ بلکہ صیغہ عقد کے اجزائے وقت کہا جائے کہ :-

"میں ان دو لڑکیوں میں سے ایک کا تیرے ساتھ نکاح کرتا ہوں۔"

جواب : یہ ہے کہ یہ واضح نہیں ہے کہ مذکورہ الفاظ اجزائے صیغہ کے وقت کہے گئے ہوں گے۔ بلکہ سیاق عبارت سے ایسا مفہوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی گفتگو ہے، جسے اصطلاح میں "مقاولہ" کہتے ہیں تاکہ موسیٰ کی رضامندی کے بعد طرفین ایک دوسرے کو انتخاب کر لیں۔ پھر صیغہ عقد جاری ہو جائے۔

ب۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ہر کوئی غیر طے شدہ حالت میں یا کم اور زیادہ کے درمیان مشکوک حالت میں رکھا جائے۔
جواب : آیت کے لب و لہجے سے یہ امر قطعی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت شعیب نے ہر آٹھ سال کی خدمت طے کی تھی۔ اُسے سب سال تک بڑھا دینا حضرت موسیٰ کی مرضی پر منحصر تھا۔

ج۔ کیا اصولاً کام اور خدمت کو مقرر دیا جاسکتا ہے۔ نیز لڑی عورت سے ہم بستری کیسے ہو سکتی ہے جبکہ ابھی اس کا تمام مہر ادا کرنے کا وقت ہی نہیں آیا جتنی کہ شوہر کی اتنی بضاعت ہی نہیں ہے کہ کل مہر یکشت ادا کر دے۔

جواب : ایسے مہر کے صدم جواز پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ ہماری شریعت میں ہر وہ شئی جس کی کچھ قیمت ہو اُس پر مہر کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ شوہر کے لیے یہ بھی لازم نہیں کہ وہ کل مہر یک وقت ادا کر دے۔ اتنا ہی کافی ہے کہ حق مہر ادا کرنے کا شوہر ذمہ دار ہو اور بیوی اس کی مالک ہو جائے۔ شوہر کی ذمہ داری صحت اور اُس کا اپنی بیوی کی رفاقت میں رہنا بھی اس امر کی دلیل ہوتا ہے کہ وہ زندہ رہے گا اور اُس میں اتنی قدرت ہوگی کہ وہ حق مہر ادا کر سکے گا۔

د۔ یہ بات اصولاً کس طرح ممکن ہے کہ باپ کی خدمت بیٹی کا حق مہر قرار دیا جاسکے۔ کیا بیٹی بھی کوئی متاع ہے جسے حق خدمت کے عوض فروخت کر دیا جائے۔

۱۔ جواب شریعت اسلامی کی روشنی میں دیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شریعت ابراہیمی میں (جو حضرت موسیٰ سے قبل رائج تھی) حق مہر کی شرائط کچھ اور ہوں۔

۲۔ مہر مطلق یعنی شہداء اسلام میں کہتے ہیں۔ آزاد شخص کی نعمت پر عقد صحیح ہے مثلاً بطور مہر کوئی منعت سکھا دے یا قرآن کی کوئی سورۃ پڑھا دے اور جلال عمل پادار شوہر کو عین خدمت کیلئے اجیر بنانے پر۔ اور مہر مقررہ دیگر اہل صاحب جواہر اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ عملہ مشورہ اس رائے سے متفق ہیں۔

جواب : اس میں شک نہیں کہ حضرت شعیب نے اس مسئلے میں اپنی بیٹی کی رضامندی حاصل کر لی تھی اور وہ اس قسم کے عقد کو جاری کرنے کے لیے وکیل تھے۔

اس مسئلے کی ایک اور توجیہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضرت موسیٰ کے ذمہ جو مہر تھا حقیقت میں اُس کی اصل مالک حضرت شعیب کی لڑکی ہی تھی مگر چونکہ خاندان شکرہ اور اُن کی زندگی نہایت خلوص اور محبت سے گزرتی تھی، آپس میں کسی قسم کا اختلاف نہ تھا (جیسا کہ اب بھی قریبی خاندانوں یا دیہات میں دیکھا جاتا ہے کہ گھر کے تمام افراد مل جمل کر رہتے ہیں) اس لیے وہاں یہ سوال پیدا نہیں ہو سکتا تھا کہ حق مہر کون لے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مہر کی مالک صرف لڑکی ہی ہے نہ کہ باپ اور حضرت موسیٰ کی خدمت بھی لڑکی ہی کے لیے تھی۔

۵۔ حضرت شعیب کی دختر کا مہر نہایت بہت زیادہ تھا۔ اگر آج کے حساب سے ایک مزدور کی مزدوری کا ایک ماہ اور پھر ایک سال میں حساب کریں اور پھر اس کو آٹھ سے ضرب دیں تو بہت ساری رقم بن جاتی ہے۔

جواب : اذیل تو یہ کہ یہ ازدواج کوئی معمولی رسم نہ تھی بلکہ موسیٰ کا حضرت شعیب کے زیر تربیت رہنے کے لیے اسباب اولیٰ میں سے تھا اور یہ ایک ذریعہ تھا جس سے موسیٰ حضرت شعیب کے دالاعلم میں رہ کر نصاب تعلیم کو پورا کریں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس طویل مدت میں موسیٰ نے پیر مدین سے کیا کچھ حاصل کیا۔

علاوہ بریں اگر حضرت موسیٰ اس مدت میں حضرت شعیب ہی کے لیے کام کرتے اور اُس کے عوض میں حضرت شعیب موسیٰ اور اُن کی زوجہ کے کنیل رہتے تو انھوں نے موسیٰ اور اُن کی اہلیہ پر جو کچھ کیا اُسے کام کی مزدوری میں سے نفی کریں تو کچھ زیادہ رقم باقی نہ رہے گی اور پھر مہر بہت خفیف رہ جائے گا۔

۳۔ ایک مروجہ رسم کی نفی : اس داستان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آج کل جو ہمارے معاشرے میں باپ یا لڑکی کے دائرہ میں کی طرف سے لڑکے کو پیام دینا عیب سمجھا جاتا ہے، درست نہیں ہے۔ اس میں کوئی شرع مانع نہیں ہے کہ لڑکی دلے اگر کسی لڑکے کو لائق اور قابل سمجھتے ہیں تو اُسے پیغام دے دیں۔ جیسا کہ حضرت شعیب نے کیا۔ نیز بزرگان اسلام کے حالات زندگی میں بھی ایسی نظریات تھے۔

حضرت شعیب کی لڑکیوں کا نام "صغورہ" (یا صغورا) اور "کتیا" بتایا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ کی شادی "صغورہ" سے ہوئی تھی۔

ترجمہ

- ۲۹- جب موسیٰ نے مدت پوری کر دی اور اپنے خاندان کے ساتھ (میدین سے مصر کی طرف) روانہ ہوا تو اس نے طور کی طرف سے آگ دیکھی۔ اُس نے اپنے گھر والوں سے کہا۔ تم یہاں ٹھہرو، میں نے آگ دیکھی ہے۔ شاید میں وہاں سے تمہارے لیے کچھ خبر لاؤں یا آگ کا کوئی انگارالے آؤں تاکہ تم اس سے گرم ہو جاؤ۔
- ۳۰- جب اُس کے پاس پہنچا تو ناگہاں میدان کے واہنے کنارے سے اُس بابرکت و بلند زمین میں ایک درخت میں سے آواز آئی۔ "اے موسیٰ! میں اللہ رب العالمین ہوں۔"
- ۳۱- تو اپنی لاشعی کو ڈال دے۔ (جب موسیٰ نے عصا کو ڈال دیا تو) دیکھا کہ وہ سانپ کی طرح تیزی سے حرکت کر رہی ہے۔ موسیٰ کو خوف ہوا اور وہ رخ موڑ کر چل پڑا اور پھر منہ پھیر کے بھی نہ دیکھا (آواز آئی) اے موسیٰ! واپس آ اور نہ ڈر تو ایمان میں ہے۔
- ۳۲- اپنا ہاتھ گریبان میں ڈال۔ تو جب تو اسے نکالے گا، وہ بغیر کسی عیب کے سفید اور چمکدار ہوگا۔ اپنے ہاتھوں کو اپنے سینے پر رکھ تاکہ خوف تجھ سے دور ہو۔ اور خدا کی طرف سے یہ دو روشن دلیلیں فرعون اور اُس کے ساتھیوں کے مقابلے کے لیے ہیں کیونکہ وہ سب فاسق ہیں۔
- ۳۳- موسیٰ نے عرض کیا میں نے اُن میں سے ایک فرد کو قتل کیا ہے مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔
- ۳۴- میرا بھائی ہارون اُس کی زبان مجھ سے زیادہ فصیح ہے تو اُسے میرے ساتھ بھیج تاکہ میری تصدیق کرے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ لوگ میری تکذیب کریں گے۔
- ۳۵- (خدا نے فرمایا) ہم تیرے بازوؤں کو تیرے بھائی کے ویسے سے مضبوط کریں گے اور تمہیں غلبہ اور برتری عطا کریں گے اور ہماری نشانوں کی برکت سے وہ تم پر غالب نہ ہو سکیں گے۔ تم اور تمہاری پیروی کرنے والے غالب رہیں گے۔

تفسیر

وحی کی تابشِ اول:

اس مقام پر اس داستان کا ساتواں منظر ہمارے پیش نظر ہے۔

کوئی آدمی بھی حقیقتاً یہ نہیں جانتا کہ ان دس سال میں حضرت موسیٰ پر کیا گزری۔ لیکن بلاشبہ یہ دس سال حضرت موسیٰ کی زندگی کے بہترین سال تھے۔ یہ سال دلچسپ، شیریں اور آرام بخش تھے نیز یہ دس سال ایک منصبِ عظیم کی ذمہ داری کے لیے تربیت اور تیاری کے تھے۔ درحقیقت اس کی ضرورت بھی تھی کہ موسیٰ دس سال کا عرصہ عالمِ مسافرت اور ایک بزرگ پیغمبر کی صحبت میں بسر کریں اور جو وہ ہے کام

۲- فَلَمَّا قَضَىٰ مُوسَىٰ الْأَجَلَ وَسَارَ بِأَهْلِهِ النَّسْمِ جَانِبِ الطُّورِ نَارًا قَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوا إِنِّي آنست نَارًا أَلْعَلِّي آتِيكُمْ مِنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ جَذْوَةٍ مِنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ ۝

۳- فَلَمَّا آتَاهَا نُودِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْأَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبْرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ أَنْ يُّمُوسَىٰ إِنِّي أَنَا اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ۝

۴- وَإِنَّ أَلْتِ عَصَاكَ فَلَمَّا رَأَاهَا تَهْتَزُّ كَأَنَّهَا جَانٌ وَلَّىٰ مُدْبِرًا وَلَمْ يُعَقِّبْ ۚ يُّمُوسَىٰ أَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ إِنَّكَ مِنَ الْأَمِينِينَ ۝

۵- أَسْأَلُكَ يَدَكَ فِي حَيْبِكَ تَخْرُجُ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ وَاضْمُمُ إِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذَنْكَ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكَ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ ۝

۶- قَالَ رَبِّ إِنِّي قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ ۝

۷- وَأَخِي هَارُونُ هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي لِسَانًا فَأَرْسَلْهُ مَعِيَ رِدْءًا يُصَدِّقُنِي إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُكَذِّبُونِ ۝

۸- قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِأَخِيكَ وَنَجْعَلُ لَكَ مَأْسُطَنَا فَلَا يَمْلِكُونَ إِلَيْكَ مَا بَايَعْتَنَا إِنَّمَا وَنَمِنَّا بِكَ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مَا

الْغَالِبُونَ ۝

کریں تاکہ ان کے دل و دماغ سے عکالت کی ناز پروردہ زندگی کا اثر باکل محو ہو جائے۔ حضرت موسیٰ کو اتنا عرصہ بھرنیہ لڑوں میں رہنے والوں کے تھکرانا ضروری تھا تاکہ ان کی تکالیف اور مشکلات سے آگاہ ہو جائے اور ساکنانِ عکالت کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ ایک اور بات بھی ہے کہ حضرت موسیٰ کو اسرارِ آفرینش میں غور کرنے اور اپنی شخصیت کی تکمیل کے لیے بھی ایک طویل وقت کی ضرورت تھی۔ یہ مقصد کے لیے بیابانِ مدین اور خانہ شعیب سے بہتر اور کونسی جگہ ہو سکتی تھی۔

ایک اولوالعزم پیغمبر کی پشت کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ یہ مقام کسی کو نہایت آسانی سے نصیب ہو جائے۔ بلکہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ سب سے زیادہ اہم تھی۔ اس لیے کہ:-
رومی زمین کے ظالم ترین لوگوں سے مقابلہ کرنا، ایک کثیر الافراد قوم کی مدتِ امیری کو ختم کرنا،
اور ان کے اندر سے ایامِ امیری میں پیدا ہونے والے تقاضوں کو محو کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

توریت اور اسی طرح اسلامی روایات میں مذکور ہے کہ حضرت شعیب نے موسیٰ کی مخلصانہ خدمات کی قدرت اسی کے طور پر پرے کر لیا تھا۔ یہ بیٹوں کے جو پچھلے ایک خاص علامت کے ساتھ پیدا ہوں گے، وہ موسیٰ کو دے دیں گے۔ اتفاقاً مدتِ موعود کے آخری سال میں جبکہ موسیٰ حضرت شعیب سے رخصت ہو کر ملک مصر کو جانا چاہتے تھے تو تمام یا زیادہ تر پچھلے اسی علامت کے پیدا ہوئے اور حضرت شعیب نے ان انہیں بڑی محبت سے موسیٰ کو دے دیا۔

یہ امر بدیہی ہے کہ حضرت موسیٰ اپنی ساری زندگی پر واہے بنے رہنے پر قناعت نہیں کر سکتے تھے۔ ہر چند ان کے لیے حضرت شعیب سے پاس رہنا بہت ہی مستقیم تھا مگر وہ اپنا یہ فرض سمجھتے تھے کہ اپنی اس قوم کی مدد کے لیے جائیں جو غلامی کی زنجیروں میں گرفتار ہے اور حالتِ انی اور بے خبری میں غرق ہے۔

حضرت موسیٰ اپنا یہ فرض بھی سمجھتے تھے کہ مصر میں جو ظلم کا بازار گرم ہے اسے سرود کریں، طاغوتوں کو ذلیل کریں اور توفیقِ الہی سے ملوں کہ عزت بخشیں۔ ان کے قلب میں یہی احساس تھا جو انہیں مصر جانے پر آمادہ کر رہا تھا۔

آخر کار انھوں نے اپنے اہل خانہ، سامان و اسباب اور اپنی بیٹیوں کو ساتھ لیا اور رخصتِ مہربانہ اور روز ہو گئے۔
مستعد آیاتِ قرآنی میں کلمہ "اہل" آیا ہے۔ اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ اس سفر میں حضرت موسیٰ کے ساتھ ان کی زوجہ کے علاوہ،
بہنوں کا لڑکا کوئی اور اولاد بھی تھی۔ اسلامی روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ توریت کے "سفر خروج" میں بھی ذکرِ فضل موجود ہے۔
وہ ازیں اس وقت ان کی زوجہ امید سے تھی۔

جب حضرت موسیٰ مدین سے مصر کو جا رہے تھے تو راستہ میں ٹول گئے۔ یا غالباً شام کے ڈاکوؤں کے ہاتھ میں گرفتار ہو جانے کے خوف سے بوجہ احتیاط مروج راستے کو چھوڑ کے سڑک پر رہے تھے۔

بہر کیف قرآن شریف میں یہ بیان اس طور سے ہے کہ: جب موسیٰ اپنی مدتِ کو ختم کر چکے اور اپنے خاندان کو ساتھ لے کر سفر پر روانہ
۱۰ اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے دس سال حضرت شعیب کی خدمت کی۔ وہ ذکر کتاب و مسائل مشیہ: جلد ۱۵ ص ۲۴ (کتاب التلاخ
۱۱ اباب المصعب باب ۲۲ حدیث ۷) میں آیا ہے۔

ہو گئے تو انہیں طور کی جانب سے شعلہ آتش نظر آیا: (فلما قضی موسیٰ الاجل وسار باہلہ انس من جانب الطور نارا)۔
حضرت موسیٰ نے اپنے اہل خاندان سے کہا: "تم یہیں ٹھہرو" مجھے آگ نظر آئی ہے۔ میں جاتا ہوں۔ شاید تمہارے لیے وہاں سے
کوئی خبر لڑوں یا آگ کا ایک انگارے آوں تاکہ تم اس سے گرم ہو جاؤ: (قال لاهلہ امحکثوا انی انت نارا لعلی اتیکو منها
بخبر او جذوة من النار لعلکم تصطلون)۔

"انسٹ" "ایناس" سے مشتق ہے جس کے معنی مشاہدہ کرنے اور ٹکون و آرام سے دیکھنے کے ہیں۔

"جذوة" "آگ کا ایک انگارا" بعض لوگوں نے اس کے معنی "اندر صحن کا بڑا ٹھنڈا" لکھے ہیں۔ اور "اتیکو بخبر

سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ راستہ میں ٹول گئے تھے اور "لعلکم تصطلون" یہ اشارہ کر رہا ہے کہ سردی اور تکلیف دہ رات تھی۔

قرآن کی آیت میں حضرت موسیٰ کی زوجہ کی حالت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ مگر تفاسیر اور روایات میں مذکور ہے کہ وہ امید سے تھیں اور انہیں
دورہ ہو رہا تھا۔ اس لیے موسیٰ پریشان تھے۔

حضرت موسیٰ جس وقت آگ کی تلاش میں نکلے تو انھوں نے دیکھا کہ:-

آگ تو ہے مگر معمول کی سی آگ نہیں ہے بلکہ حرارت اور سوزش سے خالی ہے۔ وہ فوراً اور
"تاہنگی کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتی تھی۔

حضرت موسیٰ اس منظر سے نہایت حیران تھے کہ ناگہاں اس پر برکت سرزمینِ بلنہ میں داوی کے داہنی جانب سے ایک درخت
میں سے آواز آئی: اسے موسیٰ میں اللہ رب العالمین ہوں (فلما اتاہا نوادی من شاطیئ الوادی الایمن فی البقعة
البارکة من الشجرة ان یا موسیٰ انی ان اللہ رب العالمین)۔

شاطیئ: یعنی ساحل۔

وادی: یعنی درہ یا پہاڑ میں وہ راستہ جہاں سے سیلاب گزرتا ہے۔

ایمن: جانبِ راست اور یہ "شاطیئ" کی صفت ہے۔

بقعة: زمین کا وہ حصہ جو اطراف کی زمین سے ممتاز ہو۔

اس میں شک نہیں کہ یہ خدا کے اختیار میں ہے کہ جس چیز میں چاہے قوتِ کلام پیدا کر دے۔ یہاں اللہ نے درخت میں یہ استعداد
پیدا کر دی۔ کیونکہ اللہ موسیٰ سے ۱۰ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ موسیٰ گوشت پرست کے انسان تھے، کان رکھتے تھے اور سننے
کے لیے انہیں امواجِ صوت کی ضرورت تھی۔ البتہ انہیں پر اکثر یہ حالت بھی گزری ہے کہ وہ بطور الہامِ ربانی پیغامِ الہی کو حاصل کر سکتے
رہے ہیں۔ اسی طرح کبھی انہیں خواب میں بھی ہدایت ہوتی رہی ہے۔ مگر کبھی وہ وحی کو بصورتِ صدا بھی سن سکتے رہے ہیں۔ بہر کیف حضرت موسیٰ
نے جو آواز سنی اس سے ہم ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ خدا جسم رکھتا ہے۔

بعض روایات میں مذکور ہے کہ موسیٰ جب آگ کے پاس گئے اور غور کیا تو دیکھا کہ درخت کی سبز شاخوں میں آگ پک رہی ہے۔
اور لفظ بہ لفظ اس کی تابش اور روشنی بڑھتی جاتی ہے۔ جو عصا ان کے ہاتھ میں تھا اس کے سہارے نکلے تاکہ اس میں سے تھوڑی سی آگ

لے لیں۔ تو آگ موسیٰ کی طرف بڑھی۔ موسیٰ ڈرے اور پیچھے ہٹ گئے۔ اُس وقت حالت یہ تھی کہ کبھی موسیٰ آگ کی طرف بڑھتے تھے اور کبھی آگ ان کی طرف۔ اسی کشمکش میں ناگہاں ایک صدا بلند ہوئی۔ اور انھیں وحی کی بشارت دی گئی۔

اس طرح ناقابل انکار قرآن سے حضرت موسیٰ کو یقین ہو گیا کہ یہ آواز خدا کی ہے، کسی غیر کی نہیں ہے۔ لیکن اُس عظیم ذمہ داری کے اعتبار سے جو موسیٰ پر عائد کی گئی تھی لازم تھا کہ اسی کے مطابق انھیں خدا کی طرف سے سچرات بھی عطا کیے جائیں۔ چنانچہ ان آیات میں دو اہم سچرات کا ذکر کیا گیا ہے۔

اول یہ کہ موسیٰ سے کہا گیا کہ: "اپنے عصا کو زمین پر ڈال دو"۔ چنانچہ موسیٰ نے عصا کو پھینک دیا۔ اب کیا دیکھتے ہیں کہ وہ عصا سانپ کی طرح تیزی سے حرکت کر رہے۔ یہ دیکھ کر موسیٰ ڈرے اور پیچھے ہٹ گئے۔ یہاں تک کہ نر کے بھی نہ دیکھا: (روان الق عصا فلما رآھا تھترکاتھا جاناً وولئ مدبراً ولو یعقب)۔

جس دن حضرت موسیٰ نے یہ عصا بیا تھا تاکہ تمھن کے وقت اُس کا سہارا لے لیا کریں اور بھیڑوں کے لیے اُس سے پتے جھاڑ لیا کریں انھیں یہ خیال بھی نہ تھا کہ قدرت خدا سے اُس میں یہ خاصیت بھی چھپی ہوئی ہوگی اور یہ بھیڑوں کو چرانے کی لامبھی ظالموں کے عمل کو بلا دے گی۔ موجودات عالم کا یہی حال ہے کہ وہ بعض اوقات ہماری نظر میں بہت حقیر معلوم ہوتی ہیں مگر ان میں بڑی بڑی استعداد چھپی ہوتی ہے جو کسی وقت خدا کے حکم سے ظاہر ہوتی ہے۔

اب موسیٰ نے دوبارہ آواز سنی جو اُن سے کہہ رہی تھی: "واپس آ اور نہ ڈر تو امان میں ہے۔ یا مومنین اقبل ولا تخف انک من اللہ"۔ "جان" دراصل اُس شے کو کہتے ہیں جو موجود تو ہو مگر نظر نہ آتی ہو۔ مجازاً "جان" اُن چیزوں کو کہتے ہیں جو گھاس کے پھیر یا زمین کے ڈانڈوں کے اندر سے گزرتے ہیں۔

البتہ قرآن کی بعض دوسری آیات میں "ثبنا مبین" (واضح اثر و صاف) بھی کہا گیا ہے۔ (اعراف - ۱۰۴، شعرا - ۱۲) ہم نے قبل ازیں کہا ہے کہ اُس سانپ کے لیے جو یہ دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ممکن ہے اُس کی دو مختلف حالتوں کے لیے ہوں ابتداء میں وہ چھوٹا سا بوا اور پھر ایک بڑا اثر و صاف بن گیا ہو۔ اس مقام پر یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ موسیٰ نے جب وادی طور میں اُسے پہلی بار دیکھا تو چھوٹا سا سانپ تھا، رفتہ رفتہ وہ بڑا ہو گیا۔

بہر حال حضرت موسیٰ پر یہ حقیقت آشکار ہو گئی کہ درگاہ رب العزت میں مطلق اس دامن ہے اور کسی قسم کے خوف و خطر کا مقام نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ کو جو سچرات عطا کیے گئے اُن میں سے پہلا سچرہ خوف کی علامت پر مشتمل تھا۔ اُس کے بعد موسیٰ کو حکم دیا گیا کہ اب ایک دوسرا سچرہ حاصل کرو جو تُو رُو اُمید کی علامت ہو گا۔ اور یہ دونوں سچرے گویا "انذار اور بشارت" تھے۔

موسیٰ کو حکم دیا گیا کہ اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالو اور باہر نکالو۔ موسیٰ نے جب گریبان میں سے ہاتھ باہر نکالا تو وہ سفید تھا اور چمک رہا تھا اور اُس میں کوئی عیب اور نقص نہ تھا: (اُسلک یدک فی جیبک تخرج بیضاء من غیر سوء)۔

حضرت موسیٰ کے ہاتھ میں یہ سفیدی اور چمک کسی بیماری (مثلاً برص یا کوئی اسی جیسی چیز) کی وجہ سے نہ تھی۔ بلکہ یہ تُو رُو الٰہی تھا جو بالکل ایک نئی قسم کا تھا۔

جب حضرت موسیٰ نے اُس سنسان کو ہمارا اور اُس تاریکات میں یہ دو عارق عادت اور خلاف معمول چیزیں دیکھیں تو ان پر لرزہ طاری ہو گیا۔ چنانچہ اس لیے کہ ان کا اطمینان قلب واپس آجانے انھیں حکم دیا گیا کہ اپنے سینے پر اپنا ہاتھ پھیریں تاکہ دل کو راحت ہو جائے: (واضحوا لیک جناحک من المرعب)۔

مذکورہ آیت کے تعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے مراد ہے کہ موسیٰ اپنے فرض کی ادائیگی اور پیام الٰہی کے پہنچانے میں ثابت قدم اور راسخ العزم رہیں اور کسی مقام اور دنیا کی کسی طاقت سے خوف نہ کھائیں۔

بعض حضرات کا ذہن اس طرف منتقل ہوا ہے کہ جس وقت عصا نے سانپ کی شکل اختیار کر لی تو موسیٰ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تاکہ اپنی ممانعت کریں لیکن خدا نے اُنھیں حکم دیا کہ اپنا ہاتھ روک لو اور نہ ڈرو، ممانعت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ہاتھ کی بجائے میاں جناح (بازو) کا استعمال نہایت فصیح ہے۔ غالباً اس تشبیہ سے تصور یہ ہے کہ انسان کی حالت اُس پرندہ کی سی ہے کہ جب وہ کوئی خوفناک منظر دیکھتا ہے تو اپنے پر پھیلاتا ہے لیکن جب وہ بحالت سکون میں ہوتا ہے تو اپنے پر اور بازو سمیٹ لیتا ہے۔

اُس کے بعد موسیٰ نے پھر وہی صدا سنی جو کہہ رہی تھی: "خدا کی طرف سے تجھے یہ دو وسیلے فرعون اور اُس کے ساتھیوں کے مقابلے کے لیے دی جا رہی ہیں کیونکہ وہ سب لوگ فاسق تھے اور میں: (خذنا لک بھانان من ربک الی فرعون وملأئہ انھو کانا قومًا فاسقین)۔

یہ لوگ خدا کی اطاعت سے نکل گئے ہیں اور سرکشی کی انتہا تک پہنچنے میں۔ تمہارا فرض ہے کہ انھیں نصیحت کرو اور راہ راست کی تبلیغ کرو اور اگر وہ تمہاری بات نہ مانیں تو ان سے جنگ کرو۔

اس موقع پر موسیٰ کو اپنی زندگی کا وہ اہم حادثہ یاد آ گیا جو مصر میں پیش آیا تھا۔ یعنی ایک قبیلے کو قتل کرنا۔ اور فرعون کی پولیس کا اُس قبیلے کے خون کا بدلہ لینے کے لیے پختہ ارادہ۔ اگرچہ موسیٰ ایک مظلوم کی حمایت میں اُس قبیلے سے لڑے تھے مگر فرعون کی منطوق میں یہ عُذر بے معنی تھا۔ وہ اب بھی تمہارے کیسے ہوئے تھا کہ اگر موسیٰ اُسے کہیں مل جائیں تو انھیں بے چون و چرا قتل کرادے۔ اس لیے موسیٰ عرض کرتے ہیں: "خدا! میں نے تو ان میں سے ایک آدمی کو قتل کیا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ وہ اُس کے انتقام میں مجھے قتل کر دیں گے اور میں اپنا فرض ادا کر سکوں گا: (قال رب انی قتلنا منھو نفساً فاخاف ان یقتلونی)۔

(حضرت موسیٰ نے درگاہ باری تعالیٰ میں عرض کی) علاوہ بریں میں تمہارا ہوں اور میری زبان بھی نصیح نہیں ہے۔ تو میرے بھائی ہارون کو بھی میرے ساتھ بھیج کر وہ مجھ سے زیادہ فصیح زبان ہے تاکہ وہ میری مدد کرے اور نصیر بنی۔ مجھے اس بات کا خوف ہے کہ میں تمہارا ہوں گا تو لوگ مجھے جھٹلائیں گے: (واخی ہارون هو اوضح منی لساناً فارسلہ معی ردأ یصد قتی انی اخافت ان یحکذلیون)۔

"افصح" کا مادہ "فصیح" ہے۔ اس کے لغوی معنی کسی چیز کے خالص ہونے کے ہیں۔ مراد ہے "سخن خالص" یعنی ہر قسم کے حشو و زوائد سے خالی۔

”رد ۶“ یعنی معین و یا اور۔

بہر حال چونکہ یہ ماموریت بہت اہم اور عظیم تھی، اس لیے حضرت موسیٰ کی آرزو تھی کہ انہیں شکست ہرگز نہ ہو۔ اس لیے انہوں نے اسے یہ تقاضا کیا۔

خدا نے بھی ان کی دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ انہیں اطمینان دلایا اور فرمایا: ہم تمہارے بازوؤں کو تمہارے بھائی کے وسیلہ سے حکم کریں گے: (قال سنشد عضدك باخيك)۔

اور تمہیں ہر مسئلے پر غلبہ اور برتری عطا کریں گے: (ونجعل لکما سلطانا)۔

قطعی مطمئن رہو! وہ لوگ ہرگز تم پر غالب نہ ہوں گے اور ان مجزوں کی برکت سے وہ نہ تو تم پر تسلط ہوں گے نہ تمہارے مقابلے میں فتح مند ہوں گے: (فلا یصلون الیکما با یا تمنا)۔

بلکہ تم اور تمہارے پیرو ہی غالب اور فیروز مند رہیں گے: (اشتما ومن اتبعکما الفالیون)۔

یہ کیسی عظیم فوید اور کتنی بزرگ بشارت تھی۔ ایسی فوید و بشارت جس نے موسیٰ کے دل کو گرم، اُن کے ارادہ کو پختہ اور عزم کو محکم کر دیا۔ اس فوید کے روشن اثرات کو ہم اس داستان کے آئندہ بیان میں دیکھیں گے۔

۳۶۔ فَلَمَّا جَاءَهُ مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَمَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي آبَائِنَا الْأُولِينَ ۝

۳۷۔ وَقَالَ مُوسَىٰ رَبِّي أَعْلَمُ بِمَنْ جَاءَ بِالْهُدَىٰ مِنْ عِنْدِ رَبِّهِ وَمَنْ تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ۝

ترجمہ

۳۶۔ جس وقت موسیٰ ہمارے روشن معجزات لے کر اُن کے پاس آیا تو انہوں نے کہا: یہ تو جادو کے علاوہ کچھ نہیں ہے، جسے غلط طور پر خدا سے منسوب کر دیا گیا ہے اور ہم نے اپنے گزشتہ بزرگوں میں کوئی ایسی بات نہیں سنی۔

۳۷۔ موسیٰ نے کہا: میرا خدا اُن لوگوں کو جو اُس کی طرف سے ہدایت لائے ہیں اور اُن لوگوں کو جن کے لیے آخر کار دنیا و آخرت کا گھر ہے، خوب جانتا ہے۔ یقیناً ظالم فلاح نہیں پائیں گے۔

تفسیر

موسیٰ فرعون کے مقابلے میں:

اس مقام پر اس رُوداد کا آغاز آفتوں حشر بیان کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ کو اُس مقدس مقام پر خدا کی طرف سے نبوت اور رسالت کا فرائض مل گیا۔ وہ مصر میں آئے اور اپنے بھائی ہارون کو مطلع کیا اور وہ رسالت جس کے لیے آپ مبعوث تھے، اُس کا پیغام اُسے پہنچایا۔ پھر یہ دونوں بھائی فرعون سے ملاقات کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ آخر فرعون نے فرعون کے ذرا اور مخصوص لوگ اُسے گھیرے ہوئے تھے۔ حضرت موسیٰ نے اُن سب کو خدا کا پیغام سنایا۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ پیغام حق لوگوں کا رد عمل کیا ہوا۔

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں خدا فرماتا ہے کہ جس وقت موسیٰ ہمارے روشن معجزات لے کر اُن لوگوں کے پاس گئے تو انہوں نے کہا: ”یہ تو جادو کے علاوہ کچھ نہیں ہے جسے غلط طور پر خدا سے منسوب کر دیا گیا ہے: (فَلَمَّا جَاءَهُ مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى)۔

ہم نے ایسی بات اپنے بزرگوں میں کبھی نہیں سنی: (وَمَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي آبَائِنَا الْأُولِينَ)۔

انہوں نے حضرت موسیٰ کے روشن معجزات کے مقابلے میں وہی حربہ اختیار کیا جو پوری تاریخ میں تمام ظالم و جابر اور گمراہ لوگ دنیا کے معجزات کے مقابلے میں اختیار کرتے رہے تھے۔

اور وہ تھا جادوگری کا الزام کیونکہ معجزہ بھی خارق عادت ہوتا ہے اور جادو بھی لیکن یہ کہاں اور وہ کہاں! جادو گر گمراہ اور یا پرست لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے عملیات کی بنیاد تحریف حقائق پر ہے۔ اس علامت سے ان کی حقیقت کو ٹھہرا پہچانا جاسکتا ہے جبکہ بلکہ پیغام حق اور اس کی صداقت پر ان کے معجزات گواہ ہیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ چونکہ ساحروں کا بھروسہ بشری طاقتوں پر ہوتا ہے اس لیے ہمیشہ ان کا دائرہ عمل محدود ہوتا ہے۔ لیکن انبیاء کے الٰہی طاقت ہوتی ہے لہذا ان کے معجزات عظیم اور نامحدود ہوتے ہیں۔

قرآن میں "آیات بینات" بطور بیخ استعمال ہوا ہے۔ مراد اس سے وہ معجزات ہیں جو حضرت موسیٰ کو عطا ہوئے تھے ہر ذکر وہی معجزوں کا ہے۔ مگر ممکن ہے انہیں ان دو معجزوں کے علاوہ بھی معجزے دینے گئے ہوں۔ یا یہ دو معجزے متعدد معجزوں سے ب ہوں۔

عصا کا اڑھنے کی صورت میں متشکل ہو جانا ایک عظیم معجزہ ہے اور پھر اس کا پہلی حالت پر واپس آ جانا ایک اور معجزہ ہے۔ اسی معجزہ سے موسیٰ کے ہاتھ کا چمک اٹھنا ایک معجزہ ہے اور پھر اس کا حالت اصلی اختیار کر لینا دوسرا معجزہ ہے۔

کلمہ "مفتویٰ" کا مادہ "فریہ" ہے جس کے معنی تسبیح اور دروغ کے ہیں۔ مگر لوگوں نے یہ کلمہ اس لیے استعمال کیا کہ یہ کتنا چاہتے تھے کہ موسیٰ نے خدا کا نام لے کر جھوٹ بولا ہے۔

اور اہل مصر کا یہ کہنا کہ "ہم نے ایسی بات اپنے باپ دادا سے کبھی نہیں سنی"۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت موسیٰ سے قبل اس ملک میں حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یوسفؑ کی نبوت اور ان کے م کی شہرت پہنچ چکی تھی یا ممکن ہے کہ انہوں نے یہ بات اس وجہ سے کہی ہو کہ ان واقعات کو ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا اور وہ حق کو دیش کر چکے تھے یا ہو سکتا ہے کہ ان کے ذہن میں یہ خیال ہو کہ اس سے پہلے بھی ہمارے اجداد کو ایسا پیغام دیا گیا تھا مگر انہوں نے نہیں کیا۔

لیکن حضرت موسیٰ نے ان کفار کے جواب میں تہدید آمیز لہجے میں کہا: میرا خدا ان لوگوں کے حال سے، جو اس کی طرف سے نون کے لیے ہدایت لاتے ہیں، خوب آگاہ ہے اور اس شخص کو بھی خوب جانتا ہے جس کے لیے دار آخرت ہے: (وقال لسی ربی اعلمو بہن جاء بالہدی من عندہ ومن ینکون لہ عاقبۃ الدار)۔

اس قول سے حضرت موسیٰ کا مقصود یہ تھا کہ خدا میرے حال سے خوب آگاہ ہے۔ ہر چند کہ تم مجھے دروغ لگتی سے تم کرتے ہو۔ یہ نہیں سوچتے کہ خدا ایک جھوٹے شخص کو ایسے معجزات کیونکر عطا کر سکتا ہے کہ جو اس کے بندوں کو گمراہ کرنا چہرے۔ خدا میرے دل حال خوب جانتا ہے اور خدا نے مجھے یہ معجزات عطا کیے ہیں وہ میرے پیغام کی حقانیت پر دلیل والی ہیں۔

علاوہ بریں "جھوٹ کے پیر نہیں ہوتے" جھوٹے آدمی کا کام ایک قلیل مدت تک ہی چلتا ہے اور پھر اس کا پردہ فاش ہو

جاتا ہے۔ تم عنقریب دیکھ لو گے کہ ہم میں سے کون کامیاب ہوتا ہے اور شکست و رسوائی کس کی قسمت میں ہے۔

مطلبن رہو اگر میں دروغ گو ہوں تو ظالم ہوں اور ظالموں کو کبھی فلاح نہیں ہوتی: (انہ لا یفلح الظالمون)۔

اور اس آیت کا مضمون سورہ طہ کی آیت نمبر ۶۹ کے مطابق ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

ولا یفلح الساحر حیث اتی

ساحر جہاں بھی جائے گا اسے فلاح نہ ہوگی۔

اس مقام پر یہ احتمال ہی ہے کہ آیت میں فرعون اور اس کے مسند اور متکبر ساتھیوں کی نفسانی حالت کی طرف اشارہ ہو کہ تم لوگ میرے معجزات کو دیکھ کر دل میں تو مجھے برحق سمجھ گئے ہو مگر اپنی نبیائت نفس کی وجہ سے میری مخالفت کرتے ہو۔ مگر اچھی طرح سمجھو کہ تم ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے اور انجام کار میرے حق میں ہو گا نہ کہ تمہارے۔ "عاقبۃ الدار" سے مراد ممکن ہے کہ دنیا کا انجام یا دار آخرت یا دونوں ہوں۔ البتہ تیسرے معنی زیادہ جامع اور زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

حضرت موسیٰ نے اس منطقی اور منہذب جواب سے ان کی اس دنیا اور آخرت دونوں میں رُوسیا ہی کو ان پر واضح کر دیا۔

- ۳۔ وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرِي فَأَوْقِدْ لِي يَا هَامُنُّ عَلَى الطِّينِ فَأَجْعَلْ لِي صُرْحًا عَلَيَّ أَطَّلِعُ إِلَى إِلَهِ مُوسَى وَإِنِّي لأظنُّهُ مِنَ الْكَاذِبِينَ
- ۴۔ وَأَسْتَكْبِرُ هُوَ وَجُنُودُهُ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوا أَنَّهُم إِلَيْنَا لَا يُرْجَعُونَ
- ۵۔ فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ فَأَنْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ
- ۶۔ وَجَعَلْنَاهُمْ آيَةً يُدْعَوْنَ إِلَى النَّارِ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ لَا يُنصَرُونَ
- ۷۔ وَاتَّبَعْنَاهُمْ فِي هَذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ هُمْ مِنَ الْمَقْبُوحِينَ

ترجمہ

- ۳۔ فرعون نے کہا: اے (دربار نشین) سردارو! میں اپنے سوا تمہارے لیے کسی کو خدا نہیں جانتا، لیکن مزید تحقیق کے لیے) اے ہامان تو میرے لیے مٹی پر آگ جلا (یعنی اینٹیں پکا) اور پھر میرے لیے ایک بلند برج تعمیر کرنا کہ مجھے موسیٰ کے خدا کا پتہ چلے۔ اگرچہ میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ جھوٹوں میں سے ہے۔
- ۴۔ وہ (فرعون) اور اس کے لشکر زمین میں ناسحق مغرور ہو رہے تھے اور ان کا خیال تھا کہ وہ ہمارے پاس لوٹ کر نہیں آئیں گے۔
- ۵۔ پس ہم نے اسے اور اس کی افواج کو پھڑپھڑایا اور انہیں غرق دریا کر دیا۔ دیکھو! کہ ظالموں کا انجام کیا ہوتا ہے۔
- ۶۔ اور ہم نے ان کو ایسے پیشوا قرار دیا جو (جہنم کی) آگ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور قیامت کے دن ان کی مدد نہ کی جائے گی۔
- ۷۔ اور ہم نے اس دُنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگا دی ہے اور قیامت کے روز وہ بد حالوں میں سے ہوں گے۔

تفسیر
ظالموں کا انجام :

- اس مقام پر ہم اس تاریخ کے نوں سبق آموز حصے کا مطالعہ کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ فرعون نے حضرت موسیٰ کو میدانِ مقابلہ سے ہٹانے کے لیے ایک برج بنانے کا منصوبہ بنایا۔
- ہم جانتے ہیں کہ سنجے ہوئے سیاست دانوں کا ایک طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ ان کی میلانِ طبع کے خلاف پیش آجاتا ہے تو وہ عوام کی توجہ اُس سے منحرف کرنے کے لیے فوراً کوئی نئی چال چلتے ہیں۔ تاکہ عوام کی توجہ اُن ہی کی طرف رہے۔
- یوں لگتا ہے کہ فرعون نے نہایت بلند برج بنانے کا حکم حضرت موسیٰ کے جادوگروں سے مقابلے کے بعد دیا ہو گا۔ کیونکہ قرآن مجید میں سُورہ مومن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منصوبہ اُس وقت بنایا گیا تھا جب کہ فرعون کے اہل کار موسیٰ کو قتل کرنے کی تجویز کر رہے تھے اور مومن آل فرعون انہیں بچانے کی تدبیر کر رہا تھا۔ نیز یہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ کے سامروں سے پہلے اس تجویز کی ضرورت نہ تھی، بلکہ وہ حضرت موسیٰ کی صداقت کی تحقیق اور انہیں جادوگروں سے شکست دلانے میں مشغول تھے۔
- قرآن مجید میں حضرت موسیٰ کے سامروں سے مقابلے کا حال سورہ ظہر، اعراف، یونس اور شعراء میں بیان کیا گیا ہے۔ مگر اس مقام پر اُس تفصیل سے قطع نظر کہ ہم صرف تعمیرِ برج کے واقعے کا ذکر کرتے ہیں جو صرف اس سورہ اور سورہ مومن میں بیان ہوا ہے۔
- جادوگروں پر حضرت موسیٰ کی فتح کا حال تمام مملکتِ مصر میں مشہور ہو گیا تھا۔ جادوگروں کے حضرت موسیٰ پر ایمان لانے سے غلطی اور بھی بڑھ گیا تھا۔ اور حکومتِ فرعون کی پوزیشن سخت خطرے سے دوچار ہو گئی تھی۔ ملک کے عوام جنہیں غلام بنا رکھا تھا، ان کے بیدار ہونے کا احتمال ہونے لگا تھا۔ اس لیے اس نازک وقت میں لازمی تھا کہ ہر قیمت پر عوام کی توجہ اُس سلسلے سے ہٹائی جائے۔ اور ان کے ذہن کو کسی اور طرف مشغول کرنے، انہیں اصل مسئلے سے غافل کرنے اور بے وقوف بنانے کے لیے کوئی تدبیر کی جائے اور ساتھ ہی ساتھ حکومت کی طرف سے اُن کے لیے عطا و بخشش کا سلسلہ بھی جاری ہو۔
- فرعون نے اس معاملے میں اپنے اہل دربار سے مشورہ کیا۔ وہ اُس نتیجے پر پہنچا جس کا ذکر زیر بحث پہلی آیت میں آیا ہے:
- فرعون نے کہا: اے میرے امرا و وزراء! مجھے تمہارے لیے اپنے سوا کسی خدا کا علم نہیں: (وقال فرعون یا ایہا العلما ما علمت لکم من الہ غیر ی)۔
- مسئلہ طور پر زمین کا خدا نہیں ہوں۔ رہا آسمان کا خدا اُس کے وجود پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ لیکن میں اقباط سے گریز نہیں کرتا اور آسمانی خدا کے متعلق تحقیق کرتا ہوں اس کے بعد اُس نے ہامان کی طرف رخ کیا اور کہا: اے ہامان! تو آگ جلا کر اینٹیں پکا (فاوقد لی یا ہامان علی الطین)۔
- اس کے بعد تو میرے لیے ایک بہت بلند برج بنا تاکہ میں اُس پر چڑھوں اور موسیٰ کے خدا کو تلاش کروں، ہر چند کہ مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ سچا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ جھوٹوں میں سے ہے: (فاجعل لی صرحاً علی اطلع الی اللہ موسیٰ وان لاظنہ

الکاذبین۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فرعون نے " اینٹ " کا لفظ کیوں استعمال نہیں کیا اور صرف یہ کہا کہ " مٹی پر آگ جلاؤ ؟ " اس کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اُس زمانے میں ابھی پختہ اٹھیں بنانے کا رواج نہ تھا۔ اینٹ فرعون کے دور میں ایجاد ہوئی۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ طرز بیان بھی سبب ازہ ہے جیسا کہ جابر بادشاہوں کا طرز گفتگو ہوتا ہے۔

بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ لفظ " آجر " (یعنی اینٹ) کوئی فصیح لفظ نہیں ہے کہ قرآن میں استعمال ہوتا اُس کی بجائے لفظ " حطین " استعمال کیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں مفسرین کے ایک گروہ نے (مثلاً خزاز زوی اور آلوسی نے) یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ آیا فرعون نے اپنا عجز و بندگی بنا کر ظاہر کیا تھا یا نہیں؟

ان مفسرین کا ذہن اس لیے منتقل ہوا کہ مینار کی تعمیر کا کام کسی طرح بھی عاقلانہ نہ تھا۔ کیا اُس عہد کے لوگ کبھی بلند پہاڑوں پر چڑھے تھے؟ اور انھوں نے آسمان کے منظر کو دیکھا ہی نہیں دیکھا تھا جیسا کہ وہ زمین سے نظر آتا ہے؟ کیا انسان کا بنایا ہوا مینار پہاڑ سے زیادہ اونچا ہو سکتا ہے؟ کیا کوئی احمق بھی یہ یقین کر سکتا ہے کہ ایسے مینار پر چڑھ کر آسمان کو چھوا جا سکتا ہے؟ لیکن وہ مفسرین نے یہ اشکالات پیدا کیے ہیں ان کی توجہ ان نکات کی طرف نہیں گئی کہ اول تو ملک مصر کو ہستانی نہیں ہے۔ دوم یہ کہ انہوں نے عہد کے لوگوں کی سادہ لوحی و ذرا سوشل کر دیا کہ ان سیدھے سادے لوگوں کو ایسے ہی مسائل سے غافل کیا جا سکتا تھا۔ یہاں تک کہ خود سے زمانے میں جسے عصر علم و دانش کہا جاتا ہے، لوگوں کی توجہ اصل مسائل سے ہٹانے کے لیے کیسے کیسے مکر و فریب اور حیلہ بازیوں سے لگے ہوئے۔

بہر کیف۔۔۔ بعض قواعد کے بیان کے مطابق، حمان نے حکم دیا کہ ایسا عمل اور بُرج بنانے کے لیے زمین کا ایک وسیع قطعہ اُتھا۔ اور اس کی تعمیر کے لیے پچاس ہزار سمار اور مزدور روانہ کر دے اور اس عمارت کے واسطے میٹیل فراہم کرنے کے لیے ہزاروں آدمی کیے گئے۔ اُس نے فرما کر کہ منہ کھول دیا اور اس مقصد کے لیے کثیر رقم خرچ کی۔ یہاں تک کہ تمام ملک مصر میں اس عظیم بُرج کی تعمیر شروع ہو گئی۔

یہ عمارت جس قدر بھی بلند سے بلند تر ہوتی جاتی تھی۔ لوگ اتنے ہی زیادہ اُسے دیکھنے آتے تھے اور منتظر تھے کہ دیکھے فرعون یہ بنا کر کیا کرتا ہے؟

یہ عمارت اتنی بلند ہو گئی کہ اُس سے دُور دُور تک اطراف و جوانب کا میدان نظر آنے لگا۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ عمالوں اُس کی مارچ سیڑھیاں ایسی بنائی تھیں کہ آدمی گھوڑے پر سوار ہو کر اُس پر چڑھ سکتا تھا۔

جب وہ عمارت پانچ سو چالیس گز اونچے ہو گئی اور اُسے مزید بلند کرنے کا کوئی امکان نہ رہا تو ایک روز فرعون پوری شان و شوکت سے دارا اُتھا۔ راست خود برج پر چڑھ گیا۔ جب وہ بُرج کی چوٹی پر پہنچا اور آسمان کی طرف نظر اٹھائی تو اُسے آسمان ویسا ہی نظر آیا جیسا کہ وہ زمین سے دیکھا۔ یہ مفسرین کا طبع زرافسانہ ہے۔ مجبوراً قہر کے جواب میں فرعون کے دارا سلطنت کے کھشحات موجود ہیں۔ دماغ اس قسم کی عمارت کا کوئی نشان نہیں ہے۔

کرتا تھا۔ اُس منظر میں ذرا بھی تغیر و تبدیلی نہ تھی۔

مشہور یہ ہے کہ اُس نے مینار پر چڑھ کے کمان میں تیر بوزا اور آسمان کی طرف پھینکا یا تو وہ تیر کسی پرندے کے لگا یا پہلے سے کوئی سازش کی گئی تھی کہ تیر خود اُڑو واپس آیا۔ تب فرعون وہاں سے نیچے اُتر آیا اور لوگوں سے کہا۔ جاؤ۔ مطمئن رہو اور کسی قسم کی فکر نہ کرو۔ میں نے سونہی کے خدا کو مار ڈالا ہے۔

یہ بات صحیح طور پر کہی جا سکتی ہے کہ سادہ لوحوں اور اذہمی تقلید کرنے والوں کے ایک گروہ نے اور ان لوگوں نے جن کی آنکھیں اور کان حُکومت و قدرت کے پردے کی لٹری سے بند ہو گئے تھے، فرعون کے اس قول کا یقین کر لیا ہو گا اور ہر جگہ اس خبر کو عام کیا ہو گا اور مصر کی رعایا کو غافل رکھنے کا ایک اور سبب پیدا ہو گیا ہو گا۔

مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ عمارت و برج قائم نہیں رہی (اور اُسے رہنا بھی نہ چاہیے تھا) تباہ ہو گئی۔ بہت سے لوگ اُس کے نیچے دب کے مر گئے۔ اس سلسلے میں اہل قلم نے اور بھی طرح طرح کی داستانیں لکھی ہیں لیکن ان کی صحت کی تحقیق نہ ہو سکی اس لیے انہیں قلم زد کر دیا گیا ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ فرعون نے یہ جملہ کہہ کر کہ:

ما علمت لکون من اللہ غیري

مجھے تمہارے لیے اپنے سوا کسی خدا کا علم نہیں۔

بڑی شبیخت کا ثبوت دیا تھا جملے سے ظاہر ہے کہ وہ اپنی اُلوہیت کو تو تسلیم سمجھتا تھا اور قابل بحث صرف یہ پہلو چھوڑ دیا کہ اُس کے علاوہ کوئی اور خدا بھی ہے یا نہیں؟

اور چونکہ خدا نے برحق کے عدم وجود کے لیے اُس کے پاس کوئی دلیل نہ تھی اس لیے یہاں ایک مغالطہ پیدا کرتا ہے اور اپنے علاوہ کسی اور دوسرے خدا کا عدم وجود ثابت کرنے کے لیے ایک بلند بُرج بنانے کا حکم دے کر لوگوں کی توجہ اصل مسئلے سے ہٹانا چاہتا ہے۔ یہ سب باتیں اس حقیقت کی علامت ہیں کہ وہ معاملے کو خوب سمجھتا تھا مگر مصر کے لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے اور اپنی پوزیشن پکارتے کے لیے بہانوں سے کھیل رہا تھا۔

اس کے بعد قرآن مجید میں فرعون اور اُس کے ساتھیوں کے بُختر اور اُن کے سبب دماغ سے انکار کا ذکر ہے۔ کہہ کر اُن کے تمام گناہوں کا سرچشمہ ان ہی دو حقائق کا انکار تھا۔ چنانچہ قرآن شریف میں یہ ذکر اس طرح ہے: فرعون اور اُس کے فوجیوں نے ناحق زمین پر بُختر کیا اور خدا کا (جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے) انکار کیا۔ انھوں نے یہ گمان کیا کہ قیامت آنے والی نہیں ہے اور وہ ہمارے پاس لوٹ کر نہیں آئیں گے: (واستحکبہم و وجنودہم فی الارض بغیر الحق و ظنوا انہم الینا لیرجعون)۔ ایسا انسان ضعیف البیان جس کی وقت اپنے آپ سے پھر بھی نہیں اڑا سکتا اور کسی ایک جراثیم (جو صرف خود دین ہی سے نظر آتا ہے) قوی ترین انسان کو تہ خاک پہنچا دیتا ہے، کیونکہ اپنی ذات پر غور کر سکتا ہے اور اس طرح اُلوہیت کا دعویٰ کر سکتا ہے؟

مشہور حدیث قدسی میں خدا فرماتا ہے :

الکبریا یأمر راقی، والعظمة ازاری، فمن نازعنی واحداً منهما القیتہ فی النار
بزرگی میری ردا ہے اور عظمت میرا لباس ہے جو میری قامت کبریائی پر سلا ہوا ہے جو شخص
ان دو چیزوں میں مجھ سے منازعت کرے گا، میں اُسے دوزخ میں ڈال دوں گا۔

ظاہر ہے کہ خدا کو تو ان توصیفات کی ضرورت نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ان کی سرکشی اور عصیان کو شی اس وقت شروع ہوتی ہے
جب وہ اپنی حقیقت کو بھول جاتا ہے اور اُس کا سر کبر و غور سے بھر جاتا ہے۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کبر و غور کا انجام کیا ہوا۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ : ہم نے اُسے اور اُس کے فوجیوں کو پڑا اور
دریا میں ڈل دیا : (فاخذناه وجنودہ فنبذناہو فی الیوم)

البتہ وہ دریا جو اُن کی حیات کا باعث تھا (یعنی اہل مصر کی معاش کا مدار جس کے پانی اور اس کے سیلاب پر تھا) ہم نے اسی کو
اُن کی موت کا سبب بنا دیا۔ اور دریا کے نیل کو جو اُن کی قدرت اور عظمت کا باعث تھا، ہم نے اُسے اُن کا قبرستان بنا دیا۔

اس آیت میں کلمہ "نبذناہو" استعمال ہوا ہے۔ اس کا مادہ "نبذ" ہے (بردن "نبض") اس کے معنی ہیں بے قدر
اور بیکار چیزوں کو دور پھینک دینا۔ یہاں قرآن کی بلاغت جاذب توجہ ہے کہ ہم نے ان بے قدر اور بیکار چیزوں (فرعون اور اُس کے
ساتھیوں) کو دور پھینک دیا اور زمین کو اُن کے ناپاک وجود سے پاک کر دیا۔

آیت کے آخر میں رُوسے معنی پیر اسلام کی طرف ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے کچھ ظالموں کا انجام کیسا تھا ؛ (فانظر کیف کان
عاقبۃ الظالمین)۔

آیت میں کلمہ "انظر" چشم ظاہر کے لیے نہیں بلکہ چشم باطن کے لیے ہے اور کلمہ "ظالمین" صرف زمانہ ماضی کے سرکش کے لیے
نہیں بلکہ اس زمانے کے سنگموں کا انجام بھی ہے۔

آیت نمبر ۴۱ میں فرمایا گیا ہے : ہم نے اُن کو ایسا پیشوا بنا دیا ہے جو آتش دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور قیامت کے روز کوئی بھی
اُن کا مددگار نہ ہوگا : (وجعلناہو ائمةً یبدعون الی الناس ویوم القیامۃ لا ینصرون)۔

مشرکین کو اس آیت کی تفسیر میں یہ مشکل پیش آئی ہے کہ خدا کا کام تو خیر کی طرف دعوت دینا ہے اور ایسے امام مقرر کرنا ہے جو
پیشوا یا اہل حق ہوں۔ اس صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا ایسے پیشوا یا اہل باطل مقرر کرے جو اُس کی مخلوق کو اگ کی طرف دعوت دیں۔
لیکن — غور کیا جائے تو یہ مشکل لا محالہ نہیں ہے۔ کیونکہ "ائمہ نازر" دوزخیوں کے پیشوا ہیں، جس وقت ضالین کے گروہ دوزخ
کی طرف حرکت کریں گے تو وہ اُن کے آگے آگے ہوں گے۔ نیز جس طرح وہ دنیا میں "ائمہ ضلال" تھے۔ آخرت میں بھی دوزخیوں کے
پیشوا ہوں گے کیونکہ وہ جہان اس جہان کی ایک وسیع ترجمیم ہے۔

دوم یہ کہ "ائمہ ضلال" خدا نہیں بناتا بلکہ یہ خود انہی کا نتیجہ اعمال ہوگا۔ یہ مسلم ہے کہ ہر ملت کا معلول اور سرکشی کا سبب فرمان الہی
تفسیر روح المعانی، تفسیر کبیر از فرزندی، تفسیر المیزان نیز دیگر تفاسیر۔ اس آیت کے متعلق۔

سے ظہور میں آتا ہے۔ چونکہ انہوں نے وہ راہ عمل اختیار کی جو امامت ضالین پر مشتمل تھی، حتیٰ کہ انہیں بتایا وہ داعی الی النار تھے اور ان
کی یہ وضع بروز قیامت ہوگی۔

پھر تاکید مزید کے لیے قرآن میں دنیا اور آخرت میں اُن کے چہرے کی کیفیت کو یوں بیان کیا گیا ہے : اس دنیا میں ہم نے
اُن کے نصیب میں لعنت کی ہے اور بروز قیامت اُن کے چہرے کو محروم و سیاہ ہوں گے : (وابتغناہو فی ہذہ الدنیا
لعنة ویوم القیامۃ ہو من المقبوحین)

"لعنت خدا" کا مطلب "رحمت الہی سے محروم ہونا ہے اور لعنت فرشتگان و مومنین سے مراد نعرین ہے جو صبح و شام اُن پر
نازل ہوتی ہے۔ ظالمین و منکبرین کبھی تو عام لعنت کے حقدار ٹھہرتے ہیں اور کبھی اُن پر خصوصیت سے لعنت و نعرین ہوتی ہے کیونکہ جو
آدمی بھی تاریخ میں ان کے حالات پڑھتا ہے ان پر لعنت و نعرین بھیجتا ہے۔

بہر حال دنیا کے یہ بدسیرت اُس جہان میں بدظورت ہوں گے۔ کیونکہ وہ دن "یوم البروز" ہوگا اور اُس روز ہر شخص کے حال سے
پردہ اٹھ جائے گا۔

چند اہم نکات

ائمہ نور اور ائمہ نازر : قرآن شریف میں دو قسم کے اماموں کا ذکر ہے۔ ایک امام تو پیشوائے متعین ہے جو
راہ راست اور دین حق کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ چنانچہ سورہ انبیاء کی آیت ۴۲ میں پیغمبروں کے ایک گروہ کے متعلق ہم یوں
پڑھتے ہیں :

وجعلناہو ائمةً یهدون بامرنا و اوحینا الیہو فعل الخیرات و
اقام الصلوٰۃ و ایتاء الزکوٰۃ و کانوا لنا عابدین
ہم نے اُن کو پیشوا بنا دیا تھا کہ وہ ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کرتے تھے۔ ہم نے
اُن کو وحی کی کہ وہ نیک کام کریں، نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور وہ صرف ہمارے ہی
عبادت گزار تھے۔

یہ ایسے امام تھے جن کے فرائض عمل بالکل واضح تھے۔ اُن کے فرائض عمل کی فہمست توحید خاص، خیر اور نیکی کی طرف لوگوں کو دعوت
دینا اور حق و عدالت پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ امامان نُور تھے کہ اُن کا سلسلہ انبیاء اور اوصیاء سے گزرتا ہوا جناب خاتم المرسلین تک آتا ہے۔
دوسری قسم کے امام رہبران ضلال و گمراہی ہیں اور آیات زیر بحث کی روش سے وہ "ائمہ نازر" ہیں۔

پیشواؤں کے دو گروہوں کی خصوصیات یہ ہیں کہ امام جعفر صادق سے مستقل ہے یہ ہیں :

۱۔ "مقبوح" کا مادہ "قبح" ہے جس کے معنی ہیں "زشتی" اور یہ کہ بعض مشرکین نے جو "مقبوح" کے معنی "دھنکارا ہوا"، "رُسوا یا
مشہوب یا اور اسی طرح کے کلمے ہیں یہ سب تفاسیر بر ماری ہیں جسے لزومی معنی کہتے ہیں۔ مگر "مقبوح" کے معنی ہی ہیں جو ہم نے بیان کیے ہیں۔

” اُن میں سے گروہ اول خدا کے فرمان کو مخلوق کی رائے اور اپنے ارادے پر مقدم رکھتے ہیں اور اسی کے حکم کو برترین فرمان سمجھتے ہیں۔“
لیکن گروہ دوم اپنی رائے کو خدا کے حکم پر مقدم سمجھتے ہیں اور اپنے حکم کو خدا کے فرمان پر ترجیح دیتے ہیں۔“

اہل نظر کے لیے ان دونوں قسم کے اماموں میں امتیاز کرنا اس معیار کی بنیاد میں آسان ہو جائے گا جو امام صادق نے بیان فرمایا ہے:

بروز قیامت جب اعمال حسن و قبیح کے مطابق مخلوق کی صف بندی ہوگی تو ہر گروہ اپنے اپنے امام کے پیچھے چلے گا۔ ناری گروہ کسی ناری امام کو تلاش کرے گا اور ڈوبی گروہ امام ہدایت کے پیچھے ہوگا۔ چنانچہ قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے:

یوم ندعوا کل اناس بامامہم

وہ ایسا دن ہوگا کہ ہم ہر گروہ کو اُس کے امام کے ساتھ بلائیں گے۔ (بنی اسرائیل - ۷۱)

ہم نے بار بار اس حقیقت کو آشکار کیا ہے کہ سپان قیامت اس تنگ دنیا کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع اور عظیم ہوگا۔ اس جہان فانی میں جن لوگوں نے جس امام کی بھی پیروی کی ہے اور اُس کے معتقد رہے ہیں، روزِ محشر بھی وہ اسی کے ساتھ ہوں گے۔ بشر بن غالب یوں بیان کرتا ہے کہ میں نے ابو عبد اللہ امام حسین علیہ السلام سے یوم ندعوا کل اناس بامامہم کی تفسیر لی تھی۔ تو امام نے فرمایا:

”امام دعالی ہدیٰ فاجابوہ الیہ ، وامام دعالی ضلالہ فاجابوہ الیہا، ہؤلاء فی الجنتہ و ہؤلاء فی النار و ہو قولہ عزوجل ”فریق فی الجنتہ و فریق فی السمیر“

ایک امام تڑو ہے جو ہدایت کی طرف بلاتا ہے اور ایک گروہ اُس کی دعوت کو قبول کر لیتا ہے اور ایک امام وہ ہے جو گمراہی کی طرف دعوت دیتا ہے اور ایک گروہ اُس کی بھی پیروی کرنے لگتا ہے۔ پہلا گروہ اہل جنت میں سے ہے اور دوسرا دوزخی ہے اور خدا کے اس فرمان کا کہ ایک فریق جنت میں ہوگا، اور ایک دوزخ میں، یہی مطلب ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ وہ فرعون جو حضرت موسیٰ کا تقاب کرتے ہوئے اپنے پیروؤں کے آگے آگے چل رہا تھا، یہاں تک کہ اُس نے اُن سب کو دریائے نیل کی موجوں میں غرق کر دیا، بروز قیامت بھی وہ اس گمراہ گروہ کے آگے آگے ہوگا اور اُنھیں دریائے آتش میں ڈبو دے گا۔ جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

یقدم قومہ یوم القیامۃ فاوردہم النار

تفسیر صافی ذیل آیات زیر بحث۔

بروز قیامت وہ اپنی قوم کے آگے آگے چلے گا۔ یہاں تک کہ وہ اُنھیں آگ میں داخل کر دے گا۔

(ہود - ۹۸)

ہم اس بحث کو مولانا کائنات امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے ایک قول پر ختم کرتے ہیں۔ آپ نے منافقین کے ایک گروہ کے متعلق فرمایا:

شعوبتوا بعدہ ، فتفتربوا الی ائمتہ الضلالۃ ، والدعایۃ الی النار بالزور والبیہتان ، فلو ہم الاعمال وجملوہم حکاماً علی رقابنا ناس یہ گروہ منافقین رسول اللہ کی وفات کے بعد بھی باقی رہا۔ اور انھوں نے آئندہ ضلال کی قربت اختیار کر لی اور اُن لوگوں کی پیروی کی جو دروغ اور بہتان کے ساتھ لوگوں کو دوزخ کی طرف بلاستے تھے۔ ان آئندہ ضلال نے اُن کے وجود سے ٹھیک فائدہ اٹھایا۔ انہیں عمدے اور منسوب عطا کیے۔ اور اُنھیں حکام بنا کر مخلوق کی گردنوں پر سوار کر دیا۔

۲۳ - وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِ مَا أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ
الْأُولَىٰ بِصَافِرٍ لِلنَّاسِ وَهَدَىٰ وَرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ
يَتَذَكَّرُونَ

۲۴ - وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْعُرْبِ إِذْ قَضَيْنَا إِلَىٰ مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنْتَ
مِنَ الشَّاهِدِينَ

۲۵ - وَلَكِنَّا أَنشَأْنَا قُرُونًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ وَمَا كُنْتَ
ثَاوِيًا فِي أَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا وَلَكِنَّا كُنَّا
مُرْسَلِينَ

۲۶ - وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّورِ إِذْ نَادَيْنَا وَلَكِنْ رَحْمَةً مِّنَ
رَّبِّكَ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أَتَهُم مِّن نَّذِيرٍ مِّن قِبَلِكَ
لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ

ترجمہ

۲۳ - پچھلی نسلوں کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے موسیٰ کو کتاب دی۔ ایسی کتاب جو لوگوں کے لیے بصیرت آفریں تھی اور ہدایت و رحمت کا باعث تھی تاکہ وہ غور و فکر کریں۔

۲۴ - اور جب ہم نے موسیٰ کی طرف فرمانِ نبوت بھیجا تو اس وقت تو مغربی گوشے میں موجود نہ تھا اور نہ تو اس واقعے کے دیکھنے والوں میں سے تھا۔

۲۵ - لیکن ہم نے مختلف زمانوں میں مختلف قومیں پیدا کیں اور ان پر طولانی زمانے گزر گئے (اور انبیاء کے آثار ان کے دلوں سے محو ہو گئے لہذا تجھے تیری آسمانی کتاب کے ساتھ بھیجا) اور تو اہل مدین میں سے نہ تھا کران، (مشرکین کو) کہ اس بارے میں ہماری آیات پڑھ کر سنانا۔ مگر یہ کہ ہم نے تجھے بھیجا (اور تجھے یہ خبریں دیں)۔

۲۶ - اور تو اس وقت طور کے پہلو میں نہ تھا۔ جب ہم نے موسیٰ کو آواز دی لیکن یہ تیرے رب کی رحمت تھی

۱۔ کرتھے یہ (اطلاعات دیں) تاکہ تو انہیں سنا کر اپنی اس قوم کو ڈرا سے جن کے پاس اس سے قبل کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔ شاید کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

تفسیر

یہ غیبی خبریں اللہ نے دی ہیں:

سورۃ قصص میں جنہی آیات بھی حضرت موسیٰ کی سرگزشت سے متعلق ہیں، ہم اس مقام پر اس کے دوسرے حصے سے متعارف ہوتے ہیں۔

اس حصے میں حضرت موسیٰ پر تواریح کے نزول اور احکام عشرہ عطا کرنے کا ذکر ہے یعنی جب نئی طاغوت کا زمانہ ختم ہو گیا (یعنی جب موسیٰ اپنی قوم کو بت پرستوں کے نرغے سے نکال لائے) تو وہ عہد شروع ہوا جب ان کی دینی نقطہ نگاہ سے تربیت اصلاح اور غیر خدا کے انکار کے بعد اللہ کی وحدانیت کا اقرار رکھنا تھا۔

چنانچہ خداوند عالم فرمایا ہے: ہم نے پچھلی نسلوں کو ہلاک کرنے کے بعد موسیٰ کو کتاب دی جو لوگوں کے لیے بصیرت آفریں اور ہدایت و رحمت کا سبب ہے تاکہ وہ غور و فکر کریں: (وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِ مَا أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ الْأُولَىٰ بِصَافِرٍ لِلنَّاسِ وَهَدَىٰ وَرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ)

آیت زیر نظر میں "قرون اولیٰ" (یعنی اعصار گزشتہ کی وہ اقوام جو ہلاک ہو گئیں) سے کونسی قومیں مراد ہیں؟ بعض مفسرین اس سے قوم نوح، عاد و ثمود اور ان جیسی ہی کافر قومیں مراد لیتے ہیں۔ کیونکہ مردہ زمانہ سے گزشتہ انبیاء کے آثار زمین سے محو ہو گئے تھے اور اب لازم تھا کہ نوح انسان کی تربیت کے لیے ایک نئی کتاب نازل کی جائے۔

بعض کے نزدیک اس سے قوم فرعون کی ہلاکت مراد ہے جو گزشتہ اقوام کی باقیات میں سے تھی کیونکہ خدا نے اس قوم کی ہلاکت کے بعد ہی موسیٰ پر توریت نازل کی۔

لیکن یہ امر تسلیم کرنے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے کہ "قرون اولیٰ" سے اس قسم کی جملہ اقوام مراد ہوں۔ "بصائر" جمع "بصیرت" کی ہے جس کے معنی "بینائی" کے ہیں۔ مگر اس مقام پر خدا کی وہ نشانیاں اور دلائل مراد ہیں جو زمین کے قلب کو متحرک کرنے کا سبب ہوں اور ہدایت و رحمت بھی اس بصیرت کے لوازم میں سے ہے۔ نیز دلوں کی بیماری اور قدرت الہی میں غور و فکر اس کا نتیجہ ہے۔

اس کے بعد یہ ذکر ہے کہ ہم نے جو کچھ موسیٰ اور فرعون کی داستان اس کی جزئیات کے ساتھ بیان کی وہ قرآن کی صداقت پر دلیل ہے۔ کیونکہ تم اس موقع پر موجود نہ تھے اور تم نے یہ واقعات اپنی آنکھوں سے نہ دیکھے تھے۔ یہ ہمارا لطف و کرم ہے کہ ہم نے مخلوق کی جدلیت کے لیے تم پر یہ آیات نازل کیں۔

طہ بصائر جمع بصیرت و ابعاد جمع بعیر

پھر فرمایا ہے کہ:۔ جب ہم نے موسیٰ کو فرمانِ نبوت دیا تو تم کو بظہور کے گوشے میں موجود نہ تھے اور تم اس واقعے کے شاہین میں سے نہیں تھے (وما کنتم بجانب الغربیٰ اذ قضینا الی موسیٰ الامر وما کنتم من الشاہدین)۔ اس مقام پر یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ میں سے ہونے سے مراد سفر کرتے ہوئے (کہ وہ راستہ سرزمینِ سینا سے گزرتا تھا) ٹھیک مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کر رہے تھے۔

اس کے برعکس جب بنی اسرائیل مصر سے شام کی طرف آئے اور داؤدی سینا سے گزرے تو انہوں نے مغرب سے مشرق کی طرف سفر کیا۔ لہذا بعض مفسرین نے سورہ شعرا کی آیت ساٹھ "فاتبعوہو مشرقین" (جو کہ فرعون اور اس کی افواج کے بنی اسرائیل کا تعاقب کرنے کے بارے میں ہے) کا یہی مطلب سمجھا ہے۔

اس کے بعد قرآن میں فرمایا گیا ہے: ہم نے مختلف زمانوں میں مختلف اقوام کو پیدا کیا مگر جب ان پر ایک طویل زمانہ گزر گیا تو انبیاء کی ہدایت اور ان کی تعلیم کا اثر ان کے قلوب سے محو ہو گیا۔ لہذا ہم نے تمہیں رسول بنایا اور قرآن عطا کیا اور گزشتہ قوموں کے حالات بیان کیے تاکہ وہ انسانوں کے لیے نصیحت کا باعث ہوں: (ولکنما نشأنا قرونًا فتطاول علیہم العمر)۔

اور تم ہرگز (اہلِ مدین کے درمیان نہ رہتے تھے) کہ تمہیں ان کی زندگی کے حالات معلوم ہوتے، اور وہ حالات تم انہیں (اہلِ مدین) نہ سنا تے، (وما کنتم تاویبا فی اہل مدین تتلوا علیہم آیاتنا)۔ لیکن ہم نے تمہیں رسول بنا کر بھیجا اور مزار بہ سال باقبل کے تاریخی حالات کا علم تمہیں بخشا تاکہ تم اس مخلوق کی ہدایت کرو: (ولکنما کنتم مرسلین)۔

اسی مضموم کی تاکید کے لیے اس عبارت کا اضافہ کیا گیا کہ: جب ہم نے موسیٰ کو ندا دی اور اس کے نام فرمانِ نبوت صادر کیا: (وما کنتم بجانب الظور اذ نادینا)۔

مگر ہم نے تمہیں جن حالات سے مطلع کیا ہے وہ اس رحمت کا تقاضا ہے کہ تم ان کے وسیلے سے اس قوم کو ڈراؤ جن کے پاس قبل ازیں کوئی ڈرانے والا نہیں پہنچا، شاید کہ وہ نصیحت حاصل کریں: (ولکن رحمة من ربک لتذرقوہم ما اناہم من نذیر من قبلك لعلہم یتذکرون)۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس آیت میں نواسہ مراد وہ ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کے سردار کے ساتھ کوہِ طور پر گئے تھے اور انہیں خدا کی آواز سنائی دی تھی۔ لیکن یہ احتمال بہت بعید ہے کیونکہ ان آیات میں اشارہ ہے ان طالبِ کربوں کو تا قبل آیات میں آپکے ہیں اور رسولِ اکرمؐ نے وہ حالت گزری کہ بتائے بجز وہ آواز لگتا شاہد ناظر نہ تھے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ آیاتِ مقبلہ میں حضرت موسیٰؑ کا دین سے مصر کی طرف سفر کرتے اور داؤدی ظہور میں پہلی دفعہ کلامِ خدا کو سننے کا ذکر ہے۔

۱ "تاوی" کا مادہ "قَوَّی" ہے جس کے معنی ہیں "سختقل طور پر پیام کرنا" اسی وجہ سے جاسے قرآن کو "مشوئی" کہتے ہیں۔
۲ حضرت موسیٰؑ اور جناب ختمی مرتبت رسالتِ مآب کے درمیان قریباً دو ہزار سال کا فاصلہ ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ خدا جناب رسالتِ مآب کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ: وہ بیدار کن اور ہوش آور واقعات جو ماضی بعید کی قوموں پر گزر چکے ہیں اور تم نے انہیں اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، ہم نے تمہیں ان سے آگاہ کیا ہے تاکہ تم انہیں اس گمراہ قوم کو سناؤ کہ ممکن ہے وہ نصیحت حاصل کریں۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن میں یہ کس طرح کہا گیا ہے کہ:۔

اس قوم (زمانہ رسول کے عربوں) کے پاس تم سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا۔

جبکہ یہ بھی مسلم ہے کہ رُوسے زمین کبھی حجتِ الہی سے خالی نہیں رہتی۔ اور اس قوم (عرب) میں بھی پیغمبرانِ صاحبِ کتاب کے اوصیا موجود رہے ہیں۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ:۔

اس قوم گمراہ کے پاس ایک صاحبِ کتاب پیغمبر اور ڈرانے والے کو بھیجنے کی غایت واضح ہے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰؑ اور پیغمبرِ اسلامؐ کے ظہور کے درمیان کئی سو سال گزر چکے تھے۔ اس دوران میں کوئی اولوالعزم پیغمبر نہیں آیا تھا اور یہ منہد اور محمد عرب اسی پہلے سے راہِ خدا سے منحرف ہو گئے تھے۔

امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب فرماتے ہیں:

ان الله بعث محمداً وليس احدٌ من العرب يقروك تائبا ولا يدعي منبوة فساق الناس حتى يواهو محلتهم وبلنهم متبعاتهم
جس وقت خدا نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث کیا (اس وقت یہ حال تھا کہ کوئی عرب بھی آسمانی کتاب نہیں پڑھتا تھا اور وہاں کوئی بھی معنی نبوت نہ تھا۔ آنحضرتؐ نے انہیں وہ مقام عطا کیا جو ان کے لائق تھا اور انہیں نجات کی منزل پر پہنچا دیا۔

(بخ البلاغہ علیہ ۳۷)

۲۷- وَلَوْلَا اَنْ تُصِيبَهُمْ مُّصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمْتْ اَيْدِيَهُمْ فَيَقُولُوا رَبَّنَا
 لَوْلَا اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنُ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
 ۲۸- فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَا اَوْتِيَ مِثْلَ مَا اُوْتِيَ مُّوْسٰى اَوْلُوْ
 يَكْفُرُوْا اِمَّا اُوْتِيَ مُّوْسٰى مِنْ قَبْلُ قَالُوْا وَسِحْرٌ تَظْهَرُ اَسَوْ قَالُوْا اِنَّا بِكُلِّ كَفْرٍ وَّوْنَ
 ۴۹- قُلْ فَاَلُوْا بِكِتٰبٍ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهَا اتَّبَعُوْهُ
 اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ
 ۵۰- فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيبُوْا لَكَ فَاعْلُوْا مَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوٰ اَهُمْ وَّوَمَنْ
 اَضَلُّ مِمَّنْ اَتَّبَعَ هَوٰهٗ بِغَيْرِ هُدٰى مِنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا
 يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ

ترجمہ

۲۷- اگر کسی پیغمبر کے بھیجنے سے پہلے ہم ان کے اعمال پر انہیں سزا دیتے تو وہ کہتے: پروردگار! تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہیں بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور مومنین میں سے ہوتے۔
 ۲۸- مگر جب ہماری طرف سے ان کے پاس حق آیا تو انہوں نے کہا کہ اس پیغمبر کو ایسی چیز کیوں نہیں دی گئی تھی جیسی حضرت موسیٰ کو دی گئی تھی۔ کیا ہمارے سزاؤں نے ان کی طرح ان آیات کا انکار نہیں کیا تھا جو اس سے قبل موسیٰ کو دی گئی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ دونوں (موسیٰ اور ہارون) جادوگر ہیں اور انہوں نے ہا ہم سازش کر لی ہے (تاکہ ہمیں گمراہ کریں) اور انہوں نے کہا کہ ہم ان سب باتوں کے منحرف ہیں۔
 ۴۹- کہہ دے کہ اگر تم سچے ہو (کہ قرآن اور قرآن الشک کی طرف سے نہیں ہیں) تو ان دونوں سے زیادہ ہدایت بخش کتاب لے آؤ تاکہ میں اس کی پیروی کروں۔
 ۵۰- پس یہ لوگ اگر تیری تجویز قبول نہ کریں تو جان لے کہ یہ لوگ صرف اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور اس سے زیادہ کوئی گمراہ ہو گا کہ جو اپنی خواہشات کی پیروی کرے اور اللہ کی ہدایت کو قبول نہ کرے۔ یقیناً خدا عالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

تفسیر

گریز از حق کے لیے نوبہ نوبہ ہانے:

گذشتہ آیات میں پیغمبر کے بھیجنے کا مقصد ڈرانا اور خوف دلانا بیان ہوا تھا۔ زیر نظر آیات میں سے پہلی میں خدا کے اس طرفدار کا ذکر ہے جو کسی قوم کی طرف رسول بھیجنے کی صورت میں ظہور میں آتا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے: پیغمبر کو مبعوث کرنے سے پہلے ہم انہیں ان کے اعمال پر سزا دیتے تو وہ کہتے کہ خدایا تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہیں بھیجا تاکہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور مومنین میں سے ہو جاتے۔ اگر یہ وجہ نہ ہوتی تو ان کے اعمال اور فکر کی وجہ سے کسی پیغمبر کے بھیجنے کی ضرورت بھی نہ تھی، (ولولا ان تصیبهو مصیبه بما قدمت ایدیہو فیقولوا ربنا لولا ارسلت الینا رسولا فنتبع آیاتک ونکون من المؤمنین)۔

اس آیت میں اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ راہ حق روشن ہے اور ہر عقل شکر اور ریت پرستی کے باطل ہونے کا حکم لگاتی ہے اور ان کے بہت سے اعمال مثلاً ظلم اور نا انصافیاں ایسے ہیں جنہیں عقل قابل نفرت سمجھتی ہے۔ اور وہ ایسے قبیح ہیں کہ بددن ارسال پیغمبر ہی مستحق سزا ہیں۔

لیکن اس کے باوجود کہ ان کی بد اعمالیوں کے بارے میں حکم عقل واضح اور روشن ہے، خدا ان کے ہر عذر کی نفی اور تمام نجات کے لیے، ان کی طرف پیغمبروں کو آسمانی کتابیں اور معجزات کے ساتھ بھیجتا ہے تاکہ ان میں سے کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہماری بے خبری تو کسی نہ ہمارے نہ ہونے سے تھی اگر ہمارے لیے خدا کی طرف سے کوئی رہبر نہ ہوتا تو ہم نجات یافتہ اور راہ ہدایت پر ہوتے۔

بہر حال یہ آیت، ان آیات میں سے ہے جو "پیغمبروں کو بھیجنے کی صورت میں" خدا کے لطف کے ضروری ہونے کو بیان کرتی ہے اور یہ ثابت کرتی ہے کہ خدا کسی قوم کو اس کی طرف پیغمبر بھیجنے سے پہلے اس کے گناہوں کی سزا نہیں دیتا۔ جیسا کہ سورہ نسا کی آیت ایک سو پندرہ میں مذکور ہے:

رسلا مبشرین ومنذریں لئلا یكون للناس علی اللہ حجة بعد الرسل
 وکان اللہ عزیزاً حکیماً

ہم نے وہ پیغمبر بھیجے جو بشارت دینے اور ڈرانے والے تھے تاکہ ان پیغمبروں کے بعد لوگوں کے لیے کوئی حجت باقی نہ رہے اور اللہ تو نا اور حکیم ہے۔

بعض مفسرین نے یہ تصریح کی ہے کہ "لئلا یكون للناس علی اللہ حجة بعد الرسل" کا جواب محذوف ہے۔ اس شرط کی جزا "لما ارسلنا رسولا" کا لما وجوباً اور اللہ رسل ہونے کا وجوباً ہے۔ دوسری تفسیر صحیح تر اور قریب ترین حقیقت ہے۔ بہر حال یہ کلام ان احکام سے مربوط ہے جن کا عقل مستقلاً ادا کر سکتی ہے۔ مگر خدا کی طرف سے بعثت انبیاء اور اولیاء سے لازم ہے۔ ہر چند کہ پیغمبروں کی آمد کے فائد میں سے ایک احکام عقلیہ کی تاکید بھی ہے مثلاً بطلان شرک و ظلم کی نجات اور شر و فساد کے معزات۔

اس کے بعد قرآن میں ان کا فریقوں کی ہمانہ تراشیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ "ہماری طرف سے پیغمبر بھیجے جانے کے بعد نبیوں نے ہمانہ سازی کو نہ چھوڑا۔ اور اپنی قدیم مخرق راہوں پر پلٹے رہے۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے: جس وقت ان کے پاس ہماری طرف سے حق آیا تو انھوں نے کہا کہ اس پیغمبر کو دیے ہی ہجرت کیوں نہیں دیتے گئے جیسے کہ موسیٰ کو دیتے گئے تھے: (فلما جآءہم الحق من عندنا قالوا لولا اوتق مثل ما اوتق موسیٰ)۔

اُس کے ہاتھ میں عصائے موسیٰ کیوں نہیں ہے؟ وہ یہ بیٹھا کیوں نہیں رکھتا؟ اُس کے لیے دیا کیوں نہیں بچٹ جانا؟ اُس کے دشمن غرق کیوں نہیں ہو جاتے؟ ایسا کیوں نہیں ہوتا؟ ویسا کیوں نہیں ہوتا؟ یہیں اعتراضات اُن کفار کے۔

قرآن مجید میں ان ہمانہ تراشیوں کا اس طرح جواب دیا گیا ہے۔

کیا گزشتہ ہمانہ بزرگوں نے ان ہجرت کا جو موسیٰ کو دیتے گئے تھے اسی طرح انکار نہیں کیا تھا: (اولو یکنفرو بما اوتق موسیٰ من قبل)۔

کیا اُس عہد کے کفار نے یہ نہیں کہا تھا کہ: یہ دونوں (موسیٰ و ہارون) ساحر ہیں۔ ان دونوں نے باہم شراکت کر لی ہے (تاکر بکر گمراہ کریں) ہم ان دونوں کا انکار کرتے ہیں: (قالوا سحران تظاہرا وقالوا انا بكل کافرون)۔

اس مقام پر کلمہ "سحران" استعمال ہوا ہے۔ حسب قاعدہ ساحر ان ہونا چاہیے تھا۔ کلمہ "سحران" شدت تاکید کے لیے ہے کیونکہ عربوں کی یہ فطرت تھی کہ جب وہ کوئی بات زور سے کہنا چاہتے تھے تو وہ صفت کو عین ذات قرار دے دیتے تھے۔ مثلاً عادل شخص کو "عادل عدالت، ظالم کو "عین ظلم" ساحر کو "عین سحر" وغیرہ۔

اس مقام پر اس احتمال کی بھی گنجائش ہے کہ "کلمہ" "سحران" سے مراد حضرت موسیٰ کے دو بڑے بھروسے "نصا اور یہی بیٹا" ہوں۔ اگر اس مقام پر تریڈیا یہ کہا جائے کہ کفار ہصر کے انکار کا کفار کے انکار سے کیا ربط ہے؟ تو اس کا جواب واضح ہے۔ اور وہ یہ کہ اہل کفر کی ہمانہ جوئی کئی تازہ بات نہیں ہے۔ تمام اہل کفر کا مزاج یکساں ہوتا ہے اور اُن کے اعتراضات بھی ایک دوسرے کے شائبہ ہوتے ہیں اور ان کے کافرانہ منصوبے بھی یکساں ہوتے ہیں۔

آیت مافوق کی جو تفسیر ہم نے بیان کی وہ تو شریعت سے پاک ہے۔ مگر کچھ مفسرین نے اس آیت کی کسی اور طرح سے بھی تفسیر کی ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ "سحران تظاہرا" سے مراد دو پیغمبر حضرت موسیٰ اور جناب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں کیونکہ مشرکین عرب یہ کہتے تھے کہ یہ دونوں ساحر تھے اور ہم دونوں کا انکار کرتے ہیں۔

ان مفسرین نے اپنے قول کی تائید میں ایک تاریخی واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ:-

اہل کفر نے چند لوگوں کو علمائے یہود کے پاس ایسے وقت بھیجا کہ وہ ان کی عید کا دن تھا۔ اُن لوگوں نے علمائے یہود سے سوال کیا کہ کیا واقعہ تمہارے پیغمبر خدا ہے؟

اُن علمائے جواب دیا کہ ہم نے تو ریت میں اُن کا نام اُن کی صفات کے ساتھ پڑھا ہے۔

ان نئی باتوں نے واپس آکر مشرکین کو کھرا کر دیا۔ اُس وقت کفار نے "سحران تظاہرا"۔۔۔ وانا بكل کافرون

کہا (یہ دونوں ساحر تھے اور ہم دونوں کا انکار کرتے ہیں) لیکن دو کمیتوں پر غور کرنے سے یہ تفسیر حقیقت سے بعید معلوم ہوتی ہے۔

اول یہ کہ:-

روایات اور تاریخ سے یہ بات بہت کم ہے کہ مشرکین عرب نے حضرت موسیٰ پر ساتری کا اہتمام لگایا ہو اور شاہد ہیں اس قسم کا احتمال ظاہر کیا گیا ہے۔

دوسرے یہ کہ:-

یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ جانتے ہوئے بھی کہ حضرت موسیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہشت کے درمیان قریبا دو ہزار سال کا فاصلہ ہے۔ یہ اذکار سے کہ یہ دونوں جاؤ گرتھے اور انہوں نے ایک دوسرے سے سازش کر رکھی تھی۔ نیز کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی جاؤ گرتھوں سال قبل یہ جان لے کہ آئندہ کیسا آدمی پیدا ہوگا اور وہ کیا دعویٰ کرے گا۔

بہر حال مُفسد طبع مشرکین کو اس امر پر اصرار تھا کہ پیغمبر اسلام کے پاس حضرت موسیٰ جیسے ہجرت کیوں نہیں ہیں۔ نیز نہ تو وہ اُس شہادت اور اُن علامات کی طرف اعتنا کرتے تھے جو توریت میں پیغمبر اکرم کے متعلق موجود تھیں اور نہ وہ قرآن اور اُس کی بڑی عظمت آیات ہی پر ایمان لاتے تھے۔ لہذا قرآن میں جناب رسالت سے یہ کہا گیا ہے (اے پیغمبر) ان سے کہہ دو کہ اگر تم سچ بڑھتا رکھتے ہو کہ یہ دونوں کتابیں خدا کی طرف سے نہیں ہیں تو اس کتاب سے زیادہ نورانی اور ہدایت بخش کوئی اور کتاب خدا کی طرف سے لے آؤ تاکہ میں اس کی پیروی کروں: (قل فأتوا بکتاب من عند اللہ ہواہدیٰ منہما لبقہ ان کنتم صادقین)۔

لیکن — وہ کفار کہ جن طلب نہ تھے بلکہ صرف ہمانہ بڑھتے۔ اس لیے وہ کسی اور عیب کتاب ہدایت کے طلب گار اور پیغمبر کے دارائے ہجرت ہونے پر بھروسے اور اس حقیقت سے غافل تھے کہ قرآن سے بڑا معجزہ اور اس سے بہتر کتاب ہدایت اور کونسی ہو سکتی تھی۔ اگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس قرآن کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوتا تو یہی اُن کی حقیقت رسالت کے لیے کافی تھا۔

اس کے بعد ان الفاظ کا اضافہ ہے۔ (اے پیغمبر) اگر یہ کفار تمہارے پیغام کو قبول نہیں کرتے تو جان لو کہ اپنی ہوس کی پیروی کرتے ہیں: (فان لسو یستجیبوا لک فاعلوا فما یقہون اہواءہم)۔

کیونکہ جو انسان ہوا پرست نہیں ہوتا وہ ایسی منطقی پیشکش کے سامنے سر جھکا دیتا ہے لیکن وہ کسی طرح بھی راہ راست پر نہیں آتے اور پیغمبر کے بہر پیغام کو کسی نہ کسی بہانے سے روک دیتے ہیں۔

کیا کوئی شخص اُس سے بھی زیادہ گمراہ تر مل سکتا ہے جو اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی کر کے کسی بھی ہدایت الہی کو قبول نہیں کرتا: (ومن اضلّ ممن اتبع ہونہ بغیر ہدیٰ من اللہ)۔

یہ مسلم ہے کہ خدا ظالمین کے گروہ کی ہدایت نہیں کرتا: (ان اللہ لایہدی القوم الظالمین)۔

اگرچہ وہ لوگ گمراہ تھے لیکن اگر اپنی گمراہی کو محسوس کر کے حق طلب ہوتے تو لطف الہی بہ متقاضی "والذین جاہدوا

فینا نھد یتھوسبنا"۔

جو لوگ ہماری طرف کوشش کرتے ہیں ہم انہیں ہدایت کے راستوں کی راہنمائی کرتے ہیں۔

ان کے سوا سب مال ہوتا۔ مگر وہ شکر نہیں۔ وہ اپنی ذات پر بھی نغمہ کرتے ہیں اور اس معاشرے پر بھی جس میں وہ رہتے ہیں۔ ان کا مقصد حیاتِ فساد اور عناد کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس حالت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ راہِ ہدایت کے لیے ان کی مدد کرے۔

خواہشات پرستی گمراہی کا سبب:

مذکورہ بالا آیات میں ان دونوں باتوں (یعنی خواہش پرستی اور گمراہی) کا رابطہ صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کو گمراہ ترین کہا گیا ہے جنہوں نے اپنی ہوائے نفس کو اپنا رہبر بنا لیا ہے اور ہدایتِ الہی کو ہرگز قبول نہیں کرتے۔ اور ہوائے نفس، عقل کی آنکھوں پر عظیم پردہ ہے۔

ہوائے نفس کسی موضوع سے ایسا دل بستہ کر دیتی ہے کہ انسان میں اور اک حقیقت کی قابلیت ہی نہیں رہتی کیونکہ اولاً حقیقت کے لیے واقعات کو بطور امر مطلق کے تسلیم کرنا اور ہر قسم کے پیشگی فیصلے اور زحمان طبع کو ترک کرنا ضروری ہوتا ہے۔

ہر وجود جو عینیت خارجی رکھتا ہے، خواہ وہ صحیح ہو یا شریک، ہمارے سیلانِ طبع کے موافق ہو یا مخالف، ہمارے ذاتی مفاد سے ہم آہنگ ہو یا نہ ہو، اسے بلا تقييد و شرط تسلیم کر لینا ہی اور اک حقیقت کہلانا ہے۔ مگر یہ مجرور اصول انسان کی ہوائے نفس سے مطابقت میں رکھتا۔

اس موضوع پر ہم نے سورۃ فرقان کی آیت نمبر ۲۲ کے ذیل میں جلد ۸ میں مفصل بحث کی ہے۔

یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ متعدد روایات میں آیت فوق کی تفسیر میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ گمراہ لوگ وہ ہیں جنہوں نے فرستادہ خدایاں ہر امام کو قبول نہیں کیا اور صرف اپنی رائے پر جمے ہوئے ہیں۔

یہ روایات حضرت امام باقرؑ، امام جعفر صادقؑ اور دیگر ائمہِ ہدیٰ سے نقل ہوئی ہیں۔ اپنے مصداق کے لحاظ سے قطعی روشن ہر مرتبہ حق الیقین ہیں۔

دوسرے نظموں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان ہر وقت ہدایتِ الہی کا نیاز مند ہے اور یہ ہدایت کبھی تو آسانی کتاب میں جلوہ گر آتی ہے، کبھی وجودِ پیغمبر اور اس کی شفقت میں، کبھی اُس کے مصوم اوصیا میں اور کبھی عقل و فرد کے استدلال میں۔

ہر کیفیتِ افکارِ ہدایت سے بہرہ مند ہونے کے لیے، لازم ہے کہ انسان اور امر الہی پر بے چون و چرا عامل ہو اور کسی امر میں بھی اپنی رائے نفس کو دخل نہ دے۔

۵۱

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝

۵۲

الَّذِينَ آتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِهِ هُمْ بِهِ يُؤْمِنُونَ ۝

۵۳

وَإِذْ آتَيْنَاهُمْ عَلَيْهِمْ قَالُوا آمَنَّا بِهِ إِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّنَا إِنَّكُنَّا

مِنْ قَبْلِهِ مُسْلِمِينَ ۝

۵۴

أُولَئِكَ يُؤْتُونَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرُءُونَ

بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ۝

۵۵

وَإِذْ أَسْمَعُوا اللَّغْوَ اعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ

أَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ ۝

ترجمہ

۵۱

ہم ان لوگوں کے پاس بے درپے قرآن کی آیات بھیجتے رہے کہ شاید وہ نصیحت حاصل کریں۔

۵۲

وہ لوگ جنہیں ہم نے قبل ازیں کتاب دی تھی وہ اس (قرآن) پر ایمان لاتے ہیں۔

۵۳

اور جس وقت ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے۔ یقیناً یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے برحق ہے اور ہم پہلے ہی سے مسلمان تھے۔

۵۴

ان لوگوں کو دو گنا بدلہ دیا جائے گا کیونکہ وہ صبر کرتے رہے ہیں اور وہ جہلان سے ساتھ بُرائیوں کو دُور کرتے رہے ہیں۔ اور ہم نے انہیں جو رزق دیا ہے اُس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔

۵۵

اور جب وہ لغو اور بے ہودہ باتیں سنتے ہیں تو اُس سے منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو ہمارے اعمال اور تمہیں تمہارے اعمال مبارک ہوں۔ تم پر ہمارا (دُور کا) سلام ہے، ہم جاہلوں کے خواستگار نہیں ہیں۔

شان نزول

آیات فوق کی شان نزول کے بارے میں مفسرین اور راویان حدیث نے گونا گوں روایات نقل کی ہیں۔ ان تمام روایات میں مشرکوں کی ایک ہی وجہ اور وہ یہ ہے کہ آیات قرآن اور پیغمبر اسلام کی رسالت پر عملائے یہود و نصاریٰ کی ایک جماعت کا ایمان لانا۔

چنانچہ — سعید ابن جبیر نے روایت کی ہے کہ یہ آیات ان ستر عیسائی علماء کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جنہیں نجاشی نے عیشہ سے تحقیق حال کے لیے مکر بھیجا تھا۔ جب جناب رسالت نے ان کے سامنے سورہ لیس پڑھی تو ان پر رقت طاری ہو گئی اور وہ رونے لگے اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیات نجران کے عیسائیوں کی ایک جماعت کے متعلق نازل ہوئی تھیں، جو آنحضرت کی خدمت میں آئے تھے۔ سب انہوں نے قرآن کی آیات نہیں تو ایمان لے آئے۔

بعض لوگ ان آیات کو "نجاشی" اور اس کے اہل دربار کے متعلق سمجھتے ہیں۔

بعض لوگوں نے ان کی شان نزول حضرت سلمان فارسی، اور عملائے یہود کی ایک جماعت (مثلاً عبداللہ بن سلام، تمیم الداری اور مارود عبدی وغیرہ) کے متعلق سمجھا ہے۔

بعض راوی ان آیات کا مشاز الیہ چالیس روشن ضمیر عیسائی علماء کو بتاتے ہیں کہ جن میں سے بیس تو جناب جعفر ابن ابوطالب کے ماتھے سے مدینہ آئے تھے اور آٹھ شام سے آئے تھے جن میں سے مشہور بحیرہ راہب شامی بھی تھا۔

البتہ ان میں سے پہلی تین قسم کی روایات ان آیات کے مکر میں نازل ہونے سے مناسبت رکھتی ہیں اور ان لوگوں کے قول کی نیکرکتی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہ کئی سورہ کی ہے۔ لیکن چوتھی اور پانچویں قسم کی روایات اس امر کی دلیل ہیں کہ یہ چند آیات مدینہ میں نازل ہوئیں اور یہ روایات ان لوگوں کے قول پر گواہی ہیں جو ان آیات کو مدنی سمجھتے ہیں۔

برکینف — جو بھی ہو — یہ آیات اس امر پر شاہد نااطق ہیں کہ اہل کتاب کے علماء میں سے ایک جماعت نے آیات قرآن کی کلام قبول کر لیا تھا کیونکہ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ رسول اللہؐ ایسی حالت میں کہ اہل کتاب میں سے کوئی بھی ان پر ایمان نہ لایا ہوتا، ایسی بات دین کیونکہ اگر یہ آیات مطابق واقع نہ ہوتیں تو مشرک فوراً آپ کی تکذیب کرتے اور شور مچانے لگتے۔

تفسیر

حق طلب اہل کتاب

گوشہ آیات میں ان ہمانوں کا ذکر تھا جو مشرک لوگ حقائق قرآن کو تسلیم نہ کرنے کے لیے تراشا کرتے تھے اور ان آیات میں جو

ط. ب. تفسیر فی ظلال القرآن، جلد ۶، صفحہ ۲۵۸، ۲۵۹۔

۵. مجمع البیان، جلد ۴، صفحہ ۲۵۸۔

زیر بحث ہیں ان آمادہ دلوں کا ذکر جسے جنہوں نے کلام الہی کو سن کر حق کو قبول کیا، پھر اس سے وفادار رہے اور دل و جان سے اس کی اطاعت کی، جب کہ جہلا کے تاریک دل جن سے قرہ بھر بھی متاثر نہ ہوئے۔

چنانچہ فرمایا گیا ہے: ہم نے آیات قرآن کو پچھ درپچھ ان کے پاس بھیجا کہ شاید وہ نصیحت حاصل کریں، (ولقد وصلنا لهم القول لعلہم یتذکرون)۔

یہ آیات بارش کے نظروں کی طرح مسلسل ان پر نازل ہوئیں۔ ان آیات کی شکلیں نوح بہ نوح تھیں اور ان کی کیفیات مختلف تھیں۔ ان میں کبھی حسن عمل کی جزا کا وعدہ تھا اور کبھی عمل سُور کے نتیجے میں دوزخ کی وعید تھی۔ کبھی ان میں نصیحت و پند تھی اور کبھی خوف دلایا گیا تھا کبھی تو ان میں عقلی استدلال تھا اور کبھی گزشتہ قوموں کی عبرت الخیر اور شریخش تاریخ بیان کی گئی تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہ آیات ہر حیثیت سے بہت کامل اور نہایت ہم آہنگ تھیں۔ جس دل میں قبول حق کی قرہ بھر بھی استعداد ہو وہ انہیں خود بخود جذب کر لیتا ہے لیکن کر دل لوگوں نے انہیں قبول نہیں کیا۔

لیکن وہ لوگ جنہیں قبل ازین تم نے آسمانی کتاب دی تھی (یہود و نصاریٰ) وہ قرآن پر ایمان لاتے ہیں (الذین آتیناہم الکتاب من قبلہ ہو بہ یؤمنون)۔

کیونکہ وہ قرآن کو ان علامات کے مطابق پالتے ہیں جو وہ اپنی آسمانی کتابوں میں دیکھتے ہیں۔ اس مقام پر جاؤ تو یہ امر ہے کہ یہ ایمان لانے والے، اہل کتاب، کچھ افراد تھے لیکن آیت فوق میں صرف اہل کتاب کہا گیا ہے، جو کلمہ عمومی ہے۔ اس میں کوئی قیادہ تخصیص نہیں ہے۔ لیکن جسے کہ اس سے یہ مراد ہو کہ جو لوگ ایمان لاتے صرف وہی اہل کتاب تھے اور باقی کچھ نہیں تھے۔

اس کے بعد اس مضمون کا اضافہ کیا گیا ہے، جس وقت ان کے سامنے یہ آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لاتے، یہ یقیناً حق ہیں اور ہمارے خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہیں، (واذا تتلى علیہم قالوا ما متنا بہ انہ الحق من ربنا) البتہ ان کے لیے ان آیات کی تلاوت ہی کافی تھی تاکہ وہ "آمتنا" کہیں اور تصدیق کریں۔ اس کے بعد ان الفاظ کا اضافہ ہے، ہم نے پیغام الہی کو آج ہی قبول نہیں کیا، بلکہ ہم تو پہلے ہی سے مسلمان تھے۔ (انا کنا من قبلہ مسلمین)۔

ہم نے اس پیغمبر کے آمد کی علامات اپنی آسمانی کتابوں میں دیکھی ہیں۔ ہمیں ان علامات کے مطابق آنے والے سے پہلے ہی اور بے چینی سے ہم اس کا انتظار کر رہے تھے اور جب ہم نے اپنے اُس باؤ کو پایا جس کا انتظار تھا تو فوراً دل و جان کے ساتھ اُس پر ایمان لے آئے۔

ط. ب. "وصلنا" کا مادہ "وصل" ہے۔ جس کے معنی ارتباط دینے اور متصل کرنے کے ہیں مگر جب یہ مادہ باب تفسیر میں جاتا ہے

تو اس میں کثرت اور تاکید کے معنی بھی شامل ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد قرآن میں اس تقلید شکن اور حق طلب گروہ کی جزائے بارے میں فرمایا گیا ہے: "یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے مبر شکیبان کی جیسے دوگنا اجر پائیں گے: (أُولَئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرْتينَ بِمَا صَبَرُوا)۔"

انہیں ایک دفعہ تو اس نیکی کا اجر ملے گا کہ وہ اپنی آسمانی کتاب پر ایمان لانے اور اس کے احکام کے پابند اور وفادار رہے اور دوسرا اجر اس بات کا ملے گا کہ وہ پیغمبر اسلام پر ایمان لانے اور انہوں نے اقرار کیا کہ یہ وہی پیغمبر موعود ہیں کہ جن کے آنے کی سابق کتابوں میں خبر دی گئی تھی۔

اس مقام پر اس احتمال کی بھی گنجائش ہے کہ انہیں دوگنا اجر ملنے کا سبب یہ ہے کہ وہ پیغمبر اسلام پر ان کے ظہور سے پہلے ہی ایمان رکھتے تھے اور ظہور کے بعد بھی انہوں نے اپنے ایمان کا اعلان کیا۔ گزشتہ آیات سے یہ معنی سمجھ میں آتا ہے۔ ان اہل ایمان نے ہر دو مرحلوں میں اپنے اثبات ایمان کے لیے نہایت صبر و استقامت کا ثبوت دیا۔ نہ تو یہود و نصاریٰ کے خرافات پر ایمان لانے کے عمل کو پسند کرتے تھے اور نہ وہ معاشرہ جو اپنے آباء و اجداد کے عقائد کا متقلد تھا انہیں سابق دین سے دست برداری کی اجازت دیتا تھا۔ تاہم — وہ ثابت قدم رہے اور انہوں نے عارضی منافع اور ہوائے نفس کو ٹھکرا دیا اور — خدا کی طرف سے دوگنا اجر کے مستحق ٹھہرے۔

اس کے بعد قرآن میں ان کے ایک سلسلہ اعمال کی طرف اشارہ ہے۔ ان کے یہ اعمال ایک دوسرے سے زیادہ قدر و منزلت رکھتے ہیں اور وہ ہیں حسنت کے ذریعہ سے سینات کو دُور کرنا، خدا کی عطا کردہ نعمتوں میں سے انفاق کرنا اور جہلا کے ساتھ بزرگانِ بڑاؤ کرنا۔ ان تین صفات کے ساتھ صبر و شکیبائی کا اضافہ کیا جائے تو چار ممتاز صفات ہو جاتی ہیں۔

سب سے پہلے یہ ذکر ہے کہ:۔۔۔ یہ لوگ بدلوں کو نیکیوں کے ذریعے دُور کرتے ہیں: (وَبِذَرُوا بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ)۔ یہ لوگ بُری باتوں کو اپنی نیک گفتاری سے، شکر کو اہم بالعمد سے، جاہلوں کے جمل کر اپنے علم سے، عداوت اور کینہ زہری کو محبت سے، قطع محبت کو اپنی دوستی اور صلہ رحمی سے دُور کرتے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو جملے اس کے کہ بدی کا بدلہ بدی سے دیں، بدی کو نیکی کے ذریعے دفع کرتے ہیں۔

بڑائیوں کے ساتھ متعلقے، بالخصوص آمادہ ہمت و حرم افراد کے مقابلے میں مذکورہ روش نہایت مؤثر ہے اور قرآن میں بار بار اس روش کا ذکر کیا گیا ہے۔

ہم نے اس موضوع کو جلد ۵ میں سورہ رعد کی آیت ۲۲ اور سورہ مؤمنوں کی آیت ۹۶ کے ذیل میں تفصیلاً تحریر کیا ہے۔ ان مؤمنین کی ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ: ہم نے انہیں جو رزق دیا ہے وہ اس میں سے انفاق کرتے ہیں: (وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ)۔

یہ مؤمنین اپنے مال اور ثروت میں سے ہی انفاق نہیں کرتے بلکہ اپنے علم و دانش، اپنی فکری اور جسمانی طاقت اپنی معاشرتی حیثیت بھی (کہ یہ سب خدا کی عطا کردہ نعمتیں ہیں) مستحقین اور نیاز مندوں کے لیے کام میں لاتے ہیں۔

نیز ان مؤمنین کا ایک اور امتیاز عملی یہ ہے کہ جس وقت وہ کوئی لغو اور بیہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے مُنہ پھیر لیتے ہیں:

رواذا سمعوا اللغو اعرضوا عنه)۔ اور ہرگز لغوات کے جواب میں لغوات نہیں کہتے اور جمل کا جواب جمل سے نہیں دیتے بلکہ، یہود کہنے والوں سے کہتے ہیں کہ ہمارے اعمال ہمارے ساتھ ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے ساتھ: (وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلكو أَعْمَالُكُمْ)۔ نہ تو تمہیں ہمارے جرمِ اعمال کی سزا ملے گی اور نہ ہمیں تمہارے جرمِ اعمال کی مگر تم جلد ہی جان لو گے ہم میں سے ہر ایک کے عمل کا انجام کیا ہو گا۔

اس کے بعد اس طلب کا اضافہ ہے کہ وہ مؤمنین ان جملہ سے (جو یہ گواہی دیتے ہیں کہ اپنی اذیت ناک باتوں سے ایمان اور نیکی کا راز اور غصہ و لالچ اور ان کی دل آزاری کریں) رخصت ہو جاتے ہیں اور ان سے یہ کہتے ہیں: تمہیں ہمارا سلام ہو، ہم جاہلوں کے طالب نہیں ہیں: (سَلَامٌ عَلَیْكُمْ لَا نَبْتَغِ الْجَاهِلِینَ)۔

ہم نہ تو بدگو ہیں اور نہ جاہل اور فسادی، اور نہ ایسے لوگوں کو پسند کرتے ہیں۔ ہم تو روشن ضمیر اہل دانش اور علمائے عامل اور سچے مؤمنین کے خواہاں ہیں۔

اس عنوان سے وہ لوگ بجائے اس کے کہ اپنی توانائیوں کو جاہلوں، کور دلوں اور بے خبر یہود کہنے والوں کے مقابلے میں ضائع اور برباد کریں، بڑی متانت سے ان سے کنارہ کش ہو کر اپنے بنیادی مقاصد کے پُورا کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

قابلِ توجہ یہ امر ہے کہ جب اس قسم کے افراد سے ان کا سامنا ہوتا ہے تو انہیں سلام تحیت نہیں کرتے بلکہ ان کا سلام سلام رخصت ہوتا ہے۔

قلوب بایمان :

مذکورہ بالا آیات میں ان قلب کی نہایت حسین اور جاذب تصویر کھینچی گئی ہے جن میں ایمان کا بیج ہے اور وہ اس کی پرورش کرتے ہیں وہ ان بے شخصیت افراد کے ذمے میں سے نہیں ہیں جو جمل، تعصب، بدزبانی، یہودہ گوئی اور جمل و کینہ زہری کا مخزن ہیں۔ یہ لوگ ایسے بزرگوار اور پاک زبان ہیں کہ انہوں نے سب سے پہلے کو راز تقلید کی زنجیروں کو توڑ دیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے توحید کی مسادگی کو بے توجہ تام سنا اور جب انہیں دلائل حق کی صداقت کا یقین ہو گیا تو انہوں نے حق کو قبول کر لیا۔

اس میں شک نہیں کہ ایسے لوگوں کو تقلید شکنی اور اپنے سحر فانی معاشرے سے جدا ہونے کا گراں تلوان ادا کرنا پڑتا ہے اور بہت سی تکالیف اور محرومیاں بھی برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ مگر ان میں اس قدر صبر و شکیبائی کا جو ہر ہوتا ہے کہ وہ پیش نظر عظیم مقصد کے لیے ان تمام مشکلات کو برداشت کر لیتے ہیں۔

یہ لوگ نہ تو کینہ توڑ ہوتے ہیں کہ ہر بدی کا بدتر جواب دیں اور نہ بخیل و خسیں ہوتے ہیں کہ عطیاتِ الہی کو صرف اپنے لیے مخصوص کر لیں۔

وہ لوگ ایسے بزرگوار ہیں جو مذکورہ بالا نقائص کے علاوہ دروغ، نامناسب مشاغل، لڑائی جھگڑوں، یہودہ جملوں، بے معنی باتوں، رکیک حرکتوں اور ان جیسی مجملہ ناشائستہ باتوں سے مُنہ ز رہتے ہیں۔ وہ پاک زبان اور پاکیزہ قلب رکھتے ہیں۔ وہ اپنی فعال اور کارساز توانائیاں

کو جملہ سے بھلا کر کے تباہ نہیں کرتے۔ سچی کہ بہت سے موقعوں پر سکوت کو (جو کہ ایسے احمقوں اور بے خرد لوگوں کے لیے بہترین جواب) گویائی پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ لوگ اپنے اعمال اور فرائض کی فکر میں بہتے ہیں اور ان بیاسوں کی طرح جو چشمہ آب کی طرف جاتے ہیں وہ لوگ بھی علم و دانش کے پیاسے ہیں اور علماء اور دانشمندان کی صحبت میں حاضر ہونے کے خواہشمند رہتے ہیں۔

ہاں — یہی وہ بزرگوار لوگ ہیں جن میں اتنی سعادت موجود ہے کہ ایمان کے پیغام کو دل سے قبول کرتے ہیں اور بیشکاہ خداوندی سے اپنے اعمال خیر کا ایک گنا نہیں بلکہ دو گنا اجر پاتے ہیں۔

یہ لوگ حضرت سلمان فارسی، نجاشی، بایجرا جیسے متلاشی حق یا ان ہی جیسے اور ان ہی کے ہم پالہ ہوتے ہیں کہ جب انہیں ناخوشگوار واقعات پیش آتے ہیں تو وہ منزل ایمان پر پہنچنے کے لیے ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔

اس ضمن میں حضرت امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث جاؤب تو جبر سے آپ نے فرمایا :

نحن صبراء و شیعتنا اصبر منا و ذلك اننا صبرنا على ما نعلم و صبروا على ما لا يعلمون۔

ہم صابر ہیں اور ہمارے شیعی ہم سے زیادہ صابر ہیں کیونکہ ہم تو اسرار امور سے آگاہ ہیں پھر صبر کرتے ہیں (اور طبیبانہ کام آسان تر ہے) مگر وہ اسرار امور کو جاننے بغیر صبر و شکیبائی کو نہیں چھوڑتے۔

یہ سوچنے کی بات ہے کہ دو جانناز آدمی میدان جہاد میں قدم رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک انجام کار سے باخبر ہے اور جاننا ہے اس جہاد کا نتیجہ فتح ہوگا۔ لیکن دوسرا شخص باخبر نہیں ہے اور محض خوشنودی خدا کے لیے میدان میں آیا ہے۔ اس حالت میں کیا دوسرے کا صبر پہلے شخص کے صبر سے اولیٰ نہیں ہے؟

یا بالفرض — اس امر کے قرآن موجود ہیں کہ متذکرہ دونوں افراد شہید ہو جائیں گے۔ مگر ان میں سے ایک یہ جانتا ہے کہ شہادت میں کون کون سے اسرار نہاں ہیں اور اس شہادت کے مستقبل کے آئندہ زمانے پر کیا اثرات مرتب ہوں گے اور یہ شہادت آئندہ نسلوں کے لیے ایک نمونہ بن جائے گی۔ لیکن دوسرا شخص اسرار آئندہ سے مطلق بے خبر ہے۔ اس لیے دوسرا شخص جب جیٹے مصائب پر صبر کرتا ہے تو جبراً بندہ تر ہے۔

ایک اور حدیث میں (جو کہ علی بن ابراہیم کی تفسیر میں درج ہے) منقول ہے کہ آیت فرق میں "لغو" سے مراد ہے: کذب، لہو اور فتناب ہے۔ اس سے پرہیز کرنے والے آئمہ ہیں۔

یہ واضح ہے کہ گزشتہ دونوں احادیث میں بیان مصلحت کے لحاظ سے کوئی ابہام نہیں ہے۔ وگرنہ "لغو" کا مفہوم بہت وسیع ہے جس میں حدیث و دم کی مراد کے علاوہ اور چیزیں بھی شامل ہیں اور تمام راست کردار مومنین "لغو" سے اعراض کرتے ہیں لیکن اس خصوص میں آئمہ کا مقام افضل ترین ہے۔

۵۶. إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ۔

۵۷. وَقَالُوا إِنْ نَشِئِ الْهُدَىٰ مَعَكَ نَتَّخِطُ مِنْ أَرْضِنَا أَوْلًا مُمْكِنًا لَهُمْ حَرَمًا مِمَّا يُجِبُّ إِلَيْهِ تَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ رِزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ۔

ترجمہ

۵۶. جسے تو نہیں چاہتا ہدایت نہیں پاسکتا بلکہ خدا ہی جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔ اور خدا ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے۔

۵۷. اور انہوں نے کہا کہ اگر ہم تیرے ساتھ ہدایت کو قبول کر لیں تو ہم اپنی زمین سے اچک لیے جائیں گے۔ کیا ہم نے انہیں ایسی جگہ نہیں دی جو حرم امن ہے اور (مہر شہر و دیار کے ثمرات اُس کی طرف لائے جلتے ہیں کہ جو ہماری طرف سے رزق ہے۔ مگر ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

تفسیر

ہدایت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے :

اگرچہ مفسرین نے زیر نظر پہلی آیت کی شان نزول میں بہت بحث کی ہے۔ لیکن انہوں نے جن روایات کو بنیاد بحث بنایا ہے وہ بے اعتبار دے وقعت ہیں۔ اور خاص مقاصد کے لیے انہیں وضع کیا گیا ہے۔ لہذا — ہم نے یہی بہتر سمجھا کہ اس آیت کی تفسیر خود قرآن مجید ہی سے اخذ کی جائے۔ اس کے بعد ان مشکوک اور جعلی روایات کی تحقیق کی جائے۔

غور طلب یہ امر ہے کہ گزشتہ آیات میں دو گروہوں کا ذکر تھا۔ ایک گروہ تو جہت دہم کفار مکہ کا تھا۔ جناب رسول خداؐ نے ہر چند انہیں ہدایت دینے کی کوشش کی، مگر ان کے دلوں میں کور ایمان کا نفوذ نہ ہوا۔ ان کے برعکس مکر سے دور دراز فاصلے پر رہنے والا ایک گروہ اہل کتاب کا تھا، جنہوں نے ہدایت الہی کو قبول کیا اور راہ اسلام میں فرط جذبات کے ساتھ استسلام و ایثار کا ثبوت دیا۔ حتیٰ کہ انہوں نے خود پرست جاہلوں اور قریبی عزیزوں کی مخالفت کی بھی پرواہ نہ کی اور ان سے خوفزدہ نہ ہوئے۔ ان امور پر توجہ کرنے کے بعد زیر نظر پہلی آیت سے یہ حقیقت بے نقاب ہوتی ہے کہ اُسے پیغمبرؐ جیسے چاہتے ہو اُسے ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ خدا جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔

اور وہ ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے: (انك لا تهدي من اجبت ولكن الله يهدي من يشاء وهو اعلم بالمهتدين)۔

وہی جانتا ہے کہ کون لوگ اس لائق ہیں کہ ایمان قبول کریں۔ وہی جانتا ہے کہ کون سے دل طلب حق میں بے چین ہیں۔ وہی جانتا ہے کہ کون سے دل میں عشق الہی کا سودا سمایا ہوا ہے۔ ان۔ وہ ان شانستہ افراد کو خوب پہچانتا ہے۔ وہ انہیں توفیق عنایت کرتا ہے اور اپنے لطف کو ان کا رفیق راہ بناتا ہے تاکہ وہ ایمان کی راہ اختیار کریں۔

لیکن وہ زشت سیرت تاریک دل جو دشمن حق میں اور اپنے تمام وسائل سے فرستادگان خدا کے خلاف جنگ کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اپنی روش زندگی کے لحاظ سے اس قدر آلودہ اور شرمناک ہیں کہ کسی طرح بھی ان کا خوف فرمایمان کو قبول نہیں کر سکتا خدا ہرگز ایسے لوگوں کی راہ میں چراغ توفیق نہیں جلاتا۔

بنائیں — اس مقام پر "ہدایت" سے مراد "ارشادہ طریق" نہیں ہے۔ کیونکہ راہ راست کی ہدایت تو پیغمبر کا فرض ہے کہ وہ بغیر اشتہار ایک کی رہبری کرتا ہے۔ بلکہ یہاں ہدایت سے "ایصال بہ مطلوب" اور منزل مقصود تک پہنچانا مراد ہے اور یہ صرف خدا کا کام ہے کہ دلوں میں ایمان کا بیج بوسے اور خدا کا یہ کرم بھی عام نہیں ہے۔ بلکہ وہ اہل دلوں پر نظر ڈالتا ہے اور پھر انہیں یہ نور ایمانی عطا کرتا ہے۔

بہر حال یہ آیت ایک طرح سے پیغمبر کی وجوہی کے لیے ہے تاکہ وہ اس واقعیت کی طرف متوجہ ہوں کہ نہ تو مکہ کے بت پرستوں کے گروہ کا شریک چہ اصرار ہے جو ہے اور نہ مردم حبشہ یا نجران اور حضرت سلمان اور بحیرا جیسے لوگوں کا ایمان لانا ہی ہے وہیل ہے۔ پیغمبر کو چاہیے کہ گروہ اول کے ایمان نہ لانے سے ہرگز طول خاطر نہ ہوں کیونکہ یہ نور الہی صرف وہاں سے آتا ہے کہ تلاش کر لیتا ہے۔ چہ وہاں داخل ہوتا ہے اور سکونت پذیر ہو جاتا ہے۔ اس مضمون کی مثالیں آیات قرآنی میں بہت ہیں۔

پسنا نچہ ہم سورۃ بقرہ کی آیت ۲۴۲ میں پڑھتے ہیں:

ليس عليك هداهم ولكن الله يهدي من يشاء
تم ان کی ہدایت کے ذمہ دار نہیں ہو بلکہ خدا جسے چاہتا ہے اُسے ہدایت کرتا ہے۔

اور سورۃ نمل کی آیت ۲۴ میں فرمایا گیا ہے:

ان تحرص على هداهم فان الله لا يهدي من يضل

اس گروہ کی ہدایت پر تیرا اصرار مؤثر نہیں ہے کیونکہ خدا جسے گمراہ کر دیا ہے، اسے ہدایت نہیں کرتا۔

اور سورۃ یونس کی آیت ۴۳ میں مذکور ہے:

افانت تهدي المعى ولو كانوا لا يبصرون

تم انہوں کو ہدایت کرنا چاہتے ہو۔ ہر چند کہ وہ کسی چیز کو نہیں دیکھتے اور کسی حقیقت کا بھی ادراک نہیں کرتے۔

بالا فرسودہ ابراہیم کی چوتھی آیت میں ایک قانون کی طور فرمایا گیا ہے:

فيضل الله من يشاء ويهدي من يشاء وهو العزيز الحكيم

خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ عزیز و حکیم ہے۔

اس آیت کا آخری جملہ یہ واضح کرتا ہے کہ ان دونوں گروہوں کے بارے میں خدا کی مشیت کو راز نہیں ہے بلکہ ہر بنی مہیا رکھتا اور افراد کی اہلیت، تلاش حق کے لیے ان کی تجربہ اور ان کے ظروف اور قابلیتوں کے مطابق ہے۔ وہ صرف اسی ہی لحاظ سے کسی جماعت کو توفیق دیتا عطا کرتا ہے اور کسی گروہ سے اُسے سلب کر لیتا ہے۔

آیات زیر بحث میں سے دوسری میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو دل میں قرآن اسلام کی شانیت کے مستحق تھے لیکن اپنے ذاتی مفادات کے خیال سے ایمان نہیں لاتے تھے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے: انہوں نے کہا کہ اگر ہم تمہارے ساتھ ہدایت کو قبول کر لیں، اور اس کی پیروی کریں۔ ہمیں زمین سے اچک لیں گے: (وقالوا ان نتبع الهدى معك نتخطف من أرضنا)۔

تفاسیر میں آیا ہے کہ یہ بات عارض بن نوح نے کہی تھی۔ وہ حضرت پیغمبر کی خدمت میں آیا اور عرض کیا:

ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ آپ فرماتے ہیں وہ حق ہے لیکن جو چیز ہمارے لیے آپ پر ایمان

لانے اور قبول حق سے مانع ہے وہ یہ ہے کہ عرب ہم پر یلغار کریں گے اور ہمیں ہماری زمینوں

سے اٹھالے جائیں گے اور ہم میں ان کے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے۔

یہ بات صرف وہی آدی کہ سکتا ہے جو خدا کی قدرت کو ناپہیز سمجھتا ہے اور تھوڑے سے جاملوں کی قوت کو بہت عظیم۔ یہ بات صرف وہی کہہ سکتا ہے جو خدا کی عنایات اور اس کی حمایت کے رموز سے آشنا نہیں ہے اور یہ نہیں جانتا کہ وہ اپنے جنوں کی کس طرح مدد کرتا ہے اور اپنے دشمنوں کو کس طرح برباد کرتا ہے۔ لہذا قرآن ایسے لوگوں کے جواب میں فرماتا ہے:

کیا ہم نے انہیں ایسی جگہ نہیں دی جو جائے امن ہے۔ اور شہر و دیار کے ثمرات ان کی طرف لائے جلتے ہیں: (اولو فکھن لہم حرماً امناً یجئ الیہ ثمرات کل شئ)۔ اور یہ رزق ہماری طرف سے ہے: (رزقاً من لدنا)۔ مگر ان میں سے اکثر یہ نہیں جانتے: (ولکن اکثرهم لا یعلمون)۔

وہ خدا جس نے شہرہ زار، سنگلاخ اور بے آب و گیاہ زمین کو حرم امن قرار دے کر اور مخلوق کے دلوں کو اس کی طرف ایسا متوجہ کر کے

۱۔ "آیت فرق میں" معك "نتبع" سے متعلق ہے اور اس کا احتمال بھی ہے کہ اس کا تعلق "هدی" سے ہو۔ اس طرح معنی میں تخفیف سافق ہو جائے گا۔

۲۔ "بج السبیلان" زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۳۔ "یجئ" کا مادہ "جہایۃ" ہے۔ اس کے معنی ہیں "بج کرنا"۔ لہذا اس محض کو جس میں ہانی بج کرتے ہیں "جہایۃ" کہتے ہیں۔
۴۔ "فکھن" کی آیت میں "فکھن" "نجعل" کے معنی میں ہے اور "حرماً" "ممنوع" ہے۔ "ممنوع" "ممنوع" اپنے اصلی معنی میں ہو کر "ممنوع دینا" ہیں "فی" کے صلہ سے صحیح ہوتا ہے۔

دنیا کے مختلف مقامات سے بہترین پیداوار اُس کی طرف لاتے ہیں، اپنی قدرت کو خوب ظاہر کر دیا ہے۔

وہ خدا جس نے ایسی قدرت نمائی کی ہے اور ایسی سر زمین کو ایسی امنیت اور ایسی نعمتیں بخشی ہیں کہ تم اپنی آنکھوں سے ان کے آثار دیکھتے ہو اور سالہا سال سے ان نعمات سے بہرہ اندوز ہو رہے ہیں، کیا وہ اس امر پر قادر نہیں ہے کہ تھوڑے سے بت پرست عرب اگر تم پر حملہ آور ہوں تو وہ ان سے تمہاری حفاظت کر سکے؟

تم کو حالت کفر میں خدا کی دو بڑی نعمتیں — امنیت اور نعمات زندگی، نصیب ہوتی رہی ہیں۔ تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ بعد اسلام خدا تمہیں ان نعمتوں سے محروم کر دے۔ دل قوی رکھو، ایمان لاؤ اور مزاج میں استقلال پیدا کرو کہ خدا ہی کعبہ و کلمہ تمہارا ساتھ ہے۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تاریخ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ حرم مکہ مسلمانوں کے لیے تو اس قدر جائے امن و امان نہ تھا۔ کیا مسلمانوں کی ایک تعداد اور چلنی ظلم و تعدی نہیں کی گئی؟ کیا اہل مکہ نے رسول اللہ کو پتھر نہیں مارے؟ کیا بعض مکانات کو مکہ میں قتل نہیں کیا گیا؟ کیا آخر کار حضرت جعفر طیار کے ساتھ کچھ لوگوں نے اور پھر باقی افراد نے حضرت پیغمبر کے ساتھ اس خیال سے کہ وہ وہاں اپنے کو غیر محفوظ سمجھتے تھے ہجرت نہیں کی؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ان تمام باتوں کے باوجود مکہ میں دوسرے مقامات سے زیادہ امن تھا اور عرب اُس مقام کو محترم اور پاک سمجھتے تھے اور جن گناہوں کے وہ دوسرے مقامات پر مرتکب ہوتے تھے، وہاں ان کے ارتکاب کی ہمت نہ کرتے تھے۔ مختصر یہ ہے کہ عین بے امنی کے زمانے میں بھی بڑی حد تک پُلان تھا۔ خاص طور پر شہر مکہ میں اُس کے اطراف ہجران کے علاقوں کی نسبت زیادہ امن رہتا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ آغاز اسلام میں ایک قلیل مدت تک یہ سر زمین امن الہی مسلمانوں کے لیے ناسودگی اور بے امنی کا مقام ثابت ہوئی۔ مگر زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ یہ مقام پاندار امن کا مرکز اور جملہ اقسام کی عظیم نعمات کا مرکز بن گیا۔ بنا بریں مسلمانوں کے لیے اس جگہ گزرتے والی مشکلات کا، عظیم نعمتوں کے حصول کے لیے برداشت کرنا کچھ سخت کام نہ تھا۔

بہر حال ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اپنے ذاتی مفادات کے نقصان کے خوف سے عارث بن فوکل کی طرح ہدایت اور ایمان سے دست کش ہو جاتے ہیں۔ جبکہ خدا پر ایمان لانا اور اُس کے احکامات پر عمل کرنا صرف اُن کے ذنیادی مفادات ہی کو خطرات سے محفوظ نہیں کر دیتا بلکہ اُن کے مشروع مادی منافع اور اُن کے لیے امن و سلامتی کا معاشرہ پیدا کرنے کے لیے بھی غیر معمولی طور پر مفید ہے۔

آج ک دنیا میں جسے تمدن کہا جاتا ہے، جو قتل و غارت، غل ریزی اور تباہ کاری ہم دیکھتے ہیں وہ اس امر کی زندہ گواہی ہے کہ لوگ ایمان اور ہدایت سے ڈر ہو گئے ہیں۔

یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ خدا نے اس مقام پر پہلے نعمت امن کا ذکر کیا ہے اور اُس کے بعد ہر سمت سے مکہ کی طرف ضروریات انسانی کے آنے کا ذکر ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ترتیب اس امر کی نشاندہی کرتی ہو کہ جب تک کسی ملک یا شہر میں امن و امان کا دور دورہ نہ ہو، اُس وقت تک وہاں کی اقتصادی حالت درست نہیں ہو سکتی۔ ہم نے اس طلب کو جلد ۱۰ میں سورہ ابراہیم

کی آیت ۳۵ کے تحت مفصل بیان کیا ہے۔

علاوہ بریں آیت میں "بیجی" فعل مضارع کی صورت میں استعمال ہوا ہے، جو حال اور مستقبل کی حالت استمراری پر دلیل ہے چنانچہ ہم چودہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اس سر زمین کی جانب ہر طرف سے خدا کی نعمتیں کھینچی چلی جا رہی ہیں۔ جو لوگ خانہ خدا کی زیارت کے لیے جاتے ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ یہ خشک و سوزاں اور بے آب و گیاہ زمین انواع و اقسام کی بہترین نعمتوں سے لبر ہے۔ شاید دنیا کے کسی حصے میں بھی نعمتوں کا اتنا وفور نہ ہو گا۔

حضرت ابوطالب کا ایمان اور معاندین کا منشور:

ان حضرات کو جو اہل مطالعہ ہیں یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ رادبان احادیث کی ایک جماعت کو اس امر پر کیوں اصرار تھا کہ جناب رسالتاب کے چچا کو بے ایمان اور مشرک ثابت کریں جبکہ ان کے متعلق دنیا کے تمام مسلمان با اتفاق اس امر کے قائل ہیں کہ انھوں نے اپنی حیات میں پیغمبر اسلام کی حمایت میں اتنا درجہ فدا کاری، قربانی اور ایثار سے کام لیا۔ ان لوگوں کا اصرار ہے کہ اُن کی وفات بحالت کفر ہوئی۔

آخر دوسرے لوگوں کے متعلق، جن کا اسلام میں کوئی کردار نہیں ہے، یہ اصرار کیوں نہیں ہے؟ غور کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ مسئلہ کوئی معمولی اور سرسری نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان تاریخی اور روایاتی بحثوں کے پیچھے حضرت علیؑ کے قریبوں کی طرف سے ایک خطرناک سیاسی کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ اس امر پر نظر کرنے سے کسی مزید دقت نظر کی ضرورت نہیں رہتی۔ ان معاندین کا اس امر پر زور تھا کہ علیؑ سے ہر فضیلت چھین لیں۔ سنی کہ ان کے بااثر اور فداکار باپ کو مشرک ثابت کریں اور انھیں بحالت عدم ایمان دنیا سے رخصت کریں۔

یقیناً بنی امیہ اور ان کے ہوا خواہ اپنے عہد میں برسر اقتدار آنے سے پہلے بھی، اس فتنہ پردازی میں مشغول رہتے تھے اور گوشش میں لگے رہتے تھے کہ جہاں سے بھی ممکن ہو اس مقصد کے لیے شواہد جمع کریں خواہ وہ کیسے ہی کمزور اور بے بنیاد ہوں۔ ہم اس کیفیت اور گندی سیاست کی مخالفاً انواج سے جو اپنی جگہ پر غور و فکر کی مستحق ہے، سے قطع نظر کرتے ہوئے — جہاں تک موضوع کتاب اجازت دیتا ہے، اس موضوع کا تاریخی اور تفسیری حیثیت سے حقیقت طلبانہ مطالعہ کرتے ہیں، تاکہ قارئین پر یہ روشن ہو جائے کہ اس ہنگامہ اختلاف کی پشت پر کوئی معتبر سند موجود نہیں ہے۔ بلکہ اس کے خلاف حقیقت بخشنے پر زندہ شواہد موجود ہیں۔

۱۔ آیت زیر بحث یعنی (انک لاتھدی من احببت...) کا کسی طرح بھی جناب ابوطالب سے کوئی ربط نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے ماقبل کی آیات اس امر کی دلیل ہیں کہ یہ آیات مشرکین مکہ کے خلاف اہل کتاب میں سے مومنین کی ایک

جماعت کے متعلق نازل ہوئی تھیں۔

جاذب توجہ یہ امر ہے کہ فخر رازی جس نے اس آیت کو اجماعِ مسلمین کا نام لے کر حضرت ابوطالب کی جانب منسوب کیا ہے خود ہی اعتراف کرتا ہے کہ آیت اپنے ظاہری معنی کے لحاظ سے کسی طرح بھی ابوطالب کے کفر پر دلالت نہیں کرتی۔
اس تفسیر کے بعد بھی بعض لوگوں کا یہ اصرار کیوں ہے کہ اس آیت کو حضرت ابوطالب کے شرک سے مربوط کر دیں۔ واقعاً یہ بات بہت حیران کن ہے۔

۲۔ اس موضوع پر جو سب سے بڑی دلیل قائم کی گئی ہے وہ اوعالیٰ اجماعِ مسلمین ہے کہ جناب ابوطالب دنیائے مشرک زخمت ہوتے۔

جبکہ اس اجماع کا ذکر محض جھوٹ ہے۔ جیسا کہ اہل سنت کے مشہور مفسر آلوسی نے اپنی تفسیر روح المعانی میں تصریح کی ہے کہ یہ مسئلہ اجماعی نہیں ہے اور آیت نوق کے متعلق اجماعِ مسلمین یا مفسرین کی یہ روایت کہ یہ حضرت ابوطالب کے متعلق نازل ہوئی تھی، درست نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ علمائے شیعہ اور ان کے بہت سے مفسرین حضرت ابوطالب کے ایمان کے مستحق ہیں اور اس موضوع پر افسوس نے اہلیتِ عظیمِ اسلام کے اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔ علاوہ بریں حضرت ابوطالب کے اپنے اکثر قصائد ان کے ایمان کی شہادت دیتے ہیں۔

۳۔ تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ "اجماعِ مسلمین" کے اوعا کا سرچشمہ اخبارِ اعدا میں جن کا کچھ اعتبار نہیں ہے اور ان روایات کی سند میں جن افراد کے نام آتے ہیں وہ مشکوک یا کذاب ہیں۔

ان روایات میں سے ایک ابن مردیہ نے اپنی ہی سند کے ساتھ ابن عباس سے نقل کی ہے:

آیت "انک لا تھدی من احببت" ابوطالب کے متعلق نازل ہوئی ہے پیر اسلام نے ان سے اسلام قبول کرنے کے لیے بہت اصرار کیا مگر انھوں نے قبول نہ کیا۔

حالانکہ اس روایت کی سند میں "ابو سھل سری" کا نام بھی ہے اور بزرگانِ علم رجال کی تصریح کے مطابق وہ حدیث پروردوں، محبوبوں اور روایتیں گھڑنے والوں میں سے تھا۔ "عبدالقدوس ابن سعید و شقی" کا نام بھی اس حدیث کی سند میں آتا ہے حالانکہ وہ بھی کذابین میں سے تھا۔

ظاہر اس حدیث سے یہ ستر شخ ہوتا ہے کہ ابن عباس نے اسے کسی واسطے کے بغیر بیان کیا ہے اور وہ خود ان حالات کے شاہد و ناظر تھے۔ جبکہ یہ معلوم ہے کہ ابن عباس ہجرت سے تین سال قبل پیدا ہوئے تھے۔ بنا بریں حضرت ابوطالب کی وفات کے وقت وہ شیر خوار ہوں گے۔ اس سے ثابت ہے کہ یہ حدیثیں گھڑنے والے اپنے فن میں بھی ماہر نہیں تھے۔
اس سلسلے میں ایک حدیث ابوبہرہ سے بھی نقل کی گئی ہے کہ وہ کہتے ہیں:

۱۔ تفسیر کبیر از فخر رازی، ج ۲۵، ص ۳۔

۲۔ روح المعانی، ج ۲۰، ص ۵۶۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۳۔ ذر المنثور، ج ۵، ص ۱۳۳۔

جس وقت ابوطالب کی وفات کا وقت قریب آیا تو رسول اللہ نے ان سے فرمایا کہ: اے بچا! کہئے: "لا الہ الا اللہ" تاکہ میں بروز قیامت آپ کے متعلق نوبت ہونے کی گواہی دوں۔

تو ابوطالب نے جواب دیا:

"اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ قریش مجھے یہ طعنہ دیں گے کہ اس نے موت کے وقت نون کی وجہ سے اسلام قبول کر لیا تو میں ضرور توحید کی شہادت دیتا اور تجھے مسرور کر دیتا۔"

اس وقت آیت "انک لا تھدی من احببت" نازل ہوئی۔

اس حدیث کا ظاہری لب و لہجہ یا انداز بیان اس امر کا مظہر ہے کہ ابوبہرہ نے اس وقوع کو بچشمِ خود دیکھا تھا۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ابوبہرہ نے ہجرت سے سات سال بعد (یعنی فتحِ خیبر کے سال میں) اسلام قبول کیا تھا۔ تو پھر بعلاوہ حضرت ابوطالب کی وفات کے وقت کیسے موجود ہو گئے جو ماقبل ہجرت واقع ہوئی تھی۔ بنا بریں اس روایت سے بھی غیر ماہرانہ جعل سازی نمایاں ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ "ابن عباس اور ابوبہرہ" خود اس واقعے کے شاہد نہ تھے اور انھوں نے یہ داستان کسی دوسرے شخص سے سنی تھی تو ہم سوال کرتے ہیں کہ "کس سے؟"

جس آدمی نے یہ روایت ان دونوں آدمیوں سے بیان کی وہ ناشناس اور مجہول ہے۔ ایسی حدیث کو مرسل کہتے ہیں اور سب جانتے ہیں کہ مرسل حدیث معتبر نہیں ہوتی۔

جانئے افسوس ہے کہ مفسرین اور راویان اخبار کی ایک جماعت نے بغیر تحقیق و غور و فکر اس قسم کی احادیث کو ایک ستر سے لے کر اپنی کتابوں میں نقل کر دیا ہے۔ اور آہستہ آہستہ اپنے لیے توجیہ اجماع بھی فراہم کر لی ہے لیکن ظاہر ہے کہ کہاں کا اجماع؟ اور کیسی حدیث معتبر؟

۴۔ ان تمام امور سے قطع نظر کر کے ان جعلی احادیث کا متن ہی غماز ہے کہ حضرت ابوطالب پیغمبرِ اسلام پر ایمان لائے تھے۔ ہر چند کہ انھوں نے مصالح کے تحت اعلانیہ اقرار نہیں کیا تھا۔ اور ہم یہ جانتے ہیں کہ ایمان کا تعلق قلب سے ہے اور زبان تو محض ایک ذریعہ اظہار ہے۔

بعض احادیثِ اسلامی میں حضرت ابوطالب کی کفایت کو اصحاب کف سے تشبیہ دی گئی ہے کہ وہ لوگ دل میں ایمان پنہال رکھتے تھے مگر بعض وجوہ کی بنا پر اس کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔

۵۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے اہم سلسلے میں صرف ایک طرف روایات پر قناعت کر لی جائے اور ابوبہرہ اور ابن عباس سے جو روایات منقول ہیں صرف انھیں پر اکتفا کر لیا جائے؟

اس مسئلہ میں اہل بیت اور علمائے شیعہ کے اجماع کو قابلِ توجہ کیوں نہیں سمجھا جاتا؟ حالانکہ یہ لوگ خاندانِ پیغمبر کے حالات

۱۔ تفسیر صافی اور تفسیر برہان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

سے زیادہ واقف ہیں۔

حضرت ابو طالب کے بہت سے اشعار ہمارے پاس ہیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر ان کے ایمان کا پتہ ہیں۔ بہت سے بزرگوں اور علمائے ان اشعار کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ ہم نے ان جناب کی سخن گوئی کے چند نمونے تفسیر کی جلد ۳ میں (سورہ انعام کی آیت ۲۶) کے ذیل میں اہل سنت کے معروف مسالیح سے نقل کر دیئے ہیں۔

۶۔ ان تمام امور سے قطع نظر کہ حضرت ابو طالب کی تاریخ زندگی، جناب رسالت مآب کے لیے ان کی عظیم قربانیاں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان سے شدید محبت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔

ہم یہاں تک دیکھتے ہیں کہ حضرت ابو طالب کی موت کے سال کا نام مسلمانوں نے "عام الحزن" رکھا۔ یہ سب باتیں اس امر کی دلیل ہیں کہ حضرت ابو طالب کو اسلام سے عشق تھا۔ اور وہ جو یہ میرا اسلام کی اس قدر ممانعت کرتے تھے وہ محض رشتہ داری کی وجہ سے نہ تھی۔ بلکہ اس دفاع میں آپ کی حیثیت ایک مومن مخلص، ایک جاں نثار اور ایسے فداکار کی حق جو اپنے رہبر اور پیشوا کا تحفظ رکھتا ہے۔

ان واضح حقائق کے باوجود کس قدر غفلت، بے خبری، ناشکرگزاری اور ظلم ہے کہ بعض لوگوں کا یہ اصرار ہے کہ ایک مومن و مخلص کو مشرک قرار دے کر دنیا سے رخصت کریں۔

۵۸۔ وَكَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطَرْتُمْ مَعِيشَتَهَا فَتِلْكَ مَسْجِدُهُمْ لَمَّا

تَسَكَّنُوا مِنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ ۝

۵۹۔ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ حَتَّىٰ يَبْعَثَ فِي أُمَمٍ رَسُولًا يَتْلُوا

عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرَىٰ إِلَّا وَأَهْلُهَا ظَالِمُونَ ۝

۶۰۔ وَمَا أَوْتِيتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَزِينَتُهَا وَمَا عِنْدَ اللَّهِ

خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝

ترجمہ

۵۸۔ اور ہم نے بہت سی ایسی بستیوں کو ہلاک کر دیا کہ جو زیادہ نعمتوں پر مغرور ہو گئی تھیں۔ یہ ہیں ان کے گھر دکھ کر جو دیران ہو چکے ہیں) کہ جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی رہا ہے اور ہم ہی ان کے وارث ہوئے۔

۵۹۔ اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک نہیں کرتا جب تک ان کے مرکز میں کوئی پیغمبر نہ بھیجے کہ جو ان کو ہماری آیات پڑھ کر سنا لے اور ہم بستیوں کو ہرگز ہلاک نہیں کرتے مگر یہ کہ ان کے باشندے ظالم ہوں۔

۶۰۔ اور جو چیز تمہیں دی گئی ہے وہ متاع حیات دنیا اور اس کی زینت ہے اور جو کچھ خدا کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے! کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

تفسیر

دنیا کی دلچسپیاں تمہیں فریب نہ دیں:

گذشتہ آیات میں یہ ذکر تھا کہ بعض کفار مکہ کو اسلام قبول کرنے میں یہ عذر تھا کہ اگر ہم ایمان لے آئیں گے تو عرب ہم پر حملہ کر دیں گے اور ہمیں ہماری سرزمین سے باہر نکال دیں گے اور ہماری زندگیوں میں خلل ڈال دیں گے۔

گذشتہ آیات میں اس عذر کا ناطق جواب دیا گیا ہے۔

زیر بحث آیات میں اس عذر کے دو جواب اور بھی دیئے گئے ہیں۔

خدا پہلے یہ فرماتا ہے: بالفرض یہ کہ تم ایمان کو قبول نہیں کرتے اور بجاالت کفر و مشرک مادی حیثیت سے خوشحال زندگی بسر

کرتے ہو لیکن یہ نہ بھولو کہ ہم نے بہت سی آبادیوں کو جو اپنی خوشحال اور پر نعمات زندگیوں پر مغرور تھیں نابود کر دیا۔ (وہ کو اہلکنا من قریبۃ البطرت معیشتا)۔ البتہ غرور نعمت نے انھیں سرکشی پر آمادہ کیا اور یہ سرکشی ظلم اور نا انصافی کا سرچشمہ بن گئی اور ظلم نے ان کی اصل حیات کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

یہ ہیں وہ بستیاں اور ان لوگوں کے مکانات کہ ان کی تباہی کے بعد کوئی کم ہی ان میں بسا (فتلک مساکنہم ولو تکتن من بعدہم الا قلیلا)۔

ان کی بستیاں اور مکانات اسی طرح خالی، خاموش، ویران اور مکینوں کے بغیر پڑے رہے، اگر کچھ لوگ وہاں آکر رہے بھی تو نہایت قلیل مدت کے لیے اور ہم ہی ان کے وارث ہوئے۔ (وکتنا نحن الوارثین)۔

اسے مشرکین مکہ! کیا تم بھی یہ چاہتے ہو کہ بحالت کفر اسی خوشحال زندگی تک پہنچ جاؤ جس کا انجام ہم نے تمہیں بتا دیا۔

بجلا ایسی زندگی کی کیا قدر و قیمت ہے۔

”بطرت“ کا مادہ ”بطر“ (بردزن بشس) اس کے معنی اُس سرکشی اور غرور کے ہیں جو دولت کی زیادتی کی وجہ سے ہو۔

آیت میں جو کلمہ ”تلك“ استعمال ہوا ہے، یہ اسم اشارہ بعید ہے اور ان چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو قابل شاہدہ ہیں ممکن ہے کہ اس کلمے سے اشارہ عاود، شہود یا قوم لوط کی ”مرزین کی طرف ہو۔ یہ مقامات اہل مکہ سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھے۔

یہ مقامات یا تو اصناف کے علاقہ میں تھے (جو میں اور شام کے درمیان ہے) یا داغی قرظی میں تھے یا روم کے علاقے میں۔

الغرض یہ تمام مقامات اعراب مکہ کے ان تجارتی قافلوں کی راہ میں واقع تھے جو شام کا سفر کرتے تھے اور اہل عرب ان میں تیروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے کہ ان کی تباہی کے بعد وہاں کبھی کوئی آباد نہیں ہوا۔

آیت نمبر اٹھاون میں جو ”الا قلیلا“ بصورت استثنیٰ آیا ہے، اس کے لیے عین احتمال ہو سکتے ہیں۔

اقل یہ کہ ساکنین کو مستثنیٰ کیا گیا ہو۔

دوسرے مسکن کو اور تیسرے سکونت کو۔

پہلی صورت میں اُس کا یہ منہوم ہے کہ ان مقامات کی تباہی کے بعد غمگینوں سے لوگ وہاں آباد ہوئے۔

دوسری صورت میں یہ معنی ہیں کہ ان مقامات کے صرف چند گھر آباد ہوئے اور

تیسری صورت میں یہ مطلب ہے کہ ویرانی کے بعد وہاں قلیل مدت تک سکونت رہی ہے۔ کیونکہ جس آدمی نے ان دنوں اور بلائیں بستیوں میں سکونت اختیار کی وہ بہت جلد فنا ہو گیا۔

البتہ مذکورہ بالا تینوں تفسیرات کے اختیار کرنے سے منشاء الہی کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیدا نہیں ہوتی۔ ہر چند کہ پہلے باری زیادہ بہتر معلوم ہوتے ہیں۔

بعض حضرات نے ”الا قلیلا“ کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ اشارہ ہے اس جانب کہ اس راہ سے آنے جانے والے مسافر غمگین دیکھ کے لیے یہاں ٹھہر جاتے تھے۔ اور بعض لوگوں نے ”قلیل“ سے آواز و حیوانات وحشی مراد لی ہے۔ ان تمام آراء اور تعبیرات میں قدر مسلم یہ ہے کہ یہ گناہ و شرک سے آلودہ بستیاں ایسی ویران ہوئیں کہ پھر وہاں کوئی نہ بسا۔

”کتنا نحن الوارثین“ کا مطلب یہ ہے کہ وہ بستیاں مکینوں سے خالی رہیں۔ نیز یہ کہ ”ہر چیز کا حقیقی مالک خدا ہی ہے“ اگر وہ عارضی اور وقتی طور پر بعض انسانوں کو بعض چیزوں کا مالک بنا دیتا ہے تو زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ یہ ملکیت زائل ہو جاتی ہے اور مالک حقیقی ہی اُس کا وارث ہوتا ہے۔

اس کے بعد کی آیت و حقیقت ایک سوال مقدر کا جواب ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ اگر اصول یہ ہے کہ خدا سرکشوں کو نابود دیتا ہے تو پھر اُس نے مکہ اور حجاز کے مشرکوں کو عذاب دے کر نابود کیوں نہیں کیا، جنہوں نے اپنی سرکشی کو آخری حد تک پہنچا دیا تھا اور کوئی ایسی جماعت اور گناہ نہ تھا جس کے وہ مرتکب نہ ہوئے ہوں!

اس کے جواب میں قرآن میں ارشاد ہے کہ تیرا پروردگار ہرگز کسی شہر یا آبادی کو ہلاک نہیں کرتا۔ جب تک اُن کے مرکزی مقام پر کوئی نبی نہ بھیج دے جو انھیں ہماری آیات پڑھ کر سنائے۔ (وماکان ربک مہلک القری حتی یبعث فی امھار رسولاً یسلوا علیہم ایااتنا)۔

زوج منہوم یہ ہے کہ جب تک تمام نجات نہیں کر لیتے اور اس قوم کی طرف صریح احکام کے ساتھ پیغمبروں کو نہیں بھیجتے اس وقت تک اُن کو سرکشی کی سزا نہیں دیتے۔

اتمام نجات کے بعد ہم اُن کے اعمال کی نگرانی کرتے رہتے ہیں اگر اُن سے ظلم و ستم سرزد ہوتا ہے اور وہ مستوجب عذاب ہوتے ہیں تو ہم اُن کو سزا دیتے ہیں اور ہم ہرگز آبادیوں کو نیست و نابود نہیں کرتے مگر اس حالت میں کہ اُن کے ساکنین ظالم اور سنگر ہوں۔ (وماکتنا مہلکی القری الا واهلھا ظالمون)۔

”ماکان“ یا ”ماکتنا“ تخصیصی الفاظ اس امر کی دلیل ہیں کہ یہ دائمی اور جاودانی سزا تھی اور ہے کہ وہ کافی

اتمام نجات کے بغیر کسی قوم کو سزا نہیں دیتا۔ نیز یہ جملہ کہ ”حتی یبعث فی امھار رسولاً“ (جب تک ان شہروں کے مرکزی مقام پر رسول مبعوث نہ کر دے) اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لازم نہیں ہے کہ خدا ہر شہر اور ہر گاؤں میں اپنا پیغمبر بھیجے۔ صرف

ایک ایسے مقام پر جہاں اُس قوم کے دانشمند اور اہل فکر لوگ رہتے ہوں اور جہاں سے ہر طرف اطلاعات پہنچ سکتی ہوں، پیغمبر کا بھیجنا ہونا کافی ہے۔

کیونکہ اُس علاقے کے تمام لوگ ضروریات زندگی کے لیے ہمیشہ وہاں آتے جاتے ہیں۔ اور وہاں جو بھی واقعہ ہو اس کی خبر پھر تمام علاقے میں اور دُور و نزدیک کے مقامات میں پھیل جاتی ہے جیسے کہ پیغمبر اسلام کی مکہ میں بعثت کی خبر بہت کم مدت میں تمام

جزیرہ عرب میں پھیل گئی تھی۔ بلکہ اُس سے بھی دُور تک پہنچ گئی تھی۔ چونکہ مکہ عرب کا مرکزی مقام تھا (جسے ام القریٰ کہتے تھے) یہ مقام حجاز کا مرکز و دھاتی بھی تھا اور تجارتی مرکز بھی۔ یہاں تک کہ بعثت رسول کی خبر اُس زمانے کے تمام معتقدن مقامات تک پہنچ گئی تھی۔

Presented by www.ziaraat.com

اس آیت میں ایک کلی اور عمومی حکم بیان کیا گیا ہے۔ بعض مفسرین نے جو اس آیت کا مشا را المیہ مکہ کو سمجھا ہے یہ بالکل بے بِل بات ہے اور "فانها" کنا بھی ایک عام تعبیر ہے کیونکہ کلمہ "ام" کے معنی ماں اور مرکز اصلی کے ہیں۔ یہ کلمہ صرف مکہ کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ

زیر نظر آیات میں سے تیسری آیت اُن ہما ساز کفار کی باتوں کا جواب ہے جو یہ کہتے تھے کہ اگر ہم ایمان لے آئے تو عرب ہم پر لڑش کر دیں گے اور ہماری زندگیوں کو تباہ کر دیں گے۔ اُن کے اس حیلہ کار و قرآن میں یہ ہے : تمہارے پاس جو کچھ بھی ہے وہ حیات دنیا کی بے قدر و قیمت متاع اور صرف

اُس کی زینت ہے : (وما آوتیتہم من شیء فمتاع الحیوۃ الدنیا وزینتہا)۔ مگر جو کچھ خدا کے پاس ہے (یعنی دوسری دنیا کی بے پایاں نعمتیں اور روحانی برکات) وہ بہتر اور پائیدار ہے : (وملئنا اللہ خیرا والبقی)۔ کیونکہ دنیا کی تمام مادی نعمتوں کے ساتھ بہت سے ناگوار واقعات اور طرح طرح کی مشکلات آتی جاتی ہیں اور دنیا کی کوئی نعمت بھی ضرر اور خطر سے خالی نہیں ہے۔

اس کے علاوہ جو نعمتیں خدا کے پاس ہیں اُن کی یہ حیثیت ہے کہ وہ دائمی اور جاوداں ہیں اور اس دنیا کی راحتیں اور آسائشیں زود گزر ہیں تو بھلا ان دونوں کا کیا مقابلہ ہو سکتا ہے؟

ان حقائق کو پیش نظر رکھ کے ایک عاقل انسان تھوڑا سا بھی مقابلہ کر کے یہ سمجھ سکتا ہے کہ اُن نعمتوں کو اس دنیا کی لذات پر قربان نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے آیت کے اخیر میں یہ الفاظ ہیں — (اخلا تعقلون) کیا تم غور و فکر نہیں کرتے؟

فخر رازی نے ایک فقیہ کے حوالے سے یہ نقل کیا ہے کہ اگر کوئی یہ وصیت کرے کہ اُس کا ایک تہائی مال عاقل ترین لوگوں کو دے دیا جائے تو میرا فتویٰ یہ ہے کہ یہ تہائی مال ان لوگوں کو دیں جو اللہ کے احکامات کی اطاعت کرتے ہیں کیونکہ عاقل ترین انسان وہ ہے کہ زود گزر قبیل متاع کو چھوڑ دے اور پائیدار اور مستقل سرمایہ فراوان کو لے لے اور یہ اصول صرف اُن لوگوں پر صادق آتا ہے جو فرمانِ الہی کے مطیع ہیں۔

اس کے بعد فخر رازی نے یہ اضافہ کیا ہے کہ اُنہوں نے یہ فقہی حکم اس زیر بحث آیت سے اخذ کیا ہے کہ

۱۔ یہ بات کہ آیا اس آیت میں مستحبتِ علیہ بھی شامل ہیں یا نہیں۔ ہم نے اس بحث کو جلد ۶ میں سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۱۵ کے ذیل میں ذکر کیا ہے۔

۲۔ تفسیر کبیر فخر رازی، ج ۲۵، ص ۶۱

۶۱۔ اَفَمَنْ وَعَدْنَاهُ وَعَدًا حَسَنًا فَهُوَ لَا قِيَةَ لِمُنْ مَّتَعْنَاهُ مَتَاعَ

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا تَهُوُّوْا لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ۝

۶۲۔ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآئِ الَّذِيْنَ كُنتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝

۶۳۔ قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰؤُلَاءِ الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا ۝

اَغْوَيْنَاهُمْ كَمَا اَغْوَيْنَا ۝ تَبَرَّآنَا اِلَيْكَ مَا كَانُوْا اِيَّا نَا

لِيَعْبُدُوْنَ ۝

۶۴۔ وَقِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ فَمَدَعُوْهُمُوْا فَلَمْ يَسْتَجِيبُوْا لَهُمْ

وَرَاوَا الْعَذَابَ لَو اَنْتُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ ۝

ترجمہ

۶۱۔ وہ شخص جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا ہو اور وہ اُسے حاصل کر لے۔ کیا وہ اُس شخص جیسا ہے جسے ہم نے حیاتِ دُنیا کی متاع دی ہے اور پھر وہ قیامت کے روز (برائے حساب و جزا) پیش کیا جائے گا۔

۶۲۔ اور وہ دن جس روز خدا انہیں نداء دے گا اور کہے گا کہ کہاں ہیں وہ جنہیں تم میرا شریک سمجھتے تھے۔

۶۳۔ اور وہ لوگ جن کے لیے فرمانِ عذاب ثابت ہو چکا ہوگا، کہیں گے: اے ہمارے رب یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ہم نے گمراہ کیا تھا۔ جس طرح ہم گمراہ ہوئے تھے اسی طرح ہم نے اُنہیں گمراہ کیا۔ اب ہم اُن سے بیزار ہیں

۶۴۔ کا انہما کرتے ہیں۔ یہ درحقیقت ہماری نہیں (بلکہ اپنی ہوائے نفس کی) پریشانی کرتے تھے۔

اور اُن سے کہا جائے گا کہ اُنہیں بلا جنہیں خدا کا شریک قرار دیتے تھے۔ تو وہ اُنہیں پکاریں گے مگر وہ اُنہیں جواب نہ دیں گے اور جب وہ عذاب کو (اپنی نگھول سے) دیکھ لیں گے تو تنہا کریں گے کہ کاش وہ ہدایت یافتہ ہوتے۔

تفسیر

وہ لوگ صرف اپنی ہوائے نفس کی پرستش کرتے تھے :

آیات فخرہ بالا سے قبل کی آیات میں ان لوگوں کا ذکر تھا جنہوں نے دنیا، نعمتوں کے لالچ میں کفر کو ایمان پر اور شرک کو توحید پر ترجیح دی۔ اور زیر نظر آیات میں اُس گروہ کی حالت اور راست باز مومنین کی کیفیت میں فرق بیان کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے، خدا، ایک موازنے کے ذریعے جو بصورت استنباط کیا گیا ہے، تمام لوگوں کے وہلان سے انصاف طلب ہو کر کہتا ہے: ”وہ آدمی جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا ہے اور وہ یقیناً اُس معبود کو پالے گا، کیا اُس کے مساوی ہے کہ جسے ہم نے صرف متاع دنیا کا حصہ دیا ہے اور قیامت کے دن وہ حساب اور جزائے اعمال کے لیے ہمارے سامنے پیش ہو گا۔“ (افمن وعدناه وعدًا حسنًا فحولوا قبیہ کمن متعناہ متاع الحیوٰۃ الدنیا ثم ھو یوم القیامۃ من المحضرن)۔

بدون شک ہر وہ شخص جس کا ضمیر بیدار ہے، وہ خدا کے نیک وعدوں اور اُس کی عظیم جاودانی برکات کو اس دنیا کی فانی نعمات اور زود گزر لذات پر (جن کا انجام جاودانی درد و الم ہے) ترجیح دیتا ہے۔ جملہ ”فحولوا قبیہ“ تاکیدی ہے۔ یعنی اللہ کے وعدہ میں ہرگز تخلف نہیں ہوتا۔ اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے کیونکہ وعدہ سے تخلف یا تو بوجہ جہل ہوتا ہے یا بوجہ غرور اور اللہ کی ذات ان میں سے ہر ایک سے پاک ہے۔

”ھو یوم القیامۃ من المحضرن“ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگ اپنے اعمال کا حساب دینے کے لیے محض الہی میں حاضر ہوں گے۔ بعض محضرن نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ آتش و دوزخ میں حاضر ہوں گے۔ مگر پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔ ہر حال آیت کے تیور بناتے ہیں کہ ان گناہ آلودہ لوگوں کو بالجبر اور ان کی رغبت کے خلاف کھینچ کر خدا کے حضور لایا جائے گا۔ اور ہر ناجہی ایسا ہی چاہیے کہ حساب اور سزا کا خوف ان کے پورے وجود پر چھایا ہوا ہوگا۔

کلمہ ”حیاۃ الدنیا“ جو قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں بار بار آیا ہے۔ اس سے اشارہ حیاتِ آخرت اور زندگی جاودانی و دوزال ناپذیر کے مقابلے میں اس دنیوی زندگی کی پستی کی طرف ہے۔

کیونکہ کلمہ ”دنیا“ مادہ ”دو“ سے مشتق ہے۔ اس کے وضعی معنی ہیں زمان یا مکان میں یا منزل یا مقام سے نزدیک ہونا۔ کبھی کلمہ دنیا اور ادنیٰ ان چھوٹی موجودات کے لیے (جو انسان کے اختیار میں ہوں) عظیم موجودات کے مقابلے میں بولا جاتا ہے اور کبھی بلند اور عالی موضوعات کے مقابلے میں پست موضوعات کے لیے استعمال ہوتا ہے اور کبھی اس کلمہ کا اطلاق دوزخ کے مقابلے میں نزدیک پر ہوتا ہے۔

چونکہ اس جہان کی زندگی جہانِ دیگر کے مقابلے میں غنیمتِ لادلیلہ قدر اور نزدیک ہے۔ اس لیے، اس کو حیاتِ دنیا کہنا نہایت ہی مناسب ہے۔

اس کلام کے بعد قرآن شریف میں منظر کشی کی گئی ہے کہ روزِ حشر کفار کا کیا حال ہوگا۔ یہ ایسا منظر ہے کہ اس کے تصور ہی سے زد گئے کھڑے ہو جاتے ہیں اور انسان کا پنپنے لگتا ہے۔

چنانچہ خداوند عالم فرماتا ہے: ذرا اُس دن کا تصور کرو کہ خدا ان مشرکین کو آواز دے گا اور کہے گا جنہیں تم نے میرا شریک قرار دیا تھا وہ کہاں ہیں؟ (و یوم ینادی ھو فیقول این مشرکوا ہی الذین کنتم تزعمون)۔

ظاہر ہے کہ یہ سوال ملامت اور سزائش کے لیے ہے۔ کیونکہ روزِ حشر تمام پر دے اور رجائات اٹھ جائیں گے۔ اُس دن نہ تو شرک کا کوئی مفہوم باقی رہے گا اور نہ شرک اپنے عقیدے پر باقی رہیں گے۔

اس لیے یہ سوال مشرکین کے لیے ایک قسم کی سزائش اور ان کے کینہ کر دار کو یاد دلانے کے لیے ہے اور ایک طرح کی توبیح و سزا ہے۔

لیکن قبل ازیں کہ وہ مشرکین جواب دیں، ان کے معبود گویا ہوتے ہیں اور وہ اپنے پرستاروں سے متنفر اور بے زاری کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ان مشرکین کے معبود کبھی تو پتھر یا لکڑی کے بت تھے۔ کبھی مقدس ہستیاں تھیں جیسے فرشتے، جینی اور کبھی جنات اور شیاطین تھے۔

آیت میں جن شرکاء الہی کا ذکر ہے ان میں سے اس مقام پر تیسرے نمبر کی جماعت (جنات و شیاطین) گویا ہوتے ہیں ہم ان کی گشتگو آیت ما بعد میں اس طرح پڑھتے ہیں: معبودوں کا ایک گروہ، جن کے لیے فرمانِ عذاب سہل ہو چکا ہے لیکن کتاب سے اے ہمارے پروردگار ہم نے ان پرستاروں کو گمراہ کیا۔ صحیح ہے کہ ہم نے انہیں گمراہ کیا۔ اسی طرح کہ جیسے کہ ہم خود گمراہ تھے۔ لیکن ان لوگوں نے اپنی مرضی سے ہماری پیروی کی، ہم ان سے بیزار ہیں۔ وہ ہماری پرستش نہیں کرتے تھے۔ بلکہ درحقیقت وہ اپنی ہوائی نفس کی پرستش کرتے تھے، (قال الذین حق علیہم القول ربنا ھولاء الذین اغوینا ھم کما غوینا تبرأنا الیک ما کانوا ایتانا یعبدون)۔

اس بنا پر آیت فوق سورہ یونس کی اٹھاسویں آیت کی طرح ہے۔ جس میں یہ قول ہے:

وقال شھوکا وھو ما کنتم ایتانا تعبدون

یہ باطل معبود روزِ قیامت اپنے عبادت کرنے والوں کی طرف رخ کر کے کہیں گے تم ہماری

پرستش نہیں کرتے تھے۔

اس طرح یہ گمراہ کرنے والے معبود، مثلًا، فرعون، نرود اور جن و شیاطین اس قسم کے پرستاروں سے اپنی بیزار ی اور نفرت کا اظہار

مذکورہ بالا آیت کی تفسیر کے متعلق یہ خیال ہی ظاہر کیا گیا ہے کہ جو اب دینے والے مشرکین کے سردار ہیں اور کفر و شرک کے مستحقین ہر آدمی۔

(یعنی فقط پرستاروں کا ایک گروہ) یہ لوگ اپنے معبودوں کے متعلق خدا کے جواب دینے کی بجائے اپنے پیروؤں کا ذکر کریں گے

اور اپنی مدافعت کرتے ہوئے عرض کریں گے۔ خدایا ہم تو گمراہ تھے کہ ہم نے شرک کی راہ اختیار کی۔ اور اس گروہ نے اپنی مرضی سے ہماری پیروی کی اور

ہم نے انہیں گمراہ کیا۔ لیکن درحقیقت وہ ہماری اطاعت نہ کرتے تھے۔ بلکہ وہ تو اپنی ہوائی نفس کی اطاعت کرتے تھے۔

مگر جو تفسیر ہم نے متن کتاب میں بیان کی وہ صحت سے زیادہ قریب ہے۔

کریں گے اور اپنی منافعت کریں گے۔ یہاں تک کہ اپنے اوپر ان کی غمراہی کا الزام بھی نہ لیں گے اور کہیں گے کہ "انہوں نے اپنی مرضی سے ہماری پیروی کی تھی۔ لیکن جب یہی امر ہے کہ نہ تو یہ انکار کچھ کا کرے گا اور نہ ان کی اپنے پرستاروں سے بیزاری اور اہماریات بلکہ وہ مجھو اپنے عبادت کرنے والوں کے گناہ میں برابر کے شریک اور حصہ دار ہوں گے۔

اس مقام پر قابل توجہ یہ امر ہے کہ اُس روز بروز حشر، ان گزراہ اور گنہگار لوگوں میں سے ہر شخص ایک دوسرے سے بیزاری کا اظہار کرے گا اور ہر شخص کی یہی کوشش ہوگی کہ اپنا گناہ دوسرے کے سر قمر سے۔

ہم دُنیا میں چھوٹے پیمانے پر اس قسم کے واقعات کی نظیر اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ باہم مل کر کسی خلاف اخلاق یا خلاف قانون فعل کے مرتکب ہوتے ہیں اور جب وہ گرفتار ہو کر عدالت میں پیش ہوتے ہیں تو ایک دوسرے سے بیزاری کا اظہار خیال کرتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنا گناہ دوسرے کے سر ڈالنے لگتا ہے۔ دُنیا اور آخرت میں گزراہ اور غلط عمل کے مرتکب لوگوں کا انجام یہی ہے۔

جس طرح سے سورہ ابراہیم کی آیت نمبر بائیس میں مذکور ہے کہ:

وما كان لى عليك من سلطان الا ان دعوتك فاستجبتم لى فلا

تلومونى ولو موافقك

میرا تو تمہارے اوپر کچھ زور نہ پلٹتا تھا۔ میں نے تو تمہیں صرف دعوت دی تھی۔

(یعنی امر الہی کی مخالف راہ کی طرف بلایا تھا) تم نے بڑے اشتیاق سے اُسے قبول کر لیا۔

اب تم مجھے نہیں بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔

مشرکین کے بارے میں سورہ صافات کی تیسویں آیت میں ہم یوں پڑھتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے لڑنے لگیں گے اور ہر ایک دوسرے کو قصور وار ٹھہرانے لگا۔ مگر گزراہ کرنے والے جواب میں واضح طور پر کہیں گے:

وما كان لنا عليك من سلطان بل كنتم قومًا طاغين

بہر حال جب ان سے ان کے مجبوروں کے متعلق سوال کیا جاسے گا تو وہ جواب دینے سے عاجز رہ جائیں گے۔ تب ان سے کہا جائے گا کہ تم اپنے مجبوروں کو جنہیں تم خدا کا شریک قرار دیتے تھے بلاؤ تا کہ وہ اس وقت تمہاری مدد کریں:

(وقيل ادعوا شركاءكم يا

وہ مشرکین یہ بانٹنے کے باوجود کہ وہ مجبور اس وقت ذرہ بھر بھی کام نہیں آسکتے، انتہائی پریشانی کی وجہ سے باہر طرف سے مایوس ہو کر یا قربان الہی کی اطاعت کی وجہ سے کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ وہ اس طرح مشرکوں اور ان کے مجبوروں کو سب کے سامنے رسوا کرے وہ اپنے مجبوروں کی طرف دست تقاضا دراز کریں گے اور انہیں اپنی مدد کے لیے بلائیں گے، (فدعوہو)۔

لیکن وہ چھوٹے مجبور، انہیں کچھ جواب نہیں دیں گے اور ان کی صدا سے ادا پر لبیک نہیں کہیں گے: (فلا يستجيبوا لهم)۔ وہ (مشرکین) اُس وقت عذاب الہی کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھیں گے: (ورأوا العذاب)۔ اور یہ آرزو کریں گے کہ

کاش ہم زندہ ہوتے اور ہدایت یافتہ ہوتے، (لو انہو كانوا يهتدون)۔ کیونکہ اُس میدان قیامت میں وہ جو بھی تدبیر کریں گے ناکامی اور رسوائی کے سوا اُس کا کوئی نتیجہ نہ ہوگا۔ کیونکہ صرف ایمان و عمل ہی وسیلہ نجات ہے جس سے وہ لوگ محروم ہوں گے۔

۱ "شُرکاءکم" کی تفسیر اس لیے ہے کہ وہ مشرکین خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے تھے۔ اشارہ اس طرف ہے کہ یہ شریک تم نے بنائے ہیں۔ اس کا جواب بھی تم ہی دو۔

۲ "لو انہو كانوا يهتدون" کے متعلق بلند پایہ مفسرین نے بڑی طویل بحثیں کی ہیں۔ اکثریت نے "لو" کو حرف شرط سمجھا ہے۔ اس کے بعد اس کی جڑ کے متعلق بحث کی ہے۔ بعض نے اس شرط کی جڑ اس جملے کو سمجھا ہے جو "ولوا العذاب" سے مستنبط ہوتا ہے۔ اور اس جملہ مقتدر کی یہ تائید کی ہے:

اور بعض لوگوں نے جملہ مقتدر کا صرح سمجھا ہے: لو انہو كانوا يهتدون لراوا العذاب فالدين اليبقين

بعض مفسرین نے دوسری جڑاں کو مقتدر سمجھا ہے۔ بعض مفسرین معتقد ہیں کہ اصلاً جواب شرط منذوف ہی نہیں ہے۔ انہوں نے جملہ "راوا العذاب" کو جواب شرط قرار دیا ہے۔ اس قول کی بنا پر جیسے کا منوم یہ ہوگا کہ اگر وہ بروز قیامت چشم بینا رکھتے اور ہدایت یافتہ ہوتے تو عذاب کو دیکھتے مگر وہ چشم بینا نہیں رکھتے۔

مگر ان تمام معانی کے ماوراء ایک معنی اور بھی ہے جسے بالائی سطور میں ہم سے ترجیح دی ہے اور وہ یہ ہے کہ "لو" تنہا کے لیے ہے۔

ادنی کتابوں میں بالخصوص "معنی اللیب" میں اس کی شرح دیکھی جاسکتی ہے۔

- ۶۵۔ وَلِيَوْمٍ يَنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَا أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ
- ۶۶۔ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْأَنْبَاءُ لِيَوْمٍ ذِي قَوْلٍ لَّا يَتَسَاءَلُونَ
- ۶۷۔ فَأَمَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسَىٰ أَنْ يَكُونَ مِنَ الْمُفْلِحِينَ
- ۶۸۔ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ سُبْحَانَ اللَّهِ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ
- ۶۹۔ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ
- ۷۰۔ وَهُوَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَمْدُ فِي الْأُولَىٰ وَالْآخِرَةِ وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ
- ترجمہ
- ۶۵۔ اس دن کا سوچو کہ جب خدا انہیں پکارے گا اور کہے گا : تم نے مرسلین کو کیا جواب دیا تھا
- ۶۶۔ اس دن تمام خبریں ان پر پوشیدہ رہیں گی (یہاں تک کہ وہ) ایک دوسرے سے سوال (بھی) نہیں کر سکیں گے۔
- ۶۷۔ لیکن جو شخص توبہ کرے، ایمان لے آئے اور عمل صالح انجام دے تو امید ہے کہ وہ فلاح یا فتنگان میں سے ہو جائے گا۔
- ۶۸۔ اور تیرا رب جسے چاہتا ہے تخلیق کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے۔ (اس کے سامنے) ان کا کوئی اختیار نہیں۔ اللہ ان شرکیوں سے منزہ و برتر ہے جن کے اس کے لیے وہ قابل ہیں۔
- ۶۹۔ تیرا رب سب جانتا ہے کہ جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے رکھتے ہیں اور جس کا اظہار

- کر دیتے ہیں۔
- ۷۰۔ وَهُوَ اللَّهُ رَبُّهُمُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ
- ۷۱۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقَيُّومُ لَا يَأْتِيهِ السُّخْرُ وَلَا يَأْتِيهِ الْمَلُومُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ لَهُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْأَعْنَاقُ وَالرُّسُومُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِحِسَابٍ يَوْمَ يَكْفُرُ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَلْحِقْنَا بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ أَجْرَهُمْ
- ۷۲۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَلِيمُ الْغَنِيُّ
- ۷۳۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقَيُّومُ لَا يَأْتِيهِ السُّخْرُ وَلَا يَأْتِيهِ الْمَلُومُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ لَهُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْأَعْنَاقُ وَالرُّسُومُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِحِسَابٍ يَوْمَ يَكْفُرُ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَلْحِقْنَا بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ أَجْرَهُمْ
- ۷۴۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَلِيمُ الْغَنِيُّ
- ۷۵۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقَيُّومُ لَا يَأْتِيهِ السُّخْرُ وَلَا يَأْتِيهِ الْمَلُومُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ لَهُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْأَعْنَاقُ وَالرُّسُومُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِحِسَابٍ يَوْمَ يَكْفُرُ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَلْحِقْنَا بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ أَجْرَهُمْ
- ۷۶۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَلِيمُ الْغَنِيُّ
- ۷۷۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقَيُّومُ لَا يَأْتِيهِ السُّخْرُ وَلَا يَأْتِيهِ الْمَلُومُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ لَهُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْأَعْنَاقُ وَالرُّسُومُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِحِسَابٍ يَوْمَ يَكْفُرُ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَلْحِقْنَا بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ أَجْرَهُمْ
- ۷۸۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَلِيمُ الْغَنِيُّ
- ۷۹۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقَيُّومُ لَا يَأْتِيهِ السُّخْرُ وَلَا يَأْتِيهِ الْمَلُومُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ لَهُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْأَعْنَاقُ وَالرُّسُومُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِحِسَابٍ يَوْمَ يَكْفُرُ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَلْحِقْنَا بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ أَجْرَهُمْ
- ۸۰۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَلِيمُ الْغَنِيُّ
- ۸۱۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقَيُّومُ لَا يَأْتِيهِ السُّخْرُ وَلَا يَأْتِيهِ الْمَلُومُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ لَهُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْأَعْنَاقُ وَالرُّسُومُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِحِسَابٍ يَوْمَ يَكْفُرُ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَلْحِقْنَا بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ أَجْرَهُمْ
- ۸۲۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَلِيمُ الْغَنِيُّ
- ۸۳۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقَيُّومُ لَا يَأْتِيهِ السُّخْرُ وَلَا يَأْتِيهِ الْمَلُومُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ لَهُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْأَعْنَاقُ وَالرُّسُومُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِحِسَابٍ يَوْمَ يَكْفُرُ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَلْحِقْنَا بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ أَجْرَهُمْ
- ۸۴۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَلِيمُ الْغَنِيُّ
- ۸۵۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقَيُّومُ لَا يَأْتِيهِ السُّخْرُ وَلَا يَأْتِيهِ الْمَلُومُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ لَهُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْأَعْنَاقُ وَالرُّسُومُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِحِسَابٍ يَوْمَ يَكْفُرُ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَلْحِقْنَا بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ أَجْرَهُمْ
- ۸۶۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَلِيمُ الْغَنِيُّ
- ۸۷۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقَيُّومُ لَا يَأْتِيهِ السُّخْرُ وَلَا يَأْتِيهِ الْمَلُومُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ لَهُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْأَعْنَاقُ وَالرُّسُومُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِحِسَابٍ يَوْمَ يَكْفُرُ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَلْحِقْنَا بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ أَجْرَهُمْ
- ۸۸۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَلِيمُ الْغَنِيُّ
- ۸۹۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقَيُّومُ لَا يَأْتِيهِ السُّخْرُ وَلَا يَأْتِيهِ الْمَلُومُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ لَهُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْأَعْنَاقُ وَالرُّسُومُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِحِسَابٍ يَوْمَ يَكْفُرُ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَلْحِقْنَا بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ أَجْرَهُمْ
- ۹۰۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَلِيمُ الْغَنِيُّ
- ۹۱۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقَيُّومُ لَا يَأْتِيهِ السُّخْرُ وَلَا يَأْتِيهِ الْمَلُومُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ لَهُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْأَعْنَاقُ وَالرُّسُومُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِحِسَابٍ يَوْمَ يَكْفُرُ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَلْحِقْنَا بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ أَجْرَهُمْ
- ۹۲۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَلِيمُ الْغَنِيُّ
- ۹۳۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقَيُّومُ لَا يَأْتِيهِ السُّخْرُ وَلَا يَأْتِيهِ الْمَلُومُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ لَهُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْأَعْنَاقُ وَالرُّسُومُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِحِسَابٍ يَوْمَ يَكْفُرُ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَلْحِقْنَا بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ أَجْرَهُمْ
- ۹۴۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَلِيمُ الْغَنِيُّ
- ۹۵۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقَيُّومُ لَا يَأْتِيهِ السُّخْرُ وَلَا يَأْتِيهِ الْمَلُومُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ لَهُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْأَعْنَاقُ وَالرُّسُومُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِحِسَابٍ يَوْمَ يَكْفُرُ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَلْحِقْنَا بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ أَجْرَهُمْ
- ۹۶۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَلِيمُ الْغَنِيُّ
- ۹۷۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقَيُّومُ لَا يَأْتِيهِ السُّخْرُ وَلَا يَأْتِيهِ الْمَلُومُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ لَهُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْأَعْنَاقُ وَالرُّسُومُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِحِسَابٍ يَوْمَ يَكْفُرُ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَلْحِقْنَا بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ أَجْرَهُمْ
- ۹۸۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَلِيمُ الْغَنِيُّ
- ۹۹۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقَيُّومُ لَا يَأْتِيهِ السُّخْرُ وَلَا يَأْتِيهِ الْمَلُومُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ لَهُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْأَعْنَاقُ وَالرُّسُومُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِحِسَابٍ يَوْمَ يَكْفُرُ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَلْحِقْنَا بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ أَجْرَهُمْ
- ۱۰۰۔ وَهُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَلِيمُ الْغَنِيُّ

تفسیر

گذشتہ آیات میں مشرکین کا ذکر تھا۔ ان آیات میں ان سوالات کے بارے میں گفتگو تھی جو ان سے کیے گئے تھے۔ زیر نظر آیات اسی گفتگو کا تتمہ ہیں۔

پہلے ان کے مبعوثوں کے بارے میں سوال تھا۔ اس کے بعد مرسلین کے ساتھ ان کے سلوک سے متعلق ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : اُس دن کا سوچو جس دن اللہ انہیں پکارے گا اور کہے گا، تم نے پیغمبروں کو کیا جواب دیا تھا، (ولیوم ینادیہم فیقول ماذا اجبتم المرسلین)۔

پہلے سوال کی طرح یقیناً اس سوال کا بھی ان کے پاس کوئی جواب نہیں۔ اگر وہ یہ کہیں کہ ہم نے ان کی دعوت کو قبول کیا تھا تو یہ جھوٹ ہے اور اُس میدان میں جھوٹ نہیں چل سکتا اور اگر وہ یہ کہیں کہ ہم نے ان کی تکذیب کی تھی، ان پر تہمتیں دھری تھیں، انہیں جاؤ گے کا نام دیا تھا، انہیں دیوانہ کہا تھا، ان کے خلاف مسلح جنگ کی تھی اور انہیں اور ان کے پیروکاروں کو قتل کیا تھا۔ تو یہ بھی ان کی بدترجی اور رسوائی کا باعث ہے۔

دہاں تو یہ عالم ہو گا کہ اللہ کے عظیم نبیوں سے جب سوال ہو گا کہ لوگوں نے تمہاری دعوت کا کیا جواب دیا تھا تو وہ کہیں گے :

تیرے علم کے سامنے تو ہمارا علم کچھ بھی نہیں تو تو تو علم الغیوب ہے۔ (ملکہ ۱۰۹)

ایسے عالم میں یہ گورڈل مشرک کیا جواب دے سکتے ہیں ؟

اسی لیے اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے : " اُس وقت تمام خبریں ان سے پردہ اٹھائیں ہوں گی " اور جواب دینے کے لیے کچھ بھی ان کے پاس نہ ہوگا۔ (فعمیت علیہم الانبیاء یومئذ)۔ یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے سے بھی کچھ پوچھ نہ سکیں گے " اور نہ کسی کا کچھ جواب سن پائیں گے۔ (فہم لایتساءلون)۔

یہ بات قابل ترجمہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں " عسی " یعنی اندھے بن کی نسبت خبروں کی طرف دی گئی ہے نہ کہ خود ان کی طرف۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ " وہ اندھے ہو جائیں گے " بلکہ کہتا ہے، " خبریں ایسی اندھی ہوں گی کہ انہیں

تلاش نہ کر پائیں گی کیونکہ بسا ایسا ہوتا ہے کہ انسان خود کسی چیز سے باخبر نہیں ہوتا لیکن ایک منہ سے دوسرے کی طرف گردش کرتی ہوئی خبر اُس تک پہنچ جاتی ہے۔ معاشرے میں بہت سی خبریں یوں ہی پھیلتی ہیں لیکن اُس جہان میں نہ تو یہ لوگ آگاہی رکھتے ہوں گے اور نہ ہی خبر پھیلنے کی صلاحیت۔

اس طرح تمام خبریں اُن سے پوشیدہ رہیں گی۔ جب اُن سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اُن مرسلین کو کیا جواب دیا تھا تو اُن سے کوئی جواب نہ بن پائے گا اور وہ سراپا سکوت بن جائیں گے۔

قرآن کی روش یہ ہے کہ وہ ہمیشہ کافروں اور گنہگاروں پر لوٹ آنے کے راستے کھلے رکھتا ہے تاکہ وہ گناہ کے کسی بھی مرحلے سے راہ حق کی طرف پلٹنا چاہیں تو اُن کے لیے گنجائش موجود ہو۔ اسی لیے اگلی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے۔ البتہ جو شخص توبہ کرے، ایمان لے آئے اور عمل صالح بجلائے امید ہے کہ فلاح یا فنگان میں سے ہو جائے۔ (فاما من تاب وامن وعمل صالحا فعلمی ان یشکون من المفلحین)۔

لہذا تمہارے لیے راہ نجات ان تین اقدامات میں ہے :

۱۔ خدا کی طرف بازگشت

۲۔ ایمان

۳۔ عمل صالح

اس کے بعد یقیناً فلاح و نجات ہے۔

”علی“ (امید ہے)۔ اگرچہ جو شخص ایمان و عمل صالح کا حامل ہو اس کے لیے فلاح یقینی ہے لیکن یہاں ممکن ہے یہ تعبیر اس لیے ہو کہ فلاح اس حالت کے تسلسل سے مشروط ہے اور چونکہ ضروری نہیں کہ ہر توبہ کرنے والا اپنی اس حالت پر باقی رہے اس لیے یہاں یہ لفظ لایا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ جب ”علی“ کی تعبیر کسی ذات کریم سے صادر ہو تو اس میں قطعی اور یقینی ہونے کا مفہوم پنہاں ہوتا ہے جب کہ اللہ تو اکرم الاکرمین ہے۔

بعد والی آیت درحقیقت نفی شرک اور مشرکین کے بطلان کی دلیل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : تیرا رب جس چیز کو چاہتا ہے خلق کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے چُن لیتا ہے۔ (وربک یخلق ما یشاء ویختار)۔

تخلیق اُس کے ہاتھ میں ہے اور تدبیر و اختیار اور انتخاب بھی اسی کے ارادے پر منحصر ہے۔ ”وہ اس کے مقابلے میں کوئی اختیار نہیں رکھتے“۔ (ماکان لہم الخیرۃ)۔

خلق کرنے کا اختیار اُسے حاصل ہے، اختیار شفاعت کا حامل وہ ہے اور انبیاء و مرسلین بھیجنے کا اختیار اُسی

لے ”ماکان لہم الخیرۃ“ میں ”ما“ نافیہ ہے۔ البتہ بعض نے اس احتمال کا ذکر کیا ہے کہ یہاں : ”ما“ موصول ہے اور پختار کے مفہوم منقول پر مطلق ہے لیکن یہ احتمال بہت بعید ہے۔

کے پاس ہے۔ خلاصہ یہ کہ تمام چیزوں کا اختیار اس کی ذات پاک کے ارادے سے وابستہ ہے کیونکہ نبوتوں سے تو کچھ ہو ہی نہیں سکتا جب کہ فرشتے اور انبیاء بھی اس کی اجازت ہی سے کچھ کر سکتے ہیں۔

بہر حال یہاں اختیار کا اطلاق اس کی عمومیت کی دلیل ہے یعنی اللہ امر تکوینی میں بھی صاحب اختیار ہے اور امر تشربی میں بھی۔ دونوں کا سرچشمہ اس کا مقام خالقیت ہے۔

جب صورت حال یہ ہے تو پھر وہ کیونکر راہِ شرک پر پھلتے ہیں اور غیر خدا کی طرف کس طرح جاتے ہیں۔ اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے : اللہ ان شرکاء سے منزہ و برتر ہے جن کے وہ قائل ہوتے ہیں۔ (سبحان اللہ وتعالی عما یشرکون)۔

اہل بیت علیہم السلام کے حوالوں سے پہنچنے والی روایات میں بتایا گیا ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں مذکور اختیار، انتخاب اور چناؤ خدا کی طرف سے امام معصوم کے انتخاب کی طرف اشارہ ہے۔ نیز ”ماکان لہم الخیرۃ“ (لوگوں کو اس سلسلے میں کوئی اختیار نہیں) سے بھی یہی مفہوم مُراد لیا گیا ہے۔ ان روایات میں دراصل ایک واضح مصداق بیان کیا گیا ہے کیونکہ دین کی حفاظت کا مسئلہ خدا ہی سے مربوط ہے اور ممکن نہیں ہے کہ اس مقصد کے لیے خدا کے علاوہ کوئی اور معصوم رہبر کا انتخاب کر سکے۔

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ کے وسیع علم کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ گزشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ کے وسیع اختیار کا ذکر ہوا تھا، زیر نظر آیت اس کے لیے تاکید یا دلیل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : تیرا پروردگار اُسے بھی جانتا ہے کہ جو وہ اپنے سینے میں چھپائے رکھتے ہیں اور اُسے بھی جسے آشکار کرتے ہیں۔ (وربک یعلم ما تکن صدورہم وما یعلنون)۔

یہ ہر چیز پر اس کے احاطے اور اختیار کی دلیل ہے نیز ضمنی طور پر مشرکین کے لیے تنبیہ ہے کہ وہ یہ گمان نہ کریں کہ اللہ ان کی تبتوں اور سازشوں سے آگاہ نہیں ہے۔

زیر بحث آخری آیت درحقیقت گزشتہ آیات کے لیے نفی شرک کے بارے میں اخذ تفسیر اور توضیح کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی ان چار صفات کا بیان ہے جو سب اُس کی خالقیت اور اختیار کی فرع ہیں۔ پہلے فرمایا گیا ہے : ”وہ خدا ہے کہ جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں (وہو اللہ لا الہ الاہو)۔

کیسے ممکن ہے کہ اُس کے علاوہ کوئی معبود ہو جب کہ خالق صرف وہ ہے اور تمام اختیارات اسی کے دست قدرت میں ہیں لہذا جو لوگ شفاعت وغیرہ کے عُذر سے بتوں کے واسطے سے متوسل ہیں وہ سخت اشتباہ میں مبتلا ہیں۔

دوسری صفت یہ کہ تمام نعمتیں، چاہے اس جہان کی ہوں چاہے اُس جہان کی سب اسی کی طرف سے ہیں اور یہ

اس کی خالقیت مطلقہ کا لازمہ ہے۔ اس لیے قرآن مزید کہتا ہے : ہر حمد و ستائش بھی اسی سے تعلق رکھتی ہے چاہے اس جہان میں ہو چاہے اُس جہان میں۔ (لہ الحمد فی الاولیٰ والآخرۃ)۔
تیسری صفت یہ ہے کہ دونوں جہانوں میں وہی حاکم ہے۔ (ولہ الحکم)۔
بدیہی ہے کہ جب خالق و مخار وہ ہے تو کوئی تشریحی حاکمیت بھی اسی کے اختیار میں ہوگی۔
چوتھی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ "تم سب کی بازگشت (حساب و اجر کے لیے) اسی کی طرف ہوگی۔
(والیہ ترجموں)۔

وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے ، وہ تمہارے اعمال سے آگاہ بھی ہے اور وہی یومِ الحجاز کا حاکم ہے لہذا تمہارا حساب کتاب اور تمہاری جزا و سزا بھی اسی کے ہاتھ میں ہوگی۔

۷۱۔ قُلْ اَرَايْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللهُ عَلَيْكُمُ اللَّيْلَ سَرْمَدًا اِلَى

يَوْمِ الْقِيَامَةِ مِنْ اِلَهٍ غَيْرِ اللّٰهِ يَاتِيكُمْ بِضِيَاءٍ اَفَلَا تَسْمَعُونَ

۷۲۔ قُلْ اَرَايْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلَى

يَوْمِ الْقِيَامَةِ مِنْ اِلَهٍ غَيْرِ اللّٰهِ يَاتِيكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُونَ

فِيهِ اَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝

۷۳۔ وَمِنْ رَحْمَتِهِ جَعَلَ لَكُمْ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ

وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝

۷۴۔ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ اَيْنَ شُرَكَاءِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ

تَزْعُمُونَ ۝

۷۵۔ وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيدًا فَقُلْنَا هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ

فَعَلِمُوا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتُرُونَ ۝

ترجمہ

۷۱۔ کہہ دو : مجھے بتاؤ اگر خدا روز قیامت تک تمہارے لیے رات ہی کو باقی رکھنا چاہے تو

کیا اللہ کے علاوہ کوئی معبود ہے جو تمہارے لیے روشنی لاسکے ؟ کیا تم سنتے نہیں ہو ؟

۴۲۔ کہہ دو : مجھے بتاؤ اگر خدا روز قیامت تک دن ہی کو باقی رکھنا چاہے تو کیا اللہ کے علاوہ کوئی معبود ہے جو تمہارے لیے رات لاسکے تاکہ تم اس میں سکون پاسکو؟ کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟

۴۳۔ یہ امر اس کی رحمت میں سے ہے کہ اُس نے تمہارے لیے رات اور دن بنائے ہیں تاکہ اس میں سکون پاؤ اور فضل الہی سے فائدہ اٹھاؤ۔ شاید تم اس کی نعمت کا شکر ادا کرو۔ اس دن کا سوچو جس میں انہیں پکارے گا اور کہے گا : کہاں ہیں وہ جنہیں تم میرا شریک خیال کرتے تھے؟

۴۵۔ (اس روز) ہم ہر امت میں سے گواہ منتخب کریں گے اور (گمراہ مشرکین سے) کہیں گے اپنی دلیل پیش کرو۔ لیکن وہ جانتے ہیں کہ حق اللہ کے لیے ہے اور جو کچھ بھی وہ افترا پر بازی کرتے تھے تو سب ان (کی نگاہ) سے گم ہو جائے گا۔

تفسیر

رات اور دن کا وجود عظیم نعمت ہے :

زیر بحث آیات نعمات الہی کے ایک عظیم حصے کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔ یہ نعمات توحید اور نفی شرک پر بھی است کرتی ہیں۔ اس لحاظ سے زیر بحث آیات گزشتہ آیات کی بحث کو ہی مکمل کرتی ہیں۔ ان آیات میں مذکور نعمات ان آیات الہی کا ایک نمونہ بھی ہیں جن کی وجہ سے خدا لائق حمد و ستائش ہے، وہی حمد و ستائش جس کا ذکر گزشتہ آیات میں آیا ہے۔ یہ نعمات نظام آفرینش اور اس جہان کی تدبیر میں خدا کے مختار ہونے پر بھی شاہد ہیں۔

پہلے دن کی عظیم نعمت یعنی روشنی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہی روشنی کہ جو ہر جنبش و حرکت کا سرچشمہ ہے۔ یاد ہوتا ہے : کہہ دو مجھے بتاؤ اگر خدا روز قیامت تک دن کو طول کر دیتا تو کیا اللہ کے علاوہ کوئی معبود ہے جو اسے لیے روشنی لے آتا؟ کیا سنتے نہیں ہو؟ (قل اریتم ان جعل اللہ علیکم اللیل سرمدا لیلوم القیامۃ من اللہ غیر اللہ یا تیکم بضیاء افلا تسمعون)۔

(حاشیہ اچھے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں)

یہاں لفظ "ضیاء" (روشنی) استعمال کیا گیا ہے کیونکہ دن کا اصلی اور بنیادی مقصد روشنی ہی ہے۔ وہی روشنی کہ جس سے تمام موجودات زندہ کی حیات وابستہ ہے۔ اگر سورج نہ ہوتا تو نہ درخت اگتے، نہ پھول کھلتے، نہ پرندے پرواز کرتے، نہ انسان کی حیات ہوتی اور نہ بارش کا کوئی قطرہ برتا۔

"سرمدا" دائم اور ہمیشگی کے معنی میں ہے۔ بعض نے اسے "سرد" کے مادہ سے سمجھا ہے اور اس کا معنی "پہلے درپہلے" کیا ہے۔ اس کی میم کو انہوں نے زائد قرار دیا ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ مادہ خود دائم اور ہمیشگی کے معنی میں ہے۔

اگلی آیت "تاریکی" کی نعمت کا ذکر کرتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : کہہ دو : مجھے بتاؤ اگر خدا روز قیامت تک دن کو طول کر دیتا تو اللہ کے علاوہ کوئی معبود ہے جو تمہارے لیے رات لے آتا تاکہ تم اس میں آرام کر پاتے؟ کیا دیکھتے نہیں ہو؟ (قل اریتم ان جعل اللہ علیکم النہار سرمدا الی یوم القیامۃ من اللہ غیر اللہ یا تیکم بلیل تسکونون فیہ افلا تبصرون)۔

تیسری آیت جو درحقیقت گزشتہ دو آیتوں کا نتیجہ ہے اس میں فرمایا گیا ہے : یہ امر رحمت الہی میں سے ہے کہ اُس نے تمہارے لیے رات اور دن بنائے ہیں تاکہ تم آرام بھی کر سکو اور دوسری طرف اپنی زندگی کی خاطر فضل خالصہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کر سکو اور شاید تم اس کی نعمت کا شکر ادا کرو۔ (ومن رحمۃہ جعل لکم اللیل والنہار لتسکونوا فیہ ولتبتغوا من فضلہ ولعلکم تشکرون)۔

جی ہاں، رحمت الہی کی وسعت کا تقاضا ہے کہ وہ تمہیں زندگی کے تمام وسائل مہیا کرے۔ ایک طرف تو تمہیں کام کاج اور جنبش و حرکت کی ضرورت ہے کہ جو دن کی روشنی کے بغیر ممکن نہیں اور دوسری طرف تمہیں راحت و آرام کی ضرورت ہے کہ جو شب کی تاریکی کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔

دوہر حاضر میں سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ روشنی کی موجودگی میں انسانی جسم کی تمام مشینریاں حرکت میں رہتی ہیں۔ خون کی گردش، سانس لینے کی مشینری، حرکت قلب وغیرہ۔ اگر روشنی ضرورت سے زیادہ پڑے یا ایک خاص مقدار سے بڑھ جائے تو خلیے (CELLS) تھک جاتے ہیں اور نشاط و اطمینان کی جگہ فرسودگی سی چھا جاتی ہے۔ اس کے برعکس رات کی تاریکی میں بدن کی مشینریاں ایک گہرے آرام و سکون میں ڈوب جاتی ہیں۔ ایسے میں قوی ایک نشاط تازہ حاصل کرتے ہیں۔

(گزشتہ صفحے کا حاشیہ)

"اور بیتو" کا عام طور پر "خبر دہی" (مجھے بتاؤ) معنی کیا جاتا ہے لیکن جیسا کہ ہم کہ چکے ہیں کہ یہ لفظ "عمل علم" کو کیا جانتے ہو؟ کے معنی میں بھی آتا ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ ارباب لغت نے تصریح کی ہے کہ "سرمدا" ایسے موجود کو کہا جاتا ہے کہ جس کا آغاز ہو اور انجام جب کہ "ابلی" اُسے کہتے ہیں جس کا آغاز نہ ہو اور "ابدی" اُسے کہتے ہیں جس کا انجام نہ ہو۔

تفسیر نمونہ کی آٹھویں اور باہویں جلد میں اس مسئلے کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔

یہ بات جاذب توجہ ہے کہ قرآن جس وقت دائمی رات کا ذکر کرتا ہے تو آیت کے آخر میں فرماتا ہے :
”کیا سنتے نہیں ہو؟“

اور جس وقت دائمی دن کے بارے میں بات کرتا ہے تو فرماتا ہے :
”کیا دیکھتے نہیں ہو؟“

تعبیر کا یہ فرق ہو سکتا ہے اس بنا پر ہو کہ رات سے مناسبت رکھنے والی جن قوت شمولی ہے جب کہ دن کے ساتھ مناسبت رکھنے والی جس بنیائی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن نے اپنی تعبیرات میں کس حد تک باریک بینی سے کام لیا ہے۔

یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ اس سلسلہ کلام کے آخر میں ”شکر“ کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ نور و ظلمت کا ایسا جچاٹلا نظام عطا ہونے پر شکر — ایسا شکر جو ہر صورت انسان کو معرفت منعم پر آمادہ کرتا ہے اور ایسا شکر جو افراتفران کا باعث بنتا ہے۔

توحید اور نفعی شرک کے بارے میں کچھ دلائل ذکر کرنے کے بعد قرآن پھر اسی سوال کی طرف لوٹتا ہے جو گزشتہ آیات میں زیر بحث تھا۔ فرماتا ہے: ”اس دن کا سوچو کہ جب خدا انہیں پکارے گا اور کہے گا :
کہاں میں وہ جو بزم خود تم نے شرک قرار دے رکھے تھے۔ (و یوم ینادی بہم فبقول این شرکاء الذین کنتم تعبدون)۔“

یہ آیت یعنی اسی سورہ کی آیت ۶۲ ہے۔ ہو سکتا ہے یہ تکرار اس بنا پر ہو کہ روز قیامت پہلے مرحلے میں اُن سے ایک انفرادی سوال ہوگا تاکہ اُن کا ضمیر بیدار ہو جائے اور وہ شرمندہ ہوں۔ جب کہ دوسرے مرحلے میں سب لوگوں کو گواہوں کی موجودگی میں سوال کیا جائے گا تاکہ وہ شرمسار ہوں اور دوسری آیت میں اسی مرحلے کی مناسبت سے سوار آیا ہے۔ لہذا بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے : اس روز ہم ہر امت میں سے گواہیں گے۔ (ونزعنا من کل امة شہیداً)۔ اس کے بعد تلے خبر اور گواہ مشرکین سے ہم کہیں گے کہ اپنے شرک پر کوئی دلیل پیش کرو۔ (فقلنا ہاتوا برہانکم)۔

یہ وہ منزل ہے جہاں تمام مسائل روز روشن کی طرح واضح ہو جائیں گے۔ ”اور وہ جان لیں گے کہ حق خدا کے لیے ہے“
! فاعلموا ان الحق لله)۔

اور جو کچھ وہ افراتفران دیکھتے تھے سب اُن کے ہاتھ سے نکل جائے گا اور گم ہو جائے گا۔ (وضل عنہم ما کانوا یفترون)۔

ہر امت میں سے گواہ سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں اگر قرآن کی دیگر آیات کو ملحوظ نظر رکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ ہر پیغمبر اپنی امت پر گواہ ہوگا جب کہ پیغمبر اسلام خاتم انبیاء ہیں۔ آپ تمام انبیاء اور تمام امتوں پر گواہ ہیں۔

لے نزع کے مادہ سے نزعنا کی تعبیر کی چیز کہ اس کی جگہ سے جب کہنے کے معنی میں ہے اور یہاں ہر گز سے ایک گواہ لایا جانا مراد ہے۔

چنانچہ سورہ نسا کی آیت ۴۱ میں فرمایا گیا ہے :

فکیف اذا جئنا من کل امة بشہید وجئنا بک من الہؤلاء شہیداً

اس دن اُن کی کیا حالت ہوگی کہ جب ہم ہر امت کے اعمال کا گواہ طلب کریں گے اور تجھے اُن پر گواہ قرار دیں گے۔ اس طرح گویا انبیاء کے حضور ایک مجلس منعقد ہوگی اور اُن کو رول ہیٹ دھرم مشرکوں سے اس مجلس میں باز پرس ہوگی۔ اس موقع پر انہیں احساس ہوگا کہ شرک کی مصیبت کتنی بڑی ہے۔ اب وہ پروردگار کی حقانیت اور نبوت کی لغویت واضح طور پر دیکھیں گے۔

یہ بات جاذب توجہ ہے کہ قرآن یہاں پر کہہ رہا ہے :

ضل عنہم ما کانوا یفترون

یعنی نبوت کے بارے میں اُن کے بے بنیاد تصورات و خیالات سب ان کی نظروں سے غائب ہو جائیں گے کیونکہ میدان قیامت تمام حق ہے، وہاں باطل کے لیے کوئی گنجائش نہیں لہذا باطل غائب اور حق ہو جائے گا۔ اس دنیا میں اگر باطل حق کا لباس پہن لیتا ہے اور چند دن فریب کاری میں مشغول رہتا ہے تو وہاں فریب کے پردے سب ہٹ جائیں گے اور حق کے علاوہ کچھ باقی نہ رہے گا۔

ایک روایت میں امام محمد باقر علیہ السلام ”ونزعنا من کل امة شہیداً“ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں
ومن ہذہ الامۃ امامہا

اس امت سے بھی اس کے امام کو چُنا جائے گا۔

یہ بات اس چیز کی طرف اشارہ ہے کہ ہر زمانے میں امت کے لیے ایک معصوم شاہ ضروری ہے اور مندرجہ بالا حدیث اس کے ایک مصداق کی طرف اشارہ ہے۔

۴۶۔ إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوسَى فَبَغَى عَلَيْهِمْ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا أَنْ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوبُوا بِالْعَصْبَةِ أُولَى الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ۝

۴۷۔ وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْهِدِينَ ۝

۴۸۔ قَالَ إِنَّمَا أُوتِيْتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي ۗ أَوَلَمْ يَعْلَم أَنَّ اللَّهَ قَدْ أَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهِ مِنَ الْقُرُونِ مَنْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَأَكْثَرُ جَمْعًا ۗ وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوبِهِ الْمُجْرِمُونَ ۝

ترجمہ

۴۶۔ قارون قوم موسیٰ میں سے تھا لیکن اس نے ان پر ظلم کیا۔ ہم نے اسے استہد فرمانے دیئے تھے کہ ان کے صندوق ایک طاقتور گروہ کے لیے بھی اٹھانا مشکل تھے۔ وہ وقت یاد کر جب اس کی قوم نے اس سے کہا: یہ سب متعجبانہ خوشی نہ کرو کیونکہ غور آمیز خوشی کرنے والوں کو خدا دوست نہیں رکھتا۔

۴۷۔ اور جو کچھ اللہ نے تجھے دیا ہے اس کے ذریعے آخرت کا گھر تلاش کرو اور دنیا سے اپنے

حصے کو فراموش نہ کر اور جیسے خدا نے تیرے ساتھ نیکی کی ہے تو بھی نیکی کر اور زمین پر ہرگز فساد و گناہ نہ کر کہ خدا مفسدین کو پسند نہیں کرتا۔

۴۸۔ (قارون) کہنے لگا: یہ دولت میں نے اپنے علم کی وجہ سے حاصل کی ہے۔ کیا اُسے معلوم نہ تھا کہ خدا نے اس سے پہلے کچھ ایسی ہی قوموں کو ہلاک کر دیا جو اس سے زیادہ طاقتور اور زیادہ مالدار تھیں (اور جس وقت عذاب الہی آپہنچتا ہے تو) پھر مجرموں سے ان کے گناہوں کا نہیں پوچھا جاتا (اور ان کے لیے عذر خواہی کا موقع باقی نہیں رہتا)۔

تفسیر

بنی اسرائیل کے خود پرست سرمایہ دار:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عجیب و غریب سرگزشت اور فرعون کے خلاف ان کے جہاد کے بارے میں کچھ تفصیلات اسی سورت کی گزشتہ آیات میں بیان کی گئی ہیں اور اس سلسلے میں کہنے کی باتیں کہی جا چکی ہیں۔ مذکورہ گفتگو بہت ہدایت بخش تھی۔

اس سورہ کی کچھ آیات بنی اسرائیل کے ایک اور مسئلے اور الجھن سے متعلق ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ان میں ایک سرکش سرمایہ دار تھا۔ اُس کا نام قارون تھا۔ قارون غرور و سرکشی میں مست کر دینے والی دولت کا مظہر تھا۔

اصولی طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی میں تین مجاوز طاعتوں کے خلاف جہاد کیا۔ ایک فرعون تھا جو حکومت و اقتدار کا مظہر تھا، دوسرا قارون تھا جو ثروت و دولت کا مظہر تھا اور تیسرا سامری تھا جو سکود فریب کا مظہر تھا۔ اگرچہ حضرت موسیٰ کا سب سے بڑا معرکہ حکومت کے خلاف تھا لیکن دوسرے معرکے بھی اہم تھے اور وہ بھی عظیم تربیتی نکات کے حامل ہیں۔

مشہور ہے کہ قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قریبی رشتہ دار تھا۔ (چچا تھا یا چچا زاد تھا اور یا خالہ زاد)۔ اُس نے تورات کا خوب مطالعہ کیا تھا۔ پہلے وہ مومنین کی صف میں تھا لیکن دولت کا گھنڈا اُسے کفر کی آغوش میں لے گیا اور اُسے زمین میں غرق کر دیا۔ اس غرور نے اسے پیغمبر خدا کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا اور اس کی موت سب کے لیے باعث عبرت بن گئی۔ اس واقعے کی تفصیل ہم زیر بحث آیات میں پڑھیں گے۔

ارشاد ہوتا ہے : قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا لیکن اس نے ان پر ظلم کیا (ان قارون کان من قوم موسیٰ فنبی علیہم)۔

اس ظلم کا سبب یہ تھا کہ اُس نے بہت سی دولت کمائی تھی اور چونکہ اس کا ظرف کم تھا اور ایمان مضبوط نہ تھا اس لیے فراوان دولت لے اسے ہکا دیا اور اسے انحراف و انکسار کی طرف لے گئی۔

قرآن کہتا ہے : ہم نے اسے مال و دولت کے اتنے خزانے دیئے کہ انہیں اٹھانا ایک طاقتور گروہ کے لیے ہی مشکل تھا۔ (واتینا من الکنوز ما ان مفاحة لتنوء بالعصبة اولی القوۃ)۔

”مفاح“ ”مفتح“ (بروزن ”مکتب“) کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے ایسی جگہ جس میں کوئی چیز ذخیرہ کرتے ہیں مثلاً صندوق کے جس میں اسواں و اشیاء محفوظ رکھتے ہیں۔

اس معنی کے لحاظ سے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ قارون کے پاس اس قدر سونا چاندی اور قیمتی اموال تھے کہ ان کے صندوقوں کو طاقتور لوگوں کا ایک گروہ بڑی مشکل سے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے کر جاتا تھا۔

تو چر رہے کہ ”عصبہ“ اس گروہ کو کہتے ہیں کہ جس نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہوں، جس کے افراد بہت طاقتور ہوں اور اعصاب کی طرح ایک دوسرے کو پکڑے ہوں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قارون کے براہرات اور گراں قیمت اموال کا حجم کس قدر زیادہ تھا۔

بعض کہتے ہیں کہ ”عصبہ“ دس سے لے کر چالیس افراد تک کے گروہ کو کہتے ہیں۔

لفظ ”تنوء“ ”نوء“ مکے مادے سے زحمت و مشقت سے اٹھنے کے معنی میں ہے اور بہت ذہنی اموال کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے کہ جب انسان اسے اٹھاتا ہے تو بوجھ کے باعث ایک طرف سے دوسری طرف کو جھک جاتا ہے۔

”مفاح“ کی تفسیر میں جو کچھ ہم نے سطور بالا میں بیان کیا ہے اسے مفسرین اور علماء لغت کی ایک جماعت نے قبول کیا ہے جب کہ بعض دوسرے علمائے ”مفاح“ کو ”مفتح“ (بروزن ”مکتب“) کی جمع قرار دیا ہے جس کا معنی ہے چابی۔ یہ

مفسرین کہتے ہیں کہ قارون کے خزانوں کی چابیاں اتنی تھیں کہ کئی طاقتور افراد بڑی مشکل سے انہیں اٹھا پاتے تھے۔ جن لوگوں نے یہ دوسرا معنی اپنایا ہے وہ خود اپنے اس معنی کی توجیہ میں مشکل سے دوچار ہو گئے ہیں کہ خزانے کی چابیاں

کے لیے ایسا کیوں ممکن ہے۔ بہر حال پہلی تفسیر زیادہ واضح اور زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ اس سے قطع نظر کہ اہل لغت نے ”مفتح“ کے بھی کئی معانی بیان کیے ہیں ان میں سے ایک معنی ”خزانہ“ ہی ہے یعنی مال جمع کرنے کی جگہ لیکن پہلا معنی حقیقت سے نزدیک اور ہر قسم کے مبالغے سے پاک ہے۔ البتہ ”مفاح“ ”مفتح“ کی جمع ہے جس کا معنی ہے چابی۔ ان الفاظ سے اشتباہ نہیں

ہونا چاہیے۔

بعض مفسرین نے یہ خیال چاہا ہے کہ ایک جماعتی معنی دیا گیا ہے اور اسے کہ مراد یہ ہے کہ ان تمام اموال کی چابی سبھی کا اور ان کی حفاظت کرنا طاقتور لوگوں کے لیے بھی مشکل تھا لیکن یہ تفسیر بھی بہت بعید معلوم ہوتی ہے۔ (اس لفظ کے لغوی مفہوم کو تفصیل سے بیان کرنے کے لیے

”لسان العرب“ کی طرف رجوع فرمائیں)۔

آئیے اس بحث سے آگے بڑھیں اور دیکھیں کہ بنی اسرائیل نے قارون سے کیا کیا :

قرآن کہتا ہے : اس وقت کو یاد کرو جب اس کی قوم نے اس سے کہا : تم میں ایسی خوشی نہیں ہونی چاہیے جس میں تکبر اور غفلت ہو کیونکہ خدا غرور میں ڈوبے ہوئے غرور افروز کو پسند نہیں کرتا۔ (اذ قال لہ قومہ لا تفرح ان اللہ لا یحب الفرحین)۔

اس کے بعد چار اور قیمتی، سرنوشٹ ساز اور تربیتی نصیحتیں کرتے ہیں۔ اس طرح کل پانچ ہو گئیں۔

پہلے کہتے ہیں : اللہ نے جو کچھ تجھے دیا ہے اُس سے وار آخرت حاصل کر۔ (وابتغ فیما آتاک اللہ الدار الاخری)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ بعض کج فہم افراد کے خیال کے برخلاف مال و دولت کوئی بڑی چیز نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ کس راستے پر صرف ہو رہا ہے۔ اگر اس کے ذریعے دار آخرت کو تلاش کیا جائے تو پھر اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے لیکن اگر

وہ غرور، غفلت، ظلم، تجاؤز اور ہوس پرستی کا ذریعہ بن جائے تو پھر اس سے بدتر بھی کوئی چیز نہیں۔

حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے یہی منطق دُنیا کے بارے میں اپنے ایک مشہور جملے میں بیان فرمائی ہے :

من البصر ما بصرتہ ومن البصر الیہا اعنتہ .

اگر کوئی دُنیا کو ایک ذریعہ جانتے ہوئے اس کی طرف دیکھے تو یہ اُس کی آنکھ کو

بینا کر دیتی ہے مگر جو اسے مقصد قرار دیتے ہوئے اس کی جانب دیکھے تو یہ اسے

نابینا کر دیتی ہے۔

قارون اپنی بے پناہ دولت کی بنا پر بہت سے اجتماعی امور خیر انجام دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ لیکن اس کے غرور و تکبر نے اسے حقائق دیکھنے کی اجازت نہ دی۔

انہوں نے مزید کہا : دُنیا سے اپنے حصے کو نہ بھول جا (ولا تنس نصیبک من الدنیا)۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر انسان کا اس دُنیا میں ایک محدود حصہ ہے یعنی وہ مال جو اس کے ہنر، لباس اور مکان کے لیے

درکار ہوتا ہے اور ان پر صرف ہوتا ہے اس کی مقدار معین ہے اور ایک خاص مقدار سے زیادہ اس کے لیے قابلِ جذب ہی نہیں ہوتا۔ انسان کو یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے۔

ایک انسان کتنی غذا کھا سکتا ہے، کتنا لباس پہن سکتا ہے اور اسے کتنے مکانوں اور سواریلوں کی ضرورت ہوتی ہے؟

مرتے وقت انسان کتنے کفن ساتھ لے جا سکتا ہے؟ لہذا باقی وہ چاہے نہ چاہے دوسروں کا حصہ ہے۔ اور انسان اس کا امانت دار ہے۔ امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے کیا خوب بیان فرمایا ہے :

یا بن آدم ما کسبت فوق قوتک فانت فیہ خازن لغیرک

اے فرزند آدم : جو کچھ تو اپنی خوراک کی مقدار سے زیادہ حاصل کرتا ہے اس کے

لے ”فرحین“ ”مفتح“ ”مفتح“ کی جمع ہے اس کا معنی ہے وہ شخص کہ جو کچھ چیز پالنے کی وجہ سے ضرور ہو گیا اور خوشی سے بھولا نہ سانا ہو۔

لے ”نوح البلاغہ“ ، خطبہ ۸۲۔

بارے میں تو دوسروں کا خزانہ دار ہے۔

اسلامی روایات اور کلمات مفسرین میں اس آیت کی ایک اور تفسیر بھی ملتی ہے اور ہو سکتا ہے یہ بھی اس کا ایک معنی ہو کیونکہ ایک لفظ ایک سے زیادہ معانی میں استعمال ہو سکتا ہے۔

وہ تفسیر یہ ہے کہ — معانی الاخبار میں ہے کہ "ولاتنص نصیبك من الدنيا" کی تفسیر میں حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا :

لاتنص صحتك وقدرتك وفراغك وشبابك ونشاطك ان تطلب بها
الآخرة

تندرستی، قوت، فراغت، جوانی اور خوشی کو فراموش نہ کر اور ان (پانچ عظیم نعمتوں) کے ذریعے اپنی آخرت طلب کر۔

اس تفسیر کے مطابق قرآن حکیم کا مذکورہ بالا جملہ تمام انسانوں کو متنبہ کرتا ہے کہ وہ سب سے صلاحیتوں اور مواقع کو ضائع نہ کریں کیونکہ ملت کے لمحے بادلوں کی طرح جلد گزر جاتے ہیں یہ

تیسری نصیحت یہ ہے : جیسے خدانے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو جس نیکی کر (واحسن كما احسن الله اليك)۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان ہمیشہ اللہ کے احسان پر نظر لگائے ہوئے ہے اور اس کی بارگاہ سے ہر خیر کا تماشاکر رہا ہے اور اسی سے ہر قسم کی توقع باندھے ہوئے ہے تو اس طرح سے وہ کیونکر کسی کے صریح تقاضے کی زبان حال کے تقاضے کو نظر انداز کر سکتا ہے اور اس سے کیسے بے اعتنائی بُرت سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ جیسے خدانے تجھ پر عنایت کی ہے تو بھی دوسروں سے نیکی کر۔ سورہ نور کی آیت ۲۲ میں عفو و درگزر کے بارے میں ایسی ہی بات کہی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

وليعفوا وليصفحوا الا تحببوا ان يعفوا الله لکم

مومنین کو چاہیے کہ عفو و درگزر سے کام لیں۔ کیا تمہیں یہ بات پسند نہیں کہ اللہ تمہیں بخش دے۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض اوقات خدا انسان کو عظیم نعمتیں دیتا ہے جب کہ اسے اپنی ذاتی زندگی میں ان سب کی احتیاج نہیں ہوتی۔ مثلاً کسی کو خدا ایسی عقل دیتا ہے کہ جو صرف ایک فرد کا نظام چلانے کے لیے کافی ہوتی ہے بلکہ ایک ملک کو کنٹرول کر سکتی ہے۔ کسی کو وہ ایسا علم دیتا ہے جو ایک انسان ہی کے لیے نہیں بلکہ ایک معاشرے کے لیے کارآمد ہو سکتا ہے۔ کسی کو وہ ایسا مال دیتا ہے کہ جو بڑے بڑے اجتماعی پروگراموں کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اس قسم کی نعمات الہی کا مفہوم یہ ہے کہ یہ سب کی سب تیری ایک ذات سے متعلق نہیں ہیں بلکہ انہیں دوسروں کی طرف منتقل کرنے کے لیے کوششیں کرنا اور دیکھنا ہے۔ اللہ نے تجھے یہ نعمت اس لیے دی ہے تاکہ تیرے ہاتھ سے اپنے بندوں کا نظام چلائے۔

لے بیخ البلاغہ ، کلمات تصارح ۱۱۲

کے تفسیر فرہنگستان ، ج ۴ ص ۱۱۲ ، بحوالہ معانی الاخبار

آخر میں چر تھی نصیحت یہ ہے : کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مادی وسائل تجھے دھوکہ دیں اور تو انہیں گناہ اور دعوت گناہ میں صرف کر دے " زمین میں ہرگز گناہ و فساد نہ کر کیونکہ اللہ مفسدین کو پسند نہیں کرتا " (ولاتتبع الفساد في الارض ان الله لا يحب المفسدين)۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض اوقات دولت مند اور سرمایہ دار ہوں زریا بڑا بسنے کے جنون میں خرابی کرتے ہیں اور معاشرے کو محرومیت اور فقر و فاقہ میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ ہر چیز اپنے لیے ہی منحصر کر لیتے ہیں، لوگوں کو اپنا غلام بنا کر رکھنے کے درپے ہوتے ہیں اور جو کوئی اعتراض کرے اسے ختم کر دیتے ہیں اور اسے ختم نہ کر سکیں تو تمہیں لگا کر غیر موثر اور معاشرے سے ایک طرف کر دیتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ معاشرے کو خرابی و تباہی کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ان ناصحین نے پہلے قارون کا غرور ختم کرنے کی کوشش کی۔ پھر اسے خبردار کیا کہ دنیا وسیلہ ہے تصدقین تیرے مرحلے میں اسے متنبہ کیا کہ جو کچھ تیرے پاس ہے اُس میں سے تو اپنے لیے تھوڑا سا خرچ کر سکتا ہے۔ پھر اسے یہ حقیقت یاد دلائی کہ خدانے تیرے ساتھ نیکی کی ہے تجھے بھی نیکی کرنی چاہیے ورنہ وہ اپنی نعمتیں تجھ سے چھین لے گا اور پانچویں مرحلے میں اسے زمین میں خرابی برپا کرنے سے ڈرایا اور یہ آخری بات پہلی باتوں کا حاصل ہے۔

صحیح طور پر معلوم نہیں کہ نصیحت کرنے والے یہ افراد کون تھے۔ البتہ یہ بات مسلم ہے کہ وہ اہل علم، پرہیزگار، زیرک با بصیرت اور جرات مند افراد تھے۔ بعض نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ وہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے۔ لیکن یہ بات بہت بعید ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے :

اذ قال له قومہ

قارون کی قوم نے اس سے کہا۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس سرکش و سنگد بنی اسرائیل نے ان ہمدرد و اعلیٰین کو کیا جواب دیا۔

قارون تو اپنی اس بے حساب دولت کے نشے میں پھرتا تھا اُس نے اُسی غرور سے کہا : میں نے تو یہ سب دولت اپنے علم و دانش کے بل بوتے پر حاصل کی ہے : (قال انما اوتيته على علم عندى)۔ تمہیں اس سے کیا کہیں اپنی دولت کیسے خرچ کرتا ہوں۔ جو میں نے کیا اسے خود کیا ہے تو پھر صرف کرنے میں بھی مجھے تمہاری راہنمائی کی کوئی ضرورت نہیں۔ علاوہ ازیں یقیناً خدا مجھے اس دولت کے لائق سمجھتا تھا تبھی تو اس نے مجھے عطا کیا ہے اور اسے صرف کرنے کی راہ بھی اُس نے مجھے بتائی ہے۔ میں دوسروں سے بہتر جانتا ہوں۔ تمہیں اس میں دخل ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان سب باتوں سے قطع نظر زحمت میں نے کی ہے، تکلیف میں نے اٹھائی ہے، ٹخن جگر پیاسے تب کہیں یہ دولت جمع کی ہے دوسروں کے پاس بھی ایسی لیاقت و توانائی ہوتی تو وہ زحمت و کوشش کیوں نہ کرتے۔ میں نے کوئی ان کا راستہ تو نہیں روک رکھا اور اگر ان میں اس کی لیاقت نہیں ہے تو پھر کیا ہی اچھا ہے کہ مجھ کے رہیں اور مر جائیں۔

یہی وہ برسیدہ اور گھٹیا منطق ہے کہ جو عام طور پر بے ایمان سرمایہ دار نصیحت کرنے والوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

لے "اوتيته على علم عندى" اس جملے میں مذکورہ بالا ایک یا تین معانی ہو سکتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن نے اس باب کو اجمالاً بیان کیا ہے کہ قادر کس علم کے بل پر دولت جمع کرتا تھا۔ کیا وہ علم کیا تھا، بیساکہ بعض مفسرین نے کہا ہے یا پھر تجارت، زراعت اور صنعت کا علم تھا یا پھر کیا وہ انتظامی صلاحیت اور علم کا حامل تھا یا یہ سب امور تھے۔ بعید نہیں کہ آیت کا مفہوم وسیع ہو اور یہ ان سب امور کی طرف اشارہ کر رہی ہو۔ (قطع نظر اس کے کہ اس بات میں کتنی حقیقت ہے کہ علم کیا ہے کہ ذریعے تانبے وغیرہ کو سونے میں تبدیل کیا جاسکتا ہے)۔

اس موقع پر قرآن قادر اور اس جیسے دیگر افراد کو ایک ٹیکھا جواب دیتا ہے: کیا اُسے معلوم نہ تھا کہ خدا نے اس سے پہلے کئی ایسی قوموں کو ہلاک کر دیا کہ جو اس سے زیادہ طاقتور تھیں، علم میں بڑھ کر تھیں اور سرمایہ بھی ان کے پاس زیادہ تھا۔

(اولو یعلمون اللہ قد اهلك من قبله من القرون من هواسد منه قوة واكثر جمعا)۔

تو کتا ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ میرے علم کی بدولت ہے لیکن تو بھول گیا ہے کہ تجھ سے زیادہ علم والے اور زیادہ طاقتور افراد بھی تھے۔ کیا وہ عذاب الہی سے بچ سکے ہیں؟

بنی اسرائیل کے اہل دانش نے قادر سے کہا تھا:

ما اتاك الله ..

اللہ نے جو کچھ تجھے عطا کیا ہے۔

لیکن اُس نے اُدب گستاخ نے کہا:

میرے پاس جو کچھ ہے وہ میرے علم کی بدولت ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے ارادے اور مشیت کا ذکر کر کے اس کی حیثیت و طاقت کے چھوٹے پن کو ظاہر کرتا ہے۔ آیت کے آخر میں ایک مختصر اور معنی نیز جملے کے ذریعے ایک اور تنبیہ کرتا ہے: "عذاب الہی کے نزول کے وقت مجرموں سے ان کے گناہ کے بارے میں سوال نہیں ہوگا۔" اس وقت سوال و جواب کی گنجائش ہرگز نہ ہوگی، اس وقت تو قاطع، دردناک، تکلیف دہ اور ناگمانی عذاب ہوگا۔ (ولا یسئل عن ذنوبهم المجرمون)۔

یعنی — آج تو بنی اسرائیل کے آگاہ افراد اور اہل دانش قادر کو نصیحت کر رہے ہیں، اسے غرور و فکر کی دعوت دے رہے ہیں اور اس کے پاس جواب دینے کی گنجائش ہے لیکن جب تمام نجات ہو چکا اور عذاب الہی آگیا تو پھر غرور و فکر کرنے اور اُدھر کی باتیں کرنے اور غرور و تکبر کے اظہار کی گنجائش نہ ہوگی۔ پھر عذاب الہی آکر رہے گا اور پھر تباہی ناگزیر ہے۔ یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہاں جو کہا گیا ہے کہ مجرمین سے سوال نہ ہوگا، اس سے کونسا سوال مراد ہے؟ دنیا کا یا آخرت کا؟

بعض مفسرین نے پہلا سوال مراد لیا ہے اور بعض نے دوسرا لیکن کوئی مضائقہ نہیں کہ دونوں جگہ پر سوال مراد ہو یعنی سزا سے استحصا کے موقع پر دنیا میں اُن سے سوال نہ ہوگا تاکہ وہ رُذکر دانی اور عُذر تراشی کریں اور وہ اپنے آپ کو بے گنہ ظاہر کریں اور قیامت میں بھی اُن سے سوال نہ ہوگا کیونکہ وہاں سوال کے بغیر ہی سب کچھ واضح ہوگا اور قرآن کے بقول مجرموں کی

حالت پر خود اُن کے چہرے گواہ ہوں گے:

يعرف المجرمون بسماهم

یعنی — مجرم تو اپنی کیفیت ہی سے پہچانے جائیں گے۔ (رضن - ۴۱)

اس طرح زیر بحث آیت سورہ رضن کی آیت ۲۹ سے ہم آہنگ ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

فیومئذ لا یسئل عن ذنوبہ انس ولا جان

اس دن کسی بھی انسان یا جن سے اس کے گناہ کے بارے میں سوال نہیں ہوگا۔

اس مقام پر ایک اور سوال سامنے آتا ہے۔ وہ یہ کہ سورہ حجر کی آیت ۹۲ میں تو ہے:

فوسرک لستلہم اجمعین

تیرے رب کی قسم ہم اُن سب سے سوال کریں گے۔

یہ آیت زیر بحث آیت سے کیسے ہم آہنگ ہے؟

اس سوال کا جواب دو طریقوں سے دیا جاسکتا ہے:

پہلا یہ کہ قیامت کے مختلف مرحلے ہوں گے بعض مراحل پر سوال ہوگا اور بعض پر سب چیزیں واضح ہو چکنے کی وجہ سے

سوال کی ضرورت نہ رہے گی۔

دوسرا یہ کہ سوال دو قسم کا ہے:

۱۔ سوال تحقیق اور

۲۔ سوال سرزنش

قیامت کے روز سوال تحقیق کی ضرورت نہیں ہوگی کیونکہ ہر چیز آشکار ہوگی اور بیان کی احتیاج نہ ہوگی لیکن سرزنش آمیز

سوال وہاں ہوگا اور یہ خود مجرموں کے لیے ایک طرح کی نفسیاتی سزا ہوگی۔

یہ بالکل ایسے ہے جیسے ایک باپ اپنے ناخلف بیٹے سے پوچھتا ہے کہ کیا میں نے تیرے تیری اتنی خدمت نہ کی تھی۔ کیا

ان خدمات کا صلہ یہ خیانت اور سرکشی تھا (جب کہ حقیقت سے باپ اور بیٹا دونوں آگاہ ہوتے ہیں اور باپ کا مقصد بیٹے کو

سرزنش کرنا ہوتا ہے)۔

۷۹۔ فَخَرَجَ عَلَىٰ تَوَمِهِ فِي زِينَتِهِ قَالَ الَّذِينَ يُرِيدُونَ الْحَيَاةَ
الدُّنْيَا لَيْلِيَتٌ لَنَا مِثْلَ مَا أُوتِيَ قَارُونُ إِنَّهُ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ۝

۸۰۔ وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَيُكَفِّرُونَ تَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِّمَن أَمَنَ وَ
عَمِلَ صَالِحًا ۖ وَلَا يُلْقَاهَا إِلَّا الصَّابِرُونَ ۝

۸۱۔ فَخَسَفْنَا بِهِ وَبِدَارِهِ الْأَرْضَ ۖ فَمَا كَانَ لَهُ مِنْ فِئَةٍ يَنْصُرُونَهُ
مِنْ دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِينَ ۝

۸۲۔ وَأَصْبَحَ الَّذِينَ تَمَنَّوْا مَكَانَهُ بِالْأَمْسِ يَقُولُونَ وَيَكَانَ اللَّهُ
يُبْسِطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ ۖ لَوْلَا أَن مَنَّ اللَّهُ
عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۖ وَيَكَانَهُ لَا يَفْلِحُ الْكَافِرُونَ ۝

ترجمہ

۷۹۔ (ایک روز) قارون بڑی سچ و سچ اور ٹھانڈے کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے نکلا۔ وہ لوگ جو دنیاوی زندگی کے طالب تھے
کہنے لگے: جیسا مال و متاع قارون کو ملا ہے، کاش ہمارے پاس بھی ہوتا یقیناً اُس کے پاس تو (دولت کا)
بہت بڑا حصہ ہے۔

۸۰۔ اور جن لوگوں کو علم دیا گیا تھا وہ کہنے لگے کہ تم پر افسوس ہے۔ ثواب الہی بہتر ہے، اُن لوگوں کے لیے جو ایمان
لائے اور عمل صالح انجام دیتے ہیں۔ لیکن اُسے صابروں کے سوا کوئی نہیں پاسکتا۔

۸۱۔ آخر کار ہم نے اُسے اور اُس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔ اور عذاب الہی کے مقابلے میں کوئی جماعت اُس کی مدد
نہ کر سکی اور وہ خود بھی اپنی مدد نہ کر سکا۔

۸۲۔ اور وہ لوگ جو کل اُس کی مقام و منزلت کی تنگ کرتے تھے! جب انہوں نے یہ منظر دیکھا تو کہنے لگے:
وائے ہو ہم پر، یہ تو اللہ ہی ہے کہ جو اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اُس پر رزق کو فراخ کر دیتا ہے۔
اور جس پر چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ اگر خدا ہم پر احسان نہ کرتا تو ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیتا۔ اے قوموں!
کافروں پر کہ وہ ہرگز نجات نہیں پاسکتے۔

تفسیر

نمائش ثروت کا جنون:

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ مغرور دولت مند لوگ طرح طرح کے جنون میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اُن میں سے ایک نمائش
ثروت کا جنون ہے۔ انہیں اس عمل سے خوشی حاصل ہوتی ہے کہ اپنی دولت کا لوگوں پر اظہار کریں۔ مثلاً یہ کہ وہ اپنی گرام
قیمت سواری پر سوار ہو کے نکلیں اور برہنہ پا لوگوں کے درمیان سے گزریں۔ اُن کے منہ پر گرد و غبار ڈالنے جائیں اور اُن کی
تحقیر کرتے جائیں۔ انہیں اس عمل سے تسکین ہوتی ہے۔

لیکن دولت کی یہی نمائش اُن کے لیے بلائے جان بن جاتی ہے۔ کیونکہ لوگوں کے دلوں میں اُن کے خلاف کینہ پرورش
پانے لگتا ہے اور جذبات نفرت پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہی شرمناک اور مکروہ عمل اُن کی زندگی کو ختم کر دیتا
یا اُن کی دولت کو برباد کر دیتا ہے۔

لیکن ہے کہ اس جنون آمیز عمل کا نتیجہ کسی قسم کی تحریک ہو۔ مثلاً لالچی افراد میں مزید دولت حاصل کرنے کی ہوس میں
اضافہ ہو۔ اور سرکش لوگوں میں فرمانبرداری کے جذبات پیدا ہوں۔ مگر اہل ثروت، نمائش دولت کے عمل کو اس قصور کے بغیر
انجام دیتے ہیں۔ درحقیقت اُن کا عمل بھی ایک قسم کی ہوس ہوتا ہے۔ اس میں کسی سوجھ بوجھ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔
بہر حال قارون بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہ تھا۔ بلکہ جنون نمائش ثروت کا ایک واضح نمونہ تھا۔ قرآن میں زیر بحث آیات میں
ایک جملے کے اندر قارون کی اس کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔ قارون پڑھی زیب و زینت سے اپنی قوم کے سامنے نکلا:
(فَخَرَجَ عَلَىٰ قَوْمِهِ فِي زِينَتِهِ ۖ)

کلمہ "فی زینتہ" اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ اُس نے اپنی پوری قوت اور توانائی اس کام پر صرف کر دی تھی کہ
وہ اپنی تمام دولت و آرائش کی لوگوں کے سامنے نمائش کرے اور یہ بات عتاب و ذکر نہیں کہ اتنی دولت کا مالک شخص جب نمود
حشمت کا ارادہ کرے تو وہ کیا کچھ کر سکتا ہے۔

کتب تواریخ میں اس واقعے کے متعلق بہت سے افسانے اور داستانیں ذکر ہوتی ہیں۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ قارون
چار ہزار غلاموں کی قطار کے ساتھ تخی اسرائیل کے درمیان سے گزرا۔ جبکہ یہ چار ہزار غلام گرام قیمت گھونٹوں پر سرخ پوشا کپڑے پہنے ہوئے

سوار تھے۔ اُس کے ساتھ خوش نکل کینزیں بھی تھیں، بوسفید پتھروں پر سوار تھیں جن پر شہری زین کسے ہوئے تھے۔ اُن کی پوشاکیں سُرُج اور سب طلا کار تھیں۔

بعض لوگوں نے اُس کے خادموں کی تعداد ستر ہزار لکھی ہے اور اسی طرح کی اور باتیں بھی لکھی ہیں۔

لیکن اگر ہم ان تمام بیانات کو مبالغہ آمیز بھی سمجھ لیں پھر بھی ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ فنانش دولت کے لیے اُس کے پاس بہت ساز و سامان تھا۔

جیسا کہ دُنیا کا معمول ہے قارون کی جاہ و حشمت کو دیکھ کر لوگوں کے دواگرد ہو گئے۔ دُنیا پرست اکثریت نے جب اس خیر و کن منظر کو دیکھا تو اُن کے دل میں ترتباتیں پھلنے لگیں۔ اُنھوں نے ٹھنڈی آد بھری اور کہنے لگے کہ کاش وہ بھی قارون جیسی دولت کے مالک ہوتے۔ خواہ ایک دن، ایک ساعت یا ایک لمحے کے لیے یہ شکوہ نصیب ہوتا۔ آہ! اُس کی کیسی شیریں، جذباتِ نشاط انگیز اور لذت بخش زندگی ہے!

چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا ہے: جو لوگ دُنیاوی زندگی کے طلب گار تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ کاش ہمارے پاس بھی اتنی دولت ہوتی جتنی قارون کے پاس ہے: (قال الذین یریدون الحیوة الدنیا یالیت لنا مثل ما اوتی قارون)۔

حقیقت میں اُس کے پاس نو دولت کا فراوان حصہ ہے: (انہ لذو حظ عظیم)۔ آفرین ہے قارون پر اور اُس کی بی پناہ دولت پر، واہ اُس کا کیا جاہ و جلال ہے۔ اور کتنے خادوم اور نوکر چاکر ہیں۔ تاریخ میں اُس جیسا کوئی شخص نہیں ہے۔ یہ عظمت لے خدائے عنایت کی ہے۔ غرض لوگ اسی طرح کی باتیں کرتے تھے۔

درحقیقت اس واقعے میں امتحان کی ایک بہت بڑی پٹی بل رہی تھی۔ اُس پٹی کے بیچ میں قارون تھا۔ تاکہ وہ اپنی سرکشی اور غرور کا امتحان دے۔ دوسری طرف بنی اسرائیل کے دُنیا پرست لوگ اُس پٹی کے گروا گرد تھے۔

لیکن قارون کے لیے ایک دردناک عذاب تھا۔ ایسا عذاب جو ایسی فنانش کے بعد ہوتا ہے۔ یہ عذاب آج عظمت سے قعر زمین میں لے جا تا ہے۔

لیکن اِس دُنیا طلب بڑے گردہ کے مقابلے میں ایک اقلیت اہل علم صاحبانِ فکر، پرہیزگار اور با ایمان لوگوں کی بھی دُعا موجود تھی جن کا اُفقِ فکر ان مسائل سے برتر اور بالاتر تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے نزدیک احترامِ شخصیت کا پیمانہ زرا اور زور نہ تھا۔ ان کے نزدیک انسان کی قدر کا معیار اِس کے مادی وسائل نہ تھے۔ یہ وہ لوگ تھے کہ دولت و ثروت کی عارضی اور مضحکہ خیز نمود و فنانش پر قسز آمیز طرز پر سُکرا دیتے تھے، اور اسے ایک بے مغز اور غیر حقیقی شے سمجھتے تھے۔

چنانچہ قرآن میں مذکور ہے کہ: وہ لوگ جنہیں علم و معرفت عطا ہوئی تھی، اُنھوں نے کہا تم پر افسوس ہے! یہ تم کیا کہہ رہے؟ اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں اور عملِ صالح کرتے ہیں، خدا کی طرف سے ثواب اور جزا بہتر ہے: (وقال الذین اوتوا العلو ویلکوا ثواب اللہ خیر لمن امن وعمل صالحاً)۔

ان الفاظ پر اُنھوں نے یہ اضافہ کیا کہ یہ ثواب الہی صرف اُن لوگوں کا نصیب ہے جو صابرین ہیں: (ولا یلقاھا الا الصابرون)۔

اِس ثواب الہی کے مستحق وہ لوگ ہیں جو دُنیا کی زینتوں اور اُس کے بیجان انگیز فرزندوں کے مقابلے میں مستقیم المزاج رہتے ہیں۔ جو نعماتِ دُنیا کی محدودیت کو مردانہ وار استقلال سے برداشت کرتے ہیں۔ جو ناکس لوگوں کے سامنے کبھی سر نہیں جھکاتے اور جو دُنیا میں مال، دولت اور خوف و مصیبت کی آزمائش کے مقابلے میں پہاڑ کی طرح ثابت قدم رہتے ہیں۔

مسلماً۔ اِس مقام پر "الذین اوتوا العلو" سے مراد بنی اسرائیل کے اہل علم مومنین ہیں۔ اُن میں یوشع جیسے بزرگ افراد بھی تھے۔

اِس مقام پر قابلِ غور امر یہ ہے کہ "الذین یریدون الحیوة الدنیا" (یہ جملہ گردہ ازل کے متعلق آیا ہے) کے مقابلے میں "الذین یریدون الحیوة الاخرة" نہیں کہا گیا۔ بلکہ صفتِ علم کی تخصیص کی گئی ہے۔ کیونکہ علم ہی وہ اصل ہے جس سے ایمان و استقامت، حصولِ ثواب الہی اور وارِ آخرت میں اجر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

"الذین اوتوا العلو" میں ایک ایسا ابہام بھی ہے کہ یہ قارون کے اِس فقر کا جواب ناطق ہے کہ وہ اپنے آپ کو عالم سمجھتا تھا۔ قرآن کا جواب یہ ہے کہ: حقیقی عالم یہ لوگ ہیں کہ جن کا اُفقِ فکر اِس حد تک بلند ہے کہ تو خیرہ سر اور مغرور۔ اِس جواب میں ہمارے لیے یہ درس بھی ہے کہ علم و دانش ہی جملہ خیرات و برکات کی دُنیا ہے۔

قارون نے سرکشی اور خدا کی نافرمانی کر کے اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھ لیا تھا۔ مگر تواریخ اور روایات میں اُس کے متعلق کچھ اور ہی واقعہ بیان ہوا ہے جو قارون کی انتہائی بے شرمی کی علامت ہے۔ اور وہ ماجرا یہ ہے کہ:-

ایک روز حضرت موسیٰ نے قارون سے کہا کہ خدا نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ تیرے مال میں سے زکوٰۃ لوں جو تمہاں کا حق ہے جب قارون زکوٰۃ کی ادائیگی کے اصول سے مطلع ہوا اور اُس نے حساب لگایا کہ اُسے کتنی کثیر رقم دینا پڑے گی تو اُس نے انکار کر دیا اور اپنے آپ کو بچانے کے لیے حضرت موسیٰ کی مخالفت پر آمادہ ہو گیا۔ وہ بنی اسرائیل کے دولت مندوں کی ایک جماعت کے سامنے کھڑا ہوا اور کہا:

"اے لوگو! موسیٰ چاہتا ہے کہ وہ تمہاری دولت خود ہضم کر لے۔ اُس نے تمہیں نماز

کا حکم دیا تم نے قبول کیا۔ اُس کے دوسرے احکامات بھی تم نے مان لیے۔ کیا تم یہ بات

بھی برداشت کرو گے کہ اپنی دولت اُسے دے دو؟"

اُن سب نے کہا کہ نہیں۔ مگر اُس سے کس طرح مقابلہ کیا جاسکتا ہے؟

اِس وقت قارون کے ذہن میں ایک شیطانی خیال آیا۔ اُس نے کہا کہ میں نے ایک بہت اچھی تدبیر سوچی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اِس کے خلاف ایک منافی عصمت سازش کرنی چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک فاحشہ عورت کو تلاش کر کے موسیٰ کے پاس بھیج دیں، تاہم وہ اُس پر شرمناک ہمت لگا دے۔ بنی اسرائیل نے اِس تجویز کو پسند کیا۔ اُنھوں نے ایک بدکار عورت کو تلاش کیا اور اُس سے کہا کہ:

"تو جو کچھ مانگے گی تجھے دیں گے بشرطیکہ تو یہ گواہی دے کہ موسیٰ کا تجھ سے نامشروع تعلق تھا۔"

اُس عورت نے بھی اس تجویز کو منظور کر لیا۔ ایک طرف تو یہ سازش ہوئی۔ دوسری طرف قارون حضرت موسیٰ کے پاس گیا اور اُن سے کہا کہ :-

”بہتر ہے کہ آپ بنی اسرائیل کو جمع کریں اور اُنھیں الٰہی احکامات سنائیں“

حضرت موسیٰ نے یہ پیش کش منظور کر لی اور بنی اسرائیل کو جمع کیا۔

جب لوگ جمع ہو گئے تو اُنھوں نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ: ”آپ ہمیں خدا کے احکام سنائیں“

حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ خدائے مجھے حکم دیا ہے کہ ”بجز اُس کے کسی کی پرستش نہ کرو“ صلوات رحم بجالاؤ، ایسا کرو اور دیکھا کرو۔ زنا کار آدمی کے لیے خدائے مجھ دیا ہے کہ اگر وہ زنا نہ مفسد کرے تب تو اسے سنگسار کیا جائے۔

جب حضرت موسیٰ نے یہ الفاظ کہے تو بنی اسرائیل کے دولت مند سازشی لوگوں نے کہا: ”خدا وہ مجرم تو خود ہی ہو۔“ حضرت موسیٰ نے جواب دیا ”اے اٹھنا ہے خواہ میں خود ہی ہوں“

اُس مقام پر اُن بے شرموں نے، بے ادبی اور گستاخی کی حد کر دی اور کہا کہ:

نہم بانستہ ہیں کہ تو خود اس فعل کا مرتکب ہو جسے۔ اور غلام بدکارہ عورت سے تیرا تعلق رہا ہے۔“

پھر اُنھوں نے اُس عورت کو بلایا اور اُس سے کہا کہ تو شہادت دے۔ حضرت موسیٰ نے اُس عورت کی طرف رخ کیا اور کہا کہ ”میں تجھے خدا کی قسم دیتا ہوں کہ تو اصل حال بیان کر۔“

جب اُس بدکارہ عورت نے یہ بات سنی تو کانپ گئی، اُس کی حالت بدل گئی اور اُس نے کہا:

”جب آپ مجھ سے سچ بات پوچھتے ہیں تو میں حقیقت حال بیان کرتی ہوں۔ وہ یہ ہے کہ

اِن لوگوں نے مجھے اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ میں آپ کو قسموں کروں، اس کے بدلے میں

اُنھوں نے مجھے ایک کثیر رقم دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر میں گواہی دیتی ہوں کہ آپ

باعثت ہیں اور اللہ کے رسول ہیں۔“

ایک دوسری روایت میں مذکور ہے کہ اُس عورت نے یہ بھی کہا کہ :-

لعنت ہو مجھ پر، میں نے اپنی زندگی میں بہت گناہ کیے ہیں مگر کسی بی بی پر تمہارا

لگانا تھی۔

اس کے بعد اُس نے دولت کے دو قبیلے جو اُن سازشیوں نے اُسے دیے تھے

نخال کر سامنے رکھ دیے اور مذکورہ باتیں کہیں۔

حضرت موسیٰ سجدے میں گر گئے اور رونے لگے۔ اس موقع پر بہت سا سازشی قارون پر عذاب نازل ہوا۔

اسی روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ خدائے قارون کے غرق زمین کرنے کا حضرت موسیٰ کو اختیار دیا تھا۔

۱۔ مطابق نقل تفسیر المیزان جلد ۱۶ صفحہ ۸۴ جوالہ والمنثور اسی طرح تفسیر روح المعانی نیز دیگر مفسرین نے بھی کچھ فرق کے ساتھ قارون کے غرق ہونے کی روایت نقل کی ہے۔

اس مقام پر قرآن مجید کے الفاظ یہ ہیں کہ: ہم نے اُسے اور اُس کے گھر کو زمین میں غرق کر دیا: (خسفنا بہ وابدارہ الارض)۔

یہ درست ہے کہ جب نمحیرین کا اطمینان اور سرکشی اور اُن کی جانب سے تہی دست مومنین کی تحقیر و تذلیل اور یہی الٰہی کے خلاف سازش اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو اُس وقت دست قدرت الٰہی دراز ہوتا ہے اور اِن منجبر گستاخوں کی زنجیروں کو شرم کر دیتا ہے اور اُنھیں ایسی سزا دیتا ہے کہ اُن کی افتاد سب لوگوں کے لیے سبب عبرت بن جاتی ہے۔

کلمہ ”خسف“ اس مقام پر زمین میں گرا جانے اور زمین میں پوشیدہ ہو جانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ انسان کی

پوری تاریخ میں ایسے واقعات بار بار پیش آئے ہیں کہ سخت زلزلہ آیا اور زمین شگافہ ہو گئی اور اُس نے شہریا آبادیوں کو نکل لیا۔ مگر

اس مقام پر جس حادثہ خسف کا ذکر ہے، یہ مختلف نوعیت کا ہے۔ اس میں فقط قارون اور اُس کے خزانے ہی غرق زمین ہو گئے۔

کیا عجب واقعات ہیں کہ فرعون تو دیر سے نیل کی موجوں میں غرق ہو جاتا ہے اور قارون شکر زمین میں سجا جاتا ہے۔ اس مقام

پر دینی یہ امر ہے کہ پانی جو مایہ حیات ہے، وہ فرعون اور اُس کے ہسکاروں کو ناپود کر کے پر مامور ہوتا ہے۔ اور زمین جو انسان کیلئے

جائے راحت ہے وہ قارون اور اُس کے ساتھیوں کے لیے گورستان بن جاتی ہے۔

یہ مسلّم ہے کہ قارون اپنے گھر میں تنہا نہ تھا۔ وہ اور اُس کے اہل خانہ، اُس کے ہم خیال، اور اُس کے ظالم اور متگرد دوست

سب کے سب شکر زمین میں سما گئے۔ لیکن اُس وقت اُس کی مدد کے لیے کوئی جماعت نہ تھی جو اسے عذاب الٰہی سے بچا سکتی

اور وہ خود بھی اپنی کوئی مدد نہ کر سکتا تھا: (فما کان لہ من فئۃ ینصرونہ من دون اللہ وما کان من المنصرین)۔

نہ تو اُس کے دستِ غرمان کے نعمتِ خور، نہ اُس کے دلی دوست، نہ اس کا مال و دولت، اِن میں سے کوئی شے بھی اُسے عذاب

الٰہی سے نہ بچا سکتی اور وہ سب کے سب قعر زمین میں سما گئے۔

آیات زیر نظر میں سے آخری آیت میں اُن لوگوں کے بدل جانے کا ذکر ہے جو گزشتہ روز قارون کے جاہ و جلال اور گرد و فر

کو دیکھ کر وجد اور رشک کر رہے تھے اور یہ آرزو کر رہے تھے کہ کاش ہمیشہ کے لیے یا عفوڑی دیر کے لیے ہی یہ شان ہمیں بھی نصیب ہوتی۔

یہ آیت عجیب سبق آموز ہے چنانچہ فرمایا گیا ہے۔ جو لوگ گزشتہ روز یہ آرزو کر رہے تھے کہ کاش ہم اُس کی (قارون کی)

جگہ ہوتے جب اُنھوں نے اُسے (قارون) اور اُس کی دولت کو زمین میں دھنستے ہوئے دیکھا تو کہنے لگے کہ ہمارے خیالات

پر افسوس ہے (حق یہ ہے کہ) خدا اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے روزی کو فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے

تنگ کر دیتا ہے۔ کلید رزق صرف اُسی کے ہاتھ میں ہے: (واضح الذین تموتوا مکانہ بالامس یقولون ویکان اللہ بیسط

الرزق لمن یشاء من عباده ویقدر)۔

(اُنھوں نے کہا) آج یہ بات ہم پر ثابت ہو گئی کہ جس آدمی کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کی کوشش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ

وہ خدا کی دین ہے۔ اُس کی عطا کا انحصار اس امر پر نہیں کہ وہ کسی سے لاضی اور خوش ہے۔ اور نہ کسی کی محرومی اس وجہ سے ہے کہ وہ

تسلسلہ اللہ کی جناب میں بے قدر ہے۔ اللہ افراد اور اقوام کو دولت دے کر ان کا امتحان لیتا ہے اور ان کی سیرت اور فطرت کو آشکار کرتا ہے۔

اس کے بعد وہ (رشک کرنے والے) سوچنے لگے کہ اگر گزشتہ روز خدا ان کی دعا کو قبول کر لیتا اور انہیں بھی قارون جیسا ہی بنا دیتا تو ان کا کیسا عبرت ناک انجام ہوتا۔ لہذا انہوں نے خدا کی اس نعمت کا شکر ادا کیا اور کہا کہ اگر خدا ہم پر احسان کرتا تو وہ ہمیں بھی زمین میں غرق کر دیتا: (لولا ان منن اللہ علینا لخننا بنا)۔

اور گویا کہ کافر ہرگز نجات نہیں پائیں گے: (و یکانذ لا یفلح الکافرین)۔

اب ہم حقیقت کی نظر سے غور و غفلت اور کفر و ہوس دنیا کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں نیز ہم یہ سمجھ گئے ہیں کہ یہ نائنسی زندگیاں جن کا منظر نہایت دل فریب ہوتا ہے ان کی حقیقت کتنی غمناک ہے۔

اس ماجرے کے انجام سے یہ امر بڑی واضح ہو جاتا ہے کہ آخر کار مغرور کافر اور بے ایمان قارون دنیا سے رخصت ہوا۔ ہر چند کہ اس کا شمار بنی اسرائیل کے دانشمند اور تورات کے تلاوت کرنے والوں میں ہوتا تھا۔ نیز وہ حضرت موسیٰ کا رشتہ دار بھی تھا۔

چند اہم نکات

۱۔ ماضی اور حال کے قارون: داستان قارون (جسے ایک مغرور دولت مند کا مثالی نمونہ کہنا چاہیے) جسے قرآن کی سات آیات میں بہت ہی باذوق و تجربہ طور پر بیان کیا گیا ہے۔ وہ انسانی زندگی کے بہت سے حقائق سے پردہ اٹھاتی ہے۔ یہ داستان اس حقیقت کو روشنی میں لاتی ہے کہ دولت کا غرور اور نشہ بعض اوقات انسان کو دیوانہ بنا دیتا ہے۔ مثلاً اپنی دولت کی مناسبت کا جنون، دوسروں کے سامنے اپنی برتری کا اظہار، یا تنہی دست لوگوں کی تحقیر کر کے محظوظ ہونے کا جنون وغیرہ۔

یہی غرور ثروت اور سیم و زر کی بے کراں حرص کبھی انسان کو بدترین اور مکروہ ترین گناہوں پر آمادہ کر دیتی ہے۔ مثلاً وہ پیغمبر خدا کے مقابلے پر اتر آئے اور حقیقت و سخاوت کے خلاف جنگ کرنے لگے۔ حتیٰ کہ پاک ترین افراد پر نہایت بے شرمانہ تمہتیں لگانے لگے اور اپنی دولت خرچ کر کے اس مقصد کے لیے ہر کار و عورتوں کی امداد حاصل کرنے لگے۔ دولت کا غرور اور نشہ انسان کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ ناصحین کی نصیحت پر کان دھرے اور خیر خواہوں کے مشورے پر عمل کرے۔

(جو انہوں نے بندگان خدا کے حقوق غصب کر کے حاصل کی ہے) ان کی عقل و دانائی کی دلیل ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو دانائے اور سب کو نادان سمجھتے ہیں۔

یہ بے فہم ثروت مند مغرور اپنے آپ کو سب سے زیادہ عالم اور دانائے اور سب کو نادان سمجھتے ہیں۔ سادہ یہ گمان کرتے ہیں کہ ان کی دولت یہاں تک کہ ان کی جرات اتنی بڑھ جاتی ہے کہ خدا کے مقابلے میں بھی اپنی سستی سمجھنے لگتے ہیں اور اپنے آپ کو اس کی ذات سے مستغنی سمجھ کر کہتے گئے ہیں کہ:

ہم نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ ہماری ہمت، تیزی طبع، تخلیقی استعداد اور علم و دانش کا نتیجہ ہے:

ہم نے دیکھ لیا کہ اس قسم کے تباہ کار مستغیرین کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اگر قارون مع اپنے خیال و دولت کے تعزز میں بیزست ہو کر نابود ہو گیا تو دوسرے لوگ، دوسرے طریقوں سے نابود ہو جائیں گے اور زمین ان کی دولت کو کسی اور شکل سے نکل لے گی۔

بعض لوگ اپنی کثیر دولت سے محلات بناتے اور باغ لگاتے ہیں اور ایسی جانیادیں خریدتے ہیں کہ ان سے فائدہ اٹھانا ان کے نصیب میں ہی نہیں ہے۔ یہ لوگ اپنی دولت سے بخر اور دیران زمینیں اس خیال سے خرید لیتے ہیں کہ ان کے پلاٹ بنا کر فروخت کریں گے۔ اور اس طرح سے بہت سی دولت کمالیں گے۔ اس طرح زمین ان کی دولت کو نکل لیتی ہے۔ اس قسم کے سبک سرد دولت مندوں کے سامنے جب اپنی کثیر دولت کو فروغ کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا تو پھر انہیں ایسے شوق جو جلتے ہیں جن کی اقدار محض وہی ہوتی ہیں مثلاً وہ آثار قدیمہ سے برآمد شدہ ٹوٹے ہوئے پیالے اور گوزے، پیرنگ تختیاں، سالہا سال پرانی کمٹوں یا ٹوٹوں کو گراں بہا قدیم یادگاروں سمجھ کر خرید لیتے ہیں اور انہیں احتیاط سے اپنے محلات میں جلاتے ہیں۔ اگر ان چیزوں کی حقیقت پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ کوڑی پر پھینکنے کے لائق ہیں۔

ان اہل ثروت نے یہ بازیب و زرینت روش حیات اس حالت میں اختیار کی ہے کہ ان کے شہر دیار یہاں تک کہ ان کے ہمسائے اور زیر و یوار نادار اور مفلوک الحال لوگ رہتے ہیں۔ جو رات کو بیٹو کے سوتے ہیں۔ مگر ان دولت مندوں کا ضمیر ایسا مزہ ہو گیا ہے کہ انہیں ان غربا کی تکلیف کا قطعی احساس نہیں ہوتا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان دولت مندوں کے پالتو حیوانات نہایت آرام و زندگی گزارتے ہیں۔ ان کے لیے تربیت دینے والے استاد مقرر کیے جاتے ہیں۔ بوقت بیماری ان کے لیے طبیب کو بلایا جاتا ہے۔ جبکہ ان اہل دولت کے قرب ہوار میں مظلوم انسان انتہائی کسپرسی کی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ وہ بستر بیماری میں مارا دفریاد کر رہے ہوتے ہیں۔ مگر انہیں طبی امداد میسر نہ ہوتی ہے نہ دوا کا ایک قطرہ۔

سطر بالا میں جو حالات ہم نے کسی معاشرے کے مخصوص افراد کے لکھے ہیں وہ کبھی ایک قوم یا ملک پر بھی صادق آتے ہیں یعنی دنیا کے دیگر ممالک کے مقابلے میں کوئی ایک ملک قارون ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی ممالک میں امریکہ قارون ہو گیا ہے۔

اہل امریکہ تیسری دنیا کے غریب، تنہی دست اور پسماندہ عوام کا استعمال کر کے نہایت باشعور و بلال زندگی گزارتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جو فالتو غذا کوڑیوں پر پھینک دیتے ہیں۔ اگر اسے جمع کر کے بیچ صرف میں لایا جائے تو دنیا کے لاکھوں بیٹوں کے انسانوں کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔

جب ہم لفظ "غریب ملک" استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ یہ ممالک من جانب اللہ مفلس بے نوک ہیں بلکہ ان ملکوں کو مغرب کی طاقتور قوموں نے غارت کر کے فقیر بنا دیا ہے۔ ان میں سے بعض ملکوں میں زیر زمین گراں بہا معدنیات اور ذخائر ہیں۔ لیکن مغرب کے غارتگر انہیں لوٹ کے جاتے ہیں اور ان ملکوں کے باشندوں کو نکال کر دیتے ہیں۔ مغرب کی یہ قارون قومیں درحقیقت غول آشام جو زمینیں جنہوں نے تیسری دنیا کے مستضعفین کی دیران شدہ جمہوریتوں کے کھنڈرات پر اپنے

محلّت تعمیر کیے ہیں۔
اس لیے۔۔۔ جب تک دنیا کی مستضعف اقوام متحدہ متفق ہو کر ان قاروں کو تعزیر زمین میں نہ بیچ دیں گی۔ دنیا کے حالات ایسے ہی رہیں گے۔

نی الحال تو کیفیت یہ ہے کہ غارتگر اہل مغرب شراب بینی کر عالم سستی میں قہقہے لگاتے ہیں اور مخلوک الحال اقوام بھگانے روتی ہیں۔

۲۔ قارون یہ دولت کہاں سے لایا تھا؟ یہ امر توجہ طلب ہے۔ سورہ مومن کی آیات ۲۳ اور ۲۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی رسالت کا آغاز ہی تین شخصوں کے ساتھ تنازعے سے شروع ہوا تھا۔ وہ تھے فرعون اُس کا وزیر ہامان اور منور ثروت مند قارون۔ جیسا کہ ارشاد الہی ہے:

ولقد ارسلنا موسیٰ بالآياتنا وسلطان مبين الى فرعون وهامان وقارون فقالوا ساحر كذاب.

ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات، دلائل اور روشن معجزات دے کر فرعون، ہامان اور قارون کی طرف بھیجا۔ مگر ان سب نے کہا کہ یہ تو بڑا جھوٹا جادوگر ہے۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قارون بھی فرعون کے لڑکا میں سے تھا اور اُن ہی کا ہم عقیدہ تھا۔ ہم تاریخ میں یہ بھی پڑھتے ہیں کہ وہ ایک طرف تو بنی اسرائیل میں فرعون کا نمائندہ تھا اور اُس کا دوسرا مقام یہ تھا کہ فرعون کا خزانہ دار تھا۔

قارون کی ان حیثیات کے پیش نظر اُس کا کردار قطعی روشن ہو جاتا ہے۔ کہ فرعون نے اس منصوبے کے تحت کہ وہ بنی اسرائیل کو مصر میں اسیر رکھے اور اُن کے سرمائے اور دولت کو لوٹتا رہے۔ اُن ہی میں سے ایک منافق۔ حیلہ باز اور بے رحم انسان کو منتخب کر لیا تھا اور اسے بنی اسرائیل پر مسلط کر کے ممتا رکھ بنا دیا تھا۔ تاکہ وہ اپنی بستی پر بنی بظلم عہدے سے فائدہ اٹھا کر اُن کا غلبہ استحصال کرے اور اُنھیں تباہ کر دے۔ اور اپنے شیوہ بجز سے غلبہ دولت بھی کما لے۔

قرآن بتاتے ہیں کہ فرعون اور اُس کے ساتھیوں کے نابود ہو جانے کے بعد اُن کی دولت اور خزانوں کی بہت بڑی مقدار قارون کے پاس رہ گئی تھی۔ اُس وقت تک حضرت موسیٰ میں اتنی قوت پیدا نہ ہوئی تھی کہ قارون سے اُس فرعونی دولت کو جو اُس کے پاس تھی ہتھنٹھنٹھن کی امداد کے لیے لے لیں۔

بہر کیف قارون نے خواہ اُس دولت کو فرعون کی حیات میں پیدا کیا تھا، یا فرعون کے غرق ہو جانے کے بعد اُس کے خزانوں کو لوٹ کر۔ یا بقول بعض بذریعہ علم کیمیا یا بذریعہ تجارت یا زور اقتدار لیے ہونے لوگوں کا استحصال کر کے، جو کچھ بھی ہو۔ جب حضرت موسیٰ کو فرعون اور اُس کے ساتھیوں پر فتح حاصل ہو گئی تو قارون نے معاہدہ اپنی پالیسی بدل کر اور بہت بڑھ چڑھ کر (جیسا کہ گروہ منافقین کا طریقہ ہوتا ہے) اپنے آپ کو تریقہ کرنے والا اور اُس کا عالم ظاہر کیا۔ حالانکہ اس قسم کے لوگوں کے قلب میں فروریان کی ایک کرن بھی داخل نہیں ہوتی۔

آخر کار جب حضرت موسیٰ نے طے کر لیا کہ وہ اُس سے زکوٰۃ لیں گے تو اُس کے چہرے سے نقاب اُلٹ گئی اور اس کے

۱۔ تفسیر فرعون ماری، جلد ۲۵، ص ۲۵۷ وغیرہج البیان، جلد ۲۹، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

۲۔ مجمع البیان، جلد ۸، ص ۵۲، سورہ مومن کی آیت ۲۴ کے ذیل میں۔

پرفریب زوبند کے نیچے سے اُس کا بُرا اور مخوس چہرہ ظاہر ہو گیا۔ اور چہرے دیکھا کہ اُس منافق انسان کا کیا انجام ہوا۔
۳۔ دولت کے بارے میں اسلام کا موقف: ہم نے جو کچھ طور بالا میں بیان کیا ہے اُس سے یہ نتیجہ اخذ نہ کیا جائے کہ مال دولت کے معاملے میں اسلام کا رویہ منہی ہے اور وہ ثروت مندی کا مخالف ہے۔ یہ میں تسلیم نہیں کرتا چاہیے کہ اسلام غربت و افلاس کو پسند کرتا ہے اور لوگوں کو مسکنت اور بے فزائی کی طرف دعوت دیتا ہے اور اُس حالت کو روحانی کمالات کے حصول کا وسیلہ سمجھتا ہے۔

بلکہ۔۔۔ اس کے بالعکس اسلام مال دولت کو ایک مؤثر اور کار ساز وسیلہ سمجھتا ہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ کی آیت ۱۸۰ میں مال کو خیر کہا گیا ہے۔ نیز۔۔۔ امام باقرؑ سے ایک حدیث منقول ہے:

فعو العون الدنيا على طلب الاخيرة

آخرت تک پہنچنے کے لیے دنیا اچھا وسیلہ ہے۔

بلکہ۔۔۔ زیر بحث آیات جن میں مغرور اور صاحب ثروت قارون کی شدید ترین مذمت کی گئی ہے، اُن سے بھی یہ حقیقت مترشح ہے کہ اسلام اُس دولت کو پسند کرتا ہے جس کے وسیلے سے "دار آخرت" کی جستجو اور اگلے جہان کی نعمت کو طلب کیا جائے۔

جیسا کہ بنی اسرائیل کے اہل دانش نے قارون سے کہا: "وانتفع فيما اتاك الله الدار الاخيرة"۔ اسلام اُس دولت کو پسند کرتا ہے جس میں "احسن كما احسن الله اليك" کے تقاضے کے مطابق تمام بنی نوع انسان کے ساتھ بھلائی اور احسان ہو۔

اسلام اس دولت کا مزاج ہے جس کا مالک "لا تنس نصيبك من الدنيا" کی تعلیم پر عامل ہو یعنی دولت مند ہونے کے باوجود یہ خیال رکھتا ہو کہ دولت دنیا میں میرا محدود حصہ ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلام اُس دولت کا خواہاں ہے جو "زمین پر باعث فساد، انسانی اقدار کو فراموش کر دینے والی، ارتکاز و تکیا اثر کی جنون آمیز مسابقت میں گرفتار کر دینے والی، انسان میں جذبہ برتری ذات پیدا کرنے والی، دوسروں کو بظلم ظفر حقیر دیکھنے والی اور یہاں تک کہ پیغمبروں کے مد مقابل آنے والی نہ ہو۔ ان اخلاقی رذیلہ کی بجائے وہ دولت ایسی ہو جس سے مجملہ بنی نوع کو فائدہ پہنچے، بین الناس اقتصادی نشیب و فراز کے خلا کو پر کر دے، بے چارے غم رسیدہ لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھے اور مستضعفین کے احتیاجات اور مشکلات کا حل بن جائے۔ اگر کوئی شخص ایسی دولت کا مالک ہے جس کے صرف ایسے مقدس مقاصد ہیں تو اُس شخص کو دنیا دار اور دولت پرست نہیں کہہ سکتے۔ ایسے شخص کا تعلق نعمات آخرت سے ہے چنانچہ ہم ایک حدیث میں پڑھتے ہیں کہ: امام جنر صادق کے اصحاب میں سے ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ:

"ہم دنیا کے پیچھے گئے ہوئے ہیں اور اُس سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہم اس سے ڈرتے

ہیں کہ کہیں ہم دنیا پرست نہ ہو جائیں؟

۱۔ وسائل المشیر، جلد ۱۲، ص ۱۵۱ (۱) باب مقدمات تجارت سے باب ۱۶، حدیث ۵

امام (جو کہ اس شخص کی نیک اور تقویٰ کو جانتے تھے) نے اُس سے سوال کیا۔
تو دُنیا کی دولت کو کس کام میں خرچ کرنا چاہتا ہے ؟
اُس شخص نے جواباً عرض کیا :

میں اُس سے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی معاش فراہم کرتا ہوں۔ اپنے اعزہ کی مدد کرتا ہوں، راہِ خدا میں انفاق کرتا ہوں اور حج و عمرہ بخاتا ہوں۔
یہ سُن کر امام نے جواب دیا :

”لیس هذا طلب الدنيا هذا طلب الآخرة“

یہ دُنیا طلبی نہیں ہے، طلبِ آخرت ہے۔

اس استشہاد کی بنا پر دو قسم کے لوگوں کے عقائد کا بطلان ثابت ہوتا ہے:

اول: مسلمان نما تعلیماتِ اسلامی سے بے خبر لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام سرمایہ داری کا حامی ہے۔

دوسرے: وہ اہل غرض و دشمنانِ اسلام جو تعلیماتِ اسلام کو مسخ کر کے اُسے معاندِ ثروت اور حامیِ افلاس و تنی وستی قرار دیتے ہیں۔ سُر اُن پر یہ حقیقت منکشف ہوئی چاہیے کہ:

ایک منگس و نادار قوم کبھی آزاد اور باعزت زندگی بسر نہیں کر سکتی۔

قومی افلاس کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ پسماندہ قوم کسی قومی قوم کے زیر اثر آکر اس سے وابستہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ منگسی دُنیا و آخرت دونوں جگہ رُوسیا ہی کا باعث ہے۔

منگسی انسان کو گناہ اور مکروہات کی طرف دعوت دیتی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا ایک قول اس معنی کا مصلق ہے:

”عنی یحجزک عن الظلم خیر من فقر یحملك علی الاثم“

وہ دولت مندی جو تجھے دوسروں کے سلبِ حقوق سے باز رکھے اُس فقر سے بہتر ہے

جو تجھے گناہ پر آمادہ کرے۔

اس لیے تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی تمام کوشش اس امر پر صرف کریں کہ وہ مالی حیثیت سے غنی اور بے نیاز ہو جائیں، خود کفیل ہوں اور اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں۔ وہ اپنے شرف، عزت اور استقلال کو، بوجہ فقر و افلاس دوسری قومن کی وابستگی پر قربان نہ کریں اور یہ جان لیں کہ اسلام کے نزدیک صراطِ مستقیم یہی ہے۔

۸۳۔ تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا
فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ

۸۴۔ مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِنْهَا وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ
فَلَا يُجْزَى الَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ إِلَّا مَا
كَانُوا يَعْمَلُونَ

ترجمہ

۸۳۔ ہم نے دارِ آخرت کو صرف اُن لوگوں کے لیے بنایا ہے جو دُنیا میں اپنی بڑائی اور (حصولِ اقتدار) کی خواہش نہیں رکھتے اور نہ فساد کا ارادہ کرتے ہیں۔ اور انجامِ نیک تو پرہیزگار لوگوں کے لیے ہی ہے۔

۸۴۔ جو شخص نیک کام کرتا ہے اس کے لیے اس کا بہتر صلہ موجود ہے اور جو لوگ کُبرے کام کرتے ہیں، اُن کا بدلہ بھی اُن کے اعمال کے مطابق ہی دیا جائے گا۔

تفسیر

فساد فی الارض اور ہوسِ اقتدار کا نتیجہ:

گذشتہ آیات میں ایک گنہگار و متکبرِ ثروت مند (یعنی قارون) کے عبرت انگیز واقعہ کے ذکر کے بعد اب زیر بحث آیات میں سے پہلی آیت میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، درحقیقت وہ اُس ماجرے کا ایک کلی نتیجہ ہے۔ چنانچہ ربُّ العزت فرماتا ہے:
ہم سوائے آخرت صرف اُن لوگوں کے لیے مخصوص کرتے ہیں جو دُنیا میں ہوسِ اقتدار نہیں رکھتے اور نہ فساد کرتے ہیں۔
(تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا)۔

صرف یہی نہیں کہ وہ ہلانے کے خواہشمند اور مند نہیں ہیں بلکہ ان چیزوں کا ارادہ بھی نہیں کرتے۔ اُن کا دل ان آلَموں سے پاک اور ان کی رُوح اس قسم کی آلودگیوں سے منزہ ہے۔

انسان کے لیے جو چیزیں نعماتِ آخرت سے محرومی کا سبب بنتی ہیں وہ درحقیقت ہی وہ ہیں :
اول : بڑا جسے کی طلب ۔

دوم : "فدا فی الارض"۔ تمام گناہ ان ہی دو چیزوں میں جمع ہیں کیونکہ خدا نے جن معکرات سے نبی کی ہے وہ انسان کیلئے تحصیلِ شرف و کمالِ اخلاق میں مانع اور اس کی مثال کے تخلیق کے خلاف ہیں ۔

حقیقہ کہ جو اس اعتبار سے خود ان چیزوں میں سے ہے جنہیں "فساد فی الارض" کہتے ہیں۔ اسی لیے اس کی فریضی ہوتی ہے اور اس کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے ۔

ہم نے "قارون" کے تفصیلی حالات اور اس کی سر نوشت میں دیکھا ہے کہ جو بات اس کی بڑھتی ، ہلاکت اور نیستی کا باعث بنی وہ اس کا کھنجر اور برتری کی ہوس تھی ۔

اسلامی روایات میں اس مسئلے پر خصوصیت سے زور دیا گیا ہے یہاں تک کہ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام سے ایک حدیث مستقول ہے :

ان لرجل ليعجبه ان ييكون شراك لعله اجود من شراك نعل صاحبه فيدخل تحتها .

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کو اس بات سے خوشی حاصل ہوتی ہے کہ اس کی جوئی کے بند اس کے دوست کے بند سے بہتر ہوں۔ تو وہ شخص محض اس جذبہ برتری سے اس آیت کے منہموم میں داخل ہو جاتا ہے ۔

قابلِ توجہ یہ امر ہے کہ مفسر تفسیر کشف اس حدیث کا ذکر کرنے کے بعد ایک اضافہ کا اضافہ کرتا ہے :-

بعض اہلِ طبع آیت زیر بحث میں جذبہ برتری اور برتری کو بہ مستفاد آیت (نصف ۱۰) ان فرعون علف الارض "محض فرعون ہی سے منسوب کرتے ہیں۔ اور بہ مستفاد آیت (نصف ۱۰)

"ولا تتبع الفساد في الارض" فساد کو قارون سے مخصوص کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو آدمی فرعون اور قارون کی مانند نہ ہو، بہشت اور دائمی گھر اس کی ملکیت ہے۔ اس طرح وہ لوگ صرف تنہا فرعون و قارون اور ان جیسے افراد کو بہشت سے خارج کرتے ہیں۔ اور

باقی نعماتِ آخرت کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں۔ ان حضرات نے اس آیت کے اخیر میں :-

"والعاقبة للمتقين" پر اس طرح پر غور نہیں کیا جس طرح اس پر امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب نے غور فرمایا تھا ۔

اس مقام پر "مفسر تفسیر کشف" کے قول پر ہم اتنا اضافہ اور کرتے ہیں کہ ان اہلِ طبع حضرات نے فرعون اور قارون کی حقیقت

۱ تفسیر "جوان الماس" زیر بحث آیت کے ذیل میں ۔

۲ تفسیر فرطی : زیر بحث آیت کے ذیل میں ۔

کو بھی نہیں پہچانا۔ کیونکہ فرعون نے اپنے آپ کو برتر و عالی سمجھا اور وہ خدا ہی تھا :

انك كان من المفسدين (نصف ۲)

قارون نے بھی اس کی مانند زمین میں فساد کیا اور جذبہ برتری بھی رکھتا تھا۔ بہ مستفاد آیت :-

فخرج على قومه في زينته (نصف ۴)

ایک روایت میں جناب امیر المؤمنین علی علیہ السلام کے متعلق مذکور ہے کہ خلافتِ ظاہری کے زمانے میں آپ ذاتِ خود بازاروں میں تشریف لاتے تھے۔ جو لوگ راستہ بٹول گئے ہوتے ان کی رہنمائی کرتے تھے، ضعیف لوگوں کی مدد کرتے تھے۔ آپ سوداگروں اور کاسبین کے قریب سے گرتے تھے اور انہیں یہ سنانے جانتے تھے :-

تلك الدار الاخرة نجعلها للذين لا يريدون علوا في الارض ولا فادا
اس کے بعد آپ یہ فرماتے تھے :

نزلت هذه الآية في اهل العدل والتواضع من الولاة واهل القدرة من الناس

یہ آیت عادل و متواضع سربراہانِ مملکت اور حکام نیز قوم کے صاحبانِ قدرت و اختیار افراد کے متعلق نازل ہوئی ہے ۔

کاسبین اور سوداگروں کو اس تمیز سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ جس طرح میں نے حکومت کر اپنے لیے سبب برتری نہیں سمجھا، تمہیں بھی چاہیے کہ اپنی فراوانی دولت کو دوسروں پر تحکم کا سبب نہ بناؤ۔ کیونکہ انجام نیک صرف ان لوگوں کے لیے ہے جن میں احساں برتری نہیں اور نہ وہ زمین پر فساد کرتے ہیں۔

جیسا کہ قرآن میں اس آیت کے آخر میں مذکور ہے "والعاقبة للمتقين" عاقبت پریرہ گاروں کے لیے ہے ۔
"عاقبت" ایک وسیع المفہوم لفظ ہے۔ جس میں اس جہان کی بیرونی اور نیک انجام اور دارِ آخرت میں بہشت اور اس کی نعمتیں، سب کچھ شامل ہے ۔

چنانچہ ہم نے دیکھا کہ قارون اور فرعون کا کیا انجام ہوا۔ باوجودیکہ وہ بے مثال طاقت رکھتے تھے۔ مگر، کیونکہ ان میں تقویٰ نہ تھا۔ لہذا وہ دردناک عذاب میں مبتلا ہوئے ۔

اب ہم اس آیت کے متعلق اپنے بیان کو امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث نقل کر کے ختم کرتے ہیں اور وہ ہے کہ جس وقت امام نے اس آیت کی تلاوت فرمائی تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور فرمایا :

ذهبت والله الاماني عند هذه الآية

اس آیت نے دُنیا میں میری تمام آرزوؤں کو ختم کر دیا ہے اور بیرونی آخرت بھی مشکل ہے ۔

۱ اس روایت کو "زافان" نے امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کے متعلق نقل کیا ہے۔ تفسیر مجمع السببان ،

زیر بحث آیت کے ذیل میں ۔

۲ تفسیر علی بن ابیہم زیر بحث آیت کے ذیل میں ۔

اس سختیت کے بیان کے بعد کہ سوائے آخرت اور اس کی نعمات دوسروں پر تسلط جمانے والوں اور سچپن کے لیے نہیں ہیں بلکہ متواضع اور حق طلب پرہیزگاروں کے لیے ہیں نیز نظر آیات میں سے دوسری آیت میں ایک قانون کلی کا ذکر کیا گیا ہے جس میں پاداش اعمال اور کثیر کردار کے متعلق خدا کے عدل اور تفضل کا ذکر ہے۔ یعنی جو آدمی نیک کام کرے گا اس کا بہتر بدلہ پائے گا: (من جاء بالحسنة فله عشر مثالا)۔

جزائے خیر کا موقع خدا کا تمام تفضل ہے۔ ذات الہی دنیا کے تنگ چشم لوگوں کی طرح نہیں ہے کہ جب وہ کسی کے عمل کا صلہ دینے لگتے ہیں تو ان کے نزدیک عدالت کا یہی مفہوم ہے کہ وہ صلہ ٹھیک اُس کام کے مطابق ہو۔ مگر ذات الہی کا تمام اس سے ارف ہے۔ وہ کبھی بظاہر عمل اپنے لطف، بیکراں سے دس گنا، کبھی سو گنا اور کبھی ہزار گنا جملہ دیتا ہے۔ کم از کم دس گنا تو ضرور ہی دیتا ہے۔ جیسا کہ ہم سورہ انفصام کی آیت ۱۶۰ میں پڑھتے ہیں:

”من جاء بالحسنة فله عشر امثالها“

مگر اُس صلہ کی حد آخر کو خدا خود ہی جانتا ہے۔ جس کا ذکر سورہ بقرہ کی آیت ۲۶۱ میں راہِ خدا میں انفاق کے صلہ میں مذکور آیا ہے۔

البتہ۔ اس اجر و صلہ کو کئی گنا کر دینا بے حساب نہیں ہے۔ اس کا انحصار پاکی عمل، اخلاص، حسن نیت اور صفائے قلب کے معیار پر ہے۔

نیکو کاروں کے متعلق خدا کے اس فضل و لطف کا ذکر بدکاروں کے اعمال کی سزا کے بعد آیا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے: جو لوگ گناہ کرتے ہیں انہیں ان کے اعمال کے مطابق ہی سزا دی جائے گی: (ومن جاء بالتيسئة ولا يجزي الذين عملوا السيات الا ما كانوا يعملون)۔

یہ اُس پروردگار کا مقام عدل ہے کہ گنہگار اپنے عمل سے ایک ذرہ بھی زیادہ سزا نہیں پائیں گے۔ اس مقام پر یہ جملہ جاذب توجہ ہے کہ:

ان کے اعمال ہی خود ان کا صلہ ہیں۔

یعنی ان کے اعمال کے آثار، (عالم ہستی میں بتائے موجودات کے قانون کے مطابق) ان کے نفوس اور عالم خارجی میں باقی رہ جاتے ہیں اور بروز قیامت، جس روز ہر راز پنہاں آشکار ہو جائے گا، یہ اعمال سیتہ مجسم ہو کر گنہگاروں کے ساتھ ہونگے اور ان کے لیے آزار و اذیت کا موجب ہوں گے۔

اس مقام پر تین سوال پیدا ہوتے ہیں، جن کا جواب دینا ضروری ہے:

۱۔ اس آیت میں کلمہ ”سیتة“ کی دو مرتبہ تکرار کیوں ہوئی ہے؟

ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ اس امر کا بیان حتیٰ مقصود ہو کہ ”سیتات“ میں ہر گنہگار کو صرف اسی عمل بد کی سزائے دی جائے گی جو اس نے انجام دیا ہے۔ بالفاظِ دیگر: خود کردہ را علاجے نیست

۲۔ کیا آیت فوق میں کلمہ ”حسنہ“ میں ایمان اور توحید بھی شامل ہیں؟

اگر یہ درست ہے تو پھر اس جملہ کے کیا معنی ہیں؟ جو کہا گیا ہے:

”ہم اُس سے بہتر کو، اُس کی جزا قرار دیں گے:

کیا اس سے بہتر بھی کوئی شے ہوگی جو اُس کی جزا ہو جائے گی؟

ہم اس سوال کے جواب میں کہتے ہیں کہ بدون تردید کلمہ ”حسنہ“ کے معنی بہت وسیع ہیں۔ اس میں انسان کے معتقدات، گفتار و کردار سب کچھ شامل ہے۔ لیکن ”پروردگار کی رضا و خوشنودی“ توحید کے صرف اعتقاد سے بہتر ہے اور یہی نیکو کاروں کی جزا ہے۔ جیسا کہ ہم سورہ توبہ کی آیت ۷۲ میں پڑھتے ہیں:

ورضوان من اللہ اکبر

خدا کی خوشنودی ہر جزا سے بہتر ہے۔

۳۔ آیت فوق میں کلمہ ”حسنہ“ مفرد کیوں استعمال ہوا ہے اور کلمہ ”سیتات“ جمع کیوں استعمال ہوا ہے؟

اس سلسلے میں بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ بہ لحاظ شمار گنہگاروں کی تعداد زیادہ ہے اور

نیکو کاروں کی کم ہے۔

اس مقام پر یہ امکان بھی ہے کہ جملہ حسنات ”حقیقت توحید“ میں مجتمع ہو جاتی ہیں۔ نیز یہ کہ اگر حسنات کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی بنیاد عقیدہ توحید ہی ہے جبکہ سیتات کی بنیاد شرک ہے اور شرک میں بخلات ”توحید“ پر گندگی اور کثرت پائی جاتی ہے۔

- ۸۵۔ اِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ اِلَيْهِ مَعَادٍ قُلْ تَرْبِّيَ اَعْلَمُ
مَنْ جَاءَ بِالْهُدٰى وَمَنْ هُوَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝
- ۸۶۔ وَمَا كُنْتَ تَرْجُو اَنْ يُلْقٰى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ الْاَرْحَمَةُ مِنْ رَبِّكَ فَلَا
تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكَافِرِيْنَ ۝
- ۸۷۔ وَلَا يَصُدُّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنزِلَتْ اِلَيْكَ وَاَدْعُ اِلَى رَبِّكَ
وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝
- ۸۸۔ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ الْاٰخَرَ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وِجْهَةً
لِّهٖ الْحُكُوْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

ترجمہ

- ۸۵۔ وہ ذات جس نے تجھ پر قرآن فرض کیا ہے وہی تجھے تیرے انجام تک پہنچا دے گا۔ کہہ دے کہ میرا رب اُسے
بھی خوب جانتا ہے جو ہدایت لے کر آیا اور اُسے بھی جو کھلی گمراہی میں ہے۔
- ۸۶۔ اور تجھے یہ توقع نہ تھی کہ یہ کتاب تجھ پر نازل کی جائے گی۔ مگر یہ شخص تیرے رب کی رحمت سے تجھ پر نازل ہوئی
پس ہرگز کافروں کا مددگار نہ ہونا۔
- ۸۷۔ اور بعد از نزول وہ تجھے آیاتِ خدا کی تبلیغ سے روک نہ دیں۔ انھیں خدا کی طرف دعوت دے اور مشرکوں میں سے
نہ ہو۔
- ۸۸۔ اور خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو مت پکارو کیونکہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اُس کی ذات کے سوا ہر
شے فانی ہے۔ حکم اسی کا ہے اور سب کچھ اسی کی طرف لوٹ جائے گا۔

شانِ نزول:

کچھ مفسرین نے زیر نظر آیات میں سے پہلی آیت کی شانِ نزول ابن عباس سے نقل کی ہے جس کا مضمون یہ ہے:-
جس وقت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہجرت فرما کر مدینہ کی طرف جا رہے تھے، تو جب آپ مقامِ جحفر پر پہنچے کہ جس کا فاصلہ
مکہ سے کچھ زیادہ نہیں ہے تو آپ کو اپنا وطن یاد آیا یعنی شہرِ مکہ، کہ جو خدا کا حرم ہے۔ اور وہاں خانہ کعبہ بھی ہے جس سے
آنحضرتؐ کا ناقابلِ انقطاع قلبی اور روحانی تعلق تھا۔

اس یادِ وطن سے احساسِ غم آپ کے چہرے پر نمایاں ہوا۔ اُس مقام پر جبرئیل نازل ہوئے اور پوچھا: کیا واقعاً آپ
کو اپنے شہر اور جائے پیدائش کا بہت اشتیاق ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: "ہاں ضرور ہے۔ تب جبرئیل نے عرض کیا کہ خدا
نے آپ کو یہ پیغام بھیجا ہے:

اِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ اِلَيْهِ مَعَادٍ
جس ذات نے اس قرآن کو تجھ پر فرض کیا ہے وہ تجھے تیرے وطن میں بھی پہنچا
دے گا۔

ہم جانتے ہیں کہ آخر کار یہ عظیم وعدہ پورا ہوا۔ پیغمبرِ اسلام ایک طاقتور فوج اور بڑی عظمت کے ساتھ مکہ کو فاتحانہ لوٹے اور
حرمِ خدا جنگ اور خون ریزی کے بغیر آپ کے قبضے میں آگیا۔
تاریخ کے اس عظیم انقلاب کے پیش نظر زیر نظر آیت قرآن کی اعجاز آمیز پیش گوئیوں میں سے ہے کہ اُس کے ذریعے
آنحضرتؐ کو حتیٰ طور پر کسی شرط کے بغیر ایسی خبر دی گئی۔ جو قلیل مدت کے بعد درست ثابت ہوئی۔

تفسیر

حرمِ امنِ خدا کی طرف بازگشت کا وعدہ:

یہ سورۃ قصص کی آخری آیات ہیں۔ ان میں پیغمبرِ اسلام کو مخاطب کیا گیا ہے۔ سوئی بن عمران کی زندگی کے بعض گوشوں
اور فرعون اور اُس کے رفقاء سے جنگ کے حالات بیان کرنے کے بعد ان میں پیغمبرِ اسلام کو بشارت دی گئی ہے نیز انھیں نہایت
مستحکم دستور العمل دیے گئے ہیں۔
جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا۔ ان آیات میں سے پہلی آیت (جیسا کہ مشہور ہے) مقامِ جحفر پر اُس وقت نازل
ہوئی، جب آنحضرتؐ مدینہ کی طرف سفر کر رہے تھے۔

ط تفسیر ابن ابی عمیر، تفسیر کبیر، تفسیر فریاضی، تفسیر مستطی، تفسیر مجمع البیان اور دیگر تفسیر۔

ان کا ارادہ تھا کہ شریب جائیں اور اس بستی کو "مدینۃ الرسول" بنا دیں۔ اس مقام پر اسلامی حکومت کی بنیاد کی پہلی اینٹ رکھیں تاکہ پیام اسلام میں جو انقلابی صلاحیتیں ہیں، انہیں عمل میں لائیں اور اس مقام کو وسیع حکومت الہی اور اس کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے مرکز قرار دیں۔

اس عظیم منصوبے کے باوجود آپ کو مکہ سے جو دل بستگی تھی وہ رنج و غم کا باعث بنی رہتی تھی اور آپ کو اس حرم امن الہی سے دوری سخت ناگوار تھی۔

ان حالات میں آپ کے قلب مُطہر پر فروری کی تابش ہوتی ہے اور آپ کو وطن مآلوف کی طرف بازگشت کی بشارت دی جاتی ہے "بائیں الفاظ" کہ: وہی ذات جس نے تم پر قرآن کو فرض کیا، وہ تمہیں تمہارے وطن و مملکت کو واپس کر دے گی: (ان الذی فرض علیک القرآن لردک الیٰہ معاد)۔

تم رنجیدہ خاطر نہ ہو — وہی خدا جس نے عالم طفولیت میں مومنی کو اُس کی ماں کے پاس لوٹا دیا، وہی خدا جس نے مصر سے دس سال کی جلا وطنی کے بعد اُسے، اُس کے وطن کو واپس کر دیا تاکہ وہ چراغ توحید روشن کرے اور مستضعفین کی حکومت قائم کرے۔ اور مکرین خدا فرعون کی طاقت کو برباد کر دے۔ وہی تم کو بھی پوری طاقت اور قوت کے ساتھ مکہ کو لوٹا دے گا۔ اور تمہارے ہاتھ سے اُس مقدس سرزمین میں چراغ توحید روشن کرائے گا۔

وہی خدا جس نے تم پر قرآن نازل کیا، اس کی تبلیغ فرض کی اور تم پر اُس کے احکام کو واجب کیا۔ اُس زمین و آسمان کے مالک قادر مطلق خدا کے لیے یہ امور آسان ہیں۔

اس کے بعد اس مطلب کا اضافہ ہے کہ: ان سرسبز اور منجھڑ خائفین سے کہہ دو کہ میرا خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اُس کی طرف سے کون ہدایت لایا ہے اور کون شخص کھلی گمراہی میں ہے: (قل ربی اعلم من جبار الہدیٰ ومن ہو فی ضلال مبین)۔ مقصد یہ ہے کہ راہ ہدایت روشن ہے اور مشرکین کی گمراہی آشکار ہے۔ یہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں بے ثمر ہے۔ خدا اُن کے افعال سے خوب آگاہ ہے اور حق طلب قلوب بھی حقیقت کو خوب جانتے ہیں۔

اس آیت کی واضح تفسیر یہی ہے جو ہم نے سطور بالا میں بیان کی ہے لیکن بہت سے مفسرین نے کلمہ "معاد" کے متعلق دوسرے احتمالات کی طرف بھی رجوع کیا ہے۔ اُن کے خیالات یہ ہیں کہ:-

"معاد" سے مراد حیات بعد از موت ہے، یا سرزمینِ محشر، یا خود موت، یا مقام شفاعتِ کبریٰ، یا بہشت یا بیت المقدس (جہاں سے آنحضرتؐ معراج پر گئے تھے) نیز اسی طرح کے بہت سے خیالات ظاہر کیے گئے ہیں۔ لیکن آیت کے کلیۃً مطالعہ اور سرگردشت مومنی و بنی اسرائیل پر غور کرنے کے بعد، اور مذکورہ شان نزول کے علم کے بعد یہ تمام معانی حقیقت سے بعید نظر آتے ہیں۔ اس لیے کلمہ "معاد" کی تفسیر (یعنی مقام بازگشت) سرزمینِ مکہ ہی درست ہے۔

علاوہ بریں، یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اگر کلمہ "معاد" کے معنی روز قیامت لیے جائیں تو وہ روز صرف ہیرہ ہی سے تو مخصوص نہیں ہے جب کہ آیت کا روئے سخن صرف جناب پیغمبرؐ کی طرف ہے۔ نیز یہ کہ ماقبل آیت (۸۴) میں بروز قیامت اعمال کی جزا و سزا کا بیان ہے اور یہ اُس کے بعد ہے اس لیے یہی کلمہ معاد کا وہ مضمون نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کے برعکس

مطلب کا قوی امکان ہے۔ کیونکہ آیت ماقبل (۸۴) میں سرسازے آخرت میں جزائے اعمال کا ذکر ہے۔ تو سیاق معانی کا تقاضا یہ ہے کہ اس آیت میں اس دنیا کی کامرائیوں کا ذکر ہو۔

آیت مابعد (۸۶) میں پیغمبر اکرمؐ کو خدا کی طرف سے ایک عظیم ترین نعمت کے عطا ہونے کا ذکر ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے:

"تمہیں ہرگز امید نہ تھی کہ یہ عظیم آسمانی کتاب تمہیں القا کی جائے گی لیکن یہ تمہارے رب کی رحمت کا تقاضا تھا؛ (وما کنتم ترجوا ان یلقیٰ الیک الكتاب الا رحمة من ربک)۔

اُس وقت بہت سے لوگوں نے سنے دین کی آمد کی خوش خبری سن رکھی تھی۔ نیز، شاید اہل کتاب میں سے کچھ لوگ اس عنایت الہی کے منتظر تھے کہ وہی اُن پر نازل ہوگی اور خدا انہیں یہ فہم داری سپرد کر دے گا لیکن اُسے پیغمبر تمہیں اس کا گمان بھی نہ تھا۔ مگر خدا نے تمہیں اس کام کے لیے سب سے زیادہ اہل سمجھا کر یہ دین تمہارے ذریعے سے دنیا میں پھیلے بعض بزرگ مشرکین نے اس آیت کو اُن آیات سے مربوط سمجھا ہے جن میں پیغمبر اسلامؐ سے داستانِ مومنی کے بارے میں خطاب کیا گیا ہے۔ وہ آیات یہ ہیں:

وما کنتم بجانب الغربیٰ اذ قضینا الیٰ موسیٰ الامر (تقصیٰ ۲۲)

وما کنتم تاویلاً فی اہل مدین (تقصیٰ ۲۵)

وما کنتم بجانب الظہور اذ نادینا ولکن رحمة من ربک (تقصیٰ ۲۶)

اے رسول تم ہرگز وادعی طور میں موجود نہ تھے، جہاں ہم نے مومنی پر وہی نازل کی تھی.....

تم نے اہل مدین میں زندگی نہیں گزاری.....

اور جب ہم نے طور پر مومنی کو وہی کی تھی تم اُس وقت بھی موجود نہ تھے۔ مگر یہ تمہارے

رب کی رحمت ہے کہ اُس نے تمہیں ان حالات کی خبر دی۔

اس تفسیر کے مطابق "کتاب" سے مراد سرگردشتِ انبیائے ماسبق ہے۔

مگر اس تفسیر اور تفسیر ماسبق میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ بلکہ اسے اُس تفسیر کا ایک حصہ ہی سمجھنا چاہیے۔

اس کے بعد ان الفاظ کا اضافہ ہے کہ:

اب اس عظیم نعمت کا شکر یہ ہے کہ کافروں کی ہرگز مدد نہ کرنا: (فلا تکونن ظہیرا للکافرین)۔

یہ حکم اُس مطلب سے ہم آہنگ ہے جسے ہم آیات ماسبق میں حضرت مومنی کے متعلق پڑھ آئے ہیں کہ مومنی نے کہا:

بعض مشرکین نے اس مقام پر کلمہ "الآ" کو استثنیٰ کے معنی میں سمجھا ہے۔ اس بنا پر وہ مصطفیٰ مند کے حلف اور مقدم ہونے کے قائل

ہوتے ہیں۔ دوسرے گروہ نے کہا ہے کہ "الآ" اس مقام پر "لکن" کے معنی میں ہے اور ان معنی میں استناد کا پہلو نکلتا ہے اور

یہ سہ سیاق کے قریب ترین۔

”پروردگارا! ان نعمت کی وجہ سے جو تو نے مجھے دی ہیں۔

میں ہرگز بجز مین کا مددگار نہ بنوں گا۔

ظالموں کی مدد کرنے کے بارے میں، ہم نے سورہ قصص کی آیت ۷۷ کے تحت مفصل بحث کی ہے۔

اس سورہ کے آخر میں مختلف استدلالات اور تفسیرات کے ساتھ توحید کو واضح کیا گیا ہے۔ وہ توحید جو جملہ دینی مسائل کی اصل بنیاد ہے، وہ توحید جو اصل بھی ہے اور فرع بھی، جو کل بھی ہے اور جز بھی۔

ان دو آیات میں پیغمبر اکرمؐ کو چار احکامات دینے گئے ہیں اور خدا کی چار صفات بیان کی گئی ہیں۔ نیز اس سورہ میں جتنے بھی موضوعات پر بحث ہوئی ہے، یہ آیات ان سب کا مکمل ہیں:

سب سے پہلے یہ کہا گیا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ کفار تجھ پر نازل شدہ آیات سے تجھے باز رکھیں:

(ولا یصدنک عن آیات اللہ بعد اذ افزلت الیک)۔

اس آیت میں اگرچہ حرف نہی کا مروج کفار ہیں۔ لیکن اس کا مفہوم یہ ہے کہ پیغمبرؐ ان کی سازشوں اور غلط اندازوں سے متنبہ رہیں۔ جیسے کہ ہم کسی سے کہتے ہیں کہ: کوئی آدمی تمہیں بہکانے نہ پائے۔ اور مراد یہ ہوتی ہے کہ ان کے دھوکے میں نہ آجانا۔ اس کے بعد جناب پیغمبرؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ جب کہ تم پر آیات الہی نازل ہو گئی ہیں تو ان احکامات پر بااستقلال قائم رہو اور کسی قسم کے تردد اور شک کو دل میں نہ آئے۔ دو۔ امر اللہ کی تبلیغ میں جو رکاوٹیں بھی پیش آئیں انہیں راستے سے ہٹا دو اور حکم قدموں کے ساتھ مقصد کی طرف بڑھو کیونکہ خدا تمہارے ساتھ ہے اور تمہارا مددگار ہے۔

مفسر معروف ابن عباس کے قول کے مطابق، اس آیت کی مخاطب تو ذات پیغمبرؐ ہے لیکن مراد ہیں عام لوگ جیسے کہ ایک عربی ضرب الثقل ہے۔ ”ایاک اعنف واسمعی یا جارہ“ میری مراد تو ہے مگر اے ہمسائی تو بھی سن لے۔ ایہ حکم جو لفظی کا پہلو رکھتا ہے، اس کے بعد اثباتی انداز سے حکم دیا ہے کہ اپنے پروردگار کی طرف دعوت دے (وادع الی ربک)۔ وہ خدا جو تیرا مالک ہے، تو جس کے اختیار میں ہے، وہی تیرا مربی اور تیری پرورش کرنے والا بھی ہے۔ اس حکم کے بعد کہ پیغمبرؐ لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیں، ہر قسم کے شکر اور بے بسی کی ممانعت کی گئی ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ قطعاً مشرکین میں سے نہ ہونا: (ولا تکونن من المشرکین)۔

یعنی راہ توحید قطعی آشکارا اور نورانی ہے اور اس پر چلنے والے ہی راہ مستقیم پر ہیں۔

بالآخر جو حکم ہر قسم کے مشرک کی نفی پر ایک تاکید مکرر ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ خدا کے ساتھ کسی بھی دوسرے معبود کو مت پکار: (ولاتدع مع اللہ الہاً اخر)۔

الفرض یہ ہے درپے احکام جن میں سے ہر ایک دوسرے حکم کا ٹوکہ ہے، اسلامی پروگرام میں عقیدہ توحید کی اہمیت کو روشن کرتے ہیں کیونکہ جب تک عقیدہ توحید پوری طرح دلنشین نہ ہو، تمام عقائد و اعمال برباد ہیں۔

قرآن میں ان چار احکامات کے ذکر کے بعد خدا کی چار صفات کا ذکر ہے کہ وہ لوازم عقیدہ توحید میں سے ہیں:

۱۔ ازل: یہ کہا گیا کہ ”اس کے سوا کوئی معبود نہیں: (لا الہ الا هو)۔

۲۔ اُس ذات پاک کے علاوہ ہر چیز فانی اور نابود ہونے والی ہے: (کل شیء ہالک الا وجہہ)۔

۳۔ دنیا کے تکوین و تشریح میں حکم اور مالکیت اسی کی ذات سے مخصوص ہے: (لہ الحکم)۔

۴۔ آخر الامر ہم سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے: (والیہ ترجعون)۔

اس امر کا امکان عقلی موجود ہے کہ آخری تین صفات اثبات توحید اور ہر قسم کی اُس بُت پرستی کو ترک کرنے کی دلیل ہو جس کا ذکر صفت اول میں کیا گیا ہے۔

کیونکہ ہم سب فانی ہیں اور بقا صرف اسی کی ذات کے لیے ہے۔

کیونکہ نظام ہستی کی تدبیر اور کائنات کی مالکیت صرف اسی کے لیے ہے۔

کیونکہ قیامت میں ہم سب کی بازگشت اسی کی طرف ہوگی۔ اُس کے مقابلے میں سمیودان مجازی کی بجلا

کیا حقیقت ہے اور سوائے اُس کے اور کونسی چیز قابل پرستش ہے؟

”کل شیء ہالک الا وجہہ“ کی تفسیر میں بڑے بڑے مفسرین نے گونا گوں خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ان آرائے مختلف کا محور دو کلمات ”وجہ اور ہالک“ ہیں۔ کیونکہ لغوی اعتبار سے کلمہ ”وجہ“ انسان کے جسم کے اُس حصے کے لیے بولا جاتا ہے جسے چہرہ کہتے ہیں یعنی انسانی صورت۔ لیکن جس وقت یہ کلمہ خدا کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اُس سے مراد اُس کی ذات ہوتی ہے۔

کلمہ ”ہالک“ کا مادہ ”ہلاک“ ہے۔ جس کے معنی موت اور نابودی کے ہیں۔ ان معانی کے پیش نظر اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ذات الہی کے سوا موجودات میں سے ہر شے فنا ہو جائے گی۔ یہ ”فنا“ کائنات کے انتقام پر منحصر نہیں ہے بلکہ حالت موجودہ میں اُس کے مقابلے میں ہر شے فانی اور معدوم ہے۔ کیونکہ جملہ ممکنات اپنے وجود کے لیے اسی کی محتاج ہیں۔ اور لحظہ بہ لحظہ اسی سے فیض و وجود حاصل کرتی رہتی ہیں۔ اُن کا قیام بذات خود نہیں ہے، بلکہ یہ ارادہ الہی ہے۔

ع اگر نازی کند یکدم فردر زمد قابہا

اگر مشیت از دی مائل بہ فنائے ممکنات ہو تو وہ ایک لمحے میں فنا ہو جائیں۔

علاوہ بریں — کائنات میں تمام موجودات ہر وقت متغیر ہو رہی ہیں اور اُن کی کیفیت بدلتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ ایسی نظریے کے مطابق (یعنی حرکت جوہری) ہر شے کی ماہیت تغیر اور حرکت ہی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تغیر اور حرکت سے مراد ہے ہر شے ہر لمحہ فنا اور وجود تازہ کے مرحلے سے گزرتی رہتی ہے۔ یعنی موجودات جہاں ہر لمحہ مرتے اور زندہ ہوتے بستے ہیں۔

بنابراین جملہ موجودات اپنی کیفیت حالیہ میں بھی ”ہالک“ اور فانی ہیں۔ صرف ذات الہی وہ ہے جس میں تغیر و فنا کا دخل نہیں اور اس کی ذات مقدس استقلال محض ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ جب اس دنیا کا وقت آخر آئے گا تو ہر موجود ممکن پر فنا اور نیستی کا تسلط ہوگا۔ جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

كلّ من عليها فان ويحق وجه ربك ذوالجلال والاکرام
زمین پر رہنے والا ہر وجود فنا ہو جائے گا صرف خدا کی ذات ذوالجلال ہی باقی رہ
جائے گی۔

صرف اہل زمین ہی نہیں بلکہ اہل آسمان بھی فنا ہو جائیں گے۔

ونفخ فی الصور فصعق من فی السموات ومن فی الارض
اور جس وقت صور پھونکا جائے گا تو وہ سب کہ جو آسمان میں اور جو زمین میں ہیں
مر جائیں گے۔

(زمر - ۶۸)

یہ تفسیر اس آیت اور دیگر آیات کے ظاہری معنی سے ہم آہنگ ہے لیکن بعض مترجمین نے اس آیت کی اور تفسیر بھی
لکھی ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں :-

کسی نے کہا ہے کہ "وجه" سے مراد عمل صالح ہے اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ :

انسان کے تمام اعمال "اُس عمل کے سوا جو لوجہ اللہ کیا گیا ہو" ضائع ہو جائیں گے۔

بعض دیگر حضرات نے کہا ہے کہ "وجه" سے مراد اشیا کا اللہ سے منسوب پہلو ہے۔ اس بنا پر آیت کا مفہوم یہ ہوگا
کہ تمام اشیا بذاتہ تو معدوم ہیں، سوائے پروردگار کی طرف ان کے انتساب کا پہلو۔

بعض کی رائے یہ ہے کہ "وجه" بر معنی دین ہے۔ اس اعتبار سے آیت کا مفہوم یہ ہے کہ بروز قیامت جملہ شریعتیں
باطل اور فنا ہو جائیں گی بجز اللہ کے دین کے اور آیت میں کلمہ "لہ الحکمو" کے معنی حاکمیت تشریحی سمجھے ہیں اور اسے
اس مفہوم کے لیے کلمہ تاکید شمار کیا ہے۔ اسی طرح جملہ "والیہ ترجعون" سے اخذ شریعت میں خدا کی طرف رجحان کرنا مراد
لیا ہے اور سمجھا ہے کہ یہ جملہ ان معنی پر ایک مکرر تاکید ہے۔

ہم نے اس آیت کی تفسیر میں، سطور مافوق میں جو کچھ کہا تھا، یہ تفسیر جن کا ہم نے بعد میں ذکر کیا اس کے منافی نہیں
کیونکہ جب ہمیں یہ علم ہو گیا کہ اس عالم میں جو چیز باقی رہ جائے گی وہ صرف ذات الہی ہوگی۔ تو اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے
جو شے کسی طرح بھی اُس کی ذات سے متعلق ہے وہ بھی کیفیت بقا و ابدیت اختیار کرے گی۔

رہبران الہی الہی بذات خدا مربوط ہیں اس لیے وہ بھی جاودانی ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ کوئی شے بھی جو ذات الہی سے
تعلق اور ربط رکھتی ہے وہ فنا اور ہلاکت سے محفوظ رہے گی۔ (یہ مقام غور و فکر ہے)

۱۔ تفسیر فراتحلیں میں اس آیت کے ذیل میں متعدد روایات کا ذکر ہے۔ ان میں سے بعض میں "وجه" سے مراد وہی خدا ہے اور
بعض میں مراد رہبران الہی اور بعض میں وہ چیزیں جو خدا سے منسوب ہیں۔

چند نکات

۱۔ تمام اشیا کس طرح فنا ہوں گی ؟ آیات فوق کے ذیل میں جو سوالات پیدا ہوتے ہیں ان میں سے
ایک یہ ہے کہ اگر دنیا کے آخر میں سب چیزیں فنا ہو جائیں گی تو اس مٹی کو بھی فنا ہو جانا چاہیے جو انسان کے جسم کی بنی ہے
جب کہ قرآن میں بطور مکرر یہ صراحت موجود ہے کہ ہم جسم کی ان ہڈیوں کو جمع کر کے ان سے دوبارہ انسان پیدا کریں گے۔ یا
— بروز قیامت انسان اپنی قبروں سے نکلیں گے۔

نیز جیسا کہ آیات قرآنی کے ظاہری معنی سے مترشح ہوتا ہے، بہشت اور دوزخ بھی پیدا کیے جا چکے ہیں جیسا کہ کلمات
"أعدت للمتقین" یا ان ہی جیسے اور کلمات سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ "بہشت پر ہمیں کاروں کے لیے ہے" چنانچہ قرآن میں
دو مقامات پر یعنی سورۃ آل عمران کی آیت ۱۳۳ اور سورۃ صدقہ کی آیت ۲۱ میں یہ بیان ہے۔ اور دو مقامات پر دوزخ کا ذکر
"أعدت للکافرین" کے الفاظ میں کیا گیا ہے۔ وہ ہیں سورہ بقرہ آیت ۲۴ اور سورۃ آل عمران آیت ۱۳۱۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر بہشت و دوزخ مخلوقات میں سے ہیں تو کیا وہ بھی بروز قیامت فنا اور نابود ہو جائیں گی؟ قطعاً نظر
ان امور کے ہمارا عقیدہ یہ بھی ہے کہ انسانوں کے لیے ایک حیات برزخی بھی ہے جیسا کہ "أرواح" کے ذکر کے وقت ہم نے
اُسے آیات قرآنی سے ثابت کیا ہے، تو کیا وہ ساکنان برزخ بھی فنا ہو جائیں گے؟
ذیل کی توضیحات سے ان تمام سوالات کے جوابات واضح ہو جائیں گے :

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کلمات "ہلاک" نابودی اور فنا "سے کسی نظم و ترتیب کا زیر و زبر ہو جانا مراد ہوتا ہے نہ کہ اُس شے
کے مواد اصلی کا فنا ہو جانا۔ مثلاً۔ اگر ایک عمارت زلزلہ کی وجہ سے سارے ہو جائے تو اُس کیفیت پر ہم کلمات "فنا و ہلاک"
کا اطلاق کرتے ہیں۔ حالانکہ اُس عمارت کا اصلی مواد موجود ہوتا ہے۔ اُس مواد کی صرف نظم و ترتیب درہم برہم ہو گئی ہوتی ہے۔
نیز یہ کہ دنیا کے آخر وقت میں۔ غر شید بے نور، چاند تاریک اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ اور زمین پر ہر زندہ موجود
کو موت آجائے گی۔ ایک پہلو سے ان اشیا کے لیے ہلاکت کا مفہوم یہ ہے :
دوسرے پہلو سے ہلاکت اور فنا کا اطلاق دنیا اور اُس کے مافیما پر ہے۔

لیکن بہشت اور دوزخ (خواہ ہم اُنہیں اسی دنیا میں سمجھیں، خواہ اس دنیا سے باہر) اس دنیا کا جز نہیں ہیں کہ انہیں
فنا اور نابودی کے حکم میں شامل کیا جاسکے۔ ان چیزوں کا تعلق آخرت اور دوسری دنیا سے ہے نہ کہ اس دنیا سے۔

تیسری بات یہ ہے کہ جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں کہا کہ موجودات امکانی کے لیے ہلاکت اور فنا کا انحصار صرف دنیا
کے خاتمے پر ہی نہیں ہے بلکہ یہ موجودات بحالت موجودہ بھی فانی ہیں۔ کیونکہ اول تو ان کا وجود قائم بالذات نہیں ہے بلکہ اپنے
وجود کے لیے دوسرے کی محتاج ہیں۔ دوسرے یہ کہ جملہ کائنات ہمہ وقت حالت تغیر اور حرکت میں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ حرکت کے
معنی میں فنا سے تدریجی جس کے مطابق ہر وقت وجود عدم کی دونوں کیفیات موجود رہتی ہیں ان توضیحات سے محالاً بالا سوالات کا جواب
واضح ہو جاتا ہے۔

۱۶ "وَلَا تَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ" کی غلط تفسیر: وہابی لوگ جن کا اس عقیدے پر اصرار ہے کہ "توئل اور شفاعت" کا سلسلہ حقیقت توحید سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ کبھی تو وہ آیت مافرق سے اور کبھی اسی کے مشابہ دوسری آیات سے استدلال کرتے ہیں۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ:

قرآن میں صریحاً غیر خدا کی عبادت و پرستش، یا کسی غیر کا نام خدا کے نام کے ساتھ لینے سے نہی کی گئی ہے: فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا۔ (سورہ جن - ۱۸)

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی آیات کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ ہم کسی کو ہرگز نہ پکاریں۔ ایسی آیات کا مفہوم وہی ہے جو حکم "مع اللہ" سے سمجھا جاتا ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص خدا کے اختیار اور اس کی صفت خلاقیت میں کسی اور کو دخل سمجھے اور مستقل طور پر یہ سمجھے کہ کوئی دوسری ذات بھی خدا کے کاموں کو انجام دے سکتی ہے، تو وہ مشرک ہے۔

لیکن اگر ہم تمام اختیارات کو خدا سے مخصوص سمجھیں اور کسی کو بھی اس کی قدرت میں شریک یا مؤثر خیال نہ کریں۔ مگر یہ عقیدہ رکھیں کہ اولیاء اللہ اس کے اذن اور فرمان سے شفاعت کرتے ہیں اور اس نیت سے ہم ان سے متوسل ہوں کہ وہ خدا کے حضور میں ہماری شفاعت کریں گے تو یہ عین توحید ہے اور یہ وہی چیز ہے جس کی طرف قرآن میں مکرر اشارہ ہوا ہے۔

آیا۔ جب بلواریان یوسف نے اپنے باپ سے کہا تھا کہ "یا ابا اناس استغفر لنا"

اے باپ تو ہمارے لیے خدا سے مغفرت طلب کر (سورہ یوسف، ۹) تو کیا یہ شرک تھا؟ یا۔ جس مقام پر قرآن شریف میں یہ ذکر آتا ہے:

وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لِيهِمُ الرَّسُولُ

لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَحِيمًا

جس وقت اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں، اگر وہ تیرے پاس آتے ہیں اور خدا سے مغفرت

طلب کرتے ہیں۔ اور رسول بھی ان کے لیے مغفرت طلب کرے تو وہ خدا کو تواب اور رحیم

پائیں گے۔ (سورہ نساء، ۶۴)

تو کیا یہ کفر کی طرف دعوت ہے؟

شفاعت اور توسل کی حقیقت اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے بل

پہرہ درگارا!۔ تو ہمارے دلوں کو توحید اور معرفت کے نور سے منور کرتا کہ ہم تیرے سوا کسی کو نہ دیکھیں۔ تیرے سوا کسی کی جستجو نہ کریں اور تیرے سوا کسی کی آرزو نہ کریں۔

خداوند!۔ تو اپنی ذات پاک سے ہمارے ارتباط کو روز بروز محکم کرتا جا۔ تاکہ اس طریقے سے ہماری رُوح پر تیری ذات کی بقائے جاودانی کا پرتو پڑے۔

بار الہا۔ تو ہمارے دلوں سے دنیا کی محبت، بڑائی کی خواہش اور فساد فی الارض کو دور رکھ اور تو ہمیں ان پر سبز گاروں کی صف میں جگہ دے جن کے لیے "عاقبت نیک" ہے (والعاقبة للمتقين)۔

سُورَةُ قَصَصٍ کی تفسیر ختم ہوئی۔

اکیس رمضان المبارک ۱۴۰۳ھ بہ مطابق ۱۲ تیر ماہ ۱۳۶۲ھ ہجری شمسی

سُورَةُ عَنكَبُوتِ كِے مضامین

محققین کی ایک جماعت میں مشورہ ہے کہ یہ کل سُورَتِ مَکہ میں نازل ہوئی۔ اس نوح سے اُس کے مضامین کئی سُورَتوں کے مضامین سے ہم آہنگ ہیں۔ اس سُورَت میں مبداء و معاد کا ذکر ہے، گزشتہ اولوالعزم انبیاء کے قیام اور مُشرکوں اور بُت پرستوں، بنابرہول اور سنگدول سے اُن کی جنگ اور پھرتی کا بیان ہے اور پھر تہجرتِ ظالمِ گروہ کی تباہی اور بربادی کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ علاوہ بریں اس سُورہ میں یہ مضمون بھی ہے کہ انبیاء نے کس طرح مخرقین کو حق کی طرف دعوت دی اور انہیں اس راہ میں کیسی کیسی آزمائشوں سے سابقہ پرا۔ نیز یہ کہ کفار کس طرح مختلف بہانوں سے قبولِ حق سے اعراض کرتے رہے۔ مفسرین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ اس سورہ کی ابتدائی گیارہ آیات باقی سُورہ سے مستثنیٰ ہیں۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ یہ گیارہ آیات مدینہ میں نازل ہوئی تھیں۔

ان مفسرین کے اس عقیدے کا محرک شاید وہ بعض شانہائی نزول ہیں، جن کا ہم بعد میں ذکر کریں گے اور جہاد کی وہ بحسب جو ان آیات میں وارد ہوئی ہے۔ اسی طرح وہ اشارات بھی ہیں جو ان آیات میں منافقین کے متعلق موجود ہیں۔ یہ تمام مضامین مکی سُورَتوں سے مناسبت رکھتے ہیں۔

تاہم، ہم بعد میں اس مطلب پر غور کریں گے کہ مفسرین کی یہ توجیحات اس سُورہ کے سکتی ہونے کے منافی نہیں ہیں۔ اس سُورہ کے نام "سُورَةُ عَنكَبُوتِ" کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس سورہ کی آیت نمبر اکتالیس میں بُت پرستوں کے غیر خدا پر اعتماد کو "عنکبوت (کرمی) سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ اس کا بھروسہ بھی نازک تاروں پر ہوتا ہے اور یہ بھروسہ بے بنیاد ہے۔ بطور کلی کہا جاسکتا ہے کہ اس سورہ کے مضامین چار حصوں میں منقسم ہیں:

اَوَّل : اس سُورہ کی ابتدا میں منافقین کی کیفیت اور اُن کے مبتلائے امتحان ہونے کا ذکر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں اُور کا ناقابلِ انتظام تعلق ہے۔ کیونکہ منافقین کی شناخت اُس وقت تک ہو ہی نہیں سکتی جب تک وہ امتحان و آزمائش میں مُبتلا نہ ہوں۔

دوم : آیت کے مضامین کے دوسرے حصے میں پیغمبر اور مومنین کی دلجوئی کے لیے پیغمبر اور مومنین کی (مثلاً: حضرت نوحؑ، ابراہیمؑ، لوطؑ اور شعیبؑ) کی زندگی کے کچھ حالات بیان کیے گئے ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ انہوں نے اپنے اپنے عہد کے فرود اور فرود پرست

سُورَةُ عَنكَبُوتِ

• یہ سُورہ مکہ میں نازل ہوئی

• اس میں ۶۹ آیات ہیں

اہل دولت کا کس طرح مقابلہ کیا۔ اُن کی جنگ کے آلات کیا تھے، کینیت جنگ کیا تھی اور پھر اس مبارزہ کا نتیجہ کیا ہوا؟
اس بیان کا مقصود یہ ہے کہ ایک طرف تو رسول اللہؐ اور مومنین کا دل قوی ہو اور دوسری طرف رسول اسلام کے زمانے کے سنگدل اور ظالم بت پرستوں کو متنبہ ہو۔

سوم : اس سورہ کے مضامین کا تیسرا حصہ جو خصوصیت سے آخر میں ہے، اُس میں توحید باری تعالیٰ، عالم آفرینش میں اُس کی آیات اور شرک سے مبارزہ کا بیان ہے۔ اس سلسلے میں انسان کی فطرت سلیم اور اُس کے وجدان کو مخاطب کیا گیا ہے۔
چہارم : اس سورہ کے ایک اور حصے میں متنوع قسم کے مضامین ہیں مثلاً: غیر حقیقی مجنوںوں اور اُن کے عنکبوت صفت بچاروں کی ناتوانی کا ذکر ہے۔ اسی طرح اس حصے میں قرآن کی عظمت، پیغمبر اسلام کی حقانیت اور مخالفین کی سرکشی کا بیان ہے۔
علاوہ بریں اس حصے میں مسائل تربیتی کا بھی ایک سلسلہ ہے۔ مثلاً: نماز، والدین کے ساتھ نیک سلوک، اعمال صالح اور مخالفین اسلام سے گفتگو اور بحث کا طریقہ تعلیم کیا گیا ہے۔

اس سورہ کی فضیلت

تفسیر مجمع البیان میں جناب رسالتؐ کا یہ قول درج ہے۔

من قرء سورة العنكبوت كان له من الاجر عشر حسنات بعدد كل المؤمنین والمنافقین۔
جو آدمی سورہ عنکبوت پڑھتا ہے اُس کے حصے میں تمام مومنین اور منافقین کی تعداد سے دس گنا حسنات لکھے جاتے ہیں۔

بالمخصوص ماہ رمضان کی تیسری تاریخ کی شب میں سورہ عنکبوت اور سورہ روم کی تلاوت کے متعلق غیر معمولی فضیلت وارد ہوئی ہے یہاں تک کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے :

من قرء سورة العنكبوت والروم فشهرا رمضان ليلة ثلاث وعشرين فهو والله من اهل الجنة لا استثنى فيه ابداً، ولا اخاف ان يكتب الله على في يميني اثماً، وان لهاتين السورتين من الله مكاناً جو آدمی ماہ رمضان کی تیسری تاریخ کی شب میں سورہ عنکبوت اور سورہ روم کی تلاوت کرے قسم بخدا وہ اہل بہشت میں سے ہے۔ میں اس معاملے میں کسی کو مستثنیٰ نہیں کرتا۔ اور اس بات سے بھی نہیں ڈرتا کہ اس قسم کے ایسے میرے نام اعمال میں کوئی گناہ لکھ دے۔ بطور مسلم ان دونوں سورتوں کا خدا کے حضور میں پڑا مرتبہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ان دونوں سورتوں کے نہایت منفعت بخش مضامین، اُن کے توحید آموز اہم اسباق اور انسان کی عملی زندگی کے لیے باعث خیر و سعادت پر دوگرام اس امر کے لیے کافی ہیں کہ جو آدمی بھی صاحب فکر و عمل ہوگا، وہ اسے بہشت کا مستحق کر دیں۔

بلکہ اگر ہم صرف عنکبوت کے مضامین سے نور ایمان اور خلوص عمل کا سبق حاصل کریں تو ہم حضرت امام جعفر صادقؑ کی قسم میں شامل ہو جائیں گے۔

ایک آیت میں انسانوں کے عام امتحان کا ذکر ہے اور یوں لکھا ہے کہ :

بغير استئني تمام لوگ امتحان کی کٹھالی میں تپائے جائیں گے تاکہ جو لوگ گناہ گار ہیں وہ سیاہ رو ہو جائیں۔

بجلا یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان اس عظیم آزمائش پر یقین کامل رکھتا ہو اور خود کو اُس امتحان کے لیے تیار نہ کرے اور وہ مستحق امداد پر ہیز گار نہ بن جائے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱۔ اَلَمْ

۲۔ اَحْبَبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْا اَنْ يَقُوْلُوْا اَمَّا وَهْمًا لَا

يُفْتَنُوْنَ

۳۔ وَ لَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ

صَدَقُوْا وَلِیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ

ترجمہ

اللہ کے نام سے شروع ہو رہمان و رحیم ہے

۱۔ اَلَمْ

۲۔ کیا تو نے یہ خیال کرتے ہیں کہ صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں وہ چھوڑ دینے جائیں گے اور ان کی

آزمائش نہیں کی جائے گی۔

۳۔ جو لوگ ان سے پہلے تھے ہم نے ان کی بھی آزمائش کی تھی (اور ان کی بھی آزمائش کریں گے) ضروری ہے کہ خدا کا علم ان کے بارے میں بھی سچ ثابت ہو کہ جو سچے ہیں اور ان کے بارے میں بھی کہ جو کاذب ہیں۔

شان نزول :

بعض مفسرین نے ایک روایت نقل کی ہے جس کے مطابق اس سورہ کی ابتدائی گیارہ آیات مدینہ میں نازل ہوئیں، ان مسلمانوں کے متعلق جو مکہ میں تھے، اظہار اسلام کرتے تھے مگر مدینہ کو ہجرت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

انہیں اپنے ان بھائیوں کی طرف سے جو مدینہ میں تھے، ایک خط ملا جس میں تحریر تھا کہ :

”تم جو ایمان کا اقرار کرتے ہو وہ خدا کو قبول نہیں ہے مگر یہ کہ ہجرت کرو اور ہمارے پاس آ جاؤ۔“

یہ خط پاکر انہوں نے ہجرت کا ارادہ کر لیا اور مکہ سے نکلے۔ مشرکین کے ایک گروہ نے ان کا تعاقب کیا اور ان سے جنگ کی۔ مہاجرین میں سے بعض تو مارے گئے اور بعض بچ رہے (اور احتمال یہ بھی ہے کہ بعض نے مشرکین کی اطاعت کرنی اور مکہ کو واپس چلے گئے۔ بعض دیگر مفسرین نے دوسری آیت کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ عمار یا سر اور دوسرے ابتدائی مسلمانوں کے متعلق ہے جو ایمان لے آئے تھے اور دشمنان اسلام کے مظالم برداشت کر رہے تھے۔

بعض کا خیال ہے کہ اس سورہ کی آٹھویں آیت سعد ابن ابی وقاص کے اسلام لانے کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔

لیکن ان آیات کو وقت نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کا سبب ہجرت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان میں تو صرف ان مظالم کا ذکر ہے جو اُس زمانے میں دشمنان اسلام روا رکھتے تھے یہاں تک کہ وہ مظالم بھی کہ جو مشرک والدین کی طرف سے اپنی اولاد پر بھی روا رکھے جاتے تھے۔

یہ آیات دشمنان اسلام کی رستم کاریوں اور مظالم کے مقابلے میں مسلمانوں کو استقامت اور پامردی کی تعلیم دیتی ہیں اور اگر وہ ایمان میں کسی مقام پر جہاد کا ذکر آ گیا ہے تو اس کا منہم بھی اس امتحان میں ثبات قدم ہے نہ کہ مسلمانوں کا شیعہ جہاد، جس کا حکم شیخہ میں نازل ہوا تھا۔

اسی طرح اگر کہیں منافقین کا ذکر ہے تو ممکن ہے کہ اُس کا اشارہ ان کمزور ایمان لوگوں کی طرف ہو جو مکہ میں مسلمانوں کے درمیان رہتے تھے۔ وہ کبھی مسلمانوں سے مل جاتے تھے اور کبھی مشرکین سے۔ غرض جس کسی کا پلہ بھاری دیکھتے اُسے کے ساتھ ہو جاتے تھے۔ بہر حال، ان آیات کی ترتیب و تنظیم اس امر کی شاہد ہے کہ ہم ان سب کو بھیجیں اور روایات بالا جن میں باہم توافق نہیں ہے وہ اس تنظیم کو ختم نہیں کر سکتیں۔

تفسیر

آزمائش ایک دائمی سنت الہی ہے :

اس سورہ کی ابتدا بھی (الح- لام-میم) حروف متعلقات سے ہوتی ہے۔ ہم نے بار بار مختلف زاویہ ہائے نظر سے ان حروف کی تفسیر بیان کی ہے :

اس سورہ میں حروف متعلقات کے بعد انسانی زندگی کے پیش آمدہ مسائل میں سے ایک اہم مسئلے کی طرف اشارہ ہے اور وہ ہے اللہ کی طرف سے بندے کا امتحان اور اُس کی آزمائش۔

سب سے پہلے یہ کہا گیا ہے کہ کیا لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر وہ صرف یہ کہنے پر اکتفا کریں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور

ان حروف کی تفسیر سورہ بقرہ، اعراف، سورہ آل عمران، سورہ ابراہیم اور سورہ احزاب کے آیتوں میں ملاحظہ کیجئے۔

توحید و رسالت پیغمبر کی شہادت دیں تو وہ اپنے حال پر پھوڑ ویسے بائیں گے اور ان کا آسمان نہ ہوگا: (أصعب الناس ان یترکوا ان یقولوا أمنا وھو لا یفتنون)۔

اُس کے بعد بلافاصلہ اس حقیقت کا ذکر ہے کہ اہل ایمان کا امتحان اللہ کی ایک دائمی اور باوقار سنت ہے۔ یہ امتحان ہونے پر امت مسلمہ ہی کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ وہ سنت الہی ہے جو گزشتہ امتوں کے لیے بھی جاری رہی ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ: ہم نے گزشتہ امتوں کی بھی آزمائش کی ہے: (ولقد فتنا الذین من قبلھم)۔ ہم نے گزشتہ امتوں کو بھی امتحان کی بھیجی میں ڈالا ہے۔ وہ بھی تمہاری طرح بے رحم، جاہل، متعصب، بے خبر اور جنگ پسند دشمنوں کے زلزلے میں گرفتار تھیں۔ ان فرض امتوں کے لیے ہمیشہ میدان امتحان تیار رہا ہے اور انھیں اس میدان سے گزرنا پڑتا ہے۔

ایسا ہونا بھی چاہیے کیونکہ: ہر آدمی ہر ترین مومن، بالاترین مجاہد اور فدا کار ترین انسان ہونے کا ادعا کر سکتا ہے۔ اس لیے اس ادعا کی حقیقت اور اُس کا وزن امتحان سے ثابت ہونا چاہیے۔ امتحان ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدعی کے دعوے اور اُس کی ذہنی آمادگی اور باطنی خلوص میں جرم آہنگی ہے یا نہیں؟

امتحان کی اس لیے بھی ضرورت ہے تاکہ ان کے متعلق خدا کا یہ علم کہ ان میں سے کون سچا ہے اور کون جھوٹا، درست ثابت ہو: (فلیعلمن اللہ الذین صدقوا ویلعلمن الکاذبین)۔

یہ امر بدیہی ہے کہ خدا سب کے دلوں کا حال جانتا ہے۔ یہاں تک کہ بنی نوع انسان کی خلقت سے پہلے بھی سب کچھ اُس کے علم میں تھا۔ اس مقام پر "علم الہی" سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ اُس کے علم میں ہے وہ وجود خارجی میں بطور عین الیقین اُس کا ثبوت مل جائے۔ یعنی اس گروہ کے متعلق خدا کا جو علم ہے، لوگ اُسے خارج میں بھی دیکھ لیں اور جس شخص کے دل میں جو کچھ ہے وہ نمایاں اور آشکار ہو جائے۔

خدا کے متعلق جہاں بھی کلمہ "علم" استعمال ہوا ہے اُس کا یہی مفہوم ہے۔

یہ حقیقت قطعی واضح ہے کہ انسان کی نیت اور اُس کا ارادہ جب تک عمل سے ظاہر نہ ہو تو اس کے لیے ثواب، جزا یا بدلے کا تعین نہیں ہو سکتا۔

آزمائش کا ہونا اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ انسان کی نیت اور اُس کی نفسانی کیفیت کا حال معلوم ہو جائے۔

اس مفہوم کو ایک اور پہلو سے بھی سمجھنا چاہیے کہ:۔ اس عالم کی مثال ایک یونیورسٹی یا ایک کھیت کی ہے (اسلامی احادیث میں یہ تقسیمات وارد ہوئی ہیں) جب ایک طالب علم یونیورسٹی میں تحصیل علم کے لیے آتا ہے تو دستوراً تعلیم یہ ہونا چاہیے کہ اُس کی فطری استعداد کی کلی کھل جائے۔ جس قسم کی لیاقت بھی اُس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے، اس کی پرورش ہو اور اُس کی فنی صلاحیتیں قوت سے نکل میں آجائیں۔

ط "یفتنون" کا مادہ "فتنہ" ہے جس کے معنی ہیں، سونے کرگم میں تپانا، اُس کی اسلیت معلوم کرنے کے لیے اس کے بعد جاننا اس لہر کے ہر طرح کی ظاہری اور باطنی آزمائش کے لیے ہونے لگے۔ مزید لکھیں گے جلد ۱، صفحہ ۲۶۹ (اردو ترجمہ) دیکھیں۔

نیز یہ کہ یہ عالم ایک کھیت ہے۔ اس کھیت میں جو بیج بویا جائے تو اُس کی سرشت اور طینت کا اظہار ہونا چاہیے۔ اُس کے اندر سے اکھوا پھوٹنا چاہیے، اُسے خاک سے سر اُجھانا چاہیے۔ جب اُس کی پرورش ہو تو وہ چھوٹا سا پودا بن جائے پھر نشوونما پا کر ایک تنومند اور بار آور درخت بن جائے۔ افراد اور اقوام دونوں کو اپنی نشوونما کے لیے ان امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے۔

اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ خدا کی طرف سے جو آزمائشیں آتی ہیں وہ محض افراد کی استعدادات کی شناخت کے لیے نہیں ہیں۔ بلکہ انسان کی فنی صلاحیتوں کی پرورش کے لیے ہیں۔

یہ امر بھی محل لحاظ ہے کہ اگر ہم کسی شے یا کسی انسان کو آزماتے ہیں تو وہ کسی فنی یا جمول صفت کو معلوم کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ مگر خدا کی آزمائش کشف جمول کے لیے نہیں ہوتی۔ کیونکہ اُس کا علم تو ہر شے پر محیط ہے بلکہ خدا اس لیے آزماتا ہے تاکہ وہ انسانوں کی استعداد کی پرورش کرے اور جو صلاحیتیں اُس میں فنی ہیں وہ قوت سے نکل میں آجائیں۔

آزمائشیں مختلف رنگ میں:

اگرچہ مجملہ اقوام اور جماعتوں کے لیے امتحان کا عمومی ذکر، مگر کے اُن مومنین کے لیے جو اُس زمانے میں اقلیت میں تھے نہایت مؤثر تھا۔ اس حقیقت پر نظر کر کے اُن میں اپنے سخت ترین دشمن کے مقابلے میں صبر و استقامت کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ مگر یہ آزمائشیں صرف مومنین کے لیے مخصوص تھیں بلکہ جہاں کہیں بھی مومنین کی جماعت ہے وہ اس سنت الہی کی مصداق ہے۔ خدا ان کا مختلف صورتوں سے امتحان لیتا ہے۔ مثلاً:۔

۱۔ مومنین کی کوئی جماعت ایسے معاشرے میں محصور ہو جاتی ہے جو ہر جہت سے آلودہ مفاسد ہے۔ اُس معاشرے میں

مومنین کو ہر جانب سے بُرائیوں کی دعوت گھیرے رہتی ہے۔ اُس وقت ان کا امتحان یہ ہے کہ وہ ایسے معاشرے کی بد اخلاقیوں کا اثر قبول نہ کریں اور اپنی نیکی اور تقویٰ کو محفوظ رکھیں۔

۲۔ کبھی مومنین کی کوئی جماعت افلاس اور محرومی میں مبتلا ہوتی ہے۔ جب کہ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اگر وہ اپنی قدر مخصوص کو جو ان کا حقیقی سرمایہ ہے فروخت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں تو بہت جلد اُن کی محرومیت اور افلاس دفع ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ تو گہری

اضحیٰ اسی صورت میں حاصل ہوگی جب وہ اپنا ایمان، تقویٰ، آزادی، عزت اور شرف کو ہاتھ سے دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔

۳۔ اس کے برعکس مومنین کے امتحان کا ایک اور بھی رخ ہے کہ:۔

مومنین کی کوئی جماعت دولت و ثروت میں مستغرق ہو جاتی ہے اور جملہ مادی وسائل اُس کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ اندر میں

حال اُن کا امتحان یہ ہے کہ:۔

کیا وہ خدا کی نعمات کا شکر ادا کرتے ہیں یا وہ دولت پا کر غفلت، غرور، خود غرضی، خود بینی اور لذات و شہوات میں

خاک آزمائش اور اُس کے مختلف جواب کی توضیح جملہ آیت ۱۵۷، سورہ بقرہ کے ذیل میں بیان ہوئی ہے۔

مبتلا ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو برتر سمجھ کر اپنے برادران ایمانی سے منقطع ہو جاتے ہیں۔

۴۔ ہمارے زمانے میں قوموں کو ایک اور شدید امتحان درپیش ہے اور وہ ہے "مشرق یا مغرب زدگی"۔ وہ مشرق یا مغرب کی بعض اقوام کو دیکھتے ہیں کہ وہ خدا اور فضائل اخلاق سے برگشتہ ہو کر دنیا میں خیرہ کن مادی تمدن سے بہرہ مند ہیں اور ان کا رفاہی اجتماعی نظام سلطنت بہت اچھا ہے۔

ان اقوام تمدن کی حالت کو دیکھ کر پسماندہ اقوام کو ایک قوی مگر عجیب سا جذبہ اسی قسم کی زندگی اختیار کرنے کی طرف کھینچتا ہے۔ وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ وہ تمام اصول اخلاق جن کے وہ مستعد رہے ہیں، انہیں پاؤں کے نیچے روند کر اور ان تمدن اقوام میں سے کسی ایک کے ساتھ وابستگی کی ذلت برداشت کر کے، اپنے اور سارے معاشرے کے لیے اسی قسم کے اسباب حیات دنیا کر لیں۔ درحقیقت اس عہد میں یہ بہت بڑا امتحان ہے۔

۵۔ اس زمانے کے مصائب، وروردرج، جنگیں اور نزاع، گرانی اور آتے دن قیمتوں میں اضافہ، اور وہ استعمال کرنے والی حکومتیں جو مرکز و قوموں کو غلام بناتی ہیں اور انہیں اپنے طاغوتی نظام کی اطاعت پر مجبور کرتی ہیں۔

علاوہ بریں انسانوں کی نفسانی خواہشات کی تند و تیز موجیں، ان میں سے ہر ایک بندگان خدا کے لیے سخت امتحان ہے۔

ان ہی حالات میں ایک شخص کے ایمان، تقویٰ، پاکیزگی، امانت اور آزادی کا امتیاز ہوتا ہے۔

لیکن ایسی سخت آزمائشوں میں کامیاب ہونے کے لیے صرف ایک ہی وسیلہ ہے کہ انسان میں استقامت ایمانی ہو اور خدا کے لطف خاص پر ہر دوسرے رکھے۔

اصول کافی میں: **الحب الناس ان یتروکوا ان یقولوا مثلاً وہم لایفتنون کی تفسیر میں بعض مصومین سے یہ حدیث منقول ہے:**

یفتنون کما یفتن الذهب، ثم قال یخلصون کما یخلص الذهب

انہیں آزمایا جاتا ہے جس طرح کہ سونے کو بوٹی میں تپایا جاتا ہے۔ وہ لوگ ہر قسم کی آلودگی سے صاف ہوتے ہیں جس طرح کہ آگ سونے کو ہر قسم کے میل سے صاف کر دیتی ہے۔

بہر حال وہ عافیت طلب لوگ جو یہ گمان کرتے ہیں کہ صرف زبان سے اظہار ایمان کرنے سے وہ مومنین میں شمار ہونے لگیں گے اور اعلیٰ علیین بہشت میں وہ پیمبروں، صدیقین اور شہداء کے ہم نشین ہو جائیں گے، سخت غلطی پر ہیں۔

امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب کا یہ قول نبی البلاغہ میں موجود ہے:

والذی ینص بالحق لتبلیتن بلبلة، ولتغریبن غریبلة، ولتسطن سوط القدر،
حق یعود اسفلکم اعلاکم واعلاکم اسفلکم

قسم ہے اس ذات کی جس نے پیغمبر کو حق پر مبعوث کیا کہ تم شدت سے آزمائے جاؤ گے اور چھلانے جاؤ گے اور جس طرح کہ بٹری میں پانی ابلتے وقت اوپر نیچے ہوتا ہے تم بھی منتخب

ہو گے۔ اس طرح سے کہ تمہارے بلند لوگ پست اور پست لوگ بلند ہو جائیں گے۔

یہ بات امیر المومنین نے اس وقت کہی جب نئے لوگوں نے آپ سے بیعت کی تھی اور وہ اس بات کے منتظر تھے کہ آپ بیت المال کے اموال کی تقسیم اور عہدوں کے عطا کرنے میں ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کیا علیؑ کا طرز عمل بھی اسی گزشتہ معیار پر ہوگا جس میں امتیاز اور تخصیص تھی یا آپ کا معیار عدل محمدیؐ ہوگا۔

۴- أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ أَنْ يَسْبِقُونَا ۗ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ

۵- مَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ اللَّهِ فَإِنَّ أَجَلَ اللَّهِ لَآتٍ ۗ وَهُوَ

السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝

۶- وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ

۷- وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ

وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَحْسَنَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

ترجمہ

۴- کیا وہ لوگ جو اعمال بد کرتے ہیں، یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ وہ ہمارے قابو سے نکل جائیں گے؟ وہ جو خیال کرتے ہیں کتنا بڑا ہے۔

۵- جو کوئی خدا سے ملاقات (اور قیامت) کی امید رکھتا ہے (تو اُسے چاہیے کہ اُس کے فرمان کی اطاعت میں فروگزاشت نہ کرے۔ یقیناً اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت ضرور آئے والا ہے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

۶- جو شخص جہاد اور کوشش کرتا ہے وہ اپنے ہی نفس کے لیے جہاد کرتا ہے اور خدا جملہ اہل عالم سے بے نیاز ہے۔

۷- اور جو لوگ کہ ایمان لائے اور انھوں نے عمل صالح انجام دیئے ہم اُن کے گناہوں کو چھاپیں گے (اور بخش دیں گے) اور انھیں اُن کے اعمال کا بہت اچھا بدلہ دیں گے۔

تفسیر

قدرتِ خدا کی حدود سے فرار ممکن نہیں:

گزشتہ آیات میں مومنین کے عام امتحان کا ذکر تھا۔ زیر نظر پہلی آیت میں کفار اور گناہ گاروں کو شدید تہدید کی گئی ہے تاکر وہ یہ گمان نہ کریں کہ اگر انھوں نے مومنین پر ظلم و تعدی کی اور خدا کا عذاب اُن پر فوراً نازل نہیں ہوا، تو خدا اُن سے غافل ہے یا اُس میں اُن پر عذاب نازل کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے: وہ لوگ جو گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں کیا اُن کا یہ گمان ہے کہ وہ ہم پر سبقت لے جائیں گے اور ہماری سزا کی گرفت سے بچ سکیں گے؟ اُن کا یہ خیال کتنا بڑا ہے۔ (اُم حسب الذین یعملون السیئات ان یسبقونا ساء ما یحکمون)۔

خدا کی طرف سے دی ہوئی نعمت اُن کو مغرور نہ کر دے۔ کیونکہ یہ بھی اُن کے لیے ایک آزمائش ہے اور انھیں توبہ اور بازگشت کی ہمت دی گئی ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کا مصداق گنہگار مومنین کو سمجھا ہے۔ اُن کا یہ خیال کسی طرح سے بھی سیاق آیت سے مناسبت نہیں رکھتا۔ بلکہ قرینہ اس امر کا شاہد ہے کہ اس آیت کا مصداق مشرکین اور کفار ہیں۔

اس کے بعد قرآن میں بار دیگر مومنین کے دستور العمل اور اُن کے لیے نصیحت کا ذکر ہے یعنی "جو شخص بھی لقاء الہی کی امید رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اُس سے جہاں تک بھی ممکن ہو اُس کی اطاعت اور فرمان برداری سے سرتابی نہ کرے۔ کیونکہ خدا نے جو وقت مقرر کیا ہے وہ ضرور آکر رہے گا؛ (من کان یرجو لقاء اللہ فان اجل اللہ لآت)۔

البتہ خدا کا یہ وعدہ حتیٰ ہے اور اس راہ پر ضرور چلنا پڑے گا۔ علاوہ بریں خدا تمہاری باتوں کو سنتا ہے اور وہ تمہارے اعمال اور نیات سے آگاہ ہے کیونکہ وہ "سننے والا اور جاننے والا ہے" (وہو السميع العليم)۔

"لقاء اللہ" سے کیا مراد ہے، اس سلسلے میں آراء مختلف ہیں۔ بعض مفسرین نے "بہتر مقررہین" سے ملاقات مراد لی ہے بعض نے "حساب و جزا" کا پیش آنا مراد لیا ہے، بعض نے اس کی تفسیر میں "حکم و فرمان حق" مراد لیا ہے اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ کنایہ ہے قیامت کے لیے۔

جبکہ اس آیت کے یہ مجازی معنی لینے کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ کتنا یہ چاہیے کہ آیت بالا میں بروز قیامت لہ اس آیت میں ایک فقرہ محذوف ہے۔ تفسیر میں اس طرح ہے:

من کان یرجو لقاء اللہ فلیبادر بالطلعة قبل ان یلحقہ الاجل۔ یا

من کان یرجو لقاء اللہ ویقول امنت باللہ فلیقلہ مستقیماً صابراً علیہ۔

فان اجل اللہ لآت۔

”لَقَاءِ اللّٰہِ“ سے مراد ”ملاقاتِ حسی“ نہیں ہے۔ بلکہ لَقَاءِ اللّٰہِ اور ایک قسم کا شہودِ باطنی ہے۔ کیونکہ اُس روز انسان کی آنکھوں سے مادیات سے ختم ہونے پر وہ اٹھ جائیں گے اور انسان جلوہ ہائے شہود کو دیکھے گا۔ نیز جیسا کہ علامہ طہطاوی نے ”المریان“ میں لکھا ہے :

”لَقَاءِ اللّٰہِ“ کا مفہوم یہ ہے کہ بندگانِ خدا بروز قیامت ایک ایسی کیفیت میں ہوں گے کہ اُن کے - اور - خدا کے درمیان جو محابباتِ حائل میں وہ اٹھ جائیں گے۔ کیونکہ روز قیامت کا مزاج ہی یہ ہوگا کہ اُس روز اُن سخاؤں کا ظہور ہوگا جو عالمِ مادی میں انسان کی نظروں سے پنہاں رہتے ہیں۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے :

وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ

اُس روز انسان جان لیں گے کہ خدا ”حق آشکار“ ہے۔ (سورہ نوریہ ۲۵)

اگلی آیت اُس مضمون کی تعبیل ہے جو گزشتہ آیت میں گزر چکا ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ: ”مومنین لَقَاءِ اللّٰہِ کے لیے جو کچھ اُن کی قدرت میں ہے اُس سے فرو گزار نہ کریں“ وہ اس لیے ہے تاکہ ہر شخص زندگی میں جہاد کرے اور سب کو گوش کرے اور مناسبات و مشکلات کو برداشت کرے۔ درحقیقت انسان کا یہ جہاد اُس کی تہذیبِ نفس ہی کے لیے ہے۔ کیونکہ خدا تو جملہ اہل جہان سے بے نیاز ہے: (وَمَنْ جَاهِدْ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ)۔ انسان کے لیے خدا کی آزمائش کا یہ پروگرام کہ وہ ہوائے نفس کے خلاف جہاد کرے، اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے دشمن سے جنگ کرے اور تقویٰ اور پاکیزگی اختیار کرے، درحقیقت یہ سب کچھ انسان ہی کے فائدہ کے لیے ہے۔

دگر ”خدا“ تو ہر حیثیت سے ایک وجودِ لامتناہی ہے۔ اُس کی کوئی احتیاج بھی نہیں ہے جو اُس کے بندوں کی عبادت یا اطاعت سے پُری ہو جائے۔ اُس میں کسی قسم کا نقص یا کمی نہیں ہے جسے دوسرے پُر کر دیں۔ بلکہ ماسوا اللّٰہ کے پاس کوئی چیز بھی اپنی ذاتی نہیں ہے۔

اس بیان سے یہ واضح ہے کہ اس آیت میں کلمہ جہاد سے مراد دشمنانِ اسلام کے خلاف مسلح جہاد نہیں ہے۔ بلکہ یہ کلمہ اس مقام پر اپنے لغوی اور وضعی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جس کا مفہوم ہے حفظِ ایمان اور تقویٰ کے لیے ہر قسم کی کوشش اور جدوجہد۔ اور ہر طرح کی سختی کو برداشت کرنا۔ نیز اس کلمہ کے مفہوم میں کینہ پرورد اور جنگِ سبب و دشمن سے دفاع بھی شامل ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس ”جہاد“ کے تمام منافع مجاہد کی ذات ہی کو پہنچتے ہیں اور وہی اس جہاد کے نتیجے میں دنیا اور آخرت کی سعادت حاصل کرتا ہے۔ اگر اُس کے ایسے ”جہاد“ سے معاشرے کو بھی فائدہ پہنچے تو وہ اُس کے اثراتِ مابعد ہوں گے۔ بنا بریں، جس کسی کو اس قسم کے جہاد کی توفیق عطا ہو اسے لازم ہے کہ وہ اس نعمتِ عظیم کے لیے خدا کا شکر ادا کرے۔

۱۔ ”لَقَاءِ اللّٰہِ“ کی تفسیر کے لیے دیکھئے، جلد اول ذیل آیت ۳۶ سورہ بقرہ۔

آیات زیر بحث میں سے آخری آیت اُس مضمون کی توضیح و تکمیل ہے جو آیت ماقبل میں عنوانِ جہاد کے تحت سرسبز طور پر بیان کیا گیا تھا۔ اس آیت میں حقیقتِ جہاد کو واضح کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ :

جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اعمالِ صالح انجام دیتے ہیں ہم اُن کے گناہوں کو چھپاتے ہیں: (وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ)۔ بنا بریں، اس جہادِ عظیم (ایمان و عملِ صالح) کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ خدا اُن کے گناہوں کو چھپا لیتا ہے اور یہ فائدہ انسان ہی کو پہنچتا ہے۔ اسی طرح جیسے اعمالِ خیر کا ثواب اُنہیں پہنچتا ہے۔ چنانچہ اس آیت کے آخر میں مذکور ہے :

ہم اُنہیں اُن کے اُن اعمالِ صالح کی جو اُنہوں نے انجام دیئے، بہترین جزا دیتے ہیں، اور لَنَجْزِيَنَّهُمْ أَحْسَنَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ)۔

”کفر“ کا مصدر ”کفیر“ ہے۔ اس کے وضعی معنی ہیں ”چھپانا“۔ اس مقام پر ”گناہوں کو چھپانا“ سے مراد ”غفور بخشش الہی“ ہے۔

”أَحْسَنَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ“ کی تعبیر یہ ہے کہ خدا جملہ اعمالِ خیر کی جزا دے گا خواہ وہ ”حسن“ ہوں یا ”أَحْسَنُ“۔ ممکن ہے اس قول کا اشارہ یہ ہو کہ ہم اُن کے اعمالِ نیک کو بھی نیک ترین اور بہترین اعمال میں شمار کریں گے یعنی اگر مومنین کے بعض اعمال عالی۔ بعضے خوب یا متوسط بھی ہوں تو ہم اُن سب کو عالی ہی شمار کریں گے۔ درحقیقت یہ تفضلِ الہی جس کی طرف قرآن کی دوسری آیات میں بھی (مثلاً: سورہ نوریہ کی آیت ۲۸ میں) اشارہ ہوا ہے :

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَيَزِيدَهُمْ مِنْ فَضْلِهِ

خدا اُن کے بہترین اعمال کی جزا دیتا ہے اور اپنے فضل سے اُس پر اضافہ کرتا ہے۔

۸- وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا وَإِنْ جَاهَدَكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۗ إِلَىٰ مَرْجِعِكُمْ فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

۹- وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ ۝

ترجمہ

۸- ہم نے انسان کو وصیت کی کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرے۔ اور اگر تیرے والدین تیرے ذمے پہلے ہوں کہ تو میرے ساتھ کسی کو شریک بنائے، جس کا تجھے علم نہیں ہے تو پھر تو ان کی اطاعت نہ کر۔ آخر کار تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے۔ پھر جو کچھ تم کہتے رہے ہو ہم تمہیں اُس سے آگاہ کریں گے۔

۹- اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے ہم انہیں نیک لوگوں میں داخل کریں گے۔

شان نزول:

سندرج بالا آیت کی شان نزول میں مختلف روایات بیان کی گئی ہیں۔ اُن تمام کا اُلباب یہ ہے کہ: کچھ افراد جو مکہ میں تھے انھوں نے اسلام قبول کیا۔ مگر جب اُن کی ماں کو اس واقعے کا علم ہوا تو اس نے تہیہ کر لیا کہ نہ تو وہ غذا کھائے گی اور نہ پانی پیئے گی تا وقتیکہ اُس کا فرزند اسلام کو ترک نہ کر دے گا۔ اگرچہ کوئی ماں بھی اپنے اس قول پر ثابت رہی اور انھوں نے ترک غذا کے عہد کو توڑ دیا۔ مگر یہ آیت نازل ہوئی اور اس نے اس امر کو سب کے لیے واضح کر دیا کہ جب ایمان و کفر کا مسئلہ پیدا ہو تو والدین کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔

۱۰ ان روایات کے راوی کا نام سعد بن ابی وقاص آیا ہے اور بعض جگہ عیاش بن ابی ربیع غزوی بھی نام ہے۔

تفسیر

ماں باپ کی نسبت بہترین نصیحت:

خدا کی ایک اہم آزمائش اُس تضاد سے عہدہ برآ ہونا ہے جو راہ ایمان و تقویٰ اور اعزاز و اقارب سے جذباتی تعلق میں ہے۔ قرآن مجید میں اس موضوع پر مسلمانوں کے فرض کے متعلق واضح ہدایت موجود ہے۔

قرآن میں سب سے پہلے اُس قانون کلی کو بیان کیا گیا ہے جس کی بنیاد انسانی جذبات اور حق شناسی ہے۔ اس ضمن میں فرمایا گیا ہے:

ہم نے انسان کو وصیت کی ہے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیکی کرے: (ووصینا الانسان لوالديه حننا). اگرچہ بظاہر یہ ایک حکم تشریحی ہے۔ مگر اس سے پہلے یہ تصور ایک "قانون عمومی" کے طور پر ہر شخص کی فطرت میں موجود ہے۔ بالخصوص— اس مقام پر جو علم "انسان" استعمال ہوا ہے وہ لائق توجہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ قانون صرف مومنین سے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ جس فرد پر بھی علم "انسان" صادق آتا ہے، اسے لازم ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے احسانات کا شکر ادا کرے اور ساری عمر ان کے احترام و تحريم اور ان کے ساتھ نیکی کرنے کو نہ بھولے۔ اگرچہ انسان ان تمام اعمال کے باوجود اُن کے فرض کو ادا نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد ایک صریحی استثناء کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ: اگر والدین یہ کوشش و اصرار کریں اور اولاد سے کہیں کہ: تو میرے لیے کسی شریک کا قائل ہو جب کہ تو اُس شریک کو جانتا جی نہ ہو، تو اس حالت میں والدین کی اطاعت نہ کرنا۔ (وان جاهدك لتشرك بى ما ليس لك به علم فلا تطعهما)۔

یہ استثناء اس لیے ہے کہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ ماں باپ سے جذباتی تعلق انسان کے خدا سے تعلق پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس مقام پر کلمہ "جاهدك" کا مفہوم والدین کی کوشش اور اصرار ہے۔

اس کے بعد "ما لیس لك به علم" کہا گیا ہے۔ یعنی وہ چیز جس کا تجھے علم نہیں ہے۔ یہ اس جانب اشارہ ہے کہ شرک کوئی منطقی امر نہیں ہے۔ کیونکہ اگر شرک واقعی درست ہوتا تو اُس کے لیے کوئی دلیل بھی موجود ہوتی۔ اس کی ایک اور تعبیر یہ ہو سکتی ہے کہ انسان کسی شے کا علم ہی نہ رکھتا ہو تو اسے پانچویں اس کی پیروی بھی نہ کرے۔ کچھ یہ کہ انسان کسی شے کے باطل ہونے کا علم رکھتا ہو اور پھر بھی اُس کی پیروی کرے۔ ایسی شے کی پیروی تو جہالت پر مبنی ہے۔ اس لیے اگر تیرے ماں باپ تجھے جہالت کی پیروی اختیار کرنے کی طرف مائل کریں تو اُن کی اطاعت نہ کر۔

اصولی طور پر انہی تعلیمات پر ایمان کے معاملے میں بھی غلط ہے۔ پھر شرک و کفر کے معاملے میں تو اس کی ضلالت کی کوئی انتہا

ہی نہیں۔

ماں اور باپ کے متعلق یہی نصیحت سورہ لقمان میں بھی آئی ہے اس میں یہ کلمات مزید ہیں:

وصاحبهما فی الدنيا معروفاً

اس حالت میں کہ تو شرک کے معاملہ میں اُن کا کہا زمانہ۔ پھر بھی دنیوی معاملات میں اُن کے ساتھ مہربانی اور نرمی کا سلوک کر اور نہ تین سہن میں اُن کے ساتھ نیکی کر۔

یہ بات اس لیے کہی گئی ہے کہ مبادا کوئی شخص اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ شرک کی طرف دعوت دینے کے معاملے میں والدین کی مخالفت کے یہ معنی ہیں کہ اُن کے ساتھ معاملات دُنیا میں بھی کج خلقی اور بُرا سلوک کیا جائے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ والدین کے احترام کی اسلام میں کتنی تاکید ہے۔

اس پوری بحث سے ایک اصول کلی اخذ ہوتا ہے کہ خدا سے انسان کے تعلق پر کوئی شے بھی اثر انداز نہیں ہو سکتی کیونکہ تعلق بذاتِ الہی ہر شے پر مقدم ہے۔ یہاں تک کہ وہ والدین کے ساتھ محبتِ پچی (جو قریب ترین رشتہ ہے) مقدم ہے۔ اس سلسلے میں ایک مشہور حدیث ہے :

لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق
مخلوق کی اطاعت میں خالق کی نافرمانی روا نہیں ہے۔

یہ حدیث امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے اور ایسے مسائل میں یہ ایک روشن معیار ہے۔

آیت کے اخیر میں یہ اضافہ ہے کہ "تم سب کی بازگشت میری طرف ہے۔ میں تم کو اُن اعمال سے آگاہ کروں گا جو تم انجام دیتے رہے ہو۔ اور اُن اعمال کی جزا و سزا ہے کم و کاست تمہیں ملے گی۔ (الذی مرجعہ کو فانیہ کو ہماکتو تعملون)۔"

درحقیقت یہ جملہ اُن لوگوں کے لیے ایک تہدید ہے جو شرک کی راہ اختیار کرتے ہیں اور اُن لوگوں کے لیے جو دوسروں کو بھی شرک کی طرف بلاتے ہیں۔ کیونکہ صحابہ کما گیا ہے کہ :

خدا اُن سب کے اعمال کا حساب اپنی نظر میں رکھتا ہے اور موقع پر اُن سے باخبر کرے گا۔

آیت مابعد میں پھر اُس حقیقت کو اُن لوگوں کے متعلق جو ایمان لائے ہیں اور اعمالِ صالحہ بجالاتے ہیں مکرر اور تاکید بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں فرمایا گیا ہے : وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور اعمالِ صالحہ بجالاتے ہیں ہم اُنہیں نذر صالحین میں داخل کریں گے۔ (والذین آمنوا وعملوا الصالحات لنسئد خلفہم فی الصالحین)۔

نفسیاتی نقطہ نظر سے انسان کے عمل کا اُس کی سیرت پر ردِ عمل ہوتا ہے۔ یعنی انسان کا عمل صالح اُس کی سیرت کو صالح بناتا رہتا ہے۔ اس طرح سے وہ نذر صالحین میں داخل ہو جاتا ہے اور اُس کا عمل سیرت کو ناپاک کر دیتا ہے اور وہ بدوں اور غیر صالح لوگوں کے زمرے میں شامل ہو جاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ : اس آیت میں اس مضمون کی بھرا سے کیا متصوہ ہے ؟

اس کے متعلق بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آیات ماقبل میں اُن لوگوں کی طرف اشارہ تھا جو راہ حق پر کام نزن ہیں اور اس آیت میں اُدیان دین اور رہنمایان طریق توحید کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ عموماً جب کلمہ "صالحین" استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد

انبیاء ہی ہوتے ہیں جو خدا سے دعا کرتے تھے کہ وہ اُنہیں صالحین سے متفق کر دے۔

اس مقام پر اس احتمال کی بھی گنجائش ہے کہ آیات ماقبل میں مومنین کے لیے اُن کے گناہوں کی بخشش اور اُن کے اعمالِ صالحہ کی اچھی جزا کا ذکر تھا۔ لیکن اس مقام پر اُن کے اعلیٰ مرتبہ کا ذکر ہے۔ جو بجائے خود ایک قسم کی جزا ہے۔ وہ یہ کہ یہ لوگ صالحین۔ انبیاء، صدیقین اور شہداء کی صف میں شامل ہوں گے اور اُن کے ہدم و ہم نشین ہوں گے۔

مال باپ سے حُسنِ سلوک :

یہ کوئی پہلی بار نہیں ہے کہ قرآن مجید میں انسانی زندگی کے اس اہم مسئلہ کو بیان کیا گیا ہو۔ اس سے قبل بھی سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۲۳ میں اس مسئلے کی جانب اشارہ ہو چکا ہے اور آپ آئندہ سورہ لقمان کی آیت ۱۳-۱۵ اور سورہ احقاف آیت ۱۵ میں بھی اس اہم موضوع کے متعلق بیانات پڑھیں گے۔

درحقیقت اسلام ماں اور باپ دونوں کے لیے نہایت ہی احترام کا قائل ہے۔ یہاں تک کہ اس صورت میں بھی کہ وہ شرک ہوں اور وہ اولاد کو شرک کی طرف دعوت دیں جو کہ اسلام کی نظر میں بدترین کام ہے، پھر بھی اُن کے حفظِ احترام کو ملحوظ رکھتا ہے۔ قرآن حکم دیتا ہے کہ اُن کی دعوتِ شرک کو تو سرگز توہل نہ کرو مگر اُن کے احترام کو واجب جانو۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی خدا کی طرف سے انسان کا ایک بہت بڑا امتحان ہے (جس طرف اس سورہ کے آغاز میں اشارہ ہوا ہے) کیونکہ انسان بعض اوقات عمر کی ایسی منزل میں پہنچ جاتا ہے کہ پھر اُس کی نگہداری بہت مشکل ہو جاتی اور حالتِ پیری میں بوجہ ناتوانی اُس کی استیجابات کا پورا کرنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب اُس کی اولاد اس کی حق شناسی اور اُس کے متعلق فرمانِ الہی کی اطاعت کر کے امتحان سے عمدہ برآ ہو۔

جناب رسولِ خداؐ کی ایک حدیث اس طرح منقول ہے کہ :

ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سوال کیا :

میں کس شخص کے ساتھ نیکی کروں ؟

آپؐ نے فرمایا : اپنی ماں کے ساتھ۔

اس نے دوبارہ سوال کیا : اس کے بعد کس کے ساتھ ؟

آپؐ نے فرمایا : اپنی ماں کے ساتھ۔

اس نے سربارہ سوال کیا : اُس کے بعد کس کے ساتھ ؟

آپؐ نے فرمایا : اپنی ماں کے ساتھ۔

البتہ جب اُس نے بارِ چہارم سوال کیا تو حضورؐ نے باپ کے ساتھ نیکی کی ہدایت کی اور اُس کے بعد تمام رشتہ داروں کے ساتھ اُن کی قربت کی ترتیب کے لحاظ سے ۔

جناب رسالت مآبؐ کی ایک اور حدیث بہت سی کتابوں میں درج ہے کہ :

ل تفسیر مع البیان اقول آیات زیر بحث۔

الجنة تحت اقدام الامهات

بہشت ماؤں کے پاؤں کے نیچے ہے۔

مُراد یہ ہے کہ ماں کی خدمت میں فرحتی اور عاجزی کرنے اور اُن کے حضور مثل خاک راہ ہونے ہی سے انسان کو بہشت نصیب ہو سکتی ہے۔

۱۰- وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ فَإِذَا أُوذِيَ فِي اللَّهِ جَعَلَ

فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللَّهِ وَلَئِن جَاءَ لَصْرٌ مِّن رَّبِّكَ لَيَقُولُنَّ

إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ؕ أَوَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُورِ الْعَالَمِينَ

۱۱- وَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنْفِقِينَ ۝

۱۲- وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا اتَّبِعُوا سَبِيلَنَا وَلنَحْمِلْ

خَطِيئَتَكُمْ وَمَا هُمْ بِحَامِلِينَ مِنْ خَطِيئَتِهِمْ مِنْ شَيْءٍ ؕ

إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝

۱۳- وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَّعَ أَثْقَالِهِمْ وَلَيَسْئَلُنَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

عَمَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝

ترجمہ

۱۰- اور لوگوں میں سے ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہم خدا پر ایمان لائے ہیں مگر جب انہیں راہ خدا میں دنیا پہنچتی ہے تو وہ لوگوں کے فتنہ کو خدا کا عذاب سمجھتے ہیں۔ مگر جب تیرے پروردگار کی طرف سے صدمہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے۔ کیا خدا جو کچھ اہل عالم کے سینوں میں ہے اُس سے خوب تر نہیں کہہ

نہیں ہے؛

۱۱- اور یقیناً خدا اُن لوگوں کو بھی جانتا ہے جو ایمان لائے ہیں اور انہیں بھی جو منافق ہیں۔

۱۲- اور کافروں نے اُن لوگوں سے کہا جو ایمان لائے ہیں کہ تم ہمارے راستے کی پیروی کرو۔ ہم تمہارے گتے سبب کو اٹھالیں گے۔ مگر وہ اُن کا ذرہ بھر گناہ بھی نہیں اٹھائیں گے۔ کیونکہ وہ جھوٹے ہیں۔

۱۳۔ یہ لوگ اپنا (اپنے گناہوں کا) بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور لوگوں کے بوجھ بھی اور یہ لوگ جو افزا کرتے رہے ہیں، قیامت کے روز اُس کے متعلق اُن سے سوال کیا جائے گا۔

تفسیر

وہ لوگ جو کامیابیوں میں شریک ہیں مگر مشکلات میں نہیں:

گزشتہ آیات میں صالح مومنین اور مشرکین کا ذکر تھا۔ ان آیات زیر نظر میں ایک تیسرے گروہ "منافقین" کا ذکر ہے۔ چنانچہ مذکور ہے کہ: "بعض لوگ ایمان کا اظہار کرتے ہیں، لیکن منافقین کی سختیوں اور مظالم کے مقابلے میں اُن میں تحمل اور استقامت نہیں ہوتی، جس وقت راہِ خدا میں اُنہیں سختیاں پیش آتی ہیں تو وہ ایمان سے روگرداں ہو جاتے ہیں اور ان مساب کو خدا کا عذاب سمجھتے ہیں اور گھبرا جلتے ہیں: (ومن الناس من یقول آمنا باللہ فاذا اُوذی فی اللہ جعل فتنة الناس کعذاب اللہ)۔

مگر جس وقت تجھے تیرے رب کی مدد پہنچتی ہے اور تم کامیاب ہوتے ہو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ تھے اور تمہاری کامیابیوں میں شریک ہیں: (ولئن جاء نصر من ربک ليقولن انا کنا معکم)۔ کیا یہ لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ خدا اُن کے دلوں کے خیالات سے باخبر نہیں ہے اور کیا خدا ان باتوں سے آگاہ نہیں ہے جو دنیا کے لوگوں کے سینوں میں ہیں: (اولیس اللہ باعلو بما فی صدور العالمین)۔

اس آیت میں "امتا" جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے، جبکہ اس کے بعد "جعل" صیغہ مفرد استعمال ہوا ہے، شاید صیغہ جمع اس لیے آیا ہو کہ یہ منافقین چاہتے ہوں کہ اپنے آپ کو مومنین میں شمار کرائیں اس لیے وہ آمنا کہتے ہیں یعنی ہم بھی دوسرے تمام مومنین کی طرح ایمان لائے ہیں۔

"اوذی فی اللہ" سے مراد "اوذی فی سبیل اللہ" ہے یعنی وہ لوگ کبھی راہِ خدا اور راہِ ایمان میں دشمنوں کی لڑائی سے دور آزار ہوتے ہیں۔

اُسے "فتنہ" کہا گیا ہے۔

آیت زیر نظر میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اہل ایمان کو لوگوں کی طرف سے جو آزار پہنچتا ہے وہ درحقیقت عذاب نہیں ہے بلکہ آزمائش ہے اور یہ آزمائش اُن کے محامل ایمان کا وسیلہ ہوتی ہے۔ اس طرح یہ بھی بتایا گیا ہے کہ لوگ "عذاب" اور "امتحان" میں فرق کرنا نہیں اور اس ہلنے سے کہ منافقین اُنہیں تسلطے ہیں، ایمان سے دست بردار نہ ہوں۔ کیونکہ منافقین کی طرف سے ستایا جاتا بھی خدا کی طرف سے دنیادی امتحان کے پروگرام میں شامل ہے۔

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ جملہ فوق "شرطیہ" ہے اور یہ مسلم ہے کہ جملہ شرطیہ کے لیے "وجود شرط" لازمی نہیں ہے۔

بلکہ اُس کا مضموم یہ ہے کہ اگر خدا آئندہ تم کو (اہل ایمان کو) کامیابیاں عطا کرے گا تو یہ کمزور ایمان منافقین اُن میں اپنے آپ کو شریک سمجھیں گے۔

علاوہ بریں مگر میں بھی مسلمانوں نے دشمنوں کے مقابلے میں کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ اگرچہ وہ فوجی فتوحات نہ تھیں بلکہ وہ معنوی کامیابیاں تھیں مثلاً اسلامی تبلیغات عمومی افکار میں نفوذ کر رہی تھیں اور عوام میں اسلام کی پیش رفت ہو رہی تھی۔ ان سب باتوں کے علاوہ مومنین کے لیے اذیت و آزار صرف معنی زندگی ہی ہم تھا۔ مدینہ کی زندگی میں اس قسم کی تکالیف کا بہت ہی کم اتفاق ہوتا تھا۔

اس آیت سے ظننا یہ امر بھی واضح ہوا کہ "منافع" صرف وہی لوگ نہیں ہیں جن کے قلوب میں ایمان تو ہو مگر نہیں ہوتا مگر وہ "ایمان" کا اظہار کرتے ہیں۔ بلکہ وہ کمزور ایمان لوگ بھی جو منافقین کا ظلم برداشت نہیں کر سکتے اس لیے جلد ہی اپنے عقیدے سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ منافقین میں شمار ہوتے ہیں۔

اور آیت زیر بحث میں بظاہر اسی قسم کے منافقین کا ذکر ہے۔ اور یہ تصریح موجود ہے کہ خدا ان کی نیتوں سے آگاہ ہے۔

اس آیت کے بعد کی آیت میں پھر مزید تاکید کے لیے یہ اضافہ ہے کہ یقینی طور پر خدا مومنین کو پہچانتا ہے اور سچی طور پر وہ منافقین کو بھی پہچانتا ہے: (ولیعلم اللہ الذین آمنوا ولیعلمن المنافقین)۔

اگر سادہ لوح لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ حقائق کو چھپا کر اطاعتِ علمِ الہی سے باہر رہ سکتے ہیں تو بہت ہی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ ہر بار وہ بطور تکرار یہ کہتے ہیں کہ "اس آیت میں کلمہ "منافق" کا وجود اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ یہ آیات مدینہ میں نازل ہوئی ہیں۔ یہ امر مسلم ہے کہ کسی جماعت میں نفاق اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ اقتدار میں اگر حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اُس وقت منافقین باقتدار جماعت سے منحرف ہو کر زیر زمین جماعت سازی شروع کر دیتے ہیں۔ مگر جیسا کہ ہم نے سطورِ فوق میں کہا، نفاق کے بہت وسیع معنی ہیں۔ ان معنی میں وہ ضعیف الایمان لوگ بھی شامل ہیں جو تھوڑی سی تکلیف بھی پیش آنے پر اپنا عقیدہ بدل لیتے ہیں۔

آیت مابعد میں مشرکین کا ایک کورہ اور پوچھ قول نقل کیا گیا ہے۔ جبکہ اسی تک مشرکین کی تعداد زیادہ تھی فرمایا گیا ہے: کاذوں نے ایمان والوں سے کہا: "تم آؤ! ہمارے عقائد اور ہمارے مذہب کی پیروی کرو اگر اس راہ میں تمہارا کوئی گناہ ہوگا تو ہم اُسے اپنے کانہوں پر اٹھالیں گے:

(وقال الذین کفروا لذلذین آمنوا اتبعوا سبیلنا ولنحمل خطیایکوا)۔

جلد "ولنعلم" نقل ہے۔ اس پر بعض مترجم نے اعتراض بھی کیا ہے کہ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے آپ ہی کو حکم دے؟

اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ یہ امر قضیہ شرطیہ کے حکم میں داخل ہے۔ یعنی پورا جملہ یوں ہے: "اگر تم ہمارا اتباع کرو تو ہم تمہارے گناہوں کو اٹھائیں گے مگر ہمارا نظریہ یہ ہے کہ اس امر میں کوئی مانع نہیں کہ انسان اپنے آپ کو حکم دے۔ نیز یہ کہ آئندہ مامور یہاں ایک ہی شخص ہے لیکن دو اعتبار سے۔

ہم آج بھی بہت سے باندیش لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ جب وہ کسی کو عمل بد پر آمادہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں، اگر اس فعل میں کوئی گناہ ہے تو وہ ہماری گردن پر حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ کوئی آدمی بھی کسی دوسرے شخص کا گناہ اپنے فتنے نہیں لے سکتا اور یہ بات ہرگز معقول نہیں ہے۔ (کیونکہ) خدا عادل ہے۔ وہ کسی کو بھی دوسرے آدمی کے جرم میں سزا نہیں دے گا۔ علاوہ بریں ان بے اساس باتوں سے کوئی آدمی بھی اعمال کی ذمہ داری سے بری نہیں ہو جائے گا۔

نیز جیسا کہ بعض کوتاہ فکر لوگ خیال کرتے ہیں، ان کی رائے کے برخلاف اس قسم کی بے سرو پا باتیں انسان کے گناہوں کی سزا میں سزا کی ٹوک کے برابر بھی کی نہیں کر سکتیں۔ اس لیے کسی عدالت میں بھی اگر جج کے سامنے کوئی ایسی بات کہنے کے خلاف آدمی کا گناہ نہیں اپنے ذمہ لیتا ہوں تو اس کی بات قبول نہیں کی جائے گی۔

یہ درست ہے کہ گناہ پر آمادہ کرنے والا شخص بھی گناہ گار کے جرم میں شریک ہے مگر یہ شرکت اس گناہ گار کی ذمہ داری کو کسی طرح کم نہیں کر دیتی۔

لہذا دوسری آیت میں تصریح کیا گیا ہے کہ : وہ لوگ دوسروں کے گناہوں اور خطاؤں کو ہرگز اپنے کا نہ ہوں پر نہ لیں گے (وما هو بحاملین من خطایا ہومن شئ انہم لکاذبون)۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ صدق و کذب جملہ خبریہ میں ہوتا ہے۔ حالانکہ ہم جس جملے پر بحث کر رہے ہیں وہ جملہ خبریہ نہیں بلکہ جملہ انشائیہ ہے (یعنی فعل امر) اور ہم جانتے ہیں کہ جملہ انشائیہ میں صدق و کذب نہیں ہوتا۔ پس قرآن یہ کیوں کہتا ہے کہ وہ "جھوٹ بولتے ہیں"؟ اس سوال کا جواب : بیان سابق سے واضح ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ جملہ امریہ اس مقام پر ایک جملہ شرطیہ خبریہ بن جاتا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تم ہمارے طریقے کی پیروی کرو تو ہم تمہارے گناہوں کی ذمہ داری لیتے ہیں۔ اور ایسے جملے میں احتمال صدق و کذب ہے۔

اور اس امر کے پیش نظر کہ کہیں ایسا نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ کفر و شرک، بت پرستی اور ظلم کی طرف دعوت دینے والے لوگ اپنے اعمال کی کوئی سزا نہیں پائیں گے، اس لیے آیت ما بعد میں یہ اضافہ کیا گیا : وہ لوگ اپنے گناہوں کا بار اٹھائیں گے اور ان کے بار پر دوسرے ذرئی بار کا بھی اضافہ ہوگا : (وایحملن الثقال مع الثقال)۔

یہ اضافی بار لوگوں کو گمراہ اور دوسروں کو گمان کی رتبت دلانے کا ہوگا۔ یہ ویسا ہی بار گناہ ہوگا جیسا کہ کسی رسم بد کی بنیاد ڈالنے کا ہوتا ہے۔ جیسا کہ پیغمبر اکرم نے فرمایا :

من سن سنة سیئة فعلیہ وزرہا ووزر من عمل بہا من غیر ان ینقص من وزرہ شیء

اس سوال کا جواب ایک اور طرح بھی دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جملہ انشائیہ میں صدق و کذب کا پہلو ہوتا ہے اور ظرف عام میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ جب کوئی آدمی کسی کام کا حکم دیتا ہے تو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ آدمی اس کام سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ جھوٹ بولنا ہے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ حقیقت میں یہ نہیں چاہتا۔

جو آدمی کسی رسم بد کی بنیاد رکھتا ہے تو اس رسم بد اور ان سب آدمیوں کا گناہ جو اس پر عمل کرتے ہیں اس کی گردن پر ہے۔ بغیر اس کے کہ ان پر عمل کرنے والوں کے گناہ میں سے ذرہ بھر کی جو۔

آیت کے اخیر میں یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ بروز قیامت ان سے یقینی طور پر ان کے افتراء اور دروغ گوئیوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا اور انہیں ان کا جواب دینا ہوگا : (ولیسئلن یوم القیامۃ عما کانوا یفترون)۔

یہاں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جس افتراء کا قیامت میں جواب دینا ہوگا وہ کیا ہے؟

تو ممکن ہے اس افتراء کا مطلب وہ دروغ گوئیاں ہوں جو یہ مشرکین خدا کے متعلق کرتے تھے اور کہتے تھے کہ : خدا ہی نے ہمیں ان بتوں کی پرستش کا حکم دیا ہے۔

یا اس سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ وہ لوگ جو یہ کہتے تھے کہ "تمہارے گناہوں کو ہم اپنی گردن پر لیتے ہیں۔ اس قول سے ان کفار کی یہ مراد ہو کہ" یہ اعمال ہرگز گناہ نہیں ہیں" اور یہ ایک جھوٹ ہے جس کا انہیں جواب دینا ہوگا۔ یا یہ کہ بروز قیامت ان سے کہا جائے گا کہ آؤ اور ان لوگوں کے گناہ اٹھاؤ ! تو وہ لوگ انکار کریں گے اور اپنے جھوٹ کو ظاہر کر دیں گے۔

یا یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ ان کے اقوال کا یہ مطلب تھا کہ ہر انسان دوسرے انسان کے گناہوں کی ذمہ داری لے سکتا ہے۔ حالانکہ یہ بات بھی دروغ ہے۔ کیونکہ ہر آدمی صرف اپنے ہی اعمال کا ذمہ دار ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ اچھی اور بُری رسمیں : اگر کوئی شخص کسی ایسے کام کی بنیاد رکھتا ہے جو اس عہد کے پورے معاشرے میں فساد و فحشاء کو بنیاد رکھنے والا شخص کل معاشرہ کے اعمال کا ذمہ دار ہوگا۔ کیونکہ کسی عمل کی تحریک بھی اس عمل کے اسباب میں سے ہے۔ یہ ثابت ہے کہ جو شخص بھی محرک عمل ہے وہ اس عمل کے خیر و شر میں شریک سمجھا جائے گا۔ خواہ وہ عمل اتنا ہی معمولی ہو۔ جناب رسالت مآب سے ایک حدیث روایت کی گئی ہے جو ہمارے اس قول کی موید ہے۔

جناب رسول خدا ایک روز اپنے اصحاب کے ساتھ تشریف رکھتے تھے کہ ایک سائل آیا اور اس نے مدد کے لیے سوال کیا۔ کسی نے بھی اسے کچھ نہ دیا۔ اتنے میں اصحاب میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور اس فقیر کو کچھ دے دیا۔ یہ دیکھ کر دوسرے لوگ بھی خیال پیدا ہوا اور انہوں نے بھی اس سائل کی مدد کی اس موقع پر رسول اللہ نے فرمایا :

من سن خیراً فاسن بہ کان لہ اجرہ ومن اجور من تبعہ، غیر منقص من اجورہ شیئاً، ومن سن شرّاً فاسن بہ کان علیہ وزرہ ومن اوزار من تبعہ، غیر منقص من اوزارہ

شیئاً

۱۔ تفسیر قرآنی، جلد ۲۵، صفحہ ۲۵

جو آدمی کسی نیک رسم کی بنیاد رکھتا ہے اور دوسرے اس کی پیروی کرتے ہیں تو اسے اس کے عمل خیر اور دوسروں کے اعمال خیر کا بھی بدلہ ملے گا۔ بغیر اس کے کہ دوسروں کی جزا میں کچھ بھی ہو اور جو کوئی رسم شرکی بنیاد رکھتا ہے اور لوگ اس کی پیروی کرتے ہیں تو اسے اس کے اپنے گناہ اور دوسروں کے گناہوں کی بھی سزا ملے گی۔ اس کے بغیر کہ ان کی سزا میں کچھ تخفیف ہو۔

اس مطلب کی اور بھی حدیثیں ضعیف اور سنی کتب احادیث میں مذکور ہیں۔ مگر ان میں سے یہ مشہور ہے۔

۲۔ ایک سوال کا جواب: اس مقام پر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ اسلامی قوانین میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک انسان کا خون بہا دوسرے آدمی کے ذمے ہوتا ہے۔ مثلاً قتل کے معاملہ میں خون بہا "عاقلہ" کے ذمے ہے۔ "عاقلہ" اصطلاح فقہ میں ایک باپ کی اولاد ذکر کر کے ہے میں کہ خون بہا کی رقم اس اولاد ذکر پر تقسیم ہو جائے گی اور ان میں سے ہر ایک اپنا حصہ ادا کرے گا۔

کیا یہ مسئلہ مندرجہ بالا آیات کے مضامین سے متضاد نہیں ہے؟

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ہم نے مباحث فقہی میں یہ واضح کر دیا ہے کہ "عاقلہ" کا خون بہا کا ضامن ہونا ایک قسم کا ایک خاندان کے افراد میں متقابل اور لازمی بیم ہے۔ اسلام نے اس وجہ سے کہ کسی خطا کی ویت کا بار ایک فرد پر نہ رہے۔ پھر سے خاندان کے افراد پر لازم کر دیا کہ وہ سب باہم دیگر ویت خطا کے ضامن رہیں اور ویت کی رقم کو آپس میں بانٹ لیں۔ ممکن ہے کہ آج ایک شخص خطا کا مرتکب ہو اور کل کو دوسرا۔

(ہم اس مسئلے کے بارے میں مزید بحث کو فقہ کی کتاب پر پھوڑتے ہیں)

بہر حال اوسے ویت کا یہ نظام باہمی مفاد کی حفاظت کے لیے ایک قسم کا تعاون اور امداد باہمی ہے۔ اور اس کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ کوئی شخص دوسرے آدمی کا گناہ اپنی گردن پر لے لے۔ بالخصوص قتل کا خون بہا حقیقت میں اس گناہ کا جرمانہ نہیں ہے بلکہ وہ "تلافی نقصان" ہے (یہ امر سنی فقہ میں ہے)۔

۱۲۔ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا حِينَ
عَامًا فَآخَذَهُمُ الطُّوفَانُ وَهُمْ ظَالِمُونَ ○

۱۵۔ فَأَنْجَيْنَاهُ وَأَصْحَابَ السَّفِينَةِ وَجَعَلْنَاهَا آيَةً لِلْعَالَمِينَ ○

۱۶۔ وَإِبْرَاهِيمَ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاتَّقُوهُ ذَلِكُمْ
خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ○

۱۷۔ إِنَّمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا وَتَخْلُقُونَ إِفْكًا إِنَّ الَّذِينَ
تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوا

عِنْدَ اللَّهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوهُ وَاشْكُرُوا لَهُ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ○

۱۸۔ وَإِنْ تَكْذِبُوا فَقَدْ كَذَّبَ أُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ وَمَا عَلَى

الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلْغُ الْمُبِينُ ○

۱۹۔ أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِي اللَّهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ إِنَّ ذَلِكَ

عَلَى اللَّهِ لَيْسِيرٌ ○

ترجمہ

۱۲۔ اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ وہ ان میں پچاس سال کم ایک ہزار سال تک رہے۔ پھر ان کو

(قوم نوح کو) طوفان نے آپڑا۔ جب کہ وہ ظالم تھے۔

- ۱۵۔ پھر ہم نے اُس (نوح) کو اور کشتی والوں کو نجات دی اور اُس کشتی کو اہل عالم کے لیے ایک نشانی بنا دیا۔
- ۱۶۔ اور ہم نے ابراہیم کو بھیجا۔ جب کہ اُس نے اپنی قوم سے کہا: تم خدا کی عبادت کرو اور اُس سے ڈرو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم اس بات کو سمجھو۔
- ۱۷۔ تم لوگ خدا کو چھوڑ کر (پتھر اور کھڑکی کے بننے بوجھے) بتوں کی عبادت کرتے ہو اور آپس میں دروغ بانی کرتے ہو۔ وہ ذاتیں جن کی تم خدا کو چھوڑ کر پرستش کرتے ہو، تمہیں رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتیں۔ پس تم خدا ہی سے رزق طلب کرو اور اُسی کی عبادت کرو اور اُس کا شکر ادا کرو کہ جس کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔
- ۱۸۔ اگر تم میری تکذیب کرتے ہو تو تم سے پہلی امتیں بھی انبیاء کی تکذیب کرتی رہی ہیں اور رسول پر تو واضح ابلاغ کے سوا اور کچھ فرض نہیں ہے۔
- ۱۹۔ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ خدا مخلوق کو کس طرح پیدا کرتا ہے اور پھر اُس کا اعادہ کرتا ہے۔ اور یہ خدا کے نزدیک آسان ہے۔

تفسیر

سرگزشت نوحؑ اور ابراہیمؑ کا ذکر:

گذشتہ آیات میں انسانوں کی عمومی آزمائش کا ذکر تھا۔ یہاں سے اور اس کے بعد انبیاء اور سرگزشتہ اقوام کی اٹھائیسواں ذکر ہے کہ وہ انبیاء اور ان کے ساتھی کس طرح دشمنوں کے نرسنے میں آزار و زحمت سے دوچار رہے، انھوں نے کس طرح صبر کیا اور پھر آخر کار انھیں حالات پر فتح نصیب ہوئی۔

یہ اذکار اصحابِ پیغمبرِ اسلام کی دلجوئی کے لیے ہیں، جو ان آیات میں مکہ میں طاقتور دشمنوں کے نرسنے میں گھرے ہوئے تھے۔ نیز یہ دشمنوں کے لیے تہدید بھی ہے کہ وہ جان لیں کہ اُن کا انجام بڑا دردناک ہو گا۔

یہاں سب سے پہلے ایک اولوالعزم پیغمبر حضرت نوحؑ کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ مختصر الفاظ میں اُن کی زندگی کا اناحصہ بیان کیا گیا ہے جو اُس وقت مسلمانوں کی وضع زندگانی کے لیے مناسب تر تھا۔

خدا فرماتا ہے: ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ اُن کے درمیان پچاس سال کم ایک ہزار سال تک رہا: (ولقد ارسلنا نوحا الی قومہ فلیت فیہم الف سنۃ الا خمسین عاما)۔

حضرت نوح علیہ السلام شب و روز تبلیغ کرنے اور توحید کی طرف دعوت دینے میں مشغول رہتے تھے۔ خواہ خلوت و تنہائی ہو یا آپ لوگوں کے مجمع میں ہوں۔ بہر کیف آپ ہر موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی قوم کو نوسو پچاس سال کی طویل مدت تک خدا کی طرف

بللاتے رہے۔ آپ اس خستہ کن گوشش سے نہ تو تھکے اور نہ اپنی طبیعت میں کسی ضعف کو پیدا ہونے دیا۔ لیکن اس محنت باوجود ایک قلیل تعداد (تاریخ کے مطابق اسی افراد) کے سوا کوئی آپ کی تعلیم پر ایمان نہ لایا۔ "ضما" جناب رسالہ کو یہ آگاہ کیا گیا ہے کہ: تم ان مشرکین کو بجانب حق دعوت دیتے رہو اور ان کی سرکشی سے دل شکستہ نہ ہو۔ کیونکہ تمہارے ساتھ ہم درپیش ہے وہ حضرت نوحؑ کی دشواریوں سے آسان تر ہے۔

مخبر دیکھو کہ اس حکم اور جھگڑا تو تم (یعنی قوم نوحؑ) کا انجام کیا ہوا۔ آخر کار انھیں ایک عظیم طوفان نے گھیر لیا اس لیے ظالم اور سنگرتے: (فأخذہم الطوفان وهو ظالمون)۔

اس طور سے ان کی شرمنگ زندگیوں کا طومار پھینکا گیا۔ اُن کے عملات اور عریلیاں اور اُن کے بے جان جسم سب کے امواج طوفان میں دفن ہو گئے۔

آیت میں جناب نوحؑ کی مدتِ تبلیغ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: "ہزار سال مگر پچاس سال کم، حالانکہ خدا نوسو پچاس سال کہہ دیتا۔

یہ اسلوب بیان طول زمان کی اہمیت کے اظہار کے لیے ہے، کیونکہ ایک ہزار کا عدد اور پھر وہ بھی "ہزار" صورت میں، تبلیغ کے لیے بہت بڑا عرصہ ہے۔

آیت فوق کے ظاہری معنی سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ کی کل عمر اتنی ہی نہ تھی۔ جب کہ موجودہ قورات نوحؑ کی کل عمر اتنی ہی لکھی ہے۔ (توریت سزکوین فصل نم)

لیکن یہ بات درست نہیں بلکہ نوسو پچاس سال کا عرصہ ماقبل طوفان تبلیغ کا ہے۔ آپ طوفان کے بعد بھی طویل زندہ رہے۔ بعض مترسین نے تین سو سال لکھے ہیں۔

اگر ہم اپنے زمانے کی عمروں کے معیار سے دیکھیں تو حضرت نوحؑ کی اتنی طولانی عمر بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے اور معلوم نہیں ہوتی۔ ممکن ہے اُس زمانے میں لوگوں کی عمریں اس زمانے کی عمروں سے مختلف ہوتی ہوں۔ بعض اسناد سے حاصل ہوتی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم نوحؑ کی عمریں طولانی ہوتی تھیں۔ اُن میں سے تو حضرت نوحؑ کی عمر غیر معمولی بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے جسم کی بناوٹ میں بھی طول عمر کا امکان ہوتا ہے۔

اس زمانے میں حکمائے جو تحقیقات کی ہیں اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی حد عمر معین نہیں ہے اور جن ن انسان کی عمر طبیعی ایک سو بیس سال یا اس سے کسی قدر کم یا زیادہ سمجھی ہے اُن کا خیال بے اساس ہے۔ بلکہ عین ممکن شرائط ہمتے حیات کے ساتھ یہ قیاس بدل جلتے۔

ہمارے اس زمانے میں سائنسدان تجربات کے وسیلے سے اس قابل ہو گئے ہیں کہ وہ بعض نباتات یا دیگر زندہ کی عمر کو اُن کی معمولی مدتِ حیات سے بارہ گنا زیادہ کر دیں۔ بلکہ بعض اوقات تو (اگر آپ تعجب نہ کریں) ۹۰۰ گنا تک کو طویل کر دیا گیا ہے۔ اگر یہ تجربات کامیاب ہوتے رہے تو وہ انسان کی مدتِ حیات کو بھی طویل دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

طویل عمر کے لیے کوشاں رہنے کے لیے حضرت امام صدیق علیہ السلام کی طویل عمر کی بحث کے سلسلے میں صدیقِ اقصیٰ بزرگ، کتاب کا مطالعہ کریں۔

اور یہ نکلن ہو جائے گا کہ انسان ہزاروں سال تک زندہ رہ سکے۔

نمٹنا یہ بھی ٹھونڈا رہے کہ کلمہ "طوفان" کا مادہ "طوف" ہے۔ اس کے حقیقی معنی ہر اس حادثے کے ہیں جو انسان کو گھیرے۔ مجازاً اس کلمہ کا اطلاق اُس کثیر پانی یا سیل شدید پر ہونے لگا جو زمین پر پھیل کر اسے نکل لے۔ اس کا اطلاق ہوا، آگ اور پانی سب پر ہو سکتا ہے۔ یہ کلمہ کبھی شدید تاریکی شب کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔
یہ امر بھی قابل غور ہے کہ قوم نوح کو "وہوظالمون" کہا گیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ وقوع طوفان کے وقت بھی وہ لوگ اسی طرح ظلم و ستم کے مرکب ہو رہے تھے۔ ان کلمات کا اشارہ اس طرف بھی ہے کہ اگر وہ ان اعمال سے باز آجاتے اور خدا کی طرف رجوع کرتے تو بجز اس عذاب میں مبتلا نہ ہوتے۔

اس کے بعد یہ اسٹافز کیا گیا ہے کہ ہم نے نوح اور اصحاب کشتی کو نجات دی اور اُسے اہل دنیا کے لیے ایک نشان قرار دیا۔ (فانجیناہ واصحاب السفینۃ وجعلناہا آیۃ للعالمین)۔

حضرت نوح اور ان کی قوم کے واقعے کے ذکر کے بعد دوسرے اولوالعزم پیغمبر حضرت ابراہیم کے حالات کا تذکرہ ہے۔
ہم نے ابراہیم کو بھیجا۔ اور جب اُس نے اپنی قوم سے کہا کہ: خدائے واحد کی پرستش کرو اور اُس کے لیے تقویٰ اختیار کیو کہ اگر تم جانو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ (رو ابراہیم اذ قال لقومہ اعبدوا اللہ واتقوہ ذالکو خیر لکم وان کنتمو تعلمون)۔

اس مقام پر تنبیہات انبیاء کے دواہم "اعتادی اور علی" ارکان کا ایک ہی جگہ بیان سے اور وہ ہیں "توسید اور تقویٰ" کی طرف دعوت (توحید کا تعین امتداد سے اور تقویٰ کا رابطہ عمل سے ہے)۔ آخر میں کہا گیا ہے کہ اگر تم فکر صحیح رکھتے ہو تو ایمان بہ توحید اور تقویٰ تمہارے لیے بہتر ہے کیونکہ اس سے تمہاری دنیوی زندگی شرک و گناہ، بدبختی کی آلودگیوں سے نجات ملتی ہے اور تمہاری آخرت کے لیے بھی یہ سعادت جاوید قرار پائی ہے۔

اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ کے دلائل سے نبوت پرستی کا باطل ہونا ثابت کرتے ہیں۔ آپ نے اس دعویٰ کو شکست دلائل سے ثابت کیا ہے اور ان سے اُن مشرکین کے معتقدات اور روشن حیات کو نا درست ثابت کیا ہے۔

۱۔ مفردات راغب و فرہنگ مید۔

۲۔ اس امر میں کہ "جعلناہا" کی تفسیر کا مروج کون ہے، مفسرین میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ "توسید" ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کا اشارہ حضرت نوح اور ان کے اصحاب کی نجات کی طرف ہے۔ بعض نے اس تفسیر کا مروج کشتی کو قرار دیا ہے۔ ہمارے نزدیک آیت کے ظاہری معنی کے لحاظ سے آخری خیال درست ہے۔ درحقیقت یہ کشتی اُس زمانے میں خدا کی تعلیم آیات میں سے ایک آیت تھی۔

۳۔ "ارسلنا" فعل ہے اور نوحؑ معلوف علیہ اور ابراہیمؑ معلوف ہے۔ دونوں مفعول ہوتے فعل "ارسلنا" کے، بعض نے ابراہیم کو فعل "انجیناہ" کے مفعول پر غلط سمجھا ہے۔ اور بعض نے فعل معذرتاً اذ کر کے مفعول سمجھا ہے۔

پہلی بات انھوں نے یہ فرمائی کہ: تم خدا سے منحرف ہو کے بتوں کی عبادت کرنے ہو۔ (اتما تقیدون من دون الذہ او شانائا)۔

حالا کہ یہ بت بے روح جتھے ہیں۔ نہ یہ صاحب ارادہ ہیں، نہ صاحب عقل اور نہ صاحب شعور۔ وہ ان تمام اوصاف سے محروم ہیں۔ ان کی ہیبت ہی بت پرستی کے عقیدے کو باطل ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

توجہ رہے کہ "اذنان" جمع ہے "ذن" کی "بروزن" معنی "دو پتھر جنہیں بعورت انسان تراش کر ان کی عبادت کی جاتی تھی۔ اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ اور آگے بڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ صرف ان بتوں کی وضع ہی یہ ثابت نہیں کرتی کہ معبود نہیں ہیں، بلکہ تم بھی جانتے ہو کہ "تم دروغ بانی کرتے ہو اور ان بتوں کو معبود کہتے ہو" (وتخلفون افکاً)۔

تمہارے پاس اس جھوٹ کو ثابت کرنے کی بجز چند اولام و خرافات کے اور کیا دلیل ہے۔

یونکہ "تخلقون" کا مادہ خلق ہے۔ یہ کلمہ کبھی پیدا کرنے یا بنانے کے معنی دیتا ہے اور کبھی یہ معنی جھوٹ بولنا۔

اس لیے بعض مفسرین نے اس جملے کی اُس کے علاوہ بھی تفسیر کی ہے جو ہم نے سطور بالا میں تحریر کی۔

انھوں نے کہا ہے کہ تخلفون سے مراد یہ ہے کہ تم ان مصنوعی معبودوں کو اپنے ہاتھ سے تراشتے ہو اور خلق کرتے۔ اس لحاظ سے کلمہ "افک" کے معنی "غیر حقیقی معبود" ہوتے اور "خلق" بمعنی تراشیدن "لہ تراشا۔

اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ تیسری دلیل دیتے ہیں کہ اگر تم ان بتوں کو مادی منفعت کے لیے پوجتے ہو یا دوسرے؛ میں فائدے کے لیے، دونوں صورتوں میں تمہارا یہ خیال باطل ہے کیونکہ تم خدا کے علاوہ جن کی پرستش کرتے ہو وہ تمہیں رزق دہنی نہیں دے سکتے: (ان الذین تقبیدون من ذون اللہ لا یملکون لکم رزقا)۔

تم خود اقرار کرتے ہو کہ یہ بت خالق نہیں ہیں بلکہ خالق حقیقی خدا ہے۔ اس بنا پر روزی دینے والا بھی وہی ہے۔ لہذا روزی خدا سے طلب کرو: (فابتغوا عند اللہ الموزق)۔

اور چونکہ روزی دینے والا وہی ہے۔ لہذا اسی کی عبادت کرو اور اُس کا شکر بجالاؤ: (واعبدوہ واشکروا لہ)۔

اس مضمون کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ منعم حقیقی کے حضور میں "حسن شکر گزاری" سے بھی عبادت کی ترکیب ہوتی ہے۔

تم جانتے ہو کہ منعم حقیقی خدا ہی ہے۔ پس شکر اور عبادت بھی اُسی کی ذات کے لیے مخصوص ہے۔

نیز اگر تم سوائے آخرت کی زندگی کے خواستگار ہو تو سمجھ لو کہ ہم سب کی بازگشت اسی طرف ہے۔ نہ کہ بتوں کی طرف (الیب

توجعون)۔

یہ بت نہ یہاں کچھ کام آسکتے ہیں نہ وہاں۔

حضرت ابراہیمؑ نے اس طرح چند مختصر مگر واضح دلائل سے مشرکین کے بے بنیاد عقائد کو رد کر دیا۔

۱۔ "افک" ہر اس چیز کہتے ہیں جس کی اصل صورت بدل جائے۔ اس لیے دروغ، باہمضوں "بڑے جھوٹ" کو افک کہتے ہیں۔ اسی طرح بارہ کبھی "افک" کہتے ہیں۔

اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ تمدید کے طور پر اور ان مشرکین کی سرکشی سے بے اعتنائی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اگر تم میرے پیام کی تکذیب کرتے ہو تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تم سے پہلے جو امتیں گزر چکی ہیں انہوں نے بھی اسی طرح اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی ہے اور آخر کار ان کا انجام بڑا دردناک ہوا: (وان تکذبوا فقد کذب أمموا من قبلكم)۔ رسول اور فرستادہ خدا کا فرض واضح و ابلاغ کے علاوہ اور کچھ نہیں خواہ لوگ اُسے قبول کریں یا نہ کریں: (وما علی الرسول الا البلاغ المبین)۔

اس مقام پر گزشتہ آیتوں سے مراد قوم نوح اور وہ اقوام ہیں جو اُس کے بعد وجود میں آئیں۔ ارتباط آیات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ قول حضرت ابراہیمؑ ہی کا ہے اور بہت سے مفسرین نے بھی اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے یا کم از کم بطور احتمال اس کا ذکر کیا ہے۔ اس مقام پر ایک اور احتمال بھی ہے کہ اس آیت میں زدئے سخن مشرکین مکہ اور رسول اللہ کے زمانے کے کافروں کی طرف ہو اور یہ جملہ:

”کذب أمموا من قبلكم“ اس احتمال سے بہت مناسبت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ سورہ زمر کی آیت ۲۵ اور سورہ فاطر کی آیت ۲۵ میں پیغمبر اسلامؐ اور مشرکین عرب کے متعلق جو ذکر آیا ہے اس آیت کا مفہوم بھی اُس کے مطابق ہے۔ بہر حال مذکورہ بالا دونوں تفسیریں نتیجے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔

اس مقام پر قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کے قہقہ کو مطلقاً چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور حضرت ابراہیمؑ کو خیر باری تعالیٰ اور اپنی رسالت کے اثبات میں جو دلائل دے رہے تھے انہیں معاد کے ذکر پر ختم کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں: کیا یہ منکرین معاد نہیں دیکھتے کہ خدا آفرینش کا آغاز کرتا ہے اور پھر اُسے واپس لوٹاتا ہے: (اولو یروا کیف یبدئ فی اللہ الخلق شو یعیده)۔ اس مقام پر ”رؤیت“ یعنی دیکھنے سے مراد مشاہدہ قلبی اور علم ہے۔ یعنی کیا یہ لوگ آفرینش الہی کی کیفیت کو نہیں جانتے؟ وہ ذات جو بار ازل ایجاد و آفرینش پر قدرت رکھتی ہے، اُس کے اعادہ پر بھی قادر ہے۔ کیونکہ ایک چیز پر قدرت رکھنا یہ معنی رکھتا ہے کہ اُس کے امثال و اشباہ پر بھی اسے قدرت ہے۔

اس مقام پر اس احتمال کی بھی گنجائش ہے کہ ”رؤیت“ کے معنی ”مشاہدہ بالعیین“ (آنکھ سے دیکھنا) ہو۔ کیونکہ انسان اس دنیا میں یہ دیکھتا ہے کہ بارش کے فیض سے مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے، زمین سے نباتات اُگتی ہیں۔ انسانی بچوں کی تولید ہوتی ہے۔ مرنے کے بچے انڈوں سے نکلتے ہیں۔ کیا وہ یہ نہیں سوچتا کہ جو ذات ان کاموں پر قدرت رکھتی ہے، وہ بعد مرگ مردوں کو حیات نو بخش سکتی ہے۔

آیت کے اخیر میں تاکید کے عنوان سے یہ اضافہ ہے کہ یہ کام خدا کے لیے آسان ہے: (انت خالق علی اللہ لیسیں)۔

کیونکہ بار ازل ایجاد و آفرینش کے مقابلے میں تجدید حیات آسان تر ہے۔

ذات الہی کے لیے کلمات ”آسان اور دشوار“ کی تعبیرات انسان کے محدود دماغ اور محدود قدرت حالت کی اختراعات ہیں جو اُس نے اپنی فہم کے مطابق وضع کر لیے ہیں۔ کام کا آسان یا دشوار ہونا تو مخلوق کے لیے ہے جس کا اختیار اور قدرت محدود ہے نہ کہ خدا کے لیے کہ اُس کی قدرت کے لیے کسی حد کا تعین نہیں ہے۔ (غور کیجئے گا)۔

۲۰. قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللَّهُ يُنشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

۲۱. يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَيَرْحِمُ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَإِلَيْهِ تُقْلَبُونَ ۝

۲۲. وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ۝

۲۳. وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَلِقَائِهِ أُولَٰئِكَ يَسْأَوْنَ مِنْ رَحْمَتِي وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝

ترجمہ

- ۲۰۔ (اے رسول) کہہ دو کہ زمین میں پہل پھر کر دیکھو کہ اُس نے پہلی مرتبہ کس طرح مخلوق کو پیدا کیا۔ اس کے بعد (اسی طرح) دوسری دُنیا کو بھی پیدا کرے گا۔ اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔
- ۲۱۔ خُدا جسے چاہتا ہے (اور سزا دیتا ہے) عذاب دیتا ہے اور جس پر چاہتا ہے رحم کرتا ہے اور تم سب اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔
- ۲۲۔ اور تم ہرگز خدا کے ارادہ پر غالب نہیں آسکتے اور اس کے دائرہ قدرت سے نہ زمین میں فرار کر سکتے ہو نہ آسمان میں اور خدا کے سوا تمہارے لیے نہ کوئی دلی ہے نہ مددگار۔
- ۲۳۔ اور جن لوگوں نے خدا کی آیات اور اُس کی تقاسمے انکار کیا وہ میری رحمت سے ناامید ہو گئے ہیں اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

تفسیر

خدا کی رحمت سے مایوس لوگ :

یہ آیات معاد کی بحث کے بعد آئی ہیں اور حضرت ابراہیمؑ کے قصے کے وسط میں جملہ معترضہ کے طور پر ہیں۔ یہ پہلی بار نہیں ہے کہ ہم قرآن میں اس قسم کی طرز بحث کا سامنا کر رہے ہیں۔ قرآن کی روش یہ ہے کہ جس وقت کسی قصے کا بیان ایک حتمی مرحلے پر پہنچتا ہے تو اس قصے سے مفید نتائج اخذ کرنے کے لیے اصل قصہ چھوڑ کر اُن نتائج کا ذکر کرنے لگتا ہے۔ ہر حال زیر بحث آیات میں سے پہلی آیت میں مسئلہ معاد کے سلسلے میں دُنیا کی سیر کی دعوت دی گئی ہے۔ جب کہ اس سے پہلے کی آیت کا رخ "سیر انفس" کی طرف تھا۔

خدا فرماتا ہے : ان سے کہو کہ رُسنے زمین کی سیر کریں۔ زندہ موجودات کی انواع کو دیکھیں۔ مختلف اور متنوع قسم کی اقوام اور جانوں کو اُن کی خصوصیات کے ساتھ ملاحظہ کریں۔ اور دیکھیں کہ خُدا نے اُنہیں بار اُزل کس طرح ایجاد کیا ہے۔ (قل سیروا فی الارض فانظروا کیف بدأ الخلق)۔

وہی خدا جو رنگ موجودات اور مختلف اقوام کو پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے، آخرت میں بھی زندہ کرے گا۔ (شہاد اللہ ینشیئ النشاء الآخرة)۔

کیونکہ اُس نے پہلی بار خلق کر کے سب پر اپنی قدرت ثابت کر دی ہے۔ ٹھیک ہے کہ خدا ہر چیز پر قادر اور توانا ہے : (ان اللہ علی کل شیء قَدِيرٌ)۔

یہ آیت اور اس سے ما قبل کی آیت قدرت الہی کی وسعت کی دلیل سے معاد کے امکان کو ثابت کرتی ہیں۔ دونوں آیات میں فرق یہ ہے کہ آیت مابقی میں خُدا انسان اور جو کچھ اُس کے اطراف و جوارب میں ہے اس کی خلقت ازل کا ذکر ہے اور دوسری آیت میں انسان کو اقوام عالم اور دوسری موجودات کے مطالعے کی دعوت دی گئی ہے۔ تاکہ وہ خُدا کی ایجاد ازل کو مختلف مظاہر اور مختلف حالات و شرائط میں مشاہدہ کریں اور خدا کی لامحدود قدرت سے آشنا ہوں اور یہ سمجھیں کہ اُس میں اعادہ حیات کی طاقت بھی ہے جس طرح سے کہ کبھی "آیات انفس" کے مشاہدے سے توحید کا اثبات ہوتا ہے۔ اور کبھی "آیات آفاقی" کے مشاہدے سے اسی طرح ان دونوں طریقوں سے معاد کا بھی اثبات ہوتا ہے۔

اس زمانے میں یہ آیت سائنسدانوں کے لیے دقیق تر اور عمیق تر مفہوم رکھتی ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ سیاحت کریں اور اُن موجودات ذی حیات کے آثار دیکھیں جو کبھی رُسنے زمین پر موجود تھے اور اب وہ سمندر کی گہرائیوں، پہاڑوں کی چٹانوں اور زمین کے طبقات میں ڈھانچوں وغیرہ کی شکل میں موجود ہیں۔ اس طرح وہ زمین پر آغاز حیات کے اسرار اور خدا کی عظمت و قدرت سے آگاہ ہوں اور یہ بھی جانیں کہ وہ اعادہ حیات پر قدرت رکھتا ہے!

۱۔ ہم نے اس تفسیر کی جلد ۳ میں سورۃ آل عمران کی آیت ۱۳۷ کے ذیل میں سیر انفس کے متعلق مفصل بحث کی ہے۔ یہیں وہ بحث زیادہ تر غرضتہ لغزمانہ اور قول کا مقام سے درج ہوئی ماسن کر کے سلسلہ میں۔

کلمہ "نشأه" کے حقیقی معنی کسی چیز کی ایجاد اور تربیت کے ہیں۔ کبھی دنیا کو "نشأه اولیٰ" اور قیامت کو "نشأه آخرت" سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

اس مقام پر یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ آیت نمبر ۱۹ میں "ان ذالک علی اللہ یسیر" آیا تھا۔ اور یہاں "ان اللہ علی کل شئی قدیدر" آیا ہے۔ انہما بیان کا یہ فرق ممکن ہے اس وجہ سے جو کہ آیت ماقبل میں محدود مشابہہ کا ذکر ہے اور اس آیت میں ایک وسیع مشابہہ کا ثبات کی دعوت دی گئی ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں ان مسائل میں سے جو معاوضے سے متعلق ہیں، ایک مسئلے کا ذکر ہے اور وہ ہے رحمت اور عذاب کا سلسلہ چنانچہ مذکور ہے کہ: "وہ قیامت میں جس شخص کو مستحق سزا سمجھے گا اسے سزا دے گا اور جس شخص کو لائق رحمت سمجھے گا اس پر رحم فرمائے گا اور تم سب اسی کی طرف لوٹ جاؤ گے۔ (یعبذب من یشاء ویرحم من یشاء والیہ قلبون)۔" باوجودیکہ خدا کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔ لیکن اس آیت میں پہلے عذاب کا ذکر ہے اور پھر رحمت کا کیونکہ یہ بطور تمہید ہے اور تمہید کے لیے یہی مناسب ہے۔

اس مقام پر ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اقل عذاب و رحمت کا ذکر ہے اور اس کے بعد اس کی طرف بازگشت کا۔ ایسا کیوں ہے؟ جب کہ قضیہ اس کے برعکس ہے یعنی اول لوگ اس کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے اور اس کے بعد وہ مستحق عذاب و رحمت قرار پائیں گے۔ شاید اسی سبب سے بعض لوگ اس عذاب و رحمت کو دنیا کا عذاب اور رحمت سمجھتے ہیں۔

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ آیات مابعد کے فریضے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس عذاب و رحمت کا یہاں ذکر ہے اس کا تعلق روز قیامت ہی سے ہے اور "الیہ قلبون" اسی مضمون کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔ یعنی جب کہ ہم سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے اور وہی اعمال کا حساب لینے والا ہے تو عذاب و رحمت بھی اسی کے اختیار میں اور اسی کے ارادے سے ہوگی۔

یہ بھی بعید نہیں ہے کہ اس آیت میں عذاب و رحمت وسیع تر معنی میں جن دنوں دنیا و آخرت دونوں کا عذاب و رحمت شامل ہو۔ یہ نکتہ بھی روشن ہے کہ "من یشاء" (وہ جسے چاہے گا) سے مراد وہ مشیت الہی ہے جو حکمت سے ہم آہنگ ہے۔ یعنی وہ جسے مستحق عذاب و رحمت سمجھے گا۔ کیونکہ مشیت الہی انہی نہیں ہے بلکہ وہ ہر شخص کے استحقاق کے مطابق ہے۔

کلمہ "قلبون" کا مادہ "قلب" ہے۔ اس کے وضع معنی میں، کسی چیز کی صورت کو بدل دینا۔ چونکہ قیامت کے دن انسان خاک بے جان کی صورت سے ایک ایسے زندہ موجود کی شکل اختیار کر لے گا جو ایک موٹو و مکمل ہوگا لہذا اس کی تعبیر آفریش کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن ہے کہ کلمہ "قلبون" سے اس نکتہ کی طرف اشارہ ہو کر ملنے آخرت میں انسان اس طرح دگرگوں اور منتقل ہو جائے گا کہ اس کا باطن ظاہر ہو جائے گا۔ اور اس کے دل کے بھید آشکارا ہو جائیں گے۔ سورہ طارق کی آیت ۹ "یوم تبلی السرائر" (وہ دن جب کہ دل کے بھید کھل جائیں گے، ان معنی سے ہم آہنگ ہے۔

اس بحث کو مکمل کرتے ہوئے کہ عذاب اور رحمت خدا کے اختیار میں ہے اور سب لوگوں کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ یہ اضافہ

کیا گیا ہے: اگر تم یہ خیال کرو کہ تم خدا کی حکومت سے باہر نکل جاؤ گے اور اس کا دست عدالت تمہارا گریبان نہ پکڑے گا۔ تو تم سخت غلطی پر ہو۔ کیونکہ تم خدا کے ارادے پر ہرگز غالب نہیں آ سکتے اور اس کے دائرہ اختیار سے زمین یا آسمان میں فرار نہیں کر سکتے: "وما آنتو بمعجزین فی الارض ولا فی السماء"۔

اور اگر تم سمجھتے ہو کہ کوئی سرپرست اور مددگار اس وقت تمہاری یاد ہی کرے گا تو یہ بھی بعض غلط فہمی ہے۔ کیونکہ تمہارے لیے خدا کے علاوہ کوئی دلی اور یاد نہیں ہے: (وما لکم من دون اللہ من ولی ولا نصیر)۔

درحقیقت خدا کے عذاب سے اسی وقت نجات مل سکتی ہے کہ یا تو تم اس کی حکومت سے باہر نکل جاؤ۔ یا اس کے دائرہ فرمان روائی میں رہ کر دوسروں کا سہارا لے کر اپنے آپ کو بچاؤ مگر نہ تو اس کی سلطنت سے باہر نکلنا ممکن ہے، کیونکہ ہر مقام پر اسی کی حکومت ہے اور تمام عالم ہستی اسی کا وسیع ملک ہے) اور نہ کسی میں یہ صلاحیت ہے کہ اس کی قدرت کے مقابلے میں علم اختیار بلند کرے یا کوئی تمہاری مدافعت کر سکے۔

دو سوال اور ان کا جواب:

پہلا سوال یہ ہے کہ اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ اس آیت میں مشرکین اور کفار سے خطاب ہے اور یہ لوگ زمین کے ساکن ہیں تو یہ کتنا کہ "ولا فی السماء" کیا معنی رکھتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تعبیر ایک طرف کی تاکید اور ثبالت ہے۔ یعنی تم نہ تو حدود زمین میں خدا کے احاطہ قدرت سے نکل سکتے ہو اور نہ آسمانوں میں۔ یعنی بالفرض اگر تم اتنی قدرت رکھتے ہو کہ آسمان پر چڑھ جاؤ تو پھر بھی اس کے دائرہ قدرت ہی میں رہو گے۔ یا یہ کہ نہ تو تم اہل زمین کے وسیلے سے خدا کو اس کی مشیت میں عاجز کر سکتے ہو اور نہ اپنے ان پیروؤں کے وسیلے سے جنہیں تم سمجھتے ہو کہ وہ آسمانوں میں ہیں۔ جیسے فرشتے یا جنات البتہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ "ولی" اور "نصیر" میں کیا فرق ہے؟ علامہ طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں لکھا ہے کہ "ولی" وہ ہے جو بغیر درخواست کے انسان کی مدد کرے۔ لیکن "نصیر" عمومیت رکھتا ہے۔ وہ کبھی درخواست پر اور کبھی بغیر درخواست کے مدد کرتا ہے۔ ان دونوں کلمات کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ "ولی" وہ سرپرست ہے جو بدون تقاضا مدد کرتا ہے اور "نصیر" اس فریاد رس اور یاد رکھتے ہیں جو طلب اور درخواست کے بعد انسان کی مدد کرتا ہے۔

اس عنوان سے قرآن میں ان جرموں کے لیے مجازات الہی سے فرار کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔

خدا آیت مابعد میں بطور قطع فرماتا ہے کہ: جو لوگ آیات الہی اور اس کی اٹھا کے منکر ہوئے وہ میری رحمت سے مایوس ہیں:

"معجزین" کا مادہ "عجز" ہے۔ اس کے معنی کسی چیز سے بچنے نہ جاننے کے ہیں۔ لہذا ان لوگوں کے دقت (جو کچھ دیکھ کر جانے کا باعث ہوتی ہے)

اس کلمہ کا استعمال کرتے ہیں جو وہ شخص ہے جو دوسرے کو مبرا کرنے میں لگے اور وہی کی قلوب وقت بجا کر لے لے یا بیجا کر لے لے عام کر دیتا ہے، اسے بھی سمجھتے ہیں

(والذین كفروا بآيات الله ولقاءه أولئك يا سوا من رحمتي)۔

اس کے بعد تاکید کے طور پر یہ اضافہ کیا گیا ہے۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (و أولئك لهم عذابا ليليم)۔
یہ عذاب الیم رحمت خدا سے مایوس ہونے کا لازم ہے۔

”آیات اللہ“ یا ”آیات تکوینی“ سے نظام آفرینش میں غلطی الہی کے آثار مراد ہیں۔ اس سورت میں ان کلمات سے اشارہ مسئلہ توحید کی طرف ہو گا۔ جبکہ ”لقاءہ“ سے اشارہ مسئلہ معاد کی طرف ہے۔

یعنی منکر سہا بھی ہیں اور منکر معاد بھی۔

یا۔۔۔ آیات اللہ سے آیات تشریحی مراد ہیں۔ یعنی وہ آیات جو خدا نے اپنے پیغمبروں پر نازل کیں۔ جن میں مبدء و معاد اور نبوت کا ذکر ہے۔ اس سورت میں کلمہ ”لقاءہ“ اسی طرح کی تعبیر ہے جیسے خاص کے بعد عام کا ذکر کیا جائے۔

اس کا امکان بھی ہے کہ ”آیات اللہ“ سے وہ تمام آیات الہی مراد ہوں جو عالم آفرینش اور احکامات تشریحی میں ہیں۔

اس نکتہ کا ذکر بھی لازم ہے کہ ”یسوا“ (وہ مایوس ہو گئے) فعل ماضی ہے۔ ہر چند کہ محض و کلام زمانہ آئندہ یعنی روز قیامت کیوں کہ عربوں کا شیعہ کلام یہ ہے کہ وہ حادثہ آئندہ۔ جو سو فیصد حتم الیقین ہو اس کے لیے فعل ماضی استعمال کرتے ہیں۔

۲۴۔ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا اقْتُلُوهُ أَوْ حَرِّقُوهُ

فَأَنجَاهُ اللَّهُ مِنَ النَّارِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ

۲۵۔ وَقَالَ إِنَّمَا اتَّخَذْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ

فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُم بِبَعْضٍ

وَيَلْعَنُ بَعْضُكُم بَعْضًا وَمَأْوَاكُمُ النَّارُ وَمَالِكُمْ

مِّن نَّصِيرِينَ ۝

۲۶۔ فَأَمِّنَ لَهُ لُوطٌ وَقَالَ إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَىٰ رَبِّي إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ

الْحَكِيمُ

۲۷۔ وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَ

الْكِتَابَ وَأَتَيْنَاهُ آجْرَهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ

الصَّالِحِينَ ۝

ترجمہ

۲۴۔ لیکن اُس (ابراہیم) کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اُسے قتل کر دو یا جلا دو۔ مگر خدا نے اُسے آگ سے نجات بخشی اور اس واقعے میں ایمان لانے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

- ۲۵۔ ۱۱) ابراہیم نے کہا: تم نے خدا کو چھوڑ کر، پیسے لیے بُتوں کو انتخاب کیا ہے تاکہ یہ تمہارے لیے دنیا کی زندگی میں بخت اور دوستی کا سبب ہوں مگر تم بروز قیامت ایک دوسرے کی دوستی سے انکار کر دو گے۔ اور ایک دوسرے پر لعنت بھیج گے۔ اُس روز تمہارا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور کوئی تمہارا مددگار نہ ہوگا۔
- ۲۶۔ پس اُس (ابراہیم) پر لوط ایمان لایا۔ اور (ابراہیم نے) کہا: میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں۔ بے شک وہ غالب اور حکمت والا ہے۔
- ۲۷۔ اور ہم نے اُسے اسحق اور یعقوب عطا کیا اور اُس (ابراہیم) کے خاندان میں نبوت اور کتاب عطا کی اور دُنیا میں اُس کا اجر دیا اور وہ آخرت میں صالحین میں سے ہوگا۔

تفسیر

حضرت ابراہیمؑ کو مشکببین کا طرز جواب:

اب ہم اس مقام پر ہیں کہ یہ دیکھیں کہ اُس گم راہ قوم نے حضرت ابراہیمؑ کے ان تین دلائل کا جو توحید، نبوت اور مہاد کے متعلق تھے کیا جواب دیا۔ ان کے پاس کوئی مدلل جواب تو تھا نہیں لہذا انہوں نے دیگر تمام سمنہ زور بے منطقی دماغشوں کی طرح اپنی شیطانی طاقت کا سہارا لیا۔ اور حضرت ابراہیمؑ کو تہمت کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا۔ جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے: ابراہیم کی قوم کے پاس اس کے ہوا کوئی جواب نہ تھا کہ اسے (ابراہیم کی) قتل کر دو یا جلا دو: (فما کان جواب قومہ الا ان قالوا اقتلوه او حرقوه)۔

قرآن کے اس طرز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کی تو یہ رائے تھی کہ ابراہیمؑ کو جلا دیا جائے اور کچھ یہ تجویز پیش کر رہے تھے انہیں تلوار کیسی اور ذریعے سے قتل کروایا جائے۔ آخر کار پہلے گروہ کی رائے مان لی گئی کیونکہ وہ قوم یہ سمجھتی تھی کہ کسی کو مارنے کا بدترین طریقہ یہی ہے کہ اُسے جلا دیا جائے۔ اس مقام پر یہ احتمال بھی موجود ہے کہ ابتداء میں اُس قوم کے لوگ حضرت ابراہیمؑ کو عام طریقے سے قتل کرنا چاہتے تھے مگر بعد میں وہ سب اس پر متفق ہو گئے کہ انہیں جلا دیا جائے اور انہیں شدید ترین عذاب دیا جائے۔

اس آیت میں یہ ذکر نہیں آیا کہ حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں کس طرح جلا دیا گیا تھا۔ ہم اس جگہ صرف یہ پڑھتے ہیں کہ خدانے انہیں آگ سے نجات بخشی: (فاخذاہ اللہ من النار)۔

حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے کی تفصیل سورہ انبیاء کی آیات ۶۸ تا ۷۰ میں مذکور ہے۔ جس پر ہم نے تفسیر نمونہ کی تیسری جلد میں مفصل بحث کی ہے۔

آیت کے آخر میں یہ اضافہ ہے کہ اس باہرے میں ایمان لانے والوں کے لیے نشانیاں ہیں: (ان فی ذلک لآیات لقوم یؤمنون)۔ صرف ایک نشانی ہی نہیں بلکہ اس واقعے میں بہت سی نشانیاں موجود ہیں۔ کیونکہ ایک طرف تو یہ روشن معجزہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کے جسم پر آگ کا اثر نہ ہوا، (اور جیسا کہ مشہور ہے) آگ گلستان میں تبدیل ہو گئی۔ یہ دوسرا معجزہ تھا۔

تیسرا معجزہ یہ تھا کہ وہ زبردست اقتدار کے حامل لوگ ایک ایسے فرد کے مقابلے میں جس کا ہاتھ ہر وسیلہ ظاہری سے خالی تھا

قلبی عاجز اور ناتواں ثابت ہوئے۔

اس عجیب غیر معمولی حادثے کا اُن سیاہ دلوں کی طبیعت پر کچھ اثر نہ ہوا، یہ بھی قدرت الہی کی ایک نشانی ہے۔ وہ لوگ کہ خدانے اس نمائندہ اور مخالف حق قوم کے افراد سے توفیق خیر کو اس طرح سلب کر لیا تھا کہ بڑی سے بڑی نشانوں کا بھی اُن پر اثر نہ ہوتا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ - جس وقت حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر آگ میں پھینکا گیا تو جو چیز جلی وہ صرف وہی ہی تھی جس سے آپ کو باندھا گیا تھا بلکہ۔

ہاں، ٹھیک ہے کہ اُن دشمنانِ حق کی آتش بُرم و جہالت نے اُن چیزوں کو جلا دیا جس میں حضرت ابراہیمؑ کو قید کیا گیا تھا اور وہ آزاد ہو گئے۔ اور یہ بھی ایک نشانی ہے۔ شاید اِن درجہ کی بنا پر - حضرت نوحؑ اور بذریعہ کشی اُن کی نجات کے تقصیر میں تجملناھا آیہ " بصورت مفرد، کہا گیا ہے اور اس مقام پر " لآیات " بصورت جمع آیا ہے۔

بہر حال حضرت ابراہیمؑ نے اُس آگ سے بر لطف الہی معجزانہ طور پر نجات پائی۔ اُس کے بعد صرف یہی نہیں ہوا کہ آپ اپنے مقاصد نبوت اور ہدایت کی تبلیغ سے دست بردار نہیں ہوئے بلکہ اس کے برعکس آپ نے اور بھی زیادہ جوش اور سرگرمی سے تبلیغ شروع کر دی حضرت ابراہیمؑ نے اپنی مشرک قوم سے کہا: تم نے خدانے برحق کو چھوڑ کر اپنی عبادت کے لیے بُتوں کو اختیار کر لیا ہے تاکہ وہ دُنیاوی زندگی میں تمہارے درمیان دوستی اور محبت کا سبب بنیں لیکن تم متنبہ رہو کہ بروز قیامت تمہارا باہمی رشتہ محبت باطل منقطع ہو جائے گا اور تم میں سے ہر ایک دوسرے کا انکار کر دے گا اور تم آپس میں ایک دوسرے پر لعنت اور نفرین کر دو گے۔ پس تم سب کا مقام جہنم ہے۔ اُس روز تمہارا کوئی بھی مددگار نہ ہوگا: (وقال انما اتخذتم من دون اللہ اوثاناً مودّۃً بینکم فی الحیوۃ الدنیا ثم یوم القیامۃ یکف بعضکم ببعض ویلعن بعضکم بعضاً ومأواکم النار وما لکم من ناصرین)۔

بُتوں کا انتخاب بُت پرستوں کے درمیان مؤذت کا سبب کس طرح ہوتا تھا؟

اس سوال کا چند پہلوؤں سے جواب دیا جا سکتا ہے:

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر قوم یا قبیلہ جب ایک ہی بُت کی پرستش کرتا تھا تو اُن میں باہمی وحدت اور یکجہت کا احساس پیدا ہوتا تھا۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ اُس زمانے میں ہر قوم اور ہر قبیلہ کا ایک مخصوص بُت ہوتا تھا۔ چنانچہ عرب میں زمانہ جاہلیت میں ہر بُت کسی شہر یا قبیلے سے منسوب تھا۔ " اُن میں سے بُت " عُزَیْ " خصوصاً قریش سے منسوب تھا۔ " لاتی " قبیلہ ثقیف کا - اور - " منات " اوس و خزرج کا تھا۔

دوسرے یہ کہ بُتوں کی پرستش اُس قوم کا اُن کے اجداد اور بزرگوں سے تعلق قائم رکھتی تھی۔ غالباً دینِ حق کو قبول نہ کرنے کے لیے

۱۔ تفسیر روح المعانی جلد ۲، صفحہ ۱۳۔
 ۲۔ "مودّۃً بینکم" کے منسوب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ " لا یجملہ " کا منقول ہے۔ اس ضمن میں مفسرین نے اور بھی احتمالات بیان کیے ہیں۔
 ۳۔ سیرت ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۸۶-۸۷۔

ازی و جرسے وہ یہ غزرتے تھے کہ یہ بُت جماعے بزرگوں کی یادگار ہیں اور ہم ان ہی کی پیروی کرتے ہیں۔
علاوہ بریں کفار کے سردار اور بزرگ اپنے پیروؤں کو بُتوں کی پرستش کی ترغیب دیتے تھے۔ اور ان سرداران قوم اور ان کے پیروؤں کے درمیان یہی ملتہ اتصال تھا۔

لیکن قیامت میں یہ تمام بروج اور کوزرہ رشتے منقطع ہو جائیں گے اور ہر آدمی اپنا گناہ دوسرے کے سر ڈالے گا اور اُس پر لعنت اور نفرین کرے گا اور اس کے عمل سے اظہار بیزاری کرے گا۔ سچی کہ ان کے وہ معبود (بُت) جن کے متعلق اُن کا خیال خام یہ تھا کہ وہ اُن کے لیے خُدا سے ارتباط کا وسیلہ ہیں اور جن کی بابت وہ یہ کہا کرتے تھے:

مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ

ہم تو ان کی محض اس لیے پرستش کرتے تھے کہ وہ ہمیں خدا سے نزدیک کر دیں گے۔ (زر ۳)
بروز قیامت پر پرستار اُن سے بھی اظہار بیزاری کریں گے۔

جیسا کہ سورہ مريم کی آیت ۸۲ میں ہے:

كَلَّا سَيَكْفُرُونَ بِعبَادَتِهِمْ وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا

وہ معبودان باطل بہت جلد اپنے بچاریوں کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور اُن کے مخالف ہو جائیں گے۔

اور بروز قیامت ایک دوسرے کے انکار، ایک دوسرے پر لعنت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اُس روز مشرکین ایک دوسرے سے بیزاری کریں گے اور وہ چیز جو دُنیا میں اُن کی بے اصل وجہ بُناو محبت کا سبب تھی وہ آخرت میں اُن کے لیے باہمی عداوت اور بُغض کا باعث بن جائیں گی۔ جیسا کہ سورہ زخرف کی آیت ۶۷ میں فرمایا گیا ہے:

الْاِخْلَافَ يَوْمَئِذٍ لِّبَعْضِهِمْ لِبَعْضٍ عَدُوًّا لِّمُتَّبِعِيْنَ

اُس روز دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔ مگر پرہیزگار (نہیں ہوں گے)۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف بُت پرستوں ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ وہ تمام لوگ بھی اس میں شامل ہیں، جنہوں نے دُنیا میں باطل امام اور باطل پیشوا چنا ہے اور اس کی پیروی کرتے ہیں اور اُس سے پیمان سوڈت باندھتے ہیں۔

یہ سب بھی قیامت میں ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے اور ایک دوسرے سے اظہار بیزاری کریں گے اور ایک دوسرے پر لعنت کریں گے۔

مومنین کا باہمی پیوند محبت جس کی بُناو اس دُنیا میں توحید، خدا پرستی اور اطاعتِ فرمانِ حق پر ہے، وہ ہمیشہ برقرار رہے گا اور وہاں اور زیادہ محکم ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بروز قیامت مومنین ایک دوسرے کے لیے استغفار و شفاعت کریں گے۔ جب کہ مشرکین ایک دوسرے پر لعنت کرنے میں مشغول ہوں گے۔

اس کے بعد کی آیت ۲۶ میں حضرت لوطؑ کے ایمان لانے کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، لوط ابراہیمؑ پر ایمان لائے:

لَمَّا اصْبَلُكَ فَانْقَلَبْ يَوْمَئِذٍ الْكَافِرِينَ جلد ۲ ص ۱۵۳ سے کتاب توحید، شیخ صدوق نقل شدہ مطابق نور الثقلین جلد ۳ ص ۱۵۳

(فامن لہ لوط)۔

حضرت لوطؑ خود پختہ بزرگ میں سے تھے اور حضرت ابراہیمؑ کے قریبی رشتہ دار تھے (کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کے چالیسویں، اگر ایک مرد بزرگ کسی پختہ پر ایمان لائے اور اُس کے احکام کی پیروی کرے تو اس کا ایمان لانا ایک اُمت و ملت کے ایمان لانے کے مترادف ہے۔ خدانے یہاں خصوصیت سے حضرت لوطؑ کے ایمان لانے کا ذکر کیا ہے جو ایک عظیم شخصیت حضرت ابراہیمؑ کے معاصر تھے تاکہ یہ امر واضح ہو جائے کہ جب ایسا شخص ایمان لے آیا تو اذل الناس کا ایمان نہ لانا کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔

البتہ یہ قیاس ہوتا ہے کہ شہر بابل میں حضرت ابراہیمؑ کی دعوت کو قبول کرنے کے لیے آمادہ دل موجود تھے۔ جنہوں نے اُس معجزہ عظیم کو دیکھ کر آپ کی اتباع کی۔ مگر یقیناً وہ لوگ اقلیت میں تھے۔

اس کے بعد یہ اضافہ فرمایا گیا ہے: ابراہیمؑ نے کہا میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کر رہا ہوں کیونکہ وہ عزیز و حکیم ہے: (وقال انی مهاجر الی ربی اتہ هو العزیز الحکیم)۔

ظاہر ہے کہ جس وقت زمین ان الہی کسی مقام پر اپنا فرض رسالت انجام دیتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ وہ معاشرہ اور سارا ماحول اس قدر آلودہ و مشرک و جہل ہے اور ظالموں کے دباؤ میں ہے کہ اُن کی دعوت حق کا اُس مقام پر پھیلنا ناممکن ہو گیا ہے تو وہ وہاں سے کسی اور جگہ ہجرت کر جاتے ہیں تاکہ اُس مقام پر دعوت الہی کو پھیلائیں۔

اس لیے حضرت ابراہیمؑ بھی شہر بابل سے حضرت لوطؑ اور اپنی امیر کو ساقطے کر "خطہ انبیا و توحید" یعنی تک شام کی طرف سفر کر گئے تاکہ آپ وہاں ایک جماعت پیدا کر سکیں اور دعوت توحید کو وسعت دے سکیں۔

حضرت ابراہیمؑ کا یہ جملہ کہ میں اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہا ہوں، قابلِ توجہ ہے آپ نے یہ جملہ اس لیے کہا کہ یہ راہ، راہ پروردگار، اُس کی رضا کی راہ اور راہِ دین و آئین تھی۔

اگر فعل "قال" (کہا) کا مراد حضرت لوطؑ ہوں۔ یعنی یہ معنی ہوں کہ "لوطؑ نے کہا کہ میں اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہا ہوں" تو سیاق عبارت اس مفہوم سے مراد ہے۔ مگر تاریخی اور قرآنی شواہد یہ بتاتے ہیں کہ "کہا" فعل میں ضمیر غائب کا مراد حضرت ابراہیمؑ ہی ہیں اور حضرت لوطؑ نے اُن کے ساتھ ہجرت کی تھی۔

اس قول کی تائید سورہ صافات کی آیت ۹۹ سے بھی ہوتی ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ کا یہ قول موجود ہے:

انّی ذاہب الی سرّی سیمدین

میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں اور وہ میری راہنمائی کرے گا۔

زیر بحث آیات میں سے آخری آیت میں اُن چار نعمات الہی کا ذکر ہے جو خدانے ہجرت کے بعد حضرت ابراہیمؑ کو عطا کیں۔ پہلی نعمت لائق اور محترم بیٹے تھے۔ ایسے فرزند جنہیں یہ توفیق ارزانی ہوئی تھی کہ حضرت ابراہیمؑ کے خاندان میں ایمان اور نبوت کا چراغ روشن رکھ سکیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے بابل سے ملک شام کو ہجرت کرنے کی تفصیل بحث سورہ انبیا کی آیت ۷۱ کے ذیل میں تفسیر نمونہ جلد ۹ میں بیان ہوئی ہے

پنانچہ خدا فرماتا ہے : ہم نے اُسے اسحاق اور یعقوب بخشا (ووهبنا له اسحق و يعقوب)۔

یہ دونوں نہایت بزرگ اور لائق پیغمبر تھے۔ ان میں سے ہر ایک حضرت ابراہیمؑ کی راہ بت شکنی پر چلتا رہا۔

دوسری نعمت یہ کہ نبوت اور کتاب آسمانی خاندان ابراہیمؑ ہی کے اندر مخصوص ہو گئی : (وجعلنا فی ذریتہ النبوة والکتاب)۔

صرف اسحاق و یعقوب (یعقوب اسحاق کے بیٹے تھے) ہی پیغمبر نہ تھے بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے خاندان میں رسالتاً تمام الانبیاء ہم رسالت کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی خاندان میں کیے بعد دیگرے بزرگ پیغمبر پیدا ہوتے رہے جنہوں نے دُنیا کو دُور توحید سے متوڑ کیا۔ تیسرے یہ کہ "ہم نے اُسے دُنیا میں بھی ہلکے دیا : (واوتیناه اجرہ فی الدنیا)۔

اس دُنیاوی اجر کا ذکر اشارتاً ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مختلف امور کی طرف اشارہ ہو۔ مثلاً نام نیک اور تمام اُمتوں میں آپ کا ذکر بطور احترام کیونکہ تمام اُمتیں حضرت ابراہیمؑ کا ایک اولوالعزم پیغمبر کے طور پر احترام کرتی ہیں اور آپ کے وجود پر فخر کرتی ہیں اور انہیں شیخ الانبیاء کہتی ہیں۔

نیز یہ کہ سرزمین مکہ آپ کی دُعا سے آباد ہوئی۔ اور ہر سال مراسم حج ادا کرتے ہوئے تمام حجاج کے دل آپ کی طرف کھینچتے ہیں۔ اور سب لوگ آپ کے پُرسکھوہ ایمان آفرین اور نیک ارادوں کو یاد کرتے ہیں۔ (یعنی خانہ کعبہ کو دیکھ کر اُس کے بانی کی یاد آتی ہے) گویا کہ یہ بھی ایک اجر ہے جو حضرت ابراہیمؑ کو دُنیا میں ملا۔

چوتھا اجر یہ ہے کہ آخرت میں اُن کا شمار صالحین میں ہوگا : (وانتہ فی الآخرۃ لمن الصالحین)۔ اور یہ سب باتیں یکجا ہو کر حضرت ابراہیمؑ کے لیے باعث افتخار ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ عظیم ترین افتخار : جیسا کہ قرآن کی بہت سی آیات سے ثابت ہوتا ہے کسی انسان کا صالحین میں شمار ہونا اُس کے لیے منتہائے افتخار ہے۔ اس لیے پیغمبروں میں سے بہت سے خُدا سے متنا کرتے تھے کہ وہ انہیں صالحین میں جگہ دے۔ حضرت یوسفؑ ظاہری شان و شوکت کے انتہائی مدارج پر پہنچنے کے بعد خُدا سے یہ دُعا کرتے تھے :

توفیقی مسلماً والحقنی بالصالحین

اے خُدا تو مجھے اس حالت میں موت دے کر میں مسلمان ہوں اور بعد مرگ تو مجھے صالحین سے ملحق کر دے۔ (سورہ یوسف - ۱۰۱)

حضرت سلیمانؑ بھی اپنی پوری حشمت اور جاہ و جلال کے باوجود خُدا سے یہ دُعا کرتے ہیں :

أدخلنی برحمتک فی عبادک الصالحین

اے خُدا ! تو مجھے اپنی رحمت سے اپنے صالح بندوں میں داخل کر۔ (نمل - ۱۹)

حضرت شیث کا جب موسیٰ سے عہد و پیمان ہوتا ہے تو فرماتے ہیں :

سنبجذنی ان نشاء اللہ من الصالحین

ان شاء اللہ تو مجھے صالحین میں سے پائے گا۔ (قصص - ۱۷)

حضرت ابراہیمؑ بھی خُدا سے یہی دُعا کرتے ہیں کہ اُن کا شمار زمرہ صالحین میں ہو :

رب ھب لی حکماً والحقنی بالصالحین (شعرا - ۸۳)

حضرت ابراہیمؑ یہ دُعا بھی کرتے ہیں کہ اُن کی اولاد صالح ہو :

رب ھب لی من الصالحین (صافات - ۱۰)

قرآن شریف کی بہت سی آیات میں یہ مضمون ملتا ہے کہ جب خُدا بے مبران بزرگ کی مدح کرتا ہے تو اُن کی تعریف میں کہتا ہے کہ وہ صالحین میں سے ہیں۔

ان نکل آیات کے مطالعے سے یہ حاصل ہوتا ہے کہ انسان کا عالی ترین مرتبہ کمال صالح ہونا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ "صالح ہونا" کیا معنی رکھتا ہے ؟ اُس کے معنی ہیں : اعتقاد و ایمان کے لحاظ سے عظمت و پاکیزگی، اسی طرح عمل اور گفتار و اخلاق کے لحاظ سے بھی مراد یہ ہے کہ مرد صالح وہ ہے جو اپنی فکر، کردار اور گفتار غرض ہر طرح سے نیک ہو۔

"صالح" کی ضد "فاسد" ہے۔ یہ واضح ہے کہ زمین پر فساد کرنے میں تمام ظلم و ستم اور تمام بد اعمالیاں شامل ہیں۔

قرآن مجید میں کلمہ "صالح" "فساد" کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے۔ اور کبھی "سیدۃ" کے مقابلے میں بھی آیا ہے۔ جن کے معنی ہیں گناہ اور بدی۔

۲۔ حضرت ابراہیمؑ پر خُدا کی عظیم برکات : بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت میں ایک لطیف نکتہ موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ :

خُدا نے حضرت ابراہیمؑ کے تمام تکلیف دہ حالات کو اُن کی ضد میں تبدیل کر دیا۔ چنانچہ

بابل کے بُت پرست یہ چاہتے تھے کہ انہیں آگ میں جلا دیں۔ مگر وہ آگ اُن کے لیے گھڑا ہو گئی۔

وہ مشرک یہ چاہتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ کا کوئی رفیق نہ ہو اور وہ تمنا رہیں۔ مگر خُدا نے انہیں ایسی جمعیت اور کثرت بخشی کہ دُنیا اُن کی نسل سے بھر گئی۔

اُن کے بعض نزدیک ترین رشتہ دار گمراہ اور بُت پرست تھے۔ اُن میں سے "آزر" بھی تھا۔ خُدا نے اس کے عوض انہیں ایسے فزند عطا کیے جو خود ہدایت یافتہ اور دوسروں کے لیے ہادی بھی تھے۔

حضرت ابراہیمؑ اپنے ابتدائے حال میں مال و دولت نہ رکھتے تھے مگر اللہ نے انہیں عظیم مال و جاہ عطا کیا۔

حضرت ابراہیمؑ شروع شروع میں ایک گناہ انسان تھے۔ یہاں تک کہ بابل کے مشرک جب اُن کا ذکر کرتے تھے تو کہتے تھے :

سمعتی یذکرہ یقال لہ ابراہیم
ہم نے سنا ہے کہ ایک نوجوان بچوں کی باتیں کرتا ہے۔ لوگ اس کا نام ابراہیم
بتاتے ہیں۔

مگر خدا نے اُن کا نام ایسا روشن کیا اور اُنھیں ایسی شہرت بخشی کہ اُنھیں سردار انبیاء اور سردارِ مسلمین کہا جاتا ہے یہ

۲۸۔ وَلَوْطَاذًا قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ
بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِنَ الْعَالَمِينَ ۝

۲۹۔ أَلَيْسَ لَكُمْ لَتَاتُونَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ وَتَأْتُونَ فِي
نَادِيكُمُ الْمُنْكَرَ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا

أَتَيْنَا الْعَذَابَ اللَّهُ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝

۳۰۔ قَالَ رَبِّ انصُرْنِي عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِينَ ۝

ترجمہ

۲۸۔ (ہم نے لوط کو بھیجا) جب اُس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم بے حیائی کا کام کرتے ہو۔ تم سے پہلے
دُنیا میں کسی نے یہ کام نہیں کیا۔

۲۹۔ کیا تم مردوں کے پیچھے جاتے ہو اور راہِ نسلِ انسانی کو قطع کرتے ہو۔ اور اپنی مجلسوں میں بُرے
اعمال انجام دیتے ہو۔ مگر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اُر تو سنا ہے تو ہم پر خدا
کا عذاب نازل کر دے۔

۳۰۔ (لوط نے) کہا: اے میرے رب! تو اس مفسد قوم کے مقابلے میں میری مدد کر۔

تفسیر

بے شرم گناہ گار:

اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیمؑ کا منقرضہ واقعہ بیان کرنے کے بعد اُن کے ہم عصر پیغمبر حضرت لوطؑ کا کچھ قصہ بیان کرتا ہے۔
چنانچہ فرماتا ہے: ہم نے لوط کو سبوت کیا۔ اُس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم بہت ہی بُرا کام کرتے ہو۔ دُنیا میں کسی نے سبوت

اس سے پہلے اس گناہ کا کام نہیں کیا : (وَلَوْ طَآذِقَال لَقَوْمَةً اَتَكُونَتَاوْنِ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكَ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِنَ الْعَالَمِيْنَ)

"فاحشہ" کا مادہ "فحش" ہے۔ اس کے وضعی معنی ہر وہ کام یا بات ہے جو نہایت نازیبا اور ناپسندیدہ ہو۔ اس مقام پر ہم جنسی اور لواطت کے لیے کنایہ ہے۔

تاسبقکوبہا من احد من العالمین سے تذب واضح ہوتا ہے کہ یہ گھٹیا اور شرمناک عمل عمری اور قومی خصلت کی صورت میں اس سے قبل کسی قوم و ملت میں ہی موجود نہ تھا۔

قوم لوط کے حالات میں متوجہین نے لکھا ہے کہ ان کے اس گناہ میں نسبتاً ہونے کا سبب یہ تھا کہ وہ لوگ نہایت بچل تھے۔ چونکہ ان کے شہزادوں کو جانے والے قافلوں کی راہ پر واقع تھے۔ انھوں نے بعض راہ گروں اور ہمالوں کے ساتھ یہ عمل انجام دینے کی وجہ سے انھیں اپنے آپ سے متنفر کر دیا۔ لیکن رفتہ رفتہ ہم جنسی کے میلانات خود ان ہی میں قومی ہو گئے اور وہ لواطت کی دلدل میں پھنس گئے۔

بہر حال وہ لوگ نہ صرف اپنے گناہوں کا بار اٹھائیں گے بلکہ ان کے گناہوں کا بھی جو آئندہ ان کے عمل کی پیروی کریں گے (اس کے بغیر کہ ان کے گناہ میں کوئی کمی تھا کیونکہ جو آدمی بھی کسی گندی اور پلیدی رسم کی بنیاد رکھتا ہے، وہ اپنے مقلدین کی بد اعمالی میں حصہ دار ہوتا ہے اور وہ لوگ اس رسم بد کے بانی تھے۔

حضرت لوط نے اس کے بعد اپنے مفہم کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کیا اور کہا کہ آیات مردوں کے پیچھے جاتے ہو : (اِنَّكُمْ لَتَاوْنُوْنَ الرِّجَالَ)

اور کیا تم نسل انسانی کی بقا کی راہ کو قطع کرتے ہو : (وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ) اور کیا تم اپنے ان مقامات پر جہاں تم جمع ہوتے ہو بڑے اعمال کے مرکب ہوتے ہو : (وَتَاوْنُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمْ الْمُنْكَرَ)۔ کلمہ "نادی" کا مادہ "ندا" ہے۔ اس کے معنی میں مجلس عمومی۔ اور کبھی تعزیر گاہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ جب ایسے مقام پر لوگ جمع ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کو آواز دیتے اور پکارتے ہیں۔

قرآن میں اس کی کوئی تفصیل موجود نہیں کہ وہ اپنی مخلوق میں کون سے بڑے اعمال کا ارتکاب کرتے تھے۔ لیکن بدون انکار ہی یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ کچھ ایسے کام تھے جو ان کی بدکاریوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اور جیسا کہ بعض تاریخوں میں منکر ہے کہ وہ آپس میں فحش اور رکیک الفاظ کا رد و بدل کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی کمرٹھکتے تھے، جوا کھیلنے تھے، بچکانہ کھیل کھیلتے تھے۔ بالخصوص ایک لہ "لَوْطًا" ممکن ہے کہ "لَوْحًا" پر صفت ہو۔ اس بنا پر ارسلنا "کا مفعول ہو گا۔ بعض لوگوں نے لَوْطًا کو لفظ "معد" اذکور کا مفعول سمجھا ہے۔

بعض مفسرین نے قَطْعُوْنَ السَّبِيْلَ کی تفسیر میں اور بھی اختلاف کا ذکر کیا ہے۔ اس قوم کی تاریخ پر نظر کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اس قوم نے قافلوں کا راستہ روک دیا تھا۔ کیونکہ ان کا وہاں کے لیے اس قوم کے شرے بچنے کے لیے سولے اس کے ادراک کی چارہ نہ تھا کہ فرعون راستے سے چلے۔ ان کے اہل گنہگار نہ ہو جائیں۔ بعض مفسرین نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ وہ قافلوں کو روکتے تھے لیکن ہم نے پہلے جو تفسیر بیان کی وہ مناسب تر ہے۔ کیونکہ قوم لوط کے مصالح میں سے ایک یہ بھی بچنے انسان کے قطع ہوجانے کا خطرہ ہے۔

دوسرے کو اور راہ میروں کو سنگرزے مارتے تھے، آلات موسیقی بجاتے تھے اور سارے مجمع کے سامنے برسنہ جوجاتے تھے بلکہ جناب رسول خدا سے ایک حدیث مروی ہے جس کی راوی ام ہانی ہیں کہ جب آپ سے " وَتَاوْنُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمْ الْمُنْكَرَ " کا مفہوم پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا۔

كَانُوا يَخْذِفُوْنَ مِنْ يَمْرِبِهِمْ وَيَخْرُوْنَ مِنْهُ

جو کوئی اُدھر سے گزرتا وہ اسے سنگرزے مارتے تھے اور اُس سے مذاق کرتے تھے۔

اب اس پر غور کیجئے کہ حضرت لوط کے پیغام حق کے جواب میں اُس گمراہ اور بے شرم قوم کا کیا جواب تھا؟ قرآن میں یہ ذکر ہے کہ : ان کے پاس بجز اس کے کوئی جواب نہ تھا۔

اگر تو سچا ہے تو ہمارے لیے خدا کا عذاب لے آ۔ (فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ اِلَّا اَنْ قَالُوْا اِنَّنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ)۔

ان ہوں بازوں نے اچھو کر عقل و شعور سے محروم تھے، یہ بات حضرت لوط کی مہقول اور مدلل دعوت کے جواب بطور مذاق کہی تھی۔

اس جراس سے یہ بھی مترشح ہے کہ حضرت لوط نے مدلل باتوں کے علاوہ انھیں یہ بھی تنبیہ کی تھی کہ اگر تم اسی باطل روش پر چلے رہے تو تم پر خدا کا دردناک عذاب نازل ہو گا۔ لیکن انھوں نے راہ ہدایت کی باتوں کو تو چھوڑ دیا اور صرف اسی آخری بات کا جواب دینے لگے۔ اور وہ اپنی استہزا اور مسخر کے طور پر۔

سورہ قمر کی آیت ۳۶ میں اسی مفہوم کے مانند بیان ہے :

وَلَقَدْ اَنْذَرْتَهُمْ بِطٰشْتِنَا فَمَا رَوٰا بِالْاٰنْذَرِ

لوط نے اپنی قوم کو ہمارے عذاب سے ڈرایا۔ مگر وہ ڈرانے والوں سے لڑنے لگے۔

اس گمراہ قوم کا یہ قول یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ یہ چاہتے تھے، عذاب نازل نہ ہونے کی صورت میں یہ ثابت کریں کہ حضرت لوط دروغ گو ہیں۔ حالانکہ یہ خدا کی رحمت ہے کہ وہ گنہگار ترین اقوام کو بھی تجویز نظر اور اپنی اصلاح کی مہلت دیتا ہے۔

یہ وہ مقام تھا کہ حضرت لوط بالکل بے بس ہو گئے اور درگاہ الہی میں غم و اندوہ سے بھرے ہوئے دل کے ساتھ عرض کی : خدایا ! تو مجھے اس مسد قوم پر فرج عنایت فرما : (قَالَ رَبِّ اَنْصُرْنِيْ عَلٰی الْقَوْمِ الْمَفْسِدِيْنَ)۔

یہ وہ قوم ہے جس نے زمین کو فساد اور تباہی سے بھر دیا ہے۔ انھوں نے اخلاق اور تقویٰ کو برباد کر دیا ہے۔ عنایت اور پاکر انہی سے شرمناک لیلی ہے۔ عدل اجتماعی کو روند ڈالا ہے۔ مشرک و بت پرستی میں فساد و اخلاق اور ظلم و ستم بھی شامل کر لیا ہے اور نسل انسانی کو فنا اور نیستی کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ خدایا ! تو ان مفسدین پر مجھے کامیابی عنایت فرما۔

ط مسقیة البحار، جلد ۲، صفحہ ۵۱۷۔

تفسیر مستطی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

ہم جنسی کارُحجان بدترین لعنت ہے :

ہم جنسی خواہ مردوں کے درمیان جو (لواطت) یا عورتوں کے (مناسختہ) وہ ان بدترین انحرافات اخلاقی میں سے ہے جو معاشرہ میں مفاسد کا سرچشمہ ہیں۔

اصولاً قدرت نے زن و مرد کے مزاج کو اس طرح خلق کیا ہے کہ انہیں جنس مخالف سے تعلق پیدا کرنے میں آسودگی اور نسیانی سکون حاصل ہوتا ہے۔ اس ضرورت کے علاوہ انسان میں جو بھی جنسی میلان پیدا ہوتا ہے وہ انسان کی طبع سلیم سے انحراف اور ایک قسم کی نسیانی بیماری ہے۔ اگر اس میلان کو روکا نہ جائے تو وہ روز بروز شدید تر ہوتا جاتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو اپنی جنس مخالف کی طرف میلان خاطر نہیں رہتا اور وہ پھر جنس موافق ہی سے غیر فطری آسودگی حاصل کرنے لگتا ہے۔

اس قسم کے باہمی نا محسوس تعلقات انسان کے نظام جسمانی حتیٰ کہ اس کے سلسلہ احصاب اور اس کی نفسیاتی کیفیت کو متاثر کرتے ہیں اور جب یہ میلان عادت بن جاتا ہے تو مرد کو ایک کامل مرد اور عورت کو ایک کامل عورت بننے سے روک دیتا ہے۔ اس طرح سے کہ اس قسم کے ہم جنس باز مرد یا عورتیں شہینہ خلقت جنسی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اپنی اولاد کے لیے اچھے ماں باپ ثابت نہیں ہوتے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان میں تو لیدر سسل کی قابلیت ہی نہیں رہتی۔

ہم جنسی کے میلان سے لوگوں میں بترتیب یہ نسیانی مرض پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ خلوت پسند ہو جاتے ہیں، مجمع سے گھبرانے لگتے ہیں، زبان تک کہ وہ اپنی ذات سے بھی بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ نیز یہ کہ ان میں نفسیاتی تشناہ کا مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ آخر یہ تو کبھی اصلاح کی طرف متوجہ نہ ہوں تو مختلف قسم کی جسمانی اور نفسیاتی امراض کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اسلام نے ان ہی اخلاقی اور اجتماعی دلائل کی بنا پر ہم جنسی کو ہر شکل اور ہر صورت میں حرام کیا ہے اور اس کے لیے بڑی سخت سزا مقرر کی ہے (جس کی حد کبھی موت تک پہنچتی ہے)۔

اس سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ اس زمانے کی مستند ذہنیاتی بے لگامی اور متوجہ طلبی بہت سے لوگوں اور لڑکیوں میں نفسیاتی فساد پیدا کر دیتی ہے۔ لڑکوں میں ناموزوں اور زمانہ لباس پہننے اور غلو آرائی کا شوق پیدا ہوتا ہے اور لڑکیوں میں مڑانہ لباس زیب تن کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ یہیں سے نفسیاتی انحراف اور میلان ہم جنسی جنم لیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس رُحجان اور ایسے تلخ ترین اعمال کو قانونی شکل دے دی جاتی ہے اور اسے ہر قسم کی سزا اور تعقیب سے بری سمجھتے ہیں ان حالات کی شرح لکھتے ہوئے قلم کو شرم آتی ہے بلکہ

۱۔ اسلام میں ہم جنس پرستی کی حرمت اور حد و سزا حضرت کے سلسلے میں تعذیبی امت تفسیر نمونہ کی جلد ۹ میں طوطی مجرور کی آیت ۸۱ کے ذیل میں کی جا چکی ہے۔

۳۱۔ وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبَشْرَىٰ قَالُوا إِنَّا مَهْلِكُوا أَهْلَ

هَذِهِ الْقَرْيَةِ إِنْ أَهْلَهَا كَانُوا ظَالِمِينَ ۝

۳۲۔ قَالَ إِنَّ فِيهَا لُوطًا قَالُوا نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَنْ فِيهَا لَنَنْجِيَنَّهٗ

وَأَهْلَهُ إِلَّا امْرَأَتَهُ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ ۝

۳۳۔ وَلَمَّا أَنْ جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِئِئًا بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذُرْعًا وَقَالُوا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ إِنَّا مُنْجُونَ وَأَهْلَكَ إِلَّا امْرَأَتَكَ كَانَتْ

مِنَ الْغَابِرِينَ ۝

۳۴۔ إِنَّا مُنْزِلُونَ عَلَىٰ أَهْلِ هَذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا

كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝

۳۵۔ وَلَقَدْ تَرَكْنَا مِنْهَا آيَةً بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝

ترجمہ

۳۱۔ اور جب ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) ابراہیم کے پاس خوش خبری لے کر آئے تو (بیٹے کے تولد کی بشارت دیتے ہوئے) انھوں نے کہا کہ ہم (قوم لوط کی) اس بستی کے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں کیونکہ اس کے باسی ظالم ہیں۔

۳۲۔ (تو ابراہیم نے) کہا: اس بستی میں تو لوط بھی ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ جو لوگ اس بستی میں رہتے ہیں ہمیں خوب معلوم ہے۔ ہم اُسے اور اُس کے گھر والوں کو پچالیں گے۔ سوائے اُس کی بیوی کے کہ وہ

اس قوم میں باقی رہ جائے گی۔

۲۳۔ اور جب ہمارے فرستادگان لوط کے پاس آئے تو وہ انھیں دیکھ کر غمگین ہو گئے تو انھوں نے کہا : ڈرو نہیں اور غم نہ کھاؤ۔ ہم تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو بچالیں گے۔ سوائے تمہاری بیوی کے کہ وہ قوم میں باقی رہ جائے گی۔

۲۴۔ ہم اس بستی کے باسیوں پر ان کی بیکاری کے باعث آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں۔

۲۵۔ ہم نے اس آبادی کی ایک ٹھلی ٹھولی نشانی ان لوگوں کے لیے چھوڑی ہے۔ جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

تفسیر

گناہ گاروں کا انجام :

آخر کار حضرت لوط کی دعا مستجاب ہوئی اور خدا کی طرف سے اس قوم تباہ کار کے خلاف سخت سزا کا حکم صادر ہوا۔ وہ فرشتے جو عذاب نازل کرنے پر مامور تھے قبل اس کے کہ سرزمین لوط پر اپنا فرض ادا کرنے کے لیے جاتے، حضرت ابراہیم کے پاس ایک اور پیغام لے کر گئے اور وہ پیغام تھا حضرت ابراہیم کے فرزند کی پیدائش کی خوشخبری، نیز لفظ آیات میں اقل فرشتوں کی حضرت ابراہیم سے ملاقات کا ذکر ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے : جس وقت ہمارے اچھی حضرت ابراہیم کے پاس بشارت لے کر گئے، انھیں اسحاق اور یعقوب کے پیدا ہونے کی خوش خبری سنائی، اور پھر (قوم لوط کی بستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کہا کہ تم اس شہر اور اس میں بسنے والوں کو ہلاک کر دو گے کیونکہ یہ لوگ ظالم ہیں، (ولمنا جاءت رسلنا ابراهيم بالبشرى قالوا انا مهلكوا اهل هذه القرية ان اهلها كانوا ظالمين)۔

چونکہ فرشتوں نے "هذه القرية" کہا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قوم لوط کی آبادی اس مقام کے قرب و جوار ہی میں تھی جہاں حضرت ابراہیم رہتے تھے۔

اور اس قوم کو لفظ "ظالم" سے یاد کرنا اس وجہ سے تھا کہ وہ اپنے نفس پر ظلم کرتے تھے کیونکہ انھوں نے شرک، فساد و اخلاق اور بے حسنی کی راہ اختیار کی تھی۔ نیز یہ کہ وہ دوسروں پر بھی ظلم کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اس طرف سے گزرنے والے مسافروں اور قافلوں پر بھی برہم کرتے تھے۔

جب حضرت ابراہیم نے یہ بات سنی تو انھیں حضرت لوط پیر خدا کی فکر ہوئی اور کہا : اس آبادی میں تو لوط بھی ہے : (قال ان فيها لوطا)۔ اس پر کیا گزے گی ؟

مگر فرشتوں نے فوراً جواب دیا : آپ فکر نہ کریں ہم ان سب لوگوں سے خوب واقف ہیں جو اس بستی میں رہتے ہیں : (قالوا نحن اعلم بما فيها)۔

ہم اندھا دُھند عذاب نازل نہیں کریں گے۔ ہمارا پروگرام نہایت سنجیدہ اور نیا نکلا ہے۔

فرشتوں نے یہ بھی کہا کہ ہم لوط اور اس کے خاندان کو نجات دیں گے۔ بجز اُس کی بیوی کے کہ جو اُس قوم کے ساتھ ہی جھٹلائے عذاب ہوگی : (لننجيناهُ واهله الا امراتهُ كانت من الغابرين)۔

اس آیت سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ اُس علاقے کی تمام آبادیوں اور بستیوں میں صرف ایک ہی خاندان مومن اور پاک نفس تھا اور خدا نے بھی اسے عذاب سے نجات دی۔ جیسا کہ سورہ ذاریات کی آیت ۳۶ میں مذکور ہے :

فما وجدنا فيها غير بيت من المسلمين

ہم نے وہاں ایک خاندان کے سوا کوئی بھی مسلمان نہ پایا۔

یہاں تک کہ حضرت لوط کی زوجہ بھی مومنین کی صف سے خارج تھی اس لیے وہ بھی عذاب میں محسور ہوئی۔

کلمہ "غابرين" "غابر" کی جمع ہے۔ اس کے وضعی معنی یہ ہیں کہ راہ سفر میں کسی کے زنگٹے کا سفر تو آگے نکل جائیں اور وہ پیچھے رہ جائے۔

وہ عورت جو خاوادہ نبوت میں شامل تھی اُسے تو "مومنین اور مسلمین" سے جدا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مگر وہ اپنے کفر و شرک اور بُت پرستی کی وجہ سے اس صفت سے جدا ہو گئی۔

اس طرز کلام سے واضح ہوتا ہے کہ وہ عورت منحرف العقیدہ تھی۔ کچھ بعید نہیں کہ اُس میں یہ بد عقیدگی اُس مشرک معاشرے کے اثر سے پیدا ہو گئی ہو اور ابتدا میں مومن و مومنہ ہو۔ اس صورت میں حضرت لوط پر یہ اعتراض نہیں ہوتا کہ انھوں نے ایسی مشرک سے نکاح ہی کیوں کیا تھا ؟

یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ اگر کچھ اور لوگ حضرت لوط پر ایمان لائے ہوں گے تو وہ جتنا نازل عذاب سے پہلے اُس گناہ آور دوزخین سے ہجرت کئے ہوں گے۔ تنہا حضرت لوط اور اُن کے عیال اُس مقام پر اس توقع سے اخیر وقت تک ٹھہرے ہوں گے کہ ممکن ہے اُن کی تبلیغ اور ڈرانے کا لوگوں پر اثر ہو۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت ابراہیم کو یہ شک تھا کہ عذاب الہی حضرت لوط کو بھی گھیر لے گا ؟ اسی لیے تو انھوں نے فرشتوں کے سامنے لوط کے متعلق اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ اور انھوں نے اطمینان دلایا کہ لوط اس بلا سے محفوظ رہیں گے۔

اس سوال کا واضح جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم جانتے تو سب کچھ تھے مگر انھوں نے صرف اپنے اطمینان قلب کے لیے یہ سوال کیا تھا۔ چنانچہ اسی پیغمبر بزرگ کا ایک ایسا ہی اور واقعہ مسند معاد کے متعلق ہے۔ جب کہ خدا نے پرندوں کو زندہ کر کے معاد کا منظر اُن کے سامنے پیش کر دیا تھا۔

لیکن منتر بزرگ علامہ لباطبائی کا خیال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کا مقصد یہ تھا کہ یہ کہہ کر کہ "لوط بھی اُن میں ہے" لوط کے وجود کو اُس قوم سے رنج عذاب کی دلیل قرار دیں۔ نیز سورہ ہود کی آیت ۷۴-۷۶ سے بھی اس مطلب کی تائید ہوتی ہے کہ ابراہیم چاہتے تھے کہ اس قوم کی سزا میں تاخیر ہو جائے تو ممکن ہے کہ اُن کے قلوب کو بردباریت سے منحرف ہو جائیں۔ لیکن حضرت ابراہیم کو یہ جواب ملا کہ آپ اس امر میں اصرار نہ کیجئے۔ اُن کی حالت اس لیت و نعل سے گزر چکی ہے اور اُن کی سزا کا قطعی وقت آگیا ہے۔

لیکن ہمارا نظریہ یہ ہے کہ اس مقام پر فرشتوں نے حضرت لوطؑ اور ان کے خاندان کی نجات کے متعلق جو جواب دیا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان آیات کا موضوع شخص صرف حضرت لوطؑ کی ذات ہی تھی لیکن سورہ بُرُود کی آیات تو ان کا مطلب کچھ اور ہے اور جیسا کہ ہم نے کہا حضرت ابراہیمؑ نے یہ سوال محض اپنے مزید اطمینان کے لیے کیا تھا۔

بیان تک کہ حضرت ابراہیمؑ سے فرشتوں کی گفتگو ختم ہوگئی اور وہ حضرت لوطؑ کے علاقے کی طرف روانہ ہو گئے۔

قرآن میں مذکور ہے کہ جس وقت ہمارے فرشتے لوطؑ کے پاس آئے تو وہ انہیں دیکھ کر غلغلیں اور پریشان ہو گیا، ولما آن جنات رسلنا لوطاً ہی، بہر وضاق بہم ذریعاً۔

حضرت لوطؑ کا یہ اضطراب اس وجہ سے تھا کہ وہ انہیں پہچانتے نہ تھے۔ وہ فرشتے خوبصورت جوانوں کی صورت میں آئے تھے اور ایسے آلودہ معاشرہ میں ایسے مہمانوں کا آنا ناممکن تھا کہ حضرت لوطؑ کے لیے پریشان اور ان مہمانوں کے سامنے ہی بے آبروی کا باعث بنا۔ لہذا آپ کو سخت فکر و اس گیر ہوئی کہ دیکھتے اس گم راہ، بے حیا اور بے شرم قوم کا ان مہمانوں کو دیکھ کر کیا ردعمل ہوتا ہے؟ کلمہ ”بسی“ کا مادہ ”ساء“ ہے بمعنی بدحال ہونا اور ”ذرع“ کے معنی دل، یا نلتق کے ہیں۔ اس لیے ”ضاق بہم ذریعاً“ کے معنی ہوں گے کہ حضرت لوطؑ پریشان اور بے چین ہو گئے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ کلمہ ”ضاق“ کے معنی ہیں: ”راستے کرتے وقت اونٹ کے دو قدموں کا فاصلہ اور جس وقت اس کی پشت پر بھاری بوجھ لدا ہوتا ہے تو اونٹ کے قدموں کا فاصلہ تنگ تر اور کم تر ہو جاتا ہے۔ لہذا ”ضاق ذریعاً“ کسی سنگین اور طاقت فرسا واقعے کے لیے بطور کنایہ استعمال ہوتا ہے مگر ان مہمانوں نے جب حضرت لوطؑ کے اضطراب کو دیکھا تو فوراً اپنا تعلق کر دیا اور ان کی پریشانی کو ختم کر دیا۔

انہوں نے کہا کہ آپ نہ تو خوف زدہ ہوں اور نہ تم کریں۔ یہ بے شرم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بہت ہی جلد یہ سب کے سب ناپود ہو جائیں گے۔ ہم آپ کو اور آپ کے خاندان کو بچالیں گے۔ سوائے آپ کی بیوی کے کہ وہ ان گناہ گاروں کے درمیان رہے گی اور ہلاک ہو جائے گی: (وقالوا لا تخف ولا تحزن انا من جنوک واهلک الا امراتک کانت من الفابرین)۔

البتہ سورہ بُرُود کی آیات سے خوب معلوم ہوتا ہے کہ جب اس بے شرم قوم کو حضرت لوطؑ کے مہمانوں کا علم ہوا تو بہت جلد ان کے پاس آئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ ان مہمانوں پر دست درازی کریں۔ حضرت لوطؑ (جنہوں نے ابھی فرشتوں کو پہچانا تھا) یہ حال دیکھ کر بہت پریشان ہوئے انہوں نے ان بے شرموں کو کبھی تو بذریعہ نصیحت، کبھی دھمکی کے ذریعہ اور کبھی ان کے ضمیر کو اپیل کرتے ہوئے کہ کیا تم میں ایک آدمی بھی، راست باز نہیں ہے؟ اور کبھی ان کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ میں تمہارے ساتھ اپنی دختر کا نکاح کر دوں گا، انہیں بڑے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ مگر وہ بے شرم کسی طرح باز نہ آئے۔ ان کے پیش نظر تو صرف ان کا بے شرم اور متصدفانہ لیکن پروردگار کے اٹیچیوں نے حضرت لوطؑ سے اپنا تعارف کروایا اور بطریق اعجاز ان ہجوم آور لوگوں کو اذہا کر دیا۔ اس طرح اس عظیم جہنم کا دل مطمئن کر دیا۔

۱۰ اس واقعے کی تفصیل جلد ۹ میں سورہ بُرُود کی آیات ۷۷ تا ۸۱ کے ذیل میں بیان ہو چکی ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ ان فرستادگان پروردگار نے حضرت لوطؑ سے دو لفظ کے ایک تو ”نہ بُرُود“ دوسرے ”غلغلیں نہ ہو“ دیکھنا یہ ہے کہ ان دو کلمات ”خوف اور حزن“ میں کیا فرق ہے۔ تفسیر المیزان میں لکھا ہے کہ: ”خوف“ اس حادثے کا ہوتا ہے جس کے پیش آنے کا احتمال ہوا اور ”حزن“ حادثے کے لازمی ہونے کا ہوتا ہے۔

بعض اہل لغت نے خوف اور غم میں یہ فرق کیا ہے کہ ”خوف“ کا تعلق آئندہ ہونے والے حادثے سے ہے اور غم کا تعلق ایسے حادثے سے ہے جو گزر چکا ہو۔ ان دونوں کلمات کے مفہوم میں یہ احتمال بھی ہے کہ ”خوف“ خطرناک باتوں کا ہوتا ہے اور ”غم“ دردناک واقعات کا خواہ ان میں کوئی خطر نہ ہو۔ اس مقام پر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ سورہ بُرُود کی آیات کا تاثر یہ ہے کہ حضرت لوطؑ کی پریشانی اپنی ذات کے لیے نہ تھی بلکہ اس لیے تھی کہ یہ بدکردار لوگ مہمانوں پر دست درازی کریں گے۔ لیکن فرشتوں نے جو جواب دیا وہ حضرت لوطؑ اور ان کے خاندان سے متعلق تھا اور ان دونوں باتوں میں ہم آہنگی نہیں ہے۔

اس سوال کا جواب سورہ بُرُود کی آیت ۸۱ سے مل سکتا ہے۔ کیونکہ جب وہ بے شرم لوگ مہمانوں پر دست درازی کرنے آئے تو فرشتوں نے لوطؑ سے کہا کہ ”یہ قوم آپ کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتی“۔ یعنی ہم تو ہم ہیں یہ تو تجھے بھی کچھ آزار نہیں پہنچا سکتے اس بنا پر فرشتوں نے اپنے تحفظ کو تو تسلیم قرار دیا۔ اور حق یہ ہے کہ ان کا تحفظ مسلم بھی تھا۔ اور انہوں نے بشارت نجات کو حضرت لوطؑ اور ان کے خاندان تک محدود کر دیا۔

اس کے بعد ان فرشتوں نے اس وجہ سے کہ اس بے شرم قوم کے متعلق ان پر جو فرض عائد کیا گیا تھا اس کی وضاحت کریں، یہ انصاف کیا: ”یونکہ یہ قوم نہایت فاسق اور گناہ گار ہے اس وجہ سے ہم اس بستی اور اس کے باسیوں پر آسمان سے عذاب نازل کریں گے: (انا منزلون علی اهل هذه القرية رجلاً من السماء بما كانوا یفستون)۔

اس مقام پر ”قریہ“ سے مراد وہی شہر سدوم اور اُس کے اطراف و جانب کے شہر اور آبادیاں مراد ہیں جن میں قوم لوطؑ آباد تھی بعض لوگوں نے ان کی مردم شماری ستر لاکھ لکھی ہے۔

کلمہ ”رجز“ سے ”عذاب“ مراد ہے۔ ”رجز“ کے حقیقی معنی اضطراب کے ہیں۔ مجازاً ہر وہ امر جو موجب اضطراب ہو اُسے ”رجز“ کہنے لگے۔ عربوں نے اس کلمہ کے معنی کو دین کر لیا اور سخت بلاؤں، طاعون، برف اور زلزلہ باری، شیطانی دسوس اور عذابِ الہی کے معنی میں بولنے لگے۔

جملہ ”بما كانوا یفستون“ سے ان پر دردناک عذاب نازل ہونے کی یہ علت واضح ہوتی ہے کہ وہ فسق اور خدا کی نافرمانی میں مبتلا تھے۔ اور فعل ”یفستون“ جو کہ فعل مضارع ہے وہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ اس گناہ میں مسلسل اور دائمی طور پر مبتلا تھے۔ اس اندازِ کلام سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ اس گناہ کے مسلسل ارتکاب سے باز آجاتے اور حق پرستی، تقویٰ اور پاکیزگی کی راہ اختیار کر لیتے تو اللہ ان کے گزشتہ گناہوں کو معاف کر دیتا اور ان پر یہ عذاب نازل نہ ہوتا۔

اس مقام پر قرآن شریف میں اُس دردناک عذاب کی نوعیت کا جو اُس قوم پر نازل ہوا، تفصیلی ذکر نہیں ہے۔ صرف اتنا ہی فرمایا گیا ہے کہ :

ہم نے اُن آبادیوں کے (دیرانوں، کھنڈرات اور آثارِ بلاویہ) کو اُن لوگوں کے لیے جو عقل و فہم سے کام لیتے ہیں باقی رکھا ہے۔ (ولقد ترکنا منہا آیۃً بیتیۃً لعلوہم یعقلون)۔

لیکن سورہ بُرُوج کی آیت ۸۲ اور سورہ اعراف کی آیت ۱۴ میں اُن پر نازل شدہ عذاب کی تشریح کی گئی ہے کہ اقل تو شدید زلزلے نے اُن کے شہروں کو کلیتاً زیر و زبر کر دیا۔ اس کے بعد اُن پر آسمان سے پتھر برسے۔ اتنی کثیر مقدار میں کہ اُن کے بن اور دیوار شدہ مکانات و محلات اُن کے نیچے دفن ہو گئے۔

کلمہ "آیۃ بیتیۃ" روشن نشانی سے اشارہ ہے، شہرِ سدوم کے باقی ماندہ کھنڈرات کی طرف کہ جو آیات قرآنی کے مطابق حجازی قافلوں کی راہ آمد و رفت میں واقع تھا اور یہ آثارِ ظہورِ پیغمبرِ اسلام کے وقت تک باقی تھے۔ چنانچہ سورہ بقرہ کی آیت ۶۶ میں مذکور ہے :

وانھا لببیل مقیم

اُس کے آثارِ اہل قافلہ کی راہ کے کنارے موجود ہیں۔

اور سورہ صافات کی آیت ۱۳۷، ۱۳۸ میں یوں آیا ہے :

وانکو لتسرون علیہم مصححین وباللیل افلا تعقلون
تم صبح و شام اُن مقامات کے قریب سے گزرتے ہو کیا تم غور نہیں کرتے۔

۳۶۔ **وَالِی مَدِیْنِ اَحَاهُمْ شُعَیْبًا فَقَالَ لِقَوْمِ اَعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا**

الْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَقْتُلُوْا فِی الْاَرْضِ مُمْسِدِیْنَ ۝

۳۷۔ **فَكَذَّبُوهُ فَارْتَدَّ رَجْفًا فَاَصْبَحُوا فِی دَارِهِمْ جَثِیْنَ ۝**

۳۸۔ **وَاعَادًا وَشُرُوْدًا وَقَدْ تَبَّیْنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسْكِنِهِمْ ۝**

وَزَیْنٍ لَّهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَوَسَّوْهُمُ عَنِ السَّبِیْلِ وَكَانُوا مُتَبَصِّرِیْنَ ۝

۳۹۔ **وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامَانَ ۝ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ**

مُوسٰی بِالْبَیِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِی الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سَابِقِیْنَ ۝

۴۰۔ **فَكَلَّا اَخَذْنَا بِذُنُبِهِمْ ۝ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِ حَاصِبًا ۝**

وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّیْحَةُ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهٖ الْاَرْضَ ۝

وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۝ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيْظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ

كَانُوْا اَنْفُسُهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝

ترجمہ

۳۶۔ اور ہم نے اُن کے بھائی شعیب کو مدین کی طرف بھیجا۔ اُس نے کہا : اے میری قوم! خدا کی عبادت کرو اور یومِ آخرت کی امید رکھو اور زمین میں فساد نہ کرو۔

- ۲۷۔ مگر انہوں نے اسے جھٹلایا۔ پس انہیں زلزلے نے آکھڑا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے روگئے اور مڑ گئے
- ۲۸۔ اور ہم نے عاو و ثمود کو بھی ہلاک کر دیا۔ اور ان کے (دوران شدہ) مکانات ہمارے سامنے موجود ہیں شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نظروں میں زینت دی تھی اور انہیں راہ سے روک دیا تھا جب کہ وہ دیکھ رہے تھے۔
- ۲۹۔ ہم نے قارون، فرعون اور ہامان کو بھی ہلاک کر دیا۔ موسیٰ ان کے پاس کھلی ہوئی نشانوں کے ساتھ آئے۔ مگر ان لوگوں نے زمین میں اپنے آپ کو بڑا بنایا (اور تکبر کیا) مگر وہ ہم پر سبقت لے جانے والے نہ تھے۔
- ۳۰۔ ہم نے ان سب کو ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ لیا۔ ہم نے ان میں سے بعض پر سنگریزوں کی بارش کا طوفان بھیجا اور ان میں سے بعض کو ایک بیخ نے آکھڑا۔ اور بعض کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور بعض کو (پانی میں) غرق کر دیا اور خدا نے ہرگز ان پر ظلم نہیں کیا۔ یہ تو خود انہی نے اپنے اوپر ظلم کیا تھا۔

تفسیر

ظالموں کے سرگروہ کی سزا مختلف تھی:

- حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کے تذکرے کے بعد دوسری قوموں کا ذکر آتا ہے مثلاً: قوم شیب، عاو و ثمود، قارون اور فرعون زیر نظر آیات میں ان میں سے ہر ایک کی طرف مختصر اور توجیہ نیا اشارہ ہے۔
- پہلے یہ کہتا ہے: ہم نے ان کے بھائی شیب کو مدین کی طرف بھیجا (والی مدین اخاهم شعیباً)۔
- حضرت شیبؑ کو "بھائی" کہا گیا ہے۔ ہم نے اس کے متعلق بارہا کہا ہے کہ اس کلمہ کی وجہ استعمال یہ ہے کہ ان پیغمبروں کو اپنی امتوں سے انتہائی محبت تھی اور وہ ان پر توفیق حاصل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ نیز یہ کہ ان پیغمبروں کی اپنی قوموں سے رشتہ داری بھی تھی۔
- "مدین" اردن کے جنوب مغرب میں ایک شہر ہے آجکل اس کا نام "معان" ہے۔ یہ شہر طبع عقبہ کے مشرق میں ہے۔ حضرت شیب اور ان کی قوم وہیں رہتی تھی۔
- حضرت شیبؑ نے تمام پیغمبران بزرگ کی طرح مبداء و معاد کے اعتقاد سے (جو کہ ہر دین کی اساس ہے) اپنی دعوت کا آغاز کیا۔ اور کہا: اے میری قوم! تم خدا کی عبادت کرو اور روز قیامت کی امید رکھو: (خقال یا قوم اعبدوا اللہ وارجوا اليوم الآخر)۔

"مبداء" پر ایمان رکھنے سے انسان کو یہ احساس رہتا ہے کہ خدا دائمی طور پر اور مسلسل میرے اعمال کی نگرانی کر رہا ہے۔

۱۔ "مبداء" ولقد ارسلنا نوحاً کے جملہ اور اس کے بعد کے جملہ پر لکھتے ہیں۔

۲۔ "مدین" کے متعلق طورہ قصص کی آیت ۲۳ کے ذیل میں تشریح کی گئی ہے۔

اور معاد پر ایمان رکھنے سے انسان کو ہر وقت یہ خیال رہتا ہے کہ اس روز بے کم و کاست میرے جملہ اعمال کے حلق باز پرس ہوگی۔ ان باتوں کا اعتقاد انسان کی اخلاقی تربیت اور اصلاح میں غیر معمولی اثر رکھتا ہے۔

حضرت شیبؑ کی تبلیغ کا تیسرا حکم ایسا جامع عملی اصول تھا جس میں تمام معاشرتی اور اجتماعی پروگرام شامل تھے۔ آپ نے فرمایا زمین پر فساد کرنے کی کوشش مت کرو: (ولا تغشوا فی الارض مفسدین)۔

فساد کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس میں ہر قسم کی تخریب کاری، دیران گری، راہ راست سے انحراف اور ظلم شامل ہے۔ اس تصور کی ضد "صلاح و اصلاح" ہے کہ جس کے مفہوم میں ہر وہ عمل شامل ہے جو تعمیری اور بنی نوع انسان کی منفعت کے لیے ہو کلمہ "تغشوا" کا مادہ "عش" ہے۔ جس کے معنی ہیں دنیا میں فساد برپا کرنا مگر یہ کلمہ زیادہ تر مفسد اخلاق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی لیے اس کے بعد کلمہ "مفسدین" کا استعمال بطور تاکید ہے۔

مگر قوم شیب نے اس کے بجائے کہ اس صلح بزرگ کی نصائح کو گوش دل سے سنتے۔ اسی ان کی تکذیب کرنی شروع کر دی (فکذبوا)۔ ان کی یہ عملی اس بات کا سبب ہوئی کہ انہیں شدید زلزلے آکھڑا، (فاخذتھم الرجفة)۔

اور وہ لوگ اس حادثے سے اپنے گھروں میں اوندھے منہ گر گئے اور مڑ گئے: (فاصبوا فی دارھم و جاثمین)۔

کلمہ "جاثم" کا مادہ "جثم" ہے (بروزن چشم) اس کے معنی ہیں گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھنا۔ اور ایک مقام پر ٹھہرنا۔ کچھ بعید نہیں کہ اس کلمہ کے استعمال کرنے سے یہ مراد ہو کہ جب یہ زلزلہ آیا تو وہ سو رہے تھے۔ جتنا محسوس کر کے وہ نامانی طور پر لیٹے جیسے ہی وہ گھٹنوں کے بل بیٹھے تو حادثے نے انہیں جان بچانے کی نعمت نہ دی۔ دیواریں گر پڑیں اور بجلی جو اس زلزلہ مرگ بار کے ساتھ ہی ٹپک رہی تھی گرتی رہی اور وہ سب لوگ مڑ گئے۔

اس کے بعد کی آیت میں قوم عاو و ثمود کا ذکر ہے۔ مگر ان اقوام سے ان کے پیغام کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ وہ قومیں تھیں جنہیں اس وقت کے مخاطبین قرآن خوب جانتے تھے۔ نیز یہ کہ قرآن کی دوسری آیات میں ان کے پیغمبروں کا ذکر مکرر آیا ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے عاو و ثمود کی قوموں کو ہلاک کر دیا: (وعادا و ثموداً)۔

اس کے بعد یہ اضافہ ہے کہ ان اقوام کی بستیوں اور ان کے مقامات کو تم خوب جانتے ہو: (ان کے شہروں کے دیرانے سرزمین حجاز اور یمن میں تمہاری راہوں کے کنارے واقع ہیں) (وقد تبین لکم من مساکنہم)۔

تم ہر سال اپنے تجارتی قافلوں کے ساتھ یمن اور مکہ شام کی طرف سفر کرتے ہو۔ سرزمین "حجاز" سے جو کہ جزیرۃ العرب کے شمال میں ہے اور اخصاف سے جو کہ یمن کے قریب بجانب جنوب ہے گزرتے ہو اور عاو و ثمود کے شہروں کے کھنڈرات کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو۔ پس تم ان کے انجام سے کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے؟

۱۔ قوم شیب کی تباہی کا دردناک حال تفصیلاً سورۃ محمد کی آیات ۸۴ تا ۹۵، جلد نمونہ میں آیا ہے۔

۲۔ "وعادا و ثموداً" نمل "اهلکنا" کا مفعول ہے جو کہ مفسر ہے۔ یہ بات آیت مائیل سے سمجھ میں آتی ہے۔ بعض مفسرین نے اسے (اذکر) کا مفعول سمجھا ہے۔

اس کے بعد ان اقوام کی اصل پرستی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نظروں میں مزیں کر دیا تھا اور انجام کار انھیں راہ حق اختیار کرنے سے روک دیا تھا: (و زین لہو الشیطان اعمالہم فصدہم عن السبیل)۔

حالانکہ وہ اقوام چشم بینا اور عقل و خرد رکھتی تھیں اور توبہ و تقویٰ ان کی فطرت میں تھا اور پیامبران الہی نے بھی انھیں اچھے راہ راست کی طرف رہبری کی تھی، (و کانوا مستبصرین)۔

بعض مفسرین نے "و کانوا مستبصرین" کے معنی یہ سمجھے ہیں کہ وہ اقوام چشم بینا اور عقل و فہم رکھتی تھیں۔ بعض نے خیال کیا ہے کہ وہ فطرت سلیم کی مالک تھیں۔ بعض نے یہ معنی سمجھے ہیں کہ انھیں پیغمبروں کی رہنمائی میسر آتی تھی۔

اگر اس آیت سے مذکورہ تمام معانی اخذ کیے جائیں تو کوئی امر مانع نہیں ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ قطعی جاہل نہ تھے بلکہ وہ اچھے طرح جانتے تھے کہ حق کیا ہے۔ ان کا وہ جان بیدار تھا، عقل و خرد سے بھی وہ بہرہ مند تھے اور پیغمبران الہی ان پر ایمان نہ کر چکے تھے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انھوں نے عقل اور تسمیر کی آواز کی طرف سے کان بند کر لیے اور انبیا کی دعوت سے منہ موڑ لیا اور شیطانی دساوس کی پیروی کرنے لگے۔ اور روز بروز انھیں اپنے غلط اعمال زیادہ تر نظر آنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ نصیبان کی اُس منزل پر پہنچ گئے جہاں سے لوٹنا ناممکن ہو گیا۔

اب قانونِ فطرت نے ان سے بارہوے تر خشک کھڑیلوں کو پھینک دیا۔ ہر وہ درخت جو پھیل نہیں لاتا اُس کی سزایابی ہے

اس کے بعد کی آیت میں ان تین نامزدوں کا ذکر ہے جن میں سے ہر ایک شیطانی طاقت کا واضح نمونہ تھا۔ وہ تھے قارون، فرعون اور ہامان۔ فرمایا گیا ہے کہ تم نے قارون، فرعون اور ہامان کو بھی ہلاک کر دیا، (و قارون و فرعون و ہامان)۔ قارون اُس ثروت کا مظہر ہے جس میں غرور، غفلت اور خود غرضی بھی پائی جاتی تھی۔

فرعون ایسی تکبرانہ طاقت کا مظہر ہے جس میں شیطنت آئینہ تھی اور ہامان شکر ظالموں کی معاونت کا نمونہ ہے۔ اُس کے بعد مذکور ہے کہ: موسیٰ ان تینوں کے پاس دشمن دلائل لے کر آئے اور ان پر اتمامِ نجات کی: (ولقد جائہو موسیٰ بالبینات)۔

مگر انھوں نے زمین پر غرور، تکبر اور سرکشی کی راہ اختیار کی، (فاستکبروا فی الارض)۔

قارون اپنی دولت، خزانوں، علم و ہنر پر بھروسہ کرتا تھا۔

فرعون و ہامان اپنے لشکر، فوجی طاقت، اور جاہل عوام میں اپنے پروپیگنڈے پر بھروسہ کرتے تھے۔

مگر وہ لوگ ان اسبابِ ظاہری کے باوجود خدا پرست نہ تھے بلکہ اُس کی قدرت کے سچے سے نکل کے کہیں فرار نہ کر سکے۔ (وما کانوا سابقتین)۔

یہ تینوں کھاست بھی نکل سکتے "اہلکنا" کا مفعول ہیں۔ جیسا کہ گذشتہ آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ بعض نے انھیں نفل "اذکر" کا مفعول سمجھا ہے۔

خدا نے اسی زمین کو قارون کو فنا کرنے کا حکم دیا جو اس کے آرام و راحت کا گوارا تھی اور فرعون اور ہامان کو نابود کرنے کا حکم اس پانی کو دیا جو انسان کے لیے سببِ حیات ہے۔

خدا نے ان سرکشوں کو ناپود کرنے کے لیے زمین و آسمان کے لشکر جمع نہیں کیے بلکہ ان ہی چیزوں کو جو ان کی بقائے حیات کا موجب تھیں انھیں نیست کرنے پر متحرک کر دیا۔

"سابقتین" جمع ہے "سابق" کی۔ اس کا معنی ہے وہ آدمی جو کسی سے آگے بڑھ کر پیش قدمی اختیار کرے۔ اگر خدا یہ فرماتا ہے "وہ لوگ آگے نہ بڑھ سکے" تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنی پوری اسمانی طاقت کے باوجود خدا کے دائرہ قدرت سے باہر نہ نکل سکے اور خدا کے عذاب سے نہ بچ سکے۔ بلکہ جیسے ہی خدا نے ارادہ کیا اسی وقت انھیں نہایت ذلت و ذسوائی کے ساتھ ویاہر عدم کو چین دیا

جیسا کہ خدا اس کے بعد کی آیت میں فرماتا ہے: ہم نے ان میں سے ہر ایک کو اس کے گناہ کی پاداش میں پکڑ لیا: (فکلوا الخبز فابذنبہ)۔ چونکہ ماقبل کی دو آیات میں چار قسم کے لوگوں کا ذکر ہوا تھا، ان کی سزاؤں کا ذکر نہ تھا۔ وہ تھے قوم عاد و ثمود، قارون و فرعون اور ہامان۔ اس لیے اس آیت کے اخیر میں بالترتیب ان کی سزاؤں کا ذکر ہوا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے: ہم نے ان میں سے بعض پر شدید تباہ کن طوفان نازل کیا اور بعض پر (فہموم من اسلنا علیہ حاصبا)۔

"حاصب" کا معنی وہ طوفان ہے جس میں سنگریزوں کی بارش ہو۔ "حصاب" کے معنی ہیں سنگریزہ

اس گروہ سے قوم عاد مراد ہے۔ سورہ فاریات، سورہ حاقہ اور سورہ قمر کے مطابق ان پر سات روز اور آٹھ راتوں تک شدید تباہ کن طوفان مسلط رہا۔ اُس طوفان نے ان کے گھروں کو باطل کھنڈ کر دیا اور ان کے جسموں کو بہت بھڑکے پتوں کی طرح پراگندہ کر دیا۔ (حاقہ ۳۵)

ان میں سے ڈوسروں کو آسمانی کڑا کرنے پھیر لیا، (ومنہم من اخذتہ الصیعة)۔

ہم نے کہا ہے کہ صیغہ آسمانی بجلی کا وہ کون ہے جس کے ساتھ ہی زمین میں زلزلہ آجاتا ہے۔

یہ وہ عذاب تھا جو قوم ثمود اور بعض دیگر اقوام پر نازل ہوا۔

جیسا کہ خدا سورہ نبؤہ کی آیت ۶۷ میں فرماتا ہے:

واخذ الذین ظلموا الصیعة فاصحوا فی دیارہم وجاشین

اور ہم نے ان میں سے بعض کو زمین میں غرق کر دیا، (ومنہم من اخذناہ الارض)۔

یہ وہ سزا تھی جو بنی اسرائیل کے مغرور و شکر قارون کو دی گئی تھی جس کا سورہ قصص کی آیت ۸۱ میں ذکر گزر چکا ہے۔

آخر کار ان میں سے بعض کو ہم نے غرق کر دیا، (ومنہم من اغرقنا)۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ فرعون و ہامان اور ان کے ساتھیوں کی طرف اشارہ ہے، جن کا قرآن کی مختلف سورتوں میں ذکر آیا ہے۔

برکیت اس بیان سے یہ تقیید اخذ ہوتا ہے کہ چار قسم کی سزائیں چار ہی قسم کے لوگوں کو دی گئی تھیں جن کی گناہوں اور

قارون کی زندگی کے حالات سورہ قصص کی آیات ۷۶ تا ۸۱ میں منقول ذکر ہو چکے ہیں۔ اور فرعون اور اُس کے ساتھیوں کی ہلاکت کا دائرہ سورہ قصص کی تفسیر میں اسی جگہ میں اور سورہ اعراف کی تفسیر، جلد چہارم میں بیان کیا جا چکا ہے۔

اخلاف کا گزشتہ دو آیات میں ذکر آچکا ہے۔ مگر اس مقام پر ان کی سزاؤں کا ذکر نہیں تھا۔

لیکن — بعض مفسرین نے اس مقام پر جو یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ ان سزاؤں میں دوسری اقوام بھی شامل ہو سکتی ہیں (مثلاً: کلمہ "عزق" میں قوم نوح بھی شامل ہے اور قوم لوط پر بھی سنگ باری ہوئی تھی)، ان مفسرین کا یہ خیال حقیقت سے بہت بعید ہے۔ کیونکہ قرآن میں جس مقام پر ان کا حال بیان کیا گیا ہے، وہیں ان کی سزاؤں کا ذکر بھی ہے۔ تو پھر سزاؤں کے ذکر کی تکرار کی ضرورت نہ تھی۔ زرا نظر سلسلہ آیات میں جس چیز کا ذکر نہ تھا وہ ان چار گروہوں کی سزائیں ہیں۔ جنہیں آخری دو آیات میں بیان کیا گیا ہے۔

آیت کے اخیر میں اس حقیقت کی تاکید کے لیے کہ یہ لوگ اپنے ہی اعمال سیرے کے رد عمل کے طور پر ان غلاظوں میں مبتلا ہوئے۔ اور انہوں نے جو بیچ بویا تھا اس کی فصل کاٹی۔ خدا فرماتا ہے: خدا نے ہرگز ان پر ظلم نہ ستم نہیں کیا۔ بلکہ ان لوگوں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا تھا۔ (وما كان الله ليظلمهم ولكن كانوا انفسهم يظلمون)۔

گناہ گاروں کو خواہ اس دنیا میں سزا دی جائے یا اس دنیا میں، درحقیقت وہ ان ہی کے گناہوں کا رد عمل ہو گا اور اس مقام پر جہاں اصلاح احوال اور بازآشتی کی تمام راہیں ان پر بند ہو جائیں گی وہ بد اعمالیاں ان کے سامنے مجسم ہو جائیں گی۔ خدا! اس سے کہیں زیادہ عادل ہے کہ وہ انسانوں پر حقیر سے حقیر ترین ظلم ہی روا رکھے۔

قرآن کی دیگر متعدد آیات کی طرح اس آیت سے بھی انسان کی آزادی ارادہ اور آزادی اختیار ثابت ہوتی ہے۔ اور یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ فیصلہ عمل خود انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔ خدا نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے اور اسے آزاد ہی دیکھنا پاتا ہے۔ اس بنا پر جو لوگ کہ "جبر" کے متفقہ ہیں (افسوس ہے کہ مسلمانوں میں بھی اس عقیدے کے لوگ موجود ہیں) قرآن کے اس توہنا استدلال سے ان کا عقیدہ باطل ٹھہرتا ہے۔

۴۱- مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ

الْعَنْكَبُوتِ إِتَّخَذَتْ بَيْتًا وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوتِ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝

۴۲- إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

۴۳- وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ لَضَرِبِهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ ۝

۴۴- خَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝

ترجمہ

۴۱- جن لوگوں نے خدا کے سوا دوسروں کو اپنے اولیا بنا رکھا ہے وہ مکڑیوں کی مانند ہیں کہ وہ بھی اپنے لیے گھر بناتی ہیں اور مکڑی کا گھر کمزور ترین گھر ہے۔ کاش کہ وہ لوگ اس بات کو سمجھتے۔

۴۲- اور وہ لوگ خدا کے علاوہ جسے بھی پکارتے ہیں خدا اسے جانتا ہے اور وہ غالب اور حکمت والا ہے۔

۴۳- ہم لوگوں کے سمجھانے کے لیے یہ مثالیں بیان کرتے ہیں اور اہل علم کے سوا کوئی انہیں نہیں سمجھتا۔

۴۴- خدا نے آسمانوں اور زمین کو حق پر پیدا کیا ہے یقیناً اہل ایمان کے لیے ان میں نشانیاں ہیں۔

تفسیر

مکڑی کے جالے کی مانند کمزور امید گاہیں :

گزشتہ آیات میں مُفَسِّد، مُسْتَحْبِر، مُسْتَحْرَم اور انصاف ظالم مشرکین کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ زیر بحث آیات میں اسی مناسبت سے ایک قابل توجہ اور ناطق مثال اُن لوگوں کے لیے ہے جو غیر خدا کو اپنا معبود اور ولی قرار دیتے ہیں۔ ہم اس مثال پر جتنا جی غور کریں اتنے ہی زیادہ نکات ہماری سمجھ میں آتے ہیں۔

چنانچہ خدا فرماتا ہے : جو لوگ غیر خدا کو اپنا معبود اور ولی بناتے ہیں وہ مکڑی کی مانند ہیں جو اپنے لیے جال بنتی ہے۔ جب کہ مکڑی کا گھر سب سے کمزور گھر ہوتا ہے۔ اسے کاش وہ یہ جانتے (مثل الذین اتخذوا من دون اللہ اولیاء کمثل العنکبوت اتخذت بیئاً وان اوهن البیوت لیت العنکبوت لو کأنوا یعلمون)۔ سبحان اللہ! یہ کیسی زسار اور جاذب مثال اور کیسی دقیق اور ناطق تشبیہ ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ ہر حیوان اور ہر کیرا مکوڑا اپنے لیے گھر یا آشیانہ بناتا ہے۔ مگر ان میں سے کسی کا گھر بھی مکڑی کے جالے سے زیادہ کمزور نہیں ہوتا۔

اصولاً مکان ایسا ہونا چاہیے جس میں دیواریں، چھت اور دروازہ ہو جو اپنے مکان کی حوادث اور موسموں کے تغیرات سے حفاظت کرے۔ اُس کی غذا، خوراک اور دنیاوی ضرورت کی چیزیں اُس میں محفوظ رہیں۔ بعض عمارتوں کی چھت نہیں ہوتی۔ مگر کم از کم دیواریں تو ہوتی ہیں۔ یا اگر دیواریں نہیں تو چھت ہوتی ہے۔ لیکن مکڑی کے جالے میں جو نہایت ہی نازک تاروں سے بنا ہوا ہوتا ہے نہ دیوار ہوتی ہے نہ چھت، نہ صحن، نہ دروازہ۔ یہ چیزیں تو نہیں ایک طرف، دوسری طرف دیکھیے تو اُس کی ساخت کا میٹرل اس قدر کمزور اور ناپائیدار ہوتا ہے کہ وہ کسی حادثے کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر نرم رفتار ہوا بھی چلے تو اُس کے تلنے بلنے کو درہم برہم کر دے۔ اگر اُس پر بارش کے چند قطرے گر جائیں تو اُسے برباد کر دیں۔ اگر آگ کے معمولی سے شعلے کی گرمی بھی پہنچے تو اُسے نابود کر دے حتیٰ کہ اگر اُس پر گرد و غبار بھی بیٹھے جائے تو بھی پارہ پارہ ہو کر مکان کی چھت سے لٹک جاتا ہے۔

اس گروہ کے باطل معبودوں کا بھی یہی حال ہے۔ یہ نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان، نہ کسی مشکل کو حل کر سکتے ہیں اور نہ مصیبت کے وقت کسی کی پناہ گاہ بن سکتے ہیں۔

ہاں۔۔۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ گھر دراز یا مکڑی کے لیے مرکز استراحت بھی ہے اور اس کے حصول غذا کے لیے حشرات کو شکار کرنے کا جال بھی ہے۔

لیکن اگر اُس کا دوسرے حیوانات اور حشرات کے گھروں سے مقابلہ کیا جائے تو نہایت کمزور اور ناپائیدار ہے۔

جن لوگوں نے خدا کے علاوہ کسی غیر کو اپنا معبود قرار دیا ہے، اُن کا بھروسہ بھی تار عنکبوت پر ہے۔ مثلاً: فرعونوں کے تخت و تاج، قادیانوں کا بے شمار مال و زر، بادشاہوں کے خزانے اور محلات۔ یہ سب تار ماری عنکبوت ہیں اور یہ سب اسباب نائنس طوفان حوادث کے مقابلے میں۔۔۔ ناپائیدار۔ ضعیف۔ ناقابل اعتماد اور فنا پذیر ہیں۔

تاریخ کے انقلابات ہمیں یہ سبق دیتے ہیں کہ درحقیقت انسان اُن میں سے کسی چیز پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتا۔ لیکن۔۔۔ جن لوگوں نے ایمان اور خدا پر توکل کو اپنی پناہ گاہ بنایا ہے۔ حقیقت میں اُن کا تکیہ مضبوط دیوار پر ہے۔

اس مقام پر اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ باوجودیکہ مکڑی کا جالا اور اُس کے تار کمزوری کے لیے ضرب المثل ہیں لیکن وہ عجیب آفریش میں سے بھی ہے۔ اگر انسان اُس پر غور کرے تو وہ خالق حقیقی کی عظمت سے اور بھی زیادہ آشنا ہو جائے۔ مکڑی کے تار ایک پچکنے والے مادہ سے بنائے جاتے ہیں۔ یہ مادہ مکڑی کے پیٹ کے نیچے سُئی کے ناکے کے برابر نہایت چھوٹے چھوٹے غلیوں میں ہوتا ہے۔ اُس کی ساخت ایک خاص ترکیب سے ہوتی ہے کہ وہ ہوا لگتے ہی سخت ہو جاتا ہے۔

مکڑی اس مادے کو اپنی خاص طرح کی انگلیوں سے اُن غلیوں میں سے باہر نکالتی ہے اور اُس سے اپنا جالا بناتی ہے۔ علم الحیات کے ماہرین کہتے ہیں کہ ہر مکڑی اس قلیل ترین مائع مادہ سے پانچ سو میٹر تار بنا سکتی ہے۔ بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ مکڑی کا تار اپنی غیر معمولی نزاکت کی وجہ سے کمزور ہوتا ہے۔ اگر اتنا ہی باریک تار فولاد کا ہو تو اُس سے مضبوط تر ہو۔

عجیب بات یہ ہے کہ مکڑی کے جالے کا ہر تار، چار تاروں سے مل کر بنا ہوتا ہے۔ پھر اُن چار تاروں میں سے ہر تار ایک ہزار تاروں سے مل کر بنا ہوتا ہے۔ جن میں سے ہر تار اُس کے ہلکے نہایت چھوٹے سے سُورخ میں سے نکلتا ہے۔ غور طلب یہ امر ہے کہ ان ہفتوں کا ہر فرعی تار کس قدر باریک، لطیف اور نازک ہوتا ہوگا۔

مکڑی کے جالے کی ساخت میں جو میٹرل استعمال ہوتا ہے، اُس کے عجیب ہونے کے علاوہ اُس کی ساخت اور اور مندی شکل بھی قابل توجہ ہے۔ اگر ہم کسی مکڑی کے سالم گھر کو غور سے دیکھیں تو ان ہی نازک تاروں میں ہمیں آفتاب و خُشاک کی طرح کا ایک دلچسپ منظر نظر آئے گا۔ البتہ مکڑی کے لیے یہ گھر نہایت مناسب اور آئیڈیل ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی اس سے زیادہ کمزور مکان کا تصور بھی نہیں ہو سکتا اور وہ معبود بھی جن کی خدا کے علاوہ پرستش کی جاتی ہے ایسے ہی ہیں۔

اس چھوٹی سی مخلوق کی تخلیق میں قدرت الہی کی عظمت اُس وقت اور بھی زیادہ آشکار ہوتی ہے، جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ مکڑی صرف ایک ہی قسم کی نہیں ہوتی بلکہ بعض ماہرین علم الحیات کا دعویٰ ہے کہ اب تک ہمیں ہزار قسم کی مکڑیاں پائی گئی ہیں اور اُن میں سے ہر نوع کی خصوصیات الگ الگ ہیں۔

آیت میں "استنام" (بتوں) کے بجائے کلمہ "اولیاء" (جمع "ولی") استعمال ہوا ہے۔ شاید اس کلمے کے استعمال میں یہ حکمت ہے کہ نہ صرف انسان کے خود ساختہ معبود (بت) بلکہ خدا کے مقرر شدہ پیشوا اور رہبر کو چھوڑ کر جسے بھی پیشوا اور رہبر بنایا جائے وہ سب اسی حکم میں شامل ہیں۔

جملہ "لوک انوا یعلمون" (اگر وہ جانتے ہوں) آیت کے اخیر میں آیا ہے۔ اس کا تعلق نہ تو باطل معبودوں سے ہے اور نہ خاندان عنکبوت کی کمزوری سے۔ کیونکہ اُس کی کمزوری کو تو سب ہی جانتے ہیں۔ اس بنا پر اس جملے کے مندرجہ ذیل

اگر وہ لوگ اپنے باطل معبودوں اور ان ہستیوں کی جن پر وہ تکیہ کرتے ہیں ناپائیداری اور بے بقائی کو سمجھتے تو وہ جان لیتے کہ یہ سب اپنے ضعف اور عظیم قدرت میں تاریک بھوت کی مانند ہیں۔

اس کے بعد کی آیت میں غافل اور بے خبر مشرکین کو تہدید آمیز تنبیہ کی گئی ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے، خدا ہر اُس شے کو جسے وہ خدا کے علاوہ پکارتے ہیں جانتا ہے: (ان الله يعلم ما يدعون من دونہ من شئ)۔ اُن کا شرک جلی ہو یا شرک خفی کوئی بھی خدا سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وہی خدا قادر مطلق، لازوال اور حکیم علی الاطلاق ہے۔ (وهو العزيز الحكيم)۔

اگر خدا نے اُن کفار کو نفلت دے رکھی ہے تو اُس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ ان کے اعمال کو جانتا نہیں یا اُس کی قدرت محذوہ ہے بلکہ یہ اُس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ وہ انہیں کافی نفلت دے تاکہ ان سب پر اتمامِ حجت ہو جائے۔ اور ان میں سے جن افراد میں ہدایت پانے کی صلاحیت ہے وہ ہدایت یافتہ ہو جائیں۔

بعض مفسرین نے اس جملے کو مشرکین کے ان بہانوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو وہ اپنی بُت پرستی کے لیے تراشتے بستے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ: ہم ان بُتوں کی پرستش ان کی وجہ سے نہیں کرتے۔ بلکہ درحقیقت بُت تو آسمان کے ستاروں، پہیروں اور فرشتوں کے منظر اور علامات ہیں اور سجدہ کرتے وقت ہمارے تصور میں تو وہی ہستیاں ہوتی ہیں۔ یہ تو ہم انہی کے احترام میں کرتے ہیں اور ہمارا شورو زیاں بھی اُن ہی کے اختیار میں ہے۔

مگر قرآن یہ کہتا ہے کہ تم جن ذاتوں کو پکارتے ہو خدا اُنہیں خوب جانتا ہے۔ خواہ وہ کچھ بھی ہوں۔ مگر خدا کے حکم اور قدرت کے مقابل میں تاریک بھوت کی مانند ہیں۔ اُن کے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔

زیر نظر آیات میں سے تیسری آیت دشمنانِ پیغمبر کے اُن اعتراضات کا جواب ہے جو وہ اس قسم کی مثالوں پر کیا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ خدا جو زمین و آسمان کا خالق ہے، مگر وہی، مکھی اور اسی طرح کے حشرات کی مثالیں دے۔ قرآن میں اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ ہم لوگوں کے لیے یہ مثالیں بیان کرتے ہیں اور اہل علم کے سوا انہیں کوئی نہیں سمجھتا: (وتلك الامثال لضر بها للناس وما يعقلها الا العالمون)۔

کسی مثال کی اہمیت یا لطافت اُس کے عظیم یا حقیر ہونے میں نہیں ہے بلکہ اس میں ہے کہ وہ اپنے مقصود پر کس طرح منطبق ہوتی ہے۔ بعض اوقات حقیر سی مثال سے اہم نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

بطور مثال۔ جس وقت کہو اور دیے اس سہاروں کی بابت گفتگو ہو تو اُس وقت مثال کے لیے "تاریک بھوت" کا انتخاب عین فصاحت و بلاغت ہے۔ کیونکہ یہ مثال اُس بے اساس و ناپائیدار سہارے کو بہترین انداز سے واضح کرتی ہے۔

اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ اہل علم ہی قرآن میں بیان کردہ مثالوں کی لطافت و نزاکت کا ادراک کرتے ہیں۔

زیر بحث آیات میں سے آخری آیت میں یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ: خدا نے آسمان اور زمین کو حق پر خلق کیا ہے۔ اس میں ایمان لانے والوں کے لیے عظیم نشان ہے: (خلق الله السموات والارض بالحق ان في ذلك لاية للمؤمنين)۔

خدا کا کوئی کام بھی باطل اور عبث نہیں ہے۔ اگر خدا کسی وقت کبھی اور اُس کے کزور اور بے بنیاد گھر کی مثال دیتا ہے تو درست ہے اور اگر وہ مثال کے لیے کسی حقیر سے وجود کا انتخاب کرتا ہے تو حق کو بیان کرنے کے لیے ہے۔ مگر نہ اُس کے لیے کسی بڑی چیز کی مثال کو اختیار کرنا کونسا مشکل تھا کیونکہ وہ تو عظیم کمبختوں اور نظامتے آسمان کا خالق ہے۔

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ان چند آیات کے اخیر میں آیات الہی کے ادراک کا معیار علم و ایمان کو قرار دیا گیا ہے۔ ایک جگہ فرماتا ہے کہ "لو كانوا يعلمون" (اگر وہ جانتے) دوسری جگہ فرماتا ہے: "ما يعقلها الا العالمون" (ان مثالوں کی نزاکت کا بجز عالمان آگاہ کے کون ادراک نہیں کر سکتا)۔

اس آخری آیت میں فرماتا ہے: "ان في ذلك لاية للمؤمنين"۔ اس میں اہل ایمان کے لیے بڑی نشان ہے۔

ان تمام معیارات سے فراد یہ ہے کہ حق تو جمال آفتاب کی طرح روشن ہے مگر اہل اور بیاد دل ہی اُس کی کرنوں سے مستفید ہوتے ہیں۔ وہ قلوب جو آگاہ ہیں اور جستجوئے حق رکھتے ہیں حق کو قبول کرنے کے لیے بیاد رُوح اور قلبِ سلیم کی ضرورت ہے۔ اگر یہ کردل مشرک جمال حق کو نہیں دیکھتے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ مخفی ہے بلکہ سبب یہ ہے کہ وہ بصیرت سے عاری ہیں۔

۲۵۔ اَتْلُ مَا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ
إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللَّهِ
أَكْبَرُ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُونَ ۝

ترجمہ

۲۵۔ کتاب میں سے جو کچھ تم پر وحی کیا گیا ہے اسے پڑھا کرو اور نماز قائم کرو کیونکہ نماز فحشاء اور منکرات سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر بڑا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اسے جانتا ہے۔

تفسیر

نماز اعمالِ قبیح سے روکتی ہے:

پیغمبرانِ اولوالعزم اور اقوامِ گزشتہ کی سرگزشت کے حصے اور ان رہبرانِ الہی سے ان کا نامناسب و ناسزا سلوک اور ان اقوام کی زندگی کے غم انگیز انجام کے بعد، خداوندِ عالم کا روضے سنن بجانب پیغمبر اسلام ان کی دل جوئی، تسلی خاطر، تقویتِ روح اور انہیں ایک، نفعی اور جامع دستورِ عمل دینے کے لیے اُتھلپت ہوتا ہے۔ انہیں دو حکم دیئے گئے ہیں:

اول یہ کہ: کتابِ الہی کا جتنا حصہ تمہیں وحی کیا گیا ہے اس کی تلاوت کرو: ﴿اَتْلُ مَا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ﴾۔ تم ان آیات کو پڑھو کیونکہ تم پر چاہتے ہو وہ ان میں ہے۔ علم و حکمت، نصیحت، مہیا شناخت حق و باطل، وسیلہ تئیر روح قلب اور ہرگز وہ اور ہر جماعت کے لیے زندگی کا پروگرام ان آیات میں موجود ہے۔ تم ان آیات کو پڑھو اور ان پر عمل کرو۔ انہیں پڑھو اور ان سے ہدایت حاصل کرو پڑھو اور ان کی تلاوت سے اپنا قلب روشن کرو۔

پہلے حکم کے بعد جس میں تعزیر کا پہلو ہے۔ دوسرا حکم یہ ہے کہ: نماز قائم کرو۔ ﴿وَأَقِمِ الصَّلَاةَ﴾۔ اس کے بعد ناسکِ عظیمِ فائدہ کا ذکر ہوا ہے۔ اور وہ یہ ہیں۔ نماز انسان کو اعمالِ فحش اور منکرات سے باز رکھتی ہے، ﴿إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾۔

چونکہ نماز کی تشریح یہی ہے کہ وہ انسان کو مہیا و معاوی کی یاد دلاتی ہے جو کہ کج روی سے بچنے رہنے کا قوی ترین سبب ہے۔

۲۔ ”فحشاء“ اور ”منکر“ کا فرق جلد ۶ میں سورہ نمل کی آیت ۹۰ کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ ”منکر“ اور ”فحشاء“ سے مراد نئی گناہان کبیر ہیں اور منکر آٹھ گناہ کبیرہ کی طرف اشارہ ہے۔ یا ”فحشاء“ وہ گناہ ہیں جو قاتلہ شہیہ کے تحت کیے جائیں اور منکر وہ گناہ ہیں جو قوتِ عقیدہ کے تحت کیے جاسکتے ہیں۔

اس لیے وہ اسے اعمالِ فحش اور منکرات سے باز رکھتی ہے۔

جب کوئی آدمی نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو تجسیمِ کتاب ہے۔ یعنی خدا کے ہر شے سے برتر والا ہونے کا اقرار کرنا ہے۔ اس کی نعمتوں کو یاد کرتا ہے، اس کی حمد و ثنا کرتا ہے، اس کی رحمانیت اور رحیمیت کی تعریف کرتا ہے، روزِ جزا کو یاد کرتا ہے۔ اس کی بندگی کا اعتراف کرتا ہے، اس سے عطا و مستقیم کی ہدایت کا خواست گار ہوتا ہے اور گمراہوں اور منغلوب لوگوں کی پیروی سے خدا کی پناہ مانگتا ہے۔ (مضمون سورہ ص)

بدون شک ایسے انسان کے قلب اور روح میں جو پابندِ صلوة ہو قبولِ حق کی تحریک، پاکیزگی کا خیال اور تقویٰ کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ نماز پڑھتے ہوئے آدمی رکوع کرتا ہے اور اپنے خالق کے حضور پیشانی خاک پر رکھتا ہے اور اس کی عظمت کے تصور میں ڈوب جاتا ہے، تو اس کے دل سے خود غرضی اور تجرکے جذبات محو ہو جاتے ہیں۔

وہ توحیدِ الہی کی شہادت دیتا ہے اور پیغمبرِ اکرم کی رسالت کا اقرار کرتا ہے۔ اس حالت میں وہ جناب رسالت مآب پر درود بھیجتا ہے اور خدا کے حضور میں دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کرتا ہے کہ وہ اسے صالح بندوں میں شمار کرے۔ (تشمہ اسلام) یہ تمام امور پابندِ صلوة انسان کے نفس میں روحانی نغمے پیدا کر دیتے ہیں اور اس کی قربتِ روحانی گناہ کے مقابلے میں مستحکم دلوار بن جاتی ہے۔

اس عمل کی شب و روز میں چند بار تکرار ہوتی ہے۔ چنانچہ جب انسان صبح کو نیند سے بیدار ہوتا ہے تو وہ اپنے رب کی یاد میں غرق ہو جاتا ہے۔ وسط روز میں جس وقت آدمی دنیاوی کاروبار میں مصروف ہوتا ہے، ناگاہانہ مؤذن کی صدائے تجسیمِ کتاب تو اپنی مصروفیات کو چھوڑ کر درگاہِ الہی کی طرف رخ کرتا ہے۔ جتنی کہ دن کے ختم ہونے اور رات کے شروع ہوتے وقت اپنے بسر استراحت پر جانے سے پہلے بارگاہِ ایزدی میں حاضر ہو کر اپنے دل کو مرکزِ الوار بناتا ہے۔

علاوہ بریں جس وقت کوئی آدمی نماز کی تیاری کرتا ہے تو پہلے نماز دھوتا اور اپنے آپ کو پاک کرتا ہے۔ ہر حرام اور نجس کو دھو کر اپنے آپ سے دور کرتا ہے۔ پھر بارگاہِ رب العزت میں حاضر ہوتا ہے۔ یہ تمام امور اسے فحشاء اور منکر سے باز رکھتے ہیں۔ بلحاظ شرائط کمالِ اخلاص اور روحِ عبادت جس نمازی کا جتنا مہیا رہے وہ اسی قدر فحشاء اور منکر سے دور رہتا ہے۔ بناسبت مہیا کبھی تو مکمل طور پر انسان بچا رہتا ہے۔ اور کبھی محض طور پر۔

یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی آدمی نماز پڑھے اور اس پر کوئی اثر نہ ہو خواہ اس کی نماز دکھاوے ہی کی کیوں نہ ہو۔ یا وہ شخص آلودہ گناہ ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ ایسی نماز کے نفس پر اثرات کم ہوتے ہیں۔ مگر یہ بات بھی ہے کہ یہ لوگ دکھاوے کی نماز بھی نہ پڑھتے تو اودا زیادہ گناہوں میں آلودہ ہوتے۔

ہم اس مطلب کو قدر سے واضح طور پر یوں بیان کر سکتے ہیں کہ فحشاء اور منکر سے پرہیز کرنے کے بھی بہت سے مراتب و درجات ہیں۔ اور ہر نمازی کا مرتبہ و مقام اس کے روحانی مدارج کمال کے مطابق ہے۔

اس آیت کے متعلق ہم نے جو کچھ سطور بالا میں کہا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں لاعاصل زحمت اٹھائی ہے اور نامناسب تفسیر کے انتخاب میں بیچارہ محنت کی ہے۔ شاید انہوں نے یہ دیکھا کہ بعض لوگ نماز

پڑھتے ہیں اور مرکب گناہ بھی ہوتے ہیں اس لیے انھوں نے آیت کے مطلق معنی پر نظر ڈالی اور سلسلہ مراتب کا لحاظ نہیں کیا۔ لہذا وہ شک میں پڑ گئے اور آیت کی تفسیر کے لیے دوسری راہیں اختیار کر لیں۔

مثلاً — بعض نے کہا ہے کہ نماز انسان کو فحشا اور منکر سے اتنی ہی دیر کے لیے باز رکھتی ہے جب تک وہ مشغول نماز ہوتا ہے۔

یہ کیا عجیب بات ہے۔ یہ کچھ نماز ہی کی خصوصیت نہیں ہے۔ بہت سے اعمال ایسے ہیں کہ ان میں بحالت مشغولیت انسان مرکب گناہ نہیں ہوتا۔

بعض اور لوگوں نے کہا ہے کہ نماز کے اعمال و اذکار ایسے جملے ہیں جن میں سے ہر ایک انسان کو فحشا اور منکر سے باز رکھتا ہے۔ مثلاً بکیر و تبیخ و تہلیل انسان سے کہتی ہے کہ گناہ نہ کر۔ یہ اور بات ہے کہ انسان اس سدا سے ہی کو سنتا ہے یا نہیں۔

اسی طرح بعض نے اس آیت کی اس عنوان سے تفسیر کی ہے کہ اس مقام پر کلمہ "نہی" صرف "نہی تشریحی" ہے وہ اس حقیقت سے غافل رہے ہیں کہ یہاں نہی تکوینی مراد ہے۔ آیت کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ — نماز کی تاثیر ہی انسان کو ازکابیت سے باز رکھنے والی ہے۔ اس لیے آیت زیر نظر کی اصلی تفسیر وہی ہے جو ہم نے سطور بالا میں بیان کی البتہ اس امر میں کوئی مانع نہیں کہ نماز فحشا اور منکر سے نہی تکوینی بھی کرتی ہے اور نہی تشریحی بھی۔

چند توجہ طلب احادیث

(۱) ایک حدیث میں جو بیخبر اسلام سے مروی ہے :

من لم تنه صلواته عن الفحشاء والمنکر لم یزدد
من اللہ الا بعداً

جس آدمی کی نماز اسے فحشا اور منکر سے نہیں روکتی اسے نماز سے خدا سے دوری کے علاوہ اور کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔

(۲) آنحضرتؐ سے ایک اور حدیث میں اس طرح منقول ہے :

لا صلوة لمن لم یطع الصلوة - وطاعة الصلوة ان ینتھی عن الفحشاء
والمنکر -

جو آدمی نماز کے حکم کی اطاعت نہیں کرتا اس کی نماز نماز نہیں ہے۔ اور اطاعت نماز یہ ہے کہ فحشا اور منکر سے اس کی نہی پر عمل کرے۔

لہذا یہ توجہ ہے۔ اس کے ذیل میں دوسری حدیث میں بھی تشریح کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

(۳) آنحضرتؐ سے مروی ہم ایک اور حدیث میں یوں پڑھتے ہیں کہ : انصار میں سے ایک جوان رسول اللہؐ کی اقتداء میں نماز پڑھا کرتا تھا۔ مگر وہ قبیح گناہوں میں مبتلا تھا۔ لوگوں نے رسول اللہؐ سے یہ بات بیان کی تو آپ نے فرمایا :

ان صلواتہ تنہاہ یوماً

آخر کار اس کی نماز کسی دن اسے ان اعمال سے روک دے گی۔

(۴) نماز کا یہ اثر اس قدر اہم ہے کہ بعض روایات میں اسے نماز کے مقبول ہونا مقبول ہونے کا معیار قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ جناب امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے :

من احب ان یعلم اقبلت صلواتہ ام لم یتقبل؟ فلینظر هل
منعت صلواتہ عن الفحشاء والمنکر؟ فبقدر ما
منعتہ قبلت منه

جو آدمی یہ جاننا چاہے کہ اس کی نماز خدا کے حضور میں مقبول ہوئی یا نہیں تو اسے چاہیے کہ یہ دیکھے کہ کیا اس کی نماز نے اسے فحشا اور منکرات سے روکا ہے یا نہیں۔ پس اس کی نماز نے جس قدر اسے ان افعال سے روکا ہے اسی قدر اس کی نماز مقبول ہوئی ہے۔

آیت کے آخر میں یہ الفاظ ہیں (ولذکر اللہ اکبر)۔

"ذکر خدا اس سے بھی زیادہ بڑا و بالا ہے۔"

اس جملے میں نماز کا ایک اہم ترین فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ یعنی نماز کی برکات و آثار میں سے نہی عن الفحشاء والمنکر سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ نماز انسان کو خدا کی یاد میں مشغول کر دیتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو ہر خیر و سعادت کی بنیاد ہے۔ یہاں تک کہ انسان کے فحشا اور منکر سے بچنے کا اصل عامل بھی ذکر اللہ ہی ہے۔ اور حقیقت میں نماز کی جملہ برکات میں سے اس کی برتری کا باعث یہ ہے کہ یہی ہر خیر و سعادت کی بنیاد ہے۔

یاد خدا اصولاً باعث حیاتِ دل اور راحتِ القلوب ہے۔ اور کوئی شے بھی اس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتی۔

الابد ذکر اللہ تطمئن القلوب

آگاہ رہو کہ یاد خدا ہی دلوں کے اطمینان کا سبب ہے۔ (ص ۲۸)

اصولی طور پر تمام عبادات خواہ وہ نماز ہو یا کوئی اور عبادت سب کی روح ذکر خدا ہی ہے۔ نماز کے الفاظ، افعال، نماز، تقدیمات نماز، اور تعقیبات نماز یہ سب کی سب چیزیں درحقیقت انسان کے دل میں یاد خدا کو زندہ کر دیتی ہیں۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ سورہ طہ کی آیت ۱۴ میں نماز کے اس بنیادی فلسفے کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ چنانچہ مومن کی مخاطب

لکھتے ہیں : جمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

کر کے کہا گیا ہے :

اقم الصلوة لذكركي

نماز کو میری یاد کے لیے قائم کر دو۔

بزرگ مفسرین نے جملہ بالا (ولذکر اللہ اکبر) کی اس سے مختلف تفسیریں بھی لکھی ہیں۔ جن میں سے بعض کے متعلق روایات اسلامی میں بھی اشارات ملتے ہیں۔ جملہ ان کے ایک یہ ہے کہ :

خدا تمہیں اپنی رحمت کے وسیلے سے یاد کرتا ہے اور تم اسے اطاعت کے وسیلے سے یاد کرتے ہو۔
دوسرے یہ کہ :- ذکر خدا نماز سے بھی بڑا بالاتر ہے کیونکہ عبادت کی زوج ذکر خدا ہی ہے۔

مذکورہ بالا تفسیر جن میں سے بعض کا ذکر روایات اسلامی میں بھی ہے۔ ممکن ہے کہ ان کا مقصود بطون آیت ہو۔ وگرنہ آیت کا ظاہری مہموم تو وہی ہے جو ہم نے پہلے بیان کیا ہے کیونکہ اکثر مقامات پر جہاں ذکر اللہ آیا ہے اس سے مراد بندوں کا خدا کو یاد کرنا ہے۔ آیت بالا سے بھی ذہن اسی مہموم کی طرف مائل ہوتا ہے۔ لیکن یہ خیال کہ خدا بندوں کو یاد کرتا ہے، تو بڑا سنگین ہے کہ یہ براہ راست تعبیہ ہو، اس بات کا کہ بندے خدا کو یاد کرتے ہیں۔ اس طرح سے ان دونوں معانی کا تضاد برطرف ہو جاتا ہے۔

معاذ بن جبل سے منقول ایک حدیث کے مطابق عذاب الہی سے نجات کے لیے انسان کا کوئی عمل بھی " ذکر اللہ سے بہتر نہیں ہے تو اس کے بارے میں لوگوں نے ان سے سوال کیا کہ کیا اللہ خدا میں بہاد بھی اس سے بہتر نہیں ہے۔ تو معاذ بن جبل نے جواب دیا کہ میں نے اسے نہیں فرمایا۔

ولذکر اللہ اکبر

ظاہراً یوں لگتا ہے کہ معاذ بن جبل نے یہ بات رسول اللہ سے سنی تھی کیونکہ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں نے پیغمبر خدا سے سوال کیا کہ تمام اعمال میں کونسا عمل بڑتر ہے ؟

تو رسول اللہ نے فرمایا :

ان تموت ولسانک رطب من ذکر اللہ عزوجل

یہ کہ مرتے وقت تیری زبان ذکر الہی میں شغول ہو۔

انسان کی نیت اور اس کے حضور قلب کی کیفیت و کیفیت نماز اور دیگر تمام عبادت میں مختلف رہتی ہے اس لیے آیت کے آخر میں ان الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے : (واللہ یعلم ما تصنعون)۔ یعنی خدا جانتا ہے کہ تم کیا کام کرتے ہو۔

تم کوئی اعمال معنی طور پر یاد رکھنے سے آشکارا طور پر انجام دیتے ہو۔ تمہاری کیا کیا نیتیں ہوتی ہیں اور تم زبان سے کیا کچھ کہتے ہو۔ خدا ان سب باتوں کو جانتا ہے۔

فرد اور جماعت کی تربیت میں نماز کا اثر :

اگرچہ نماز ایسی چیز نہیں کہ اس کا فلسفہ کسی سے مخفی ہو۔ لیکن جب ہم متون آیات اور روایات اسلامی کو دقت نظر سے دیکھتے ہیں تو بہت سی باریکیاں اور نکات ہمارے سامنے آتے ہیں، مثلاً :

۱۔ نماز کا فلسفہ اس کی روح و اساس، مقصد و عمل اور نتیجہ غرض سب کچھ یاد خدا ہے۔ یعنی وہی ذکر اللہ جسے آیت بالا میں " بزرگین " کہا گیا ہے۔

البتہ " ذکر " ایسا ہونا چاہیے جو تمہیں فکر و اور فکر وہ کہ جو محرک عمل ہو۔ جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث " ولذکر اللہ اکبر " کی تفسیر میں منقول ہے۔ آپ نے فرمایا :

ذکر اللہ عند ما احل و حرم

افعال حلال و حرام کے بارے میں خدا کو یاد کرنا (یعنی خدا کا ذکر ایسا ہونا چاہیے کہ انسان حلال کام انجام دے اور حرام سے بچے)۔

۲۔ نماز گناہوں کو دھو دیتی ہے اور خدا کی مغفرت و بخشش کا وسیلہ ہے۔ کیونکہ نماز انسان کو توبہ اور اصلاح عمل پر آمادہ کرتی ہے۔ اس لیے ایک حدیث میں ہے کہ جناب رسول خدا نے اپنے اصحاب سے سوال کیا :

لو کان علی باب دار احدکم نھر و اغتسل فی کل یوم منہ خمس مرات اکان ینقی فی جسده من الذنوب شئ ؟

قلت لا۔ قال :- فان مثل الصلوة کمثل النھر الجاری کلما صلی کفرت ما بینہما من الذنوب۔

اگر تم میں سے کسی کے مکان کے دروازہ کے سامنے صاف و پاکیزہ پانی کی نہر ہو اور وہ آدمی دن میں پانچ دفعہ اس نہر میں غسل کرے تو کیا اس آدمی کے جسم پر کسی قسم کی کثافت اور مکین باقی رہ جائے گا ؟

جواب میں عرض کیا گیا۔ نہیں۔

تب رسول اللہ نے فرمایا : نماز بھی اسی آپ جاری کی مانند ہے۔ جس وقت بھی انسان نماز پڑھتا ہے تو وہ گناہ جو دو نمازوں کے درمیان اس نے انجام دیئے ہوتے ہیں، محو ہو جاتے ہیں۔

اس طرح سے انسانی روح پر گناہوں سے جو زخم لگ جاتے ہیں نماز کی مرہم سے بھر جاتے ہیں اور دل پر جو زنگ لگ جاتا ہے وہ صاف ہو جاتا ہے۔

۱۔ بحار انوار جلد ۸۲ صفحہ ۳۔

۲۔ رسائل مشیخہ جلد ۳، صفحہ ۲ (باب ۲ از ابواب اعداء العنکبوت حدیث ۳)۔

۱۔ اس صیر کے مطابق اس مقام پر اللہ قائل ہے۔ لیکن گوشہ تفسیر کے مطابق آیت میں مذکور فعل کا قائل ہے۔

۳۔ نماز آئندہ گناہوں کے مقابلے میں دیوار بن جاتی ہے کیونکہ وہ انسان کے اندر رُوحِ ایمانی کو قوی کرتی ہے اور دل میں تقویٰ کے پودے کی پرورش کرتی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ایمان و تقویٰ گناہوں کو روکنے کے لیے مضبوط ترین دیوار ہیں اور یہی وہ چیز ہے جسے زیر بحث آیت میں "تمھاری عنق الفحشاء والمنکر" کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ اس مطلب کی متعدد احادیث کے مطابق پیشوایانِ اسلام کے سامنے بعض گناہ گار لوگوں کا حال بیان کیا گیا تو انھوں نے فرمایا:

فکر نہ کرو۔ نماز ان کی اصلاح کر دے گی۔

۴۔ نماز غفلت کو ڈور کر دیتی ہے۔ راہِ حق کے راہیوں کے لیے سب سے بڑی نصیحت یہ ہے کہ وہ اپنے مقصدِ تخلیق کو ٹھنوں جائیں اور زندگی کی مادی راحتوں اور زبرد گزرنے والوں میں غرق ہو جائیں۔

مگر نماز جو کہ وقت کے مختلف فاصلوں سے ہر شب و روز میں پانچ بار ادا کی جاتی ہے۔ مسلسل انسان کو آگاہ اور متنبہ کرتی رہتی ہے۔ وہ انسان کو اس کا مقصد آفرینش سمجھاتی رہتی ہے اور دنیا میں اس کی حیثیت اور فرست آگاہ کرتی رہتی ہے۔ انسان کے لیے یہ ایک بڑی نعمت ہے کہ "اس کے پاس ایک ایسا وسیلہ ہے جو ہر رات دن میں اسے ہند متنبہ خواہ غفلت سے جگاتا رہتا ہے۔"

۵۔ نماز تجزیہ اور خود بینی کو ڈور کر دیتی ہے۔ کیونکہ انسان ہر شب و روز میں سترہ رکعت نماز پڑھتا ہے اور ہر رکعت میں دو با خدا کے سامنے خاک پر پیشانی رکھتا ہے۔ اس حالت میں اپنے آپ کو اس کی عظمت کے سامنے صرف ایک ذرہ ناچیز ہی نہیں بلکہ اس کی لامحدودیت کے مقابلہ میں ایک صفر سمجھتا ہے۔

نماز انسان کے غرور اور خود پرستی کو ڈور کر دیتی ہے نیز تجزیہ اور احساسِ برتری کو ختم کر دیتی ہے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنی اس معروف حدیث میں جس میں عباداتِ الہی کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے، ایمان کے بعد نماز کو جو افضل عبادات ہے، کی یہی غایت بیان فرمائی ہے:

فرض الله الاميمان تطهيرا من الشرك والصلوة تنزيها عن الكبر

خدا نے ایمان کو شرک کی نجاست سے پاک کرنے کے لیے فرض کیا اور نماز کو جبر سے پاک کرنے کے لیے۔ (صحیح ابلاغ، کلمات تصار ۲۵۲)۔

۶۔ نماز انسان کے فضائلِ اخلاق اور اس کے کمالِ روحانی کی پرورش کا وسیلہ ہے کیونکہ وہ انسان کو عالمِ مادی اور عالمِ طبیعت کی چار دیواری سے آزاد کرتی ہے اور اسے ملکوتِ آسمانی کی طرف بلائی ہے۔ اُسے فرشتوں کے ساتھ ہم صدا اور ہم راہ کر دیتی ہے۔ انسان حالتِ نماز میں اپنے آپ کو بلا واسطہ خدا کے سامنے محسوس کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں اُس سے باتیں کر رہا ہوں۔

شب و روز میں انسان کی مرتبہ اس عمل کی محکرا کرتا ہے۔ اس صورت میں کہ انسان خدا کی صفاتِ رحمانیت و رحیمیت اور

اس کی عظمت کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اور سورۃ الحمد کہ جو نیکی اور پاکبازی کی بہترین رہبر ہے، کے بعد قرآن کی دوسری آیات و تلاوت کرتا ہے۔ یہ عمل نفسِ انسانی میں بہترین فضائلِ اخلاق کی پرورش کرتا ہے۔

حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے فلسفہ نماز کے متعلق ایک حدیث میں فرمایا:

الصلوة قربات کل تقی

نماز ہر پرہیزگار کے لیے تقربِ الہی کا وسیلہ ہے۔

۷۔ نماز انسان کے تمام اعمال کو قدر و قیمت اور رُوحِ عطا کرتی ہے۔ کیونکہ نماز انسان کے اندر رُوحِ اخلاص کو زندہ کرتی نماز نیتِ خالص، گفتارِ پاک اور اعمالِ صالح کا مجموعہ ہے۔ رات دن میں ان تمام چیزوں کی محکرا انسان کی رُوح پر تمام اعمال خیر کا بیج بکھرتی ہے۔ اور نفس کی کینیتِ اخلاص کو تقویت بخشتی ہے۔

ایک مشہور روایت میں ہے کہ جب امیر المومنین علی ابن ابی طالب کا سراقہ بن غلام ابن مہلم کی تلوار سے شگافتہ چکا تھا تو آپ نے اپنی وصیتوں میں یہ بھی فرمایا:

اللہ اللہ فی الصلوة فانھا عمود دینکم

نماز کے بارے میں خدا سے ڈرو، خدا سے ڈرو کیونکہ وہ تمہارے دین کا ستون ہے۔

یہ مسلم ہے کہ اگر جو چیز ٹوٹ جائے یا گر پڑے تو شیخ کی طنابیں یا مینیں خواہ کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہوں وہ بے فائدہ ہیں۔ اسی طرح اگر نماز کے وسیلے سے بندوں کا خدا سے تعلق باقی نہ رہے، تو دوسرے اعمال بے اثر ہو جاتے ہیں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک حدیث مروی ہے:

اول ما یحاسب به العبد الصلوة فان قلبت قبل سائر عمله وان ردت رة علیہ سائر عمله۔

قیامت میں جس چیز کا سب سے پہلے بندوں سے حساب لیا جائے گا وہ نماز ہے۔

اگر خدا نے نماز کو قبول کر لیا تو دیگر اعمال بھی مقبول ہو جائیں گے اور اگر وہ رد کر دی گئی تو تمام اعمال رد ہو جائیں گے۔

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ نماز خالق و مخلوق کے درمیان ایک راز ارتباط ہے۔ اگر نماز اپنی شرائط کے ساتھ صحیح طور پر ادا ہو جائے تو اس میں قربت اور اخلاص کے جذبات کہ جو جملہ اعمال کی قبولیت کی بنیاد ہیں، فطرتاً پیدا ہو جاتے ہیں اور اگر اخلاص اور نیتِ صادق نہ ہو تو تمام اعمال بیکار اور غیر نتیجہ بخش ہیں اور اعتبار کے درجے سے ساقط ہو جاتے ہیں۔

۸۔ مشتملات نماز سے قطع نظر اگر نماز اپنی شرائط کے ساتھ توجہ سے ادا کی جائے تو وہ انسان کو تقویٰ کا عادی بنا دیتی ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ صحبتِ صلوة کی شرائط میں یہ امور شامل ہیں کہ نماز گزار کا مکان، اس کا لباس، وہ فرش

۱۔ صحیح ابلاغ، کلمات تصار جلد ۱۲۶۔

۲۔ صحیح ابلاغ، وصیت ۲۷۔

جس پر وہ نماز پڑھتا ہے۔ وہ پانی جس سے وضو اور غسل کرتا ہے اور وہ مقام جہاں وہ غسل اور وضو کرتا ہے، ان سب کو غصب سے بھرا اور دوسروں کے حقوق پر تجاوز سے پاک ہونا چاہیے۔
جس آدمی کا کردار تجاوز، ظلم، سُود خوری، غصب، کم فروشی، رشوت خوری اور کسبِ اموالِ حرام سے آلودہ ہو تو وہ اواسے نماز کی شرائط کو کیونکر پورا کر سکتا ہے۔

۹۔ اس بنا پر رات دن میں پانچ مرتبہ نماز کی تکرار بنی نوع انسان کے حقوق کا احترام کرنے کی تعلیم دیتی ہے۔ نماز کے لیے، ان شرائط کی صحت کے علاوہ جو اُس کی قبولیت کے لیے لازمی ہیں کچھ اور شرائطِ کمال بھی ہیں کہ ان کا لحاظ رکھنا بہت سے گناہوں کے ترک کرنے کے لیے مؤثر ہے۔ علمِ فقہ اور حدیث کی کتابوں میں ایسے بہت سے اُتھر کا ذکر ہے جن کی وجہ سے نماز قبول نہیں ہوتی۔ ان میں سے ایک شراب خوری بھی ہے۔ روایات میں ذکر ہے کہ :-

لا تقبل صلوة شارب الخمر اربعین يوماً الا ان يتوب
شراب خوار کی نماز چالیس روز تک قبول نہیں ہوتی مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ توبہ کرے۔

متعدد روایات میں ہے کہ جن لوگوں کی نماز قبول نہیں ہوگی ان میں سے ظالم رہنا بھی ہے۔ بعض دوسری روایات میں یہ تصریح موجود ہے کہ جو آدمی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا اُس کی نماز قبول نہیں ہوگی۔ اسی طرح اور روایات میں آیا ہے کہ حرام غذا کھانے، غرور و تجر اور خود بینی سے بھی نماز قبول نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ قبولیت نماز کی تمام شرائط کو ملحوظ رکھنے سے کسی تربیتِ اخلاق ہوتی ہے۔

۱۰۔ نماز انسان میں نظم و ضبط کی عادت پیدا کرتی ہے کیونکہ اُسے لازماً معین وقت پر ادا کرنا ہوتا ہے۔ سر نماز کی ادائیگی میں تقسیم یا تاخیر دونوں سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سے نماز کے دیگر آداب و احکام ہیں، مثلاً نیت، قیام و قعود، رکوع و سجود وغیرہ کہ جب انسان ان سب کو پوری توجہ کے ساتھ ٹھیک ٹھیک ادا کرتا ہے تو اُس کے کردار اور اُس کی زندگی کے نظام میں نظم و ضبط کا پیدا ہو جانا آسان ہو جاتا ہے۔

نماز باجماعت سے قطع نظر کرتے ہوئے فردی نماز میں یہ تمام فوائدِ مضر ہیں۔ اور ہم ان پر خصوصیاتِ جماعت کا اندازہ کریں کہ جو روح نماز کا تقاضا ہے تو نماز میں اور بھی بے شمار برکات ہیں، جن کے تفصیلی ذکر کا یہاں موقع نہیں ہے۔ علاوہ بریں ہم سب ہی کم و بیش انھیں جانتے ہیں۔

فلسفہ و اسرار نماز کے متعلق امام علی ابن موسیٰ الرضا علیہ السلام کی ایک جامع حدیث نقل کر کے ہم اپنے بیان کو ختم کرتے ہیں۔

امام کی خدمت میں ایک خط آیا جس میں فلسفہ نماز کے متعلق سوال کیا گیا تھا تو اُس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ :
نماز کے واجب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اُس کی ادائیگی کے دوران میں انسان کی توجہ اللہ کی طرف ہوتی ہے اور

۱۔ بحار انوار، ج ۸۴، ص ۳۱۳ تا ۳۱۴۔

۲۔ بحار، ج ۸۴، ص ۳۱۵۔

وہ اپنے پروردگار کی ربوبیت کا اقرار کرتا رہتا ہے۔ نمازی آدمی شرک و بت پرستی کے خلاف جنگ کرتا ہے، اپنے پروردگار کے حضور نہایت خضوع و خشوع سے کھڑا ہوتا ہے، وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہے، اپنے گزشتہ گناہوں کی خدا سے بخشش طلب کرتا ہے۔ اور ہر روز خدا کی تعظیم کے لیے زمین پر پیشانی رکھتا ہے۔

نماز کا مقصد یہ بھی ہے کہ انسان ہمیشہ ہوشیار رہتا ہے اور اس بات کو یاد رکھتا ہے کہ خدا سے غفلت کا گرد و غبار اس کے دل پر نہ بیٹھنے پائے، وہ دنیا کی دولت پرست و مغرور نہ ہو جائے، بلکہ ہمیشہ خدا کے حضور میں خضوع و خشوع کی حالت میں رہے اور اُس سے دنیا کی دولت اور دین کی نعمات میں اضافے کا طالب ہو۔

علاوہ بریں ذکرِ خدا کا تسلسل کہ جو نماز کے سبب سے حاصل ہوتا ہے، اس امر کا موجب ہوتا ہے کہ انسان اپنے مولا، مُدبّر اور خالق کو فراموش نہیں کرتا اور اُس پر سرکشی کے جذبات کا غلبہ نہیں ہوتا۔

خدا کی طرف یہی توجہ اور اُس کی درگاہ میں حاضری انسان کو گناہوں سے باز رکھتی ہے اور طرح طرح کی برائیوں سے بچاتی ہے۔

- ۲۶۔ وَلَا تَجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۗ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ وَقَوْلُوا آمَنَّا بِالَّذِي أُنزِلَ إِلَيْنَا وَأَنْزَلَ إِلَيْكُمُ وَالْهَنَا وَالْهَكْمُ وَاحِدٌ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۝
- ۲۷۔ وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ ۗ فَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۖ وَمِنْ هَؤُلَاءِ مَنْ يُؤْمِنُ بِهِ ۖ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الْكَافِرُونَ ۝
- ۲۸۔ وَمَا كُنْتُمْ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكُمْ إِذَا لُمْتُمُ الْمُبْطِلِينَ ۝
- ۲۹۔ بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ لِقَوْمٍ أُولُوا الْعِلْمَ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الظَّالِمُونَ ۝

ترجمہ

۲۶۔ اور تم اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر احسن طریقے سے، سوائے ان لوگوں کے جو ظلم کے مرتکب ہوں اور ان سے کہو کہ خدا کی طرف سے جو کچھ ہم پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمارا تمہارا معبود ایک ہے اور

- ہم اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔
- ۲۷۔ اس طرح ہم نے تمہارے اوپر کتاب نازل کی ہے پس جن لوگوں کو ہم نے اس سے قبل آسمانی کتاب دی تھی وہ اس کتاب پر ایمان لائیں گے اور (مشرکین کے) اس گروہ میں سے بھی بعض اس پر ایمان لائیں گے اور ہماری آیات کا کفار کے سوا کوئی انکار نہیں کرتا۔ اور تم نے اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھی اور اپنے ہاتھ سے کچھ نہیں لکھا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ لوگ ضرور شک کرتے کہ جو تمہاری باتوں کو باطل کرنے کے درپے ہیں۔
- ۲۸۔ بلکہ یہ (کتاب آسمانی) روشن آیات ہیں جو ان لوگوں کے سینوں میں ہیں، جنہیں علم دیا گیا ہے۔ اور ظالموں کے سوا ہماری آیات کا کوئی انکار نہیں کرتا۔

تفسیر

بحث کے لیے بہترین روش اختیار کرو :

گزشتہ آیات میں جاہل اور آمادہ بجنگ بُت پرستوں کے متعلق گفتگو تھی، جس کا لہجہ متفصائے حال کے مطابق تند اور سخت تھا۔ اُن میں اُن کے مجبوروں کو تار عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور بتایا گیا تھا۔

لیکن آیات زیر بحث میں اہل کتاب سے بحث و مباحثہ کا ذکر ہے کہ وہ عمدہ طریقے سے ہونا چاہیے۔ کیونکہ انہوں نے کتب آسمانی اور انبیاء کے احکامات کچھ تو سنے تھے۔ اور مُدْتَلِّ بات سُننے کے لیے وہ کچھ زیادہ آمادہ تھے۔ یوں بھی ہر آدمی سے اس کی عقل و علم اور اخلاق کے معیار کے مطابق گفتگو کرنی چاہیے۔

اس سلسلے میں پہلے یہ فرمایا گیا ہے کہ بجز اس روش کے جو سب سے بہتر ہے اہل کتاب سے بحث نہ کرو (ولا تجادلوا اهل الكتاب الا بالتي هي احسن)۔

"لا تجادلوا" کا مادہ "جدال" ہے۔ اس کے حقیقی معنی رستی کو بیٹھنا، بل دینے اور اسے مضبوط کرنے کے ہیں۔ یہ کلمہ مضبوط عمارت وغیرہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

جب دو آدمی کسی موضوع پر بحث کرتے ہیں۔ تو ہر ایک کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے کو اس کے عقیدے سے

۱۔ اَلَّتِي مَرْصُوفٌ مَقْدَرٌ كَيْفِيَّةٌ سَفَتْ هِيَ سَفَلًا "الطَّرِيقَةُ"۔

مژدے اس وجہ سے اس عمل کو "مجادلہ" کہتے ہیں۔ کشش لڑنے کو بھی "جدال" کہتے ہیں۔ بہر کیف اس مقام پر "تجادلوا" سے مراد مدلل گفتگو ہے۔

اس مقام پر "الٹی ہی احسن" کہنا نہایت جامع تعبیر ہے کیونکہ یہ الفاظ مباحثے میں ہر لحاظ سے صحیح اور مناسب طریقہ اختیار کرنے کا مفہوم لیے ہوئے ہیں خواہ وہ الفاظ کا استعمال ہو، خواہ گفتگو کے مشمولات ہوں، خواہ طرز گفتگو ہو، خواہ گفتگو کے دوران میں دیگر امور ہوں۔

بنابریں اس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ بدورانِ مباحثہ، تمہارے الفاظ مودبانہ ہوں، گفتگو کا لہجہ دوستانہ ہو اور مضمون مدلل ہو۔ آہنگ صدا میں شور و غل، خشونت اور ہتک احترام کا شائبہ نہ ہو۔ اسی طرح باتوں اور جہش و ابرو کی حرکات جن سے انسان اپنا مطلب واضح کرتا ہے نہایت ہتذب ہوں۔

تعبیرات قرآن بھی کیسی جامع ہیں کہ ایک مختصر سے جملے میں معنی کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ یہ نصیحت اس وجہ سے کی گئی ہے کہ اسلامی نقطہ نگاہ سے بحث کی غایت غرض مقابل کو شرمندہ کرنا، اُسے شکست دینا یا اس پر تقویٰ حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ طرف ثانی کے دل میں ہمارے کلام کا اثر ہو اور حق اس کی رُوح کو کھرائے۔ یہ مقصود بہترین طور پر اسی انداز گفتگو سے حاصل ہو سکتا ہے جس کی قرآن میں نصیحت کی گئی ہے۔

حقیقی کرلیا کرنا ہے کہ انسان کسی کے سامنے قول حق کو اگر اس طرح پیش کرے کہ عرف ثانی کو خیال پیدا ہو کہ یہ تو میرے ہی دل کی بات ہے، تو وہ حق کی طرف ہست جلد مائل ہو جاتا ہے کیونکہ انسان اپنے افکار سے اپنی اولاد کی طرح پیار کرتا ہے۔ اسی وجہ سے کہ قرآن مجید میں بہت سے مسائل سوالیہ انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ تاکہ اس سوال کا جواب مخاطب کے دل سے موج زن ہو اور وہ اسے اپنی ہی بات سمجھے۔

مگر ہر قانون میں استثنا بھی ہوتا ہے۔ مثلاً اسی اسلامی اصولِ بحث کے تحت نرم گفتاری اور حُسنِ منظم کو بعض اوقات فریقِ مخالف توفیق کی کمزوری پر محمول کر سکتا ہے یا ممکن ہے کہ یہ معنی بر انسانیت شیوہ گفتار طرف مقابل کی جرات اور جسارت میں اضافہ کر دے۔ اسی لیے آیت کے آخر میں ان الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے مگر ان لوگوں کے ساتھ یہ اسلوب گفتگو اختیار نہ کرو جنہوں نے ان میں سے ظلم کیا ہے: (الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ)۔

یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے اُدپر اور دوسروں پر ظلم کیا اور انہوں نے بہت سی آیاتِ الہی کو چھپایا تاکہ لوگ پیرایہ اسلام کے اوصاف سے آشنا نہ ہوں۔

وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا۔ اور۔ خدا کے ان احکامات کی توہین و تخفیر کی جو ان کے مفادات و دنیا کے خلاف تھے۔ وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا اور مشرکین کی طرح دین میں خرافات شامل کر لیں مثلاً: حضرت مسیح یا عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہنے لگے۔ مختصر یہ کہ۔ ان لوگوں کے ساتھ نرم گفتاری لا حاصل ہے کہ جنہوں نے ظلم کیا ہے اور استدلال گفتگو کی بجائے تلوار کھینچ لی اور دلیل کی بجائے طاقت پر بھروسہ کیا اور امن و صلح کی بجائے شیطنت اور شرارت پر اتر گئے۔

آیت کے آخر میں "مجادلہ احسن" کی ایک ایسی مثال پیش کی گئی ہے کہ وہ اس قسم کی بحثوں کے لیے ہمیشہ ایک نادر نوحہ ہے۔

چنانچہ فرمایا گیا ہے: تم ان سے کہو کہ ہم اُس پر جو خدا کی طرف سے ہم پر اور تم پر نازل ہوا ہے، ایمان رکھتے ہیں، تمہارا اور ہمارا مجبوز ایک ہے اور ہم اُس کی اطاعت کرتے ہیں: (وقولوا امنا بالذی اُنزل الینا و انزل الیکم و الہنا و الیکم واحدٌ و نحن لہ مسلمون)۔

اس آیت میں گفتگو کا کیا ہی دلچسپ اسلوب اور کیسا ہی پیارا طرز ہے۔ اُس شے پر جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی ایمان اور عقیدہ کی ہم آہنگی ہے۔ تمام تعصبات کو دور کر دیا گیا ہے۔ ہم اور تم کا تفرقہ مٹا دیا گیا ہے اور آخر میں توحید باری تعالیٰ کا اقرار ہے اور غیر شرط طور پر اُس کی اطاعت کا اقرار ہے۔

"مجادلہ احسن" کا یہ ایک نمونہ ہے کہ جو کوئی اُسے سنتا ہے وہ طبعاً پسند کرتا ہے۔ یہ اسلوب گفتگو ثابت کرتا ہے کہ اسلام "گردہ بندی" نہیں چاہتا اور نہ وہ بنی نوع میں تفرقہ اندازی کو پسند کرتا ہے۔ اسلام تو صرف وحدت کی دعوت دیتا ہے، ہر حق بات کو مان لینے کی نصیحت کرتا ہے۔

اس قسم کی بحث کے نمونے قرآن میں بکثرت ہیں۔ ان میں سے ایک وہ ہے جس کی طرف امام صادق علیہ السلام نے ایک حدیث میں اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

"مجادلہ احسن" کی مثال وہ گفتگو ہے جو "سورہ یسین" کے آفرینِ منکرین معاد کے سلسلے میں آئی ہے۔

وہ منکرین جب ایک برسیدہ بڑی کو رسول اللہ کے سلسلے لائے اور کہا کہ کس میں یہ قدرت ہے کہ اسے دوبارہ زندہ کر دے؟ تو جواب میں آنحضرت نے فرمایا:

"یَحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ..."

وہی خدا جس نے پہلے پیدا کیا تھا زندہ کرے گا۔ وہی خدا جو سبز درخت سے تمہارے لیے آگ پیدا کرتا ہے۔

اس کے بعد کی آیت ان چار اصولوں کی تاکید کے طور پر آئی ہے جو آیت ماقبل میں بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے: ہم نے تم پر ایسی طرح کتاب آسمانی نازل کی ہے: (وَكَذَلِكَ أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ)۔

اس قرآن کے نزول کی اساس یہ ہے کہ ذاتِ مجبوز واحد و یکتبہ، تمام پیرانِ برحق کی دعوت کی غایت ایک ہی تھی، فرمانِ الہی کی بے چون و چرا اطاعت کی جائے اور لوگوں سے مجادلہ و مباحثہ بہترین طریقہ پر کیا جائے۔

بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ اس جملے میں پیغمبر خدا پر نزولِ قرآن کو، انبیاء ماقبل پر نازل ہونے والی کتابوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یعنی جس طرح ہم نے گزشتہ پیغمبروں پر آسمانی کتابیں نازل کیں اسی طرح تم پر بھی قرآن نازل کیا ہے۔

مگر پہلی تفسیر زیادہ پر معنی معلوم ہوتی ہے۔ ہر چند کہ دونوں تفسیر کو قبول کر لینا بھی ممکن ہے۔

اس کے بعد قرآن اضافہ کرتا ہے: وہ لوگ جنہیں ہم نے اس سے قبل آسمانی کتاب دی تھی (اور وہ واقعی اس کی اتباع کرتے ہیں) وہ اس کتاب پر ایمان لے آئیں گے: (الَّذِينَ آمَنُوا بِالْكِتَابِ الَّذِي وَضَعْنَا لَكَ مِنْ قَبْلِهِ وَأَتُواهُ حَتَّىٰ كُنْتُمْ تُخْرَجُونَ مِنَ الْمَسْجِدِ وَمِنَ الْمَسْجِدِ يُخْرَجُونَ مِنْهُ يَسْتَفْهِمُونَ)۔
کیونکہ انھوں نے اس کتاب کی صداقت کی نشانیاں اپنی کتاب میں دیکھی ہیں۔ نیز یہ کہ وہ اصولی طور پر اس کتاب کے مضامین کو اپنی کتاب کے مضامین سے ہم آہنگ پاتے ہیں۔

مگر ہم جانتے ہیں کہ تمام اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) پیغمبر اسلام پر ایمان نہیں لائے۔ اس بنا پر یہ جملہ حقیقی اور طالبانِ حق مومنین کے لیے آیا ہے جو ہر قسم کے تعصبات سے پاک تھے اور جن کے لیے درحقیقت "اہل کتاب" کی صفت موزوں تھی۔

اس کے بعد مزید کہا گیا ہے: ان میں سے بھی ایک گروہ اہلِ مکر و مشرکین (ع) اس (قرآن) پر ایمان لے آئے گئے (وَمِنَ هَؤُلَاءِ مَنْ يُؤْمِنُ بِالْمَعْرُوفِ)۔

آیت کے آخر میں دونوں قسم کے کفار کے متعلق کہا گیا ہے: ہماری آیات کا کفار کے علاوہ کوئی بھی انکار نہیں کرتا۔ (وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الْكَافِرُونَ)۔

"جحد" کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کسی چیز کا مستحق تو ہو مگر بظاہر اس کا انکار کرتا ہو۔ لہذا مذکورہ بالا جملے کا مفہوم یہ ہو گا کہ درحقیقت کفار اپنے دل میں ان آیات کی عظمت کے معترف تو ہیں اور وہ اس کلام میں صداقت و راستی کی علامات کا ادراک بھی کرتے ہیں۔ نیز جناب رسالت مآب کی پاکیزہ سیرت اور ان کے پرکاروں کے مخلصانہ کردار کو دیکھ کر وہ اس کلام کی حقیقت کے قائل ہیں مگر بزرگوں کی کورانہ تقلید، جاہلانہ تعصب اور نامشروع اور دقیق ذنیباہی مفاد کا خیال انھیں انکار پر آمادہ کر دیتا ہے۔ اور کلمہ الحق کئے سے روکے رکھتا ہے۔

اس ترتیب سے خدا نے قرآن کے مقابلہ میں مختلف اقوام کے موافق کو بیان کیا ہے۔

ان میں سے ایک صف میں اہل ایمان ہیں۔ چاہے وہ علمائے اہل کتاب اور ان میں سے راست باز مومنین ہوں۔ یا وہ مشرک ہوں۔ جو تشنہ حق تھے مگر جب انھوں نے حق کو پایا تو اس سے دل لگا لیا۔
دوسری صف میں ہٹ دم مشرکین ہیں۔ جنھوں نے حق کو دیکھا مگر چونکہ ان کی طرح اس نور سے چھپ گئے کیونکہ ان کے تارو پود میں کفر کی ظلمت سمائی ہوئی تھی، اس لیے انھیں نور ایمان سے وحشت تھی۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ گروہ ثانی نزول آیات سے پہلے بھی کافر ہی تھا۔ لیکن ان کے کفر پر تاکید مزید ممکن ہے کہ اس وجہ سے جو کہ اس سے قبل ان پر انعامِ بخت نہ ہوئی تھی۔ اب انعامِ بخت کے بعد ان کا کفر حقیقی ثابت ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہ علوم آگاہی

۱۔ بعض مفسرین نے جملہ "الَّذِينَ آمَنُوا بِالْكِتَابِ الَّذِي وَضَعْنَا لَكَ مِنْ قَبْلِهِ" سے اہل کتاب مراد لی ہے۔ مگر یہ تفسیر مستبعد نظر آتی ہے۔ کیونکہ "الَّذِينَ آمَنُوا بِالْكِتَابِ" اور اسی میں عبرت

قرآن میں بود و نصاریٰ کے سوا کسی اور کے لیے استعمال نہیں ہو سکتا۔

۲۔ "فَوَاتِنَ" میں سے ہیں "جحد" کے معنی ہیں "اس بات کی نفی جس کا دل میں اثبات برادر اس بات کا اثبات جس کی دل میں نفی ہو۔"

کے باوجود وہ زاہد ستیم کو چھوڑ کر دانستہ گمراہ ہوئے ہیں۔

اس کے بعد پیغمبر اسلام کے دعویٰ کی حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے (جو کہ حقیقت میں آریہ گزشتہ کے مضمون پر تاکید ہے) فرمایا گیا ہے:

اے رسول! تم نے قرآن نازل ہونے سے قبل کوئی کتاب نہیں پڑھی اور تم ہرگز اپنے ہاتھ سے کچھ نہ کہتے تھے، تاکہ ایسا نہ ہو کہ تمہارے وہ دشمن جو ہر وقت تمہاری دعوت کی تکذیب کی فکر میں رہتے ہیں۔ انھیں شک و تردد کا موقع مل جائے اور وہ کہیں کہ جو کچھ یہ شخص کہتا ہے وہ پُرانی کتابوں کے مطالبے اور ان سے اخذ و نقل کا نتیجہ ہے: (وَمَا كُنْتُمْ تُتْلَوْنَ مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخْطَوْنَ بَيْنَ يَدَيْكُمُ الْاَمْثَالَ الْمَبْتُورِينَ)۔

اے رسول! تم ہرگز مکتب میں نہیں گئے اور کبھی عبارت نہیں لکھی لیکن یہی الہی کے ذریعے مدرسین کو پڑھانے والا معاملہ ہو گیا۔ بھلا اس بات کا کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ ایک شخص نے نہ تو کبھی سبق پڑھا ہو، نہ کبھی کسی استاد اور مکتب کی شکل دیکھی ہو اور وہ اپنی طرف سے ایک کتاب تصنیف کر کے لے آئے اور تم بنی نوع انسان کو مقلدے کا چیلنج کر دے اور سب لوگ اس جیسی کتاب تصنیف کرنے سے عاجز ہو جائیں؟

کیا۔ رسول کا یہ اعجاز اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ یہ سب کچھ خدا کی لامحدود قدرت کی وجہ سے ظہور میں آ رہا ہے اور انہوں نے جو کتاب پیش کی ہے وہ آسمانی ہے جو کہ خدا کی طرف سے ان پر نازل ہوئی ہے۔

اگر کوئی شخص بطور اعتراض یہ کہے کہ ہم یہ کیونکر جانیں کہ پیغمبر اسلام نہ کبھی کسی مکتب میں گئے اور نہ لکھنا ہی سیکھا؟ تو اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ وہ ایک ایسے معاشرے میں رہتے تھے جس میں لکھنے پڑھنے لوگ بہت ہی محدود اور گنتے پختے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ تمام شہر مکہ میں سترہ آدمیوں سے زیادہ لکھنے پڑھنے کے قابل نہ تھے۔ ایسے معاشرے میں اگر کوئی مکتب میں جاتے اور پڑھنا لکھنا سیکھے تو وہ اپنے آپ کو نہیں چھپا سکتا۔ وہ تو ہر طرف مشہور ہو جائے گا اور اسے تعلیم دینے والے استاد کو بھی لوگ جانتے ہوں گے۔

بھلا ایسا آدمی کیونکر یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں پیغمبرِ برحق ہوں اور کیونکر ایسا سفید جھوٹ بول سکتا ہے؟

بالخصوص یہ آیات مکہ میں نازل ہوئی تھیں جہاں پیغمبر خداؐ اپنے بڑھے تھے اور وہ بھی ان ہٹ دم دشمنوں کے سامنے جن کی نظر سے چھپنے سے پھوٹی غلطی ہی پھٹی نہیں رہ سکتی تھی۔

اس کے بعد کی آیت میں حقیقت قرآن کے اور دلائل بیان کیے گئے ہیں۔ چنانچہ کہا گیا ہے: یہ کتاب آسمانی ایسی آیاتِ بينات کا مجموعہ ہے جن کی جگہ اہل علم کے سینوں میں ہے۔ (بل هو آيات بينات فصدورالذی اولوالعالمین)۔

۱۔ "من قبلہ" میں جو ضمیر ہے اس کا مرجع قرآن ہے اور کلمہ "میں" (داواں) لفظ "اس لیے کہ عام طور پر انسان اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں۔" مبطلون "مبطل" کی جمع ہے اور یہ اس آدمی کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو باطل کرنے کے ذریعہ جو۔

کلمہ "آیات بیّنات" اس امر کا مظہر ہے کہ حقیقت قرآن کے دلائل خود اسی میں موجود ہیں، وہ آیات ہی سے روشن ہیں اور یہ آیات خود اپنی صداقت کی دلیل ہیں۔

یہ آیات قرآن خدا کی آیات تکوینی کی طرح ہیں کہ انسان جن کے مطالعے سے کسی دوسری چیز کی احتیاج کے بغیر حقیقت کو پالیتا ہے۔ یہ آیات تشریحی اگر انھیں بغور دیکھا جائے تو اپنے مشمولات کے لحاظ سے خود ہی اپنی صداقت کی دلیل ہیں۔

علاوہ بریں ان آیات کے طرف وار اور گردیدہ وہ لوگ ہیں جنھیں علم و رفت حاصل ہے۔ ہر چند کہ وہ تہی دست اور پابربندہ ہیں۔

زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی فکر و خیال کی وقعت اور قدر کی شناخت کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اُس مکتب فکر کے حامی کون لوگ ہیں۔ اگر اُس کے بانی کے گرد نادان یا چالاک و عتیار لوگ جمع ہو گئے ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ بھی اسی نمائش کا ہوجا۔ لیکن اگر اُس مکتب فکر کے حامی وہ لوگ ہیں جن کے سینے میں اسرارِ علوم پوشیدہ ہیں تو یہ اُس فکر کی حقیقت کی دلیل ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ صداقت قرآن کے حامیوں اور عاشقوں میں علمائے اہل کتاب کا ایک گروہ اور حضرت ابو ذرؓ حضرت سلیمانؑ حضرت متقداؑ حضرت عمارؓ اور حضرت علیؑ جیسی بلند شخصیتیں تھیں۔

اہل بیت علیہم السلام سے جو روایات مروی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت اہل بیتؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ مگر آیت کا مفہوم اسے منحصر نہیں کرتا اس لیے یہ روایات "الذین اوتوا العلم" کا واضح مصداق بتاتی ہیں۔ اگرچہ بعض روایات میں یہ تصریح موجود ہے کہ "اس آیت میں" الذین اوتوا العلم سے شہرہ تبت سے مراد آئمہ معصومین علیہم السلام ہیں۔ درحقیقت یہ قرآن کے علم کامل کے مرحلے کی طرف اشارہ ہے جو انھیں عطا ہوا ہے۔ لیکن اس امر میں کوئی مانع نہیں ہے کہ دیگر علما اور صاحبان عقل و فہم بھی علوم قرآنی سے بہرہ ور ہوں۔

ضمناً، اس آیت سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ علم و دانش کا انحصار صرف کسی اُستاد کے سامنے زائے تمدن نہ کرنے اور کتاب پڑھنے پر نہیں ہے کیونکہ آیات گزشتہ سے صریحاً یہ ثابت ہے کہ رسول اللہؐ کبھی کسی مکتب میں نہیں گئے تھے اور انھوں نے کسی سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا مگر پھر بھی وہ "الذین اوتوا العلم" کے بہترین اور افضل ترین مصداق ہیں۔

پس ثابت ہوا کہ علم رسمی کے مادہ ایک برتر علم ہے جو خدا کی طرف سے انسان کے قلب میں بصورت فور و ولایت کیا جاتا ہے،

العلم نور یقذفہ اللہ فی قلب من یشاء

اور درحقیقت جو ہر علم یہی ہے۔ باقی تو پوست اور پھلک ہے۔

اس آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے۔ عناد پیشہ سنگروں کے علاوہ کوئی بھی ہماری آیات کا انکار نہیں کرتا (وما یجدہ یایاتنا الا الظالمون)۔

کیونکہ ان آیات کے معانی و مفہام روشن ہیں اور وہ پیغمبرؐ انھیں لایا ہے۔ جس نے کبھی سبق نہیں پڑھا اور اُتی ہے اور صاحبان فکر اہل علم ان پر ایمان لائے ہیں۔

۱۔ یہ روایات تفصیلی طور پر تفسیر قرآن کی جلد ۲ صفحہ ۲۵۲ پر مذکور ہیں۔

علاوہ بریں مجموعی طور پر ان آیات کے مضامین اور مشمولات روشن و آشکارا ہیں۔ اسی وجہ سے انھیں بیّنات کہتے ہیں اور گزشتہ آسمانی کتابوں میں بھی ان کے مضامین آئے ہیں۔

ان سب باتوں کے باوجود کیا سوائے ان لوگوں کے جو نہ صرف اپنے آپ پر بلکہ معاشرے پر ظلم کرتے ہیں، کوئی شخص بھی ان کا انکار کر سکتا ہے؟ (بطور تکرار تحریر ہے کہ کلمہ "بحد" اُس مقام پر بولا جاتا ہے کہ انسان کسی چیز کا جان بوجھ کر انکار کرے)۔

چند اہم نکات

۱۔ ہمارے محبوب پیغمبرؐ جو کبھی مکتب میں نہیں گئے : یہ درست ہے کہ لکھنا پڑھنا ہر انسان کے لیے باعث کمال سمجھا جاتا ہے مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لکھنے پڑھنے سے عدم واقفیت ہی کمال بن جاتا ہے۔ یہ اصول حضرت خاتم الانبیاءؐ پر بالخصوص صادق آتا ہے۔

کیونکہ، بالفرض اگر کوئی تعلیم یافتہ عالم یا کوئی آگاہ علوم اور کثیر المطالعہ فلسفی نبوت کا دعویٰ کرے اور قوم کے سامنے کوئی کتاب یہ کہہ کر پیش کرے کہ "یہ کتاب آسمانی ہے" تو اس نبوت میں قوم کی طرف سے شکوک پیش آنے کا امکان کیونکہ وہ کہہ سکتے ہیں کہ جو کہتا ہے کہ یہ کتاب خود اسی شخص نے تصنیف کر لی ہو۔ لیکن اگر ہم یہ دیکھیں کہ ایک علمی لحاظ سے پس ماندہ قوم میں سے ایک ایسا انسان اُفتخا ہے جس نے کبھی کسی اُستاد کے سامنے زائے تمدن نہ نہیں کیا، کوئی کتاب نہیں چھٹی اور نہ کبھی کوئی صفحہ لکھا اور وہ ایک ایسی عظیم المرتبت کتاب پیش کرتا ہے جو نہایت بلند اور عالی مضامین پر مشتمل ہے تو یہ ادراک کرنا قطعی آسان ہے کہ یہ کتاب اُس کی تصنیف یا تخلیق فکر نہیں ہے۔ بلکہ وحی آسمانی اور تعلیم الہی کا نتیجہ ہے۔

قرآن کی دوسری آیات میں آنحضرتؐ کے لیے کلمہ "اُمّی" استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ ہم نے سورہ اعراف کی آیت ۱۵۷ کے تحت اس کلمہ کی تین تفسیریں لکھی ہیں۔ ان میں سے بہتر تفسیر "ورس ناخوانہ" ہے۔ درحقیقت حجاز میں کوئی دور نہ تھا کہ جہاں پیغمبر اسلامؐ تعلیم حاصل کرتے اور نہ کوئی معلم تھا جس سے علمی استفادہ کر سکتے۔ ہم نے اس سے پہلے یہ کہا ہے کہ مکہ میں ایسے لوگ جو لکھ پڑھ سکتے تھے، سترہ سے زیادہ نہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ عورت صرف ایک ہی تھی جو لکھنا پڑھنا جانتی تھی۔ یہ امر خلاف فطرت ہے کہ ایسے معاشرے میں جہاں مبادی علم سے آشنا لوگ بھی اس قدر کیاب اور انگشت شمار ہوں اور کوئی آدمی صاحب علم و معرفت ہو اور لوگ اُسے نہ جانتے ہوں۔ ان میں سے اگر کسی نے قطعی طور پر یہ کہا ہو کہ میں نے ذرا بھی تعلیم حاصل نہیں کی اور اُس کے اس دعویٰ پر کسی نے بھی شک نہ کیا، تو یہ واقعہ نمذی کے صدق قول پر دلیل ہے۔ بہر حال آیات زیر بحث میں جناب رسالت مآبؐ کی جو کیفیت بیان ہوئی ہے وہ اعجاز قرآن کو ثابت کرنے اور ہمانہ جو لوگوں کی بہانہ شکنی کے لیے نہایت موثر اور کافی ہے۔

۲۔ فرقہ السیطان بلا ذری طبع مصر ۱۹۵۹ء

جی ہاں! رسالت مآبؐ بے نظیر اور عظیم عالم تھے۔ آنحضرتؐ نے صرف مکتبِ وحی میں تفصیلِ علم کی جتنی بعض لوگوں کے لیے جو ایک بہانہ باقی رہ گیا ہے وہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے بعثتِ نبوت سے پہلے ملکِ شام کے ایک دوسفر کیے تھے۔ (وہ بھی قلیل مدت کے لیے جس میں آپؐ تجارتی کاروبار میں مصروف رہے تھے) تو ممکن ہے ان ایک دوسفر میں آپؐ علمائے اہل کتاب سے ملے ہوں اور ان سے دینی مسائل تحصیل کیے ہوں۔

اس آدھار کے ضعف کی دلیل خود اسی میں پوشیدہ ہے۔ جیسا کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایسا انسان جس نے کبھی مکتب کا منہ نہیں دیکھا نہ کوئی حرف پڑھا وہ پیرانہ گزشتہ کی تمام تاریخ، احکام و قوانین اور معارفِ عالی کو لوگوں سے سن کر اتنی جلد یاد کر لے اور اٹھیں تیس سال کی مدت میں بروئے کار لائے اور جب اسے ایسے مسائل سے سابقہ پڑے جن کے پیش آنے کا کبھی گمان بھی نہ ہو تو اس کا رد عمل نہایت ہی بجا نہ ہو۔

یہ بات ٹھیک ویسی ہی ہے کہ ہم یہ کہیں کہ فلاں شخص نے تمام طبی علوم چند روز میں از سر کر لیے ہیں کیونکہ وہ فلاں ہسپتال میں ڈاکٹروں کو بیماروں کا علاج کرنے دیکھتا رہتا۔ یہ بات تو بالکل مذاق معلوم ہوتی ہے۔

اس جھکتے کی طرف بھی توجہ لازمی ہے کہ یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ آنحضرتؐ کو نبوت پر فائز ہونے کے بعد تعلیماتِ الہی کے ذریعے پڑھنے کھننے پر قدرت حاصل ہو گئی ہو۔ اگرچہ کسی تاریخ میں بھی یہ نہیں لکھا کہ آپؐ نے رسمی طور پر تحصیلِ علم کی ہو، آپؐ کوئی تحریر پڑھ سکتے ہوں یا اپنے ہاتھ سے خط بھی لکھ سکتے ہوں۔

اور ہو سکتا ہے یہ بھی کہا جائے کہ آنحضرتؐ تمام عربی اس کام سے پرہیز فرماتے رہے، شاید اس وجہ سے تھا کہ بہانہ جو لوگوں کے ہاتھ کوئی ثبوت نہ آجائے۔

کتبِ تاریخ اور حدیث میں صرف ایک موقع کا ذکر ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے اپنے ہاتھ سے لکھا اور وہ ہے صلح حدیبیہ کا واقعہ۔ مسند احمد میں یہ لکھا ہے کہ ان جناب نے خود اپنے ہاتھ میں قلم پکڑا اور صلح نامہ لکھا۔

لیکن علمائے اسلام کی ایک جماعت نے اس حدیث کا انکار کیا ہے۔ اور یہ کہا ہے کہ یہ قول زیر بحث آیاتِ قرآنی کے صریحاً خلاف ہے۔ ہر چند کہ بعض حضرات کا عقیدہ ہے کہ آیت میں صراحت نہیں ہے۔ کیونکہ بقول ان کے ان آیات میں پیغمبرؐ کی قبل از نبوت کی حالت کو بیان کیا گیا ہے۔ لہذا اس امر میں کوئی مانع نہیں کہ آپؐ نے مقامِ نبوت پر فائز ہونے کے بعد بطور استثناء ایک موقع پر کچھ لکھا ہو۔ آپؐ کا یہ فعل بھی معجزہ شمار ہوگا۔

ہر کیف ایسے مسئلے میں خبر واحد پر بھروسہ کرنا حرم و احتیاط کے خلاف ہے اور علمِ اصول میں جو بات طے شدہ ہے اس کے بھی خلاف ہے۔ ہر چند کہ اس حدیث کے صحیح مان لینے سے کوئی مشکل نہ پائی جاتی ہوگی۔

۲۔ دوسروں کے دلوں میں نفوذ کا طریقہ: دلوں کو مسخر کرنے اور دوسروں کے افکار میں کلمہ الحق کے نفوذ کے لیے

۱۔ مسند احمد جلد ۲ صفحہ ۲۹۸۔

۲۔ تفسیر نمونہ جلد ۹ میں سورہ اعراف کی آیت ۱۵۷ کے تحت پیرامی کی تفسیر ملاحظہ ہو۔

صرف قوی اور مستحکم استدلال ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ مد مقابل سے رُو در رُو ہونے اور اس سے گفتگو کرنے کے اسلوب کو بھی عمیق ترین اثر پیدا کرنے میں دخل ہے۔

کیونکہ بہت سے لوگ ہیں جو نہایت دقیق اور موثکاف بحث کر سکتے ہیں اور مسائلِ علمی سے باخبر اور ماہر ہیں لیکن چونکہ وہ بطور احسن اور نتیجہ بخش بحث کرنے کے اسلوب سے واقف نہیں ہیں اس لیے ان کی گفتگو دوسروں کے دلوں میں بہت کم اثر کرتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دوسرے کو قائل کرنے کے لیے صرف اس کی عقل و فکر کو مطمئن کرنا یا اسے لاجواب کر دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ کلمہ حق کے کسی کی شخصیت میں اترنے کے لیے اس کی تسکین جذبات ضروری ہے کیونکہ انسان کی نصف شخصیت کی تعمیر جذبات و احساسات سے ہوتی ہے۔

اس بات کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ مطالبہ گفتگو کا صرف کیفیتِ شعور میں اتنا کافی نہیں ہے بلکہ اٹھیں نفس کے تحت شعور کا حسہ بن جانا چاہیے۔

انبیاء کرام اور بالخصوص پیغمبر اسلامؐ اور ائمہؑ کے حالات پر غور کرنے سے خوب واضح ہوتا ہے کہ یہ بزرگوار اپنے تبلیغی اور تربیتی مقاصد کو حاصل کرنے اور لوگوں کے قلوب میں کلمہ حق کے نفوذ کے لیے اخلاقِ اجتماعی اور نفسیاتی اصول کو پیش نظر رکھتے تھے۔ ان کا لوگوں سے گفتگو کرنے کا طریقہ ایسا تھا کہ وہ بہت جلد انہیں اپنے مقصد کی طرف متوجہ اور جذبہ کر لیتے تھے۔ اگرچہ بعض حضرات ائمہ کے ایسے اثرات کو شجرہ قرار دینا چاہتے ہیں لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ اگر ہم بھی لوگوں سے گفتگو کرنے میں ان ہی کے شیوہ، بحث اور سنت و روش کو اختیار کریں تو بہت جلد اٹھیں متاثر کر سکتے ہیں اور ان کی نوح کی گہرائی میں نفوذ کر سکتے ہیں۔

پیغمبر اسلامؐ کے متعلق قرآن میں بصراحت مذکور ہے۔

فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب
لا نفصوا من حولك۔

یہ رحمتِ الہی ہے کہ تو ان کے لیے نرم خو ہے اگر تو سخت اور سنگدل ہوتا تو یہ لوگ تیرے پاس سے منتشر ہو جاتے۔ (آل عمران - ۱۵۹)

اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ گفتگوں، بحث اور گفتگو کے بعد نہ صرف یہ کہ اپنے مذاکرات میں کامیاب نہیں ہوتے بلکہ اس کے برعکس مد مقابل اپنے عقیدہ باطل میں سخت تر اور زیادہ متعصب ہو جاتا ہے۔ محض اس وجہ سے کہ انہوں نے اپنی بحث میں "روش احسن" کو ملحوظ نہیں رکھا۔

بحث میں سختی، اپنی برتری کا اثبات، دوسرے کی تحقیر، انہماک پر غور، دوسروں کے عقاید و خیالات کا عدم احترام اور بحث میں خلوص کا فقدان یہ سب باتیں مباحثہ میں انسان کی شکست کا باعث ہوتی ہیں۔ لیکن اخلاقِ اسلامی کے مباحثہ میں "جدال" اور "مراءتہ کی تحريم کے تحت ایک بحث کا ذکر آتا ہے۔ اس سے مراد ایسی بحث ہے جس میں حق جوں اور حق طلبی

کی نسبت نہ ہو۔ اس کی غایت محض لفظی جنگ، اپنی برتری کا اثبات اور اپنی بات کی بیخ ہو۔
”جدال“ اور ”مراء“ کی عمت ان کے اخلاقی اور معنوی پہلوؤں کے علاوہ اس لیے بھی ہے کہ اس قسم کی بحثوں سے فکری ارتقا نہیں ہوتا۔

”جدال“ اور ”مراء“ کی حرمت تو یکساں ہے۔ مگر علمائے اسلام نے ان دونوں میں فرق کیا ہے۔ انہوں نے ”مراء“ کو معنی اظہارِ نفس و کمال اور ”جدال“ کو ایسا دتیرہ کہا ہے جو دوسرے کی تحقیر کے لیے ہو۔ نیز ”جدال“ بحث میں ابتدائی حملے کو کہتے ہیں اور ”مراء“ دفاعی حملے کو کہتے ہیں۔

علاوہ ازیں علمی مسائل میں بحث کرنے کو ”جدال“ کہتے ہیں۔ اور ”مراء“ عام ہے خواہ بحث علمی ہو یا غیر علمی البتہ ”جدال“ وہاں تک ان تفاسیر میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

بہر حال مٹا نہیں سے بحث و مجادلہ کبھی تو ”جدال بہ احسن“ کے اصول پر کیا جاتا ہے۔ اور وہ ایسی بحث ہوتی ہے، جس میں اُن شرائط سے جو ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا ہے اور کبھی وہ بحث ”غیر احسن“ ہوتی ہے۔ اور وہ ایسی بحث ہے جس میں شرائط مذکورہ کو ذموش کر دیا جاتا ہے۔

اب ہم اس گفتگو کو چند سبق آموز اور ناطق روایات لکھ کر ختم کرتے ہیں۔

جناب رسالت مآب صل علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث مروی ہے آپ فرماتے ہیں :
لا یتکلم عبد حقیقۃ الا یمان حتی یدع المراء وان کان محققاً۔

کوئی آدمی بھی جو کس حقیقتِ ایمان کو نہیں پاتا تا وقتیکہ وہ ”مراء“ کو ترک کرے
خواہ وہ حق پر ہی ہو۔

ایک اور آیت میں مذکور ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنے فرزند سے کہا :

یا بختی ایاک والنراء فاتتہ لیست فیہ منفعة وهو یویج بین
الاخوان العداوة

اے میرے بیٹے، تو ”مراء“ سے پرہیز کر کیونکہ صرف یہی نہیں کہ اُس میں کوئی
منفعت نہیں، بلکہ وہ جانوروں کے درمیان دشمنی کی آگ بھڑکاتا ہے۔

نیز یہ میرا اسلام سے منقول ہے کہ :

ماصل قوم بعد ان ہداهم الاءوتوا الجدل

کوئی قوم ہدایت یافتہ ہونے کے بعد گمراہ نہیں ہوتی۔ مگر یہ کہ وہ آپس میں جنگ جوئے
اور اثبات برتری کی ایسی بحثیں کرنے لگے جن میں کوئی حقیقت نہ ہو۔

۳۔ گفتار اور ظالمین : آیات زیر بحث میں ایک مرتبہ ہمیں یہ جملہ نظر آتا ہے :

ہماری آیات کا کوئی انکار نہیں کرتا مگر گفتار کہ وہ از روی عناد انکار کرتے ہیں۔

یہی جملہ بار دیگر قدرے تفاد کے ساتھ نظر آتا ہے۔ جس میں کافروں کے بجائے ظالمون استعمال ہوا ہے۔
”ہماری آیات کا ظالموں کے سوا کوئی انکار نہیں کرتا“

ان دونوں آیات کے تقابل سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تکرار مطلب نہیں ہے بلکہ ان میں دو مختلف مطالب بیان کیے گئے ہیں۔

آیت ۴۴ میں جہاں کافروں استعمال ہوا ہے یہاں اشارہ منکرین کے عقیدے کی طرف ہے اور آیت ۴۹ میں جہاں ظالمون کہا گیا ہے یہاں اہل انکار کا عمل مراد ہے۔

اول یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے اپنی رائے اور تجویز یا اپنے بزرگوں کی کوراز تقلید کی وجہ سے کفر و شرک کو اختیار کر لیا ہے، وہ ہر منزلت اللہ آیت کا انکار کرتے ہیں۔ خواہ اُن کی عقل اُسے درست اور حق ہی سمجھتی ہو۔

دوسرے مقام پر یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے اپنی ذات پر اور معاشرے پر ظلم کی راہ اختیار کی ہے، اسی طرز عمل میں اپنے ناجائز مفادات دیکھتے ہیں اور اس ظلم کو جاری رکھنے کا عزم ارادہ کیے ہوئے ہیں۔ تو یہ فطری امر ہے کہ وہ ہماری آیات کو قبول نہیں کرتے کیونکہ ہماری آیات جس طرح اُن کے اسلوب فکر سے ہم آہنگ نہیں ہیں اُن کے شیوہ عمل سے بھی مطابقت نہیں رکھتیں۔

۵۰ - وَقَالُوا لَوْلَا أَنْزَلَ عَلَيْهِ آيَاتٍ مِنْ رَبِّهِ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُبِينٌ

۵۱ - أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَى عَلَيْهِمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَرَحْمَةً وَذِكْرَى لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ

۵۲ - قُلْ كَفَى بِاللَّهِ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ شَهِيدًا لِيَعْلَمُوا مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوا بِاللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ

۵۳ - وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَوْلَا أَجَلٌ مُّسَمًّى لَجَاءَهُمُ الْعَذَابُ وَلِيَأْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ

۵۴ - لِيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ

۵۵ - يَوْمَ يَغْشَاهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ وَيَقُولُ ذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ

ترجمہ

۵۰ - اور وہ کہتے ہیں کہ اُس پر خدا کی طرف سے معجزات نازل کیوں نہیں ہوئے تو

۵۱ - اُن سے کہہ دو کہ معجزات تو خدا ہی کے پاس ہیں (اور اسی کے حکم سے نازل ہوتے ہیں نہ کہ میری اور تمہاری پسند کے مطابق) اور میں تو کلمہ کھلاؤرانے والا ہوں اور کیا ان لوگوں کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے تجھ پر یہ آسمانی کتاب نازل کی ہے کہ جو پیغم انھیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔ اس میں ایمان لانے والوں کے لیے رحمت اور نصیحت ہے۔

۵۲ - ان سے کہہ دو : میرے اور تمہارے درمیان خدا ہی گواہ کافی ہے۔ اور وہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اُسے جانتا ہے۔ اور جو لوگ باطل پر ایمان لائے اور انہوں نے خدا کا انکار کیا وہ خسارے میں ہیں۔

۵۳ - یہ لوگ تجھ سے عذاب کے لیے جلدی کر رہے ہیں۔ اگر ایک وقت مقرر نہ ہو چکا ہوتا تو اُن پر (اللہ کا) عذاب آجاتا اور یہ عذاب آخر کار اُن پر ناگہانی طور پر نازل ہوگا جب کہ وہ بے خبر ہوں گے۔

۵۴ - یہ تجھ سے عذاب کے لیے جلدی کر رہے ہیں۔ دراصل حالیکہ جہنم تو کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔

۵۵ - اور جس دن (اللہ کا) عذاب انھیں اوپر سے نیچے تک ڈھک لے گا تو اُن سے کہا جائے گا تم جو کام کیا کرتے تھے اب اُس کا مزہ چکھو (اور یہ بہت سخت اور دردناک دن ہوگا)

تفسیر

کیا قرآن بطور معجزہ کافی نہیں ہے؟

جو لوگ اپنی ہٹ دھرمی اور باطل پر اصرار کی وجہ سے اس بات پر آمادہ نہیں تھے کہ قرآن کے استدلال اور منطقی بیان کو بہ اطاعت قبول کر لیں اور آنحضرتؐ کی حقانیت کی اس جہت سے پذیرائی کریں کہ وہ تحصیل علم نہ کرنے کے باوجود ہی کتاب لائے۔ انھوں نے ایک نیا بہانہ تلاش کر لیا۔ چنانچہ قرآن کی زبردست آیات میں سے پہلی آیت میں اُس کا ذکر ہے کہ انھوں نے بطور تمسخر کہا کہ اُس پر (موسٰی اور عیسیٰ کی طرح) خدا کی طرف سے معجزات کیوں نازل نہیں ہوئے؟ (وقالوا لولا انزل علیہ آیات من ربہ)۔

اُس کے پاس عصائے موسٰی، بیڑ بیضا اور دم سیمابھی معجزات کیوں نہیں ہیں؟

وہ اپنے دشمنوں کو اپنے عظیم معجزات کے ذریعے نابود نہیں کر دیتا۔ جس طرح کہ موسٰی، شعیب، بلوڈ اور فرخ و ثود نے نابود کر دیا تھا۔

یا جس طرح کہ سورۃ بنی اسرائیل میں اس گروہ کا قول پایا جاتا ہے کہ (انھوں نے کہا) پیغمبر اسلامؐ مکہ کے خشک بیابان میں پانی کے چشمے کیوں جاری نہیں کر دیتا، اُس کے پاس سونے کا نعل کیوں نہیں ہے۔ وہ آسمان پر کیوں چڑھ نہیں جاتا اور اوران کے لیے خدا کی طرف سے آسمان سے ایک خط کیوں نہیں لاتا؟

تو اس میں بصراحت یہ واقعات موجود ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ قرآن کے علاوہ اور بھی معجزات رکھتے تھے۔ مگر ان باتوں سے وہ حقیقت طلب گار معجزہ نہ تھے۔ بلکہ وہ ان بہانہ ساز لوگوں سے ایک طرف تو اعجاز قرآن سے صرف نظر کرنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف وہ منہ مانگے معجزے کے خواہش مند تھے۔ من پسند کے معجزات کا تو مطلب یہ ہے کہ پیغمبر خداؐ ہر شخص کی خواہش کے مطابق، وہ جس قسم کے بھی معجزے کا طلب گار ہو، کر دکھائیں مثلاً، اُن میں سے ایک آدمی کہے کہ "آپ آپ شریں کا چتر بجائی کر دیجئے۔"

دوسرا کہے کہ مجھے تو یہ معجزہ پسند نہیں آپ مکہ کے پہاڑوں کو سونے کا بنا دیجئے۔ تیسرا کہے کہ یہ معجزات کافی نہیں ہیں آپ ہمارے سامنے ہی آسمان پر چڑھ جائیں۔

اس صورت سے یہ لوگ معجزات کو بے قدر باز بچہ اطفال بنا دیں۔ اور پھر انجام یہ ہو کہ معجزات دیکھنے کے بعد بھی کہیں کہ یہ تو جادوگر ہے۔

لہذا قرآن میں سورۃ انعام کی آیت ۱۱۱ میں بیان کیا گیا ہے:

ولو اتنا انزلنا الیہم الملئکة وکلّمہم الموقی وحشرنا علیہم

۱۔ سورۃ بنی اسرائیل آیت ۹۰ تا ۹۳۔

کل شیء قبل ما کانوا لیؤمنوا

اگر ہم اُن کی طرف فرشتوں کو بھیجتے اور مردے اُن سے باتیں کرتے اور تمام چیزوں کو اُن کے سامنے موجود کر دیتے تو وہ پھر بھی ایمان نہ لاتے۔

بہر حال قرآن میں ان ہٹ دھرم بہانہ ساز لوگوں کو دو طرح سے جواب دیا گیا ہے۔

اول یہ کہ اے رسول ان سے کہہ دو کہ معجزہ میرا کام نہیں جو تمہاری خواہش کے مطابق صادر ہوتا ہے بلکہ تمام معجزات خدا کے اختیار میں ہیں: (قل اتما الا آیات عند اللہ)۔

خدا ہی اس مصلحت کو بہتر جانتا ہے کہ کس قوم کے لیے، کس وقت اور کونسا معجزہ مناسب ہے۔ وہی جانتا ہے کہ کون لوگ جو ایسے حق اور ذوق تحقیق رکھتے ہیں۔ تو وہ معجزہ بھی اُن ہی کو دکھاتا ہے نیز وہ جانتا ہے کہ کون سے لوگ بہانہ ساز اور اپنی خواہشات نفس کے غلام ہیں۔

اور ان سے کہہ دو کہ میں تو فقط ڈرلنے والا اور خیر دار کرنے والا ہوں: (واتما انما نذیرو مبیین)۔

میرا فرض تو صرف ڈرانا، تبلیغ کرنا اور تمہیں کلام خدا سنانا ہے۔ رہا معجزات اور خوارق عادات کا دکھانا، سو یہ خدا کے اختیار میں ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ کیا اُن کے لیے یہی کافی نہیں ہے کہ ہم نے تجھ پر یہ کتاب آسمانی نازل کی ہے جو ہمیشہ انھیں بڑھ کر سنائی جاتی ہے: (اولو یرکفہو اتنا انزلنا علیک الکتاب یتلی علیہم)۔

یہ لوگ مادی معجزات کا تقاضا کرتے ہیں، در ان حالیکہ قرآن برترین روحانی معجزہ ہے۔

یہ لوگ زُود گزر معجزہ کا تقاضا کرتے ہیں جبکہ قرآن جاودانی معجزہ ہے اور رات دن اُس کی آیات انھیں بڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک ناخواندہ انسان (اور اگر بالفرض اُس شے بڑھا بھی ہو) ایسی کتاب پیش کرے جس کے شمولات اور مضامین ایسے عجیب ہیں اور جس کی فصاحت میں ایسا جذب ہے جو انسانوں کی طاقت سے بلا ہے۔ اور وہ جملہ اہل عالم کو مقابلے کا چیلنج کر دے۔ اور سب لوگ اس کتاب کا جواب پیش کرنے سے عاجز اور در ماندہ رہ جائیں۔

اگر — وہ واقف معجزے کے طلب گار ہیں تو ہم نے قرآن نازل کر کے اُن کے مطالبے سے بھی بڑا معجزہ اُن کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ مگر نہیں — وہ لوگ حق طلب نہیں ہیں بلکہ بہانہ ساز ہیں۔

یہ امر مہ نظر رہے کہ جملہ "اولو یرکفہو" (کیا اُن کے لیے کافی نہیں ہے) معمولاً ایسے موقع پر بولا جاتا ہے کہ جب انسان کوئی کام ایسا کرے جو طرف مقابل کی توقع اور امید سے کہیں بالا ہو اور مد مقابل اُس کی قدر و وقعت سے غافل ہو یا تجاہل عارفانہ سے کام لے۔ مثلاً مد مقابل یہ اعراض کرے کہ تو نے میری فلاح خدمت کیوں نہیں کی؟ او ہم اُس کی خواہش سے بھی عظیم تر خدمت کی نشان دہی کریں (جسے اُس نے نظر انداز کر رکھا ہو) اور کہیں کہ کیا یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے تیری اتنی بڑی خدمت کی ہے؟

ان سب باتوں سے قطع نظر معجزہ کو پیغمبر کی دعوت کی کیفیت اور زمان و مکان کی شرائط سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ اس لیے جس پیغمبر کی شریعت جاودانی ہے، اس کا معجزہ بھی جاودانی ہی ہونا چاہیے۔ جس پیغمبر کی دعوت جمال گیر ہے اور آئندہ زمانوں پر بھی حاوی ہو اس کا معجزہ بھی روحانی اور عقلی اسلوب کا ہونا چاہیے۔ جو تمام اہل فکر اور اہل فرد کے لیے موجب جذب و کشش ہو۔ یقیناً قرآن ہی اس مقصد کو پورا کرتا ہے نہ کہ عرصائے مٹوئی اور پیر بیضا۔

آیت کے آخر میں مزید توضیح و تاکید کے لیے کہا گیا ہے: اس آسمانی کتاب میں ایمان لانے والوں کے لیے عظیم رحمت اور نصیحت موجود ہے: (ان فذلک لرحمۃ و ذکر لى لقوم یؤمنون)۔ واقعاً قرآن رحمت بھی ہے اور پند و نصیحت حاصل کرنے کا وسیلہ بھی ہے لیکن صرف اہل ایمان کے لیے، صرف ان لوگوں کے لیے جنہوں نے حقیقت کو غرش آمدید کہنے کے لیے اپنے دلوں کے دروازے کھول دیئے ہیں، صرف ان لوگوں کے لیے جو طالب نور ہیں اور راہ مستقیم کے جو گیا ہیں۔ ایسے لوگ اس رحمت کا اپنی پوری شخصیت کے ساتھ اور ادا کرتے ہیں اور اس کے سامنے میں راحت پاتے ہیں۔ یہ لوگ آیات قرآنی کو جتنی مرتبہ بھی پڑھتے ہیں ان کے قلوب پر ان کے نئے معانی روشن ہو جاتے ہیں۔

مکن ہے کہ "رحمت" اور "ذکر لى" میں یہ فرق ہو کہ قرآن صرف ایک معجزہ اور دفتر نصیحت ہی نہیں ہے بلکہ ان باتوں کے علاوہ، وہ حیات انسانی کے لیے ایسے قوانین اور اصول عمل سے پر ہے جن کی اتباع انسان کے لیے باعث نزول رحمت ہوتی ہے۔ نیز یہ کہ اس میں انسان کی اخلاقی اور روحانی تربیت اور تکمیل انسانیت کے قواعد اور نصاب موجود ہیں۔ اس کے موازنہ میں عرصائے مٹوئی ایک معجزہ تو تھا مگر لوگوں کی روزمرہ کی زندگی میں تو اس کا کچھ اثر نہ تھا۔ برخلاف اس کے قرآن اپنے اسلوب کے لحاظ سے معجزہ تو ہے ہی مگر اس میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے مکمل پروگرام بھی ہے اور باعث رحمت الہی ہے۔

چونکہ ہر مذہبی کو اپنے اثبات دعویٰ کے لیے شاہد و گواہ کی ضرورت ہے، اس لیے آیت مابعد میں فرمایا گیا ہے: اے رسول ان سے کہہ دو کہ یہی کافی ہے کہ: میرے اور تمہارے درمیان خدا گواہ ہے۔ (قل کنفی باللہ بینى و بینک و شہیدا)۔

یہ امر واضح ہے کہ کوئی گواہ جس قدر بھی حقیقت تفسیر سے زیادہ باخبر ہوگا، اس کی گواہی کی قدر اسی نسبت سے زیادہ ہوگی۔ لہذا جملہ مابعد میں یہ اضافہ کیا گیا ہے: وہ خدا جو میرا گواہ ہے آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس سب کو جانتا ہے: (یعلو ما فی السموات والارض)۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ خدا نے اپنے پیغمبر کی حقانیت پر کس طرح گواہی دی ہے۔

مکن ہے کہ صداقت پیغمبر کی یہ گواہی عملی ہو۔ جب خدا نے قرآن جیسا عظیم معجزہ پیغمبر کو عطا کیا تو گویا علوان کی حقانیت

کی سند بھی جاری کر دی کیونکہ کیا یہ ممکن ہے کہ خدا نے حکیم و عادل قرآن جیسا معجزہ (العیاذ باللہ) کسی دروغ گو کو عطا کر دے؟ اس بنا پر کسی کو ایسا معجزہ عطا کرنا ہی اس کی نبوت کی صداقت پر خدا کی بہترین گواہی ہے۔ مذکورہ بالا عملی گواہی کے علاوہ قرآن مجید کی متعدد آیات میں خدا کی قوی شہادت بھی موجود ہے۔ چنانچہ سورہ احزاب کی آیت ۴۰ میں مذکور ہے:

ما کان محمد اباً احد من رجالکم و اکن رسول اللہ و خاتم النبیین

محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں وہ تو اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔

اور سورہ فتح کی آیت ۲۹ میں ہے:

محمد رسول اللہ والذین معہ اشکاء علی الکفار رحماء بینہم

محمد رسول خدا ہیں اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں وہ کفار کے مقابلے میں سخت ہیں اور باہم ایک دوسرے پر رحم اور مہربان ہیں۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت مدینہ کے بعض اشراف یہود کے جواب میں نازل ہوئی ہے جیسے کعب بن اشرف اور اس کے لقب میں تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ اے محمد کیا کوئی شخص اس بات کا گواہ ہے کہ تم خدا کے رسول ہو؟ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی اور کہا کہ یہ گواہی خدا دیتا ہے۔

اس کی تفسیر یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شہادت خدا سے مراد یہ ہے کہ سابق آسمانی کتابوں میں یہ شہادت موجود ہے جیسے اہل کتاب کے علماء اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہر کیف ان تینوں تفاسیر میں کوئی باہمی تضاد نہیں ہے اور ممکن ہے کہ اس آیت میں یہ تمام مضامین جمع ہوں۔

آیت کے اخیر میں بطور تمہید و تنبیہ فرمایا گیا ہے: جو لوگ باطل پر ایمان لائے اور انہوں نے خدا کا انکار کیا، وہ درحقیقت خسارے میں ہیں: (والذین آمنوا بالباطل و کفروا باللہ اولئک ہم الخاسرون)۔ اس سے بڑا اور کون سا خسارہ ہوگا کہ انسان اپنی شخصیت کے تمام سرمائے کو کسی ناچیز اور بے قدر شے کے لیے گنواں جیسا کہ مشرکین کا عمل تھا کہ انہوں نے اپنا دل و جان نبوت کے حوالے کر دیا تھا اور انہوں نے اپنی تمام جسمانی قوتیں اور جملہ انفرادی اور اجتماعی وسائل کو آئین نبوت پرستی کی ترویج و تبلیغ اور نام خدا کو محو کر دینے میں صرف کر دیا تھا مگر انہیں خسران و زیان کے علاوہ اس کا کچھ بھی پھل نہ ملا۔

غالباً آیات قرآنی میں اسی عظیم خسران کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کبھی کلمہ "الخسر" کہہ کر بھی اس حقیقت کی نشان دہی کی گئی ہے۔ یعنی اس سے بڑا اور کوئی نقصان نہیں ہے۔ (مجدد - ۲۲، نل - ۵، کھف - ۱۱۳)

یہ بات بھی اہم ہے کہ انسان کو کسی تجارت میں نقصان ہو جاتا ہے اور وہ اپنا سرمایہ گنوا بیٹھتا ہے اور اس کا دلویا بھل جاتا ہے مگر کبھی اس سے بھی زیادہ نقصان ہوتا ہے کہ اُس تاجر کے شانوں پر قرض کا بارہ جاتا ہے اور دلویا یہ ہونے کی یہ بدترین شکل ہے۔ مُشْرکین کا بالکل یہی حال تھا۔ بلکہ وہ کبھی دوسروں کی گمراہی اور ایمان کے دلویا یہ بن کا باعث بھی ہوتے تھے۔

گزشتہ آیات میں جناب رسالت مآب کی دعوت الی الحق کے مقابلے میں کفار کی دوہانہ تراشیوں اور ان کے جرات کا ذکر ہوا تھا۔

اول یہ کہ وہ کہتے تھے کہ پیغمبر کوئی معجزہ کیوں نہیں دکھاتا؟
قرآن میں اس کا یہ جواب دیا گیا تھا کہ یہ کتاب آسمانی خود برترین معجزہ ہے۔
دوسرے یہ کہ اس پیغمبر کی حقانیت کا گواہ کون ہے؟
قرآن میں یہ جواب دیا گیا کہ وہ خدا گواہ ہے جو عالم کل ہے۔

زیر بحث آیت میں کفار کی ایک تیسری ہمانہ سازی کا ذکر ہے: یہ لوگ عذاب الہی کے بارے میں جملت کرتے ہیں۔ اور اُسے تجھ سے بہت جلدی چاہتے ہیں؛ (وَلِيَسْتَجْلِبُواكَ بِالْعَذَابِ)۔
وہ کہتے ہیں کہ اگر عذاب الہی حق ہے اور وہ کفار پر نازل ہوتا ہے تو وہ ہم پر کیوں نازل نہیں ہوتا؟

قرآن میں اس سوال کے تین جواب دیئے گئے ہیں:

اول یہ کہ: اگر وقت موعود متعین نہ ہوتا تو ان پر فوراً خدا کا عذاب نازل ہو جاتا؛ (وَلَوْلَا أَجَلٌ مُّسْتَقَرٌّ لَوَجَّاهُمُ الْعَذَابُ)۔

وقت اس لیے مقرر کیا گیا ہے کہ منشاء الہی یہ ہے کہ اول تو یہ خواب کفر سے بیدار ہوں اور اگر ایسا نہ ہو تو اُملت وقت سے ان پر اتمام نجات ہو جائے۔ کیونکہ خدا اپنے کاموں میں بخلافت حکمت جلد بازی نہیں کرتا۔
دوسرے یہ کہ: جو لوگ یہ بات کہتے ہیں، انہیں اس کا کیا اطمینان ہے کہ ان کے طلب کرتے ہی ان پر عذاب نازل ہو جائے گا؟ کیونکہ یہ عذاب تو اس حالت میں کہ وہ بے خبر ہوں گے ان پر ناگہان اور بدون آثار نازل ہو جائے گا؛ (وَلِيَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ)۔

اگرچہ عذاب کا وقت موعود متعین و مقرر ہے۔ مگر اس کی تاخیر میں مصلحت یہ ہے کہ کفار اُس سے آگاہ نہ ہوں اور وہ ابتدائی آثار کے بغیر انہیں آپکڑے۔ کیونکہ اگر اُس وقت کا اعلان کر دیا جاتا تو گنہگاروں کی جرات و جسارت اور بھی بڑھ جاتی۔
وہ وقت موعود کے آفری لحظے تک اپنے گناہ و کفر کو جاری رکھتے اور جب یہ دیکھتے کہ وقت موعود کے مطابق عذاب کی گھڑیاں

۱۔ اس موضوع پر تفصیل بحث جلد ۴ میں سورہ کہف کی آیت ۱۰۳ کے تحت درج کی جا چکی ہے۔

۲۔ "بغتہ" کا مادہ "بغت" (بروزن "وقت") ہے اس کا معنی ہے کسی حادثہ کا ناگہان اور بلا انتظار ہونا۔

نزدیک ہیں تو آخری لمحات میں سب توبہ کر لیتے اور خدا کی طرف رجوع کرتے۔

قوموں کی تربیت اخلاقی میں اس قسم کی سزاؤں کا تقاضا یہ ہے کہ ان کا وقت مقررہ نامعلوم رہے۔ تاکہ ان کا خوف اور ڈراؤں گناہوں سے باز رکھنے کا ایک مؤثر عامل ثابت ہو اور ہر گھڑی اپنا اثر دکھاتا رہے۔

ہم نے نزول عذاب کی جس حکمت "تاخیر" کا ذکر کیا ہے، اُس سے ثابت ہے کہ جملہ "وہو لا يشعرون" سے یہ مراد نہیں ہے کہ انہیں اصلاً وجود عذاب ہی کا ادراک نہ ہوگا۔ اگر ایسا ہوتا تو عذاب میں کوئی حکمت ہی باقی نہ رہتی۔ بلکہ اس جھیلے کا مقصود یہ ہے کہ انہیں وقوع عذاب کے وقت اور اُس کے آثار نزول کی مطلق خبر نہ ہوگی۔ بالفاظ دیگر، ان پر عذاب بجا لیت غفلت بجلی کی مانند ٹوٹ پڑے گا۔

قرآن کی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہمانہ جھوٹی صرف کفار مکہ ہی تک منحصر نہ تھی بلکہ قبل ازان دوسری قومیں بھی تعیل عذاب پر اصرار کرتی رہی تھیں۔

تیسرا جواب قرآن کی آیت ما بعد میں دیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ: اسے رسولؐ یہ کفار تم سے عذاب الہی میں تعیل کا تقاضا کرتے ہیں جب کہ جہنم نے ان کا فوہل کا احاطہ کیا ہوا ہے؛ (لِيَسْتَجْلِبُواكَ بِالْعَذَابِ وَأَنْ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ)۔
مراد یہ ہے کہ اگر عذاب دینا میں تاخیر ہو جائے تو عذاب آخرت تو ان کے لیے سو فیصد قطعی اور یقینی ہے اور ایسا مسلمہ ہے کہ قرآن میں اس کا ذکر ایک امر وقوعی کے طور پر کیا گیا ہے۔ باین الفاظ کہ جہنم گویا اب بھی ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اس آیت کی ایک دقیق تر تفسیر بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ بمعنی حقیقی دو جہنموں سے جہنم اب بھی انہیں گھیرے ہوئے ہے اول تو دنیاوی جہنم ہے۔ وہ یہ کہ یہ لوگ شرک اور گناہوں کی جہنم میں مبتلا ہیں جو انہوں نے اپنے جلنے کے لیے خود فراہم کی ہے۔ وہ جنگ و خون ریزی، نزاع و اختلاف باہمی، بدامنی اور عدم سکون، ظلم و بیدادگری اور ہوا ہوس اور سرکشی کی جہنم میں گھرے ہوئے ہیں۔

دوسرے یہ کہ آیات قرآنی کے ظاہری منہوم کے مطابق ان کفار کے لیے جہنم اب بھی موجود ہے اور جیسا کہ ہم نے سطور ماقبل میں تشریح کی ہے اسی دنیا کے باطن میں ہے۔ اور اُس نے درحقیقت کفار کو گھیر رکھا ہے۔ چنانچہ سورہ تھاکر کی آیات ۴، ۵، ۶ میں اُس کا ذکر موجود ہے:

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ
عَيْنَ الْيَقِينِ

ایسا نہیں ہے اگر تمہیں علم یقین ہوتا تو جہنم کا مشاہدہ کرتے اور پھر اس کو عین یقین سے دیکھتے۔

۱۔ اس موضوع کی توضیح کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۲ میں آل عمران کی آیت ۱۳۲ کی تفسیر دیکھیے۔

اُس کے بعد فرمایا گیا ہے : وہ روز بڑا سخت اور دردناک ہو گا۔ جب عذاب الہی انہیں سر کے اوپر اور پاؤں کے نیچے سے گھیر لے گا اور اُن سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم کرتے تھے آج اُس کا مزہ چکھو : (یوم یذاقہ العذاب من فوقہم ومن تحت ارجلہم ویقول ذوقوا ماکنتم تعملون)۔ یہ آیت ممکن ہے بروز قیامت کفار کے لیے احاطہ عذاب جہنم کی توضیح کے لیے ہو۔ نیز ممکن ہے کہ اُس دردناک عذاب کا بیان ہو جس نے اُن کے ايمان کی وجہ سے انہیں آج گھیرا ہوا ہے اور کل کو ظاہر و آشکار ہو گا۔

بہر حال قرآن کے الفاظ یہ ہیں کہ یہ عذاب اُن کے سر کے اوپر اور پاؤں کے نیچے سے آئے گا اور بقیہ اطراف و جوانب کا ذکر نہیں کیا گیا۔ یہ بیان اس مطلب پر عادی ہے کہ جب آگ کے شعلے پاؤں کے نیچے سے باہر ہوں گے اور سر کے اوپر سے نازل ہوں گے تو وہ اُن کفار کے تمام اطراف و جوانب کو گھیر لیں گے۔

امولاً فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص سر سے پاؤں تک بے ہوشی کی حالت میں ڈوبا ہوا ہے۔ یعنی اُس کا تمام وجود اس گناہ میں غرق ہو گیا ہے۔ اس طرح سے بعض مفسرین کو جو یہ مشکل پیش آئی کہ انہوں نے یہ غور کیا کہ قرآن میں بالا و پائین کا ذکر تو ہوا ہے باقی اطراف کو کیوں چھوڑ دیا ہے، وہ حل ہو جاتی ہے۔

یہ واضح ہے کہ جملہ "ذوقوا ماکنتم تعملون" کا کٹنے والا ضابطہ۔ علاوہ بریں، یہ اس قسم کے لوگوں کے لیے ایک نفسیاتی سزا ہے۔ اس سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہوتی ہے کہ آخرت کی زندگی میں عذاب الہی انسان کی دنیاوی بد اعمالیوں کے رد عمل، انعکاس اور تجسم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

چند اہم نکات

- ۱۔ دلائل اعجاز قرآن : اس میں شک نہیں کہ قرآن پیغمبر اسلام کا عظیم ترین معجزہ ہے اور یہ معجزہ جاودانی، اپنی دلیل آپ، مسرت لبتا، محسوس اور ہر زمانہ کے لیے مناسب اور انسانوں کے ہر طبقہ کے لیے ہے۔ ہم نے اعجاز قرآن کے متعلق مشرح اور توضیحی بحث جلد اول میں سورۃ بقرہ کی آیت ۲۶ کے تحت تحریر کی ہے۔ اس مقام پر اس کی تکرار کی حاجت نہیں ہے۔
- ۲۔ انکار معجزات کا ثبوت : بعض مغرب زدہ دانشور چاہتے ہیں کہ پیغمبر اکرم کے معجزات کا انکار کر دیں۔ اُن کا امر ہے کہ پیغمبر اسلام سے قرآن کے علاوہ کوئی اور معجزہ صادر نہیں ہوا۔ ان حضرات کے مزاج سے یہ بھی امکان ہے کہ وہ قرآن کو بھی معجزہ نہ سمجھیں حالانکہ اُن کا انکار معجزات آیات قرآنی، روایات متواتر اسلام کی مسلمہ تاریخ کے خلاف ہے۔

۳۔ بعض مفسرین نے "یوم" کو فعل مستقر کا ظرف سمجھا ہے اور بعض نے "یوم" کو فعل متعلق سمجھا ہے۔

ہم نے اس موضوع کو جلد ۶ میں سورہ بنی اسرائیل کی آیات ۹۰ تا ۹۳ کے تحت بیان کیا ہے۔

۳۔ من پسند کے معجزات : پیغمبروں کے مخالفین کی ہمیشہ ایک روش یہ بھی رہی ہے کہ وہ معجزات کو ایک ایسا عمل بتاتے رہے ہیں جو پیغمبروں سے فی البدیہہ ارتجالاً سرزد ہوتا ہے۔ وہ اپنے اس عمل سے ایک طرف تو معجزے کی اہمیت کم کر کے اُسے بے قدر اور مبتذل ثابت کرنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف وہ اس ہسلنے سے انبیاء کی دعوت کو رد کرنا چاہتے تھے۔ لیکن انبیاء کبھی بھی اُن کی اس سازش کا شکار نہیں ہوئے۔ جیسا کہ آیات بالا میں مذکور ہے۔ وہ ان کے جواب میں کہتے تھے کہ :

"معجزات ہمارے اختیار میں نہیں ہیں کہ جنہیں تمہاری مرضی اور خواہش کے مطابق ہر روز اور ہر گھڑی دکھایا جائے بلکہ معجزہ تو صرف حکم خدا سے صادر ہوتا ہے اور ہمارے اختیار سے باہر ہے۔"

معجزات اقران کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۵ میں سورۃ یونس کی آیت ۲۰ کے تحت تفصیل بیان ہو چکی ہے۔

- ۵۶۔ لِيُعْبَدِيَ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ أَرْضِي وَاسِعَةٌ فَإِيَّايَ فَاعْبُدُونِ ۝
- ۵۷۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ إِلَيْنَا تُرْجَعُونَ ۝
- ۵۸۔ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُؤْتِيَنَّهُمْ مِنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۗ نِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ۝
- ۵۹۔ الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝
- ۶۰۔ وَكَانَ مِنْ دَابَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۗ اللَّهُ يَرِزُّهَا وَإِيَّاكُمْ ۗ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝

ترجمہ

- ۵۶۔ اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو میری زمین وسیع ہے، تم میری ہی عبادت کرو (اور دشمن کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ)۔
- ۵۷۔ ہر متفلس موت کا مزہ چکھنے والا ہے۔ پھر تم ہماری طرف لوٹ آؤ گے۔
- ۵۸۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے ہم انہیں بہشت کے بالاخانوں میں جگہ دیں گے۔ جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ نیک عمل

کرنے والوں کا کیا خوب بدلا ہے۔

- ۵۹۔ یہ وہ لوگ ہیں جو صبر (اور استقامت) اختیار کرتے ہیں اور اپنے پروردگار پر توکل کرتے ہیں۔
- ۶۰۔ اور کس قدر چلنے پھرنے والے جاندار ایسے ہیں کہ جو اپنا رزق اٹھانے کی قدرت نہیں رکھتے۔ اللہ انہیں اور تمہیں رزق دیتا ہے اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

شان نزول

بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ زیر نظر پہلی آیت ان مومنین کے بارے میں نازل ہوئی جو مکہ میں کفار کا ظلم برداشت کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ فرائض اسلامی کو بھی ادا نہ کر سکتے تھے۔ اس لیے انہیں حکم دیا گیا کہ اس سرزمین سے ہجرت کر جائیں۔

نیز بعض مفسرین کا خیال ہے کہ آخری زیر نظر آیت یعنی "وَكَانَ مِنْ دَابَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا" ان مومنین کی شان میں ہے جو مکہ میں دشمنوں کے ستم سہہ رہے تھے اور کہتے تھے کہ اگر ہم مدینہ کو ہجرت کر جائیں تو دہان نہ ہمارا کوئی گھر ہو گا نہ زمین۔ وہاں ہمیں کون آب و غذا دے گا: تب یہ آیت نازل ہوئی جس میں ہے کہ زمین پر تمام حرکت کرنے والے خدا کے خوانِ نعمت سے روزی کھاتے ہیں۔ تم بھی اپنی روزی کی فکر نہ کرو۔

تفسیر

ہجرت کرنی چاہیے:

گزشتہ آیات میں یہ ذکر تھا کہ مشرکین نے اسلام اور مسلمانوں کے مقابلے میں کیا کیا مختلف موافقت اختیار کیے مگر بڑبڑ آیت میں خود مسلمانوں کی حالت بیان کی گئی ہے یعنی ان مشکلات کی حالت میں جو مسلمانوں کو کفار کے نزعے میں ان کی طرف سے اذیت و آزار کی صورت میں پیش آ رہی ہیں، مسلمانوں کا کیا فرض ہے۔

خداوند عالم فرماتا ہے: اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو اور دشمنان اسلام کے نزعے میں فرائض دینی ادا نہیں کر سکتے، تو میری زمین وسیع ہے۔ تم دوسرے مقام کو ہجرت کر جاؤ اور وہاں میری عبادت کرو: (یا عبادی الذین آمنوا! ان ارضی واسعة فایای فاعبدون)۔

یہ امر بدیہی ہے کہ یہ حکم اُس زمانے کے صرف مومنین تک ہی کے لیے مخصوص نہ تھا اور آیت کی شان نزول اُس کے وسیع اور دراز دامن معنی کو جو کہ قرآن کی دوسری آیات سے ہم آہنگ ہے محدود نہیں کرتی۔

اس جنت سے یہ آیت ایک اصولِ کلی کی حامل ہے کہ جس زمانے میں اور جس معاشرہ و مقام میں مسلمانوں کی آزادی کا مائل سلب ہو جائے وہاں رہنے سے ذلت و خواری کے سوا کچھ حاصل نہ ہو اور وہاں رہ کر الہی پروگرام پر عمل نہ ہو سکے تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہاں سے ایسے مقامات کی طرف ہجرت کر جائیں جہاں وہ مطلق آزادی یا نسبتاً آزادی کے ساتھ اپنے فرائض دینی ادا کر سکیں۔

بہ الفاظِ دیگر آفرینش انسان کا مقصود خدا کی عبادت ہے۔ وہ عبادت جس میں زندگی کے ہر میدان میں انسان کی آزادی، سرفرازی اور کامیابی کا راز مخفی ہے۔ "فایای فاعبدون" میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ نیز سورہ ذاریات کی آیت ۵۶ میں یہ الفاظ آئے ہیں:

وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون

جب یہ بنیادی اور آخری مقصد انسان کے پیش نظر ہو تو ہجرت کے سوا اور کوئی راہ نہیں رہتی۔ خدا کی زمین وسیع ہے۔ اس لیے کسی اور جگہ قدم رکھنا چاہیے۔ ایسے مواقع پر قبیلہ و قوم، وطن اور گھربار کے تعصبات میں مقید رہ کر کسی قسم کی ذلت کو برداشت نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ ان چیزوں کا احترام اُسی وقت تک جائز ہے جب تک مقصود حقیقی کو کوئی خطرہ نہ ہو۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے ایسے ہی مواقع کے لیے فرمایا ہے:

لیس بلد باحق بک من بلد خیر البلاد ما حملهک

تیرے لیے کوئی شہر بھی دوسرے شہر سے بہتر نہیں ہے۔ بس بہترین شہر وہی ہے جو تجھے قبول کر لے اور تیری ترقی کے اسباب فراہم کر دے۔

یہ مسلم ہے کہ حُب و وطن اور اپنی جائے ولادت سے ذہنی تعلق انسان کی مرشست میں داخل ہے۔ مگر زندگی میں کبھی ایسے مسائل بھی پیش آجاتے ہیں کہ یہ چیزیں حقیر اور بے مقدار ہو جاتی ہیں۔

ہجرت کے متعلق اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے۔ اس سلسلے میں جو روایات ہم تک پہنچی ہیں ہم نے انھیں سورہ نسا کی آیت ۱۰۰ کے تحت جلد چہارم میں بیان کیا ہے۔

خدا نے اپنے بندوں کو یا عبادی "کما ہے۔ یہ اُس کی طرف سے نہایت ہی محبت آمیز طرزِ خطاب ہے۔ درحقیقت یہ انسان کے لیے تاج افتخار ہے جو مقام رسالت و خلافت سے بھی برتر ہے۔ جیسا کہ تہجد میں ہمیشہ کلمہ "عبید" کو شادیت رسالت سے پہلے ادا کرتے ہوئے ہم کہتے ہیں:

"اشهد ان محمداً عبده ورسوله"

یہ امر جالب توجہ ہے کہ جب خدا نے آدم کو پیدا کیا تو اُسے "خليفة الله" کے لقب سے عتبت بخشی مگر شیطان

پھر بھی اُسے بہکانے سے مایوس نہ ہوا۔ وہ آدم کے پاس آیا اور پھر جو ہونا تھا وہ ہوا۔ مگر خدا نے آدم کو مقام عبودیت پر سرفراز کیا تو شیطان نے اُس کے مقابلے میں بارمان لی اور کہا:

فبعزتک لاغویبنہواجمعین الاعبادک منہم المخلصین

مجھے قسم ہے تیری عزت کی کہ میں تمام فرزندِ آدم کو بہکاؤں گا۔ مگر ان میں سے

تیرے مخلص بندوں کو نہیں بہکا سکتا۔ (ص - ۸۲، ۸۳)

یہاں تک کہ خدا نے بھی اس امر کی ضمانت دی ہے اور فرمایا ہے:

ان عبادی لیس لک علیہم سلطان

تو ہرگز میرے بندوں پر تسلط حاصل نہ کرے گا۔ (بقرہ - ۲۲)

اس بنا پر عبودیت خالص کا مقام زمین پر خلافت الہی کے مقام سے بھی برتر و بالاتر ہے۔

ہم نے جو کچھ کہا اُس سے یہ خوب واضح ہوتا ہے کہ آیت زیر بحث میں کلمہ "عباد" سے تمام انسان مراد نہیں ہیں بلکہ صرف وہ انسان مراد ہیں جو مومن ہیں اور آیت میں جملہ "الذین آمنوا" تاکید اور توضیح کے لیے استعمال ہوا ہے۔

چونکہ وہ لوگ بر مشرکین کے شہروں میں رہتے تھے اور ہجرت کے لیے آمادہ نہ تھے۔ ان کے دیگر عزیزوں میں سے ایک یہ تھا کہ ہم اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اپنے شہروں سے نکل جائیں اور دشمنوں کی طرف سے موت یا بھوک اور دیگر خطرات سے دوچار ہو جائیں۔ علاوہ ازیں ہم اپنے خویش واقارب، اولاد اور شہر و دیار سے جُدا ہونے کے غم میں مبتلا ہو جائیں۔

قرآن میں ان کے خطرات کا ایک جامع جواب دیا گیا ہے: آخر کار سب انسانوں کا انجام موت ہے اور ہر شخص موت کا مزہ چکھے گا۔ پھر تم ہماری طرف لوٹ آؤ گے: (کل نفس ذائقۃ الموت ثم الینا ترجعون)۔

یہ جہان کسی کے لیے بھی "دار البقا" نہیں ہے۔ یہاں سے بعض لوگ جلد اور بعض دیر میں چلے جائیں گے۔ بہر حال ہر شخص کو دوستوں، اعزاق و اقارب اور اولاد کی جدائی کا صدمہ سہنا ہے۔ تو پھر انسان ان زود گزر مسائل کے لیے شکر اور کفر کی آبادیوں میں رہ کر کیوں ذلت و قید کو برداشت کرے؟ کیا صرف اس لیے کہ چند روز اور زندہ رہ جائے؟ ان سب باتوں کے علاوہ ڈرنا اس بات سے چلے کہ قبل اس کے کہ تم ایمان و اسلام کی زمین میں پہنچو تمہیں شکر و کفر کی جگہ موت آجائے۔ سوچو کہ ایسی موت کتنی خوفناک اور دردناک ہے۔

پھر یہ بھی گمان نہ کرو کہ موت ہی ہر چیز کی انتہا ہے۔ موت تو درحقیقت انسان کی اصلی زندگی کا آغاز ہے۔ کیونکہ تم سب ہماری طرف لوٹ آؤ گے۔ یعنی خدا نے بزرگ اور اُس کی بے پایاں نعمتوں کی طرف۔

ل "فایای فاعبدون" کا جملہ درحقیقت "ہاے بندو! تم پر عظمت ہے جو محدود ہے اور جلد فنا ہو جاتی ہے۔

ان صاقت بکوالارض فاهجر وامنھا الی الاخری وایای اعبدون۔

اس کے بعد کی آیت میں ، چند نعمتوں کا اس طرح ذکر ہے :

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح انجام دیے ، ہم انہیں بہشت کے بالا خانوں میں جگہیں دیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی : (والذین آمنوا وعملوا الصالحات لننبؤنہم من الجنة غرفا تجري من تحتها الانہاس) ۱۰

وہ لوگ ایسے محلّات میں سکونت اختیار کریں گے جنہیں ہر طرف سے جنت کے درخت گھیرے ہوں گے اور طرح طرح کی نہریں جن کے پانی کا ذائقہ اور اُس کا منظر مختلف ہوگا۔ جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات سے ثابت ہے ، درختوں کے ٹھہرٹ میں سے نکل کر ان محلّات کے نیچے رواں ہوں گی۔

یہ ملحوظ رہے کہ ”عُرف“ جمع ہے ”عُرفہ“ کی۔ اس کے معنی ہیں : بلند عمارت اور بالاخانہ جو اپنے اطراف سے متاثر و بہشتی بالاخانوں کا امتیاز یہ ہے کہ وہ دنیاوی مکانات اور محلّات کے مانند نہ ہوں گے کہ جن میں انسان تنہا رہتا ہے اور آرام نہیں کر پاتا کہ کوچ کا نقارہ گونجنے لگتا ہے بلکہ اہل ایمان اور صالحین اُن میں ہمیشہ رہیں گے ، (خالدين فيها)۔ آیت کے اخیر میں یہ اضافہ کیا گیا ہے : کیا اچھا اجر ہے اُن لوگوں کا جو صرف خوشنودی خدا کے لیے عمل کرتے ہیں : (نعو اجر العالمين)۔

اس آیت میں مومنین اور صالحین کے اجر کا جو ذکر ہے اُس سے گزشتہ آیات میں کفار اور گناہ گاروں کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اگر سادہ سا موازنہ بھی کیا جائے تو مومنین اور صالحین کے اجر کی عظمت روشن ہو جاتی ہے۔

گزشتہ آیات کے مضمون میں کفار کے آگ اور ایسے عذاب میں مبتلا ہونے کا ذکر تھا کہ جن نے انہیں سر سے پاؤں تک گھیرا ہوا ہے۔ اور اُن سے بطور سرزنش یہ کہا جاتا ہے کہ تم جو کچھ کرتے تھے اب اُس کا مزہ چکھو۔ لیکن یہ آیت کہتی ہے کہ مومنین نعمت بہشتی میں غوطہ ور ہیں اور رحمت پروردگار ہر طرف سے اُن کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور وہ سلامت بارجلوں کے بجائے ایسے کلمات سُنتے ہیں جن سے سراسر خداوند کریم کے لطف و محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ اُن سے کہا جاتا ہے : ”عمل کرنے والوں کا اجر کتنا اچھا ہے !“

ظاہر ہے کہ ”عالمین“ جملہ ہائے ماقبل کے قرینے کے مطابق وہ لوگ ہیں جن سے یہ کیفیت ایمان عمل صالح سرزد ہوتا ہے۔ ہر چند کہ کلمہ ”عالمین“ اپنے لغوی معنی میں محدود نہیں ہے بلکہ مطلق ہے۔

جناب رسالت مآب سے ایک حدیث مروی ہے :

ان في الجنة لفرقا يرى ظهورها من بطونها ويطونها من ظهورها۔

بہشت میں ایسے شفاف محلّات ہیں کہ اُن کے اندر کا حصّہ باہر سے اور باہر کا منظر اندر سے نظر آتا ہے۔

۱۰ ”النَّبِيُّ نَهْمٌ“ کا مادہ تمبوئہ (بروزن تذکرہ) ہے اس کا معنی ہے : بغرض بقائے دوام کسی کو سکونت دینا۔

حضور نے یہ فرمایا تو ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کی :
یا رسول اللہ! وہ محلّات کس کی ملکیت ہوں گے ؟
آنحضرت نے جواب دیا :

هي لمن اطاب الكلام واطعم الطعام وادام الصيام وصلى الله
بالليل والناس نيام

یہ محلّات اُس شخص کے لیے ہیں جو اپنی گفتگو کو پاکیزہ کرے ، چوکوں کو کھانا کھلائے ، بکثرت روزے رکھے اور وقتِ شب جب سب لوگ بخواب ہوں تو وہ اللہ کے لیے نماز پڑھے۔

اس کے بعد کی آیت مومنین عامل کے اہم اوصاف کو بیان کرتی ہے۔ یعنی : یہ وہ لوگ ہیں جو مشکلات کے مقابلے میں صبر و استقامت کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے پروردگار پر توکل کرتے ہیں : (الذین صبروا وعلیٰ ربہم یتوکلون)۔ یہ لوگ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں اور صبر کرتے ہیں۔

یہ مومنین غربت کی تنگیوں ، وطن سے نکل کر بے وطنی کی سختیاں سہتے ہیں اور صبر کرتے ہیں۔ اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے دشمنوں کے آزار کو جان و دل سے برواشت کرتے ہیں اور اپنے نفس سے جاوا کی راہ میں ، جو ہوا و اکبر اور اپنے سے قوی دشمنوں سے لڑائی میں جو کہ ہوا و اصغر ہے ، طرح طرح کی مشکلات برواشت کرتے ہیں اور صبر کرتے ہیں۔ بے شک اس صبر و استقامت ہی میں اُن کی کامیابی کا راز ہے اور یہی اُن کے شرف کا باعث ہے۔ کیونکہ صبر و استقامت کے بغیر زندگی میں کوئی تخلیقی اور مثبت عمل نہیں ہو سکتا۔

علاوہ بریں وہ مومنین نہ اپنے مال و دولت پر بھروسہ کرتے ہیں ، نہ اپنے دوستوں اور عزیزوں پر۔ اُن کا توکل صرف خدا پر ہے اور صرف اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اگر ایک ہزار دشمن بھی انہیں ہلاک کرنے کا ارادہ کریں تو وہ یہ کہتے ہیں : اے خدا ! اگر تو میرا دوست ہے تو مجھے دشمنوں سے کچھ خوف نہیں۔

الرحم علیٰ عورکون تو صبر و توکل ہی جملہ فضائل انسانی کی جڑ ہے۔ ”صبر“ انسان کو موانع اور مشکلات کے مقابلے میں استقامت بخشتا ہے اور ”توکل“ اس راہ پر تشبیب و فراز میں انسان کو آمادہ و عمل رکھتا ہے۔ درحقیقت اعمال صالح انجام دینے کے لیے اِن دو فضائل اخلاقی یعنی صبر و توکل سے مدد لینا چاہیے۔ کیونکہ صبر و توکل کے بغیر وسیع پیمانے پر اعمال صالح کا انجام دینا ناممکن ہی نہیں ہے۔

۱۰ تفسیر قرطبی، ذیل آیت زیر بحث ، جلد ۵ صفحہ ۵۰۵۔

۱۱ توکل کی حقیقت اور اُس کے فلسفہ کے بارے میں مفصل بحث جلد ۶ میں سورہ ابراہیم کی آیت ۱۱ کے ذیل میں مذکور ہے اور صبر کے بارے میں جلد ۶ صفحہ ۲۶۷ اور جلد ۲ میں صفحہ ۲۱۷ (اردو ترجمہ) دیکھیے۔

زیر بحث آیات میں سے آخری آیت میں ان لوگوں کے شکوک و شبہات کا جواب ہے جو اپنی زبان قابل یا زبان من سنہ کہتے ہیں کہ: اگر ہم اپنے شہر سے ہجرت کریں گے تو ہمیں روزی کون دے گا۔ قرآن میں ان کے اس خوف کا یہ جواب دیا گیا ہے: تم روزی کی فکر نہ کرو اور قلت و اسارت کے عیب و عار کو برداشت نہ کرو۔ روزی رسالہ خلیفہ نہ کہ تم بلکہ زمین پر چلنے والے بہت سے جاندار ایسے بھی ہیں جو اپنا رزق اٹھا نہیں سکتے اور نہ وہ اپنے گھونسلوں اور بون میں خدا کا ذخیرہ کر سکتے ہیں اور ہر روز انہیں سنہ رزق کی طلب ہوتی ہے مگر خدا انہیں بھوکا نہیں چھوڑتا اور انہیں رزق دیتا۔ وہی خدا تمہیں بھی رزق دے گا۔ (وڪاين من دآية لا تحمل رزقها الله برزقها وایاکم)۔

انہی سے قطع نظر زمین پر حرکت کرنے والوں اور حیوانات و وحشرات میں، بہت ہی کم ایسی انواع ہیں جو چوڑھیوں اور شہد کی مکھیوں کی طرح اپنی غذا سحر و بیابان سے لاکر اپنے بل یا چھتے میں ذخیرہ کرتی ہوں۔ اکثر مخلوقات قانع الیوم ہیں یعنی وہ ہر روز اپنے لیے تازہ رزق حاصل کرتی ہیں۔ اور جو کھانا سو کھایا کے طرز عمل پر زندگی گزارتی ہیں۔ اس قسم کی کرداروں مخلوقات ہمارے اطراف و جوارب میں دور و نزدیک، بیابانوں، سمندروں کی گہرائیوں، پہاڑوں کی بندلوں اور دروں میں موجود ہیں۔ یہ اپنے پروردگار کے خان بے دریغ سے اپنا رزق کھاتے ہیں۔

لہذا — تو اسے انسان جو کہ ایسی مخلوق کے مقابلہ میں اپنی روزی حاصل کرنے اور اسے ذخیرہ کرنے کے لیے زیادہ باہوش اور توانا ہے، اپنی قطع روزی کے خوف سے ایسی سکودہ اور شرمناک زندگی سے کیوں چمٹا ہوا ہے؟ اور دنیا میں ہر قسم کے ظلم و ستم اور قلت و غناری کو کیوں برداشت کرتا ہے؟ تو بھی اس تنگ و تاریک زندگی کے دائرہ سے باہر نکل اور اپنے پروردگار کے وسیع دسترخوان پر بیٹھ اور روزی کی فکر نہ کر۔

اس حالت میں جب کہ تو اپنی ماں کے شکم میں ایک ناقص جنین کی شکل میں تھا اور کوئی شخص بھی یہاں تک کہ تیرے باپ اور تیری مادر مہربان کا دست شفقت بھی تجھ تک نہ پہنچ سکتا تھا، تیرے خدا نے تجھے فراموش نہیں کیا اور جس چیز کی تجھے ضرورت تھی وہ ہم پہنچائی۔ اس وقت تو تو ایک اور طاقتور وجود ہے۔ نیز چونکہ حاجت مندوں کو روزی پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ روزی رسالہ ان کی ضروریات سے آگاہ ہو، اسی لیے آیت کے آخر میں: (وهو السميع العليم) فرمایا گیا ہے۔ یعنی وہی سُننے والا اور جانتے والا ہے۔

وہ تم سب کی باتیں سنتا ہے یہاں تک کہ تمہاری اور تمام حرکت کرنے والے جانداروں کی زبان حال کو بھی سنتا اور جانتا ہے، تم سب کی ضروریات سے خوب آگاہ ہے اور کوئی چیز اس کے بے پایاں علم سے ہٹا نہیں ہے۔

۶۱ وَلِیْنِ سَأَلْتَهُمْ مِّنْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لِقَوْلِنَ اللّٰهِ فَاَنۢی
یُؤْفَكُوْنَ ۝

۶۲ اللّٰهُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنۢ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهِ وِیَقْدِرُ لَهُ
اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝

۶۳ وَلِیْنِ سَأَلْتَهُمْ مِّنْ نَّزْلِ مِنَ السَّمٰوٰتِ مَآءً فَاحْیَا بِهٖ
الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لِقَوْلِنَ اللّٰهِ قُلِ الْحَمْدُ
لِلّٰهِ ۚ بَلۡ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ۝

۶۴ وَمَا هٰذِهِ الْحَیۡوَةُ الدُّنْیَا اِلَّا لَهْوٌ وَّوَلَعِبٌ ۚ وَاِنَّ الدَّارَ
الْاٰخِرَةَ لَهٰی الْحَیۡوَانِ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ۝

۶۵ فَاِذَا رَكِبُوْا فِی الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیۡنَ لَهُ الدِّیۡنَ
فَلَمَّا نَجَّوْهُمۡ اِلَی الْبَرِّ اِذَا هُمۡ لِشُرْکُوْنَ ۝

۶۶ لَیَكْفُرُوْا بِمَا اٰتٰیہُمۡ ۗ وَلِیَتَمَتَّعُوْا ۗ فَسُوْفَ لَعَلَمُوْنَ ۝

ترجمہ

۶۱۔ اگر ان سے تو پوچھے کہ آسمانوں اور زمینوں کو کس نے خلق کیا اور کس نے تمہارے لیے شمس و قمر کو مقرر کیا ہے، تو وہ کہیں گے اللہ نے تو پھر وہ (عبادتِ خدائے) منحرف کیوں ہو رہے ہیں؟

۶۲۔ خدا اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے روزی کو فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ خدا ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

۶۳۔ اگر تو ان سے پوچھے کہ آسمان سے پانی کس نے برسایا اور اُس کے وسیلے سے زمین کو اُس کی موت کے بعد کس نے زندہ کر دیا؟ تو کہیں گے کہ اللہ نے تو ان سے کہہ: تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ مگر ان میں سے اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔

۶۴۔ یہ دُنیا کی زندگی تو لہو و لعب کے سوا کچھ نہیں اور حقیقی زندگی کا مقام تو دارِ آخرت ہی ہے۔ کاش کہ وہ لوگ جانتے۔

۶۵۔ جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خلوص کے ساتھ اللہ کو پکارتے ہیں (اور اُس کے غیر کو بٹول جاتے ہیں)۔ مگر جب اللہ انہیں نجات دے کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو وہ پھر شرک کرنے لگتے ہیں۔

۶۶۔ (چھوڑو انہیں) تاکہ ہم نے جو آیات انہیں بخشی ہیں ان کا انکار کریں اور دُنیا کی زُور و گُور لذات سے فائدہ اٹھائیں۔ لیکن بہت جلد انہیں معلوم ہو جائے گا۔

تفسیر

دل میں خدا زبان پر بُت :

آیات گزشتہ میں رُوسے سخن ان مُشرکین کی طرف تھا جنہوں نے حقانیتِ اسلام سمجھ تو لیا تھا لیکن اس خوف سے کہ ان کی بسراوقات کے ذرائع منقطع ہو جائیں گے وہ ایمان کو قبول کرنے اور ہجرت کرنے کے لیے آمادہ نہ تھے۔ آیات زیر بحث میں رُوسے سخن بجانب پیغمبر اسلام اور درحقیقت تمام مومنین کی طرف ہے۔ ان آیات میں دلائل توحید کو "خلقت"، ربوبیت اور "فطرت" کی بنیاد پر ہمیں مختلف طاقتوں سے بیان کیا گیا ہے۔ ان دلائل کے ذریعے یہ بات اُن کے دل نشین کی گئی ہے کہ ان کی تقدیر اُس خدا کے ہاتھ میں ہے جس کی قدرت کے آثار تم انفس و آفاق میں دیکھتے ہو، ذکر بُتوں کے اختیار میں کیونکہ اس معاملے میں اُن کا کچھ دخل نہیں ہے۔

سب سے پہلے خلقتِ زمین و آسمان کا ذکر کیا گیا ہے اور مُشرکین کے باطنی اعتقادات کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اگر تم ان سے یہ سوال کرو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے خلق کیا ہے؛ اور کس نے بندوں کے مفاہ میں سورج اور چاند کو اپنے زیر فرمان مقرر رکھا ہے، تو سب کے سب بیک زبان جواب دیں گے: اللہ نے (ولئن سألتهم من خلق السموات والارض وسخر الشمس والقمر ليقولن اللہ)۔

کیونکہ یہ مسلم ہے کہ بُت پرست یا اُن کے علاوہ کوئی آدمی بھی یہ نہیں کہتا کہ خالقِ زمین و آسمان اور تسخیر کنندہٴ خورشید و ماہِ یہ حقیر سے پتھر اور کڑی کے بُت میں جنہیں انسانوں نے اپنے ہاتھ سے تراشا ہے۔

براہِ غلط و گمراہ بُت پرست بھی خدا کی توحید میں کوئی شک نہ کرتے تھے۔ البتہ وہ لوگ عبادت میں مُشرک تھے۔ وہ کہتے تھے: "ہم بُتوں کو اس لیے پُوجتے ہیں کیونکہ وہ ہمارے اور خدا کے درمیان واسطہ ہیں۔ جیسا کہ سورہٴ یونس کی آیت ۱۸ میں مذکور ہے:

ويقولون هؤلاء شفعاؤنا عند الله

(اُن کا قول تھا) ہم اس لائق نہیں ہیں کہ براہِ راست خدا سے ارتباط حاصل کریں۔

اس لیے ہمیں چاہیے کہ بُتوں کے ذریعے سے براہِ برقرار رکھیں:

ما نقصدہم الا ليقربونا الى الله زلفی

ہم اُن کی پُرتش نہیں کرتے مگر اس وجہ سے تاکہ ہمیں اُن کے وسیلے سے خدا کی

قربت حاصل ہو جائے۔ (ذمر۔ ۳)

وہ لوگ اس حقیقت سے غافل تھے کہ خالق اور خلق کے درمیان کوئی فاصلہ موجود نہیں ہے اور وہ ہم سے رگِ جان سے بھی زیادہ نزدیک ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ انسان موجوداتِ عالمِ کل سے سب سے زیادہ ہمارے اور شاہکار ہے، وہی اس قابل ہے کہ خدا سے براہِ واسطہ

رابط پیدا کر کے۔ کوئی اور مخلوق اُس کے لیے واسطہ نہیں بن سکتی۔

بہر حال، اس روشن دلیل کے بعد، آیت کے اخیر میں فرمایا گیا ہے: "جب حقیقت یہ ہے تو یہ کفار خدا کی عبادت سے منہ موڑ کے پتھر اور لکڑی سے تراشے ہوئے ناپیز بھوتوں کی پرستش کیوں کرتے ہیں: (خائف یوفکون)۔" "یوفکون" مادہ افک (بروزن) "فکر" سے بنا ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کی واقعی اور حقیقی شکل کر بدل دینا۔ اسی مناسبت سے اس کا اطلاق دردغ اور بادِ مخالفت پر بھی ہوتا ہے۔

اس مقام پر "یوفکون" صیغہ جمول استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد ہے کہ مشرکین بحالت شعور استدلال عقل کے ساتھ ایسا نہیں کرتے بلکہ بلا ازاہ بُت پرستی کی طرف کھینچے چلے جاتے ہیں۔
تفسیر شمس و ماہ سے مراد وہ نظامات ہیں جو خدا نے اُن کے لیے مقرر کر دیئے ہیں اور یہ نظامات بہ اعتبار نتائج انسانوں کے لیے منفعت بخش ہیں۔

اس کے بعد اس مفہوم کی تاکید کے لیے کہ خالق درازق وہی ہے، یہ اضافہ کیا گیا ہے: "خدا اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے روزی کو فراخ کر دیتا ہے۔ اور جس کے لیے چاہتا ہے محدود اور تنگ کر دیتا ہے: (اللہ یبسط الرزق لمن یشاء من عباده و یقدر لہ)۔"

روزی کی کلید اسی کے ہاتھ میں ہے نہ کہ انسانوں اور بھول کے ہاتھ میں۔ آیات ماقبل میں یہ جو کہا گیا ہے کہ "راست باز مومنین صرف اسی پر توکل کرتے ہیں" اسی وجہ سے ہے کہ جب کہ ہر چیز کا کُل اختیار اسی کو حاصل ہے، تو وہ پھر انہارا ایمان سے کیوں ڈریں اور یہ کیوں سوچیں کہ ہماری زندگیاں دشمنوں کی طرف سے خطر میں ہیں۔

اگر مومنین یہ تصور کریں کہ خدا قدرت تو رکھتا ہے مگر اُن کے حال سے آگاہ نہیں ہے تو یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ کیونکہ خدا عالم کل ہے: (ان اللہ بحکمتہ شہید علیہم)۔ یہ بات ہرگز قابل تصور نہیں کہ خدا خالق و مُدبّر عالم ہو اور اُس کا فیض بہ تسلسلِ لمحات موجودات کو پہنچ رہا ہو اور وہ اُن کی حالت سے آگاہ نہ ہو۔

دوسرے مرحلے میں خدا کی ربوبیت اور اُس کی طرف سے رزق کے چشمے جاری ہونے کا ذکر ہے۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے: "اگر اُن مشرکین سے تم یہ سوال کرو کہ آسمان سے پانی کون برساتا ہے۔ اور زمین کو اُس کے ٹرڈہ ہونے کے بعد اُس کے وسیلے سے کون زندہ کرتا ہے؟ تو وہ سب بیک زبان کہیں گے: "اللہ"۔ (ولئن سألتہم من نزل من السماء ماءً فاحیا بہ الارض من بعد موتہا ليقولن اللہ)۔

بُت پرستوں کا یہ باطنی اعتقاد ہے۔ یہاں تک کہ اُنھیں اُس کے زبان سے اقرار کرنے سے بھی انکار نہ تھا۔ کیونکہ وہ بھی خدا ہی کو خالق اور رَبّ سمجھتے تھے اور اُسی کو مُدبّر عالم سمجھتے تھے۔

اُس کے بعد فرمایا گیا ہے: "کہو کہ حمد و ستائش صرف اللہ ہی کے لیے ہے: (قل الحمد للہ)۔" حمد و ستائش اُس ذات کے لیے ہے جو تمام نعمتوں کا بخشنے والا ہے کیونکہ پانی اِجواک اصل سرچشمہ حیات ہے اور سب جانداروں کے لیے باعثِ حیات ہے) اُس کی طرف سے نازل ہوتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ہر قسم کا رزق بھی اُسی کی طرف سے آتا ہے۔

اس بنا پر حمد و ستائش بھی اُسی کے لیے مخصوص ہونی چاہیے۔ اور دوسرے معبودوں کا اس میں کچھ حصہ نہیں ہے۔ تم خدا کا شکر کرو کہ مشرکین کو بھی ان حقائق کا اعتراف ہے۔ نیز اس بات کا بھی شکر یہ ادا کرو کہ ہمارا استدلال اس قدر مستحکم اور ناطق ہے کہ کسی شخص میں بھی اُس کے ابطال کی قدرت نہیں ہے۔

اور چونکہ مشرکین کی گتنگو اور اُن کے عمل میں تناقض تھا، اس لیے آیت کے اخیر میں ان کلمات کا اضافہ کیا گیا ہے: (بل اکثرہم ولا یعقلون)۔ اِن میں سے اکثر عقل سے کام نہیں لیتے۔

گذرنا کیونکہ ہمیں ہے ایک عاقل و فہمیدہ انسان اس قدر پراگندہ گوئی کرے کہ ایک طرف تو وہ اُس ذات کو خدا کہے جو خالق و درازق و مُدبّر عالم ہے اور دوسری طرف بھوتوں کو سجدہ کرے۔ جنہیں اُس کے احوال حیات میں کوئی دخل ہی نہیں ہے۔

ایک طرف تو وہ "خالق" و "رب" کی توحید کا قائل ہو اور دوسری طرف عبادت میں ہنرک کرے۔ یہ الفاظ لائق توجہ ہیں کہ یہ نہیں کہا کہ وہ عقل نہیں رکھتے۔ بلکہ یہ کہا ہے کہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔ یعنی عقل ہے تو ہی مگر اُس سے کام نہیں لیتے۔

ادرا اس غرض سے کہ اُن مشرکین کے خیالات و افکار کو اس محدود زندگی کے اُفق سے بلند کرے اور اُن کی عقل کے سامنے ایک وسیع ترین عالم کا منظر پیش کرے، خدا اس کے بعد کی آیت میں اس دُنیا کی زندگی کی کیفیت کو سراسر آخرت کی حیات جاوداں کے مقابلے میں ایک بلیغ اور پُر معنی عبارت میں اس طرح بیان کرتا ہے: "اس دُنیا کی زندگی لہو و لعب کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس زندگی میں کھیل کود اور لالچ یعنی مشاغل کے سوا اور کوئی مقصد نہیں: (وما ہذہ الحیوۃ الدنیا الا لہو و لعب)۔"

حقیقی زندگی دارِ آخرت ہی کی ہے۔ کاش کہ وہ لوگ اس بات کو جانتے: (وان الدار الاخرۃ لہی الحیوان لوکا نوالعلمون)۔ یہ الفاظ کتنے جاذب اور مؤثر ہیں۔ کیونکہ "لہو" کے معنی ایسا ہر شغلہ اور ایسا ہر کام ہے جو انسان کو زندگی کے میناوی مسائل سے منحرف کر دیتا ہے اور "لعب" خیالی مقصد کے لیے خیالی پلاؤ پکانے کو کہتے ہیں کھیل کو بھی لب کہتے ہیں۔ جب بچے کوئی کھیل کھیلتے ہیں تو اُن میں سے ایک بادشاہ بنتا ہے، دوسرا وزیر بنتا ہے، تیسرا سپہ سالار فرج بنتا ہے، کوئی اُن میں قافلہ سالار بنتا ہے اور کوئی راہ زن بنتا ہے۔ جگہ کے بعد جب کھیل ختم ہو جاتا ہے تو یہ تمام عمدے خواب و

خیال بن کر رہ جاتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ دنیا کی زندگی ایک قسم کا مشغلہ اور کھیل ہے۔ اس دنیا میں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ اپنے اپنے تعصبات سے دل لگاتے ہیں۔ چند روز کے بعد پرانہ ہو جاتے ہیں۔ پھر زیر خاک پنہاں ہو جاتے ہیں۔ اُس کے بعد اُن کی زندگی اور اُن کے مشاغل کے متعلق لوگ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔

لیکن حقیقی زندگی جس کو نہ فنا ہے، نہ اس میں درد و رنج ہے، نہ خوف و اضطراب ہے اور نہ تضاد و تزامم ہے وہ حیاتِ آخرت ہی ہے۔ مگر _____ کا شکر انسان اس حقیقت کو جانے اور نظر دقیق اور حقیقت سے کام لے۔ جو لوگ کہ اس دنیا سے دل لگاتے ہیں اور اس کی ظاہری جوج دھج پر فریفتہ ہو جاتے ہیں وہ بچوں کی طرح ہیں۔ خواہ اُن کی عمر کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو۔

ضمناً یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ کلمہ "حیوان" (بروزن "فربان") بہت سے مشرکین اور اہل لغت کے نزدیک یعنی "حیات" کا منہوم رکھتا ہے۔ (یعنی مصدری رکھتا ہے)۔ آیت میں اشارہ اس طرف ہے کہ سوائے آخرت ہی عین حیات ہے۔ گویا اُس میں ہر طرف سے زندگی کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ دہاں بجز زندگی کچھ اور نہیں ہے۔

یہ برہمی ہے کہ قرآن کا سرگز یہ منشاء نہیں ہے کہ خدا حیات سوائے آخرت کے ذکر سے اُن نعمات کی قدر کم کرے جو اُس نے اپنے بندوں کو اس دنیا میں عنایت کی ہیں۔ بلکہ اس موازنہ سے مقصود صرف یہ ہے کہ خدا انسان کے سامنے دونوں جہان کی زندگیوں کی قدر و حیثیت کو پیش کرنا چاہتا ہے۔ علاوہ بریں یہ بھی پیش نظر ہے کہ وہ انسان کو متنبہ کرے کہ وہ ان نعماتِ دنیاوی کا اسیر نہ ہو جائے بلکہ اُن کا حاکم ہو اور اپنی شخصیت کے جوہر اصلی کو ان کے عوض نشان نہ کرے۔

تیسرے مرحلے میں انسان کی فطرت و مرشحت کا بیان ہے اور یہ فرمایا گیا ہے کہ جو انی ترین حالات میں انسان کے دل میں فُور توجہ چمکنے لگتے ہیں۔ اس حقیقت کو ایک نہایت ہی واضح مثال سے روشن کیا گیا ہے۔ جس وقت وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خدا کو اخلاص کامل سے یاد کرتے ہیں۔ اُس وقت غیر خدا اُن کے ذہن سے قطعی محو ہو جاتا ہے۔ لیکن جب خدا انہیں طوفان اور گرواب سے رہائی بخش دیتا ہے اور سلامت خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو وہ پھر شرک ہو جاتے ہیں: (فاذا ركبوا في الفلك دعوا لله منخلصين له الدين فلما نجاهم الى البر اذاهم ليشركون)۔

یہ درست ہے کہ شدائد زندگی اور طوفانِ حوادث ہی میں انسان کی فطرت کے دہر نکلتے ہیں۔ کیونکہ ہر انسان کی روح میں توحید کا فُور پھینچا ہوا ہے مگر معاشرت کے لایق آداب و رسوم، غلط تربیت اور شر و فساد آگین تعلیم اُس پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ مگر جب ہر طرف سے منسبتوں کے طوفان اُٹھتے ہیں اور انسانِ شگفتہ کے گرواب میں پھنس جاتا ہے تو پھر وہ نام و سائل ظاہری سے یہ صبر واصل "حی" سے ماخوذ ہے اور "نیان" کا۔ چونکہ "و" سے "ی" ہو گیا اور "ح" سے "ی" ہو گیا۔

دست کش ہو جاتا ہے۔ پھر اُس کی فطرت اسے مدارانِ عالم کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اُس وقت اُس کے دل سے شرکِ اولد خیالات نر ہو جاتے ہیں اور وہ ان حوادث کی بھٹی میں تپ کر بہ صدق "منخلصین له الدين" ہر کھوٹ سے صاف ہو جاتا ہے۔ غلامانہ گفتگو یہ ہے کہ انسان کے قلب میں ایک نقطہ نورانی موجود ہے۔ جس کا تعلق اُس عالم سے ہے جو جہانِ مادی سے ماورائے اور ذاتِ الہی سے اُس کا نزدیک ترین رابطہ ہے۔

غلط تعلیمات، غفلت و غرور بالخصوص ہرجست سے سلامتی اور فردانی دولت کی حالت میں اس نقطہ نورانی پر پردے پڑ جاتے ہیں مگر حوادث کے طوفان ان پردوں کو چاک کر دیتے ہیں، غفلت کی گرد بھڑ جاتی ہے اور وہ نقطہ نورانی پھر چمکنے لگتا ہے۔ عظیم بادیاں اسلام شکرین خدا کو اسی طریقہ سے راہِ راست پر لاتے تھے۔

ہم سب نے اُس شکی کی داستان سنی ہے جو معرفتِ الہی کے معاملہ میں سخت شک میں مبتلا تھا اور امام جعفر صادقؑ نے اسی لاشعوری جذبے کے حوالے سے اس کو ہدایت فرمائی۔ اُس آدمی نے امام کی خدمت میں عرض کی:

يا بن رسول الله دلتني على الله ما هو ؛ فقد أكثر على المجادلون
وحیرونی فقال له الامام (ع) : يا عبد الله ! هل ركبت سفينة قط ؟

قال : نعم

قال : فهل كسرتك حيث لا سفينة تنجيك ولا سبلحة تفنيك ؟

قال : نعم

قال : فهل تعلق قلبك هنالك ان شيئاً من الاشياء قادر على ان
يخلصك من ورطتك ؟

قال : نعم

قال الصادق (ع) : فذلك الشيء هو الله القادر على الانجاء۔ يث
لا منجى، وعلى الاغاثة حيث لا مغث۔

اسے فرزندِ رسولؐ ! آپ میری رہنمائی فرمائی کہ خدا کون ہے؟ کیونکہ مجھے ایک عظیم
دوسرے حیران کر دیا ہے۔

امامؑ نے فرمایا: اسے بندہ خدا! کیا تو کبھی کشتی میں سوار ہوا ہے؟
اُس نے عرض کیا: ہاں۔

آپؑ نے فرمایا: کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ تیری کشتی ایسی جگہ ٹوٹی ہو کہ وہاں کچھ بچانے
کے لیے کوئی کشتی موجود نہ ہو اور تو تیر بھی نہ سکتا ہو؟

اُس نے عرض کیا: ہاں۔

آپؑ نے فرمایا: کیا اُس حالت میں تیرے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ کوئی بہت سی کشتی

تجھے اس نسبت سے بچا سکتی ہے؟

اس نے عرض کیا: ہاں۔

امام نے فرمایا: وہ خدا ہی ہے جو اس حالت میں نجات دینے پر قدرت رکھتا ہے

جب کوئی نجات دہندہ اور فریاد رس نہ ہو۔

زیر بحث آیات میں سے آخری آیت میں خدا پرستی اور توحید باری تعالیٰ پر ان تمام استلالت کے بعد مخالفین اسلام حضرت مکن نندیدہ شدید کے بعد ارشاد خداوندی ہے: "وہ لوگ ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں اور ہماری عطا کردہ نعمات کے ناشکر گزار ہیں۔ وہ چند روز ان زود گزر لذات سے اٹھ لیں۔ لیکن وہ جلد سوجو جائیں گے کہ کفر و شرک کا انجام لیا ہو گا اور وہ انھیں کن نعمات میں مبتلا کر دے گا: (لِیُکْفِرُوا بِنِعْمَةِ اللَّهِ عَلَيْهِمْ وَلِيُذَمَّوْا صُوف يَعْلَمُونَ)۔

اگرچہ اس آیت میں کفر اور انکار آیات کا ذکر ہے لیکن یہ بدیہی ہے کہ ان الفاظ کا مقصد تمدن جہلہ یا کفار اسی ظن جیسے کسی جہلہ پیشہ انسان سے کہا جائے کہ تم سے جو گناہ اور غم بھی ہو سکتا ہے کہ لو کہیں اپنے انکار کا نتیجہ جلد ہی بھگتو گے۔ اگرچہ عبارت میں صیغہ امر استعمال ہو رہی ہے مگر اس سے کسی شخص کی طلب فراد نہیں بلکہ تمدن جہلہ مراد ہے۔ نیز یہ کہ "صُوف يَعْلَمُونَ" مطلق صورت میں آیا ہے اور یہ وضاحت نہیں ہے کہ وہ کیا جان لیں گے۔ صرف اتنا کہا ہے کہ وہ جلد جان لیں گے۔

یہ شبوہ کلام صرف اس لیے ہے کہ اس کا مفہوم جتنا بھی زیادہ وسیع ہو گا سننے والے کا ذہن کسی حد میں محدود نہ رہے گا۔ براعالمیوں کا نتیجہ غلاب الہی، دونوں جہان میں رسوائی اور ہر قسم کی بدبختی ہے۔

سختیوں میں فطرتِ انسانی کے جوہر کھلتے ہیں:

ہم ان شاء اللہ سورہ رُوم کی آیت ۳۰ کے ذیل میں اسل توجیہ و نداء شناسی کے امر فطری ہونے کے تعلق تفصیل سے بحث کریں گے۔

اس مقام پر جس بات کا ذکر ضروری ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کی متعدد آیات میں زندگی کی مشکلات اور سختیوں کا ذکر اس عنوان سے کیا گیا ہے کہ وہ انسان کی اس فطرت کے ظہور کا وسیلہ بن جاتی ہیں۔

ایک مقام پر فرمایا گیا ہے:

وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَالْيَهُ
تَجْرُونَ ثُمَّ إِذَا كُشِفَ الضُّرُّ عَنْكُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْكُمْ بِرِئَابِهِمْ
يُشْرِكُونَ

ترجمہ: اور تم کو جو نعمت ہے وہ اللہ کی ہے پھر جب تکلیف پہنچے تو تم اس سے بھاگتے ہو پھر جب تکلیف سے ہٹا دیا جائے تو تم میں سے ایک گروہ اپنے رب سے شریکوں کو

تمہارے پاس جتنی بھی نعمات ہیں وہ سب خدا کی عطا کردہ ہیں اور جب تم پر کوئی

بلا نازل ہوتی ہے تو تم اس کی درگاہ میں فریاد کرتے ہو مگر جب خدا وہ بلا تم سے

ٹال دیتا ہے تو تم میں سے ایک گروہ پھر شریک ہو جاتا ہے۔ (عن: ۵۳-۵۴)

سورہ یونس میں یہ بات ایک اور طرف سے بیان ہوئی ہے:

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَا الْجُنُودَ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَابِلًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّكَانَ
لَمَّا يَدْعُنَا آلِيَّ ضُرِّهِمْ جَبَّ جُنُودُهُمْ أَلَيْسَ بِهِ نَسْوَةٌ أَوْ كَيْفَ ضَلُّوا أَذًى لَّيْسَ بِهِ
هَمٌّ وَهُمْ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ وَإِن يَدْعُوا إِلَىٰ جُنُودِهِمْ فَلَا يَسْتَمِعُونَ
سورہ رُوم کی آیت ۳۳، سورہ زمر کی آیت ۴۶ اور سورہ بنی اسرائیل کی آیات ۶۴-۶۹ میں یہی مطلب عبارات دیگر اور اشارات
پر مبنی کے ساتھ آیا ہے۔

ہم نے آیات زیر بحث میں بھی یہ پہنچا ہے کہ شریکین کا یہ گروہ جب ان کے دل نجاست کفر سے آلودہ ہوتے ہیں تو
جنتوں کے پاس جاتا ہے مگر جب یہ سمنہ رنی سفر پر روانہ ہوتے ہیں اور وہاں انھیں طوفان، بھینور اور مخالفت ہوا کہیں گھیر لیتی ہیں
اور ان کی کشتیاں سطح امواج پر گھاس کے ٹکے کی طرح حرکت کرنے لگتی ہیں اور وہ سر طرف سے مالین ہوا لگتے ہیں تو ان کے
قلب میں نور توحید چمکنے لگتا ہے اور تمام نور سائنسہ معبود غائب ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ان کے دل میں "خلوص کامل" پیدا
ہوتا ہے مگر یہ خلوص مجبوراً پیدا ہوتا ہے اور بس قدر ہوتا ہے۔

لیکن جیسے ہی طوفان ٹل جاتا ہے اور حالات پھر معتدل ہو جاتے ہیں تو ان کے دل پر پھر پردے سے پڑ جاتے ہیں اور عمل نسبت
کے اطراف میں شرک اور بت پرستی کے کاٹنے آگ آتے ہیں۔

مکن ہے کہ کفار کی اس قلبی کیفیت کے لیے عذر پیش کیا جائے کہ ان کی یہ حالت شعور میں ان تمدنیہ خیالات اور
اثرات کی وجہ سے ہے، جو انھوں نے اپنے معاشرے اور تمدنیہ سے حاصل کر لیے ہیں۔

مگر یہ عذر اس صورت میں قابل قبول ہو سکتا ہے کہ یہ حالت صرف ان مذہبی لوگوں کی ہوتی جو مذہبی ماحول میں سنبھلیں
لیکن تجربہ یہ ہے کہ غیر مذہبی معاشرے میں سخت ترین منکرین خدا کی بھی یہی حالت ہوتی ہے۔ اس سے یہ سمجھ لیا جاتا ہے
کہ نور توحید کا لازماً کہیں اور نکلنے ہے۔ یعنی وہ انسان کے الشعور اور اس کی فطرت و سرشت میں داخل ہے۔

۶۷۔ اُولَٰئِكَ يَرْوٰۤاۤ اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًاۙ اٰمِنًاۙ وَبَيِّنَاتٍ لِّخَلْفِ النَّاسِ مِنْ حَوْلِهِمْۙ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ۝

۶۸۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلٰى اللّٰهِ كَذِبًاۙ اَوْ كَذَبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُ الّٰیْسُ فِىۤ جَنَّتِهِۦ مَثْوٰى لِّلْكَافِرِيْنَ ۝

۶۹۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِىْنَاۙ لَنَهْدِيَْنَّهُمْ سُبُلَنَاۙ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

ترجمہ

۶۷۔ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے حرم کو مقام آمن بنایا ہے۔ درآں مالیکہ لوگ اُس کے اطراف سے اُپک لیے جاتے ہیں۔ کیا یہ لوگ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور خدا کی نعمت کا انکار کرتے ہیں؟

۶۸۔ اُس سے زیادہ ظالم کون ہے جو خدا پر تجھوت باندھتا ہے یا جب اس کے سامنے حق بات آنے تو اُس کی تکذیب کرتا ہے۔ کیا کافروں کا ٹھکانا جہنم نہیں ہے؟ اور جن لوگوں نے ساری راہ میں انھوں نے نیت کے ساتھ اجماد کیا ہم ضرور انھیں اپنی راہ کی ہدایت دیں گے اور خدا تو نیکو کاموں کے ساتھ ہے۔

شان نزول

تفسیر "دُر المنثور" میں زیر بحث آیت کے متعلق ابن عباس سے یہ روایت منقول ہے کہ مشرکین کے ایک گروہ نے رسول اللہ سے یہ کہا: اے محمد! ہم آپ کے دین میں اس دہشتہ داخل نہیں ہوتے کہ ہم ڈرتے ہیں کہ لوگ (مخالفین) ہمیں اٹھا کر لے جائیں گے (اور بددیہی موت کے گھاٹ اتار دیں گے) کیونکہ ہماری تعداد کم ہے اور مشرکین عرب کی جمعیت زیادہ ہے۔ جیسے ہی انھیں یہ اطلاع ملے گی کہ ہم نے آپ کا دین قبول کر لیا ہے تو وہ ہمیں اٹھا کر لے جائیں گے۔ ہم ان میں سے صرف ایک ہی شخص کی خوراک ہیں۔ اس مقام پر آیت "اُولَٰئِكَ يَرْوٰۤاۤ اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًاۙ اٰمِنًاۙ وَبَيِّنَاتٍ لِّخَلْفِ النَّاسِ مِنْ حَوْلِهِمْۙ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ۝" نازل ہوئی۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں بھی مشرکین کے اس بہانے کی طرف ذمہ داری صورت سے اشارہ ہوا تھا کہ ہم اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اگر ہم اٹھا کر ایمان کر دیں اور اُس کے ساتھ ہجرت کریں تو ہماری زندگی تو مختل ہو جائے گی قرآن میں اُن کے اس بہانے کا مختلف طریقوں سے جواب دیا گیا ہے۔

زیر بحث آیات میں انھیں ایک اور طریقے سے جواب دیا گیا ہے۔ خدا فرماتا ہے: کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اُن کے لیے حرم امن قرار دیا ہے۔ (یعنی سرزمین پاک و مقدس مکہ)۔ (اُولَٰئِكَ يَرْوٰۤاۤ اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًاۙ اٰمِنًاۙ)۔ جب کہ سارے عرب بد امنی کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ "اس سرزمین سے باہر انسانوں کو اٹھا کے لے جاتے ہیں"۔ ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم ہے مگر اس سرزمین میں بیک حال امن و امان برقرار رہتا ہے: (وَيَتَحَفَّظَنَّ النَّاسَ مِنَ حَوْلِهِمْ)۔

وہ خدا جو اس امر پر قادر ہے کہ حجاز کے اس بھر متلاطم و طوفانی میں حرم مکہ کو آرام و امن کے ایک جزیرہ کی مانند بنا دے، تو کیا اُس میں اتنی قدرت نہیں ہے کہ انھیں دشمنوں سے محفوظ رکھے؟ وہ لوگ خدائے قادر و توانا کے مقابلے میں ان ضعیف و ناتوان لوگوں سے کیوں ڈرتے ہیں؟

کیا اس کے باوجود وہ باطل پر ایمان رکھیں گے اور خدا کی نعمت کا انکار کرتے رہیں گے: (اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ)۔

مختصر بات یہ ہے کہ جو خدا! اس امر پر قادر ہے کہ ایک پرفساد ملک میں جہاں نیم وحشی لوگ آباد ہیں۔ ایک چھوٹے سے علاقے کو جائے امن قرار دے دے۔ کیا وہ یہ نہیں کر سکتا کہ کافر اور بے ایمان لوگوں میں مومنین کو آفات سے محفوظ رکھے

قرآن میں اس روشن دلیل کے ذکر کے بعد بطور استقرا "ایک حکم" قائم کیا گیا ہے: ایا ان لوگوں سے بھی زیادہ ظالم کوئی ہے؟

خدا پر ہمت نہ ہوتی تھی یا جب حق ان کے پاس آتا ہے تو اس کا انکار کرتے ہیں۔ (ومن اظلم ممن افترى على الله كذباً او كذب بالحق لما جاءه)۔

ہم نے تمہارے لیے اس امر کی واضح دلائل قائم کر دی ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی اور عبادت کے لائق نہیں ہے۔ مگر تو خدا پر ہمت لگاتے ہو اور اس کے لیے شریک بنالیتے ہو۔ یہاں تک اپنے اس کفر و شرک کے لیے یہ دعویٰ کرتے ہو کہ یہ سب کچھ بھی رخصت کے الٰہی سے ہو رہا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہم نے تم پر قرآن نازل کیا جس میں حق کے دلائل واضح اور روشن ہیں۔ لیکن تم ان چیزوں سے قطع نظر کر کے انہیں پس پشت ڈال دیتے ہو۔ کیا اس سے بھی بڑا کوئی ظلم و ستم متصور ہو سکتا ہے؟

یہ شبوہ اپنے اوپر اور تمام بنی نوع انسان پر ظلم ہے کیونکہ شرک اور کفر ظلمِ عظیم ہے۔ یہ الفاظ دیگر وسیع معنی کے لحاظ سے ظلم کا مفہوم یہ ہے کہ کسی چیز کو اس کے مناسب مقام سے نکلانا اور خوف کرنا۔ اس لحاظ سے — کیا اس سے بھی بڑا کوئی بات ہو سکتی ہے کہ انسان ایک بے حقیقت پتھر اور ٹکڑی کو خالق زمین و آسمان کا شریک دسیں بنا دے۔

علاوہ ازیں شرک جملہ معاشرتی مفاسد کی بنیاد ہے۔ درحقیقت دوسرے مظالم اسی سے پیدا ہوتے ہیں مثلاً بوجہ پرستی جاہ پرستی یا دنیا پرستی۔ ان میں سے ہر ایک ایک قسم کا شرک ہے۔

لیکن ہر شخص متنبہ رہے کہ "ایک نامبارک انجام"۔ شرکین کے ایشوار میں ہے۔ کیا کافروں کا مقام دھل دوزخ نہیں ہے؟ (اليس في جهنم مثوى للكافرين)۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ قرآن مجید میں پندرہ مقامات پر جن لوگوں کو ظالم ترین افراد کہا گیا ہے۔ ان سب کا ذکر جملہ استفہامیہ سے کیا گیا ہے۔ یعنی "من اظلم" (یہ استقام انکار ہے)۔

ان آیات میں غور و فکر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگرچہ بظاہر ان میں مختلف مسائل بیان ہوئے ہیں مگر دیکھا جائے تو ان سب کی بنیاد شرک ہے۔ اس لیے ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

مزید وضاحت کے لیے جلد ۳ میں سورہ انفصام آیت ۲۱ کے تحت دیکھیے :

زیر نظر آیات میں سے آخری آیت میں جس پر سورہ عنکبوت کا اختتام ہوتا ہے، ایک اہم حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ جو اس تمام سُنّت کا جوہر ہے اور اس کے آغاز سے ہم آہنگ ہے۔

فرمایا گیا ہے اگرچہ راہِ خدا میں بہت سی مشکلات ہیں۔ مثلاً ایک دشواری حق کو پہچاننے کی ہمت سے ہے۔ شیاطین جن دنوں کے دوسروں کے لحاظ سے بھی دشواری ہے۔ بے رحم اور مغرور دشمنوں کی مخالفت بھی ایک دشواری ہے۔

علاوہ بریں وہ لغزشیں بھی ایک مشکل ہیں جن کا انسان سے سرزد ہونا ممکن ہے۔ لیکن اس مقام پر ایک ایسی حقیقت بھی ہے جو ان مشکلات کے مقابلے میں دل کو اطمینان بخشی اور قوی رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جو لوگ ہماری راہ میں ہمارے کرتے ہیں۔

انہیں اپنے راستوں کی طرف ہدایت کرتے ہیں اور خدا نیکو کاروں کے ساتھ ہے: (والَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لِنَهْدِيَهُمْ لِمَنْ وَارَ اللَّهُ لَعْنَةُ الْمُحْسِنِينَ)۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ اس مقام پر کلمہ "جہاد" سے کیا مراد ہے؟ آیا اس سے مراد "جہاد با دشمن" ہے؟ یا جہاد بانفس؟ یا جہاد در راہ معرفتِ خدا؟ بذریعہ علم و استدلال ہے؟

مفسرین نے اس کے مفہوم کے لیے متعدد احتمالات کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح کلمہ "فینا" کی تعبیرات میں بھی اختلاف ہے۔ آیا اس سے مراد "راہِ رضائے الٰہی" ہے؟ یا راہِ جہاد بانفس مراد ہے؟ یا طریقِ عبادت مراد ہے؟ یا دشمنانِ اسلام جنگ کرنا مراد ہے؟

لیکن — یہ ایک روشن امر ہے کہ کلمہ "جہاد" اور اسی طرح کلمہ "فینا" کا مفہوم نہایت وسیع ہے اور اس کا اطلاق ہر جہت سے ہے۔ وہ تمام گوشیشیں اور ہر قسم کا جہاد جو راہِ خدا میں صرف اُس کی رضائے لیے کیا جائے اور جس کی غایت یہ ہو کہ انسان منشائے الٰہی کے تحت زندگی بسر کرے، اس مفہوم میں شامل ہیں۔ خواہ انسان اکتسابِ معرفتِ الٰہی کی راہ میں کوشش کرے یا اپنے نفس سے جہاد کرے یا دشمنانِ اسلام سے جنگ کرے یا اطاعتِ الٰہی کی مشقت کو برداشت کرے یا دوسرے معصیت کے مقابلے میں استقامت اختیار کرے یا اپنی توانائی مستغنیہ افراد کی مدد کرنے میں صرف کرے یا کوئی اور نیک کام کرے۔ غرض سب باتیں عبارت "جہاد" اور "فینا" کے مفہوم میں شامل ہیں۔

الغرض جو لوگ مذکورہ راہوں میں جس شکل و صورت سے بھی مجاہدہ کرتے ہیں خدا کی حمایت و ہدایت اُن کے شامل حال بنتی ہے۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اُس سے ضمناً یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آیت میں کلمہ "سبیل" (جمع سبیل یعنی راہ) سے مراد مختلف راستے ہیں، جو خدا تک پہنچتے ہیں۔ یعنی جن کی غایت رضائے الٰہی ہے مثلاً راہِ جہاد بانفس، راہِ جہاد با دشمنانِ اسلام، راہِ تحصیلِ علم و دانش وغیرہ۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ ان مقاصد میں سے انسان کسی مقصد کے لیے بھی جہاد کرے تو وہ اس راہ پر کام لے کر جہاد ہے جو خدا تک پہنچتی ہے۔

خلاصہ اپنی راہ کے تمام مجاہدین سے یہ وعدہ کیا ہے تو اس وعدہ کو مختلف تاکیدات سے (مثلاً لام تاکیدیہ اور فون تاکیدیہ ثقلیہ سے) منوکہ کیا ہے اور انسان کی کامیابی، ترقی اور حصولِ مقاماتِ روحانی کو دہیزوں میں محصور کر دینے اور وہ میں "جہاد" اور "خلوصِ نیت" سے۔

کچھ فلاسفہ کا عقیدہ ہے کہ "تفکر اور مطالعہ" سے علم و دانش حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ درزش ذہنی انسان کی روح کو "طوریہ معقولات" کے قبول کرنے کے لیے تیار کر دیتی ہے اور جس وقت انسان کی روح انہیں قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتی ہے تو خالقِ تعالیٰ و داہبِ العنصر کی جانب سے انسان کی روح پر فیضِ علم کی بارش ہوتی ہے۔ اس بنا پر انسان کو اس راہ میں جہاد تو ضرور کرنا چاہیے لیکن ہدایتِ خدا کے اختیار میں ہے۔ نیز حدیث میں یہ جو وارد فرمایا ہے کہ :

جس وقت بھی ہمارے اندر فتور سا اخلاص بھی پیدا ہو جائے گا اور ہمارے مجاہدین میں حرکت عمل پیدا ہوگی تو یکے بعد دیگرے کامیابیاں حاصل ہوتی جائیں گی۔ غلامی کی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی۔ ساری سیال امید سے اور ناکامیوں کامیابی سے، دولت عزت سر بندی سے انتشار و ففاق و عدت و تنظیم باہمی سے بدل جائے گی۔

قرآن کتنا با عظمت و الہام بخش ہے کہ اُس نے ایک مختصر سے جملے میں درود و درمان دونوں کو بیان کر دیا ہے۔

درست ہے کہ جو لوگ راہِ خدا میں جہاد کرتے ہیں ہدایتِ الہی اُن کے شامل حال رہتی ہے اور یہ ہدیری ہے کہ ہدایتِ الہی کے ہوتے ہوئے گم راہی اور شکست کبھی پیش نہیں آسکتی۔

اہل بیت کی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا مزاج آلِ محمدؑ اور اُن کے پیرو ہیں۔ تو درحقیقت وہ اس مفہوم کے مصداق کامل ہیں کیونکہ یہ حضرات طریقِ جہاد اور راہِ اخلاص میں پیش قدم اور پیش کردہ تھے۔ اس تفسیر سے آیت کا مفہوم محدود نہیں ہوتا۔

ہر حال ہر شخص اپنی جہاد کے دوران میں اس حقیقتِ قرآنی کو واضح طور پر محسوس کرتا ہے کہ جس وقت بھی وہ راہِ خدا میں سعی و کوشش اور جہاد کے لیے آمادہ ہوتا ہے تو اُس کے لیے آسانوں کے دروازے کھل جاتے ہیں اور مشکلات آسان ہوجاتی ہیں اور اُس کے لیے سختیاں قابلِ تحمل ہوجاتی ہیں اور وہ اُن پر غالب آجاتا ہے۔

۲۔ لوگ تین قسم کے ہیں : (۱) ایک گروہ ہٹ دھرم منکرین کا ہے کہ کوئی ہدایت بھی اُن کے لیے نمود مند نہیں ہے۔

(۲) دوسرا گروہ اُن غلصین کا ہے جو حق کی جستجو میں رہتے ہیں اور نتیجتاً حق کو پالیتے ہیں۔

(۳) تیسرا گروہ اُن سے بھی برتر ہے۔ وہ لوگ حق سے دُور نہیں ہیں کہ کوشش کر کے نزدیک ہوں۔ وہ حق سے جدا نہیں ہیں کہ کوشش کر کے اُس سے جاسمیں بلکہ وہ ہمیشہ حق کے ساتھ ہیں۔

آیت ۶۸ میں "ومن اظلم ممن افتری" کا اشارہ گروہِ اول کی طرف تھا۔ اور۔

آیت ۶۹ میں "والذین جاہدوا فینا" سے گروہِ دوم مراد ہے۔ اور اسی آیت میں "ان الله لمع المحسنین" گروہِ سوم کے لیے ہے۔ ان الفاظ سے یہ مفہوم بھی اخذ ہوتا ہے کہ "مُحْسِنِین" کا مقام مجاہدین سے ارفع ہے۔ کیونکہ یہ لوگ جہاد اور اپنی نجات کے لیے کوشاں رہنے کے علاوہ مقامِ ایشاد و احسان پر بھی فائز ہیں اور دوسروں کے لیے اپنے آپ کو خطرات میں ڈالنے سے پہلوتھی نہیں کرتے۔

اے پروردگار! تو ہمیں ایسی توفیق عنایت فرما کہ تمام عمر تیری راہ میں سعی و کوشش سے دست بردار نہ ہوں۔

خداوند!۔ تو ہمیں ایسا اخلاص مرحمت فرما کہ ہمیں تیرے سوا کسی خیر کا خیال بھی نہ آئے اور کسی غیر کی طرف ہمارا قدم نہ اٹھے۔

حصولِ علم کا انحصار تعلیم و تعلم کی کثرت پر نہیں ہے بلکہ علم ایک نور ہے کہ خدا جس قلب کو اہل اور مناسب حال سمجھتا ہے اُس میں ودیعت کر دیتا ہے۔

مکن ہے کہ اس کا اشارہ بھی ہمارے بیان کردہ مفہوم کی طرف ہو۔

چند اہم نکات

۱۔ جہاد و اخلاص : آیاتِ مقابل سے یہ مطلب بخوبی اخذ ہوتا ہے کہ ہمیں جو بھی شہادت و ناکامی پیش آتی ہے وہ ان دو اسباب میں سے کسی ایک کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یا تو ہم نے جہاد میں کوتاہی کی ہے یا ہمارے عمل میں خلوص نہ تھا۔ اگر یہ دونوں شرائط (جہاد و اخلاص) باہم جمع ہو جائیں تو اللہ کے تائیدی وعدے کے مطابق اُن کے لیے مقاصد میں کامیابی اور صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت یقینی ہے۔

اگر ہماری سہاگ فکر درست ہو تو ہم اسلامی معاشرے کو پیش آنے والی مشکلات اور مصائب کے اسباب معلوم کر سکتے ہیں اور جان سکتے ہیں کہ جو مسلمان کل تک رہنا سچے عالم تھے، آج پس ماندہ کیوں ہو گئے ہیں؟ وہ زندگی کے ہر پہلو میں ہم تک کہ ثقافت، کلچر اور اپنے قوانین کے لیے بھی دوسروں کی طرف دستِ نیاز کیوں دراز کرتے ہیں؟

وہ سیاسی طوفانوں اور بیرونی فوجی حملوں کی صورت میں دوسروں پر بھروسہ کیوں کرتے ہیں؟ ایک وقت وہ تھا کہ دوسرے اُن کے خوانِ علم و ثقافت کے ریزہ چیں تھے۔ اور آج وہ دوسروں کے دسترخوان سے رفعِ احتیاج کرتے ہیں۔

وہ کیوں اختیار کے دستِ ہوس میں گرفتار ہیں اور اُن کے ملک دوسروں کے تصرف میں کیوں ہیں؟ ان تمام سوالات کا ایک ہی جواب ہے وہ یہ کہ یا تو ہم نے جہاد کو فراموش کر دیا ہے یا ہماری نیتوں میں خلوص باقی نہیں رہا۔

ہاں۔ بالکل درست ہے کہ علمی و ادبی، سیاسی و اقتصادی اور فوجی محاذوں پر ہم نے جہاد کو قلعی فراموش کر دیا ہے اس کے بجائے مسلمانوں پر شہتِ نفس، دنیا کی محبت، راحت طلبی، تنگ خیالی اور اغراضِ شخصی غالب آگئی ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کے اپنے ہاتھ کے مقتولین کی تعداد اُس سے کہیں زیادہ ہے جتنی کہ ڈشمن نے قتل کی ہے۔

ایک مغرب زدہ یا مشرق زدہ گروہ ہے جس نے اپنی عزتِ نفس اور اپنی خودی کو اُن اقوام کے مقابل ہار دیا ہے۔ اسلامی ملک کے صاحبانِ اقتدار اور رہنمایان قوم نے اپنے آپ کو غیر اقوام کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔

اہل دانش اور صاحبانِ فکر و تدبیر نے مایوس ہو کر خلوت نشینی اختیار کر لی ہے۔ ان سب اسباب نے جذبہ جہاد اور اخلاص کو محو کر دیا ہے۔

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرون ملک مقیم ہیں
مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔

منجانب۔

سبیل سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدرآباد پاکستان

یا ربنا!

تو ہمارا مقام مجاہدین سے بلند کر دے اور ہمیں دشمنین کے مقام احسان و ایثار پر فائز کر دے اور تمام عمر تو ہمارے سرور پر اپنی ہدایت کا سایہ رکھ۔ آمین یا رب العالمین۔

تفسیر سورہ "عنکبوت" اختتام کو پہنچی

۲۱۔ شوال ۱۴۰۳ھ ہجری

سُورَةُ رُوم

- مکہ میں نازل ہوئی
- اس کی ۶۰ آیات ہیں

سُورَةُ رُومِ كِے مُنْدِرَجَات

قول مشہور کے مطابق چونکہ یہ تمام سُورہ مکہ میں نازل ہوئی ہے لہذا اس میں منکئی سُورتوں کے سے منساہین اور رُوح موجود ہے۔ یعنی اس میں سب سے زیادہ مبداء و معاد کے مسئلے پر بحث کی گئی ہے۔ کیونکہ اسلام کا منکئی عہد ایسا زمانہ تھا جس میں بنیادی امتناوات کی تعلیم پر زور تھا۔ مثلاً توحید، مبارزہ باشرک، توجہ بہ معاد اور بروز قیامت اعمال کی جزا و سزا وغیرہ۔ ان مباحث کے ضمن میں کچھ اور مطالب بھی آگئے ہیں جو ان ہی سے مربوط ہیں۔

در حقیقت اس سُورہ کے مضامین کا ان سات حصوں میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے :

۱۔ اس میں پیش گوئی کی گئی ہے کہ آئندہ ہونے والی جنگ میں اہل روم کو ایرانیوں پر فتح حاصل ہوگی۔ یہ پیش گوئی اس گفتگو کی مناسبت سے ہے جو اس موضوع پر مسلمانوں اور مشرکین میں ہوئی تھی۔ ان شاء اللہ آئندہ ہم تفصیل سے اس کا ذکر کریں گے۔

۲۔ کسی قدر بے ایمان افراد کی طرز فکر اور ان کی کیفیت حالات کا ذکر ہے اور اس کے بعد انہیں بروز قیامت ان کی بد اعمالیوں کی سزا اور عذاب الہی سے ڈرایا گیا۔

۳۔ اس سُورہ کی آیات کے ایک اہم حصے میں خدا کی عظمت کا ذکر ہے اور اس کے لیے ان امور کی نشاندہی کی گئی ہے: آسمان و زمین، انسان کے وجود، موت سے حیات اور حیات سے موت کے ظہور، خاک سے انسان کی پیدائش، اس کے لیے نظام زوجیت اور اس نظام سے ہم جنس افراد کی پیدائش، پھر ان کے درمیان رابطہ محبت، بلوقت شب نیند کی نعمت، دن کو حصول معاش کے لیے حرکت و عمل، ظہور رعد و برق و باران، موت کے بعد زمین کا دوبارہ زندہ ہونا اور الہی کے مطابق زمین اور دیگر سیاروں کے نظام کی تدبیر۔

۴۔ ان دلائل کے ذکر کے بعد جو معرفت الہی کے لیے نفس و آفاق میں موجود ہیں، یہ ذکر ہے کہ توحید ایک امر فطری ہے۔

۵۔ بے ایمان افراد کے حالات کو مشرح طور پر مکرر بیان کیا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ ان کے گناہوں کے نتیجے میں زمین فساد سے بھر گئی ہے۔

۶۔ سُود عوامی کی مذمت کی گئی ہے نیز مسئلہ مالکیت اور حق ذمی القرابی کا ذکر ہے۔

۷۔ دلائل توحید کے لیے حق کی نشانیں کا مکرر ذکر ہے اور ان مسائل کو بیان کیا گیا ہے جو معاد سے متعلق ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس سُورہ میں بھی قرآن کی دوسری سُورتوں کی طرح دلائل عقلی بھی ہیں، جذب و احساس کو بھی بیدار کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ خطابت کا ایسا مرکب ہے کہ مجموعی طور پر نفوس انسانی کی ہدایت اور تربیت کے لیے ایک جامع منظوریہ

فضیلتِ سُورَةِ رُومِ

امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے۔ جس کی طرف ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا :

جو شخص ماہ رمضان کی تالیسویں شب میں سُورہ عنکبوت اور سُورہ روم پڑھے گا۔
 قرم بخدا وہ اہل بہشت میں سے ہے۔ میں اس کلیہ میں کوئی استثنا نہیں کرتا۔
 ان دو سُورتوں کی خدا کے نزدیک بڑی وقعت ہے۔

جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک اور حدیث اس طرح ہے۔ منقول ہے :

من قرأھا کان لہ من الاجر عشر حسنات بعدد حکل ملک مسیح اللہ
 بین السماء والارض وادرك ما ضیع فی یومہ ولیلہ۔
 جو شخص کہ سُورہ روم کو پڑھے گا اسے ہر اس فرشتے کے حسنات کے مقابل جو زمین اور
 آسمان کے درمیان خدا کی تسبیح کرتا ہے، دس گناہ اجر ملے گا اور جو کچھ اس نے رات یا دن
 میں تلف کیا ہے اس کی بھی تلافی ہو جائے گی۔

یہ امر واضح ہے کہ جو شخص اس سُورہ کے مضامین کو جو کہ سر اسر درس توحید خدا ہے اور بروز قیامت عظیم عدل و انصاف کے بیان پر مشتمل ہیں۔ اپنے قلب رُوح میں جگہ دے گا، وہ مسوں کرے گا کہ خدا ہر لمحہ اس کا محافظ و نگہبان ہے اور وہ روز جزا اور بروز قیامت عدل الہی کا یقین رکھے گا اور اس کا دل خدا کے خوف سے اس طرح سے سمور ہو جائے گا کہ وہ ایسے اجر عظیم کا مستحق ٹھہرے گا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

- ۱- اَلَمْ
- ۲- غَلَبَتِ الرُّومُ
- ۳- فِي اَدْنٰی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ
- ۴- فِي بَضْعِ سِنِيْنَ ۗ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ ۗ وَيَوْمَئِذٍ يُفْرِحُ الْمُؤْمِنُوْنَ
- ۵- بِنَصْرِ اللّٰهِ ۗ يَنْصُرُ مَن يَّشَاءُ ۗ وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِیْمُ
- ۶- وَعَدَ اللّٰهُ ۗ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ
- ۷- يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۗ وَهُوَ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ

ترجمہ

اللہ کے نام سے شروع جو رحمان و رحیم ہے

۱: اَلَمْ

- ۱- اہل روم مغلوب ہو گئے۔
- ۲- (اور یہ شکست) نزدیک کے ملک میں رومنا ہوئی۔ لیکن وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب آجائیں گے۔
- ۳- چند ہی سال میں۔ سب کام حکم خدا سے ہوتے ہیں خواہ اس شکست و کامیابی سے قبل ہوں یا بعد میں اور اُس روز مومنین خوش ہو جائیں گے۔
- ۴- خدا کی مدد کے سبب سے۔ خدا جسے چاہتا ہے فتح و نصرت دیتا ہے اور وہ عزیز و رحیم ہے۔
- ۵- یہ خدا کا وعدہ ہے اور وہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔
- ۶- یہ لوگ تو دنیا کی صرف ظاہری زندگی کو جانتے ہیں اور آخرت کی زندگی سے غافل ہیں۔

شان نزول

جلد مشرین بزرگ کا اس پر اتفاق ہے کہ اس سورۃ کی پہلی آیات اُس وقت نازل ہوئی تھیں جب جناب رسالت مآب مکہ میں تھے اور مومنین بہ لحاظ تعداد اقلیت میں تھے۔ اُس زمانے میں ایرانیوں اور رومی حکومت میں جنگ ہوئی۔ جس میں ایرانی فرج کو فتح ہوئی تھی۔

مکہ کے مشرین نے اس فتح کو فال نیک سمجھ کر اپنے لشکر کو مبنی برحق ہونے کی دلیل قرار دیا اور کہا کہ ایرانی تو لشکر اور عیسیٰ ہیں کیونکہ وہ شہریت پرست میں مگر رومی سچی اور اہل کتاب ہیں۔ لہذا جس طرح ایرانی غالب اور رومی مغلوب ہوئے اسی طرح آخری فتح لشکر ہی کی ہوگی، اسلام کا دور صلہ ختم ہو جائے گا اور ہم فتح مند ہوں گے۔ اگرچہ اس قسم کی خوش فہمیاں بے بنیاد ہوتی ہیں۔ لیکن اُس معاشرے اور ماحول کے پہلا میں یہ پروپیگنڈا بے اثر نہیں رہ سکتا تھا۔ لہذا یہ امر مسلمانوں پر گراں گزارا۔

اُس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ جن میں حتمی طور پر یہ کہا گیا کہ اگرچہ ایرانی اس جنگ میں کامیاب ہو گئے ہیں لیکن زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ رومی فرج سے شکست کھائیں گے۔ یہاں تک کہ اس پیش گوئی کے پورا ہونے کا وقت ہی بتا دیا گیا اور کہا کہ چند سال کے اندر ہی یہ امر وقوع پذیر ہو گا۔

قرآن کی یہ حتمی پیش گوئی ایک طرف تو اس کتاب آسمانی کے اعجاز کی علامت اور اس امر کی دلیل تھی کہ اس کے لائے والے کو خدا کے علم بے پایاں اور اس کے عالم الغیب ہونے پر کتنا بھروسہ تھا۔ دوسری طرف یہ منظر کیمن کی فال گیری کی قطعاً ہی اس پیش گوئی نے مسلمانوں کو ایسا اٹوڑو و مطمئن کر دیا کہ ان میں سے بعض نے اس مسئلے پر مشرکین سے شرط بانڈھی شروع کر دی یہ ملحوظ رہے کہ اس وقت تک اس قسم کی شرط بندی کی ممانعت کا حکم نہیں آیا تھا! ۱

تفسیر

ایک عجیب پیش گوئی :

یہ سورۃ ان آنتیں سورتوں میں سے ایک ہے جو حروف مقطعه سے شروع ہوتی ہیں (بسم اللہ)۔ ان حروف مقطعه کی تفسیر کے بارے میں بار بار بحث کر چکے ہیں بالخصوص سورہ بقرہ، سورہ آل عمران اور سورہ اعراف کی ابتدا میں۔ اس مقام پر جو چیز جاذب توجہ ہے وہ صرف یہ ہے کہ بہت سی ان سورتوں کے برخلاف جو حروف مقطعه سے شروع ہوتی ہیں اور معاً بعد ازاں ان میں عظمت قرآن کا ذکر شروع ہو جاتا ہے، اس سورہ میں عظمت قرآن کی بحث نہیں ہے بلکہ ایرانیوں کے مقابلے میں اہل روم کی شکست اور پھر ان کی فتح کا ذکر ہے۔ لیکن غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ بحث بھی عظمت قرآن ہی کا بیان ہے۔ کیونکہ یہ غیبی خبر جو زمانہ مستقبل سے متعلق ہے، اس کتاب آسمانی کی عظمت و اعجاز کے دلائل میں شمار ہوتی ہے۔

خداوند عالم حروف مقطعه کے نوکر کے بعد فرماتا ہے : ”رومی مغلوب ہو گئے“ (غلبت الروم)۔ اور یہ شکست اس مقام پر ہوتی ہے جو تم سے نزدیک ہے: (فی ارض الامرض)۔

”اے ساکنان مکہ!“ تمہارے نزدیک کے علاقہ میں یہ واقعہ نمودار ہوا ہے۔ یعنی جزیرہ العرب کے شمال سرزمین شام میں۔ اس علاقے میں جو بصری اور اذرعات کے درمیان واقع ہے۔

اس مقام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کلمہ ”روم“ سے مشرقی روم (موجودہ ترکی) مراد ہے نہ کہ مغربی۔ بعض مفسرین (مثلاً شیخ طوسی نے تبیان میں) نے یہ خیال کیا ہے کہ ”ارض الامرض“ سے مراد ملک ایران ہے یعنی یہ شکست ایران اور روم کی سرحد پر واقع ہوئی۔

کلمہ ”الارض“ کی ابتدا میں الف و لام عدد کے پیش نظر پہلی تفسیر درست معلوم ہوتی ہے لیکن بعض جہات سے یہ شان نزول مختلف تعبیرات سے تقابلاً مع السببان، السببان، اور الشبان، ابو الفتح رازی تفسیر غزالی، تفسیر زوسی، تفسیر شافعی اور دوسری تفسیریں آئی ہے۔

تفسیر تبیان، جلد ۸، ص ۲۰۔

جن کا ذکر ہم کریں گے دوسری تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔ کلمہ ”ارض الامرض“ سے ایک تیسرا مفہوم بھی اخذ ہو سکتا ہے جو باعتبار تیسری تفسیر روم سے زیادہ مختلف نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ ”زمین“ سے مراد روم کا علاقہ ہے یعنی اہل روم نے اپنی سرحد کے قریب ترین علاقے میں ایرانیوں سے شکست کھائی۔

کلمہ ”ارضی“ سے اس شکست کی اہمیت کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ اگر کسی فوج کو اس کے ملک کی سرحد سے دور دراز علاقے میں شکست ہو جائے تو یہ امر اس قدر اہم نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ کسی فوج کو اس کے ملک کے قریب ترین علاقے میں جہاں اسے ہر طرح کی کمک پہنچ سکتی ہے اور جو زیادہ مضبوط علاقہ شمار ہو وہاں شکست ہو جائے۔

اس بنا پر ”فی ارض الامرض“ کے مفہوم میں رومیوں کی شکست کی اہمیت شامل ہے۔ اس حالت میں مغلوب قوم کے لیے یہ پیش گوئی کہ انہیں آئندہ چند سال میں فتح حاصل ہوگی اور یہی زیادہ اہم سے اور ایسی پیش گوئی جو اس اعجاز کے علاوہ اور کسی طرح نہیں ہو سکتی۔

اس شکست کے ذکر کے بعد یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ رومی اس شکست کے بعد جلد ہی فتح یاب ہوں گے (وہو من بعد غلبہم وسیغلبون)۔

صرف کلمہ ”سیغلبون“ ہی (یعنی وہ جلد غالب ہوں گے) بیان مقصود کے لیے کافی تھا مگر ”من بعد غلبہم“ کا اضافہ اس لیے کیا گیا ہے تاکہ فتح کی اہمیت زیادہ ہو جائے۔ کیونکہ ایک شکست نورہ فوج کا ایک قبیلہ مدت میں پر غالب آجانا غیر متوقع ہے اور قرآن میں مستقبل میں اس کے وقوع کی خبر دی گئی ہے۔

اس کے بعد اس حادثے کے وقوع کی مدت بالناظر (فی بضع سنین)۔ چند سال ہی میں بیان کی گئی ہے۔ جب کلمہ ”بضع“ کہا جاتا ہے تو اس سے کم از کم تین سال اور زیادہ سے زیادہ نو سال مدت مراد ہوتی ہے۔

۱؎ ظروفاً اول الفترال کے بعد اس کا بیٹا ہرزرد اور ہرزرد کے قتل کے بعد ہرزرد لقب بہ خروہم تخت نشین ہوا۔

۲؎ سن ۳۲۳ء میں رام کے بادشاہ، قیصر مدیس کو ایک شخص سستی فوس نے قتل کر دیا۔ خروہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر روم کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ اس جنگ میں ہرزرد کب جلدی رہی ایرانی سپہ سالاروں نے ازبک، اظاک، دشق اور یروشلم پر قبضہ کر لیا اور شمالی مصر کے بعض حصے بھی فتح کر لیے ”غلبت الروم“ اس بضع کی طرف اشارہ ہے۔

قیصر ماریس کے بعد ہرقل روم کا بادشاہ بنایا۔ سن ۳۲۳ء تا ۳۲۴ء عیسوی میں ایرانیوں نے نہ صرف مغربی علاقے واپس لے لیے بلکہ وہ ایرانی علاوہ میں داخل ہو کر شہر کزنک تک پہنچ گیا۔ سن ۳۲۵ء میں وہ ایران کے دارالسلطنت تیسفون تک آ پہنچا۔ خروہ وہاں سے فرار ہو گیا اور تھوڑی مدت میں ایک بغاوت میں مارا گیا۔

۳؎ ”وہو من بعد غلبہم وسیغلبون“

۴؎ رومیوں کی اس فتح کی پیش گوئی ہے۔ کلمہ ”بضع“ سے اور معنی بھی مراد لیے گئے ہیں۔ مثلاً یہ مدت کم از کم تین سال اور زیادہ سے زیادہ دس سال ہوتی ہے یا کم از کم ایک سال اور زیادہ سے زیادہ نو سال یا کم از کم تین سال اور زیادہ سے زیادہ نو سال۔ مگر ہم نے جو کہادہ زیادہ مشہور ہے۔

اگر خدا زمانہ مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی خبر دیتا ہے تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہر چیز اور ہر کام اسی کے اختیار میں ہے۔ خواہ کوئی بات اس شکست خوردہ قوم کی فتح سے پہلے ہو یا بعد میں۔ (الامر من قبل ومن بعد)۔

یہ امر یہی ہے کہ کائنات میں ہونے والے ہر واقعے کا خدا کے حکم اور اس کے ارادے سے وقوع پذیر ہونا۔ ہمارے اختیار و آزادی ارادہ اور پیش نظر مقاصد کے حاصل کرنے کے لیے سعی و کوشش میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ یہ الفاظ ڈیڑھوں کتنا چاہیے کہ اس عبارت کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ وہ انسان سے اختیار کو سلب کرے بلکہ یہ کلمہ سمجھانا مقصود ہے کہ درحقیقت قادر بالذات اور مالک علی الاطلاق وہی ہے اور کسی انسان کے پاس جو کچھ ہے اسی کا دیا ہوا ہے۔

اس کے بعد ان الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے کہ: اگر آج رومیوں کو شکست ہوگئی ہے اور مشرک اس سے خوش ہیں تو جب رومی غالب ہوں گے تو مومنین خوش ہوں گے۔ (ولیومئذ یفرح المؤمنون)۔

البتہ مومنین نصرت الہی سے خوش ہوں گے۔ (بند خدا)۔

خدا جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے، وہ شکست ناپزیر اور مہربان ہے: (بند خدا من یشاء وهو العزیز الخیر)۔ اس روز مسلمانوں کی خوشنودی سے کیا مراد ہے؟

اس کے متعلق کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ رومیوں کی فتح سے خوش ہوں گے۔ ہر چند کہ ان کا شمار بھی کفار میں تھا۔ لیکن — چونکہ وہ کتاب آسمانی کے حامل تھے۔ اس لیے مشرک مجوسیوں پر ان کی فتح گویا مشرک پر فتوح کی فتح کا ایک مرحلہ تھی۔

اس سلسلے میں بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ مومنین اس وجہ سے خوش ہوں گے کہ انہوں نے اس واقعے کو فال ایک سمجھا اور مشرکین پر اپنی فتح کی دلیل خیال کیا۔

یہ کہ — ان کی خوشی کا باعث یہ تھا کہ اس واقعے سے اس روز قرآن کی عظمت اور اس کی پیش گوئی کی صداقت ظاہر ہوگئی۔ یہ بات بھی مسلمانوں کے لیے ایک اہم معنوی فتح خیال کی گئی۔

یہ احتمال بھی بعید نہیں ہے کہ رومیوں کی فتح مسلمانوں کی مشرکین پر فتوحات میں سے ایک فتح کی ہم زمان تھی۔ بالخصوص بعض بزرگ مشرکین نے لکھا ہے کہ رومیوں کی یہ فتح مسلمانوں کی جنگ بدر میں فتح یا صلح حدیبیہ کے ہم زمان تھی کہ وہ بھی اپنی حیثیت سے ایک بڑی فتح شمار ہوتی تھی۔ خاص طور پر کلمہ "بند خدا" اس مطلب سے مناسبت رکھتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مسلمان اس روز مختلف جہتوں سے خوش ہوں گے۔

اول تو اس وجہ سے کہ اہل کتاب کو مجوسیوں کی فتح حاصل ہوئی جو کہ خدا پرستی کی مشرک پر فتح کی علامت تھی۔

دوم: چونکہ قرآن کی مجراہ پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی، اس لیے یہ بھی ایک معنوی فتح تھی۔

سوم: اسی زمانے میں مسلمانوں کو دوسری فتوحات کے علاوہ ایک اور فتح حاصل ہوئی تھی وہ تھی صلح حدیبیہ۔

پھر بطور تاکید مزید فرمایا گیا ہے: یہ وہ وعدہ ہے جو خدا نے کیا ہے: (وعدہ اللہ)۔

اور خدا بزرگ وعدہ خلافی نہ کرے گا۔ اگرچہ انفرادی نہیں جانتے، الا ینخلت اللہ وعدہ وان کن اکثر الناس لایعلمون)۔

اور لوگوں کی لاعلمی کا باعث یہ ہے کہ انہیں خدا اور اس کے علم و قدرت کی معرفت حاصل نہیں ہے۔ درحقیقت انہوں نے خدا کو پہچانا ہی نہیں۔ اس لیے وہ اس حقیقت سے کہ خدا کا اپنے وعدے سے بچر جانا محال ہے، آگاہ نہیں ہیں۔ چونکہ وعدہ سے بچر جانا یا تو جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے یعنی وعدہ کرتے وقت کوئی بات نامعلوم تھی مگر جب بعد میں معلوم ہوئی تو رائے بدل گئی یا وعدہ خلافی ضمت و ناکوان کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے اس کی خبر نہ ہو سکتی تھی۔ کیونکہ اس میں اپنا وعدہ پورا کرنے کی قدرت نہیں ہوتی۔

لیکن وہ خدا جو ہر کام کے انجام سے باخبر ہے اور اس کی قدرت جملہ اہل ایمان کی قدرتوں پر فوقیت رکھتی ہے، ہر زمانہ وعدے سے زبردست

اس کے بعد یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ: یہ کہتا ہیں لوگ دنیا کی صرف ظاہری زندگی کو دیکھتے ہیں اور آخرت اور انجام ہوا سے بے خبر ہیں: (یللمون ظاہراً من الخیرة الدنیا وهو عن الآخرۃ ہم غافلون)۔

یہ لوگ صرف دنیاوی زندگی سے آگاہ ہیں اور اس زندگی کی ہی صرف ظاہری حالت پر قناعت کیے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں نے دنیاوی زندگی سے جو حاصل کیا ہے، وہ صرف چند مسرت و فیاض، لذات زور زور اور خواب و خیال ہیں اور اس زندگی کے ماحصل میں جو غرور اور غفلت پوشیدہ ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

اگر وہ لوگ دنیا کی اس زندگی کے باطن اور مخفی کیفیت کو بھی جانتے ہوتے تو یہی بات ان کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی تھی کہ آخرت میں کیا ہوگا۔ کیونکہ اگر اس حیات نامیادار پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ طویل زنجیر حیات کی ایک کڑی ہے اور طویل سفر کی ایک منزل ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے شہم مادر میں بچے کی زندگی مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ وہ تو ایک طویل زندگی کا ابتدائی مرحلہ ہے۔

ہاں شہم کہ وہ لوگ اس دنیاوی زندگی کے ظاہر کو دیکھتے ہیں اور اس کی باطنی کیفیت اور مخفی حالت سے غافل ہیں۔

اس موقع پر جانوقیب توجہ یہ امر ہے کہ آیت ہفتم میں ضمیر "ہو" مکرر استعمال ہوئی ہے جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس غفلت و بے خبری کا باعث وہ خود ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی ہم سے کہے کہ: "تو نے مجھے اس

ل "وعدہ اللہ" بطور مطلق منسوب ہے اور اس کے ماقبل جملہ "سیفلیون" سے جو کہ دعوت الہی کا معنی ہے، معلوم ہوتا ہے اور بحالت تعذیر پورا جملہ میں ہے۔ "وعدہ اللہ ذلک وعداً"۔

کام سے نافل کر دیا۔ اور ہم اس کے جراب میں یہ کہیں کہ، تو، تو خود ہی غافل ہو گیا۔ یعنی تو خود ہی اپنی غفلت کا باعث تھا۔

چند اہم نکات

۱۔ اعجاز قرآن۔ علم غیب کے لحاظ سے، قرآن کا مجزہ ثابت کرنے کے دلائل میں سے ایک دلیل قرآن کی غیبی خبریں بھی ہیں کہ جن کا ایک نمونہ آیات زیر بحث میں آیا ہے۔ چنانچہ آیات کے اندر مکرر تاکیدات کے ساتھ ایک شکست خوردہ فوج کی چند سال بعد عظیم فتح کی خبر دی گئی۔ یہ اور اس اطلاع کو خدا کے مختلف ناپید وعدہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

اس پیش گوئی کے چند اہم پتوں میں، اول تو مطلقاً فتح کی خبر دی گئی ہے:

وہو من بعد غلبہم و سنبولون

اور اس کے بعد انہیں جلد ہی فتح نصیب ہوگی۔

دوسرے لفظ پر اسی زمانے کے قریب مسلمانوں کی فتح کی خبر ہے:

ولیوست فی فتح المؤمنون بنصر اللہ

اور اس نصرت الہی کے باعث اہل ایمان خوش ہوں گے۔

تیسرے یہ تصریح ہے کہ واقعہ چند سال بعد ظہور پزیر ہوگا: فی بضع سنین۔

چوتھے دوبار تاکید کے ساتھ اس وعدے کا نقلی بناؤ ثابت کرتے ہیں:

وعد اللہ لا یخلف اللہ وعدہ

یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ فرماں ہی نہیں گزرے تھے، یہ دونوں واقعات وقوع پذیر ہو گئے۔ نئی جنگ میں رومیوں نے ایرانیوں پر فتح حاصل کی اور قریباً اسی زمانے میں صلح حدیبیہ کے ذریعے (اور ایک روایت کے مطابق جنگ بدر میں) مسلمانوں کو دشمنوں پر قابل دید فتح حاصل ہوئی۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک انسان اپنے عام کتابی علم کے ساتھ ایسے اہم واقعے کی بطور قطعی خبر دے سکتا ہے؟

یہاں تک کہ بالفرض اگر کوئی سیاسی آومی پیش بینی کے قابل بھی ہو۔ تب بھی وہ ایسی بات نہایت محتاط الفاظ میں بطور احتمال کہے گا، ذکر اس ضمن صراحت اور تحقیق کے ساتھ کہ اگر یہ پیش گوئی غلط ثابت ہو جائی تو دشمنوں کے ہاتھ ابطال ثابت کی ایک سند آجاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سائنس مثلاً اہل اہم کی فتح یا واقعہ سبباً یہ ثابت کرتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کے علم و اطلاع کا منبع

کوئی دوسرا تھا۔ وگرنہ کوئی شخص بھی معمول کے اور عام حالات میں نہ اتنی توانائی رکھتا ہے نہ جرات کر سکتا ہے کہ تیش کے ساتھ ایسی بات کہہ دے۔

بالخصوص پیغمبر اسلام کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے نہ تھے جو غیر محتاط بات کہہ دیتے ہیں بلکہ آپ کے تمام کام منظر و محکم تھے۔ ایسا شخص اگر اس قدر کا دعویٰ کرتا ہے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی اطلاعات کا مرکز ماورائے طبیعت ہے اور اس کا اعداد و حیاتی اور خدا کے سبے پائوں علم پر ہے۔ اس پیش گوئی کی تاریخی مطابقت پر جو جلد ہی بحث کریں گے۔

۲۔ ظاہر بین لوگ: اصولاً ایک مومن اور صاحب معرفت انسان اور ایک مادہ پرست، یا مشرک کی بصیرت میں بہت فرق ہے۔

مقدم الذکر انسان اپنے عقیدہ توحید کی بنا پر کائنات کو خدا کے حکم و دان کی مخلوق سمجھتا ہے اور یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ کے نام انعام ایک پیش نظر غایت کے قرآن حکمت پر مبنی ہے۔ اور اس عقیدے سے وہ عالم کو نہایت دقیق اندازہ روز کا مجموعہ سمجھتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے اس عالم میں کوئی چیز نہیں ہے جو اس کے علم سے باہر ہو۔ اس کے علم کے تمام کلیات پر غور و نظر ہے۔

یہ بصیرت توحیدی اسے متنبہ کرتی رہتی ہے کہ دنیا کے کچھ واقعات اور کچھ امور، مومن ہی کے لئے ہیں، کچھ تو کلمن ہے کہ برہت، باطل سادہ نظر آتی ہے اس میں پیچیدہ ترین راز ہوں۔

توحید پرست انسان کی نظر اس دنیا کی کمرائی کو دکھتی ہے، مہر دہ اس کے ظاہر پر قناعت نہیں کرتی۔ اس نے مکتبہ توحید میں یہ سبق پڑھا ہے۔ وہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ خدا کا کوئی فضل جو عیش، شہن، سبب اور تخیل عالم کی کوئی غایت ہے۔ اس لیے کائنات کے ہر جز کو اسی غایت کے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔

اس کے مقابلے میں مغز الذکر مادہ پرست ہے ایمان انسان دنیا کو اندر سے، بہرے اور بے مقصد واقعات کا ایک مجموعہ سمجھ کر صرف اس کے ظاہر کو دیکھتا ہے اور اس حقیقت کا تاثر ہی نہیں ہے کہ اس کا باطن اور خلق ہی ہے۔

اس گروہ کا خیال ہے کہ بالفرض ایک کتاب ہے جس کے اوراق پر ایک طفل نادان نے اپنی انگلیوں سے بے مقصد لکیریں اور خطوط کھینچ دیئے ہیں تو کیا اس کتاب کی کوئی اہمیت ہوگی؟ یا اس میں کچھ معنی ہوں گے؟ ان کی نظر میں یہ دنیا بھی ایسی ہی ہے۔

یہاں تک کہ بعض عظیم سائنس دانوں کا قول ہے کہ بنی نوع انسان میں سے ہر طبقہ اور ہر گروہ کے، وہ منکرین جو نظام کائنات کے متعلق غور و فکر کرتے رہے ہیں وہ مذہبی ذہن رکھتے تھے۔ (غور کیجئے گا)۔

چنانچہ دانش مند معروف معاصر آئن سٹائن بول لیتا ہے:

آئن سٹائن (EINSTEIN) کا انتقال ۱۹۵۵ء میں ہوا۔

دنیا کے نظریے سے متاثر ہونے والے لوگوں کو اس سے منسلک کرنا ایسا شخص
 عمل کرتا ہے جو ایک قدر کا عنصر میں مزاجی احساس نہ رکھتا ہو۔ اگرچہ اس کا مذہب
 عامۃ الناس کے مذہب سے مختلف ہوتا ہے۔
 اس عالم کا مذہب کائنات کے عجیب و دقیق نظام پر غور کرنے کے بعد ایک
 مرتبہ بخش حیرت پر مبنی ہوتا ہے۔ جب کبھی ان اسرار سے پردہ اٹھتا ہے تو معلوم
 ہوتا ہے کہ انسان نے اب تک اپنی منظم کوشش اور غور و فکر سے اس کائنات
 کے متعلق جو کچھ جانا ہے، وہ علم کے ایک بکے عکس سے زیادہ نہیں ہے۔
 ان مشاغل ایک دوسری جگہ کہتا ہے:

سائنس دانوں، متفکرین اور اکتشاف کرنے والوں کے لیے وہ سب سے بڑی بات کا سبب بنی کہ وہ غور
 اور ساہما سال تک گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر کائنات کے دقیق اسرار کا مطالعہ کرتے رہیں، ان کا یہی
 اعتقاد تھا۔

ایک وہ آدمی ہے جو اس دنیا ہی کو آخری منزل اور مقصود حیات سمجھتا ہے۔
 دوسرا وہ شخص ہے جس کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ یہ دنیا اور اس کی زندگی تو ایک کیمیت اور اس حیاتِ جاودانی کے لیے
 میدانِ امتحان ہے جو اس کے بعد آنے والی ہے۔ پہلا ان دونوں آدمیوں کے دنیا کے متعلق نظریہ نقل کیسا لگتا ہے؟
 ان میں سے ایک کی نظر صرف اس کے ظاہر پر ہوتی ہے اور دوسرا اس کی عمیق حقیقت پر غور و فکر کرتا ہے۔
 اور زائد یہ نظر کا یہ اختلاف ان لوگوں کی تمام زندگی کو متاثر کرتا ہے۔

ظاہریں انسان راہ خدا میں غرق کرنے کو نقصان مہیا سمجھتا ہے۔ جب کہ مردِ مومن اسے پر صنعت تجارت خیال کرتا ہے
 ان میں سے ایک سود خوری کو اپنی آمدنی میں افزائش کا ذریعہ نہیں کرتا ہے اور دوسرا اسے باعثِ وبال و بد بختی و زیان سمجھتا ہے۔
 ان میں سے ایک جہاد کو اپنے لیے باعثِ رحمت اور شہادت کو ہر معنی فنا سمجھتا ہے اور دوسرا جہاد کو ہر سہولت مند اور شہادت
 کو حیاتِ جاوداں خیال کرتا ہے۔

یہ درست ہے کہ بے ایمان لوگ دنیا کی صرف ظاہری زندگی کو دیکھتے ہیں اور آخرت سے غافل ہیں:

يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غٰفِلُونَ ۝

۳۔ تاریخی مطابقت: اس پیش گوئی سے جنگِ ایران و روم کی مطابقت تاریخی یوں ہے کہ:

خسرو پرویز کے عہد میں ایرانیوں اور رومیوں کے درمیان ایک طویل جنگ کا سلسلہ شروع ہوا جو تقریباً چوبیس سال تک
 جاری رہی یعنی ۶۰۲ء سے شروع ہوا کہ ۶۲۷ء عیسوی میں ختم ہوئی۔

اس کی تفسیر یہ ہے کہ ۶۰۲ء عیسوی میں ایران کے دو سو سالہ رن شہر براز اور شاہین نے روم کے مشرقی علاقے پر

حملہ کر دیا اور رومیوں کو شکست دے کر شامات، ایشیائے کوچک اور مصر تک کو فتح کر لیا۔ روم کی مشرقی حکومت جس نے شہ
 شکست کھائی تھی تباہی کے کنارے جا پہنچی اور ایرانیوں نے ان کے تمام ایشیائی مقبوضات پر قبضہ کر لیا۔
 یہ واقعہ بعثتِ پیغمبر کے قریباً ساتویں سال پیش آیا۔ اس کے بعد قیصر روم "ہرقل" نے ۶۰۲ء عیسوی میں ایران پر
 جہازِ حملہ کیا اور خسرو پرویز کی فوجوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے اس جنگ کا سلسلہ جس میں رومی فاتح، جسے ۶۰۲ء عیسوی تک
 جاری رہا۔ ایرانیوں نے شکست سے متاثر ہو کر خسرو پرویز کو سلطنت سے معزول کر کے اس کے بیٹے "شیرویہ" کو بادشاہ
 بنا دیا۔

تاریخی لحاظ سے یہ امر پیش نظر رہے کہ جناب رسول خدا کی ولادت ۶۰۰ء عیسوی میں ہوئی اور آپ کی بعثت ۶۱۰ء عیسوی
 میں ہوئی۔ اس حساب سے ایرانیوں کے باغیوں رومیوں کو بعثت کے ساتویں سال شکست ہوئی اور پھر رومیوں کو فتح کر ایرانیوں کو
 شکستِ جہت کے پانچویں یا چھٹے سال سے متعلق ہوتی ہے۔

ہجرت کے پانچویں سال جنگِ خندق ہوئی اور پچھنے سال صلح حدیبیہ واقع ہوئی۔

الہیہ ایران اور روم کے مابین جنگ کی خبروں کو جہاد و مکہ تک پہنچنے تک کچھ دیر لگی ہوگی، بعد ازاں اس تاریخی طاقت سے
 قرآن کی پیش گوئی کی صداقت واضح ہوتی ہے۔ (پھر کچھ کا)

۸- اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي أَنفُسِهِمْ مَا خَلَقَ اللَّهُ

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَجَلٍ مُّسْتَعْتَبٍ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَائِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُونَ ۝

۹- اَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

الَّذِينَ مِّن قَبْلِهِمْ كَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَأَثَارُوا الْأَرْضَ وَعَمَرُوهَا أَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوها وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ

فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝

۱۰- ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِينَ أَسَاءُوا السُّوْءَىٰ إِنَّ كَذٰلِكَ

بِآيَاتِ اللَّهِ وَكَانُوا بِهَا يَسْتَهْزِءُونَ ۝

ترجمہ

۸- کیا وہ اپنے دل میں یہ نہیں سوچتے کہ اللہ نے آسمانوں، زمین اور ان دونوں کے

درمیان جو کچھ ہے، کو نہیں پیدا کیا مگر حق کے ساتھ اور ایک معینہ مدت کے لیے۔ مگر بہت سے لوگ (قیامت اور) اپنے رب کی لقا کے منکر ہیں۔

۹- کیا ان لوگوں نے زمین میں سیر نہیں کی کہ دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جو

ان سے پہلے تھے۔ وہ قوت میں ان سے زیادہ تھے۔ انھوں نے زمین کو (زراعت اور آبادی کے لیے) دگرگوں کیا اور اس سے زیادہ آباد کیا جتنا ان لوگوں نے آباد کیا ہے۔

ان کے لیے مبعوث شدہ نبی ان کے پاس روشن دلیلوں کے ساتھ آتے رہے لیکن انہوں نے انکار کیا اور اپنی سزا پائی اور خدا ایسا نہ تھا جو ان پر ظلم کرتا یہ تو انھوں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا تھا۔

۱۰- پھر ان لوگوں کا انجام جو اعمال بد کے مرتکب ہوئے، اس مقام تک پہنچا کہ انھوں نے آیات الہی کو جھٹلایا اور ان کی بنی اڑائی۔

تفسیر

بدکاروں کا انجام :

گزشتہ زیر بحث آیات میں سے آخری آیت میں ان ظاہری لوگوں کا ذکر تھا جن کے اذوق فکر کی دست صرف اس محدود عالم اور جہان مادی تک ہے۔ وہ لوگ قیامت اور وجود عالم مادرائے طبیعت سے غافل ہیں۔ مگر۔ آیات زیر بحث اور آیات آئندہ میں مبداء و معاد کے متعلق مختلف مطالب کا ذکر ہے۔

اول۔ بطور استفہام اعتراض آمیز قرآن کہتا ہے: کیا یہ لوگ اپنے ذہن میں یہ نہیں سوچتے کہ خدا نے آسمانوں کو زمین کو اور ان کے درمیان جو کچھ ہے اُسے بھی حق کے بغیر پیدا نہیں کیا اور ان کے لیے ایک معینہ مدت مقرر کی ہے: (اولم یتفکروا فی انفسہم ما خلق اللہ السموات والارض وما بینہما الا بالحق واجل مستعی)۔ یعنی اگر وہ لوگ صحیح طور پر سوچیں اور اپنے دہان اور عقل کے فیصلے کی طرف رجوع کریں تو وہ ان دو امور سے خوب آگاہ ہو جائیں گے جن سے اول یہ ہے کہ یہ کائنات اساس حق پر پیدا کی گئی ہے۔ اور اس کا وجود ایسے نظام کے تحت قائم ہے جو اس کے خالق کی عقل، قدرت کامل اور اس کے وجود کی دلیل کامل ہے۔

دوسرے۔ یہ کائنات زوال اور فنا کی طرف زوال ہے۔

چونکہ — یہ ممکن نہیں ہے کہ اس خالق حکیم نے اسے بے مقصد و بے غایت پیدا کیا ہو۔ اس کا وجود، اس امر کی دلیل ہے کہ اس جہان کے بعد ایک اور دنیا اور دار البقا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو اس جہان کی آفرینش بے معنی تھی اور یہ قطعی لایعنی بات تھی کہ انسان کی چند روزہ زندگی کے لیے اس طویل و عریض کائنات کو پیدا کر دیا جائے۔ اسی سے وجود آخرت کا ثبوت طلبہ۔ اگر اس حقیقت پر غور کیا جائے کہ یہ کارخانہ کائنات ایک نظم و ترتیب کے تحت چل رہا ہے۔ کائنات کا کوئی جز بھی آزاد اور مستقل نہیں بلکہ ہر جز اپنے وجود و بقا کے لیے ایک دوسرے کا محتاج اور باہم دگر منصف ہے تو ہمیں تو ہمارے ذہن کی رسائی کسی سدا یعنی خالق حکیم کی طرف ہوتی ہے اور "اجل مستحی" معاد کی دلیل ہے۔ یعنی اس کائنات کا وجود ایک معینہ وقت تک ہے (غور کیجئے گا)۔

لہذا آیت کے اخیر میں ان الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ بہت سے لوگ اپنے پروردگار کی لقا کے منکر ہیں: (وان کثیرا من الناس یلقائ ربہم لکافرون)۔

یا اکثر آدمی "معاذ" ہی کے منکر ہیں۔ جیسا کہ قرآن شریف میں مشرکین کا قول بار بار نقل ہوا ہے کہ وہ کہتے تھے: کیا یہ ممکن ہے کہ جب ہم ناک ہو جائیں گے۔ تو ہم پھر زندہ ہو جائیں؟ یہ تو عجیب بات ہے اور یہ غیر ممکن ہے۔ یہ اس بات کے کہنے والے کے جنون کی دلیل ہے۔ (روم - ۵، ص ۲۵ - ۲۶ - ۲۷ - ۲۸ - ۲۹ - ۳۰ - ۳۱)

یا۔ یہ کہ وہ زبان سے تو انکار نہیں کرتے لیکن ان کا عمل ایسا ہے جیسا کہ ان کے منکرانہ اعمال سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ معاد پر قطعی یقین نہیں رکھتے۔ کیونکہ اگر وہ معاد کے منتظر ہوتے تو ان کا عمل ایسا فائدہ نہ ہوتا اور وہ خود ایسے مُخسّر ہوتے آیت میں جو "فی الفسھم" کے الفاظ ہیں ان کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ وہ لوگ اپنے "اسرار وجود" کا مطالعہ کریں، جیسا کہ فرخ رازی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے: بلکہ۔ ان الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ عقل و وجدان کو کام میں لاکر زمین اور آسمان کی خلقت پر غور کریں۔

مکن ہے کہ کلمہ "بالحق" کے دو معنی ہوں۔ ایک تو یہ کہ کائنات کی آفرینش، اس کا نظم و ترتیب اور قانونِ ظہر حق کے ساتھ ہے۔

دوسرے یہ کہ تخلیق کا مقصد حق ہے۔ ان دونوں تفسیروں میں باہم کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ "لقاؤم بھم" سے مراد (جیسا کہ ہم نے بار بار کہا ہے) یہ ہے کہ بروز قیامت حجابات اٹھ جائیں گے اور انسان اپنے "شہود باطنی" سے خدا کو اس کی عظمت کے ساتھ پہچانے گا۔

"اجل مستحی" کے الفاظ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس دنیا کی زندگی کو دوام اور بقا نہیں ہے۔ گویا یہ تمام دنیا پرست لوگوں کو ایک تئید ہے۔

آیت ما بعد میں یہ اضافہ کیا گیا ہے۔ کیا انھوں نے زمین میں سیر نہیں کی کہ وہ دیکھتے کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جو ان سے پہلے تھے: (اولو لیسیرواف الارض فیظرو کیف کان عاقبۃ الذین من قبہم)۔

پہلے سیر کر لیں اور دیکھیں کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جو ان سے پہلے تھے۔ (اولو لیسیرواف الارض فیظرو کیف کان عاقبۃ الذین من قبہم)۔

وہ لوگ طاقت میں ان سے زیادہ تھے۔ انھوں نے زمین کو درگوں کیا اسے ان سے زیادہ آباد کیا تھا۔ (کانوا اشد منہوقۃ واثاروا الارض وعمروھا اکثر مما عمروھا)۔

ان کی طرف سے جو عبادتیں ان کے پاس روشن و دلیرانہ کے ساتھ آئے! (وجانثہم من سلہم بالینات)۔ لیکن انھوں نے احکامِ الہی سے بغاوت کی اور حق کی اطاعت نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خدا کی طرف سے دردناک عذاب میں مبتلا ہوئے۔

حلانے تو ان پر ہرگز ظلم نہیں کیا۔ لیکن انھوں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا: (فماکان اللہ لیظلمہم ولکن کانوا انفسہم یظلمون)۔

درحقیقت آیت ۹ میں ان اقوام کی طرف اشارہ ہے جو یہودیوں کے ہم عصر مشرکین کے مقابلے میں مال، جسمانی طاقت اور قدرت کے لحاظ سے کمزور اور برتر تھے۔ نیز ان کے دردناک انجام کو ان کفار کے لیے درس عبرت قرار دیا گیا ہے۔

آیت میں "اثاروا الارض" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مکن ہے کہ اس سے زراعت و شجر کاری کے لیے زمین کا جوتنا یا کھودنا مراد ہو یا زمین اور کاریز کا کھودنا، یا کسی بڑی عمارت کی تعمیر کے لیے بنیاد کھودنا مراد ہو۔ یہ تمام چیزیں مراد ہوں۔ کیونکہ "اثاروا الارض" کا مفہوم بہت وسیع ہے یہاں تک کہ تعمیر و آبادی کے جملہ مراحل اس میں شامل ہیں۔ بلکہ چونکہ اس زمانے میں وہی لوگ سب سے زیادہ صاحبِ قوت و اقتدار سمجھے جاتے تھے جو کاشت کاری میں ترقی یافتہ تھے یا جنھوں نے فنِ تعمیر میں ترقی کی تھی۔ لہذا ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو مشرکین مکہ کے مقابلے میں (جو کہ ان فنون میں نہایت پس ماندہ تھے) یقیناً برتری حاصل تھی۔

لیکن جب انھوں نے ان فنون میں برتری کے باوجود آیاتِ الہی اور اس کے پیغمبروں کا انکار کیا اور ان کی تکذیب کی تو ان میں عذابِ الہی سے بچ کر نکل جانے کی طاقت نہ تھی۔ لہذا اسے مشرکین مکہ! تم سوچو کہ تم کس طرح اُس کے عذاب سے بچ سکتے ہو؟

وہ یہ دردناک عذاب اور اپنے اعمال کی پاداش کو خود ہی لائے تھے۔ انھوں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا تھا۔ خدا تو کبھی کسی پر ظلم و ستم روا نہیں رکھتا۔

زیر بحث آیات میں سے آخری آیت میں اقوامِ گزشتہ کے آخری مرحلہ کفر کا بیان ہے کہ ان کی بد اعمالیاں اور سرکشی یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ انھوں نے آیاتِ الہی کی تکذیب کی اور اس سے بھی بدتر یہ کہ ان کا مذاق اڑانے لگے: (شعراکان عاقبۃ الذین اساءوا السواى ان کذبوا بایات اللہ وکانوا بہا لیتہزونون)۔

البتہ گناہ اور آلودگی نفس جہاد کی بیماری کی طرح ہے، جو رُوحِ ایمان کو کھاکر فنا کر دیتی ہے یہاں تک کہ انسان آیاتِ الہی کو "اثار" کا مادہ "شعور" (بوزن عوار) ہے، جس کے سمی پکڑنے کرنے کے ہیں۔ عرب لیل کو ڈرکتے تھے۔ وہ تفسیر یہ تھی کہ وہ اُسے بل میں جوتے تھے۔

کی تکذیب کرنے لگتا ہے۔ اس منزل سے بھی آگے بڑھ کر آیات الہی اور پیغمبروں کا مذاق اڑانے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ کفر کے اُس مرحلے پر پہنچ جاتا ہے کہ اُس پر کسی وعظ، نصیحت یا تحریف کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ اس حالت میں اُس کے لیے صرف عذاب الہی کا تازیانہ ہی باقی رہ جاتا ہے۔

گناہ گاروں اور اواخر الہی کے بائیسوں کے صفحات زندگی کو اگر بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ ابتداء میں ایسے سرکش اور ظلیان کوش زستے۔ اُن کے دلوں میں نور ایمان کی کوئی کرن ضرور چمکتی تھی۔ لیکن پے در پے گناہوں کا ارتکاب انہیں روز بروز ایمان اور تقویٰ سے دور کرتا گیا اور انجام یہ ہوا کہ وہ کفر کے آخری مرحلے پر پہنچ گئے۔

کر بلا کی شیر دل خاتون جناب زینب سلام اللہ علیہا نے دمشق میں یزید کے سامنے جو خطبہ دیا ہے، اُس میں آپ نے اس آیت کو انہی معنی میں استعمال کیا ہے جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں۔ اُن معظّم نے دیکھا کہ یزید کفر آمیز کلمات کہہ رہا ہے اور وہ مشہور اشعار پڑھ کر جن میں سے ایک کی ابتدا یوں ہے:

لعبت ہاشم بالملک "اسلام کی برہنہ کا مذاق اڑا رہا ہے اور اُس کی ان باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے کسی پر بھی ایمان نہیں ہے۔ تو اُن محدود سونے محمد الہی اور پیغمبر اکرمؐ پر درود کے بعد یوں فرمایا:

صدق الله كذلك يقول شرکان عاقبة الذین

اسلہوا السواہی ان کذبوا باایات اللہ وکانوا بهما یستہزؤن ...

اگر آج تو ان کفر آمیز اشعار کے ذریعے اسلام اور ایمان کا انکار کر رہا ہے اور اپنے مشرک بزرگوں سے جو جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے تھے یہ کہہ رہا ہے کہ:

"کاش کہ تم زندہ ہوتے اور یہ دیکھتے کہ میں نے خاندانِ نبیؐ سے تمہارا انتقام لے لیا ہے۔"

تو یہ کچھ تعجب کا مقام نہیں ہے کیونکہ یہ وہی بات ہے جو خدا نے فرمائی ہے کہ "مجربین آخر کار ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں۔"

اُن معظّم نے اس سلسلے میں بہت سے مطالب ارشاد فرمائے۔

(مزید توضیح کے لیے بجا رالانوار، جلد ۵، صفحہ ۱۵۷ دیکھیے)۔

۱۔ لغی اسلام اور انکارِ نبوت کے سلسلے میں تاریخوں میں بڑے بڑے متعدد اشعار نقل کیے گئے ہیں جن میں سے ایک کا ترجمہ یہ ہے:

ذکوئی نبی آیا اور زوی اُزی۔ یہ تو نبی ہاشم کی ملک و مال پر قبضہ کرنے کے لیے محض ایک چال تھی۔

گویا کہ اعلانِ نبوت محض ایک سیاسی کھیل تھا۔

(۱۔ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)۔

۲۔ آیت نمبر ۱۰ کی تفسیر میں ہم نے جو کچھ کہا ہے اس کے مطابق "السواہی" "اساوا" کا مفعول ہے اور "ان کذبوا باایات اللہ" اس "کان" کے بجائے ہے اور اس کی خبر عاقبۃ ہے۔ علامہ طیباً طہالٰی مرحوم نے اس مطلب کا بظہر اہتمام ذکر کیا ہے۔ اگرچہ خود انہوں نے اس کی تصدیق نہیں کی۔ اور ابوبقائے کتاب "املاء ما صفت بہ انرجمن" کے صفحہ ۱۵۰ جلد ۱ پر اس مطلب کا دو احتمالات میں سے ایک کو قابلِ قبول ہونے کے طور پر ذکر کیا ہے مگر مفسرین کی اکثریت مثلاً طبری، صاحب المیزان، زبیری، آلوسی، ابوالفتح رازی، اور قسطلینی نے فی ظلال و تبيان میں اس آیت کی تفسیر میں ایک دوسرے احتمال کو قوی کہا ہے اور وہ یہ ہے کہ "سواہی" کان کا اسم ہوگا اور "ان کذبوا" تعلق کے لیے ہے۔ اس تفسیر کے مطابق آیت کے معنی یہ ہوں گے:

"آخر کار اُن لوگوں کا انجام جو اعمالِ برا انجام دیتے رہے، یہ ہی ہوا۔ کیونکہ انہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی۔"

یہ جملہ للذین احسنوا الحسنیٰ کے مشابہ ہے جس کا معنی ہے جنہوں نے نیکی کی اُن کے لیے نیکی ہے۔ مگر انصاف یہ ہے کہ آیت کے ظاہر و معنی سے جو کچھ کہہ میں آتا ہے یہ تفسیر اُس کے برخلاف ہے اور ان مفسرین نے اگر اس تفسیر کو اختیار کیا ہے تو ہمیں یہ امر اس بات پر مجبور نہیں کر سکتا کہ آیت کے ظاہر و معنی سے جو مفہوم ہم آہنگ ہے اُسے ترک کر دیں۔ بالخصوص وہ اپنا مطلب واضح کرنے کے لیے اس امر پر مجبور ہیں کہ "جملہ" "ان کذبوا" میں حرفِ لام کو مقرر نہیں اور یہ تقدیر ظاہر کلام کے خلاف ہے۔ (غور کیجئے گا)

۱۱ - اللَّهُ يَبْدُوُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝

۱۲ - وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُونَ ۝

۱۳ - وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ مِنْ شُرَكَائِهِمْ شُفَعَاءُ ۝

وَكَانُوا لِشُرَكَائِهِمْ كُفْرِينَ ۝

۱۴ - وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُؤْمِنُونَ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ۝

۱۵ - فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَهُمْ فِي رَوْضَةٍ ۝

يُحِبُّونَ ۝

۱۶ - وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ ۝

فَأُولَئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُونَ ۝

ترجمہ

۱۱ - خدا آفرینش کا آغاز کرتا ہے۔ پھر اُس کا اعادہ کرتا ہے۔ پھر تم سب اُسی کی طرف لوٹ جاؤ گے۔

۱۲ - اور جس روز قیامت برپا ہوگی تو مجرمین مایوسی اور غم و اندوہ میں ڈوب جائیں گے۔

۱۳ - اور جنہیں انہوں نے خدا کا شریک قرار دیا تھا اُن میں سے کوئی بھی اُن کا شفیق نہ ہوگا۔

اور وہ (اُس روز) اُن شریکوں کا انکار کر دیں گے۔

۱۴ - اور جس روز قیامت برپا ہوگی تو (لوگ) ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔

۱۵ - مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک کام کیے وہ باغِ جنت میں شاداں و مسرور ہوں گے۔

۱۶ - لیکن وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا اور ہماری آیات اور لقائی آغرت کی تکذیب کی وہ عذابِ الہی میں حاضر کیے جائیں گے۔

تفسیر

قیامت میں مجرمین پر کیا گزرے گی :

گزشتہ آیت میں اُن تکذیب کرنے والوں کا ذکر تھا جو آیاتِ الہی کا مذاق اڑاتے تھے اور زیرِ نظر آیات میں کچھ معاد اور قیامت میں مجرمین کی حالت کا ذکر کر کے معاد کے متعلق اُس مضمون کی تکمیل کی گئی ہے جس کا ذکر آیاتِ سابقہ میں آیا تھا۔

پہلے یہ فرمایا گیا ہے : خدا آفرینش کا آغاز کرتا ہے۔ اور پھر اُس کا اعادہ کرے گا اور تم سب چہ اُسی کی طرف لوٹ جاؤ گے : (اللَّهُ يَبْدُوُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ)۔

اس آیت میں سلسلہ معاد کے بارے میں ایک پُر معنی اور مختصر دلیل دی گئی ہے۔ قرآن کی دوسری آیات میں بھی بالفاظِ مختلف اس دلیل کی تکرار ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ :

وہی ذات جو آفرینشِ اول پر قدرت رکھتی تھی، معاد پر بھی قدرت رکھتی ہے۔ نیز

قانونِ عدالت اور حکمتِ الہی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مخلوق فنا ہو کر دوبارہ پیدا ہو۔

”ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ“ سے یہ مراد ہے کہ بروز قیامت زندہ ہونے کے بعد سب کے سب خدا کے دارالعدل کی طرف دُعا سے سزا یا جزا پانے کے لیے لوٹیں گے۔ اس سے برتر یہ کہ وہ مومنین جو دُنیا میں ادا اللہ کی اطاعت کر کے مدارجِ روحانی کی تکمیل کرتے رہے ہیں، وہ اپنی روحانی تکمیل میں اُسی طرح ختم ناپذیر منزلِ معرفت اور پروردگار کی قربت کی طرف بڑھتے رہیں گے۔

آیت مابعد میں مجرموں کی حالت اس طرح بیان کی گئی ہے کہ : جس روز قیامت برپا ہوگی ، بحر میں ناسمیری اور فواد میں ڈوب جائیں گے ، (ویوم تقوم الساعة یبلس البحر منون)۔

”یبلس“ مادہ ”ابلاس“ سے بنا ہے۔ اس کے معنی اُس غم و اندوہ کے ہیں جو انسان پر شہادت یا سزا ناماری سے طاری ہو جاتا ہے۔

یہ امر بدیہی ہے کہ بالفرض انسان کسی چیز سے ناامید ہو جاتا ہے تو اگر وہ شے بتائے حیات کے لیے اہمیت نہیں رکھتی تو اس کی ناامیدی بھی اہم نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ کسی لازمہ زندگی سے مایوس ہو جائے تو اس پر غم و اندوہ کا عاثر ہونا بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے بعض مفسرین نے مادہ ”ابلاس“ کا خاصہ ”ضروری ہونا“ بھی قرار دیا ہے۔

”ابلیس“ کو اسی مناسبت سے ابلیس کہتے ہیں کہ وہ رحمت الہی سے مایوس اور غم ناک ہو گیا ہے۔

بہر حال مجرم اسی کے مستحق ہیں کہ اُس روز مایوس اور غم ناک ہوں کیونکہ وہ عرصہ عشر میں اپنے ساتھ نہ تو ایمان اور عمل صالح ہی لائے ہیں۔ اور نہ اُس روز اُن کا کوئی مددگار و رفیق ہوگا۔ نہ یہ امکان ہوگا کہ وہ پھر دنیا کی طرف لوٹ جائیں اور اپنی گزشتہ کوتاہیوں کی تلافی کر لیں۔

لذا آیت مابعد میں یہ اضافہ کیا گیا ہے۔ اُن کے معبود اُس روز شفاعت نہ کریں گے : (و لویکن لہم من شرکاء پہم شفعاءوا)۔

آیت میں معبودوں سے وہی بُت مراد ہیں کہ جس وقت اُن کفار سے پوچھا جاتا تھا کہ تم ان بتوں کی پرستش کیوں کرتے تھے تو وہ جواب دیتے تھے :

هُؤلَاءِ شَفَعَاءُنَا عِنْدَ اللّٰهِ

یہ بُت درگاہ الہی میں ہمارے شفیع ہیں۔ (یونس - ۱۸)

اُن کفار کی سمجھ میں اُس وقت یہ بات آئے گی کہ وہ پتھر کے بے قدر و قیمت ٹکڑے تو کسی قسم کا اختیار اور قدرت نہ رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ اُن معبودوں سے جنہیں وہ خدا کا شریک سمجھا کرتے تھے۔ نفرت اور بیزارگی کا اظہار کریں گے اور ”اُن سے کسی قسم کا تعلق رکھنے سے انکار کر دیں گے“ : (و کانوا بشرکاء پہم کافرین)۔

بہلا کفار معبودوں کا انکار کیونکر نہ کریں گے کیونکہ وہ یہ دیکھ رہے ہوں گے کہ یہ معبود نہ صرف یہ کہ اُن کی کسی مصیبت میں کام نہیں آسکتے بلکہ بقول قرآن وہ معبود اپنے پرستاروں ہی کی تکذیب کرنے لگیں گے اور کہیں گے :

اے پروردگار ! ما کانوا ایتانایعبدون

یہ لوگ ہماری نہیں ، بلکہ اپنی ہوائے نفس کی پرستش کرتے تھے۔ (قصص - ۶۳)

اس سے بھی سوا یہ کہ وہ معبود اپنے پرستاروں کی دشمنی پر کمر باندھ لیں گے۔ جیسا کہ سورہ احقاف آیت ۶ میں :
واذا حشر الناس کانوا لہم اعداء و کانوا اعباد تہم کافرین

جس وقت مشرکین مشرکوں کے تو اُن کے مخلوق بنو اُن کے دشمن ہو جائیں گے اور اُن کی عبادت کا انکار کر دیں گے۔

آیت ۱۴ میں بروز قیامت لوگوں کے مختلف گروہ جو پانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ بروز قیامت لوگ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے : (ویوم تقوم الساعة یوسف میتفرقون)۔

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے امن صالح انجام دینے اور بہشت کے باغ میں نعمات الہی سے بہرہ مند اور مسرور و شاد کام ہوں گے ، اس طرح سے کہ اُن کے چہرے شہادت کے آثار ظاہر ہوں گے : (فاما الذین امنوا و عملوا الصالحات فہم فی روضة یحبرون)۔

”یحبرون“ کا مادہ ”حبر“ سے ابرزق قشیرہ اس کا معنی ہے ”اثر خوب“۔ یہ علم اُس وقت بھی بولا جاتا ہے جب خوشی اور مسرت کا اثر چہرے سے ظاہر ہو اور چونکہ اہل بہشت وہاں خوشی اور مسرور سے ایسا مسرور ہوگا کہ اُس کا اثر اُن کے تمام وجود سے ظاہر ہوگا اس لیے اس نمونہ کے لیے یہ کلمہ استعمال ہوا ہے۔

”روضۃ“ اُس مقام کو کہتے ہیں جہاں باق اور درخت بہشت ہوں اس لیے سرسبز و شاداب باغات کو بھی روضہ کہتے ہیں۔

اگر اس آیت میں یہ کلمہ بصورت اسم نکرہ استعمال تو ہے تو اُس مقام کی عظمت اور بزرگی کو واضح کرنے کے لیے ہے یعنی مومنین بہشت کے بہترین خوبصورت اور مسرور انجیز بہشتوں میں نعمت الہی سے لطف اندوز ہوں گے۔

لیکن جو لوگ کافر ہو گئے ہیں اور انہوں نے ہماری آیت اور قے آخرت کی تکذیب کی ہے وہ ضرور عذاب الہی میں حاضر کیے جائیں گے : (واما الذین کفروا و کذبوا بہینا و لقاء الاخرۃ فاولئک فی العذاب محضون)۔

یہ امر جاذب توجہ ہے کہ اہل بہشت کے لیے کلمہ ”یحبرون“ استعمال ہوا ہے جو بہر لحاظ سے اُن کی مسرت کی علامت ہے لیکن دوزخیوں کے لیے کلمہ ”محضون“ استعمال ہوا ہے ، جو اُن کی اہمائی کراہت اور ناراضگی کی دلیل ہے کیونکہ حاضر کیے جانے کا اطلاق ایسے موقع پر ہوتا ہے کہ کسی آدمی کو اُس کی ولی خواہش کے خلاف کچھ لایا جائے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اہل بہشت کے معاملہ میں ”یقین“ اور ”عمل صالح“ دونوں کی قید لگائی گئی ہے۔ جب کہ دوزخیوں کے متعلق صرف عدم ایمان (انکار مبدیہ) کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس میں رمز یہ ہے کہ داخل بہشت ہونے کے لیے نہ صرف یقین کافی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ عمل صالح بھی

لازم ہے۔ مگر واصل جہنم ہونے کے لیے عدم ایمان ہی کافی ہے۔ خواہ اُس آدمی نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ کیونکہ "کفر" بجائے خود گناہ عظیم ہے۔

قیامت کا ایک نام "ساعت" کیوں ہے ؟

یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ قرآن کی بہت سی آیات میں قیامت کو "ساعت" کہا گیا ہے۔ اُن آیات میں زیر نظر آیات میں سے دو آیات (۱۲ - ۱۴) بھی شامل ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ "ساعت" کے حقیقی معنی زمانے کا ایک حصہ، یا لحظت زود گزر ہے۔ اور چونکہ حادثہ قیامت ناگہانی اور برق آسا طور پر واقع ہوگا۔ نیز یہ کہ خدا "سریع الحساب" ہے، اس لیے وہ اُس روز بندوں کا جلد حساب لے گا لہذا قیامت کو "ساعت" کہا گیا ہے۔ تاکہ لوگ یومِ رستاخیز کی حیثیت و واقفیت کو ہمیشہ نظر میں رکھیں۔

ابن منظور "لسان العرب" میں لکھتا ہے کہ "ساعة" اُس وقت کا نام ہے جب کہ اُس عالم کے انتقام کے لیے ایک بیج ماری جائے گی اور اُس آواز کو سن کر سب جاندار فوراً مر جائیں گے اور یہ اُس وقت کا نام بھی ہے جبکہ قیامت میں لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔

دُنیا کے انتقام اور وقوعِ قیامت کے لیے اس نام کا اس لیے انتخاب کیا گیا ہے کہ پہلی بیج میں جیسا کہ خدا نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے :

ان كانت الاصبحة واحدة فاذا هم خامدون

سب کے سب بطور ناگہانی مر جائیں گے۔

اور جب دوبارہ طور پھونکا جائے گا تو سب کے سب ناگہان زندہ ہو جائیں گے اور پھر قیامت پیا ہوگی۔

"زبیدی" نے "تاج العروس" میں بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ "ساعة" تین قسم کی ہے :

۱۔ ساعتِ کبرئیی : وہ دن جب لوگوں کو حساب کے لیے زندہ کیا جائے گا۔

۲۔ ساعتِ دُسطلی : جب خدا کی طرف سے نازل عذاب کی وجہ سے کسی مخصوص زمانے میں ناگہانی طور پر سب کے سب آدمی بیک وقت مر جائیں گے۔

۳۔ ساعتِ صُغری : ہر انسان کی موت کا دن۔

۱۷۔ فَسَبِّحْ لِلَّهِ حِينَ تَسْونَ وَحِينَ تُصْبِحُونَ

۱۸۔ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَحِينَ تُظْهِرُونَ

۱۹۔ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَكَذَلِكَ تُخْرَجُونَ

ترجمہ

۱۷۔ پاک و منزہ ہے وہ خدا جس وقت کہ تم شام کرتے ہو اور صبح کرتے ہو۔

۱۸۔ آسمانوں اور زمینوں میں حمد و ستائش اُسی کے لیے مخصوص ہے۔ اور تسبیح و تنزیہ اُسی کے لیے ہے بوقتِ عصر بھی اور ظہر کے وقت بھی۔

۱۹۔ وہ خدا زندہ کو مُردہ سے نکالتا ہے اور مُردہ کو زندہ سے۔ اور زمین کو اُس کی موت کے بعد حیات بخشتا ہے اور اسی طرح تم بروز قیامت نکالے جاؤ گے۔

تفسیر

تسبیح و حمد ہر حال میں خدا کے لیے ہے :

آیات گزشتہ میں مبداء و معاد کے موضوع پر ایک طویل بحث گزری ہے اور کسی قدر مومنین کے اہل اور مشرکین کی پاداشِ عمل کا ذکر آیا ہے۔ آیات زیر نظر میں خدا کی حمد، تسبیح اور ہر قسم کے شکر، نقص اور عیب سے اُس کے منزہ ہونے کا ذکر ہے۔

چنانچہ خدا فرماتا ہے :
تسبیح و تنزیہ اسی خدا کے لیے مخصوص ہے جس وقت کہ تم صبح کرتے ہو اور شام کرتے ہو (سبحان اللہ حسین تمسوں
وحین تصبحون)۔

آسمان و زمین میں حمد و ستائش اسی ذات پاک کے لیے مخصوص ہے اور بوقت عصر اور جب ظہر کا وقت ہوتا ہے :
(وله الحمد في السموات والارض و عشيا وحين تظہرون)۔

- ان دو آیات میں اس ترتیب سے تسبیح پروردگار کے لیے چار اوقات بیان ہے :
- ۱۔ آغاز شب (حین تمسوں)۔
 - ۲۔ طلوع صبح (وحین تصبحون)۔
 - ۳۔ وقت عصر (وعشیا)۔
 - ۴۔ زوال آفتاب یعنی ظہر کا وقت (وحین تظہرون)۔

لیکن بحیثیت مکان "ادائے حمد" میں عمومیت ہے۔ جس میں آسمانوں اور زمین کی وسعتیں شامل ہیں۔ آیات فوق
میں مذکورہ بالا چار اوقات کے ذکر سے ممکن ہے بطور محاورہ یہ مراد ہو کہ ہمیشہ اور دائمی طور پر تسبیح کرتے رہو۔ جیسا کہ ہم
کہتے ہیں کہ "فلاں شخص کی صبح و شام دیکھ بھال کرتے رہو" اور مراد ہوتی ہے کہ ہمیشہ اور ہر وقت اُس کے نگرانِ حال ہو
بعض مفسرین نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ مذکورہ چار اوقات سے نماز کے چار اوقات مراد ہیں۔ مگر وہ اس اعتراض
کا جواب دینے سے قاصر رہے ہیں کہ پانچ اوقات کے بجائے صرف چار اوقات کا ذکر کیوں ہے ؟
(یعنی وقتِ عشا کا کوئی ذکر نہیں ہے)

لیکن — ممکن ہے کہ اس سوال کا یہ جواب دیا جائے کہ چونکہ مغرب و عشا کی نمازوں کا وقت نسبتاً نزدیک ہے
اور ان دونوں نمازوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹے کا فاصلہ ہے۔ اس لیے دونوں کا ذکر ایک ہی جگہ کر دیا گیا ہے
جب کہ نمازِ ظہر و عصر کے اوقات فضیلت میں چند گھنٹے کا فاصلہ ہے۔
لیکن — اگر ہم حمد و تسبیح کا وہ وسیع مفہوم لیں جو آیات زیر بحث سے مترشح ہوتا ہے تو پھر یہ پانچ نمازوں میں
معمود نہ رہے گی۔ ہر چند کہ ان نمازوں پر اُس کا واضح اطلاق ہوتا ہے۔
اس مقام پر اس نکتے کا ذکر بھی لازمی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ "سبحان اللہ و له الحمد" کہہ کر خدا نے اپنی تسبیح
حمد خود ہی کی ہو۔ جیسا کہ سورہ مومنوں کی آیت ۱۴ میں فرمایا گیا ہے :

فتبارك الله احسن الخالقين

پُر بَرکت اور جاوید ہے وہ خدا جو خلق کرنے والوں میں بہترین ہے۔

یا — ممکن ہے کہ یہ حمد و تسبیح یعنی امر ہو۔ یعنی "سبحوه واحمدوا له" یعنی اُس کی تسبیح اور حمد کرو۔
یہ تفسیر اس مفہوم سے قریب تر معلوم ہوتی ہے کہ آیات زیر بحث میں تمام بندوں کو ہر صبح و شام اور بوقت ظہر و عصر حمد
ملفوظاً ظاہر ہے کہ "عشیا" و "حین تظہرون" و "حین تمسوں" پر جس کا تعلق موضوع تسبیح ہے۔

تسبیح کا حکم دیا گیا ہے، خواہ نماز میں ہو یا اس کے علاوہ تاکہ اُن کے قلب و رُوح سے ہشک و گناہ کے آثار پوری طرح
محو ہو جائیں۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ایک حدیث میں یوں آیا ہے کہ :
جو کوئی ان دو آیات اور اُس کے بعد کی آیت کو بوقت صبح پڑھے گا تو جو فریضہ بھی
اُس سے دن میں فوت ہو گا، خدا اُسے اُس کا بھی صلہ دے گا اور جو کوئی ان
آیات کو آغازِ شب میں پڑھے گا تو جو فریضہ بھی اس سے رات کو فوت ہو گا خدا
اُس کا اجر بھی دے گا۔ (تفسیر نرائشتین، جلد ۴، صفحہ ۱۵۱)

اس کے بعد کی آیت میں پھر مسئلہ معاد کا ذکر ہے اور منکرین جس بات کو بعد از عقل سمجھتے تھے اُس کا ایک اور طرح
سے جواب دیا گیا ہے وہ یہ کہ : سُنتِ الہی یہ ہے کہ وہ زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے باہر نکالتا ہے اور زمین
کو اُس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ تم بھی اسی طرح بروز قیامت زندہ کیے جاؤ گے اور اپنی قبروں سے نکالے جاؤ گے۔
(يخرج الحي من الميت و يخرج الميت من الحي و يحيي الارض بعد موتها و كذلك
تخرجون)۔

یعنی معاد کے منظر اور اختتام دُنیا کے منظر کی بالترتیب یا ہمیشہ ہماری آنکھوں کے سامنے تکرار ہوتی رہتی ہے۔
جن میں سے ایک تو زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور دوسرا مردہ کو زندہ سے۔
بنا بریں یہ کوئی تعجب کا مقام نہیں ہے کہ دُنیا کے خاتمے پر تمام زندہ موجودات مر جائیں اور قیامت میں تمام انسان
ایک نئی زندگی حاصل کریں۔

لیکن قرآن شریف میں اس حقیقت کو کہ "مردہ سے زندہ کو کیسے نکالا جاتا ہے" بار بار مردہ زمین کی مثال دے کر
واضح کیا گیا ہے۔

یہ امر سب پر روشن ہے کہ سردیوں کے موسم میں زمین مُردہ ہو جاتی ہے۔ نہ اُس میں گھاس اُگتی ہے۔ نہ کوئی پھول
کھلتا ہے نہ کوئی شگوفہ پھولتا ہے۔

لیکن فصلِ بہار میں اعتدال ہوا اور حیات بخش بارش کے قطرات گرنے کی وجہ سے زمین میں ایک جُنبش پیدا ہوتی ہے۔ ہر جگہ گھاس
اُگ آتی ہے۔ پھول کھلتے ہیں شائعوں پر شگوفے نمودار ہوتے ہیں۔ یہ ہے معاد کا منظر جسے ہم دُنیا میں دیکھتے ہیں۔

لیکن یہ کہ زندہ سے مُردہ کیونکر نکالا جاتا ہے، یہ بات بھی پوشیدہ و پنهان نہیں ہے۔
کمزور زمین کی سطح پر درخت مر جاتے ہیں اور خشک کھڑکی کی صورت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح انسان اور حیوانات
اپنی زندگی سے محروم ہو کر جسدِ بے جان بن جاتے ہیں۔

یہ تشبیہ ایرانی موسم کے لحاظ سے ہے۔ ہمارے ملک میں زمین موسم گرما (مئی جون) میں مُردہ ہوتی ہے اور برسات اُسے زندہ کرتی ہے۔

نیکان۔ — بعض مغزین نے زندہ کو زندہ سے نکالنے کی یہ تفسیر کی ہے کہ انسان و حیوان نطفے سے پیدا ہوتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ کافر کے گھر میں مومن پیدا ہو جائے۔ بعض نے سونے والوں کا پیدار ہونا مراد لیا ہے۔

لیکن یہ قطعی خیال ہے کہ یہ تمام تفسیرات و تاویلات آیت کے لغوی معنی سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ کیونکہ نطفے ہی کو لیجئے تو وہ مردہ نہیں ہوتا بلکہ وہ موجود زندہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ایمان دکن کے استمارت کو آیت کے باطن سے تو اذکار کیا جا سکتا ہے لیکن ظاہری معنی اس طرف راجح نہیں ہیں۔

آیت کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ خدا ہمیشہ مردہ موجودات سے زندہ موجودات کو نکالتا ہے۔ اور زندہ موجودات کو بے جان موجودات میں بدل دیتا ہے۔ دور حاضر میں انسان نے علوم میں تجربات اور مشاہدات سے جتنی بھی ترقی کی ہے اور معلومات کا جو ذخیرہ ہم پہنچایا ہے اس کے مطابق یہ برگز نہیں دیکھا گیا کہ غیر ذی حیات سے زندہ وجود پیدا ہو جائے۔ یعنی زندگی سے زندگی پیدا ہوتی ہے نہ کہ موت سے۔ بلکہ ہمیشہ زندہ موجودات بیج سے یا کسی دوسرے زندہ وجود کے نطفے سے متولد ہوتے ہیں۔

ابتداء میں کڑھ زمین آگ کا ایک گولا تھا۔ اس پر زندگی کا وجود نہ تھا۔ بعد میں ان مخصوص اسباب کی وجہ سے (جن کا علم حاضر کے ذریعے سے اب تک انکشاف نہیں ہو سکا ہے) اس بے جان زمین سے، ایک عظیم تحریک کے ساتھ زندہ مخلوقات پیدا ہو گئی۔

لیکن جہاں تک موجودہ حالات میں انسان کے علم و دانش کی رسائی ہے اس کے ذریعے کڑھ زمین کے موجودہ حالات میں یہ تحریک نظر نہیں آتی۔ (لیکن ہے کہ سمندر کی گہرائی میں اب تک یہ عظیم تحریک حیات موجود ہو)۔

لیکن ہمارے لیے جو بات مخصوص اور قابل اورک ہے وہ یہ ہے کہ بے جان موجودات زندہ موجودات کے اجسام کا جزو بن جاتے ہیں اور پھر خود بھی زندہ مخلوقات میں شامل ہو جاتے ہیں۔

ہم جو آب و غذا کھاتے ہیں وہ زندہ مخلوق نہیں ہے۔ لیکن وہ جیسے ہی ہمارے جسم کا جزو بنتی ہے، ایک زندہ مخلوق بن جاتی ہے۔ غذا کی وجہ سے ہمارے بدن کے خلیوں CELLS پر مزید خلایا کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ پھر پھر اسی طرح ایک نئی شہر خوار جان ہو کر فرمی ہیکل بن جاتا ہے۔

کیا یہ اصول تغذیہ موت سے زندگی کو برآمد کرنا نہیں ہے؟ بنا بریں کہا جا سکتا ہے کہ عالم طبیعی کے نظام میں دائم ایک دور جاری رہتا ہے کہ موت سے زندگی اور زندگی سے موت خارج ہوتی رہتی ہے۔

۱۔ معتقد نے بیج کی مثال تو دی، مگر اس کی تشریح نہیں کی۔ ہر بیج میں قابلیت نشوونما خفستہ ہوتی ہے۔ زمین کی قربت نامیہ اسے پیدا کرتی ہے اور روح پیدا کر دیتی ہے۔ صرف جدید علمائے حیاتیات BIOLOGIST ہی نے نہیں، قدمائے بھی یہ معلوم کر لیا تھا کہ نباتات میں بھی زندگی ہے۔ اس کا نام ارضوں نے روح نجاتی رکھا تھا۔ اس لحاظ سے آیت کا منہم قطعی واضح ہے کہ خدا (مردہ سے زندہ کو جو دہیں لاتا ہے) مغزین نے زندہ کو مرث لکھا۔ جو حیوانات میں ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے ادھر ادھر کی تاویلات کی ہیں۔

اسی دلیل سے وہ خدا جو خالق فطرت ہے اس امر پر بھی قادر ہے کہ بروز قیامت مردوں کو زندہ کر دے۔ البتہ، جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے، معنوی اور باطنی لحاظ سے آیت زیر بحث کی اور تفسیر بھی ہو سکتی ہیں مثلاً کافر کی نسل سے مومن پیدا ہو جائے اور مومن کی اولاد کافر ہو جائے۔ جاہل کی اولاد عالم ہو جائے اور عالم کافر جاہل ہو جائے۔ خدا کا خلف صالح ہو اور صالح کا خلف مُخسَد ہو جائے۔ بعض اسلامی روایات میں اس طرف اشارہ بھی ہوا ہے۔

مکن ہے کہ بطون آیت سے یہ معانی اخذ کیے گئے ہوں۔ کیونکہ آیات قرآن کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ مرگ و حیات کے ایک جامع اور وسیع معنی ہوں جن میں مادی اور روحانی دونوں پہلو شامل ہوں۔ امام مؤمنی بن جعفر علیہ السلام سے آیت "یسعی الامرض بعد موتہا" کی تفسیر میں ایک روایت مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: لیس یجیبہا بالقطر ولكن یبعث اللہ رجالاً یشیون العدل فتخی الامرض لاجیاء العدل ولا قامۃ الدل فیہ النفع فی الامرض من القطار بعین صلیحاً۔ آیت کا مقصود یہ نہیں ہے کہ خدا زمین کو بارش کے ذریعے زندہ کرتا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو پیدا کرتا ہے جو اصول عدل کو زندگی بخشتے ہیں اور احیاء عدل سے زمین زندہ ہو جاتی ہے اور آگاہ رجب زمین پر عدل کا قائم ہونا چالیس روز تک مسلسل بارش سے زیادہ نافع ہے۔

امام کے اس قول سے کہ آیت کا مقصد "نزل باران" نہیں ہے

اس آیت کے معانی کو محدود کرنے کی نفی ہو جاتی ہے یعنی آیت کی تفسیر کو بارش کے معنی ہی تک محدود نہ کرنا چاہیے۔ عدالت کے ذریعے زمین کی معنوی زندگی نزل باران سے کہیں زیادہ اہم ہے۔

۲۰. وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ إِذَا أَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُونَ

۲۱. وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا

لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ

۲۲. وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ السِّنِّكُمْ

وَالْوَالِدِكُمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالَمِينَ

ترجمہ

۲۰. اور اُس (خدا) کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اُس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ اُس کے بعد جب تم انسان بن گئے تو رُوئے زمین پر پھیل گئے۔

۲۱. اور اُس کی آیات میں سے یہ بھی ہے کہ اُس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے ازواج کو پیدا کیا تاکہ تم اُن کی قربت میں تسکین پاؤ اور اُس نے تمہارے درمیان مودت اور مہربانی پیدا کر دی۔ اس میں اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو فک کر تے ہیں۔

۲۲. نیز اُس کی آیات میں سے یہ بھی ہے کہ اُس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور

تمہاری زبانوں اور رنگ کا اختلاف، اہل علم کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔

تفسیر

انفس و آفاق میں خدا کی آیات :

ان آیات اور ان کے بعد آنے والی آیات کے کچھ حصے میں نظام عالم ستھ میں خدا کی نشانیوں اور دلائل توحید کے باذیہ توجہ نکات کو بیان کیا گیا ہے۔ اس بیان سے گزشتہ مباحث کی تکمیل ہوتی ہے۔

یہ کہہ سکتے ہیں کہ بحیثیت مجموعی یہی آیات قرآن کی آیات توحید کا ایک اہم حصہ ہیں۔

یہ آیات جو سب کی سب "من" (یعنی خدا کی نشانیوں میں سے ایک) سے شروع ہوتی ہیں اُن کا ایک مخصوص آہنگ ہے، لب و لہجہ دلچسپ اور دلکش ہے اور اُن کی تعبیرات مؤثر اور عمیق ہیں۔

مجموعی طور پر یہ آیات سات ہیں۔ اُن میں چھ تو مسلسل ہیں اور ایک آیت نمبر ۲۶ آگ ہے۔

آیات آفاقی و انفسی کے لحاظ سے ان آیات کی تفسیر دلچسپ ہے۔ اس طرح سے کہ ان میں سے تین آیات میں آیات انفس کا ذکر ہے۔ (یعنی خود انسان کی ذات میں کون سی آیات الہی ہیں)۔

اور تین آیات میں آیات آفاق کا بیان ہے (یعنی عالم خارجی میں عظمت پروردگار کی کون کون سی نشانیاں ہیں)۔

جب کہ ایک آیت میں آیات انفس و آفاق دونوں کا ذکر ہے۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ وہ آیات جو "من آیاتہ" سے شروع ہوتی ہیں قرآن میں گیارہ سے زیادہ نہیں ہیں۔ جن میں سے سات تو اسی سورہ روم میں ہیں اور دو آیتیں سورہ فتح

(۲۶۔ ۲۹) میں اور دو آیات سورہ شوریٰ میں ہیں (۲۹۔ ۳۲) اور حق یہ ہے کہ ان گیارہ آیات کا مجموعہ اثبات توحید پر کاملاً عادی ہے۔

آیات زیر نظر کی تفسیر شروع کرنے سے پہلے ہم اس نکتے کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جن مسائل اور رموز فطرت کی طرف قرآن کی ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے وہ بظاہر عام آدمیوں کے لیے قابل ادراک اور قریب فہم ہیں۔ لیکن انسانی علم و دانش کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان آیات الہی کے تازہ رموز و نکات کا انکشاف ہوتا جاتا ہے۔ اس تفسیر میں ہم اُن میں سے بعض کی طرف اشارہ کریں گے۔

قرآن میں سب سے پہلے انسان کی آفرینش کا ذکر ہے اور تخلیق انسان اللہ کی پہلی اور سب سے اہم نعمت اور احسان ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے۔ آیات الہی میں سے ایک یہ ہے کہ اُس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ اس کے بعد تم انسان بن گئے اور رُوئے زمین پر پھیل گئے۔ (و من آیاتہ ان خلقکم من تراب ثم اذا انتمو

بشر تنشرون)۔

اس آیت میں خدا کی دو نشانوں کا ذکر ہوا ہے:

اول انسان کی مٹی سے پیدائش کا۔ اس سے پہلے انسان یعنی آدم کی تخلیق مُراد ہے یا تمام انسانوں کی پیدائش اور دوسری نشانی یہ ہے کہ نسل انسانی مشیر ہوگی اور نسل آدم تمام رُودے زمین پر پھیل گئی۔ اگر خدا آدم میں افزائش نسل کی خصوصیت نہ رکھتا تو اُس کی نسل کا سلسلہ کب کا منقطع ہو چکا ہوتا۔

مقام حیرت ہے کہ کثیف مٹی کہاں اور انسان جیسے لطیف ہستی کہاں؟

مقام غور ہے کہ آنکھ کے نازک ترین پردے جو برگ گل سے بھی لطیف تر، حساس تر اور نازک تر ہوتے ہیں اسی طرح سے دماغ کے لطیف اور غیر معمولی حساس غلیات کو اگر ہم مٹی کے پاس رکھیں اور پھر دونوں کا مقابلہ کریں تو اُس وقت یہ راز سمجھ میں آئے گا کہ خالق کائنات نے کس حکمت بالغہ سے مٹی کے مادہ کثیف سے کس قسم کے نازک، دقیق اور قیمتی آلات سرچ ایسے تخلیق کیے ہیں۔

مٹی میں نہ تو لور ہے، نہ حرارت ہے، نہ زیبائی، نہ طاقت، نہ جس و حرکت، مگر باہر برحققت وجود انسانی کا فیروسی سے اُٹھا ہے۔

جو ذات کہ ایسے بے جان مادہ سے (جو موجودات عالم میں سب سے کم تر اور پست ترین شمار ہوتا ہے) ایسی عجیب و غریب مخلوق پیدا کر سکتا ہے، وہی اس قدرت اور لامحدود علم و دانش کے لیے ہر قسم کی تحسین و ستائش کی مستحق ہے۔

تبارک اللہ احسن الخالقین

اس بیان سے اس واقعیت کا علم بھی ہوتا ہے کہ بحیثیت نوع انسانوں میں کچھ فرق نہیں ہے۔ اُن کا جوہر آفرینش ایک ہی ہے۔ خاک سے سب کا ناقابل انقطاع تعلق ہے اور طبعاً، آخر کار سب کے سب خاک ہی کی طرف لوٹ جائیں گے۔ قابل توجہ امر یہ ہے کہ لغت عرب میں کلمہ "اذا" اسور ناگمانی کے موقع پر استعمال ہوتا ہے۔

اس مقام پر اس کلمہ کے استعمال سے لیکن ہے یہ مُراد ہو کہ خدا نے آدم کو مشیر مثل کی اتنی قدرت دی کہ قبیل مُدت میں اُس کی نسل تمام رُودے زمین پر پھیل گئی اور ایک انسانی معاشرہ وجود میں آ گیا۔

زیر بحث آیات میں سے دوسری آیت میں تخلیق انسان کا حال بیان کرنے کے بعد اُن نشانوں کا ذکر ہے جو انسان کے نفس میں موجود ہیں۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے۔ آیات الہی میں سے ایک اور بات یہ ہے کہ تمہاری ہی جنس سے تمہارے لیے ازدواج کو پیدا کیا گیا ہے تاکہ تم اُن کی قرابت میں سکون حاصل کرو، (ومن آياتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتکنوا علیہا)۔

اور چونکہ زن و شوہر کے درمیان رشتہ محبت کی بقا کے لیے بالخصوص اور تمام انسانوں کے درمیان بالعموم، ایک جذبہ اور روحانی و قلبی کشش کی ضرورت ہے، اس لیے آیت میں اِن الفاظ کا اضافہ کیا گیا۔ تمہارے درمیان محبت اور رحمت

کو پیدا کیا، (وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ)۔

آیت کے اخیر میں تاکیدی مزید کے لیے فرمایا گیا ہے۔ ان امور میں فکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں (ان فی ذلک لآیات لِقوم یتفکرون)۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں شادی کا مقصد سکون و راحت بیان کیا گیا ہے۔ اس کے لیے نہایت پرمعنی لفظ "لتکنوا" استعمال کیا گیا ہے۔ اس ایک لفظ میں بہت سے مسائل بیان کر دیئے گئے ہیں۔

اس قسم کی تعبیر کی نظیر سورہ اعراف کی آیت ۱۸۹ میں بھی ملتی ہے۔

یہ حق ہے کہ ان خصوصیات کے ساتھ شریک حیات کا وجود کہ وہ ایک دوسرے کے لیے زندگی کی راحت کا باعث ہیں خدا کی بہت بڑی نعمت ہے۔

زندگی کے اس راحت و آرام کا باعث یہ ہے کہ یہ دونوں اصناف ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والی اور ایک دوسرے کی خوشی، مسرت اور پرورش کا وسیلہ ہیں۔ یہاں تک کہ اُن میں سے ہر ایک، ایک دوسرے کے بغیر ناقص ہے اور یہ فطری امر ہے کہ ایک شخصیت موجود اور دوسرے اُس کے باعث تکمیل و وجود میں اس قسم کا خوش آئند جذبہ موجود ہونا چاہیے۔ اس اصول فطرت سے یہ نتیجہ نکالنا درست ہے کہ جو لوگ اس نسبت الہی کو ترک کرتے ہیں اُن کی شخصیت ناقص رہ جاتی ہے کیونکہ اُن کی تکمیل شخصیت کا ایک مرحلہ طے نہیں ہوا۔

تجزو کی زندگی صرف اُن حالات میں جائز ہے جب انسان کسی خاص ضرورت یا شرائط کے تحت مجبور ہو۔ بہر حال زندگی کا یہ آرام و سکون، جسمانی، روحانی، انفرادی اور اجتماعی برحیثیت سے ہے۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ترک ازدواج کی وجہ سے بعض جسمانی، بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح مجرد افراد میں جو نفسیاتی اُلجھنیں اور روحانی اضطراب ہوتا ہے اُس کی وجہ بھی یہی ہے، جو سب پر روشن ہے۔

معاشرتی نقطہ نگاہ سے مجرّد لوگوں کو اپنی ذمہ داری کا احساس بہت کم ہوتا ہے۔ اسی لیے ان میں خودکشی کے واقعات بہت نظر آتے ہیں اور اُن سے خوفناک جرائم بھی سرزد ہوتے ہیں۔

جس وقت انسان تجرّد کی زندگی کو چھوڑ کر خانگی زندگی اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے اندر ایک تازہ شخصیت کا احساس کرتا ہے نیز اُسے اپنی ذمہ داری کا احساس بھی ہونے لگتا ہے۔ حالت ازدواج میں انسان کو جو راحت ملتی ہے، اُس میں یہ امور بھی داخل ہیں۔

اب رہا "مودت اور رحمت" کا مسئلہ تو درحقیقت یہ دونوں چیزیں انسانی معاشرے کی عمارت کی تعمیر کا مسئلہ ہیں کیونکہ ہر معاشرہ افراد کے اجتماع سے بنتا ہے۔ اس کی مثال اُس عمارت کی سی ہے جو اینٹوں اور پتھروں کے ٹکڑوں سے مل کر تعمیر ہوتی ہے۔ اگر افراد انسانی پر اگنہ حالت میں رہیں تو کوئی معاشرہ بھی وجود میں نہیں آ سکتا جیسے کہ اجزائے تعمیر اگر باہم مربوط نہ ہوں تو کوئی عمارت بھی وجود میں نہیں آ سکتی۔

وہ ذات جس نے انسان کو معاشرتی زندگی کے لیے پیدا کیا، اسی نے اُس کی فطرت میں باہمی تعاون اور اُلفت کا جذبہ بھی

و دلالت کر دیا ہے۔

مکن ہے کہ "موت" اور "رحمت" میں مختلف جہات سے فرق ہو :

۱۔ "موت" وہ داخلی تحریک ہے جو ابتدا میں ارتباط کا سبب بنتی ہے۔ لیکن — عرصے آفری حصے میں اگر زودین میں سے ایک ضعیف و ناتواں ہو جائے اور اُس میں اتنی طاقت نہ رہے کہ دوسرے کی خدمت کر سکے تو اُس وقت "رحمت" موت کی جگہ لے لیتی ہے۔

۲۔ "موت" کا تعلق سن رسیدہ لوگوں سے ہے جو ایک دوسرے کی خدمت کر سکتے ہیں۔ لیکن اولاد اور چھوٹے بچے سایہ رحمت میں پرورش پاتے ہیں۔

۳۔ موت ایک طرف نہیں ہوتی بلکہ اُس کے لیے طرف ثانی کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن "رحمت" میں ایسا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ایک طرف ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک معاشرے کی بقا کے لیے کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے تعاون سے خدمت کریں اور یہ جذبہ موت سے پیدا ہوتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خدمت کے صلہ کی توقع نہیں کی جاتی اسے "ایشارہ" کہتے ہیں، جو جذبہ رحمت کا نتیجہ ہوتا ہے۔

مگر آیت میں زودین کے درمیان "موت" اور "رحمت" دونوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس لیے اس تعبیر سے یہ احتمال ہوتا ہے کہ یہ خصوصیت جملہ بنی نوع انسان کے لیے ہے۔ جن میں زودین کا تعلق ان جذبات کا داغ مصداق کہے جا سکتے ہیں۔

بنی نوع انسان کے تمام معاشروں میں خاندانی زندگی ایسی چیز ہے جس کا وجود موت اور رحمت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ اگر افراد خاندان کے درمیان یہ جذبات نہ رہیں یا کمزور ہو جائیں تو اس سے معاشرے میں ہزاروں اضطراب، بے چینیوں اور مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

زیر بحث آیات میں سے آفری آیت ان مضامین کا ایک مجموعہ ہے جن کا ان آیات میں ذکر ہوا ہے جن میں انصر آفاق میں پائی جانے والی نشانوں کا ذکر ہے۔

اس میں سب سے پہلے آسمانوں اور زمین کی تخلیق کا ذکر کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے — خدا کی عظیم آیات میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق بھی ہے : (و من آیاتہ خلق السماوات والارض)۔

آسمان پر سیاروں کے کرات ہیں۔ ان کے نظامات، کمکشائیں اور ان کی بلندی اور مسافت کا یہ عالم ہے کہ انسان کا بلند پرواز تخیل ان کی عظمت کا ادراک کرنے سے عاجز ہے اور ان کے مطالعے سے انسان ٹھک جاتا ہے۔ انسان کا علم و دانش جس قدر بھی ترقی کرتا جاتا ہے، اسی قدر خدا کی عظمت کے تازہ نکات اُس پر آشکار ہوتے جاتے ہیں۔ ایک وقت وہ بھی تھا کہ انسان بلندی پر نظر آنے والے ستاروں کی تعداد صرف اتنی ہی سمجھتا تھا جتنے اُسے نظر آتے تھے۔

ماہرین علم ہیئت نے ان ستاروں کی تعداد جو غیر زور دین کے نظر آتے ہیں پانچ ہزار سے چھ ہزار تک بیان کی ہے۔

نہیں جس رفتار سے بڑی بڑی ذرات بنیوں کی ایجاد میں اضافہ ہوا ہے اسی رفتار سے مزید آسمانی عظیم الجثہ کرات دریافت ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ علمائے ہیئت کا خیال ہے کہ یہ کمکشائیں جو ہم سے قریب تر ہے اور جو خلا کے لامحدود میں موجود کثیر کمکشائوں میں سے ایک ہے، اس میں ایک ارب سے زیادہ ستارے ہیں۔ جن میں سے ہمارا سورج اپنی خیرہ کن عظمت کے باوجود کمکشائوں کے متوسط ستاروں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ تو صرف خدا ہی کو علم ہے کہ ان تمام کمکشائوں میں جن کا ابھی ہم شمار نہیں ہو سکا، کتنے ستارے ہوں گے۔

اسی طرح جس سرعت سے سائنسی علوم مثلاً : علم الارض، علم نباتات، علم الحیات، علم تشریح اعضاء، طبیعیات علم النفس اور تحلیل نفسی ترقی کر رہے ہیں۔ اسی رفتار سے آفریش زمین کے متعلق تازہ انکشافات ہو رہے ہیں، جن میں سے ہر ایک عظمت الہی کی ایک آیت ہے۔

اس کے بعد کلام کا پہلو بدل کر انسان کے نفس میں من جملہ آیت عظیم کے ایک آیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف بھی اُس کی آیات عظمت میں سے ہے : (واختلاف السنتکم واللوانکم)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کی اجتماعی زندگی افراد اشخاص کی شناخت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ اگر کوئی ایسا وقت آجائے کہ دنیا کے تمام انسانوں کی شکلیں، قیافہ، قد اور ذیل ڈول یکساں ہو جائے تو اسی دن ان کی زندگیوں کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ باپ اور بیٹے، اپنے اور غیر کی پہچان نہ ہو سکے گی۔ اور نہ مجرم دہے گناہ، قرض خواہ و مقروض، حاکم و محکوم رئیس و مروض، میزبان و دہمان اور دوست و دشمن کی تمیز ہو سکے گی۔ یہی حالت میں کیسا عجیب گھپلا اور بڑبڑ پیدا ہو جائے گی کبھی کبھی دو ہزاروں بیانیوں کے، جو ہر جہت سے باہم مشابہ ہوتے ہیں، لوگوں سے ملنے اور ان کی شناخت کے بارے میں یہ دشواری پیش آتی ہے۔ چنانچہ ہم نے سنا ہے کہ دو، ہم رنگ و ہم شکل بھائیوں میں سے ایک بیمار ہوا اور اُن نے دوا دوسرے کو پلا دی۔

اس لیے معاشرہ کی تنظیم کے لیے خدا نے انسانوں کی آوازوں اور رنگوں کو مختلف بنایا ہے۔

جیسا کہ فخر الدین رازی نے آیت زیر بحث کے ذیل میں کہا ہے :

ایک انسان دوسرے انسان کو یا تو آنکھ سے دیکھ کر پہچانتا ہے یا اُس کی آواز سن کر، اس لیے خدا نے بذریعہ حتم شناخت کرنے کے لیے انسانوں کے رنگ، صورتوں اور شکلوں کو مختلف بنایا ہے۔

اور بذریعہ گوش شناخت کرنے کے لیے آوازوں اور لہجوں میں اختلاف پیدا کر دیا ہے۔

یہاں تک کہ تمام دنیا میں دو انسان بھی ایسے نہیں مل سکتے جو چہرے کی بناوٹ اور آواز کے لہجے میں ہر لحاظ سے یکساں ہوں۔ یعنی انسان کی صورت جو ایک چھوٹی سی بات ہے اور اُس کی آواز کا لہجہ جو ایک سادہ سی چیز ہے، قدرت خدا سے کروڑوں آدمیوں کا بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اور یہ خدا کی عظیم آیات میں سے ہے۔

اس موقع پر ایک احتمال اور بھی ہے اور بعض مترجمین نے اُس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ اختلاف السن سے مراد بولی جانے والی زبانوں کا فرق مراد ہے جیسے عربی، فارسی، ترکی وغیرہ اور رنگوں کے اختلاف سے نسلوں کے رنگوں کا اختلاف مراد ہے

جیسے زرد نسلیں، سیاہ نسلیں، گوری نسلیں وغیرہ۔

لیکن آیت میں استعمال شدہ کلمہ "اختلاف" کے وسیع معنی بھی لیے جاسکتے ہیں۔ جن میں یہ تفسیر اور تفسیر ماقبل دونوں شامل ہوں۔ بہر کیف، خلقت کا یہ تنوع ہر جہت سے خدا کی قدرت اور عظمت کی نشانی ہے۔

فرید وجدی نے اپنی دائرۃ المعارف ENCYCLOPEDIA میں مغرب کے مشہور سائنس دان نیوٹن کا یہ قول درج کیا ہے:

"خالق کائنات خدا کے بارے میں ہرگز شک نہ کرو کیونکہ عقل اسے قبول نہیں کرتی کہ صرف بے شعور فطرت اور سلسلہ علت و معلول سے موجودات ظہور میں آجائیں۔ کیونکہ اندھی فطرت BLIND NATURE (جو ہر زمان و مکان میں یکساں وجود رکھتی ہے) سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ اُس سے یہ تمام نوع بہ نوع کائنات اور رنگارنگ موجودات صادر ہو سکیں اور یہ ممکن نہیں ہے کہ اندھی فطرت سے کوئی ایسا عالم پیدا ہو جائے جس کے اجزا میں نظم و ترتیب ہو اور تغیرات زمان و مکان کے باوجود اُس کے تناسب اور ہم آہنگی میں کوئی فرق نہ آئے۔

اس سے ثابت ہے کہ لازماً اس کائنات کا مبداء کوئی ایسی ذات ہے جو نبات علم و حکمت اور ارادہ سے متصف ہے۔"

قرآن شریف آیت کے آفر میں کہتا ہے:

ان چیزوں میں اہل علم و دانش کے لیے آیات الہی ہیں: (ان فِ ذٰلِكَ لَايَاتٍ لِّلْعٰلَمِيْنَ)۔ کیونکہ اہل علم ہی عامرۃ الناس کے مقابلے میں ان اسرار سے بہتر نظر پر آگاہ ہوتے ہیں۔

۲۳۔ وَمِنْ آيَاتِهِ مَنَامُكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهِ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُونَ ۝

۲۴۔ وَمِنْ آيَاتِهِ يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنزِلُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيُحْيِي بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝

۲۵۔ وَمِنْ آيَاتِهِ اَنَّ تَقْوَمَ السَّمَاءُ وَالْاَرْضُ بِأَمْرِهِ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْاَرْضِ اِذَا اَنْتُمْ تَخْرُجُونَ ۝

ترجمہ

۲۳۔ اور اُس کی آیات میں سے تمہاری رات اور دن کی نیند بھی ہے۔ اور تمہارا اُس کے فضل کو تلاش کرنا ہے۔ تحقیق کہ ان امور میں اُن کے لیے جو سُننے میں بہت سی نشانیاں ہیں۔

۲۴۔ اور اُس کی آیات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ تم کو بجلی دکھاتا ہے جو خوف کا باعث بھی ہے اور (بارش کی) امید کا بھی اور وہ آسمان سے پانی برساتا ہے جس سے وہ زمین کو اُس کی موت کے بعد زندہ کر دیتا ہے۔ اس میں اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

۲۵۔ اور اُس کی آیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آسمان و زمین اُس کے حکم سے قائم ہیں پھر جب وہ تمہیں (قیامت میں) زمین سے بلائے گا تو تم فوراً نکل پڑو گے (اور میدانِ حشر میں حاضر ہو جاؤ گے)۔

تفسیر

انسان کے نفس اور خارجی دنیا میں خدا کی عظمت کی نشانیاں: گزشتہ بحثوں کے بعد جن میں انفس و آفاق میں آیات الہی کا ذکر تھا، زیر نظر آیات میں ان عظیم آیات کے ایک اور حصہ کا بیان ہے۔

سب سے پہلے نیند کی طرف توجہ مبذول کرانی گئی ہے کیونکہ وہ مظاہرِ فطرت میں سے ایک اہم منظر اور نظامِ عالم میں اُس کے خالق کی حکمت کا اظہار ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے۔ تمہارا دن اور رات میں سونا نیز فضل الہی سے حصہ پانے کے لیے تمہاری سعی و کوشش اور ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے لیے تمہاری ہباگ دوز اور اُن کا پورا ہونا یہ سب آیات الہی ہیں (ومن آیاتہ منامکوم باللیل والنہاس وابتغاؤکوم من فضلہ)۔

آیت کے اخیر میں یہ الفاظ ہیں۔ سُنئے واللہ کے لیے ان امور میں بہت سی نشانیاں ہیں: (ان فی ذلک لآیات لقوم یسمعون)۔

کسی سے بھی یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ تمام "جان داروں" کو صرف شدہ طاقت کو بحال کرنے اور آئندہ محنتِ مشقت کے واسطے تیار ہونے کے لیے، آرام کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ استراحت اور نیند لازمی طور پر انسان پر طاری ہو جاتی ہے اور وہ لوگ جو کسبِ معاش میں محنت اور مشقت کرتے ہیں وہ تو ناگزیر طور پر تھک کر سو جاتے ہیں۔

پھر سے تازہ دم ہونے کے لیے نیند سے بہتر اور کونسا ذریعہ ہو سکتا ہے جو فطرتاً انسان پر طاری ہو جاتی ہے اور جو وقتی طور پر انسان کے تمام جسمانی، فکری اور دماغی اعمال کو منقطع کر دیتی ہے۔

صرف بعض اعضاء و اعضاء و اعضاء جن کا مصروفِ عمل اور بیدار رہنا ثباتِ حیات کے لیے لازم ہے نہایت آہستہ کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ مثلاً حرکتِ قلب، روانیِ تنفس اور دماغ کے بعض حصے۔

یہ نعمت الہی اس امر کا باعث ہوتی ہے کہ انسان کے جسم اور روح میں از سر نو قوت کار آجاتی ہے۔ انسان جب استراحت کرتا ہے تو وہ اُس وقت کام سے فارغ ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر سونے سے اُس کی ٹھکن دور ہو جاتی ہے اور اُس کے اعضاء کو آرام مل جاتا ہے اس طرح انسان میں ایک نئی زندگی، خوشی اور تازہ توانائی پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر انسان سویا نہ کرنا تو اس کا جسم جلد ہی پڑھوڑا اور فرسودہ ہو جاتا اور بہت جلد ناتوان اور ضعیف ہو جاتا۔

یہی وجہ ہے کہ مناسب و معتدل نیند انسان کے لیے نشاطِ جوانی کی بقا، طولِ عمر اور صحت و سلامتی کا باعث ہے۔ یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ آیت میں نیند کا ذکر ابتغاؤکم من فضلہ سے پہلے آیا ہے، جس کے معنی ہیں کہ اپنی روزی تلاش کرو۔ اس ترتیب میں مصلحت یہ ہے کہ "نیند" تلاشِ رزق کے لیے بنیادی شرط ہے۔ کیونکہ اگر انسان نے کافی آرام نہ کیا ہو تو ابتغاؤکم من فضلہ بھی مشکل ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ بھی درست ہے کہ معمولاً انسان رات کو سوتا ہے اور دن کو اپنا رزق تلاش کرتا ہے مگر یہ لازمی نہیں ہے کہ انسان اپنے معمولاتِ حیات کو بدل سکے۔ خدا نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ وہ اپنی نیند کی عادت کو بدل سکتا ہے اور ضرورت کے مطابق اُس میں تغیر کر سکتا ہے۔ اسی لیے "منامکوم باللیل والنہاس" کہا گیا ہے (رات کا ذکر پہلے اور دن کا ذکر بعد میں ہے)۔

بے شک سونے کا اصل وقت رات ہی کا ہے اور تاریکی کے سبب شب کو سکونِ محسوس ہوتا ہے اس لیے آرام کرنے کے لیے اُسے اولیت حاصل ہے۔ مگر انسان کی زندگی میں بعض حالات ایسے پیش آجاتے ہیں کہ اس کے برعکس عمل کرنا پڑتا ہے مثلاً رات کو سفر کرنا پڑے تو دن کو آرام کرنا پڑے گا۔ اسی قیاس پر دیکھیے کہ اگر سونے کے اوقات انسان کے اختیار میں نہ ہوتے تو کتنی دشواری پیش آتی۔

نیند کو آیاتِ الہی میں شمار کرنے کی اہمیت ہمارے زمانے میں اور بھی زیادہ واضح ہو گئی ہے کیونکہ ہر زمانہ بعض صنعتی کارخانے اور ہسپتال رات دن کام کرتے اور کھلے رہتے ہیں اور اُن میں کام کرنے والے تین تین شیفتوں میں کام کرتے ہیں۔ آدمی کے جسم اور روح کو نیند کی ضرورت اتنی زیادہ ہے کہ انسان میں بے خوابی کے تحمل کی توانائی بہت ہی کم ہے اور انسان چند شب و روز سے زیادہ بے خوابی برداشت نہیں کر سکتا۔

اس لیے ظالم اور ستم شکار اہل اقتدار کسی کو بدترین سزا یہی دیتے ہیں کہ اُسے سونے نہیں دیتے۔ برعکس اس کے بہت سی بیماریوں کا موثر علاج یہ ہے کہ بیمار کو گہری نیند سلا دیا جائے۔ اس طرح سے اس کی قوتِ فطرت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

لیکن عام انسان کے لیے نیند کی مقدار کو متعین نہیں کیا جاسکتا کیونکہ طولِ خواب کا انحصار انسان کے سن و سال، اس کے حالات، اس کی جسمانی بناوٹ اور نفسیاتی کیفیت پر ہے۔

البتہ — نیند کی اُس مقدار کو کافی کہہ سکتے ہیں جس کے بعد انسان اپنے اندر تازگی محسوس کرے۔ جس طرح پانی پی کر اُدھ غذا کھا کر سیری محسوس کرتا ہے۔

یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ نیند کے لیے جس طرح طولِ زمان کا لحاظ ہے اُس کا گہرا ہونا بھی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ بسا اوقات ایک گھنٹہ کی گہری نیند، چند گھنٹوں کی اچھٹی ہوئی نیند کے مقابلے میں انسان کی روح اور جسم کو تازگی بخشنے میں زیادہ موثر ہوتی ہے۔

لیکن — اگر کسی موقع پر گہری نیند ممکن نہ ہو صرف خفیف اور اچھٹی ہوئی نیند اور غنودگی بھی خدا کی نعمتوں میں سے ہے۔ جیسا کہ سورہ انفال کی آیت ۱۱ میں مجاہدین بدر کے متعلق ذکر ہے کیونکہ میدانِ جنگ میں گہری نیند ممکن ہی نہیں ہے اور

نہ نفعیہ و نود مند ہے۔

بہر حال — نیند اور استراحت — اور اُس سے جو سکون، نشاط اور توانائی حاصل ہوتی ہے، خدا کی ایسی نعمت ہے جس کی کسی طرح بھی توصیف نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد کی آیت میں آیاتِ الہی کی پانچویں قسم کو بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت میں بھی خدا کی ان نشانیوں کا ذکر ہے جو نفسِ انسانی سے باہر عالمِ خارج میں پائی جاتی ہیں۔ اس میں خصوصیت سے رعد و برق، بارش اور زمین کی موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا ذکر ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے۔ آیاتِ الہی میں سے ایک بجلی بھی ہے جو تمہارے لیے موجبِ خوف بھی ہے اور باعثِ امید بھی: (ومن آیاتہ یریکم البرق خوفاً وطمعاً)۔

بجلی کا خوف تو یہ ہے کہ وہ کبھی بصورتِ صاعقہ ٹوٹ پڑتی ہے اور ہر اس چیز کو جو اُس کے احاطہ میں آجائے جلا خاں کر دیتی ہے۔ بجلی چمکنے سے "امید" یہ ہوتی ہے کہ عموماً گرج چمک کے بعد تندہ و تیز بارش ہوتی ہے۔ اس بنا پر بجلی نازل بارش کا پیش خیمہ ہے۔ اس کے علاوہ بجلی کے چمکنے میں جو فوائد ہیں انھیں اس زمانے میں سائنس دانوں نے منکشف کیا ہے۔

ہم نے سورۃ رعد کے آغاز میں اُن کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس کے بعد یہ فرمایا گیا ہے کہ خدا آسمان سے پانی برساتا ہے جو زمین کو اُس کی موت کے بعد زندہ کر دیتا ہے: (وینزل من السماء ماءً فیحیی بہ الارض بعد موتہا)۔

خشک اور جلتی بھنتی زمین میں جس سے موت کی بو آتی ہے چند حیات بخش بارشوں کے بعد جان آجاتی اور وہ زندہ ہو جاتی ہے۔ اُس سے اُگنے والے پھولوں، سبزے اور جڑی بوٹیوں سے اُس کے آثارِ حیات نمایاں ہوتے ہیں۔ اُس کی حالت دیکھ کر کوئی یقین بھی نہیں کر سکتا کہ یہ وہی مژدہ زمین ہے۔

آیت کے آفریں بطور تاکید اضافہ کیا گیا ہے کہ ان چیزوں میں اُن لوگوں کے لیے جو فکر کرتے اور عقل سے کام لیتے ہیں خدا کی نشانیاں ہیں: (ان فی ذلک لآیات لِّقوم یعقلون)۔

اہل عقل و فکر ہی یہ سمجھتے ہیں کہ اس مُرتب نظامِ فطرت کے پیچھے کسی قادرِ مطلق کا ہاتھ ہے جو اس نظام کو چلا رہا ہے۔ نیز یہ کہ یہ نظام فطرت محض اتفاقاً یا اندھی اور بہری حرکت و ضرورت سے ظہور میں نہیں گیا۔

زیر نظر آیات میں سے آفری آیت میں عالمِ خارج میں موجود آیاتِ الہی کے سلسلے میں زمین و آسمان کے نظام اور اُن کی ثبات و بقا کا ذکر ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے۔ آیاتِ عظمتِ الہی میں سے ایک یہ ہے کہ آسمان و زمین اُس کے امر سے قائم ہیں: (ومن آیاتہ ان تقوم السماء والارض بامرہ)۔

۱۔ تفسیر نمونہ، جلد ۵، طرفِ رجوع فرمائیے۔

یعنی صرف آسمان و زمین کی تخلیق ہی جیسا کہ آیت ۲۲ میں اشارہ ہوا ہے، آیتِ الہی نہیں بلکہ ان کے نظام کا باقی رہنا ایک دوسری نشانی ہے۔ کیونکہ یہ عظیم اجرامِ اپنی منظم گردش کے لیے اور چیزوں کی اعتیاج بھی رکھتے ہیں جن میں سے سب سے اہم اُن کی باہم ثبوتِ جاذبہ اور دافعہ ہے۔

خداوندِ عالم نے کراتِ سماوی میں ان دونوں قوتوں کو ایسے اعتدال پر رکھا ہے کہ لاکھوں سال گزرنے کے بعد بھی سرٹو انحراف کے بغیر اپنے مدار پر گردش کر رہے ہیں۔

ایک اور پہلو سے دیکھا جائے تو گزشتہ آیت میں یہ بیان ہے کہ خالقِ کائنات ذاتِ واحد ہے۔ اور — اس آیت کا مضمون یہ ہے کہ اس کارخانہٴ عالم کی مُرتبی اور مدبر بھی ذاتِ احدیت ہی ہے۔

آسمان اور زمین کے لیے فعل "تقوم" کا استعمال جس سے اُن کا قیام اور ثبات مراد ہے، ایک لطیف تعبیر ہے۔ جو انسان کے معمولاتِ حیات سے لی گئی ہے کیونکہ انسان کے کام کرنے کے لیے بہترین حالت، حالتِ قیام ہے۔ اس حالت میں وہ اپنے تمام کام انجام دینے پر قدرت رکھتا ہے اور اپنے اطراف پر پُر اُستلا رکھتا ہے۔

کلمہ "امر" کے استعمال سے پروردگار کی انتہائی قدرت مراد ہے کہ اس عظیم و وسیع کائنات کے نظم اور دوامِ حیات کے لیے اُس کا ایک حکم ہی کافی ہے۔

اس آیت کے اخیر میں، معاد کے لیے توحید کو بنیادی شرط قرار دیتے ہوئے، بحث کا رخ اسی طرف موڑتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ جب وہ تمہیں زمین میں سے بٹانے کا تو تم سب کے سب باہر نکل آؤ گے: (ثم اذا دعاکم ودعوۃ من الارض اذا انتہو تخرجون)۔

قرآنِ کریم میں یہ بات بجزار نظر آتی ہے کہ خدا معاد کو زمین و آسمان میں اُس کی قدرت کی نشانیوں کی بنیاد پر ثابت کرتا ہے۔ چنانچہ آیت زیر بحث بھی اُن ہی آیات میں سے ہے۔

کلمہ "دعاکو" سے یہ مراد ہے کہ جس طرح اِس کائنات کی نظم و تدبیر کے لیے اُس کا ایک حکم کافی ہے، اسی طرح بروز قیامت دوبارہ جی اُٹھنے اور حشر و نشور کے لیے بھی اُس کا ایک دفعہ بُلانا ہی کافی ہوگا خصوصیت سے جب اِس بُلنے پر توجہ کی جائے "اذا انتہو تخرجون"۔

عربی زبان میں کلمہ "اذا" مناجات کے لیے آتا ہے۔ اِس سے ثابت ہے کہ ایک ہی دفعہ بُلانے سے سب کے سب ناکہانی طور پر قبروں سے باہر نکل آئیں گے۔

اِس ضمن میں "دعوة من الارض" کے الفاظ سے معاد جسمانی ثابت ہوتی ہے کہ بروز قیامت انسان اسی زمین سے اُٹھایا جائے گا۔

چند اہم نکات

۱۔ درسِ خدا شناسی کا ایک مکمل نصاب: گزشتہ صفحہ آیات میں خدا شناسی کے مضمون کو مختلف انداز و

عنوانات سے بیان کیا گیا ہے۔ جو درحقیقت اس درس کے لیے ایک مکمل نصاب ہے۔

اس مضمون میں آفرینش آسمان سے لے کر مٹی سے انسان کی تخلیق، اہل خانہ کی باہمی محبت، شب و روز کی راحت بخش غنیمت، نظام کائنات میں تدبیر الہی، نزول باران اور اقوام عالم کی زبانوں اور ان کے رنگوں کا اختلاف، غرض کہ انفس و افاق میں خدا کی جو بھی آیات ہیں، ان سب ہی کا ذکر ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ ان آیات میں سے ہر ایک میں دلیل اور ثبوت ہے۔ دو حصے ہیں، ایک حصہ بطور تہنید ہے اور دوسرے میں دعویٰ کا اثبات اور تاکید ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے دو عادل گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے چھ آیات میں خدا کی بے پایاں قدرت کے اظہار کے لیے مجموعی طور پر بارہ گواہ ہو گئے۔

۲۔ کون لوگ ان آیات سے کسب حکمت کرتے ہیں؟ ان چھ آیات میں سے درمیان کی چار آیات میں تاکید کیا گیا ہے کہ ان حوادث عالم اور اجزاء کائنات میں عدا، عقلاً، متفقین اور شٹنے والوں کے لیے روشن نشانیاں ہیں۔ مگر آیت ۲۰ اور ۲۵ میں یہ ذکر نہیں ہے۔

فخر الدین رازی نے اس کی یہ وجہ بتائی ہے کہ آیت ۲۰ میں اس امر کا ذکر نہ ہونے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آیات بیس اور اکیس ایک دوسرے کے بعد آئی ہیں اور دونوں میں ان آیات کا ذکر ہے جو انسان کے عالم انفس میں ہیں۔

اور آخری آیت میں مطلب اس قدر واضح ہے کہ اس پر غور کرنے کے لیے تعقل و تفکر کی ضرورت ہی نہیں بلکہ قابل غور بات یہ ہے کہ پہلے کلمہ "تفکر" استعمال ہوا ہے۔ اس کے بعد "علم" کا ذکر ہے۔ کیونکہ علم کے لیے فکر کی بنیادی حیثیت ہے۔ اس کے بعد سننے والے کان کا ذکر ہے۔ کیونکہ علم و آگاہی کے طفیل ہی انسان کلر جن سننے اور قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے۔ جس طرح سے کہ قرآن میں مذکور ہے:

فبشر عباد الذين يستمعون القول فيتبعون احسنه

میرے ان بندوں کو بشارت دو جو باتوں کو سنتے ہیں اور ان میں سے بہترین پر عمل کرتے ہیں۔ (نور - ۱۴-۱۸)

آیت ۲۴ میں "عمل" کا ذکر ہے۔ کیونکہ عقل کامل کی منزل پر وہی لوگ پہنچیں گے جو سننے والے کان رکھتے ہیں۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ زیر نظر آیات میں سے آیت ۲۰ میں انسان کی خلقت اور اس کی نسل کے زمین پر پھیلنے کا ذکر ہے:

ثم اذا انتحل بشركتشرعون

اور آخری آیت ۲۵ میں بروز قیامت زمین سے جی اٹھنے کا ذکر ہے:

نفسیر کبیر فرائی، زیر بحث آیات کے ذیل۔

اذا انت و تخرجون۔

پہلی آیت - ۲۰ میں آغاز انسان کا ذکر ہے اور آخری ۲۵ میں اس کے انجام کا ذکر ہے۔

۳۔ عالم خواب کے عجائبات : علمائے خواب اور اس کی خصوصیات کے بارے میں جو بحثیں کی ہیں ان کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اس پر اسرار عالم کے تمام پہلو روشن نہیں ہوئے اور انسان کی اس کی پیچیدہ حقیقتوں تک رسائی نہیں ہوئی۔

ابھی اہل علم میں یہ امر زیر بحث ہے کہ انسان کے جسم میں کون سا عمل اور رد عمل ہوتا ہے کہ ناگہانی طور پر اس کے دماغ اور بدن کے عمل کا ایک حصہ معطل ہو جاتا ہے اور اس کی روح اور جسم میں ایک نئی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض علما کا یہ خیال ہے کہ انسان کے جسم میں تبدیلیاں نیند آنے کا باعث ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب دماغ سے جسم کے دوسرے حصوں میں غنم جاتا ہے تو یہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے نظریے کو ثابت کرنے کے لیے ایک آلہ ایجاد کیا ہے جو مغز سے باقی اعضا کی طرف انتقال غنم کو ظاہر کرتا ہے۔

علما کا ایک اور گروہ جسم میں کیمیائی تبدیلیوں کو نیند کا باعث سمجھتا ہے۔ ان لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ جب وقت انسان محنت مشقت کرتا ہے تو اس کے جسم میں ایک زہر پیدا ہو جاتا ہے جو دماغ کے ایک حصے کو بیکار کر دیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں انسان سو جاتا ہے اور جب یہ زہر جزو بدن بن کر زائل ہو جاتا ہے تو انسان بیدار ہو جاتا ہے۔ سائنس دانوں کی ایک اور جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ "نیند" کا ایک عامل اعصابی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دماغ میں بھی ایک خاص قسم کا فعال نظام اعصاب موجود ہے جس کی مثال موٹر کے پٹرول کی سی ہے۔ یہ نظام اعصاب تھک کر بیکار ہو جاتا ہے اور آدمی سو جاتا ہے۔

مگر ان تمام نظریات پر اعتراضات کیے گئے ہیں جن کے ابھی تک شافی جوابات نہیں دیے جا سکے۔ اس لیے ابھی تک "نیند" ایک پراسرار چیز ہی ہے۔

سائنس دانوں نے جن عجائبات خواب کا انکشاف کیا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ بوقت خواب جب دماغ کے خلیوں کا اکثر حصہ اپنا کام ترک کر دیتا ہے تو بعض خلیے جنہیں "خللائے نگہبان" کہنا چاہیے، بیدار رہتے ہیں اور انسان عالم بیداری میں ان خلیوں کو جو پیغام بھی دیتا یا جو نصیحت بھی کرتا ہے وہ اسے ہرگز فراموش نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ وہ مغز کو بیدار کر کے اسے متحرک کر دیتے ہیں۔

مثلاً — ایک ٹھکی مادی ماں جب رات کو سونے لگتی ہے اور اس کا شیر خوار بچہ اس کے قریب ہی گوارے میں موجود ہوتا ہے تو وہ لاشعوری طور پر دماغ کے "نگہبان" خلیوں سے (جو روح اور جسم کے درمیان رابطے کا کام دیتے ہیں) یہ کہتی ہے کہ میرا بچہ جس وقت بھی رونے لگے تو مجھے جگا دینا۔ ماں کے نزدیک اس کے علاوہ دوسری آوازوں کی کوئی اہمیت نہیں ہو سکتی ہے کہ بادل کی گرج، اس ماں کو نیند سے بیدار نہ کرے۔ لیکن بچے کی ہلکی سی آواز بھی اسے جگا دیتی ہے اور دماغ کے

نگہبان غیبی اس فرض کو ادا کرتے ہیں۔

ہم نے اس بات کو ٹھو اپنے اوپر بار بار آزما کے دیکھا ہے کہ اگر ہم نے اپنے دل میں یہ طے کر لیا ہے کہ بیج سورج سے یا آبی رات کو ہمیں کسی سفر یا کسی اہم پروگرام پر جانا ہے تو عین وقت پر آنکھ کھل جاتی ہے۔ جب کہ دیگر مواقع پر ہم گھنٹوں پڑے سوئے رہتے ہیں۔

خاصہ گفتگو یہ ہے کہ نیند ایک روحانی مظہر ہے اور روح ایک پراسرار عالم ہے۔ لہذا — کیا عجیب ہے کہ اس مسئلے کے بہت سے پہلو ایسے ہوں جو ابھی انسان پر منکشف نہ ہوتے ہوں۔ مگر انسان اس اسرار کی گرہ کشائی میں جتنا بھی زیادہ غور و فکر کر رہا ہے اتنا ہی اُس پر اس مظہر کے خالق کی عظمت واضح ہوتی جاتی ہے۔

۴۔ میاں بیوی کی باہمی محبت : اگرچہ — انسان کا اپنے والدین اور بھائی بہنوں سے رابطہ نسبی ہے جس کی بنیاد رشتہ داری کے گہرے تعلق پر ہے۔ اس کے متعلق میں زوجین کا باہمی تعلق صرف قانون اور معاہدہ باہمی پر ہے۔ لیکن اگر ایسا ہوتا ہے کہ اُن دونوں کے درمیان محبت رشتہ داری کے تعلق پر سبقت لے جاتی ہے۔ مذکورہ بالا آیات میں وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ میں انسان کی اسی فطرت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

جناب رسالتاً سے ایک حدیث مروی ہے کہ : جنگ احد کے بعد آپ نے بنت جحش سے فرمایا کہ "تیرے ماموں حمزہ شہید ہو گئے" تو اُس نے جواب دیا : انا لله وانا الیہ راجعون " میں خدا سے اس مصیبت کا اجر چاہتی ہوں۔"

آپ نے پھر اُس سے کہا — "تیرا بھائی بھی شہید ہو گیا۔"

اُس لڑکی نے پھر "انا لله" پڑھا اور اس کا اجر خدا سے مانگا۔ مگر جناب رسالت مآب نے جیسے ہی اُسے اُس کے شوہر کے مرنے کی خبر سنائی، تو : وہ سر پینے اور فریاد کرنے لگی۔

ہاں — یہ قول کتنا سچا ہے :

'ما یعدل الزوج عند المرأة شیء'

عورت کے لیے کوئی شے بھی اُس کے شوہر کے مانند نہیں ہے۔

۲۶۔ وَلَهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلٌّ لَهُ قِنْتُونَ ۝

۲۷۔ وَهُوَ الَّذِي يَبْدُؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ ۝

۲۸۔ وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

۲۹۔ ضَرَبَ لَكُمْ مَثَلًا مِّنَ الْفُسْكَمُ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَاءَ فِي مَآرِزِ قِتْلِكُمْ

فَإِن تُوَفِّيهِ سِوَاءٌ تَخَافُونَهُمْ كَخِيفَتِكُمْ الْفُسْكَمُ

كَذَلِكَ نَفِصَلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُعْقِلُونَ ۝

۲۹۔ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَهْوَاءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَمِنْ يَهْدِي

مَنْ أَضَلَّ اللَّهُ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نَّاصِرِينَ ۝

ترجمہ

۲۶۔ اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے سب اُس کے سامنے جھکے ہوئے ہیں

اور سب اُسی کے فرماں بردار ہیں۔

۲۷۔ اور وہی خلقت کا آغاز کرتا ہے اور پھر اُسے لوٹائے گا اور اُس کے لیے یہ کام آسان ہے

اور اُس کے لیے آسمانوں اور زمین میں تو صیف برتر ہے اور وہ غالب اور حکمت والہ ہے۔

۲۸۔ خدا تمہارے لیے تمہارے ہی حال کی ایک مثال بیان کرتا ہے (اگر تمہارے پاس لونڈیاں اور غلام ہوں تو) کیا وہ تمہارے غلام اور لونڈیاں تمہارے اس مال میں جو ہم نے تمہیں دیا ہے شریک ہیں؟ اور کیا اُس میں وہ تمہارے برابر کے حصہ دار ہیں؟ اور کیا اُن سے اجازت لیے بغیر تم اُس میں تصرف سے اسی طرح ڈرتے ہو جیسے اُن کے حصہ داروں سے؟ ہم اس طرح اپنی آیات کو اُن کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں کھول کر بیان کرتے ہیں۔

۲۹۔ بلکہ ظالم بغیر علم و آگاہی کے اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور خدا جسے گمراہ کرے اُسے کون ہدایت کر سکتا ہے اور اُن کا کوئی یار و مددگار نہ ہوگا۔

تفسیر

خدا کے واحد ہی مالک حقیقی ہے

گزشتہ آیات میں "توحید خالقیت" اور "توحید ربوبیت" کے متعلق بحث تھی۔ مگر زیر نظر آیات میں سے پہلی آیت میں توحید کی ایک اور شاخ یعنی "توحید مالکیت" کا ذکر ہے۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے: زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے سب اُس کے لیے ہے (وله من فی السماوات والارض)۔ اور جو کچھ سب اُس کی ملکیت میں ہے، اس لیے سب کے سب اُس کے سامنے فرد تن اور طبع ہیں (کل لہ قانتون)۔

یہ ظاہر ہے کہ اس مقام پر مالکیت اور طبع ہونے کا مفہوم مالکیت و اطاعت تکوینی ہے۔ یعنی قانون آفرینش کے لحاظ سے ہر شے کی زمام امر اُس کے ہاتھ میں ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ خواہ نہ خواہ اُس کے قوانین کا پابند ہے۔

یہاں تک کہ نافرمان باغی اور قانون شکن گناہ گار بھی، خدا کے قوانین تکوینی کی پابندی پر مجبور ہیں۔ اس مالکیت کی دلیل اُس کی وہی خالقیت اور ربوبیت ہے۔ وہ ذات جس نے ابتدا میں کائنات کو خلق کیا اور اُس کا نظام تدبیر بھی جس کی قدرت

میں ہے، لازماً اُس کا مالک اصلی بھی وہی ہے۔

چونکہ جہاں ہستی کی تمام موجودات اس امر میں یکساں ہیں۔ (یعنی جہاں تکوین میں جملہ مخلوقات قوانین فطرت کی مطیع ہیں)۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس کی مالکیت میں کوئی شریک نہیں ہے۔ یہاں تک کہ مشرکین کے خیالی معبود بھی اُسی مالک الملوک کے ملوک اور مطیع فرماں ہیں۔

ضمناً یہ بھی ملحوظ رہے کہ "قانت" کا مادہ "قوت" ہے، جس کے معنی ہیں ایسی اطاعت جس میں عاجزی اور انکساری بھی شامل ہو۔ بقول راغب اصفہانی در مفردات:

جناب رسالت مآب سے ایک حدیث مروی ہے:

کل قنوت فی القرآن فهو طاعة

قرآن میں جہاں کہیں بھی کلمہ قنوت آیا ہے اس کے معنی اطاعت کے ہیں۔

اطاعت بھی دو طرح کی ہے، تکوینی اور تشریحی۔

یہ جو بعض مشرکین نے اس مقام پر قانتوں کے معنی "قائمون بالشہادۃ علی وحدانیۃ" کیے ہیں، درحقیقت یہ مفہوم بھی اطاعت کا ایک پہلو ہے۔ کیونکہ وحدانیت خدا کی شہادت دینا بھی ایک قسم کی اطاعت خدا ہی ہے۔

آیات گزشتہ اور آیات آئندہ میں سبب اور معاد کے مسائل تانے بانے کی طرح بٹے ہوئے ہیں۔ چنانچہ زیر قلم آیات میں سے آیت ۲۷ میں پھر سلسلہ معاد کا ذکر ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے۔ "اُسی کی ذات ہے جس نے آفرینش کا آغاز کیا اور وہ پھر اُسے لوٹائے گا اور یہ کام اُس کے لیے آسان تر ہے" (وهوالذی یبدؤ الخلق ثویبیدہ وهو اھون علیہ)۔

اس آیت میں مختصر ترین استدلال کے ساتھ امکان معاد کو ثابت کیا گیا ہے۔ رُوح بیان یہ ہے کہ:-

جب تم یہ مانتے ہو کہ آغاز آفرینش اُسی کی طرف سے ہے۔ تو بعد فنا تجدید حیات جو تخلیقِ اول کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے، اُس پر وہ کیوں قادر نہیں ہو سکتا؟

اعادہ تخلیق کے، آغاز تخلیق سے آسان تر ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ابتدا میں ہر شے سے کسی چیز کا وجود ہی تھا اور فنا اُسے عدم سے وجود میں لایا ہے مگر بعد فنا اعادہ کے لیے کم از کم مواد اصلی تو موجود ہوگا۔ جس کا کچھ حصہ مٹی میں ملا ہوگا اور کچھ حصہ فضا میں پراگندہ ہوگا۔ خدا کا کام تو ان اجزائے منتشر کو صرف منظم کرنا اور انہیں صورت بخشنا ہی ہوگا۔

۱۔ اُسی نے اپنی کتاب رُوح المعانی میں، اس آیت کے تحت اس واسطے کہ کسی مابجل مشرک سے نقل کیا ہے۔

۲۔ فرمازی نے تفسیر کے حوالے سے یوں نقل کیا ہے کہ: "خدا نے جناب سبوح کی بغیر باپ کے پیدائش کے متعلق یہ کہا ہے" هو علیٰ ہدین"

اور علیٰ کا مقوم ہونا حصر کی دلیل ہے۔ یعنی یہ کام صرف میرے لیے آسان ہے نہ کہ میرے غیر کے لیے۔ اور زیر نظر آیت میں "هو اھون علیہ" بیان علیہ حصر کے معنی نہیں دیتا بلکہ یہ ہے کہ جو شخص کسی کام کا آغاز کر سکتا ہے وہ اس کا اعادہ بھی کر سکتا ہے۔

اس مقام پر ایک نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ کسی کام کا آسان یا سخت ہونا فکر انسانی کے مطابق ہے جب کہ ذاتِ لامحدود کے لیے سخت و آسان میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔ کیونکہ کسی کام کا سخت و آسان ہونا اس مقام پر مقصور ہوتا ہے جہاں فاعل کی قدرت محدود ہو کہ وہ ایک کام کو تو آسانی سے کر سکے اور دوسرے کام کو دشواری سے۔ لیکن جب فاعل کی قدرت لامحدود ہو تو پھر سخت و آسان کے الفاظ بے معنی ہیں۔

در حقیقت کلمات "آسان اور" دشوار" کا مفہوم انسانی ہے۔ خدا کے لیے عظیم ترین پہلو کو اٹھالینا آسان ہی کہتے ہیں۔ جتنا انسان کے لیے گھاس کے ٹھکے کو۔

شاید اسی وجہ سے آیت میں بلافاصلہ یہ الفاظ ہیں: (وله المثل الاعلیٰ فی السماوات والارض)۔ آسمانوں اور زمین میں خدا ہی کے لیے توصیف برتر ہے۔

کیونکہ آسمان و زمین میں کسی وجود کے متعلق بھی جو وصف کمال تصور کیا جائے مثلاً: علم، قدرت، مالکیت، عظمت، جود و کرم تو اس کا مصداق اتم و اکمل خدا ہی ہے۔ کیونکہ صرف ذاتِ الہی ہی لامحدود ہے۔ باقی ماسوائے محدود ہے۔ علاوہ بریں خدا کے اوصاف ذاتی ہیں اور دیگر ہر شے کے اضافی اور عارضی ہیں۔ نیز یہ کہ جملہ کمالات کا منبع اصلی وہی ہے۔ ہماری زبان (ہر زبان جو انسان بولتا ہے) روزمرہ کے زندگی کے مطالب کے اتمام و تقییم اور مقصد بر آری کے لیے ہے کوئی زبان بھی ماورائی حقائق اور ذاتِ باری تعالیٰ کے اوصاف بیان نہیں کر سکتی جس طرح کہ ہم نے کلمہ "اھسون" کو دیکھا۔ جملہ مافوق بھی ان جملوں کی مانند ہے جیسے سورہ اعراف آیہ ۱۸۰ میں ہے:

وللہ الاسماء الحسنیٰ فادعوه بها

خدا کے لیے بہترین نام میں سے ان ناموں سے پکارو۔

یا جیسے سورہ شوریٰ کی آیت ۱۱ میں آیا ہے:

لیس کمثلہ شئی

کوئی شے بھی دنیا میں اس کی مثل نہیں ہے۔

آیت کے اختتام پر بہ عنوان تاکید یا بطور دلیل فرمایا گیا ہے: اور وہی عزیز و حکیم ہے (وہو العزیز الحکیم)۔ وہ عزیز اور شکست ناپذیر ہے۔ لیکن قدرت نامحدود کے ہوتے ہوئے بھی وہ کوئی کام بے حساب انجام نہیں دیتا۔ اس کے تمام کام حکمت پر مبنی ہیں۔

گزشتہ آیات میں توجید و معاد کے متعلق کچھ دلائل بیان کرنے کے بعد ایک مثال کی صورت میں فحش شرک کی دلیل دی گئی ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے: خدا خود تمہارے ہی حالات سے تمہارے لیے ایک مثال دیتا ہے (ضرب لکم مثلاً من انفسکم)۔

وہ مثال یہ ہے کہ اگر تمہارے غلام اور خادم ہوں تو کیا یہ لوگ اس روزی میں جو ہم نے تمہیں دی ہے، تمہارے

شریک ہو جائیں گے؟ (ہل لکم من مملکت ایمانکم من شرکاء فی ما رزقناکم)۔ اس طرح کی شرکت کہ تم دونوں ہر طرح سے سادی ہو (فانتو فیہ سواۃ)۔ اور اس طرح بے تکلف شریک ہوں کہ تمہیں یہ ڈر ہو کہ وہ تمہاری اجازت کے بغیر تمہارے مال میں تصرف کریں گے۔ جس طرح کہ تم اپنے آزاد شریک (یعنی شہدادوں) سے اپنے مال اور میراث کے متعلق ڈرتے ہو۔ (تخافونہم کخیفتم انفسکم)۔ یا یہ کہ تمہارا یہ حال ہو جائے کہ تم اپنے مال میں ان کی اجازت کے بغیر تصرف نہ کر سکو۔

(مثال کا نتیجہ یہ ہے کہ جب کہ تم اپنے غلاموں کی "جو تمہاری مجازی ملکیت میں" اپنے کاروبار اور امور میں اس طرح شرکت کو نادرست سمجھتے ہو تو پھر ان مخلوقات کو جو خدا کی حقیقی ملکیت میں اس کا شریک کس طرح سمجھتے ہو؟ یا جب تم بیرون کو (مثلاً مسیح کو) یا ملائکہ کو، یا ایسی مخلوق کو جیسے جنات میں یا پھر یا نگوی کے نبیوں کو خدا کا شریک سمجھتے ہو تو بتاؤ کہ یہ تمہارا کیسا غیر منطقی اور غلط فیصلہ ہے؟ یہ مجازی غلام جو نہیں ہے کہ بہت جلد آزاد ہو جائیں اور تمہاری ہی صف میں اٹھنے کے ہوں (چنانچہ اسلام میں اس سادات کی بنیاد ڈال دی گئی ہے) جب تک غلام ہیں اپنے مالک کے سادی نہیں ہو سکتے اور اس کے اختیارات میں دخل دینے کا حق نہیں رکھتے۔

تو پھر تم نے ان حقیقی غلاموں کو کیونکر خدا کا شریک سمجھ لیا ہے کہ جو اپنی ذات اور وجود کے لیے خدا کے محتاج ہیں اور خدا کے ساتھ ان کی استیجاب کا تعلق کبھی منقطع نہیں ہو سکتا۔ ان کے پاس جو کچھ ہے اسی کا دیا ہوا ہے اور اس کے فضل کے بغیر وہ بیچ و بچ نہیں ہیں۔

بعض مغتربین نے کہا ہے کہ اس آیت میں ان کلمات کی طرف اشارہ ہے جو مشرکین قریشی مراسم حج کے وقت جب "لیکے کہتے تھے تو کہا کرتے تھے وہ کہتے تھے:

لبتیک ، اللہم لا شریک لک ، الا شریکاً هولک ، تملکہ و ماملک

لبتیک، اے خدا! تیرا کوئی شریک نہیں ہے، مگر تیرا ایک شریک ہے جس کا تو

مالک ہے اور اس کی املاک کا مالک بھی ہے!

یہ امر بدیہی ہے کہ اس آیت کی یہ شان نزول دیگر آیات کی طرح اس کے معنی کو محدود نہیں کرتی۔ ہر حال میں یہ آیت تمام مشرکین کے لیے جواب ہے جو ان ہی کی زندگی سے لیا گیا ہے، جس کا مدار غلامی کے رواج پر تھا۔ اس آیت میں اس دلیل سے ان پر اتمام حجت کی گئی ہے۔

کلمہ "ما رزقناکم" کے استعمال سے مقصود یہ ہے کہ تم حقیقت میں نہ تو ان غلاموں کے حقیقی مالک ہو اور نہ اس مال کے جو تمہارے پاس ہے کیونکہ ان سب چیزوں کا مالک حقیقی خدا ہے۔ لیکن اس علم کے باوجود تم اس بات کے لیے تیار نہیں ہو کہ اپنے مجازی مال و دولت کو ایسے افراد کے سپرد کرو جو بطور مجاز تمہارے ملوک کہلاتے ہیں اور انہیں اپنی دولت میں شریک سمجھو۔ حالانکہ عام فطرت انسانی کے نقطہ نگاہ سے یہ امر محال نہیں ہے۔ کیونکہ اگر غلام پر اعتبار ہو تو

لہ تفسیر المیزان و تفسیر ابن السببان و تفسیر فرشتہ لیلین، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

اُسے مال میں حق تصرف دیا جاسکتا ہے۔

لیکن خدا اور مخلوقات میں خالق اور مخلوق کا ناقابلِ تغیر فرق ہے۔ یہ امر حال ہے کہ مخلوق، خالق کے اختیارات میں شریک ہو سکے۔

علاوہ بریں — جب کسی ذات یا شے کی پرستش کی جاتی ہے تو اُس کے دو ہی سبب ہوتے ہیں۔ یا تو اُسے اُس کی عظمت کی وجہ سے پُرجا جاتا ہے۔ یا بہ تمتائے سُود یا بخوف زیاں (جو اُس سے انسان کو پہنچ سکتا ہے) مگر ان خود ساختہ معبودوں میں تو ان میں سے ایک بات بھی نہیں ہے۔

آیت کے اخیر میں اس مسئلے پر زیادہ غور و غوض کرنے کے لیے بطور تائید فرمایا گیا ہے: ہم اس طرح اُن لوگوں کیلئے جو غور و فکر کرتے ہیں اپنی آیات کی تشریح کرتے ہیں (كذالک نفضل الایات لقوم یعقلون)۔

البتہ — تمہاری ہی زندگیوں سے واضح مثالوں کا ذکر کر کے ہم تمہیں بہت حقائق سمجھاتے ہیں تاکہ تم اُن پر غور کرو۔ کم از کم اتنا تو سمجھو کہ جو بات تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے، وہ ربِّ العالمین کے لیے بھی پسند نہ کرو۔

مگر یہ آیاتِ بیانات اور اس قسم کی واضح اور روشن مثالیں صاحبانِ فخر کے لیے ہیں۔ نہ کہ بے دانش نفس پرست ظالموں کے لیے۔ جن کے دلوں پر جہل و نادانی کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور آیاتِ جاہلیت کی خرافات اور تعصبات نے اُن کی فضا کے فکر کو تیرہ و تار کر دیا ہے۔ اس لیے آیہ بعد میں یہ اضافہ کرتے ہیں: ظالم و آگاہی کے بغیر اپنی ہوا و ہوس کی پیروی کرتے ہیں۔ اُن کا عمل کسی دلیل کے تحت نہیں ہے بل اتبع الذین ظلموا اھواہم و بغیر علم۔

خدا نے ایسے لوگوں کو اُن کی بد اعمالیوں کی وجہ سے دائمی ضلالت میں پہنچا دیا ہے۔ بھلا اُن لوگوں کی ہدایت کون کر سکتا ہے جنہیں خدا نے گمراہ کیا ہو (فمن یھدی من اضل اللہ)۔

آیت نمبر ۲۹ میں "اشرکوا" کے بجائے "ظلموا" استعمال ہوا ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ "شُرک" بجائے خود بہت بڑا ظلم ہے۔ یہ خالق پر ظلم ہے۔ کیونکہ مشرکین خدا کی مخلوق کو اُس کا ہم پایہ بنا دیتے ہیں۔

نیز یہ خلق خدا پر بھی ظلم ہے۔ کیونکہ مشرکین انہیں راہ توحید سے جو درحقیقت راہ خیر و سعادت ہے، گمراہ کرتے ہیں۔

تشرک اپنی ذات پر بھی ظلم ہے۔ کیونکہ مشرک اپنی زندگی کو برباد کر کے گمراہی میں سرگرداں رہتا ہے۔

ضمناً — کلمہ "ظلموا" کا استعمال مؤخر جملہ کے لیے بطور مقدمہ ہے۔ یعنی اگر خدا نے اُن ظالموں کو راہ حق سے گمراہ کر دیا ہے تو یہ اُن کے ظلم کا نتیجہ ہے۔ جس طرح کہ ہم سورہ ابراہیم کی آیت ۲۷ میں پڑھتے ہیں:

ویضل اللہ الظالمین

خدا ظالموں کو گمراہ کر دیتا ہے۔

بعض مشرکین نے جملہ "تھا خود خود" کے خیزت کو "انفسکوا" کی کچھ اور تفسیر کی ہے، جس کا ما اصل یہ ہے کہ ان خود ساختہ معبودوں میں اپنی قدرت نہیں ہے کہ تم ان سے ڈرو۔ اتنا بھی نہ ڈرو جتنا ایک دوسرے سے ڈرتے ہو، اس سے زیادہ ڈرنے کا کیا موقع ہے کہ جس نے تفسیر اپنی ہی کی ہے وہ زیادہ بہتر ہے۔

یہ مسلم ہے کہ خدا جن لوگوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دے تو اُن کا کوئی بھی یاد و ناصر نہ ہوگا (وما لھم من ناصرٍ)۔ خدا نے اِس عنوان سے گروہِ ظالمین و مشرکین کی نخوس سرِ نوبت کو بیان کیا ہے۔ اور جیسا کہ فرمایا گیا ہے، وہ اسی کے مستحق ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ عظیم ترین مظالم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنی عقل و فکر سے دست کش ہو کر آفتابِ علم و دانائی کی طرف سے منہ موڑ لیا ہے اور ظلمتِ ہواد ہوس کی طرف رخ کر لیا ہے۔ ایسی حالت میں یہ فطری امر ہے کہ خدا اُن سے اپنی توفیق سلب کر لے اور انہیں کفر و بشرک کی تاریکیوں میں چھوڑ دے جہاں اُن کا کوئی یاد و ناصر نہ ہوگا۔

۳۰. فَأَقْرَ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۖ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۖ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۗ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۗ وَلَٰكِنَّا أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝

۳۱. مُبِينٍ إِلَيْهِ وَاتَّقُوهُ ۖ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝

۳۲. مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِبَعًا ۗ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝

ترجمہ

۳۰. تو اپنا رخ پروردگار کے خالص دین کی طرف کر لے کیونکہ یہ فطرت ہے کہ جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ خدا کی آفرینش میں کوئی تغیر اور تبدیلی نہیں ہوتی اور یہی محکم و استوار دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

۳۱. تم اسی خدا کی طرف رجوع کیے رہو۔ اُس سے ڈرتے رہو، نماز قائم کرتے رہو اور مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ۔

۳۲. (اور نہ اُن لوگوں میں سے ہونا) جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور فرقوں میں بٹ گئے۔ (تعب یہ ہے کہ) ہر گروہ اُسی سے (دالستہ ہے اور) خوش ہے

جو کچھ اُس کے پاس ہے۔

تفسیر

اس مقام تک، مشاہدہ کائنات سے توجید و خدا شناسی کا سبق حاصل کرنے اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اس عالم ماذنی کے مادہ ایک ایسی ذات ہے جو مبداء علم و قدرت ہے، بہت سی بحثیں ہوئی ہیں اور اس سطورہ میں جو آیات توجید سے متعلق آئی ہیں اُن سے بھی یہ سبق حاصل کیا ہے۔

اب جو نئی آیات زیر بحث ہیں اُن میں سے پہلی آیت میں اُس توجید کا ذکر ہے جو عالم فطرت میں موجود ہے یعنی اسی سلسلہ توجید کو مشاہدہ عالم مظاہر کے بجائے مشاہدہ نفس، مشاہدہ باطن اور کیفیت عالم وجدان کے زاویہ نظر سے بیان کیا گیا ہے۔

چنانچہ فرمایا گیا ہے: خدا کے پاک اور خالص دین کی طرف رخ کرو (فَأَقْرَ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا)۔ کیونکہ یہی وہ فطرت ہے جس پر خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ خدا کے عمل تخلیق میں تغیر نہیں ہوتا (فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ)۔

اور یہی محکم و استوار دین و آئین ہے (ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ)۔

مگر اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے (وَلَٰكِنَّا أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ)۔

”وجہ“ کے لغوی معنی ہیں ”صورت“ مگر یہاں صورت ظاہری نہیں بلکہ صورت باطنی اور ”رُؤیِ دِل“ مراد ہے۔ یعنی یہ مطلب نہیں کہ تم دین کی طرف اپنا رخ کر لو بلکہ قلبی توجہ مطلوب ہے۔ توجہ قلبی کو بطور استعارہ ”وجہ“ کہا گیا ہے کیونکہ یہ جسم کا سب سے اہم عضو ہے۔

”اقر“ کا مادہ ”اقامہ“ ہے۔ جس کے معنی ہیں صاف اور مستقیم کرنا اور کھڑا کرنا۔

”حنیف“ کا مادہ ”حنف“ ہے۔ جس کے معنی ہیں ”باطل سے حق کی طرف میلان“ یا ”کجی سے راستی کی طرف“ اس کی ضد ”جنت“ ہے یعنی راستی سے گم راہی کی طرف میلان۔

”دین حنیف“ وہ دین ہے جو تمام انحرافات، فرافات، کجی اور گم راہیوں سے بچا ہوا اور راستی اور سستی کی طرف مائل ہوا ہے۔

مجموعی طور پر اس جملہ کے یہ معنی ہیں کہ اپنی توجہ دامن اُس دین کی طرف رکھو جو ہر قسم کی کجی اور ناراستی سے پاک ہے وہی آئین اسلام اور وہی خدا کا پاک اور خالص آئین ہے۔

اس آیت میں بطور تاکید یہ سمایا گیا ہے کہ ”دین حنیف“ جو ہر قسم کے بشرک سے پاک ہے، وہ دین ہے جو خدا نے

۱۔ ”الدین“ میں الف و لام عمد کے معنی دیتا ہے، یعنی وہی دین دائیں جس کا تبلیغ پر ہر اسلام مامور ہے۔

تمام بنی نوع انسان کی سرشت میں ولایت کیا ہے اور فطرت انسانی جادوانی اور تغیرناپذیر ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

اس آیت میں اور بھی چند حقائق ہیں :

۱۔ صرف خدا شناسی ہی نہیں بلکہ دین و آئین بطور کلی تمام جہات سے ایک امر فطری ہے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے کیونکہ جب ہم حقیقت توحید پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ امور تکوینی اور امور تشریحی کے درمیان ہم آہنگی کوئی چیز نہیں ہے کہ احکام شریعت فطرت انسانی کے مطابق ہوں اور انسان کی فطرت سے بھی شریعت کے قوانین کی تائید ہوتی ہو۔

اس مطلب کو الفاظ دیگر یوں ادا کیا جاسکتا ہے کہ "تکوین" (فطرت انسانی) اور "تشریح" (امور شرعی) دونوں قوی بازوؤں کی مانند ہیں، جو اعمال انسانی میں ہم آہنگی کے ساتھ شامل رہتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی امر شریعت ایسا ہو جو فطرت انسانی کے خلاف ہو۔ بخلاف اس کے یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ انسان کی فطرت سلیم میں کوئی بیلاں ہو اور شریعت اُس کی مخالفت کرے۔

اس میں شک نہیں کہ "شریعت" فطرت انسان کی مثال گیر رہتی ہے اور اسے خوف راستوں سے روکنے کیلئے اُس پر حدود و قیود اور شرائط عائد کرتی رہتی ہے۔ مگر سلامت رو فطری خواہشات کی ہرگز مخالفت نہیں کرتی بلکہ انہیں شرف طریقیوں سے پورا کرنے کی ہدایت کرتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتو "تکوین" اور "تشریح" میں تضاد پیدا ہو جائے، جو اس توحید سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ خدا ایسے کام نہیں کرتا جو ایک دوسرے کے ضد و تقیض ہوں۔ یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ اُس کا فرمان تکوینی تو یہ ہو کہ یہ کام کر اور فرمان تشریحی یہ ہو کہ نہ کر۔

۲۔ دین اپنی خاص اور ہر قسم کی آلودگی سے پاک صورت میں انسان کے تحت الشعاع میں موجود ہے۔ انسان کا راہ مستقیم سے منحرف ہونا ایک عارضی امر ہے۔ اس بنا پر ہمیں بدول کا فرض یہ ہے کہ وہ انسان کو ان عارضی الخرافات سے روک دیں اور اُس کی اصلی فطرت کو اظہار کا موقع فراہم کریں۔

۳۔ نیز جملہ "لا تتبدیل لخلق اللہ" اور اُس کے بعد جملہ "ذلک الدین القیم" مذہب اور دین کے فطری جوئے اور فطرت الہی کے عدم امکان تغیر پر تاکید ہے۔ ہر چند کہ بہت سے لوگ کافی استعداد نہ ہونے کی وجہ سے اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ لازم ہے کہ کلمہ "فطرت" کا مادہ "فطر" (بوزن بذر) ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کو اُس کے طول سے چیرنا۔ یہ کلمہ مجازی طور پر یعنی خلقت استعمال ہوتا ہے۔ گویا کہ موجودات عالم کی آفرینش کے وقت پردہ عدم شگافتہ ہوا اور مخلوقات ظاہر ہو گئیں۔

بہر حال جب انسان روز اقل عالم ہستی میں قدم رکھتا ہے تو اسی دن سے یہ نور الہی اُس کے دل میں چمکنے لگتا ہے۔ ہم نے جو کچھ سطور بالا میں کہا ہے اُس کی وہ متعدد روایات تائید کرتی ہیں جو اس آیت کی تفسیر میں مذکور ہوئی ہیں۔

ہم اُن کا اس وقت ذکر کریں گے جب اس آیت کے نکات لکھیں گے۔ اس کے علاوہ ہم یہ بھی بیان کریں گے کہ "توحید" ایک فطری شے ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں یہ اضافہ ہے کہ دین حنیف یعنی خالص و فطری دین کی طرف تمہاری توجہ اس حال میں ہے کہ تم خدا کی طرف لوٹو گے (منیبین الیہ)۔ تمہارے وجود کی اصل و اساس توحید پر ہے اور آخر کار تم اسی بنیاد کی طرف لوٹ جاؤ گے۔

کلمہ "منیبین" کا مادہ "انابہ" ہے جس کے وضعی معنی ہیں "پھر لوٹ آنا"۔ اس مقام پر اس لفظ کا مفہوم ہے "خدا کی طرف لوٹ آنا" یا "توحید کی فطرت کی طرف لوٹ آنا"۔ یہ بات اس لیے کہی گئی ہے کہ ہمیشہ ایسے اسباب پیدا ہونے کا امکان ہے جو انسان کو عقیدہ و عمل کے لحاظ سے مرکز توحید سے منحرف کر دیں۔ اس حالت میں انسان کو خدا کی طرف لوٹنا چاہیے اور جتنی مرتبہ بھی اس عمل کی تکرار ہوگی، فطرت توحید عمیق و استوار ہوتی جائے گی اور اسباب انحراف کمزور اور ضعیف ہوتے جائیں گے یہاں تک کہ ہمیشہ کے لیے انسان کا عقیدہ توحید مستحکم ہو جائے گا اور وہ "فاقہ و جھک للذین حنیفاً" کا مصداق ہو جائے گا۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ "اقہ و جھک" میں صیغہ واحد ہے اور "منیبین" میں صیغہ جمع ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلا حکم اگرچہ مفرد صورت میں ہے اور اس کے مخاطب جناب رسالت مآب ہیں۔ لیکن حقیقت میں اس سے تمام مسلمان اور مومنین مراد ہیں۔

"انابت" اور "بازگشت" کے ذکر کے بعد "تقویٰ" کا حکم ہے کہ جو تمام احوال و لواہی کا جامع ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے : خدا سے پرہیز کرو (واقفوا) یعنی اُس کے احکام کی مخالفت سے پرہیز کرو۔ اُس کے بعد تمام احوال میں سے سب سے زیادہ زور اور تاکید نماز پر ہے۔ فرمایا گیا ہے : نماز قائم کرو (واقفوا الصلوٰۃ)۔

کیونکہ نماز ہر جہت سے شرک کے ساتھ مبارزہ کا بہترین لائحہ عمل ہے اور عقیدہ توحید اور ایمان باللہ کو مستحکم کرنے کا بہترین وسیلہ ہے۔

اس لیے ذکر صلوٰۃ کے بعد ہی شرک کے بارے میں فرمایا گیا ہے : مشرکین میں سے مت ہو جانا (ولا تتکونوا من المشرکین)۔ کیونکہ "شرک" عظیم ترین گناہ اور اکبر کیا ہے۔ لیکن جب روز حساب خدا ہر قسم کے گناہوں کو بخش دے مگر وہ گناہ شرک کو کبھی نہ بخشنے گا۔ جیسا کہ سورہ نسا کی آیت ۴۸ میں مذکور ہے :

ان الله لا یغفران لیشرک بہ و یغفر ما دون ذلک لمن یشاء
خدا گناہ شرک کو ہرگز نہیں بخشنے گا۔ لیکن اگر وہ چاہے گا تو اس سے کتر گناہوں کو
بخش دے گا۔

یہ واضح ہے کہ اس آیت میں چار احکام آئے ہیں یعنی توبہ و بازگشت بسوی خدا، تقویٰ، انقاست نماز اور پرہیز از شرک: یہ سب مسلو توحید اور اُس کے اثر عملی پر تاکید کے لیے ہیں

زیر نظر آیت میں علامات و نتائج شرک میں سے ایک کو نہایت مختصر اور پر معنی عبارت میں بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: تم مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ وہی لوگ جنہوں نے اپنے دین کو بے پایاں کر لیا ہے اور مختلف فرقوں اور جماعتوں میں تقسیم ہو گئے ہیں: (من الذین فرقوا دینہم وکانوا شیعاً)۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ ان فرقوں میں باہم جو تضاد و اختلاف ہے، اس کے باوجود ہر گروہ اپنے عقاید اور مسلمات سے خوش ہے (کل حزب بما لدینہم فرحون)۔

یہ مسلم ہے کہ علامات شرک میں سے ایک پرانندگی اور باہمی تفرقہ بھی ہے کیونکہ مختلف سببوں کی پرستش سے عقائد و عقاید اور منتشر روش فکر پیدا ہوتی ہے اور یہ چیزیں باہمی تفرقہ اور پرانندگی کا موجب ہو جاتی ہیں۔ شرک کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ بولنے، نفس، تمسب، کبر، خود خواہی اور خود پسندی اُس کے سایہ بسایہ رہتی ہے۔ اس لیے کسی قوم میں اتحاد و وحدت صرف خدا پرستی، تواضع و ایثار اور عقلی روش ہی کے تحت باقی رہ سکتی ہے۔

منطق استخراجی کے اصول سے ہمیں جہاں جہاں اختلاف اور پرانندگی نظر آئے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہاں کسی نہ کسی قسم کا شرک ضرور موجود ہے۔ اخذ نتائج کے اعتبار سے اس ضمنوں کو بصورت سحراریوں کہا جاسکتا ہے کہ شرک کا نتیجہ کسی قوم میں تفرقہ تضاد و ذہنی تواریخوں کا ضیاع اور آخر کار اُس قوم کا ضیاع و ناتوانی اور تباہی ہے۔

لیکن یہ کہ مشرکین اور مشرکین راہ راست میں سے ہر گروہ نے اپنے لیے جو راہ انتخاب کر لی وہ اسی کو حق سمجھتا ہے اور اُس سے خوش ہے۔ اُن کی یہ روش کسی دلیل کی منتج نہیں ہے۔ کیونکہ جو وہ اُس انسان کی دلی خواہشات کو اُس کی نظریں مزین کر کے جلوہ گر کرتی ہے اور خواہشات کی اس جلوہ آرائی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اس طریق حیات سے جو اس نے اختیار کر لی ہے زیادہ دل بستگی اور راحت قلب محسوس ہونے لگتی ہے۔ خواہ وہ راہ عمل قطعی گمراہی ہی کیوں نہ ہو۔ جب انسان کی چشم بصیرت پر خواہشات نفس کا پردہ پڑ جاتا ہے تو وہ چہرہ حقیقت کو اُس کی اصل شکل میں نہیں دیکھ سکتا اور حُب و بغض سے غیر جانبدار ہو کر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔

نورہ خاطر آیت ۸ میں یوں مذکور ہے:

افمن زین لہ سوء عملہ فراہ حننا

وہ شخص جس کی نظر میں اُس کے اعمال قبیح مزین ہو گئے ہیں اور وہ اُسے حسین نظر آتے ہیں، کیا وہ اُس شخص کی مانند ہے جو راہ خدا میں قدم اٹھاتا ہے اور حقائق کو اصل صورت میں بے نقاب دیکھتا ہے؟

چند اہم نکات

۱۔ توحید انسان کی داخلی قوی قوتِ باذبہ ہے: جس طرح کہ دلائل عقلی و منطقی انسان کے طرز عمل کو معین کرتے ہیں اسی طرح اُس کے نفس میں ایسے جذبات اور تاثرات موجود ہیں کہ جو کبھی تو شعوری اور کبھی غیر شعوری طور پر اُس کے طرز عمل کا تعین کرتے ہیں۔

نسل انسانی کے بقا کا راز ہی یہ ہے کہ انسان ساری حیات میں ہمیشہ ہی دلائل عقلی و منطقی سے کام نہیں لیتا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا کرنے لگے تو بہت سے مقاصد زندگی مُعطل ہو کے رہ جائیں۔ مثلاً اگر انسان غذا کھانے یا آمیزش جنسی کے لیے طبی اور منطقی دلائل دیکھنے لگے۔ یعنی غذا کھانے سے "بدل مایہ تخلی" ہوتا ہے اور تولید و نسل بقائے نسل انسانی کا باعث ہے، تو اُس کی نوع اُب سے پہلے کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی۔ لیکن جنسی جذبہ و ہیبت اور غذا کھانے کی خواہش خواہ نہ خواہ اُس سے یہ اعمال سرزد کراتی ہے اور یہ مقاصد جن قدر بقائے حیات فرد اور بقائے نوع کے لیے زیادہ مفید ہوتے ہیں یہ جذبات بھی اتنے ہی زیادہ قوی ہوتے ہیں۔

لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ کشش اور میلان دو قسم کا ہے۔ کبھی تو غیر شعوری ہوتا ہے جیسے کہ حیوانات عقل و فکر کے بغیر ہی غذا اور جنس مخالف کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

اور کبھی یہ میلان شعوری ہوتا ہے یعنی یہ جبلت عقل و شعور سے کام لے کر اپنا عمل کرتی ہے۔

قسم اول کے جذبات کو "جبلت" اور قسم دوم کو "فطرت" کہتے ہیں۔

خدا پرستی اور اُس کی ذات کی طرف میلان قلب ہر شخص کی فطرتِ اسلیہ ہے۔

مکن ہے کہ بعض حضرات ہماری اس بات کو ایسا ادعا بھیجیں جو خدا پرست لوگوں کی طرف سے تراش لیا گیا ہے۔ مگر ہمارے پاس ایسے شواہد موجود ہیں جن سے نہ صرف انسان کا میلان ذاتِ الہی کی طرف فطری ثابت ہوتا ہے بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مذہب اپنے تمام اصولوں کے ساتھ ایک فطری امر ہے۔ مثلاً:

(۱) انسان کی پُرہنگا مرطوب تاریخ میں ہمیشہ کسی نہ کسی قسم کا مذہبی اعتقاد اور ماورائے فطرت طاقت پر ایمان ضرور رہا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ فطرت انسانی ہے۔ کیونکہ اگر اعتقاد و ایمان بالذات صرف انفرادی رجحان اور عادت ہوتا اور یہ جذبہ عمومیت نہ رکھتا اور نہ دائمی اور ہمیشگی ہوتا تو یہ نتیجہ نکالا جاسکتا تھا کہ یہ عارضی واقعہ ہے۔ مگر اس کی عمومیت اور دوام اس کے فطری ہونے کی دلیل ہے۔

بڑے بڑے مؤرخین کی رائے ہے کہ اُنہوں نے جہاں تک انسانی تاریخ کا کھوج لگایا ہے اور زمانہ با قبل تاریخ کا جس حد تک انکشاف ہوا ہے، اُنہوں نے انسانی معاشرے میں "لا دینیٹ" کا بجز استثنائی صورت کے کہیں نشان نہیں پایا۔

عصر حاضر کا مشہور مؤرخ ویل ڈیورنٹ کہتا ہے:

اگر ہم مذہب کی یہ تعریف کریں کہ وہ "ما فوق الطبیعت" قوتوں کی پرستش کا نام ہے۔ تو ابتداء کے بحث ہی سے یہ نکتہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ بعض ابتدائی اقوام کا ظاہر اگلی مذہب نہ تھا۔

اس کے بعد وہ اس قسم کی اقوام کی مثالیں دے کر لکھتا ہے کہ یہ مثالیں نادرات میں سے ہیں۔ اور یہ قدیم اعتقاد مطابق حقیقت ہے کہ:-

"دین ایک ایسا مظہر ہے جو ہر انسان کی فطرت سے اُبھرتا ہے:-"

اس کے بعد وہ یہ اضافہ کرتا ہے کہ ایک فلاسفر کی نظر میں مذہب کے راز کا سہرا نفسیات اور تاریخ کے بنیادی مسائل میں سے ہے۔ وہ اس پہلو کی طرف توجہ نہیں کرتا کہ تمام ادیان میں لغو اور غلط عقل عقائد موجود ہیں بلکہ وہ ان حقیقت پر غور کرتا ہے کہ جب سے تاریخ انسانی شروع ہوتی ہے، اسی وقت سے "دین" بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا۔ اختتام کلام پر وہ اپنی گفتگو کو اس پر مبنی سوال پر ختم کر دیتا ہے۔

"یہ تقویٰ جسے کسی طرح بھی انسان کے دل سے مٹو نہیں کیا جاسکتا اس کا منبج کہاں ہے؟"

یہی سوچ اپنی ایک اور تحقیق میں (جو اس نے ادیان کا قبل تاریخ کے متعلق کی ہے) یوں لکھتا ہے:

اگر ہم ماقبل تاریخ میں وجود مذہب کا تصور پیش نظر نہ رکھیں تو ہم اس کے وجود کو موجودہ تاریخی دور میں بھی نہیں سمجھ سکتے۔

ماقبل تاریخ انسانوں کے متعلق آثار قدیمہ کی کھدائی سے جو حالات معلوم ہوئے ہیں، ان سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ مشہور عالم علم معاشرت SOCIOLOGIST سموئیل کینگ اپنی کتاب بنام "جامعہ شناسی" میں لکھتا ہے: موجودہ نسل انسانی کے اسلاف بھی یقیناً کسی مذہب کے متعلق تھے۔

وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں ان آثار کو پیش کرتا ہے جو آثار قدیمہ کی کھدائی سے منکشف ہوئے ہیں کہ وہ:-

اپنے فردوں کو ایک مخصوص وضع سے دفن کرتے تھے اور ان کے ساتھ ایسی

اشیا بھی رکھتے تھے جو ان کے عقیدے کے مطابق بروز قیامت کام آئیں۔

بہر حال کوئی محقق بھی مذہب کو انسان کی تاریخ حیات سے جدا کرنا قبول نہیں کرتا۔

(۲) آج کی دنیا کے مشاہدے سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے کی بعض مستبد طاقتوں نے اپنی پوری کوشش اور طاقت صرف کر کے لوگوں کے دلوں سے مذہب کو محو کرنا چاہا۔ لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئیں۔

چنانچہ ہم ٹویب جانتے ہیں کہ بڑوں کی برسر اقتدار پائی، ساٹھ برس سے بغیر کسی وقفے کے مسلسل پروپیگنڈے اور ماحول کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کے جملہ وسائل سے کام لے کر یہ کوشش کر رہی ہے کہ لوگوں کے دلوں اور دماغوں سے مذہبی

۱۔ تاریخ تمدن، جلد اول صفحہ ۸۷ تا ۸۹۔

۲۔ تاریخ تمدن، جلد اول صفحہ ۱۵۶۔

۳۔ جامعہ شناسی، صفحہ ۱۹۲۔

اعتقادات کو بالکل ختم کر دے۔ لیکن اس آہنی پردے سے کبھی کبھی جو خبریں پھوٹ نکلتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام پروپیگنڈے اور سخت گیری کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ حالیہ دنوں میں روس کی بعض ریاستوں میں مذہبی جوش و خروش زیادہ نظر آنے لگا ہے۔ جس نے حکومت کے حکام بالاکو حیران کر دیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کسی روز یہ سختی اور گلو گیری ختم ہو گئی تو مذہب پھر اپنی جگہ لے لے گا۔ یہ امر اس بات کا شاہد ہے کہ مذہب ایک فطری چیز ہے۔

(۳)۔ علاوہ بریں ماہرین نفسیات اور ماہرین تجربی نفسی PSYCHO ANALYST نے البادورج انسانی PSYCHO DIMINSIMS کے بارے میں جو انکشافات کیے ہیں وہ بھی مذہب کے فطری ہونے پر شاہد ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نفس انسانی کے مختلف ابعاد کے متعلق تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ اس میں ایک جوہر قدسی یا یزدانی بھی ہے جسے جلت مذہبی کہنا چاہیے۔ بعض ماہرین نفسیات اس امر کے قائل ہیں کہ انسان میں "راستی، علم، نیکی اور زیبائی کے جذبات کا سرچشمہ جوہر قدسی ہے۔"

علمائے نفسیات کا قول ہے کہ نفس انسانی میں اصولی اور اساسی محرکات حسب ذیل ہیں:

۱۔ حسن راستی: انسان میں یہ جس بر قسم کے علوم و فنون کا سرچشمہ ہے۔ یہی انسان کو رموز کائنات کی تحقیق اور انکشاف پر آمادہ کرتی ہے۔

۲۔ حسن نیکی ETHICAL INSTINCT: یہ جس انسان کو فضائل اخلاقی مثلاً عدالت، شجاعت، قربانی اور ان جیسے دیگر امور کی طرف مائل کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر انسان میں ہلاکت خود یہ صفات نہ ہوں تو وہ ایسے فضائل کے حاملین کو ہیر و پھینچ لگتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی طینت میں نیکی کا میلان موجود ہے۔

۳۔ حسن زیبائی (جلبت حسن) AESTHETIC INSTINCT: یہ جلبت انسان کو فنون لطیفہ، جمالیات، ادبیات، فونتی اور وجدانی اشواق کی طرف مائل کرتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فرد اور معاشرے کو متغیر کر دیتی ہے۔

۴۔ حسن مذہبی RELIGIOUS INSTINCT: یعنی یہ ایمان رکھنا کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے اور اُس کی عبادت اور حمد و ثنا کرنا۔ اس موضوع پر کوڈن ٹائم نے جو مقالہ سپرد قلم کیا ہے اُس میں وہ لکھتا ہے:

سگنڈ فرانڈ نے انسان کے لاشعور کے متعلق جو تحقیقات شروع کی تھیں (جسے انگریز ایڈلر اور جنگ نے ترقی دی) اُس سے علم نفسیات کے دائرہ علم میں ایسی قوتیں آئی ہیں جو انسان کے نفس کی گہرائیوں میں مستور ہیں، جو ادراک حقائق کرتی اور مادراء عقل رموز کی معرفت حاصل کرتی ہیں۔ ممکن ہے کہ ان تحقیقات سے یہ بھی ثابت ہو جائے کہ انسان میں "حسن دینی" موجود ہے اور اس کا راز کیا ہے۔ ہرچند کہ ابھی اس (حسن دینی) کے متعلق ماہرین نفسیات میں اتفاق نہیں ہے، تاہم اس مسئلے پر غور و فکر کا سلسلہ جاری ہے۔ اور مختلف مکاتب فکر کے علمائے نفسیات "حسن دینی" کی اس تعریف پر متفق ہیں جو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:-

"حسن دینی" نفس انسانی کے فطری اور مستقل عناصر اولیہ میں سے ہے۔ یہ احساس نفس کا حقیقی اور زیبا ترین حصہ ہے۔

نفس پر جو دوسری کیفیات طاری ہوتی ہیں یہ اُن میں سے کسی سے بھی مطابقت نہیں رکھتا۔ اس احساس کا چشمہ لاشعور کی گہرائی سے پھوٹتا ہے۔

انسان کے اندر بزدلی، جہاں، نیکی اور راستی کا برحمان موجود ہے اس کی علت بھی یہی احساس ہے جسے مخدوم دینی یا زیادہ صحیح الفاظ میں مخدوم متہمت کہنا چاہیے۔

اگر ان چاروں احساسات بلا کہ "مقولات" اور "کلمات" کہا جائے تو صحت دینی ہی ایک ایسا مقولہ ہے جس میں باقی ہر سر احساسات میں اپنی خصوصیات کے شامیں ڈیرے

تیار کی۔ دو کیفیتیں کے مختلف مقامات کا تجزیہ اور تریزہ کیا گیا ہے، اُس میں مذکور ہے:

جس طرح کہ عصر حاضر کی امتیازی خصوصیات میں سے سب سے بلند کہ عالم مادی میں طول، عرض و عمق کے علاوہ ایک چوتھا بُعد "زمانہ" یا "مکان" بھی بیان کیا جاتا ہے۔

جو وقت کے ابعاد ٹولہ سے منفرد ہوتے ہوئے اُن میں ابعاد کا جامع بھی ہے۔

اسی طرح اس زمانے کے ماہرین انبیاء نے نفس انسانی میں حق جمال، حسن خیر اور حقیقت راستی کے علاوہ ایک حق قدسی یا زیدانی (کہ جسے حقیقت میں نفس انسانی کا بعد چہارم کہنا چاہیے) کو دوبارہ ثابت کیا ہے۔

نفس کا یہ بعد چہارم (یعنی حق قدسی) باقی احساسات سے منفرد ہے۔ ممکن ہے احساسات سرگمازا اسی سے پیدا ہوئے ہوں۔ اہم انسان کی یہ جبلت بھی کہ وہ مصائب کے طوفان میں اپنی مشکلات کے حل اور خدا کو زندگی سے نجات حاصل کرنے کیلئے

کسی نادیدہ اور اورائی طاقت سے لوگ لگتا ہے۔ اس عقیدے کی شاہد ہے کہ اُس کے اندر ایک اندرونی بندہ اور فطری الہام ہوتے ہوئے جو اُسے وجود خدا کا یقین دلاتا ہے۔

ممکن ہے کہ بعض حضرات انسان کے اس میدان کو اس مذہبی پردیگنٹے کا رد عمل سمجھیں جو ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے اور ہم عاجز اُس سے متاثر ہوتے رہتے ہیں۔

لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس جذبے کے مظاہر تمام انسانوں میں ہر جگہ ہیں تو اس میں بھی موجود ہیں جو عام طور پر مذہبی ذوق نہیں رکھتے۔ تو ثابت ہوتا ہے کہ یہ ننگ و اعترض غلط ہے۔ بلکہ کسی مادرائی طاقت پر اعتقاد رکھنا انسان کے نفس کی

گہرائی میں موجود ہے۔ جو کہ کسی پردیگنٹے کا نتیجہ نہیں ہے۔

(۵) انسان کی زندگی میں ایسے واقعات بھی نظر آتے ہیں جن کی حس مذہبی کے منہاج کے سوا اور کوئی تامل و تفسیر نہیں ہرکتا

۱۔ مقالہ کول نام، ترجمہ منہج سبائی، در کتاب "حس مذہبی یا بعد چہارم روح انسانی"۔

۲۔ ایرانی اہل علم انگریزی دہائیوں اور ہرمن کے اسلوب میں لکھا دیتے ہیں کہ اُن کی اصلیت کا پتا چلتا ڈھنڈا کرنا اور حال پر جانا ہے۔

۳۔ مذکورہ نام کا آخری حصہ "KANTAIN" ہے۔ اول کے دو نظموں کی تفسیر دوسری۔

۴۔ پانچواں باب "عقیدت ان مشائخ" ۱۹۵۵ء - ۱۹۵۶ء۔ یہ مکتبہ امریشیات تھا۔ اُس کا نظریہ ہے کہ کسی شے کی مکان و زمان میں پرورش جو چاہئے ہے۔

مثلاً — ہم ایسے انسانوں کو دیکھتے ہیں کہ جو نہایت جوش کے ساتھ اپنے تمام مالی وسائل کسی مذہبی مقصد پر نظر لیے پر قربان کر دیتے ہیں۔ اُن کے پاس جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ بے نظیر طور پر مذہب پر نثار کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اس راہ میں جان دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

وہ شہداء جنہوں نے متعاصد الہی کو پورا کرنے کے لیے سب ان جنگ میں ذوق و شوق سے شہادت نوش کیا، صرف اسلامی تاریخ ہی میں ایسے افراد کی مثالیں بکثرت نہیں پائی جاتیں بلکہ دوسری اقوام اور ملتوں کی تاریخ میں بھی کم نہیں ہیں

یہ مثالیں اس حقیقت کا واضح ثبوت ہیں کہ انسان کے نفس کی گہرائی میں جس مذہبی موجود ہے۔

ممکن ہے کہ اس موقع پر یہ سوال بھی اٹھایا جائے کہ کیونٹ ٹوٹ جو اپنے الہام اور مذہبی مخالفت کو چھپاتے تک نہیں اُن میں بھی اپنے عقائد اور افکار کے لیے ایسا ہی قربانی کا بندہ ہو رہے۔

لیکن اگر قدر سے غور کیا جائے تو یہ اعترض باور ہوا ثابت ہوتا ہے۔ وہ یوں کہ کیونٹ حضرات جو مذہب کی کلیتہً نفی کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ مذہب اساطیر الاولین میں سے ہے اور انسان کی ابتدائی سرگزشت کی یادگار ہے، جب کہ وہ عالم ظنی تھا۔ اس لیے کیونٹ معاشرے میں اس کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے لاشعوری طور پر اپنے اس عقیدے کو مذہب بنا لیا ہے۔ وہ لوگ اپنے قومی زبانوں کو اسی نظر عقیدت سے دیکھتے ہیں جیسا کہ مسر کے بت پرست اپنے عقول کو دیکھتے تھے۔ چنانچہ لیون کی قبر کی زیارت کے آنے

دن جو اوصاف و صف کیے جاتے ہیں وہ اس کا ثبوت ہیں۔

وہ لوگ "مارکس ازم" کے اصولوں کو مثل وحی آسمانی اور نقص سے پاک اور مقدس سمجھتے ہیں۔ وہ مارکس اور لیون کو معصومین کی طرح منترہ عن الخطا تصور کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان اصولوں میں اصلاح اور تجدید نظر ناقابل معافی گناہ سمجھتے ہیں۔

نیز اپنے مخالفین کو اہل دین ہی کی اصطلاح میں "فرند" کہتے ہیں۔ گویا کہ اُن کے لیے لادینی (مخرف شکل میں) ایک دین بن گئی ہے اور اُن کے افکار، مراسم اور اعتقادات مذہبی رنگ اختیار کر گئے ہیں۔

۲۔ احادیث اسلامی میں فطرت خدا شامی کا ذکر : صرف قرآن ہی میں نہیں بلکہ احادیث اسلامی میں بھی "معرفت الہی" اور توحید کے ایک امر فطری ہونے کے بارے میں خوب بحث کی گئی ہے۔ ان میں سے بعض احادیث میں

فطرت توحیدی اور بعض میں عنوان معرفت کے تحت، بعض میں "فطرت اسلامی" یہاں تک کہ بعض میں اس جذبے کو ولایت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

محدث بزرگوار جناب گلپینی نے "اصول کافی" میں ہشام ابن سالم کے واسطے سے ایک نہایت معتبر حدیث نقل کی ہے۔ ہشام کا قول ہے کہ اُس نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا کہ: "فطرت اللہ التي فطر الناس علیها" میں

فطرت سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا کہ "توحید" مراد ہے۔

نیز اسی کتاب "کافی" میں امام جعفر صادق کے ایک صحابی سے ایک اور حدیث منقول ہے کہ اُس صحابی نے جب آیت مذکورہ کی تفسیر دریافت کی تو آپ نے فرمایا کہ "فطرت" سے مراد "اسلام" ہے۔
امام باقر علیہ السلام سے ایک اور حدیث اسی کے مشابہ منقول ہے کہ آپ کے ایک صاحب علم صحابی زرارہ نے جب اس آیت کی تفسیر دریافت کی تو آپ نے فرمایا کہ :-

فطرہم علی المعرفة بہ

خدا نے فطرت انسانی میں اپنی معرفت و شناخت کا جذبہ رکھا ہے۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث منقول ہے جو مشہور ہے :

نکل . ولود یولد علی الفطرة الاسلام حتی لیكون ابواہما اللذان

یہودان وینصرانہ

ہر بچہ نوزاد نریت اسلام اور شرک سے خالی دین پر پیدا ہوتا ہے۔ بعد میں اُس کے

ماں باپ اُس پر یہودیت یا نصرانیت جیسے انحرافی عقائد کا رنگ چڑھا دیتے ہیں۔

امول کافی میں امام جعفر صادق سے ایک حدیث اسی آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ آپ سے جب آیت مذکورہ کی تفسیر دریافت کی گئی تو جواب میں فرمایا کہ "فطرت" سے مراد ولایت اور اولیائے الہی کی رہبری کو قبول کرنا ہے۔

امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے اپنے ایک خطبہ میں (جو کہ نبی البلاغہ میں مندرج ہے) مختصر مگر بلیغاً فرمایا ہے:

خدا نے انسانوں کی طرف اپنے رسول بھیجے اور یکے بعد دیگرے انبیاء کو مانور کیا تاکہ

وہ ان سے بیامان فطرت کے ایذا کا سٹاپ کر سکیں اور انھیں خدا کی وہ نعمتیں یاد دلا سکیں

جنہیں وہ بھول گئے ہیں اور بذریعہ تبلیغ ان پر اتمامِ نجات کریں اور ان کے لیے عقل

کے خزانوں کو فاش کر دیں۔

مذکورہ روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ سرشتِ انسانی میں صرف "معرفتِ الہی" ہی نہیں بلکہ کل اسلام بصورتِ ایجاز و ولایت کیا گیا ہے۔ جس میں توحید سے لے کر پیشوایانِ الہی کی رہنمائی، پیغمبر کے سچے نمائندین، ایمان تک کہ فروعاً دین سب کچھ شامل ہے۔ نبی البلاغہ سے جناب امیر المومنین کا جو قول سطر بالا میں نقل کیا گیا ہے، اُس کی اساس پر پیغمبروں کا فرض فطرتِ انسانی کی گردن کشائی، خدا کی فراموش کردہ نعمتوں کو یاد دلانا، انسان کی فطرتِ توحیدی کو بیدار کرنا اور نفسِ انسانی کے لاشعور میں معرفتِ الہی کے جو غریبے مخفی و مستور ہیں، انھیں واضح و آشکار کر کے حالتِ شعور میں لانا ہے۔

یہ نکتہ مستحق توجہ ہے کہ دنیاوی زندگی میں انسان کو جو مشکلات و تکالیف اور دردناک حادثات پیش آتے ہیں، قرآن شریف

۱۔ لکھنؤ کان ۲ ص ۲۰۰۔ تفسیر جمع البواہات از روم طبری فیہی آیت مورد بحث۔

۲۔ تفسیر نور الثقلین، جلد ۲ صفحہ ۱۸۴۔

میں ان امور کا اس پہلو سے ذکر کیا گیا ہے کہ یہ انسان کے اندر حق مذہبی کو بیدار کرنے کے وسائل ہیں۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے :

فاذا ركبوا في الفلك دعوا الله مخلصين له الدين فلما نجاهم

الى البر اذا هم يشركون۔

جس وقت وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں اور سمندر میں خطرات میں گھر جاتے ہیں تو بڑے

خلوص سے خدا کو پکارتے ہیں۔ مگر جب انھیں خدا سلامتگی کے ساتھ خشکی پر پہنچا دیتا ہے

تو وہ پھر مشرک ہو جاتے ہیں۔ (عنکبوت - ۲۵)

اس مضمون کے متعلق اسی سورتہ کی (جو کہ سورہ عنکبوت سے مشابہ ہے) آیات مابعد کی تفسیر کرتے ہوئے اور باتوں کا بھی ذکر کیا جائے گا۔

- ۳۳ - وَإِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُنِيبِينَ إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا
 إِذَا قَهَرْتَهُمْ مِنْهُ رَحْمَةٌ إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ ۝
- ۳۴ - لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ فَتَسْتَوُوا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝
- ۳۵ - أَمْ أَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوا بِهِ يُشْرِكُونَ ۝
- ۳۶ - وَإِذَا أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوا بِهَا ۚ وَإِنْ تُصِيبُهُمْ سَيِّئَةٌ
 بِمَا قَدَّمْتُمْ أَيْدِيَهُمْ إِذَا هُمْ يَقْتِنُونَ ۝

ترجمہ

- ۳۳ - جس وقت لوگوں کو ضرر پہنچتا ہے تو وہ اپنے رب کو پُکارتے اور اس کی طرف
 رجوع کرتے ہیں۔ پھر جب وہ انہیں اپنی رحمت کا مزہ چکھاتا ہے تو ان میں سے
 ایک فریق اپنے پروردگار کی نسبت مُشرک ہو جاتا ہے۔
- ۳۴ - (انہیں رہنے دو تاکہ) ہم نے ان کو جو کچھ بخشا ہے اس کی ناشکر گزاری کریں اور
 (دُنیا کی زُود گزرتوں سے) فائدہ اٹھا لو مگر جلد ہی تمہیں معلوم ہو جائے گا (کہ تمہارے
 کفران اور خود غرضیوں کا کیا نتیجہ نکلتا ہے)۔
- ۳۵ - کیا ہم نے ان پر کوئی ایسی محکم دلیل نازل کی ہے جو انہیں بشرک کرنا سکھاتی ہے اور
 اس کی توجیہ کرتی ہے؟

- ۳۶ - اور جب ہم لوگوں کو اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ اُس سے خوش ہو جاتے ہیں۔
 اور جب اُن کے اعمال کے سبب انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنا تک مالوس
 ہو جاتے ہیں۔

تفسیر

زیر نظر آیات میں سے پہلی آیت گزشتہ آیات کے مضمون پر استدلال اور تاکید ہے یعنی تصور توحید ایک فطری امر ہے اور
 مصائب اور شدائد کے وقت یہ نورانی دل میں چمکتا ہے۔ چنانچہ خداوند عالم فرماتا ہے: جب انسانوں کو کوئی ضرر پہنچتا ہے تو
 وہ خدا کو یاد کرتے ہیں اور اُس کی طرف رجوع کرتے ہیں: (وَإِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُنِيبِينَ إِلَيْهِ)۔
 لیکن یہ لوگ اس قدر کم ظرف، کوتاہ فکر، اسیرِ تعصب اور اپنے بزرگوں کے ایسے اندھے مُقلد ہیں کہ جیسے ہی اُن کے
 اُدھر سے سخت حادثات گزر جاتے ہیں اور نسیمِ راحت و آرام چلتی ہے اور خدا اُن پر اپنی طرف سے رحمت کی بارش کرتا ہے تو
 اُن میں سے ایک گروہ اپنے پروردگار کے معاملے میں مُشرک ہو جاتا ہے: (ثُمَّ إِذَا أَذَقْنَا لَهُمْ مِنْ رَحْمَتِنَا إِذَا هُمْ يَنْتَبِهُونَ)۔

اس مقام پر "مسَّ الناس ضراً" سے مراد معمولی تکلیف ہے۔

اسی طرح "اذا قهرتهم منه رحمة"۔

(جب وہ اپنی طرف سے رحمت چکھاتا ہے) سے بھی اشارہ نعمت کی مقدار قلیل ہے۔ کیونکہ ایسے موقعوں پر کلمہ "اذا قهرتهم" کا استعمال کسی شے کی مقدار قلیل کے لیے ہوتا ہے۔ بالخصوص جب کہ کلمات "ضراً" اور "رحمة" ہر دو اسمِ مکرمہ استعمال ہوئے ہیں۔

اس گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جب انہیں کوئی معمولی مشکل بھی پیش آتی ہے تو اُن کی فطرت توحید پر
 سے پردہ اٹھ جاتا ہے۔ مگر مختصر سی نعمت پا کر اُن کی راہ فکر متغیر ہو جاتی ہے اور وہ غافل ہو جاتے ہیں اور سب کچھ بھول جاتے ہیں۔
 پہلی حالت کے متعلق بطور تفسیر یہ کہا گیا ہے کہ تمام انسانوں کا یہ حال ہے کہ وہ مشکلات کے وقت خدا کو یاد کرتے ہیں لیکن
 "فطرت توحیدی" کا وجود سب کے اندر یکساں ہے۔

لیکن — دوسری صورت (یعنی نعمت پا کر غافل ہو جانا) میں صرف ان لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے راہِ شرک کو اختیار
 کیا ہے۔

کیونکہ دُنیا میں اس کے ایسے بندے بھی ہیں کہ راحت و رحمت ہر حال میں شکرِ خدا کرتے ہیں اور زندگی کے مابقی تغیرات
 انہیں یا وحق سے غافل نہیں کرتے۔

"میںیں الیہ" کا مفہوم جیسا کہ ہم نے سابقاً ذکر کیا توجہ طلب ہے۔ کیونکہ "انابۃ" مادہ "نوب" سے بنا ہے۔ اس کے معنی ہیں، کسی چیز کی طرف پھروٹ جانا۔ اس سے اس معنی کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ انسان کی فطرت میں جذبہ توجہ خدا پرستی بنیادی طور پر موجود ہے اور بشرک ایک عارضی صورت ہے کہ انسان کسی وقت خدا سے امید منتقل کر لیتا ہے۔ مگر پھر خواہ نہ خواہ ایمان بانٹا اور توجہ کی طرف لوٹتا ہے۔

یہ امر توجہ طلب ہے کہ آیت بالا میں "رحمت" کا انساب خدا کی طرف ہے۔ لیکن "حصر" یعنی رحمت و تکلیف کو اس کی طرف منسوب نہیں کیا گیا۔ کیونکہ بہت سی سختیاں اور تکلیفیں خود ہمارے ہی اعمال اور گناہوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ مگر تمام رحمتیں من جانب اللہ ہیں خواہ وہ عارضی ہوں یا مستقل ہوں۔

اس آیت میں کلمہ "سرتھو" دو بار آیا ہے۔ یہ اس حقیقت کی تاکید کے لیے ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور اس کی تدبیر کو اپنے نفس میں محسوس کرتا ہے بشرطیکہ غلط تعلیم و تربیت اس کا راستہ شرک کی طرف نہ موڑ دے۔ اس مقام پر اس نکتے کا ذکر بھی لازم ہے کہ "اذا قصو منہ" میں ضمیر "منہ" کا مرجع ذات الہی ہے۔ اس سے اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ تمام نعمتیں اسی کی طرف سے ہیں۔ بہت سے مفسرین نے (مثلاً مصنفین المیزان، تمبیان، ابوالفتح رازی) اس ضمیر کا یہی مفہوم لیا ہے۔ اگرچہ بعض دیگر مفسرین نے (جیسے کہ فخر رازی) اس ضمیر کا مرجع "حصر" بتایا ہے اور آیت کے یہ معنی سمجھے ہیں۔

"خدا جس وقت مضرت اور تکلیف کے بعد ان کی طرف اپنی رحمت بھیجتا ہے۔ تو ایک گروہ بشرک ہو جاتا ہے۔" اگر آیت کا یہ مفہوم سمجھا جائے تو اس مقام پر حرف "من" بدلیت کے معنی دیتا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ آیت کے ظاہری معنی کے لحاظ سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں ان کم ظرف مشرکین کی تنبیہ و تہدید کے لیے کہ جو نعمات الہی کے حصول کے بعد اللہ کو بھول بھلتے ہیں، فرمایا گیا ہے: انھیں ہماری نعمتوں کا انکار کرنے دو اور جو کچھ ان کے امکان میں ہے انھیں کرنے دو۔ (لیکھو! ہا اتیناھو)۔

جتنا بھی تمہارے امکان میں ہے اس دنیا کی رُوڈ گزرنے والوں سے فائدہ اٹھا لو، (فتمتعوا)۔

مگر تم جلد ہی اپنے بُرے اعمال کا نتیجہ دیکھ لو گے: (صوف تعلمون)!

آیت ۳۳: "لیکھوا" کی ابتدا میں لام "ام" کہہ اور یہ امر تہدید کے لیے ہوتا ہے اور "تمتعوا" بھی دوسرا ہے۔

اس آیت میں تہدید کا پہلو موجود ہے۔ ہرچیز کے اول (یعنی "لیکھوا") امر غائب کی صورت میں ہے اور دوسرا یعنی "تمتعوا" امر حاضر کی صورت میں ہے۔ مگر اگر خدا نے مشرکین کو ابتدا میں غائب فرض کیا۔ اس کے بعد تہدید شدید کے لیے انھیں حاضر قرار دے کر غالب کرتا ہے مگر بعض مفسرین نے اس لام کو لام عاقبت سمجھا ہے۔ یعنی آخر کار انھوں نے خدا کی نعمتوں کا انکار کیا۔ مگر پہلے معنی زیادہ فوڈل ہیں۔

اگرچہ بظاہر آیت کے مخاطب مشرکین ہی ہیں۔ لیکن اگر آیت کا مفہوم وسیع ہو تو کچھ بعید نہیں کہ اس میں وہ سب لوگ شامل ہوں جو نعمات الہی سے فائدہ اور لطف تو اٹھاتے ہیں، مگر ان نعمتوں کو مستم اور بخشے دلے کو بھول جاتے ہیں۔ یہ واضح ہے کہ اس موقع پر فعل امر کا استعمال تہدید کے لیے ہے۔

آیت ما بعد میں گروہ مشرکین کو قصور وار ثابت کرنے کے لیے ان کے خلاف سرزنش کو سوال کے پیرائے میں ادا کیا گیا ہے: کیا ہم نے ان پر کوئی دلیل حکم نازل کی ہے، جو انھیں راہ بشرک پر چلنے کی لفظاً ترغیب دیتی ہے۔ (ان انزلنا علیہم سلطاناً فھو ینکلمھم بما کانوا بہ یشرکون)۔

کلمہ "۲۱" یہاں استغناء کے لیے ہے۔ یہ استغناء انکاری برائے تو بیخ ہے۔

یعنی انسان راہ و رسم شرک کا اتباع یا تو مدائے فطرت کی وجہ سے کرتا ہے یا بحکم عقل، یا بدایت الہی کی وجہ سے، اور یہ تمینوں باتیں محال اور ناشدنی ہیں کیونکہ جب وہ مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں تو ان کی فطرت اسلیہ ظاہر ہوتی ہے اور وہ خدا سے دامن کو پکارتی ہے۔ نیز عقل بھی انھیں سلامت روی کا مشورہ دیتی ہے کہ اس کا سہارا تلاش کرو کہ جو "واہب النعم" ہے۔ (بدون احسان نعمتیں بخشے والا ہے)۔

آخر میں حکم الہی کا معاملہ دہرہ جاتا ہے۔ سو اس آیت میں اس کی بھی نفی کی گئی ہے کہ ہم نے انھیں ہرگز ایسا حکم نہیں دیا۔ اس بنا پر اعتقاد شرک کے لیے ان کے پاس کوئی قابل قبول بنیاد نہیں ہے! کلمہ "سلطان" کا معنی وہ شے ہے جو فتح مندی اور تسلط کا موجب ہو مگر اس مقام پر یہ کلمہ ایسی دلیل کے لیے استعمال ہوا ہے جو حکم اور قلب کو مطمئن کرنے والی ہو۔

کلمہ "یشکلم" (یعنی کلام کرتی ہے) ایک مجازی اسلوب ہے۔ جو کسی دلیل کے واضح ہونے کے لیے بولا جاتا ہے۔ یعنی یہ ایک ایسی دلیل ہے جو انسان سے کلام کرتی ہے۔

بعض مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس مقام پر کلمہ "سلطان" کے معنی فرشتے ہیں۔ اگر یہ معنی درست سمجھ جائیں تو "تکلم" کے مجازی نہیں بلکہ حقیقی معنی لیے جائیں گے یعنی ہم نے ان کی طرف کوئی ایسا فرشتہ نہیں بھیجا جو بشرک کا پیغام لے کر گیا ہو اور اس موضوع پر اُس نے ان سے گفتگو کی جو۔

مگر پہلی تفسیر زیادہ واضح ہے۔

زیر نظر آیات میں سے آخری آیت (۳۶) جس میں ان (مشرک) کم ظرف جھلا کی طرز فکر اور نفسیاتی کیفیت کا نقشہ کھینچا گیا ہے) کے الفاظ یہ ہیں کہ: ہم جس وقت لوگوں کو اپنی رحمت سے سرفراز کرتے ہیں تو وہ خوش اور مغرور ہو جاتے ہیں۔ مگر جب انھوں نے جو اعمال انجام دیئے ہیں ان کے نتیجے میں انھیں رنج اور تکلیف پہنچتی ہے تو وہ مایوس اور ناامید ہو جاتے ہیں:

(وَإِذَا ذُقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوا بِهَا وَإِنْ تُصِيبُوا سَيْئَةً بِمَا قَدَّمْتُمْ إِلَيْنَا
إِذَا هُمْ يَفْتَنُونَ)

جب کہ راست باز مومنین وہ ہیں کہ نہ تو وہ نعمت و غنائم کے وقت غرور و غفلت میں مبتلا ہوتے ہیں اور نہ مصیبت کے وقت اُن پر یاس و نا اُمیدی طاری ہوتی ہے۔ وہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ نعمت عطیۃ الہی ہے۔ اس لیے وہ اس کے لیے خدا کا شکر کرتے ہیں اور مصیبت کو وہ آزمائش و امتحان یا اپنے اعمال کا نتیجہ سمجھتے ہیں لہذا وہ صبر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے ہیں۔ جب کہ بے ایمان لوگ ”غرور“ اور ”یاس“ کے درمیان بے قرار ہوتے ہیں تو بایمان افراد ”شکر اور صبر“ کے درمیان مطمئن ہوتے ہیں۔

اس آیت سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ کم از کم انسان کو پیش آنے والی مصیبتوں اور پریشانیوں کا ایک حصہ اُس کے اعمال اور گناہوں کا نتیجہ ہوتا ہے اور خدا اس ذریعے سے اُن کی اصلاح اور اُن مصیبت سے پاک کر کے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے۔

اس مقام پر یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ جملہ ”فرحوا بہا“ صرف نعمت یا کثرتِ امان ہونے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ ایسی خوشی مراد ہے جس میں ایک قسم کی سستی اور بے خبری بھی شامل ہو جیسے کہ اُن کم مایہ لوگوں کی حالت ہوتی ہے جن کے پاس اچانک دولت آجائے۔ مگر نہ ایسی خوشی اور مسرت جس میں شکر خدا اور توبہ الی اللہ بھی شامل ہو بُری چیز نہیں ہے بلکہ اُس کا تو حکم دیا گیا ہے۔

قل بفضل اللہ وبرحمته فبذلک فلیفرحوا (یاس۔ ۵۸)۔

اس کے بعد ”بما قدمتم اید یھو“ کہہ کر گناہوں کو باحقوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اکثر کام باحق ہی سے انجام دیتا ہے۔ اگرچہ دل، آنکھ اور زبان سے بھی گناہ ہوتے ہیں۔ لیکن اُن اعمال کی کثرت ہے جو باحقوں سے کیے جاتے ہیں۔ اس لیے کلمہ ”ایدئی کو منتخب کیا گیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس آیت اور آیت ۳۳ کے مضمون میں تضاد نہیں ہے؟

کیونکہ اس آیت میں مُشکرکین کی مایوسی کا ذکر اُس حالت میں ہے، جب کہ وہ مصائب میں مبتلا ہوں جب کہ آیت گزشتہ (۳۳) میں یہ بیان ہے کہ وہ غفلتوں اور مشکلات کے وقت خدا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ایک ہی کیفیت حال کا نتیجہ اُس آیت (۳۳) میں ذات الہی سے اُمید درجاً ہے اور اس آیت میں مایوسی ہے۔

لیکن اگر ایک نکتہ پر غور کیا جائے تو اس سوال کا جواب مل جاتا ہے۔ وہ یہ کہ گزشتہ آیت میں تمام زبیاں رسال امور شامل ہیں مثلاً: طوفان، زلزلہ یا اور قسم کی آفات ارضی و سماوی کہ اُن کے نزل کے وقت عام آدمی خواہ وہ موصد ہوں یا متحرک خدا کو پکارتے ہیں اور یہ فطرت توحیدی کی ایک علامت ہے۔

زیر بحث آیت میں یہ مذکور ہے کہ گناہوں کا انسان کے ضمیر پر کیا ردّ عمل ہوتا ہے اور اُس سے مایوسی پیدا ہوتی ہے کیونکہ بعض افراد ایسے بھی ہیں کہ اگر اُن سے عمل خیر سرزد ہوتا ہے تو مغرور ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو عذاب الہی

سے محفوظ سمجھنے لگتے ہیں اور جب وہ کوئی عمل بد انجام دیتے ہیں تو اُن کے جذبات اس کے برعکس ہوتے ہیں اور اُن پر سرتا سر رحمتِ خدا سے مایوسی چھا جاتی ہے۔

جب کہ وہ عجب اور غرور بھی مذموم ہے اور رحمتِ خدا سے یہ یاس اور نا اُمیدی بھی نازیبا ہے۔ اس لیے دونوں آیات میں جو مضامین ادا کیے گئے ہیں وہ مختلف پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں۔

۳۷- أَوْ لَعْنُوا أَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ
إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝

۳۸- فَاتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ ۚ ذَلِكَ
خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

۳۹- وَمَا آتَيْتُم مِّن رَّبِّ لَيْلِبُوا فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرِبُوا
عِنْدَ اللَّهِ ۚ وَمَا آتَيْتُم مِّن زَكَاةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ ۝

۴۰- اللَّهُ الَّذِي خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يَرْيَبُكُمْ
ثُمَّ يُحْيِيكُمْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَفْعَلُ
مِنْ ذَٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۚ سُبْحٰنَهُ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝

ترجمہ

۳۷- کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ خدا جس کے لیے چاہتا ہے روزی کو فراخ اور تنگ کر دیتا ہے، بے شک اس میں ایماندار لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

۳۸- پس تو قریبیوں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرتا رہ۔ یہ امر ان لوگوں کے لیے

۳۹- جو رضائے خدا کے طالب ہیں بہتر ہے اور ایسے ہی لوگ نجات پانے والے ہیں اور تم جو سو دیتے ہو تاکہ لوگوں کے مال میں افزائش ہو تو خدا کے نزدیک اس میں افزائش نہیں ہوتی اور تم جو بطور زکوٰۃ ادا کرتے ہو اور صرف رضائے الہی کے طلب گار ہوتے ہو، جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہی دوگنا اجر پانے والے ہیں۔

۴۰- خدا کی ذات ہی وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، پھر رزق دیا۔ پھر وہ تمہیں مار دے گا اور پھر زندہ کرے گا۔ تم نے خدا کے لیے جو شریک قرار دیئے ہیں، کیا ان میں سے کوئی ایسا ہے کہ ان کاموں میں سے کوئی کام کر سکے؟ اس سے برتر و متزہ ہے کہ اس کے لیے شریک قرار دیں۔

تفسیر

پہلی زیر بحث آیت میں بھی گزشتہ مقامات کی طرح "تفسیر ربوبیت" کا تذکرہ ہے۔ اور جیسا کہ آیات ماقبل میں آچکا ہے بعض کم ظرف لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب ہم انہیں اپنی نعمتیں عطا کرتے ہیں تو وہ مغرور ہو جاتے ہیں اور جب وہ کسی بلایا مصیبت سے دوچار ہو جاتے ہیں تو مالوس ہو جاتے ہیں۔ اسی نسبت سے اس آیت میں فرمایا گیا ہے: کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ خدا جس کے لیے چاہتا ہے روزی فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ (اولو پروا ان اللہ یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر)۔

جب انسان نعمتوں سے غمنی ہو جائے تو یہ حالت اس کے لیے عذر، سرکشی اور یاد الہی کی فراموشی کا باعث نہ ہو بلکہ اور سلب نعمات یا اس اور نا اُمیدی کا باعث نہ ہو جائے کیونکہ: روزی کی وسعت اور تنگی خدا کے ہاتھ میں ہے کبھی اس کی مسکنت فراخی میں ہوتی ہے اور کبھی تنگی میں۔

یہ درست ہے کہ یہ عالم عالم اسباب ہے، جو لوگ غننی اور سخت کوشش میں، عام طور پر وہ زیادہ کماتے ہیں اور خوش حال ہیں۔ بخلاف ازیں کابل اور کم کوشش لوگ عسرت میں رہتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ کیونکہ کبھی ایسا بھی ہونے میں آتا ہے کہ نہایت لائق اور جہد و جد کرنے والے لوگ جتنی بھی زیادہ کوشش کرتے ہیں، کامیاب نہیں ہوتے۔ اس کے بالکل ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں جو کسب معاش میں بہت کوشش نہیں کرتے، سحران کے لیے ہر طرف سے روزی کے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔

یہ مستثنیات اس لیے ہیں تاکہ خدا یہ بتا دے کہ اس عالم اسباب میں جو ترغیبات TEMPTATIONS ہیں ان کا نتیجہ یہ نہ ہو کہ انسان عالم اسباب میں ہی گم ہو جائے۔ انسان کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اس کارخانے کی پشت پر ایک قوی ہاتھ ہے جو اُسے پھلا رہا ہے۔

اس عالم نیرنگ میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی مقصد کے لیے خواہ کتنی ہی کوشش کر لے اور ہر دروازے پر دستک دے لے مگر اُس کے لیے ہر راستہ بند ہوتا ہے۔ کبھی اُس کے لیے اتنی آسانی پیدا ہو جاتی ہے کہ ہنوز وہ کسی دروازے کے قریب بھی نہیں آتا کہ اُس کے لیے کھل جاتا ہے۔

ہم اپنی زندگی میں اس قسم کے واقعات دیکھتے رہتے ہیں کہ ایک شخص کو نعمت کا غرور ہے اور دوسرا آدمی غربت اور افلاس کی وجہ سے مایوس ہے۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ہمارے ارادوں اور خواہشات کے پیچھے ایک قوی ہاتھ ہے جو کام کر رہا ہے۔ اس لیے آیت کے آفریں قرآن فرماتا ہے: **اِنَّ مَعَ كُلِّ مُلْكٍ لَّيَدٌ اُولٰٓئِكَ لِيُنزِلُوهُم مِّنْ سَمٰوٰتٍ مَّوَدَّعًا** (ان کے ساتھ ہر بادشاہ کی ہاتھ ہے جو ان لوگوں کے لیے آسمانوں سے مودعہ لائے ہیں خدا کی قدرت اور عظمت کی نشانیاں ہیں۔) (ان فی ذالک لآیات لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ)

بعض مفسرین نے اس مضمون کی ایک حکایت بیان کی ہے:

کسی نے ایک عالم سے سوال کیا:

مالدلیل علی ان للعالم صانعا واحدا

اس امر کی کیا دلیل ہے کہ اس عالم کا ایک صانع کیسا ہے؟

اُس عالم نے جواب دیا: میں دلیلیں ہیں۔

ذل اللیب ، وفقر الادیب ، وسقم الطیب

اول یہ کہ اہل فرد و حکمت دنیا میں ذلیل ہیں۔

دوم یہ کہ اہل علم و ادب فقر و فاقہ میں مبتلا ہیں۔

سوم یہ کہ طبیب بھی بیمار ہوتے ہیں۔

بے شک ان مستثنیات کا وجود اس امر کی دلیل ہے کہ چارہ کار کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔

چنانچہ امیر المؤمنین حضرت علیؑ سے ایک حدیث مروی ہے:

عرفت الله سبحانه بفسخ العزائم وحل العقود ونقض الهمم

میں نے اپنے خدا کو اس بات سے پہچانا کہ عوام حکم فرما رہے ہیں اور کبھی گریں

کھل جاتی ہیں اور کبھی قوی ارادے ٹوٹ جاتے ہیں اور ناکام ہو جاتے ہیں۔

اور چونکہ ہر نعمت الہی اپنے ساتھ ذمہ داریاں اور فرائض بھی لاتی ہے۔ اس لیے آیت مابعد میں رُوئے سخن پیغمبر کی

لہذا تفسیر روح البیان، جلد ۲، صفحہ ۲۹ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

کلمہ نوح البلاغ، صفحات قصار جلد ۲۵۰۔

طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جب کہ ایسا ہے تو تم اپنے اعزاء و اقارب کا حق ادا کرو۔ اسی طرح سکینوں اور سافروں کی مدد کرو (فات ذالقرنیٰ حقہ والمسکین وابن السبیل)۔

جب تمہارا رزق وسیع ہو تو یہ نہ سمجھو کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ بلا شرکت غیرے تمہارا ہی ہے۔ بلکہ تمہارے مال میں دوسروں کے بھی حقوق ہیں۔ اُن میں سے تمہارے اعزاء میں اور وہ حاجت مند لوگ ہیں جو شدت فقر سے ناتوان ہو گئے ہیں، اسی طرح وہ آبرو مند لوگ ہیں جو دُلمن سے دُور حالت مسافرت میں حادثات پیش آنے کی وجہ سے محتاج ہو کر سفر جاری نہیں رکھ سکتے۔

کلمہ حقہ سے اس واقعت کا اظہار مقصود ہے کہ مذکورہ بالا لوگ انسان کے مال و دولت میں شریک ہیں۔ اگر انسان انہیں کچھ بطور امداد دیتا ہے تو درحقیقت وہ اُن کا حق ادا کر رہتا ہے اور اُن پر کچھ احسان نہیں کر رہا۔

مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت کا مخاطب خصوصیت سے جناب رسالت مآب اور اُن کے اعزاء و اقارب ہی کو سمجھا ہے۔

جناب ابوسعید خدری اور دوسرے اصحاب سے ایک مشہور روایت میں یہ نقل ہوا ہے:

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہؐ نے "ذک" جناب فاطمہ کو بخش دیا۔

روایت کے الفاظ یہ ہیں:

لما نزلت هذه الآية على النبي اعطى فاطمة فذكا وسلمة اليها

امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ نے بھی اس مضمون کو لعینہ بیان کیا ہے۔ امام جعفر صادقؑ کی زبانی ایک روایت ہے جس میں اس گفتگو کا ذکر ہے جو بانسے اسلام حضرت فاطمہ زہراؑ اور حضرت ابوبکر کے درمیان ہوئی تھی۔ اُس میں یہ مضمون نہایت تفصیل سے مذکور ہے۔

مگر مفسرین کی ایک اور جماعت نے اس آیت میں خطاب کے عمومی معنی مراد لیے ہیں۔ جس میں جناب رسول اللہؐ اور اُن کے علاوہ سب لوگ شامل ہیں۔

اس تفسیر کے مطابق ہر شخص کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے اعزاء و اقارب کے حق کو فراموش نہ کرے۔

مگر ان دونوں تفسیر میں باہم کوئی تضاد نہیں ہے۔ بلکہ دونوں قابل تسلیم اور اپنے مقام پر درست ہیں۔ باہم وجہ کہ آیت کا مضموم وسیع ہے اور جناب پیغمبر، اُن کے اقربا، بالخصوص جناب فاطمہ زہراؑ اُس کی مصداق کامل ہیں۔

یہ امر واضح ہے کہ مذکورہ بالا تفسیر میں سے کوئی بھی اس آیت کے معنی ہونے کی تردید نہیں کرتی۔ کیونکہ آیت کا مضموم عام ہے جس پر مکمل ہی عمل ہو سکتا تھا اور مدینہ میں بھی یہاں تک کہ جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کو اس آیت کی اساس پر نیک کی جاگیر عطا کرنا کاملاً قابل قبول ہے۔

لہذا تفسیر مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

تذکرہ فضائل جلد ۲، صفحہ ۱۸۷ بحوالہ تفسیر صلحی ابراہیم۔

اس مقام پر صرف جملہ ”لما نزلت هذه الآية“ کے مفہوم کی وضاحت باقی رہ جاتی ہے۔

جناب ابوسعید خدری کی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ نے فدک کی جاگیر جناب فاطمہؑ کو اس آیت کے نازل ہونے کے بعد عطا کی لیکن اگر اس مقام پر (لما) کے معنی علت کے لیے جائیں تو نہ کہ زمانہ خاص کے لیے تو یہ مسلہ بھی حل ہو جاتا ہے اور روایت کا یہ مفہوم ہو جائے گا کہ:

پیغمبرؐ نے خدا کے اس حکم کے مطابق فدک جناب فاطمہؑ کو عطا کیا۔

علاوہ ازیں بعض آیات کبھی دود فخر بھی نازل ہوئی ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہر قسم کے مستحق اور نیاز مند افراد میں سے صرف ان تین قسم کے لوگوں کا ذکر ہی کیوں ہوا ہے؟ ممکن ہے کہ یہ اس وجہ سے ہو کہ ان تین قسم کے افراد کی اہمیت زیادہ ہے۔ کیونکہ رشتہ داروں کا حق تو سب سے فائق ہے اور محروم اور حاجت مند لوگوں میں سے مسکین اور راہ سفر میں در ماندہ لوگ سب سے زیادہ مستحق ہیں۔

فرازی نے اس سوال کی توجیہ میں ایک نکتہ بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ وہ آٹھ قسم کے لوگ جنہیں زکوٰۃ کی رقم دینی چاہیے، انہیں اسی صورت میں دی جاسکتی ہے جب کہ صاحب سال پر اواسے زکوٰۃ واجب ہو۔ مگر آیت میں جن تین قسم کے لوگوں کا ذکر ہوا ہے، ہر حالت میں ان کی مدد کرنا لازم ہے۔ کیونکہ بعض رشتہ دار تو واجب النفقہ ہوتے ہیں اور ”مسکین“ وہ محروم و فقیر ہے کہ اگر اس کی مدد نہ کی جائے تو اکثر اوقات اس کی جان کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ممکن ہے کہ کوئی مسافر ایسے حالات میں گرفتار ہو کہ مدد نہ پہنچنے کی صورت میں اس کی جان پر یں جائے۔ علاوہ بریں آیت میں ان تین قسم کے لوگوں کا جس ترتیب سے ذکر کیا گیا ہے وہ ان کے اہمیت کی مناسبت سے ہے۔

ہر حال آیت کے اخیر میں نیکو کار لوگوں کی تشویق اور ضمانت اس بخشش کی شرط قبولیت کے طور پر فرمایا گیا ہے: یہ کام ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو صرف رضائے الہی کے طالب ہیں۔ (ذلک خیر للذین میریدون وجہ اللہ)۔ اور جو لوگ کہ ایسے کارہائے خیر انجام دیتے ہیں وہ نجات یافتہ ہیں۔ (واولئک هم المفلحون)۔

وہ اس جہان میں نجات یافتہ ہوں گے۔ کیونکہ ”الفاق“ دنیاوی زندگی میں اچھی عجیب برکات کا موجب ہوتا ہے اور آخرت میں خدا کی نازد میں انفاق دینی ترین اعمال میں سے ہوگا۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ آیت بالا میں کلمہ ”وجہ اللہ“ سے خدا کی جسمانی صورت مراد نہیں ہے کیونکہ وہ صورت جسمانی نہیں رکھتا بلکہ اس کلمہ سے مراد خدا کی ذات ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف انفاق اور رشتہ داروں اور دیگر صاحبان حقوق کا حق ادا کرنا ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب کچھ اخلاص اور پاک نیت کے ساتھ ہو۔ اس میں کسی قسم کی ریاکاری اور خود نمائی نہ ہو اور نہ احسان و تحقیر کا جذبہ ہو۔ دینے والا کسی قسم کے بدلے کا منتظر بھی نہ رہے۔

اس مقام پر یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ بعض مفسرین کے قول کے خلاف جنہوں نے یہ لکھا ہے کہ داخل بہشت ہونے کے لیے ”الفاق“ ”وجہ اللہ“ کا مصداق نہیں ہے، حقیقت امر یہ ہے کہ انسان جو کام بھی انجام دیتا ہے اس کا

کسی نہ کسی طرح خدا سے کچھ تعلق ہوتا ہے۔ وہ کام خواہ اس کی رضا کے لیے ہو یا حصول اجر و ثواب یا اس کے عذاب سے نجات پانے کے لیے ہو۔ یہ سب کام وجہ اللہ ہیں۔ اگرچہ انسان کے لیے مرحلہ عالی و کامل یہ ہے کہ ہر کام کرتے وقت اس کی نظر میں خدا کی عبودیت اور اطاعت کے سوا کوئی اور مقصد نہ ہو۔

آیت مابعد میں اس بحث کی مناسبت سے جو اتفاق خالص کے متعلق جاری تھی، اتفاق کی دو صورتوں کا ذکر ہے۔ اول تو وہ اتفاق ہے جو محض لوجہ اللہ کیا جائے اور دوسرے وہ جو حصول مال دُنیا کے لیے کیا جائے۔ اس سلسلے میں خدا فرماتا ہے: تم جو مال اس مقصد سے خرچ کرتے ہو کہ اس سے افزائش ہو اور لوگوں کے احوال میں اضافہ ہو جائے تو خدا کے نزدیک اس میں کچھ اضافہ نہ ہوگا۔ البتہ تم جو بطور زکوٰۃ صرف رضائے الہی کے لیے دیتے ہو، اس قسم کے لوگ کسی گناہ اور ثواب کے مستحق ہیں۔ (وما آتیتم من رباً لیربوا فی اموال الناس فلا یربوا عند اللہ وما آتیتم من زکاة تریدون وجہ اللہ فاولئک هم المضعفون)۔

اس آیت میں جملہ دوم کا مفہوم ”یعنی زکوٰۃ دینا اور راہ خدا میں انفاق کرنا اور ثواب کثیر کا موجب ہے“ واضح ہے لیکن جملہ اول کے مفہوم کی کہ ”ربا“ درحقیقت بمعنی افزائش ہے۔ مفسرین نے گونا گوں تفسیریں کی ہیں۔ ان میں سے پہلی تفسیر جو سب سے زیادہ واضح اور آیت کے مفہوم سے ہم آہنگ تر، اور ان روایات سے ہم ساز ہے جو اہل بیتؑ سے منقول ہیں، یہ ہے کہ اس مقام پر ”ربا“ سے مراد وہ تحالفت میں جو بعض لوگ دوسروں کے لیے بالخصوص صاحبان دولت و ثروت کے لیے لے جاتے ہیں اور ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان اہل دولت سے زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر منفعت حاصل کریں۔

یہ امر بدیہی ہے کہ اسرا کو جو ہدیے پیش کیے جلتے ہیں انہیں مستحق امداد سمجھ کر تو نہیں پیش کیے جاتے اور نہ یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ لوگ حاجت مند ہیں اس لیے پہلے ان کی مدد کرنی چاہیے بلکہ مدد نظر یہ ہوتا ہے کہ یہ ہدیہ ایسی جگہ دیا جائے جہاں سے زکوٰۃ حاصل ہو سکے۔ یہ فطری امر ہے کہ اس طور کے تحالفت جن میں شائبہ اخلاص نہیں ہوتا، اخلاق فقط نگاہ سے ان کی کوئی قدر نہیں ہے۔ اس بنا پر اس آیت میں ”ربا“ سے مراد ہدیہ اور عطیہ ہی ہے اور جملہ ”لیربوا فی اموال الناس“ کا مفہوم لوگوں سے زیادہ فائدہ اٹھانا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کا فائدہ حاصل کرنا حرام تو نہیں ہے کیونکہ اس معاملے میں (ہدیہ دینے اور لینے والے کے درمیان) کوئی شرط اور قرار واد نہیں ہوتی۔ مگر اخلاقاً اس کی کوئی قدر نہیں ہے۔ امام جعفر صادقؑ سے متعدد احادیث میں مروی ہے کہ اس ربا سے مراد ”ربائے حلال“ ہے۔ بمقابلہ ”ربائے حرام“ کیونکہ اس میں شرط و قرار واد ہوتی ہے۔

آیت بالا کی تفسیر میں ایک حدیث کتاب تہذیب الاحکام میں امام جعفر صادقؑ سے یوں منقول ہے:

هوہدیتک الی الرجل تطلب منه الشواب افضل منھا فذلک ربی یؤکل۔

اگر کسی کو ہدیہ دینے کا مقصد یہ ہے کہ تم اس آدمی سے زیادہ منفعت حاصل کرو تو یہ ربائے حلال ہے۔

امام جعفر صادقؑ ہی سے ایک اور حدیث یوں منقول ہے :

الرجل یاربائان احدہما حلال والآخر حرام فاما الحلال فہو ان یقرض الرجل اخاه قرضاً یرید ان یریدہ ویعوضہ باکثر مما یاخذہ بلا شرطینہما ، فان اعطاه اکثر مما اخذہ علی غیر شرطینہما فہو مباح لہ ، ولینس لہ عند اللہ ثواب فیما اقرضہ ، وهو قولہ فلا یربوا عند اللہ ، واما الحرام فالرجل یقرض قرضاً ویشتراہ یرد اکثر مما اخذہ فہذا ہوا الحرام .

”ربا“ دو طرح کا ہے۔ ایک حلال اور دوسرا حرام۔ حلال وہ ہے کہ انسان اپنے کسی مسلمان بھائی کو اس اُمید پر قرض دے کہ جب وہ یہ رقم واپس دے گا تو اصل پر کچھ اضافہ کر دے گا۔ مگر قرض دہندہ اور مفروض کے درمیان اس قسم کی کوئی شرط نہ ہو۔ اس صورت میں اگر قرض لینے والا غیر مشروط طور پر اصل زر پر کچھ اضافہ کر کے واپس کرنا ہے تو فاضل رقم قرض دہندہ کے لیے حلال ہے۔ لیکن اس صورت میں اگر وہ قرض نہیں ملے گا جو ایک مسلمان بھائی کی بوقت ضرورت مدد کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ آیہ قرآنی ”فلا یربوا عند اللہ“ کا یہی مفہوم ہے۔ حرام ربا وہ ہے کہ انسان کسی کو اس شرط پر قرض دے کہ وہ اصل زر پر اتنی رقم اضافہ کر کے واپس کرے گا۔ یہ ”ربا“ حرام ہے۔

اس آیت کی ایک اور تفسیر بھی بیان کی گئی ہے کہ یہاں ”ربا“ سے مراد ربائے حرام ہے۔ اس تفسیر کے مطابق مفہوم قرآنی یہ ہے کہ ”ربا“ اور مخلصانہ اتفاق میں موازنہ و مقابلہ کیا جائے۔ وہ یہ کہ ”ربا“ اگرچہ بظاہر افزائش مال کا موجب ہے مگر یہ افزائش خدا کے نزدیک بے قدر ہے۔ حقیقی قدر و منزلت اتفاق فی سبیل اللہ کی ہے ان مطالب کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس آیت کو صحت ٹھونک کے مسئلے کی تمہید یا مقدمہ سمجھا جاتا ہے کہ پیغمبرؐ کی ہجرت سے قبل وہ صرف ایک اخلاقی نصیحت کے طور پر بیان ہوا تھا۔ مگر ہجرت کے بعد قرآن کی تین سورتوں (سورہ بقرہ، آل عمران و نساء) میں بتدریج اس کی حرمت بیان ہوئی ہے۔ (اسی بنا پر ہم نے بھی تفسیر نمونہ کی جلد اول صفحہ ۶۲۹، (اُردو ترجمہ) پر اس کا ذکر کیا ہے)۔

لیکن ان دو معانی میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ البتہ آیت مذکورہ کی تفسیر ایسے وسیع معنی میں کی جاسکتی ہے کہ جس میں ربائے حلال اور ربائے حرام ہر دو شامل ہیں اور یہ دونوں ”اتفاق فی سبیل اللہ“ کے مقابلے میں رکھے جاسکیں لیکن آیت

کے الفاظ پر نظر کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تفسیر اقل ہی زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ ایسا کام کیا گیا ہے جس کا کوئی ثواب تو نہیں مگر وہ مباح ہے۔ کیونکہ یہ کہا گیا ہے کہ خدا کے نزدیک اس عمل کی پاداش نہیں ہے۔ اس کلام کی روح سے روشن ہے کہ یہ ربائے حلال ہی کے متعلق کہا جاسکتا ہے، جس میں نہ کوئی ثواب ہے نہ گناہ اور اس میں کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے جو خدا کے خشم و غضب کا باعث ہو۔ روایات اسلامی میں اس قسم کے معاملات کی مثالیں موجود ہیں۔

اس مقام پر اس نکتے کا ذکر بھی لازم ہے کہ آیت میں جو کلمہ ”مضعفون“ استعمال ہوا ہے، اگرچہ اسم فاعل ہے لیکن اس مقام پر ”مضعف کثرتہ“ یعنی بڑھانے والا کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ اس فرد کے معنی میں ہے جو مضعف اور کسی گناہ پر پانے والا ہے۔ کیونکہ زبان عربی میں بعض اوقات اسم فاعل ”مالک شے“ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے ”موسر“ وہ شخص جس کے پاس مال ہجرت ہو۔ یہ اسر بھی نظر سے پس پردہ نہ ہے کہ کلمہ ”ضعف و مضعف“ عربی زبان میں صرف دو چند کے معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ دو گنا کے علاوہ کسی گناہ بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے اور پسند آیت کم از کم دس گنا مفہوم ہے۔ جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے :

من جاء بالحسنة فله عشر امثالها (انعام - ۱۶)

اور یہ اجر بصورت قرض اٹھارہ گنا تک ملتا ہے۔ چنانچہ امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث منقول ہے :

علی باب الجنة مكتوب القرض بثمانية عشر والصدقة بعشر
بهشت کے دروازے پر تحریر ہے کہ قرض کا اجر اٹھارہ گنا ہے اور صدقے کا دس گنا ہے !

اور یہ اجر اتفاق فی سبیل اللہ کی صورت میں سات سو گنا تک پہنچ جاتا ہے۔ جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۶۱ سے یہ ثابت ہے۔

زیر بحث آخری آیت میں بار دیگر مباد و معاد کا ذکر ہے جو کہ اس سورہ کی بہت سی آیات کا بنیادی موضوع ہے۔ اس آیت میں خدا کو چار اوصاف سے متصف کیا گیا ہے تاکہ شرک کی نفی اور توحید کا اثبات ہو اور وقیع معاد پر بھی دلیل قائم ہو۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے : خدا ہی کی وہ ذات ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، اس کے بعد تمہارے لیے رزق دنیا کیا پھر تمہیں وہ ماردے گا اور پھر زندہ کرے گا۔ (اللہ الذی خلقکم شعور زفقو شرعیمیکو)۔ جن کو تم نے خدا کا شریک قرار دیا ہے کیا ان میں سے کسی میں بھی یہ قدرت ہے کہ وہ یہ کام کرے :
(هل من شركا نك من يفعل من ذالک من شئ)۔

خدا کی ذات اُن شکر کا ہے جو تم اس کے لیے تجویز کرتے تھے۔ سزا اور برتر ہے، (سبحانہ و تعالیٰ عما یشرکون) یہ امر مسلم ہے کہ مشرکین میں سے کسی کا بھی یہ اعتقاد نہ تھا کہ فاعل تخلیق بت ہیں، یا یہ کہ انھیں رزق پہنچانا بتوں کے اختیار میں ہے یا اُن کی حیات و مرگ کے مختار وہ ہیں کیونکہ وہ اُن خود ساختہ معبودوں کو اپنے اور خدا کے درمیان اٹل اور شفاعت کنندہ سمجھتے تھے، نہ کہ خالق آسمان و زمین اور نہ روزی و دہندہ۔ اس لیے قرآن میں یہ سوالات استہمام انگاری ہیں اور سوالات کی رُوح جواب میں نفعی کی متقاضی ہے۔

اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُس عہد کے مشرکین جن سے یہ خطاب ہے وہ حیات بعد الموت کے معتقد تھے تو پھر قرآن کی اس آیت میں خدا کی تین صفات بیان کر کے حیات بعد الموت کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟

مکن ہے کہ یہ اسلوب بیان اس وجہ سے ہو کہ (ہم نے مسئلہ معاد کی بحثوں میں ثابت کیا ہے) معاد اور حیات بعد از مرگ ایک فطری امر ہے۔ اس لیے قرآن نے اُن مشرکین کے مستحکمات کو ملحوظ نہیں رکھا بلکہ فطرت انسانی کو پیش نظر رکھا ہے۔

علاوہ بریں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ماہر خطیب جب کسی لیے شخص سے ہم کلام ہوتا ہے، ہو کسی مسئلے کا نتیجہ تو وہ اثبات، حجت کے لیے اُس مسئلے کو دوسرے اسے حقائق کے ساتھ ملا کر ذکر کرتا ہے جو سزا مقابل کے لیے قابل قبول ہوتے ہیں اور جب وہ دیکھتا ہے کہ اُس کا نفس اثر پذیر ہے کے لیے آمادہ ہو چکا ہے تو پھر وہ اُس اثبات، طلب مسئلے پر قاطعیت کے ساتھ گفتگو کرتا ہے۔ تاکہ وہ مخاطب کے ذہن نشین ہو جائے اور اُس سے انکار بن نہ پڑے۔

ان سبب، امور کے علاوہ خدا کی اُس قدرت فلتی میں جس نے بار اقل زندگی بخشی ہے اور اُس اختیار میں جس سے وہ بعد از مرگ زندگی عطا کرے گا ناقابل انقطاع تعلق ہے اور اسی منطقی رابطے کی وجہ سے دونوں زندگیوں کا ایک ہی جگہ ذکر کیا گیا ہے۔ برصالح قرآن کہتا ہے: جب کہ (تخلیق رزق، حیات و موت) یہ جملہ امور خدا کے اختیار میں ہیں تو عبادت و پرستش بھی صرف اُس کی ہونی چاہیے

نیز "سبحانہ و تعالیٰ عما یشرکون" سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ اُن مشرکین نے ذات احدیت کے مرتبے کو غیر معمولی طور پر اُس کے مقام ارفع سے نیچے گرا دیا تھا اور اس ذات کو اپنے خود ساختہ معبودوں کی صف میں جگہ دے دی تھی۔

۴۱- ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝

۴۲- قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلُ كَانْ أَكْثَرُهُمْ مُشْرِكِينَ ۝

۴۳- فَاقْرَأْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا مَرَدَّ لَهُ مِنَ اللَّهِ يَوْمَئِذٍ يُصَدِّعُونَ ۝

۴۴- مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۚ وَمَنْ عَمِلْ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ ۖ يَهْدُونَ ۝

۴۵- لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْ فَضْلِهِ ۗ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِينَ ۝

ترجمہ

۴۱- لوگوں کے اعمال کی وجہ سے خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ انھیں اُن کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے۔ شاید کہ وہ خدا کی طرف رجوع کریں۔

۴۲- ان سے کہہ دو: زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ اُن لوگوں کا انجام کیا ہوا جو تم سے

پہلے تھے۔ ان میں سے اکثر مشرک تھے۔

۴۳۔ تم اس دن سے پہلے جو خدا کی طرف سے آکر رہے گا اور اسے کوئی روک نہیں سکتا اپنا رخ مستقیم اور پائیدار دین کی طرف کیے رہو۔ اور اس روز لوگ مختلف جماعتوں میں بٹ جائیں گے۔

۴۴۔ جس شخص نے کفر کیا اُس کا کفر اسی کے لیے زیاں رساں ہے اور جو لوگ کہ اعمال صالح انجام دیتے ہیں وہ (خدا کے اجر و ثواب کی اپنے حق ذمے کے لیے مہیا کرتے ہیں۔

۴۵۔ یہ اس لیے ہے تاکہ خدا ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں و اعمال صالح انجام دیتے ہیں اپنے فضل سے جزا دے۔ یقیناً وہ کافروں کو دوست نہیں رکھتے۔

تفسیر

لوگوں کے اعمال ہی سرچشمہ فساد ہیں:

گزشتہ آیات میں شرک کا ذکر تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ مناسک کی جزا توحید کا ہے اور شرک اختیار کرنا ہے۔ اس لیے زیر نظر آیات میں اقل یہ کہا گیا ہے کہ لوگوں کے اعمال کے نتیجے میں غشی ہو جائے گی اور فساد ظاہر ہو گیا ہے۔ (ظہر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس)۔ خدا چاہتا ہے کہ لوگ اپنے اعمال کا رد عمل دیکھیں اور جو کام انھوں نے کیے ہیں ان سے بعض کا نتیجہ چکیں۔ (اس طرح) شاید اُن کی آنکھیں کھلیں اور اللہ کی طرف رجوع ہوں: (لیذیقنہم جنت اللہ علی عملہم یرجعون)۔

یہ آیت فساد اور گناہ کے باہمی ربط کے متعلق ایک وسیع معنی کی حامل ہے۔۔۔۔۔ کے گناہ اور بد اعمالیوں کا یہ نتیجہ نہ تو سر زمین مکہ و حجاز کے لیے مخصوص ہے اور نہ عصر پیغمبر کے لیے بحد نصیبی ہے۔۔۔۔۔ میں "تفسیر حقیقیہ" ہے جس میں معمول کا موضوع سے ربط و تعلق بیان کیا جاتا ہے۔

بر الفاظ دیگر۔ زمین پر جہاں بھی فساد ظاہر ہوتا ہے وہ لوگوں کی بد اعمالیوں کا نتیجہ ہے۔ اگر انسان غور کرے تو اس نتیجے میں بھی تربیت کا ایک پہلو ہے تاکہ لوگ اپنی بد اعمالیوں کا نتیجہ دیکھ کر توبہ کریں اور خدا کی طرف رجوع کریں۔

بعض مفسرین کا ترس ہے کہ اس آیت کا پس منظر وہ قحط اور خشک سالی ہے جو پیغمبر کی بد دعا کے نتیجے میں مشرکین مکہ کو پیش آئی تھی۔ اُس وقت بارش ہونا بند ہو گئی تھی، بیابان خشک سے خشک تر ہو گئے تھے یہاں تک کہ انہیں بحیرہ احمر میں پھلی کا شکار بھی نہیں ملتا تھا۔

بالفرض اگر یہ واقعہ تاریخی طور پر صحیح بھی ہو، تب بھی ایک جزوی واقعہ ہے جس پر آیت صادق آئی ہے اور یہ واقعہ اس آیت کو کسی مخصوص قوم یا جماعت کے فساد و گناہ تک محدود نہیں کرتا، نہ اس کا مصداق کسی خاص زمان و مکان تک ہے اور نہ اس کا باران اور خشک سالی تک محدود ہے۔

اس آیت کے متعلق جو نقطہ نگاہ ہم نے سطور بالا میں بیان کیا ہے اُس سے آشکار ہے کہ اس آیت کی تفسیر کے تحت اہل قلم نے جن محدود اور مقامی واقعات کو اس کا مصداق قرار دیا ہے وہ قابل قبول نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہ بعض مفسرین نے زمین پر فساد ("فساد فی البر") سے مراد قابل کے باغیوں، بائبل کا تامل مراد لیا ہے اور سمندر میں فساد ("فساد فی البحر") سے مراد وہ واقعہ مراد لیا ہے جو حضرت موسیٰ اور نضر میں ہوا کہ ایک بادشاہ نے ملتانوں کی کشتیاں ضبط کرنی چاہیں۔

یاد رہے کہ بعض مفسرین نے "فساد فی البحر" کے معنی لکھے ہوئے باتیان فساد کا ذکر کر دیا ہے اور ایسے حکمران مراد لیے ہیں جو اپنی اغراض کے لیے زمین اور سمندر کو فساد سے بھر دیتے ہیں۔

اس مقام پر یہ امکان ہے کہ اس قسم کے افراد موجب فساد ہوں، جو دنیا پرست اور خوشامد پسند ہوں اور ان کے زور کی وجہ سے لوگ اُن کی اطاعت اور فرماں برداری کی ذلت کو قبول کر لیں۔

لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ آیت کا احاطہ مصداق اتنا محدود نہیں ہے۔

مفسرین کی ایک جماعت نے "فساد فی البحر" کے معنی میں بھی اختلاف کیا ہے۔ اُن میں سے بعض کا یہ قول ہے کہ "بحر" سے مراد وہ شہر ہیں جو سمندر کے کنارے واقع ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ "بحر" سے مراد حاصل خیز، پربارخ و زراعت کے علاقے ہیں۔ ہمارے نزدیک کلمہ "بحر" کے معنی میں یہ تکلفات بلا دلیل ہیں کیونکہ اس کلمہ کے معنی مشہور ہیں۔ "بحر" سمندر کو کہتے ہیں۔ سمندروں میں کئی طرح سے فساد رونما ہو سکتا ہے۔ اول یہ کہ سمندر جو فواید پہنچتے ہیں وہ کم ہو جائیں، دوم یہ کہ اُس کے طوفان و تلاطم سے نقصان پہنچے۔ سوم یہ کہ سمندری لڑائیاں ہوں جیسا کہ آج کل جنگی بحری بیڑے لڑتے ہیں۔ آبدوزیں ہیں جو تباہی لاتی ہیں۔

جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے:

حیات دو اب البحر بالمطر فاذا كف المطر ظهر الفساد في البحر والبر وذا لك اذا كثرت الذنوب والمعاصي۔

سمندر میں رہنے والی مخلوق کی زندگی کا مدار بارش پر ہے۔ جب بارش نہیں ہوتی سمندر اور خشکی دونوں میں فساد برپا ہو جاتا ہے اور یہ اُس وقت ہوتا ہے جب

لوگوں کے گناہ کثیر ہو جاتے ہیں۔

حدیث مذکورہ بالا میں سمندری حیوانات کی زندگی کا جو ربط نزدل باران سے بیان کیا گیا ہے وہ تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ جب بارش کم ہوتی ہے تو سمندر میں پھلیوں کی تعداد بھی کم ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ہم نے بعض ساحل نشین کو کتنے شائبہ کہہ۔

سمندر کو بارش کا فائدہ صحرا سے زیادہ پہنچتا ہے۔

یہ امر کہ برد بحر میں فساد رونما ہونے کا انسانوں کے گناہوں سے کیا ربط ہے، ہمارے پاس اس کی اور توجیحات بھی ہیں۔ جن کا ان شاء اللہ نکات کی بحث میں ذکر آئے گا۔

آیت البعد میں زمین پر سیر کا حکم بایں صلمت دیا گیا ہے کہ قوموں کے ارتکاب گناہ کی وجہ سے زمین پر ظور فساد جو نتائج رونما ہوتے اس کے ثواب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ اس ضمن میں پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ ان لوگوں سے کہہ دو: تم زمین میں سفر کرو اور گزشتہ امتوں کے حالات کی تحقیق کرو اور ان کے اعمال اور ان کے نتائج کی تفتیش کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ تم سے پہلے جو قومیں ان مقامات میں آباد تھیں اور شرک و انکار پر مہر تھیں ان کا انجام کیا ہوا:

(قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبة الذین من قبیل کان اکثرہم مشرکین)۔

ان کے دیران شدہ قصور و محلات کو بر نظر عبرت دیکھو اور دیکھو کہ انھوں نے جو خزانے جمع کیے تھے وہ لٹ چکے ہیں۔ مشاہدہ کرو کہ ان کی وہ جماعت جسے اپنی قوت اور توانائی پر ناز تھا پرانہ ہو گئی ہے اور دیکھو کہ ان کی قبریں ٹوٹ پھوٹ کر دیران ہو گئی ہیں اور ان کی بلایاں گل سڑ گئی ہیں۔

ذرا دیکھو اور غور کرو کہ ان قوموں کے شرک اور ظلم و ستم کا انجام کیا ہوا۔ جاسے عبرت ہے کہ اگر وہ پرندوں کے آشیانے جلاتے تھے تو ان صیادوں کے گھر بھی کیسے برباد ہوتے ہیں۔

انبتہ ان میں سے اکثر افراد مشرک تھے؛ (کان اکثرہم مشرکین) اور یہ شرک اتم الفساد اور ان کی تباہی کا باعث ہوا۔

اس مقام پر یہ امر توجہ طلب ہے کہ آیات ماقبل میں جہاں خدا کی نعمتوں کا ذکر تھا اس وقت ترتیب یہ تھی کہ پہلے انسان کی تخلیق کو بیان کیا، پھر اسے روزی دینے کا ذکر کیا (اللہ الذی خلقک وثور زقک و مگر آیات زیر نظر میں جب خدا کے عذاب و سزا کا ذکر ہو رہا ہے تو پہلی تشبیہ یہ ہے کہ خدا قوموں کے گناہوں کی سزا میں پہلے تو ان سے اپنی نعمتیں سلب کر لیتا ہے۔ اس کے بعد ان کے شرک کی وجہ سے انھیں ہلاک اور نابود کر دیتا ہے۔

یہ ترتیب بایں معنی ہے کہ نعمت الہی کی پہلی منزل تخلیق ہے اس کے بعد اپنے بندوں کو روزی رسائی ہے مگر جب وہ اپنی بخشش کو واپس لیتا ہے تو پہلے ان سے وہ نعمات جو دگر حیات میں سلب کر لیتا ہے۔ اس کے بعد ان کو سزا اور گمراہ اقوام کو ہلاک کر دیتا ہے۔

اس آیت میں "اکثرہم مشرکین" کہا گیا ہے۔ ان الفاظ کی وجہ سے کہ یہ سورہ مکی ہے اور اس

زمانے میں مسلمان بحیثیت تعداد و شمار اقلیت میں تھے۔ اس لیے اکثرہم مشرکین کہہ کر مسلمانوں میں باطنیان قلب پیدا کرنا مقصود تھا کہ مشرکین کی کثرت سے ہراساں نہ ہوں۔ کیونکہ خدا نے گزشتہ زمانوں میں ان جیسے مشرکین کی بڑی بڑی جماعتوں کو تباہ و نابود کر دیا ہے۔ نیز ان الفاظ میں اس عہد کے اہل طغیان کے لیے تشبیہ بھی ہے کہ جاؤ زمین میں چل کر دیکھو کہ تمہاری ہم مسلک ماقبل قوموں کا کیا انجام ہوا۔

چونکہ نصیحت حاصل کرنا، خواب غفلت سے بیدار ہونا اور پھر خدا کی طرف رجوع کرنا ہی کافی نہیں ہوتا۔ اس لیے آیت مابعد میں خدا پیغمبر اکرمؐ کی طرف رُوئے سخن کر کے یہ فرماتا ہے: تم اپنا رخ مستقیم اور پائیدار دین (وہ دین جو توحید خالص کی تعلیم دیتا ہے) کی طرف کیے رہو، اس دن کے آنے سے قبل جسے ارادہ الہی سے کوئی روک نہیں سکتا اور نہ خدا کا پروگرام مٹھل ہو سکتا ہے۔ اس روز لوگ پرانہ اور گروہ در گروہ ہو جائیں گے۔ ایک گروہ بہشت میں اور دوسرا گروہ دوزخ میں جائے گا: (فاقہ ووجہک للذین القیم من قبل ان یأتی یوم لا مرد لہ من اللہ یومئذ یصدعون)۔

اس آیت میں دین کی صفت "قیم" بیان کی گئی ہے۔ "قیم" کے معنی ثابت اور استوار کے ہیں۔

لہذا "فاقہ ووجہک للذین القیم" جملہ تاکید ہے جس سے مراد یہ ہے کہ چونکہ آئین اسلام اہل عالم کے نظام حیات کو استوار اور ان کی مادی اور روحانی حوائج کو پورا کرنے والا ہے۔ لہذا اس سے منحرف نہ ہونا۔ نیز یہ کہ آیت کے مخاطب جناب رسالت مآب ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب پیغمبرؐ کو یہ تاکید ہے تو دوسرے سمجھ لیں کہ پھر ان کی کیا حیثیت ہے۔

نیز یہ کہ آیت فوق میں کلمہ "یصدعون" استعمال ہوا ہے۔ یہ فعل مضارع ہے جس کا مادہ "صدع" ہے جس کے وضعی معنی برتن کو توڑنے اور پھانسنے کے ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ یہ کلمہ ہر قسم کی پرانگی اور تفرقہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اس آیت میں اس کلمہ کا مفہوم یہ ہے کہ بروز قیامت اہل بہشت اور مستحق النار لوگوں کے گروہ الگ الگ ہو جائیں گے۔ پھر ان دونوں جماعتوں کی بھی بہشت کے اور دوزخ کے درجات کے لحاظ سے درجہ بندی ہو جائے گی۔

اس کے بعد آنے والی آیت میں اس امر کی تشریح ہے کہ بروز قیامت لوگ کس طرح جماعتوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے: جس نے کفر کیا اس کا نقصان خود اسی کو پہنچے گا: (من کفر فعلیہ کفرہ)۔

آیت کے جز "لا مرد لہ من اللہ" میں کلمہ "مرد" مصدر ہے جس کا معنی اسم فاعل استعمال ہوا ہے۔ اس لیے اس کے یہ معنی ہوں گے "لا مرد لہ من اللہ" اس مقام پر ضمیر "لہ" کا مراد "یوم" ہے لہذا اجمالاً جملے کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص بھی خدا کو اس دن کے برپا کرنے سے روک نہیں سکتا۔ یعنی خدا کو بروز قیامت کوئی بھی دادرسی، اعمال کی جزا و سزا دینے سے روک نہیں سکتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ نہ تو خدا ہی اپنے وعدہ سے پھرنے والا ہے کہ اس روز حساب کو موقوف کر دے اور نہ کسی غیر ہی میں یہ طاقت ہے۔ پس اس روز کا آنا حتمی ہے۔ (غور کیجئے گا)

کین وہ لوگ جو اعمال صالح انجام دیتے ہیں، وہ ان اعمال کے ذریعے اجر الہی کو اپنے لیے مہیا کرتے ہیں: (ومن عمل صالحاً فلا نفعہ منہم یسئدون)۔

راغب نے مفردات میں لکھا ہے کہ "یسئدون" کا مادہ "مہد" (بروزن) عمد ہے۔ یہ اسم ہے۔ گوارہ اور بھولے کو یا شیر خوار بچہ کے سنانے کی جگہ کو کہتے ہیں۔

بعد ازاں اس کے معنی وسیع ہو گئے اور معصوم و نھاد ہر آرام وہ اور آسائش بخش جگہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اسی ہمت سے مومنین صالح اور اہل بہشت کے لیے یہ کلمہ استعمال کیا گیا ہے۔

خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ انسان یہ گمان نہ کرے کہ اُس کے ایمان و کفر یا اعمال زشت و زیبا خدا پر کچھ اثر ہوتا ہے۔ بلکہ وہ خود ہی اپنے اعمال صالح سے شاد و خوشنود اور اعمال سیر سے غمگین ہوتا اور تکلیف اٹھاتا ہے۔

یہ امر توجہ طلب ہے کہ جہاں کفار کا ذکر ہے، جملہ "من کفر فلیہ کفر" پر ہی اتفاق کی گئی ہے لیکن جب اہل ایمان کا ذکر آتا ہے تو آیت مابعد میں بالوضاحت یہ بیان ہے کہ انہیں صرف بوزن اعمال ہی جزا نہیں ملے گی بلکہ خدا انہیں ایسی نعمات کثیر عطا فرمائے گا جو اُس کے فضل و کرم کے شایان شان ہیں۔

مقصود یہ ہے کہ خدا اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور اعمال صالح انجام دیتے ہیں اپنے فضل و کرم سے جہلے خیر دے گا: (لیجزی الذین آمنوا و عملوا الصالحات من فضلہ)۔

یہ امر مسلم ہے کہ خدا کے اس فضل سے کفار مستفید نہ ہو سکیں گے۔ کیونکہ خدا کفار کو دوست نہیں رکھتا: (انہ لا یحب الکافرین)۔

ہر کیف یہ امر بدیہی ہے کہ خدا عادل ہے اس لیے وہ کفار اور مشرکین کے ساتھ بھی عدل کے ساتھ سلوک کرے گا۔ اور انہیں اتنی ہی سزا ملے گی جتنی کے وہ مستحق ہیں۔ مگر وہ خدا کے فضل اور اس کی نعمات سے محروم نہیں گے۔

چند اہم نکات

۱۔ گناہ و فساد کا باہمی ربط : انسان سے جو بد اخلاقی یا بد اعمالی بھی سرزد ہوتی ہے اُس کا معاشرے کی حالت پر اور اس ذریعے سے افراد کی حالت پر اثر پڑتا ہے اور یہ اثر معاشرے کے اجتماعی نظام میں فساد کا باعث ہوتا ہے۔

اخلاقی گناہ، بد اعمالی اور قانون شکنی غیر صحت، بخش اور مسوم غذا کی مانند ہے جس کا انسان کے نظام جسمانی پر مضر اثر پڑتا ہے اور اُس کے رد عمل سے کسالت صحت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مثلاً :
درد و غم کوئی سے انسان کا اعتماد جاتا رہتا ہے۔

اسامت میں خیانت سے معاشرتی تعلقات فراب ہو جاتے ہیں۔ آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھانا اس سے انسان

میں استبداد اور خود سری کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو آخر کار رنگ لاتا ہے۔ انسان اپنے فرض کو فراموش کر دیتا ہے اور کمزوریوں اور زیر دستوں کے حقوق سلب کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں لوگوں کے دلوں میں اُس کے خلاف کینہ اور عداوت کے جذبات ابھرتے ہیں اور جس معاشرے میں ہر طرف کینہ اور عداوت مسلط ہو اُس کی بنیاد متزلزل ہو جاتی ہے۔

خلاصہ تحریر یہ ہے کہ : ہر بد عملی خواہ وہ قلیل ہو یا کثیر، اُس کا رد عمل معاشرہ اور فرد دونوں کے حق میں مضر ہوتا ہے۔ اسی لیے آیت "ظہر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس" کا ایک تفسیر یہ جی کی گئی ہے: "گناہ اور فساد میں یہی فطری ربط ہے۔"

لیکن اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے گناہ ایسے ہیں جو مذکورہ بالا مضر توں کے علاوہ ایسے نیاں اور اثرات کا سلسلہ بھی اپنے ساتھ لاتے ہیں کہ نگاہ ظاہر میں یہ پہچان بھی نہیں ہو سکتی کہ اُن اثرات کا گناہوں سے کیا ربط ہے۔

مثلاً : روایات میں مذکور ہے کہ "قطع رحم" عموماً کوتاہ کر دیتا ہے۔ مال حرام کھانا قلب کو سیاہ اور زنا کاری اور فحاشی کا چلن انسانوں کی فنا کا باعث ہوتا ہے اور روزی کو کم کر دیتا ہے۔

اس سلسلے میں امام جعفر صادق سے ایک حدیث منقول ہے کہ آیت نے فرمایا :

من يموت بالذنوب اكثر ممن يموت بالاحمال
جو لوگ بسبب گناہ مرتے ہیں اُن کا شمار اُن سے زیادہ ہے جو طبعی موت سے مرتے ہیں۔

قرآن شریف میں ایک اور مقام پر اس مضمون کو ایک اور پہلو سے بیان کیا گیا ہے :

ولو ان اهل القرى امنوا و اتقوا لفتحنا علیہم برکات من السماء
والارض ولکن کذبوا فاخذناہم بما کالوا یکفون
اگر وہ لوگ جو شہروں اور آبادیوں میں بستے ہیں ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے
تو ہم اُن کے لیے آسمانوں اور زمین کی برکات کھول دیتے۔ لیکن اُنہوں نے تو

ہماری آیات کی تکذیب کی تو ہم نے بھی اُنہیں اُن کے اعمال کی سزا دی۔ (اعوان ۱۶)

زیر بحث آیت میں کلمہ "فساد" میں مفاسد اجتماعی، بلائیں اور سلب برکات، تمام چیزیں شامل ہیں۔ اس مقام پر ایک اور نکتہ قابل توجہ ہے۔ وہ یہ کہ زیر بحث آیت سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آفات اور بلاؤں کے نزول سے

لہ رسول اللہ سے ایک حدیث منقول ہے کہ :-

زنا کی چھ سزائیں ہیں جن میں سے تین دنیا میں ملتی ہیں اور تین آخرت میں۔ ڈیڑھ سزائیں یہ ہیں کہ انسان سے نزائیت سلب ہو جائے
لے موت، اور آجانی ہے میسڈ اس کی روزی قطع ہو جاتی ہے اور آخرت کی سزائیں یہ ہیں کہ اس سے حساب میں سختی ہوگی، اُس پر خدا کا غضب
نازل ہوگا اور ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔ (سفینۃ البحار (مادہ زنب) کلمۃ سفینۃ البحار (مادہ زنب)

انسانوں کی تربیت بھی ہوتی ہے۔ اس طرح کہ وہ جب اپنے اعمال کے نتائج کو دیکھیں گے تو خواب غفلت سے بیدار ہوں گے اور تقویٰ و دلہارت اختیار کریں گے۔
ہمارا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ جملہ آفات و مصائب اسی قسم کے ہیں۔ لیکن اُن میں کچھ اس قسم کے فلسفے کے حامل ہیں۔

البتہ ان کے دیگر پہلو بھی ہیں جن کے بارے میں ہم نے متعلقہ مقام پر بحث کی ہے۔
۲۔ زمین پر سیاحت میں پوشیدہ حکمتیں : قرآن مجید میں زمین پر سیاحت کا چھ مقام پر ذکر ہے اور وہ ہے سورہ آل عمران، انعام، نحل، نمل، عنکبوت اور سورہ روم ہیں۔
ان میں ایک مقام پر یعنی سورہ عنکبوت کی آیہ بیس میں تو انسانوں کو سیاحت کا اس لیے حکم دیا گیا ہے تاکہ وہ اُن اسرار و رموز کا مشاہدہ کریں جو اللہ کی مخلوقات میں یہاں ہیں۔
اور دیگر پانچ مقامات پر یہ ہدایت اس لیے کی گئی ہے تاکہ لوگ دنیا کی جاہ، ستم شمار اور عصیان کو کوشش اقوام کے دردناک اور بلا زدہ انجام کو دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔

انسانوں کی روحانی اور اخلاقی تربیت کے لیے قرآن میں خصوصیت سے کائنات کی موسومات و مملوسات کا ذکر کیا گیا ہے قرآن سماؤں کو خصوصاً یہ حکم دیتا ہے کہ اپنی زندگی کے محدود دائرے سے باہر نکل کے اس وسیع دنیا کی سیوریات کریں۔ وہ دوسری قوموں کے اعمال، اسلوب حیات اور رفتار زندگی کو دیکھیں اور اس پر بھی غور کر کے عبرت حاصل کریں کہ اقوام و مملکت کی کج رفتاری اور عصیان کوشی کا انجام کیا ہوتا ہے۔

عمر حاضر میں شیطانی طاقتوں (طاقتور اقوام) نے اپنے نفع اندوزی کے دامن حرص کو پھیلانے کے لیے دنیا کی تمام اقوام، تمام ممالک اور زمین کے ہر حصے کی تحقیق کی ہے اور اُن کی تہذیب و تمدن، مادی ذرائع، صنعت و معرفت اور عسکری صنعت و قوت غرض ہر پہلو سے تفتیش کی ہے اور پھر اُن کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔
قرآن یہ درس دیتا ہے کہ ان جبار اور خُون آشام قوموں کے بجلکے (اے مسلمانو!) تم زمین پر پھیل جاؤ اور اُن کے شیطانی منصوبوں کے بجائے روحانی درس حاصل کرو۔

دوسروں کی زندگی سے عبرت حاصل کرنا شخصی تجربے سے زیادہ اہم اور زیادہ قدر رکھتا ہے۔ کیونکہ شخصی تجربہ تو نقصان اٹھا کر ہی حاصل ہوتا ہے۔ مگر دوسروں کی زندگی سے زبان و نقصان برداشت کیے بغیر عبرت حاصل ہوتی ہے۔
زمین پر سیاحت کے بارے میں قرآن کا حکم عین اُن اصولوں کے مطابق ہے جو آج کل علمائے علم الانسان نے اختیار کیے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ کتاب میں اصولی مسائل پڑھانے کے بعد طلباء کو سیاحت کے لیے لے جاتے ہیں تاکہ وہ پختہ خود مطالعہ کریں۔

البتہ آج کل ایک اور قسم کی سیاحت کا رواج ہو رہا ہے۔ اس کا نام ٹورزم TOURISM رکھا ہے۔ اس سیاحت کا

لکھنؤ، گجرات، جہان - بحث آفات بلا۔

روح شیطانی تہذیب کی ممالک قوموں کی طرف سے کسب دولت اور ثروت حرام کمانے کے لیے ہوتا ہے۔ اُن کے زیادہ تر مقاصد غیر اخلاقی ہوتے ہیں۔ مثلاً نازیبا و ناشائستہ ثقافت کی ترویج، عیاشی، ہوس رانی، عداوت کی بے لگانی اور دوسرے ناشائستہ مشاغل۔ اس قسم کی سیاحت تباہ کن ہے۔

اس کے برخلاف اسلام اُس قسم کی سیاحت کا حامی ہے جس کا مقصد صحت مند تہذیب کی اشاعت، تجربت سے باہمی استفادہ، جہان انسانیت میں اسرار تخلیق کی جستجو، عالم طبیعی کی تحقیق اور فاسد و ستمگر اقوام کے دردناک انجام سے عبرت حاصل کرنا ہو۔

اس مقام پر اس نکتے کا ذکر ہے عمل نہیں ہے کہ اسلام میں ایک اور قسم کی "سیاحت" اور جہاں گردی کی نماندہ ہے۔ اسکا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے :

لا سیاحت فی الاسلام

اسلام میں سیاحت نہیں ہے۔

اس حدیث کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے جو تمام عمر یا زندگی کے ایک حصے کے لیے معاشرتی زندگی سے منقطع ہو جاتے تھے اور کوئی حاصل خیز مشورہ نہیں کرتے تھے۔ بلکہ شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ مارے مارے پھرتے تھے۔ یہاں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے اور معاشرتی تعلقات پر بوجھنے رہتے تھے۔

یہ الفاظ دیگر یہ لوگ "راہبان سیکر" تھے۔ اُن راہبوں کے بالکس جو گرجوں میں مقیم رہ کر معاشرتی تعلقات ترک کر کے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ جنہیں "مونیخ" ثابت کہا جاسکتا ہے۔ مگر اسلام ایک عملی دین ہے وہ رہبانیت اور ترک دنیا کا مخالف ہے۔ اس لیے وہ اس قسم کی سیاحت کی اجازت بھی نہیں دیتا۔

۳۔ دین قیم اور آئین محکم : زیر بحث آیات میں پیغمبر اکرم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی کئی توجہ اُس آئین و طرف رکھیں جو مستقیم، محکم اور استوار ہے۔ اور جس میں کسی قسم کی کج روی اور راہ راست سے منحرف ہونے کا احتمال نہیں ہے۔ نیز اُس کی بنیادیں غیر متزلزل ہیں۔

یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن کی دوسری آیات میں "دین کے اور اوصاف بھی بیان ہوئے ہیں مثلاً :
سورہ بقرہ کی آیہ ۱۰۵ میں دین کو کلمۃ حنیف سے متصف کیا گیا ہے۔ (یعنی وہ دین جس میں کسی قسم کی کج روی نہیں ہے۔)

رسول اللہ سے ایک اور حدیث منقول ہے :

سیاحتہ امتی الذنوب والجهاد

یعنی اگر میری امت مادی زندگی سے منموزنا پابندی ہے تو پھر کون جہاد کی طرف نہ جائے اور کیوں بیابانوں میں فضول برتی پھرے۔

سورہ زمر کی آیت ۳ میں اُسے "خاص" کہا گیا ہے۔

اللہ الذین الخالص

سورہ نمل کی آیت ۵۲ میں کلمہ "واصب" استعمال ہوا ہے۔ جس کے معنی ہیں وہ آئین جو تعمیر ناپذیر اور فنا نازل سے بری ہے، (ولہ الذین واصبا)۔

سورہ حج کی آیت ۷۸ میں اسلام کو ایسا آئین بتایا گیا ہے۔ جس میں کسی قسم کی سخت گیری نہیں ہے:

وما جعل علیکم فی الدین من حرج

ان صفات مذکورہ میں سے ہر صفت جسم اسلام کا ایک پہلو ہے۔ یہ تمام پہلو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

اس لیے تتبع کے لیے ایسے ہی دین کو منتخب کرنا چاہیے اور اُس کی تعلیمات کی تکمیل میں سی کرنی چاہیے اور اس کے تحفظ میں جان لڑا دینی چاہیے۔

۴۔ روز قیامت ٹل نہیں سکتا : آیات مذکورہ بالا میں روز قیامت کے متعلق یہ ذکر آیا ہے کہ "یوم لا مردۃ لہ من اللہ" وہ ایسا دن ہے کہ خدا کو اس کے برپا کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا اور نہ اس کے عمل وقوع میں کوئی حائل ہو سکتا ہے۔ اور نہ کسی میں یہ قدرت ہوگی کہ اُس روز کے محاسبے سے فرار ہو کر پھر دنیا میں آجائے۔

قرآن کی دوسری آیات میں بھی روز قیامت کا حال بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورہ شوریٰ آیت ۴۴ میں مذکور ہے کہ:

جب ظالم خدا کے دردناک عذاب کو دیکھیں گے تو کہیں گے:

هل الی مردۃ من سبیل

کیا کوئی ایسی راہ ہے کہ ہم پھر دنیا کی طرف لوٹ جائیں؟

اسی طرح سورہ شوریٰ کی آیت ۴۷ میں قیامت کی تعریف میں "یوم لا مردۃ لہ من اللہ" کہا گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ عالم ہستی میں انسان متعدد مراحل سے گزرتا ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مرحلہ ما بعد سے مرحلہ ما قبل کی طرف عود کر جائے، نہ صرف انسان بلکہ جملہ کائنات کے لیے، یہ خدا کی مختلف ناپذیر سنت ہے۔

مثلاً: ایک بچہ جو شکم مادر سے عالم وجود میں آیا ہے خواہ وہ باعتبار ترکیب جسمانی کامل ہو یا ناقص، کیا یہ ممکن ہے کہ وہ پھر بصورت جنین واپس لوٹ جائے؟ یا وہ میوہ جو شاخ درخت سے لوٹ کر گر گیا ہے، خواہ پختہ ہو یا خام، کیا وہ پھر واپس ہو کر اسی شاخ سے متصل ہو سکتا ہے؟

انسان کا اس جہان فانی سے اُس جہان باقی کی طرف منتقل ہونا بھی ایسا ہی ہے۔ یعنی یہاں سے انتقال کے بعد پھر کسی طرح بھی اس کی بازگشت نہیں ہو سکتی اور یہی وہ حقیقت ہے کہ انسان اس پر غور کرے تو وہ لرزہ برانداز ہو جاتا ہے اور یہی حقیقت اُسے خواب غفلت سے بیدار کرتی ہے۔

-۴۶

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ يُرْسِلَ الرِّيحَ مُبَشِّرَاتٍ وَلِيُذِيقَكُمْ مِنْ رَحْمَتِهِ وَلِتَجْرِيَ الْفُلُكُ بِأَمْرِهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلِعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ

-۴۷

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا إِلَى قَوْمِهِمْ فَجَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَاذْتَمَنَّا مِنَ الَّذِينَ أَجْرَمُوا وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ

-۴۸

اللَّهُ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ تَتَّبِعُ سَحَابًا فِي سَمَاءِ كَيْفَ يَشَاءُ وَيَجْعَلُهُ كِسْفًا فَتَرَى الْوُدُقَ يُخْرَجُ مِنْ خِلِّهِ فَإِذَا أَصَابَ بِهِ مِنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ

-۴۹

وَأَنْ كَانُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمُبْسِلِينَ

-۵۰

فَالنُّظْرُ إِلَىٰ أَثَرِ رَحْمَتِ اللَّهِ كَيْفَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا إِنَّ ذَلِكَ لَمُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

ترجمہ

۴۶- اس کی (عظمت و قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ ہواؤں کو بشارت دینا بنا کر بھیجتا ہے تاکہ تمہیں اپنی رحمت کے لطف سے آشنا کرے اور سیراب کرے اور اسی کے حکم سے کشتیاں چلیں۔ تم اس کے فضل سے استفادہ کرو ممکن ہے کہ تم اس کا شکر ادا کرو۔

۴۷- ہم نے تم سے پہلے اُن کی قوم کی طرف رسول بھیجے۔ وہ اُن کے پاس ہماری روشن دلیلیں لے کر گئے (مگر جب پند و نصائح نے کوئی فائدہ نہ بخشا تو ہم نے ہر مین سے انتقام لیا) اور ہم نے مومنین کی مدد کی (اور مومنین کی مدد کرنا ہم پر ہمیشہ فرض ہے۔

۴۸- وہ خدا ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے تاکہ وہ ہواؤں کو حرکت میں لے آئیں پھر انہیں آسمان کی وسعت میں جس طرح چاہتا ہے پھیلا دیتا ہے اور پھر انہیں تہ در تہ کر دیتا ہے پھر تم دیکھتے ہو کہ اُن ہواؤں کے بیچ میں سے بارش کے قطرے گرنے لگتے ہیں۔ جب خدا (اس حیات بخش بارش کو) اپنے بندوں میں جنہیں وہ چاہتا ہے، اُن پر برساتا ہے تو وہ خوش ہو جاتے ہیں۔

۴۹- ہر چند کہ وہ اس سے قبل کہ اُن پر بارش نازل ہو، مایوس تھے۔

۵۰- رحمت الہی کے آثار دیکھو کہ وہ زمین کو اُس کی موت کے بعد کس طرح زندہ کر دیتا ہے اور وہی ذات جس نے مردہ زمین کو زندہ کیا، بروز قیامت (مردوں کو زندہ کرے گی اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

تفسیر

خدا کے آثار رحمت کو دیکھو:

ہم کہہ چکے ہیں کہ اس سورہ میں دلائل توحید باری تعالیٰ کا قابل لحاظ حصہ سات آیتوں میں بیان ہوا ہے۔ اُن میں سے ہر آیت "ومن آیاتہ" کے الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔ ان آیات میں سے چھ پر صفحات ما قبل میں گفتگو ہو چکی ہے۔ اب آفریں ہم سب سے آخری ساتویں آیت پر غور کرتے ہیں۔

آیت ما قبل الذکر میں ایمان اور عمل صالح کا بیان تھا۔ دلائل توحید بھی اس سلسلے میں برائے تاکید ہوں گے۔ خداوند کریم فرماتا ہے کہ: خدا کی عظمت و قدرت کی علامات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ ہواؤں کو بشارت دینا بنا کر بھیجتا ہے۔ (ومن آیاتہ ان یرسل الریاح مبشرات)۔

وہ ہواؤں بارش کے جلو میں حرکت کرتی ہیں، بادل کے ٹھنڈے کو گھیر کر لاتی ہیں اور باہم پیوست کرتی ہیں۔ پھر انہیں خشک اور بیاسی زمینوں کی طرف لے جاتی ہیں۔ یہ بادل صفحہ آسمان پر چھپا جلتے ہیں اور فضا کا درجہ حرارت تبدیل ہو جاتا ہے۔ پھر بارش ہونے لگتی ہے۔

ممکن ہے کہ شہر دل میں رہنے والے امیر لوگوں کے لیے بشارت دہندہ ہواؤں کی پیش قدمی زیادہ اہمیت نہ رکھتی ہو۔ لیکن بیابان گرد آتشہ کام لوگ جو قطرات باران کے منتظر اور نیاز مند رہتے ہیں اُن کی ذہنی کیفیت مختلف ہے۔ جیسے ہی ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں اور بادلوں کو اپنے ہمراہ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں۔ اور دوسرے مقامات کی نباتات پر جو بارش ہو چکی ہے۔ اس کی خوشبو اپنے ساتھ لاتی ہیں تو اُن ساکنان بیابان کے دل میں برق امید چمکنے لگتی ہے۔ اگرچہ آیات قرآنی میں ہواؤں کے عمل بشارت کو اکثر مقامات پر محض نزول باران سے منحصر کیا گیا ہے۔ لیکن —

مثلاً، ہوائیں — فضا کی گرمی اور سردی کو مستعمل کر دیتی ہیں۔

ہوائیں — فضا میں پھیلے ہوئے تعفن کو وسیع فضا میں بکھیر کر فضا کو صاف کر دیتی ہیں۔ علاوہ بریں ہوائیں — سورج کی تپش کو کم کر دیتی ہیں اور نباتات کو شدت حرارت سے جلنے سے محفوظ رکھتی ہیں۔ درختوں سے جو آکسیجن گیس خارج ہوتی ہے، ہوا اسے انسانوں تک سوغات کی صورت میں پہنچاتی ہے۔ اور — انسان اپنی ماس سے جو کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس خارج کرتے ہیں اسے نباتات کی خوراک بنا دیتی ہے۔ ہوائیں بہت سی نباتات میں مادہ تولید کو داخل کرتی ہیں۔ یعنی نر و مادہ کے تعلقوں کو باہم مخلول کر دیتی ہیں۔ ہوائیں چکیاں چلاتی ہیں اور کاشتکار اُن کے وسیلے سے گندم کو بھوسے سے صاف کرتے ہیں۔ ہوائیں قدرتی نباتات کے بیجوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ اُڑا کے لے جاتی ہیں اور اُنہیں —

ہوئیں۔ ابدانی کشتیوں کو مسافروں اور بارگراں سمیت ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس زمانے میں جب کہ برہی جہاز مشینی ذرائع سے چلنے لگے ہیں، جہازوں کی رفتار پر باد شرط یا باوجود مخالف کا اثر پڑتا ہے۔

دریں صورت ہوائیں مختلف جہات سے انسان کے لیے بشارت آدر ہیں۔

آیت کے آخری الفاظ میں ہیں: خدا چاہتا ہے کہ وہ ہمیں اپنی رحمت کا ذائقہ چکھائے اور یہ کہ کشتیاں اسی کے حکم سے چلیں اور تم اس کے فضل سے بہرہ یاب ہو سکو۔ ہے کہ اس طرح تم اس کا شکر ادا کرو، (ولینذیقکم من رحمۃہ ولتجنری الفلک بامرہ ولتبتغوا من فضلہ وانلکم تشکروا)۔

ہوائیں زمین کی پرورش اور کاشتکاری کے لیے گونا گوں نعمات کا باعث ہیں، نیز وہ حمل و نقل کا وسیلہ بھی ہیں۔ تمیز تباری اور پیش رفت کا سبب بنتی ہیں۔ قرآن میں ان فوائد کی طرف تین جملوں سے اشارہ کیا گیا ہے:

اول: لینذیقکم من رحمۃہ

دوم: لتجنری الفلک بامرہ

سوم: لتبتغوا من فضلہ

توجہ طلب یہ امر ہے کہ یہ سب برکات اس وقت نمودار ہوتی ہیں جب ہوا کراہ زمین پر حرکت کرتی ہے۔

مگر انسان کسی نعمت کی بھی اس وقت تک قدر نہیں کرتا جب تک وہ اس سے سلب نہ ہو جائے۔ جب تک ہوا زمین پر ہوتی تو اس وقت تک انسان کو شعور نہیں ہوتا کہ اس پر کون سی نعمت نازل ہو رہی ہے۔ اگر انسان خوبصورت ترین بات میں بھی بیٹھا ہو اور ہوا چلنی بند ہو جائے تو وہ جگہ جگہ اس کے لیے، نوز زنار بن جاتی ہے۔ اور اگر قید خانے میں بند ہو جائے تو وہ جگہ راحت بخش ہو جاتی ہے۔ قید خانے میں تکلیف کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ وہاں تازہ ہوا کا گزر نہیں ہوتا۔ اگر سمندروں کی سطح پر ہوا بند ہو جائے اور موج بھر ساکت ہو جائے تو سمندری مخلوق کی زندگی آکسیجن کی کمی کی وجہ سے خطرے میں پڑ جائے۔ اور سمندر ایک گندے پانی کا تالاب بن جائے۔

فخر الدین رازی کہتے ہیں کہ "ولینذیقکم من رحمۃہ" میں نکتہ یہ ہے کہ چکھائی تھوڑی سی چیز جاتی ہے جس سے مراد یہ ہے کہ خدا کے نزدیک یہ تمام دنیا اور اس کی نعمتیں نہایت قلیل ہیں اور خدا کی رحمت واسعہ دوسری دنیا کے لیے مخصوص ہے۔

اس کے بعد آیت میں پیران الہی کی بشت کا ذکر ہے۔ مگر آیت ۴۸ میں پھر ہواؤں کے چلنے کا بیان آجاتا ہے۔ ممکن ہے کہ آیت ۴۷ کا ایسی دو آیات کے درمیان واقع ہونا جن میں ہواؤں کی نعمت کا ذکر کیا گیا ہے، محض جملہ مترفع کے طور پر ہو۔ جیسا کہ اس کے متعلق بعض مفسرین کی بھی یہی رائے ہے۔

علاوہ بریں یہ بھی ممکن ہے کہ ان مباحث کے ساتھ مسئلہ نبوت کا ذکر مبداء و معاد کے مسائل کی تحلیل کے نقطہ نظر

ہو۔ جن کا اس سورہ میں سکر ذکر ہوا ہے (جیسا کہ بعض دیگر مفسرین کی رائے بھی ہے)۔ نیز یہ امکان بھی ہے کہ یہ ذکر ان لوگوں کی تنبیہ کے لیے ہو جو خدا کی نعمت سے بہرہ اندوز ہوتے ہوئے بھی کفران نعمت کرتے ہیں۔

بہر حال آیت نمبر ۴۷ میں فرمایا گیا ہے: ہم نے تم سے پہلے بھی ان کی قوم کی طرف رسول بھیجے۔ (ولقد ارسلنا من قبلك رسلاً الی قومہم)۔

اور یہ رسول ان اقوام کے پاس معجزات اور روشن و آشکارا عقلی دلائل لے کر آئے۔ (فجاءوہم بالبینات)۔ ان اقوام میں سے ایک جماعت تو ایمان لائی اور ایک گروہ مخالفت پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن جب ان کفار پر پند نصائح اور تنبیہات کا کچھ اثر نہ ہوا تو پھر ہم نے مجرموں سے انتقام لیا: (فانتقمنا من اللذین اجرموا)۔

مگر ہم نے مومنین کی مدد کی اور مومنین کی مدد کرنے کا فرض ہم پر ہمیشہ عائد ہوتا ہے: (وکان حقاً علینا فضل المؤمنین)۔

جملہ بالا میں کلمہ "کان" استعمال ہوا ہے جو اس سنت الہی کے حکم ہونے کی علامت ہے۔ اس کے بعد کلمہ "حق" استعمال ہوا ہے اور پھر "علینا" جو کہ حق کی توضیح کرتا ہے۔ کلمات کی یہ ترتیب درحقیقت اس موضوع کے لیے پے درپے تاکیدات ہیں۔

ترتیب الفاظ میں "حقاً علینا"۔ "فضل المؤمنین" پر مقدم ہے۔ جو حکم کی دلیل ہے اور تاکید کو کچھ ہے۔ اس مقام پر حصر و تاکید سے مراد یہ ہے کہ بطور مسلم ہم نے مومنین کی مدد کرنا اپنا فرض قرار دیا ہے اور مومنین کے لیے کسی اور کی مدد کی احتیاج کے بغیر ہم اپنے وعدے کو عملی جامہ پہنائیں گے۔

یہ جملہ ضمنی طور پر ان مسلمانوں کی دلجوئی اور تسلی کے لیے ہے جو اس زمانے میں کفار مکہ کی ایذا رسانوں کے تحت سخت مبتلائے مصائب تھے۔ یہ کفار تعداد اور وسائل میں بہت آگے تھے۔

اگر نفسیاتی نتائج کے اعتبار سے دیکھا جائے تو دشمنان خدا کا گناہ و عصیان میں مبتلا ہونا ہی مومنین کی فحش و نصرت کی دلیل ہے۔ کیونکہ یہی گناہ اور انحراف از راہ راست بطور کیف کر دار ان کفار کے وجود کا استیصال کر دے گا یعنی ان کا گناہ ہی ان کی نابودی کے اسباب مہیا کر دے گا اور ان پر خدا کا عذاب نازل ہو گا۔

اس کے بعد آیت ۴۸ میں پھر ہوا چلنے کی نعمت کا ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے: وہ خدا ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے تاکہ وہ بادلوں کو حرکت میں لائیں: (اللہ الذی یرسل الریاح فتشیر صحاباً)۔

پھر وہ بادلوں کو آسمان کی وسعت میں اپنی مصلحت کے مطابق پھیلا دیتا ہے، (فیسطو فی السماء کیف یشاء)۔ پھر ان بادلوں کے ٹکڑوں کو جمع کر کے تہ بہ تہ کر دیتا ہے، (ویجعلہ کسفاً)۔

لہ کسف جمع کسفہ (بروزن جملہ) یعنی قطعاً اس مقام پر بادل کے وہ ٹکڑے اُراد میں جڑوڑتے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے بادل جاری ہو کر بے گناہ ہے۔

تم دیکھتے ہو کہ اُس بادل کے بچرم میں سے قطرات باران خارج ہوتے ہیں: (فتری الودق یدخرج من خللالہ)۔

قدرت نے نازل باران کے لیے ہوا کو ایک پورا منصوبہ سونپ دیا ہے۔ اس پر یہ فرض عام کیا ہے کہ وہ سمندر سے بادلوں کے ٹکڑوں کو خشک اور پیاسی زمین کی طرف لاتی ہے۔ پھر انہیں صفحہ آسمان پر پھیلا دیتی ہے۔ بعد ازاں اُن کو الگ الگ درجہ بندی کر دیتی ہے۔ پھر بادلوں کے اطراف کے ماحول کو سرد کر کے بادلوں کو برسنے کے قابل بنا دیتی ہے۔ بادلوں کی مثال تجربہ کار "چوپالوں" کی سی ہے کہ وہ جھل میں چرنے والی بھیڑوں کو ادھر ادھر سے جمع کرتے ہیں۔ پھر انہیں معین راستے پر لے جاتے ہیں۔ پھر بارے میں لاکر ان کا ڈھونڈ دیتے ہیں۔

جملہ۔۔ فتیری الودق یدخرج من خللالہ

جس کے معنی یہ ہیں کہ "تو بارش کے فرد ترین قطرات کو دیکھتا ہے جو گھنگور گھٹاتے برستے ہیں۔"

مکن ہے کہ اس بیان سے اس حقیقت کا اظہار مقصود ہو کہ بادلوں کا حجم اور ہوا کی شدت حرکت اس حد تک نہیں ہے کہ وہ قطرات باران کو ٹپکنے اور زمین پر آنے سے روک لیں۔ بلکہ پانی کے یہ چھوٹے چھوٹے ذرات اُس طوفان آبرودار کے باوجود جس نے فضا سے آسمان کو گھیر رکھا ہے، زمین پر آنے کے لیے اپنا راستہ بنا لیتے ہیں۔ یہ قطرات باران پیاسی زمین پر آہستہ آہستہ اس طرح گرتے ہیں کہ زمین سیراب ہو جاتی ہے اور کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچتا۔ ہوا کا وہ طوفان جو بڑے بڑے درختوں کو اکھاڑ پھینکتا اور پہاڑوں کی چٹانوں کو ہلا دیتا ہے، وہ بارش کے لطیفانہ ننھے ذرات کو اپنے درمیان سے گزرنے دیتا ہے تاکہ وہ زمین تک پہنچ جائیں۔

اس مقام پر یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ جب آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہوں تو آنکھ کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ الگ الگ ٹکڑے ہیں۔ لیکن جس وقت ہم ہوائی جہاز کے ذریعے بادلوں کے بیچ میں سے گزرتے ہیں یا اُن کے اوپر پہنچ جاتے ہیں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے ٹکڑے الگ الگ ہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: خدا اس حیات بخش بارش کو اُن بندوں تک پہنچاتا ہے جنہیں وہ یہ نعمت بخشا چاہتا تھا تو وہ خوش ہو جاتے ہیں: (فاذا اصاب به من یشاء من عبادہ اذا ہم یستبشرون)۔

ہر چند کہ وہ لوگ نازل باران سے قبل مایوس اور ناامید تھے: (وان کانوا من قبل ان ینزل علیہم من قبلہ لمبلسین)۔

اس مایوسی اور اس بشارت کا وہی لوگ اچھی طرح ادراک کر سکتے ہیں کہ جن کی زندگیوں کا انحصار بیابان گردیوں کی طرح ان قطرات باران ہی پر ہے۔

جس وقت یاس اور ناامیدی نے ایسے لوگوں پر اپنا منہوس سایہ ڈالا ہوا ہوتا ہے اور وہ خود، اُن کے پالتو جانور اور

۱۔ وِدْق (روزن حلق) پانی کے غبار کی مانند چھوٹے چھوٹے ذرات۔ یا بارش کے پرانہ قطرات۔
۲۔ ملبس مانہ "الطاس" بمعنی یاس و ناامیدی۔

مزدور زمین بوجہ قحط آب تشنه ہوتی ہیں کہ اتنے میں ٹھنڈی ہوا کا بھونکا چلتا ہے جو بارش کا پیش رو ہوتا ہے۔ وہ بارش بارش کی خوشبو اپنے ساتھ لاتی ہیں۔ چند لمحے ہی گزرتے ہیں کہ آسمان پر بادل پھیل جاتے ہیں، وہ گھنگور اور بھاری ہو جاتے ہیں اور برسنے لگتے ہیں۔ گڑھے صاف پانی سے بھر جاتے ہیں۔ پھر بڑی ندیاں اس نعمت سمدی سے لبریز ہو جاتی ہیں۔ خشک زمینوں اور ان بیابان گرد لوگوں کے دلوں میں تازہ زندگی کی کوئیلیں پھٹنے لگتی ہیں، دلوں میں امید کی بجلی چمکنے لگتی ہے۔ دلوں سے ناامیدی اور مایوسی واصل جاتی ہے۔

اس آیت میں کلمہ "قبل" کی تکرار غالباً تاکید کے لیے ہے۔ منشا یہ ہے کہ بارش سے چند لمحے پہلے جی ہاں چند لمحے پہلے چہرے اترے ہوتے تھے۔ لیکن جیسے ہی بارش ہوتی ہے، اُن خشک لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے۔ دیکھو انسان کتنا کمزور موجود ہے اور اس کا خدا کس قدر مہربان ہے۔

فارسی زبان میں تاکید کے لیے زمانے کا سحر ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً۔۔ ہم کہتے ہیں کہ "کل ہمک"۔ جی ہاں کل ہی تک فلاں شخص میرا دوست تھا۔ مگر اب سخت دشمن ہو گیا ہے۔ اس تکرار سے انسان کی تغیر حالت کا اظہار منظور ہوتا ہے۔

زیر نظر آیات میں سے آخری آیت میں پیغمبر اسلام کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ: رحمت الہی کے آثار کو دیکھو کہ وہ زمین کو اُس کی موت کے بعد کس طرح زندہ کرتا ہے۔ فاذا نظر الی آثار رحمة اللہ کیف یحی المرص بعد موتھما۔

کلمہ "فاذا نظر" استعمال کرنے میں یہ مصلحت ہے کہ نزول باران کے سبب سے جب مرده زمین زندہ ہوتی ہے تو اُس میں رحمت الہی کے آثار اس قدر نمایاں اور آشکار ہیں کہ انسان کو بغیر جستجو سرسری نظر سے دیکھ کر ہی معلوم ہو جاتا ہے نیز یہ کہ بارش کو "رحمت الہی" کہا گیا ہے۔ یہ باعتبار تہجہ ہے کیونکہ وہ مختلف جہات سے باعث برکت ہے۔ مثلاً: بارش۔۔ خشک زمین کی آبیاری کرتی اور نباتات کے بیجوں کی پرورش کرتی ہے۔

بارش۔۔ درختوں کو حیات تازہ بخشتی ہے۔ بارش۔۔ ہوا کو گرد و غبار سے پاک کر دیتی ہے اور انسان جس ماحول میں جیتا ہے اُسے دھوکہ صاف کر دیتی ہے۔ بارش۔۔ نباتات کو دھوکہ اُنہیں طرادت بخشتی ہے۔

بارش۔۔ ہوا کو مرطوب و ملائم اور ہلکا کر کے انسان کے سانس لینے کے قابل بنا دیتی ہے۔ بارش کا پانی زمین میں جذب ہو جاتا ہے اور پھر کچھ عرصہ بعد چشموں اور کاریز کی صورت میں زمین پر بہنے لگتا ہے۔ بارش سے سیلاب آتا ہے۔ نہریں جاری ہو جاتی ہیں۔ یہ پانی جب ڈیم میں جمع ہو جاتا ہے تو اُس سے بجلی پیدا کی جاتی ہے۔ جس سے روشنی حاصل ہوتی ہے اور شینوں کو حرکت دی جاتی ہے۔

قرآن کی دوسری آیات میں بھی بارش کو "رحمت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان مقامات میں سے سورہ فرقان کی آیت ۴۸ اور سورہ نمل کی آیت ۶۳ ہے۔

سورہ شوریٰ کی آیت ۲۸ میں مذکور ہے :-

وهو الذي ينزل الغيث من بعد ما قطفوا وينشر رحمته
وہ خدا ہی کی ذات ہے جو بارش کو نازل کرتی ہے۔ اس کے بعد کہ لوگ
ناامید ہو گئے ہوتے ہیں اور اپنی رحمت کو پھیلا دیتا ہے۔

اس کے بعد اس تعلق کی جہت سے جو معباد و معاد کا اس قسم کے مسائل سے ہے، آیت کے آخر میں اس
بات کا اضافہ کیا گیا ہے : جس ذات نے مردہ زمین کو نزول باران سے زندہ کر دیا وہی بروز قیامت مردوں کو بھی زندہ کرے گا۔
اور وہی ہر چیز پر قادر ہے۔ (ان ذالک لمحی الموتی وهو علی کل شیء قدير)۔

اس مقام پر فعل مضارع کے بجائے " فعی " اسم فاعل استعمال ہوا ہے۔ جس کے پہلے لام تاکید ہے۔ اس سے
انتہائی تاکید مقصود ہے۔

آیات قرآنی میں ایسا بار بار نظر سے گزرا ہے کہ مسئلہ معاد کو ثابت کرنے کے لیے یہ واضح طور شہادت پیش کیا گیا ہے
کہ مردہ زمین نزول باران کے بعد زندہ ہوجاتی ہے۔ چنانچہ سورہ ق کی آیت ۱۱ میں مردہ زمینوں کی زندگی کے ذکر
کے بعد فرمایا گیا ہے :

كذلك الخرج

بروز قیامت مردوں کا زندہ ہونا بھی اسی کی مانند ہے۔

نیز سورہ " فاطر " کی آیت ۹ میں بھی اسی قسم کا مضمون ہے :

كذلك النشور

بروز قیامت نشور اسی طرح ہوگا۔

اس واقعہ یہ ہے کہ قانون حیات و مرگ ہر مقام پر یکساں ہے۔ اللہ کی ذات پاک جو بارش کے چند قطرے سے
مردہ زمین کو زندہ کر دیتی ہے اور اُس میں جوشِ نو اور حرکت بالیدگی پیدا کر دیتی ہے۔ قدرت کے اس عمل کی ہر سال
اور کبھی ہر روز تکرار ہوتی رہتی ہے۔ اسی ذات میں یہ قدرت ہے کہ موت کے بعد انسانوں کو بھی زندہ کر دے۔
حق یہ ہے کہ ہر شکل میں موت و حیات اسی کے اختیار میں ہے۔

یہ درست ہے کہ ظاہراً زمین زندہ نہیں ہوتی بلکہ " حیات ارض " کا مفہوم یہ ہے کہ نباتات کے جو بیج زمین میں پناہ
ہوتے ہیں وہ پرورش پاتے ہیں۔ یہ پھوٹے پھوٹے بیج زمین کے اجزاء کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں اور یہ اجزاء
روح نباتی بن کر زندہ ہوجاتے ہیں۔ نیز ان ہی نباتات کے منتشر اور پاشیدہ اجزاء از سر نو زمین کو قوت حیات
بخشتے ہیں۔

در حقیقت مکرمین معاد کے پاس بجز استبعاد کے اور کوئی دلیل نہ تھی اور قرآن مجید میں ان کے استبعاد کی نفی اور
شکست کے لیے ایسی مثالیں دی گئی ہیں۔

۵۱- وَلَيْنِ ارسلنا ریحاً فراهه مصفراً اظلوا من بعده يكفون
۵۲- فانك لا تسمع الموتى ولا تسمع الصم الدعاء اذا ولوا
مدبرين

۵۳- وما انت بهد العی عن ضلتهم ان تسمع
الا من یؤمن بایتنا فهم مسلمون

۵۴- الله الذي خلقكم من ضعف ثم جعل من بعد
ضعف قوۃ ثم جعل من بعد قوۃ ضعفاً و شیبۃ یخلق
ما یشاء وهو العلیم القدیر

ترجمہ

۵۱- اگر ہم (گرم اور جلانے والی) ہوا بھیجیں کہ اُس کے اثر سے وہ اپنی زراعت
اور باغات کو زرد اور پڑ مردہ دکھیں تو وہ ناشکری کرنے لگتے ہیں۔

۵۲- اور تم مردوں کو اپنی بات نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو جب وہ مُنہ موڑ لیں۔

۵۳- اور نہ تم اندھوں کو اُن کی گم راہی سے نکال کر ہدایت کر سکتے ہو۔ تم صرف اُن ہی
لوگوں کو اپنی بات سنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور حق کے سامنے
سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔

۵۲۔ وہ خدا ہی ہے جس نے تمہیں کمزور حالت میں پیدا کیا۔ پھر کمزوری کے بعد اُس نے قوت عنایت کی۔ پھر قوت کے بعد کمزوری اور پیری کا وقت دیا۔ خدا جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ علیم و قدیر ہے۔

تفسیر

مردے اور بہرے تیری بات نہیں سنتے :

از بسکہ گزشتہ آیات میں بابرکت ہواؤں کا ذکر تھا جو پُر برکت بارشوں کا پیش خیمہ ہوتی ہیں مگر زیر نظر آیات پر پہلی آیت میں نیاں رساں ہواؤں کا ذکر ہے۔ اس ضمن میں خدا فرماتا ہے اگر ہم ہوا بھیجیں (کہ جو گرم اور بخسار دینے والی یا سرد و خشک ہو) اور اُس کے اثر سے یہ لوگ اپنے باغات اور زراعت کو زرد اور پژمردہ دیکھیں تو ناشکر گزار رہیں گے۔ یہ لوگ کم ظرف ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ نزل باران سے قبل مایوس اور شکستہ خاطر ہوتے ہیں اور جب مینہ بریں جاتا ہے تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ اور اگر کسی دن ٹوچنے لگے اور وقتی طور پر وہ اذیت میں مبتلا ہو جائیں تو فریاد کرنے لگتے ہیں اور خدا کی شکایت کرنے لگتے ہیں۔

اس کے برعکس راست باز مومنین کا یہ حال ہے کہ جب انھیں خدا کی کوئی نعمت ملتی ہے تو شکر کرتے ہیں اور مصیبتوں میں صبر کرتے ہیں۔ مادوی زندگی کے نشیب و فراز سے اُن کے ایمان میں ذرہ بھر خلل نہیں پڑتا۔ اور ضعیف الایمان کبر دلوں کی طرح ہوا کے ایک موافق بھونکنے سے مومن اور دوسرے مخالف بھونکنے سے کافر نہیں ہوجاتے۔ کلمہ "مصفل" کا مادہ "تصفہ" (برزن "مصرف" ہے۔ اس کے معنی زرد رنگ کے ہیں۔ بعض مفسرین کے نزدیک "راؤہ" کی ضمیر کا مرجع درخت اور گھاسیں ہیں جو مسرت رساں ہوا میں چلنے سے بہت جلد پژمردہ اور زرد ہوجاتی ہیں۔

بعض مفسرین کا یہ خیال ہے کہ "راؤہ" کی ضمیر کا مرجع اُبر ہے کیونکہ زرد رنگ کے بادل نازک ہوتے ہیں جو برستے نہیں ہیں۔ ان کے برخلاف کالے اور گھٹے بادل خوب برستے ہیں۔

بعض مفسرین اس ضمیر کا مرجع "ریح" (ہوا) کو سمجھتے ہیں کیونکہ معمول کی ہوائیں توبے رنگ ہوتی ہیں لیکن بادِ موسوم جو بیابان کا گرد و غبار بھی اپنے ساتھ اڑالاتی ہے، زرد رنگ کی ہوتی ہے۔ اس مقام پر ایک اور احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ کلمہ "مصفل" کے معنی "خالی" بھی ہیں۔ جیسا کہ راغب اصفہانی

نے مفردات میں لکھا ہے کہ خالی برتن، غذا سے خالی پیٹ یا خون سے خالی رگوں کو "مصرف" (بروزن مصرف) کہتے ہیں۔ بنا براین "مصفل" کا معنی ہے "ہوائیں جو بارش سے خالی ہوں۔ اس صورت میں "راؤہ" کی ضمیر کا مرجع "ریح" (ہوا) ہے (یہ مقام غور طلب ہے)۔ ہمارے خیال میں تفسیر اذل سب سے زیادہ مشہور ہے۔

اس مقام پر یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ برسنے والی اور مفید ہواؤں کے لیے "ریح" کلمہ جمع استعمال ہوا ہے۔ لیکن نیاں رساں ہوا کے لیے کلمہ مفرد "ریح" آیا ہے۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ اکثر ہوائیں مفید ہی ہوتی ہیں اور بادِ موسوم کبھی کبھی لعینوں یا سالوں میں ایک مرتبہ چلتی ہے۔ لیکن مفید ہوائیں تو ہمیشہ چلتی ہی رہتی ہیں۔

یاد رکھیں کہ "ریح" بصورت جمع اس لیے استعمال کیا گیا ہو کہ مفید ہواؤں کا اس صورت میں مفید اثر ہوتا ہے کہ پہلے درپلے چلتی رہتی ہیں۔ جب کہ مفرد ہوا ایک ہی مرتبہ چل کر اپنا تباہ کن اثر چھوڑ جاتی ہے۔ اس آیت کے ذیل میں ایک آخری نکتہ قابل ذکر ہے کہ آیت نمبر ۴۸ میں کلمہ "یستشرون" جو نفع بخش ہواؤں کے ذکر میں استعمال ہوا ہے اور جملہ "لظلموا من بعدہ بکفرون" (اس کے بعد وہ اپنے کفر پر قائم رہتے ہیں) اس آیت میں آیا ہے۔ ان دونوں کا فرق قابل لحاظ ہے۔

ان کلمات کے استعمال میں جو تفاوت ہے اُس سے ثابت ہے کہ ایسے بندے بھی ہیں کہ جب وہ خدا کی پہلے درپلے نعمتوں کو دیکھتے ہیں تو خوش ہو جاتے ہیں لیکن اگر وہ ایک دن کے لیے یا صرف ایک بار کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائیں تو شکایت کرنے اور رونے دھونے لگتے ہیں اور کفر کی طرف اس طرح مائل ہو جاتے ہیں۔ گویا انھوں نے کبھی اسے چھوڑا ہی نہ تھا۔

ان لوگوں کی مثال ایسے افراد کی ہے کہ جو ساری عمر صحت مند اور سلامتی سے رہتے ہیں۔ مگر۔ کبھی خدا کا شکر ادا نہیں کرتے۔ لیکن۔ اگر کبھی ایک رات کے تیز بخار میں مبتلا ہو جائیں تو جو کفر اور اُن کمبختی بھی اُن کی زبان پر آتی ہے، بکتے رہتے ہیں اور بے دانش اور ضعیف الایمان لوگوں کا یہی حال ہے۔

اس موضوع پر ہم نے اسی سورہ کی آیت ۳۵ اور سورہ ہود کی آیت ۹، ۱۰ اور سورہ حج کی آیت ۱۱ کے ذیل میں بھی بحث کی ہے۔

اس کے بعد کی دو آیات میں آیت ماقبل کے مضمون کی مناسبت سے انسانوں کو چار گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے : اول : وہ لوگ جو اگرچہ جسمانی اعتبار سے زندہ ہیں لیکن باعتبار قلب دُروح مُردہ ہیں کہ وہ ادراکِ حقائق سے قاصر ہیں۔

دوم : وہ لوگ کہ اُن کے کان تو ہیں مگر وہ کلمۃ الحق سنتا نہیں چاہتے۔

سوم : وہ گردہ جن کی آنکھیں چہرہ حق کو دیکھنے سے محروم ہیں
چہارم : راست باز مومنین کا گردہ جو دلہائی دانا، گوشہائی شنوا اور چشم ہائے مینا رکھتے ہیں۔
پہلی بات یہ کہی ہے کہ : اپنی حق باتیں مُردوں کو نہیں سنا سکتے اور جن کے قلب مُردہ ہو چکے ہیں اُن پر تمہاری
نعمتوں کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔ (فانک لاتسمع الصوتی)۔

نیز یہ کہ ”تم اپنی بات بہروں کو بھی نہیں سنا سکتے۔ بالخصوص اُس وقت کہ جب وہ کلہر حق سُننے سے پشت پھیر لیں“
(ولا تسمع الصر التعاء اذا ولوا مدبرین)۔
اسی طرح تمہارے امکان میں یہ بھی نہیں کہ تم اندھوں کو گم راہی سے نکال کر راہِ راست کی ہدایت کرو (وہمانت
بہادی الہی عن ضلالہم)۔

تم اپنے طلبات حق صرف اُن لوگوں کے کانوں تک پہنچا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور حق کے
سننے سے تسلیمِ خرم کیے ہوئے ہیں : (ان تسمع الآمن لیؤمنن بأیاتنا فہم مسلمون)۔
جس طرح کہ تم نے اس سے قبل بھی کسی مقام پر کہا ہے کہ قرآن مادی حیات و مرگ اور۔ ظاہری مینائی اور سماعت
کے علاوہ ایک برتر حیات و مرگ اور وید و شنید کا قائل ہے کہ انسان کی سعادت اور بد بختی کا انحصار ان آفر اللہ ذکر اس بلندی
پر ہے۔

جس شخص کا دل بیدار ہے اس کی نظر مادی اور جسمانی فوائد پر نہیں رہتی بلکہ اُس کا نقطہ نگاہ روحانی اور معنوی ہوتا ہے۔
ادراک حقیقت کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ انسان کا قلب آمادہ ہو اور اُس کی آنکھ مینا اور کان سننے والے ہوں۔
اگر کسی شخص کا دل کثرتِ گناہ، دماغ کی سنگینی اور غور کی وجہ سے مُردہ اور اس کی رُوح خوابید ہو چکی ہے اور اُس
میں ادراک حقیقت اور امتیاز حق و باطل کی استعداد ہی نہیں رہی۔ تو اگر تمام انبیاء اور اولیاء بھی جمع ہو کر تمام آیات الہی اُسے
سنائیں تو اُس پر کچھ بھی اثر نہ ہوگا۔

اگر قرآن میں حواسِ خمسہ میں سے صرف دو حواسِ ظاہر کا اور قوتِ ادراک کا ذکر ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان
عالمِ خارجی سے جو معلومات حاصل کرتا ہے اُن کا بیشتر حصہ ان ہی دو حواس (بصارت و سماعت) یا وجدان اور تخلیلِ عقل
کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

یہ امر تو جہ طلب ہے کہ آیاتِ بالا میں راہِ راست سے اعتراف اور عدم ادراک حقیقت کے تین مراحل بیان کیے گئے
ہیں جن میں سے مرحلہ اول یعنی حالتِ مرگ، شدید ہے اور مرحلہ سوم یعنی نابینائیِ خفیف ہے۔

مرحلہ اول : ”دل کی موت“ ہے کہ قرآن میں مُردہ دل لوگوں کو ”موتی“ کہا گیا ہے کہ اُن کے اندر نفوذِ حق کا
کوئی امکان ہی نہیں ہے۔

مرحلہ دوم : ”عدم سماعت“ ہے۔ بالخصوص وہ بہرے کہ جنہوں نے کلمتہ الحق سے ڈر کر دانی کر لی ہے اور دُور
بھاگ رہے ہیں۔ اُن کی گران گوشہ کا یہ حال ہے کہ نزدیک کی شدید چیخ پکار اُن کے کانوں پر جس کے اثر ہونے کا امکان

جو سکتا تھا اُن پر اُس کا بھی اثر نہیں ہوتا۔

البشہ ان بہروں کا گردہ مُردوں کے مانند نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے کہ کبھی علامت یا اشارے سے اُنہیں کوئی
بات سمجھائی جا سکے۔ اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ بہت سے حقائق ایسے ہیں کہ اُنہیں ایسا اشارہ سے سمجھایا نہیں جا سکتا۔
بالخصوص اس حالت میں کہ مخاطب پشت پھیر لے۔

مرحلہ سوم : عدم بصارت (نابینائی) ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ اندھوں کے ساتھ، مُردوں کی نسبت، زندگی بسر کرنا
آسان تر ہے کیونکہ کم از کم ان کے کان تو کھلے ہوتے ہیں اور اُن کے سامنے بہت سے مطالب بیان کیے جا سکتے ہیں۔
مگر۔ پھر بھی۔

دیکھنا اور سُننا برابر تو نہیں۔

علاوہ بریں اندھے کے سامنے کسی شے کی کیفیت کا بیان کر دینا بھی کافی نہیں ہے کیونکہ مادی اشیا کی حقیقت اُن کے
دیکھے بغیر سمجھ میں نہیں آتی۔ بعض بسیط تصورات کا بھی یہی حال ہے۔ مثلاً اندھے سے کہا جائے کہ دائیں طرف یا بائیں طرف
پلہ تو اس حکم پر عمل کرنا آسان نہیں ہے کیونکہ بعض اوقات معمولی سی غلطی سے وہ کسی گڑھے میں جا گرے گا۔

قرآن مجید میں ”موت و حیات“ کا جو تصور ہے ہر نے اُسے سورہ نحل کی آیات ۸۰ اور ۸۱ کے تحت بالتشریح
بیان کیا ہے۔ اور بابوں کے اس کزور اعتراض کا ذکر بھی کیا ہے۔ جودہ پیمبر اکرمؐ اور آئمہ سے توسل کے خلاف ان آیات
زیر بحث اور دیگر آیات کے حوالے سے کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان آیات سے ثابت ہے کہ مُردے مُطلقاتاً کچھ نہیں سمجھتے
مگر ہم نے ثابت کیا ہے کہ ”انسان“ اور خصوصاً پینٹروایان بزرگ اس دُنیا سے سفر کرنے کے بعد ایک ”برزخی زندگی“ گزارتے
ہیں۔ قرآن اور انا دینت کی بہت سی اسناد اس پر گواہ ہیں اور حیاتِ برزخی میں اُن کی استعدادِ ادراک و بصیرت حیاتِ دُنیوی
کی نسبت وسیع تر ہو جاتی ہے۔

۱ مزید توضیح کے لیے جلد ۸ میں آیات مذکورہ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔

اس مقام پر ہمیں اس جملے کا اضافہ بھی کرنا چاہیے کہ تمام مسلمان اپنی نمازوں میں تشریح پڑھتے وقت پیمبرِ گرامیؐ کو مخاطب
کر کے اُن پر ان الفاظ سے سلام بھیجتے ہیں: ”السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ“۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ مخاطب حقیقی ہے نہ کہ مجازی اور سلام اُس ذات کے لیے ہے جو سُنتی اور ادراک کرتی ہے۔ اس
لیے پیمبر اکرمؐ کو بصورتِ خطاب سلام کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ آنحضرتؐ کی رُوح مقدسہ ہم سب کے سلاموں کو سُنتی ہے۔
اور کسی جہت سے بھی ہم ان خطابوں کو مجاز پر محمول نہیں کر سکتے۔

۲ زیر بحث آیات میں سے آفری آیت جمع میں توحید باری تعالیٰ کی دلیل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو دلیل فقر و غنا کھلائی
اس دلیل سے خدا ان تمام دلائل کی جو اثبات توحید کے لیے اس سورہ میں بیان ہوئے ہیں تکمیل کرتا ہے ارشاد ہوتا ہے:
ذات الہی وہی ہے جس نے تم کو جب پیدا کیا تو تم ضعیف و ناتوان تھے۔ اسی نے تمہیں اس ضعف و ناتوانی کے غم سے

بعد قوت اور توانائی عطا کی کہ تمہارے شباب اور جوانی کا زمانہ آگیا۔ اس دور کے بعد پھر انضامِ قومی کا زمانہ آیا اور تم پر شعفِ پیری غالب آگیا۔ (اللہ الذی خلقکم من ضعف شو جعل من بعد ضعف قوۃ شو جعل من بعد قوۃ ضعفاً و شیبۃً)۔

وہی خدا ہے کہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ اور وہی عالم و قادر ہے۔ (یخلق ما یشاء و هو العلیم القدیم)۔ تم آغازِ حیات میں اتنے ضعیف و ناتوان تھے کہ اپنے اوپر سے کبھی بھی نہیں اڑا سکتے تھے اور نہ اپنے منہ کی رال کو صاف کر سکتے تھے اور تمہاری یہ حالت جسمانی اور فکری لحاظ سے "لا تعلمون شیئاً" کے مصداق تھی (یعنی تم کچھ نہیں جانتے) یہاں تک کہ تم اپنے ماں باپ کو جو دانا تمہاری نگہداشت کرتے تھے نہیں پہچانتے تھے۔

لیکن — رفته رفته تم میں نور، بالیدگی اور توانائی پیدا ہوگئی۔ تمہارا جسم قوی ہو گیا۔ اور — تم میں عقل، قوت و تفکر اور وسیع ادراک پیدا ہو گیا۔

تاہم — تم اس طائف و توانائی کا مستعمل نہیں کر سکتے تھے۔ تمہاری مثال ایسی ہے کہ ایک آدمی دامن کوہ سے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جائے اور وہ پہرہاں سے نیچے آجائے۔ تمہارا حال بھی ایسا ہی ہے کہ بعد طفلی کے شعف و ناتوانی سے جوانی کی توانائی تک ترقی کرتے ہو۔ پھر زوال شروع ہو جاتا ہے اور جسمانی و روحانی شعف و ناتوانی کے قعر میں گر پڑتے ہو۔ زندگی میں یہ تغیرات اور نشیب و فراز اس حقیقت کی روشن دلیل ہیں کہ نہ تو وہ قوت و توانائی تم نے اپنے ارادے سے پیدا کی تھی اور نہ اس شعف و ناتوانی پر تمہیں اختیار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان جملہ تغیرات کا منبع کوئی اور ہی ذات ہے۔ اور تمہاری بہرِ جنت بے بسی اس امر کی دلیل ہے کہ تمہارے وجود کے پینے کو کوئی اور ذات ہی گھماتی ہے اور تمہاری ہر کیفیت حیات عارضی ہے۔

امیر المؤمنین علیؑ ابن ابی طالب نے اپنے نوزادِ اقوال میں اس مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں :

عرفت اللہ سبحانہ بفسخ العزائم و حل العقود و نقض الصموم
میں نے اپنے خدا کو حکمِ ارادوں کے فسخ ہونے، مشکلات کے حل ہونے اور قوی ارادوں کے ٹوٹنے اور ناکام ہونے سے پہچانا۔

میں ان تغیرات سے سمجھ گیا کہ اختیار مطلق کسی اور ہی ذات کے اختیار میں ہے۔

ہمیں اپنے معاملات میں کچھ اختیار نہیں۔ مگر اتنا ہی بنتا اُس نے بخشا ہے۔

یہ امر بھی توجہ طلب ہے کہ — آیت ۵۴ میں جب بارودم کلمہ شعف آیا ہے تو اُس کے ساتھ کلمہ شیبۃ کا اضافہ بھی ہے جس کے معنی پیری ہیں۔ لیکن جب بار اول "ضعف" کہا تھا تو وہاں طفولیت کا ذکر نہیں ہے۔

غالباً اس ترتیب میں یہ مصلحت ہے کہ شعفِ پیری بہت اذیت رسا ہے۔ کیونکہ شعفِ طفلی کے برعکس شعفِ پیری کا انجام مرگ و فنا ہے۔ دوم یہ کہ تجربہ کار اور سال خوردہ لوگوں سے جو توقعات وابستہ ہوتی ہیں وہ بچوں سے نہیں ہوتیں۔

حالانکہ بعض اوقات بلحاظ شعف و ناتوانی اُن کی حالت یکساں ہوتی ہے۔ یہ مقام بہت محبت انگیز ہے۔ آیت ۵۴ کا آخری جملہ "جس میں خدا کے علم اور قدرت کا ذکر ہے وہ معنایاً بشارت بھی ہے، تنبیہ بھی۔ تنبیہ اس جہت سے ہے کہ خدا تمہارے جملہ اعمال اور نیتوں سے آگاہ ہے اور اُن اعمال کو دیکھ کر دیکھنے پر قادر ہے۔"

۵۵۔ وَیَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُونَ مَا لَبِثُوا غَيْرَ سَاعَةٍ
كَذَلِكَ كَانُوا يُؤْفَكُونَ ۝

۵۶۔ وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَالْإِيمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِي كِتَابِ اللَّهِ
إِلَى يَوْمِ الْبَعْثِ فَهَذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلَكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا
تَعْلَمُونَ ۝

۵۷۔ فَيَوْمَئِذٍ لَا يَنْفَعُ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَعذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ
يَسْتَعْتَبُونَ ۝

۵۸۔ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ
وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِآيَةٍ لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا
مُبْطَلُونَ ۝

۵۹۔ كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝

۶۰۔ فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَا يَسْتَخِفُّكَ الَّذِينَ
لَا يُوقِنُونَ ۝

ترجمہ

۵۵۔ اور جس روز قیامت برپا ہوگی تو گناہ گار قسمیں کھائیں گے کہ وہ (عالم برزخ میں) ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں ٹھہرے۔ وہ اسی طرح اور اک حقیقت سے محروم رہے تھے۔

۵۶۔ اور جن لوگوں کو علم اور ایمان دیا گیا ہے وہ کہیں گے کہ تم فرمانِ خدا کے مطابق روز قیامت تک (عالم برزخ میں) رہے ہو اور اب یہ اٹھنے کا دن ہے مگر تم جانتے نہ تھے۔

۵۷۔ اُس روز ظالموں کا عُذر کچھ فائدہ نہ دے گا اور اُن کی توبہ بھی قبول نہ کی جائے گی۔

۵۸۔ ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی مثالیں بیان کی ہیں۔ اگر تم اُن کے سامنے کوئی آیت پیش کرتے ہو تو یہ کافر کہتے ہیں کہ تم تو جھوٹے ہو (اور یہ سب جادو ہے)۔

۵۹۔ اِس طرح خدا اُن لوگوں کے دلوں پر جو علم نہیں رکھتے مہر لگا دیتا ہے۔

۶۰۔ جب کہ حالت یہ ہے تو تم صبر کرو کیوں کہ خدا کا وعدہ حق ہے اور جو لوگ ایمان نہیں رکھتے وہ تمہیں غضب ناک نہ کریں (اور اپنی جگہ سے ہٹا نہ دیں)۔

تفسیر

وہ دن جب کہ عُذر خواہی بے سُود ہوگی :

ہم اس سے پہلے کہہ چکے ہیں کہ اس سورہ میں 'مبدأ و معاد' کی بحثیں کرنے کے لئے اس کے تانے بانے کی طرح باہر کی طرف منظر آتا ہے۔ زیر نظر آیات میں 'مبدأ و معاد' کی ان بحثوں پر جو قبل ازیں گزر چکی ہیں، مسکرت قیامت کا مزید اضافہ کیا گیا ہے اور اِس روز ہجرتوں کا جو درد ناک حال ہو گا، اُس کی سنگین کشی کی گئی ہے۔

چنانچہ خدا فرماتا ہے کہ: جس روز قیامت برپا ہوگی، مجرمین قسمیں کھائیں گے کہ ہم تو عالم برزخ میں فقط ایک گھنٹہ ہی رہے ہیں، (و یوم تقوم الساعة ينقسم المجرمون ما لبثوا غير ساعة)۔

البتہ وہ اپنی گزشتہ زندگی میں بھی اسی طرح ادراک حقیقت سے محروم رہے تھے، اذالك كانوا يوفون۔ روز قیامت کو قرآن میں "ساعة" کہا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم نے کسی ماقبل مقام پر کہا ہے کہ یہ کلمہ یا تو اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ قیامت ایک لحظے میں ناگہانی طور پر آجائے گی۔ یا یہ "ساعة" ہے کہ بندوں کے اعمال کا حساب سرخ ورق ہوگا کیونکہ خدا جلد حساب لینے والا ہے۔ کلمہ "ساعت" عربی زبان میں زمانہ کے ایک خفیف جز کے لیے بولا جاتا ہے۔

"ما لبثوا غير ساعة" میں مقام توقف کا ذکر نہیں ہے۔ اس لیے بعض مفسرین کا یہ خیال ہے کہ "توقف در دنیا" مراد ہے کہ حقیقت میں ایمان کی زندگی ایک لحظہ زود گزر سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن آیہ ما بعدہ اس امر کی روشنی دیتا ہے کہ "توقف" سے مراد جہان برزخ میں ٹھہرنا ہے یعنی وہ عالم مراد ہے جو موت کے بعد اور یوم قیامت کے درمیان ہوگا کیونکہ "لقد لبثتم في كتاب الله الى يوم البعث" سے ثابت ہے کہ تقسیم اور مقام دونوں کی انتہا روز قیامت تک ہے۔ اس لیے برزخ ہی سچ ہے، وغیر کیجئے گا!

یہ بھی ملحوظ رہے کہ عالم برزخ سب کے لیے یکساں نہ ہوگا۔ ایک گروہ ایسا ہے جو برزخ میں باشعور زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن دوسرا گروہ ایسا ہے کہ گویا سو رہا ہے اور قیامت میں خواب سے بیدار ہوگا اور ہزار ہا سال کو ایک ساعت سمجھے گا۔

اس مقام پر دو باتوں کا ذکر اور ضروری ہے۔ اول یہ کہ مجرمین ایسی جمہوری قسم کیونکر کھالیں گے؟

اس کا جواب اہل و اشرار ہے۔ وہ یہ کہ :-

وہ مجرمین درحقیقت یہی سمجھیں گے کہ زمانہ قیامت برزخ بت تعیل تھا کیونکہ اس مقام پر ان کی حالت مجرمانہ کی طرح ہوگی۔ مثلاً:

کیا اصحاب کف نے جو مومن اور صالح لوگ تھے طویل خواب سے بیداری کے بعد یہ تصور نہیں کیا تھا کہ وہ ایک دن یا اس کا کچھ حصہ سوتے رہے ہیں؟

نیز یہ کہ انبیائے ماسلف میں سے ایک نبی (جن کا حال سورہ بقرہ کی آیت ۲۵۹ میں آیا ہے) جو دنیا سے سفر کرنے کے بعد ایک سو سال کے بعد پھر زندہ ہو گئے تھے، کیا انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ ان دنوں زندگانوں کے درمیان فاصلہ ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ہے۔

۱۔ اس مضمون کے متعلق مفصل بحث اس سورہ روم کی آیت ۴۱ کے تحت کی گئی ہے۔

۲۔ "برزخ" کے متعلق جلد ۸ سورہ مؤمنین کی آیت نمبر ۱۰۰ کے تحت مفصل بحث کی گئی ہے اور اس آیت میں جو کلمہ ہے وہ بھی تشریح سے بیان کیا گیا ہے۔

انہیں حال اس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ برزخ کی مخصوص حالت کے پیش نظر مجرموں کا تصور بھی بوجہ نادانانہ حقیقت ایسا ہی ہو۔

اسی لیے آیت ما بعدہ میں یہ مضمون ہے کہ مؤمنین آگاہ ان سے کہیں گے کہ تمہیں غلط فہمی ہے۔ تم تو برزخ میں روز قیامت تک رہے ہو اور آج ہی وہ روز قیامت ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ نکتہ بالا کو پیش نظر رکھتے ہوئے جملہ "كذلك كانوا يوفون" کی تفسیر بھی واضح ہو جاتی ہے۔ کیونکہ کلمہ "افك" کے وضعی معنی حقیقت کو دگرگوں کرنا اور حق سے منحرف ہونے کے ہیں۔ یہ مجرمین بھی برزخ میں اپنی وضع کی وجہ سے حقیقت کا ادراک نہ کر سکیں گے اور انہیں اس مقام پر مدت قیامت کا اندازہ ہی نہ ہوگا وہ مطالب جو ہم نے سطور بالا میں بیان کیے ان کو نظر میں رکھا جائے تو ان طولانی بحثوں سے اعتنا کی ضرورت نہیں ہے جو انہوں نے اس امر کو موضوع قرار دے کر کی ہیں کہ "مجرمین بروز قیامت عذاب جہنم کیوں بولیں گے؟ کیونکہ آیت میں کوئی ایسی دلیل نہیں جس سے "دروغ عمدی" ثابت ہو۔

البتہ قرآن میں بروز قیامت مجرمین کے دروغ و کذب کا ذکر بھی نظر آتا ہے۔ جس کا مفصل جواب ہم نے جلد ۲ میں سورہ النعام کی آیت ۲۳ کے تحت دیا ہے۔ دیگر یہ کہ اس بحث کا ان آیات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

آیت ما بعدہ میں اس جواب کا ذکر ہے۔ جو حق آگاہ مؤمنین ان مجرمین کو دیں گے جو عالم برزخ اور قیامت کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے: وہ لوگ کہ جنہیں علم دایمان دیا گیا ہے کہ تم لوگ حکم خدا کے مطابق روز قیامت تک عالم برزخ میں رہے ہو اور آج روز قیامت اور قبروں سے اٹھنے کا دن ہے سو تم اس حقیقت کو نہ جانتے تھے۔ (وقال الذين اوتوا العلم والایمان لقد لبثتم في كتاب الله الى يوم البعث وهذا اليوم يوم الكفتم لا تعلمون)۔

اس آیت میں کلمہ "علم" کو "ایمان" پر مقدم رکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم ہی اساس ایمان ہے۔ دیگر یہ کہ "في كتاب الله" سے ممکن ہے کہ "كتاب" معنوی "مراد ہو یا کتب آسمانی مراد ہوں یا دونوں مراد ہوں۔ یعنی خدا کے تعویذ اور تشریحی حکم کے مطابق یہ معتد تھا کہ تم اتنی مدت برزخ میں رہو۔ اس کے بعد تم بروز قیامت محسوس ہو گے۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "الذین اوتوا العلم والایمان" کا مصداق کون لوگ ہیں؟ بعض مفسرین نے اس سے فرشتے مراد لیے ہیں۔ جو علم اور ایمان دونوں رکھتے ہیں اور ایک دوسری جماعت نے

۱۔ آیا اس آیت کے کلمات کی نسبت میں تقدیم و تاخیر ہے؟ اس بارے میں اہل علم میں اختلاف ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ فی کتاب اللہ جملہ "اوتوا العلم والایمان" سے متعلق ہے۔ تب صحیح یہ ہونے لگا کہ: جو لوگ کہ کتاب اللہ کا علم رکھتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ یہ بات کہتے ہیں کہ بعض مفسرین نے یہ جملہ "الذین اوتوا العلم والایمان" سے متعلق سمجھا ہے۔ جہاں بھی سطور بالا میں یہی مضمون مراد لیا ہے کیونکہ تقدیم و تاخیر کی کوئی واضح قرینہ نہ ملتا ہے اور اس مقام پر کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔

مؤمنین حق آگاہ مراد لیے ہیں۔ ہمارے نزدیک دوسرے معنی زیادہ واضح ہیں۔

بعض روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ "الذین اوتوا اللہ والایمان" سے امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام اور امیر طاہرین مراد ہیں۔ اس تفسیر میں جن ذوات کو آیت کا مصداق ٹھہرایا گیا ہے وہ اس کا روشن مصداق ہیں مگر اس سے آیت کا وسیع مفہوم، مخدوم نہیں ہو جاتا۔

اس مقام پر یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ عالم پرزخ کے متعلق دو گروہوں میں وجہ اختلاف کا سبب یہ ہے کہ گروہ اول جو عالم پرزخ میں وقت قیام کو صرف ایک ساعت سمجھتا ہے، وہ عذاب الہی کا خوف ہے اور یہ خواہش رکھتا ہے کہ بتنی بھی زیادہ دیر ہو جائے اچھے اور دوسرا گروہ جو طول وقت کی حقیقت سے آگاہ ہے وہ چونکہ بہشت اور اس کی جاودانی نعمتوں کا منتظر ہے اسے یہ مدت قیام بہت طویل معلوم ہوتی ہے۔

بہر حال جس وقت مجربین یہ دیکھیں گے کہ روز قیامت کے روز ناک عواقب ان کے زور ہو رہے ہیں تو وہ عذر خواہی اور توبہ کرنے لگیں گے۔ لیکن۔۔۔ قرآن کا نیت یہ ہے کہ: "اس روز ظالموں کو ان کی عذر خواہی کچھ فائدہ نہ دے گی اور ان کی توبہ بھی قبول نہ ہوگی۔ (خیرومئذ لا یمنع الذین ظلموا۔ عذر تصوم ولا هم لیستغیبون)"

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن کی بعض آیات میں بتدوین بیان کیا گیا ہے کہ مجربوں کو عذر خواہی کی اجازت ہرگز نہیں دی جائے گی۔

ولا یؤذن لهم فیعتذرون (مرسلات۔ ۳۳)

لیکن اس آیت میں یہ فرمایا گیا ہے: "ان کی عذر خواہی کچھ مفید نہ ہوگی۔ اس نکتے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عذر خواہی تو کریں گے مگر انھیں اس کا کچھ فائدہ نہ ہوگا

ان آیات میں کچھ تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ قیامت کے مختلف مراحل ہوں گے۔ کسی ایک مرحلے میں ان مجربین کو عذر خواہی اور بے نیکی کی ہرگز اجازت نہ ہوگی اور ان کے شہر پر نمر لگا دی جائے گی۔ البتہ ان کے دست دیا، اعضا و جوارح اور وہ زمین جس پر انھوں نے گناہ کیا ہے ان کے اعمال کا حال بیان کریں گے لیکن دوسرے مرحلے میں ان کی زبان کھل جائے گی اور عذر خواہی کرنے لگیں گے۔ مگر بے سود۔

ان کا عذر یہ ہوگا کہ اپنے گناہوں کو کفر و فحاشی کے آثار ضلالت کے سر توہمیں گے اور ان سے کہیں گے کہ "اگر تم نہ ہوتے تو ہم مؤمن ہوتے۔"

تفسیر فخر رازی۔ زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

"لیستغیبون" کا مادہ عتب (بروزن "حتم" ہے۔ اس کے وضعی معنی دل سے پھینکنا ہے جس سے عیب بابت افعال میں آتا ہے (اعتاب) تو اس کے معنی ہے عیب کو دور کرنے کے بوجہ ہے انسان العیب میں بے تفریق ہے کہ جب بظاہر استغیب (استغاب) میں ملے تب بھی اس کے معنی دل سے پھینکنا ہے اور دور کرنے کے ہی ہیں اس کے معنی "معنی استرضاء" یعنی کسی کی رضا طلب کرنے اور توبہ کرنے کے ہیں اور آیت زیر بحث میں انہی فی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی مجربین قیامت میں توبہ نہ کر سکیں گے۔

سورہ سبأ آیت ۳۱:

لولا انتم ولکننا مؤمنین

لیکن وہ آثار ضلالت ان کے جواب میں کہیں گے:

انحن صدقنا کون عن الہدی بعد اذ جاءکم

کیا ہم نے تمہیں اس وقت ہدایت سے روک دیا تھا جب وہ تمہارے قریب

آگئی تھی اور تم اسے کھنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے؟ (سبأ۔ ۳۲)

یہ مجربین کبھی اپنی عذر خواہی میں کوشش کرتے ہوئے راہ راست سے اپنے انحراف کو شیطان کے سر توہمیں گے اور اس نے ان کے دل میں جو دوسرے ڈالے ہیں ان پر لٹے ملامت کریں گے۔ مگر اہل ایمان انھیں یہ جواب دے گا:

فلا تلو مونی ولو موافقناکم

تم مجھے نہیں بلکہ اپنے نفوس کو ملامت کرو۔ (ابراہیم۔ ۲۲)

میں نے تمہیں کسی کام پر مجبور تو نہیں کیا تھا۔ میں نے تو تمہیں صرف دوستانہ دعوت دی تھی۔ اور۔۔۔ تمہنے اسے قبول کر لیا۔

انہی آیت میں ان تمام مطالب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اس سورۃ میں بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ خداوند عالم فرماتا ہے: ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر قسم کی مثالیں بیان کی ہیں مثلاً وعدہ و وعید۔ امر و نہی۔ بشارت و انذار۔ آیات آفاق و انفس۔ دلائل مبدا و معاد اور غیب کی خبریں حاصل کلام یہ کہ قرآن میں ہر اس بات کا ذکر ہے جس کا انسانی نفوس پر اثر ہو سکتا ہے) ۱ ولقد ضربنا للناس فی ہذ القرآن من کل مثل۔

در حقیقت قرآن کلیۃً اور بانصوص سورۃ زوم کہ ہم جس کی تفسیر کے اختتام کے مرحلے میں ہیں ایسے مسائل کا مجموعہ ہے جو انسانوں کے ہر طبقہ اور ہر گروہ اور ہر طرز فکر اور ہر عقیدے کے لوگوں کو بیدار کرنے والے ہیں۔

قرآن۔۔۔ دس بے عبرت، مسائل اخلاقی، عملی پروگرام اور امور اعتقادی کا ایسا مجموعہ ہے جس میں یہ مسائل اس اسلوب سے بیان کیے گئے ہیں کہ وہ ہر ممکن طریقے سے فکر انسانی میں نفوذ کر جائیں اور انھیں راہ سعادت پر گامزن کر دیں۔

مگر اس کے باوجود ایک گروہ ایسا ہے کہ ان کے تباہی اور سیاہ دلوں پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ لہذا تم ان کے سامنے جو آیت اور حق کی نشانی بھی پیش کرو گے تو یہ کفار رہیں کہیں گے کہ تم اہل باطل ہو اور تم جو کچھ کہتے ہو بے بنیاد باتیں ہیں: (ولئن جئتمہم بآیۃ لیقولن الذین کفروا ان انتھوا الا مبطلون)۔

آیت میں کلمہ "مبطلون" ایک جامع لفظ ہے جس میں مشرکین کے تمام ناروا التزامات، نعمتیں اور لیبیل شامل ہیں مثلاً: دروغ، سحر اور جنون کا اتمام، کلام الہی کو خرافاتی افسانے اور اساطیر الاقدین کہنا۔ یہ جملہ امور باطل اس ایک کلمے میں جمع ہیں یہ مسلم ہے کہ کفار کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ پیغمبران خدا کو ان اہتمامات میں سے کسی ایک سے جہم کرتے رہتے ہیں

تاکہ چند روز تک اس وسیلے سے پاک دل لوگوں کو حق پر فاعل رکھ سکیں۔

آیت میں کلمہ "انتصر" تفسیر جمع استعمال ہوئی ہے۔ ممکن ہے کہ اس سے پیغمبر اور راست باز مومنین پر درود ہوں اور ممکن ہے کہ جملہ انبیاء، پیشوا، الہی اور طرفداران حق مراد ہوں۔ کیونکہ کفار کا ہت و حرم گروہ تو مکتب دین کے تمام طرفداروں ہی کا خاتم تھا۔

آیہ مابعد میں اس گروہ کی مخالفت حق کی وجہ بالوضاحت بیان کی گئی ہے۔ گروہ کفار کی خیرہ سری، ان کے قلب کا قبول حق سے گریز اور ہر حقیقت سے دشمنی اس وجہ سے ہے کہ کثرت گناہ اور کج فکری کی وجہ سے ان کی حس قبول حق امتیاز مردہ ہو گئی ہے۔ اب ان کو کسی طرح ہی ادراک حقیقت ہوتا ہی نہیں ہے۔ خدا ایسے لوگوں کے دلوں پر جو علم و آگاہی نہیں رکھتے، نمر لکا دیتا ہے۔ (کذا لک یطیع اللہ علی قلوب الذین لا یعلمون)۔

کلمہ "یطیع" کا مادہ "طیع" ہے۔ اس کے معنی میں نمر لگانا۔

یہ دستور چلنے بھی تھا اور اب بھی ہے کہ ہم کسی شے کو اس طرح محفوظ کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی اسے نہ چھوئے اور اس میں مطلقاً تصرف نہ کرے تو اگر اسے کسی پیرے میں سیسے یا کانڈ میں لپیٹتے ہیں تو اس کے جڑ پر اور اگر صندوق میں بند کرتے ہیں تو قفل پر لاکھ سے نمر لکا دیتے ہیں۔ یہ امر برائی ہے کہ اس بٹنل یا صندوق کو بغیر نمر توڑنے کھولنا نہیں ہے۔ اور اگر نمر توڑی جانے لگی تو فوراً بات کھلی جانے لگی۔

قرآن میں ایسے قلوب کی حالت کو جس میں قبول حق کی صلاحیت ہی نہیں رہی اور ایسے لوگوں کی کیفیت کہ جن میں نہ عقل ہے، نہ علم، نہ وجدان نیز جن کے ہر بات یافتہ ہونے کی کوئی توقع ہی نہیں رہی بطور کنایہ نمر گروہ ہونے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ آیات گزشتہ میں علم کو ایمان کی اساس کہا گیا ہے اور اس آیت میں جمل کو کفر اور عدم قبول حق کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔

سورہ روم کی آخری آیت میں (جو زبیر آیات میں سے آخری آیت بھی ہے) پیغمبر گرامی اسلام کو دو اہم احکام اور ایک عظیم بشارت دی گئی ہے۔ تاکہ ان جناب کو اس جنگ مہیکار میں جو اس زمانہ میں باہل، بے خرد اور ناسک دماغ کفار سے مسلسل جاری تھی، استقامت اور استقلال عطا ہو۔

جہلا حکم یہ ہے کہ آپ جملہ حوادث، تمام آزار و زحمات اور ہر قسم کی ناروا تمہوں کے مقابلے میں صبر کیجئے (فاصلہ)۔ کیونکہ صبر و شکیبائی اور استقامت ہی کامیابی کی اصلی کلید ہے۔ اور اس غرض سے کہ پیغمبر اکرم تبلیغ اسلام کی راہ میں زیادہ سہولت ہو جائیں اضافہ کیا گیا ہے: خدا کا وعدہ یقیناً حق ہے (ان وعد اللہ حق)۔

خدا فرماتا ہے کہ ہم نے آپ سے اور مومنین سے فتح و کامرانی، زمین کی خلافت اور کفر پر اسلام کے غلبے کا وعدہ کیا۔ اور یہ کہا ہے کہ نور کو ظلمت پر اور علم کو جہل پر غلبہ حاصل ہوگا۔

اس مقام پر کلمہ "وعد" سے مراد وہ وعدے ہیں جو قرآن میں مومنین کی فتح یابی کے بارے میں بار بار کیے گئے ہیں جن جملہ ان کے ہم اسی سورہ کی آیت ۴۷ میں پڑھتے ہیں:

وكان حقاً علينا نصر المؤمنين
مومنین کی مدد کرنا ہمیشہ ہم پر فرض رہا ہے اور ہے۔
اسی طرح سورہ مؤمن کی آیت ۵۱ میں ہے:

انا لنصر رسنا والذین امنوا فی الحیاة الدنیا و یوم یوم الاحشاء
ہم اپنے رسولوں اور مومنین کی اس دنیا کی زندگی میں اور ہر ذر قیامت جب کہ گواہ پیش ہوں گے مدد کریں گے۔

نیز سورہ مائدہ کی آیت ۵۶ میں ہے:

فان حزب الله هو الغالبون
بہ تحقیق حزب خدا ہی فتح مند ہے

دوسرا حکم الہی یہ ہے کہ آپ کفار سے اس سخت اور مسلسل جنگ میں اپنے اعصاب پر قابو رکھیں اور طبیعت کی متانت اور اطمینان قلب کو کبھی ہمت سے نہ جانے دیں۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے: جو لوگ ایمان نہیں رکھتے وہ ہمیں ہمت سے اور تندہی سے نہ بنا دیں۔ (ولا یستخفونک الذین لا یوقنون)۔

اس قسم کے لوگوں کے مقابلے میں آپ کا فرض بردباری، تحمل، حوصلہ اور حفظ متانت ہے کہ جو ایک پیغمبر کے ثلایان شان ہے۔ "لا یستخفونک" کا مادہ خفت سے یعنی "سبکی"۔

رسول کریم کو ہدایت ہے کہ آپ اس قدر ثابت قدم اور خود دار رہیں کہ یہ لوگ آپ کو سبک نہ سمجھیں لگیں اور آپ کو اپنے مقصد کی راہ سے ہٹانہ سکیں۔ آپ اپنی راہ نصب العین میں محکم اور استوار رہیجئے۔ کیونکہ وہ لوگ تو یقیناً نہیں رکھتے اور آپ یقین و ایمان کا مرکز ہیں۔

اس سورہ کا مومنین کی دشمنوں پر فتح کے وعدے سے آغاز ہوا تھا اور کامیابی کے وعدے ہی پر اس کا اختتام ہوتا ہے مگر اس فتح میں کی شرط اصلی رسول اور مومنین کا صبر و استقامت بیان کی گئی ہے۔

• پروردگار! تو ہمیں بھی ایسا صبر اور استقامت عطا کر کہ مشکلات و حوادث کے طوفان ہمارے استقلال میں خلل انداز نہ ہو سکیں۔

• خداوند! ہم تیری ہی ذات پاک کے دامن تحفظ میں پناہ لیتے ہیں۔

تاکہ ایسا نہ ہو کہ ہمارا شمار ان لوگوں میں ہو جن پر کسی وعظ، نصیحت، عبرت اور تحویف کا اثر ہی نہیں ہوتا۔
بار الہا - دشمن باہم مربوط اور متحد ہیں اور طرح طرح کے شیطانی اسکے سے مسلح ہیں۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ تو
ہمیں بیرونی دشمنوں اور اندرونی شیطانوں پر فرح عنایت کر۔ آمین - یارب العالمین!

سورہ روم کی تفسیر کا اختتام ہوتا ہے۔

۲۱ دفتہ ۲۰۲۰ء بھری

تفسیر نمونہ جلد ۱۶

کے ترجمے کا اختتام۔

اس تحریر پر تفسیر سید صفدر حسین نجفی فرزند سید غلام سرور نقوی مرقوم
کے اہوں اختتام پذیر ہوا۔

روز جمعہ

بوقت ساڑھے دس بجے صبح

بتاریخ ۸ ربیع الثانی ۱۴۰۳ھ بھری

بمطابقت ۲۰ دسمبر ۱۹۸۵ء عیسوی

برہن سید محمد نواز شمس علی - ۸۱-۸۱

(ان کے بیٹے محمد رضا سولہ کی شاوی خانہ آبادی کے روز)

والحمد لله اولاً و آخراً والصلوة على النبي وآله سرمداً ابداً

صفوحہ ۱۱۱

سُورَةُ لُقْمَانَ

○ مکہ میں نازل ہوئی

○ اس کے ۳۲ آیات ہیں

سورہ لقمان کے مضامین

مفسرین کے درمیان مشہور یہ ہے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا بعض علماء مثلاً شیخ طوسی نے تفسیر تمبیان میں اس کی مختصر سی آیات مثلاً چوتھی آیت جرنار اور زکوٰۃ کے بارے میں ہے یا نوح الدین رازی نے اس چوتھی آیت کے علاوہ سنا میوں آیت کو بھی مستثنیٰ کیا ہے یہ آیت خداوند عالم کے وسیع علم کے بارے میں بحث کرتی ہے لیکن اس قسم کے استثناء کو کوئی واضح دلیل نہیں ملتی۔ کیونکہ نارا اور اپنے نکل مضموم کے لحاظ سے زکوٰۃ لکڑی بھی موجود تھیں اور خداوند عالم کے وسعت علم کی حقیقت بھی کوئی ایسی چیز نہیں جس سے یہ پتہ چلے کہ یہ آیت مدنی ہے۔

اسی بنا پر سورہ لقمان مکی ہونے کے لحاظ سے دوسری مکی سورتوں کے مضامین پر مشتمل ہے اور اس میں بھی اسلام کے بنیادی عقائد مثلاً "ہمد" "و" "معاذ" اور "نہرت" کے سلسلہ میں بحث کی گئی ہے۔

بطور کلی اس سورہ کے مضامین پانچ حصوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں:

پہلے حصہ میں حروف متطعات کے ذکر کے بعد عظمت قرآن اور خاص صفات کے حامل مومنین کے لیے قرآن کا ہدایت اور رحمت ہونے کا اشارہ ملتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ایسے لوگوں کے بارے میں بھی گفتگو موجود ہے جو ان آیات کے بارے میں سختی اور مٹ دہری سے کام لیتے ہیں اور جنہیں قرآن نے ہر دم سے تشبیہ دی ہے۔ اور ایسے لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو اپنی غلط سرگرمیوں کی بدولت لوگوں کو قرآن سے منحرف کرنے رہتے ہیں۔

دوسرے حصہ میں آسمانوں کی تخلیق اور انہیں بغیر کسی ستون کے برقرار رکھنے اور زمین میں سپاٹا پیدا کرنے، مختلف جانور معرض وجود میں لانے، بادشہ نازل کرنے اور نباتات وغیرہ اگانے کا تذکرہ ہے۔

تیسرے حصہ میں خلاق عالم کی صفات اور قدرت کی مناسبت سے حضرت لقمان کے کچھ حکمت آمیز ارشادات کو بیان کیا گیا ہے۔ یہی تیسریں اس مرد خدا نے اپنے فرزند سے کہیں۔ چنانچہ ان نصاب میں توحید کے تذکرے اور شرک کے ساتھ معاذ آرائی کی منزل سے لے کر ماں باپ کے ساتھ نیک کرنے، امر المعروف اور نہی منکر کا فریضہ بجا لانے، سخت قسم کے حوادث کے مقابلہ میں صبر و شکیبائی کا مظاہرہ کرنے، لوگوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنے، نواضع اور فرتنی اختیار کرنے اور تمام امور میں اعتدال پیدا کرنے تک کا حکم موجود ہے۔

چوتھے حصہ میں ایک بار پھر توحید کے واپس پیش کئے گئے ہیں اور آسمان وزمین کی تسخیر اور خداوند عالم کی دافرتوں کا تذکرہ ہے۔ اس میں ایسے بت پرستوں کی مذمت کی گئی ہے جو صرف اپنے بڑوں کی تقلید میں گمراہی کی وادی میں سرگردان ہیں اور انہی سے خداوند عالم کی خلافت کا اقرار لینے کا ذکر ہے جو عبودیت کی بنیاد اور اسماں ہے۔

نیز اس سلسلہ میں قرآن اسی حصہ میں خداوند عالم کے وسیع اور بے انتہا علم سے ایک واضح مثال کے طور پر وہ اٹھاتا ہے اور اسی سلسلہ میں کائنات کی آفاقی نشانیوں کے ذکر کے علاوہ توحید نظری کا ذکر بھی موجود ہے جس کی تخلیق انسان کے امواج بلا میں گرفتار ہونے کے

وقت ہوتی ہے اور اس بارے میں یہاں نہایت عمدہ پیرائے میں بحث کی گئی ہے۔

پانچویں حصہ میں مہاد اور موت کے بعد زندگی کی طرت مختصر لیکن دل بردار سے والا اشارہ موجود ہے جو خیر دار کو رہا ہے کہ اس دنیاوی زندگی پر مغرور نہیں ہونا چاہیے، بلکہ آخرت کی مرستے جاودانی کی فکر میں رہنا چاہیے۔

یہاں پر پروردگار عالم کے علم غیب کے اس حصے کو بیان کیا گیا ہے جو انسان کے جلد امور سے متعلق ہے۔ ان امور میں سے انسان کی موت کا صحیح ہے اور وہ کچھ بھی جو ابھی حکم مادر میں ہے۔ خدا ان سب کیفیات سے باخبر ہے۔ اسی مطلب پر یہ سورہ پایہ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔

یہ بات بھی یاد رہے کہ اس سورہ کو "سورہ لقمان" سے موسوم کرنے کی وجہ وہی اہم اور پر مغز گفتگو ہے جو حضرت لقمان کی نصیحتوں پر مشتمل ہے اور یہ واحد سورہ ہے جس میں اس مرد دانائے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔

سورہ لقمان کی فضیلت:

اس سورہ کی فضیلت میں بہت سی روایات پیغمبر اسلام اور آئمہ اہلبیت سے نقل ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ حدیث پیغمبر اکرم سے مروی ہے:

من قرء سورۃ لقمان، کان لقمان لہ دفیقا یوم القیامۃ، واعطی من الحسنات عشتا بعدد من عمل بالمعروف وعمل بالمعکر۔

"جو شخص سورہ لقمان پڑھے، حضرت لقمان قیامت میں اس کے رفیق اور دوست ہوں گے اور جن لوگوں نے نیک یا بد اعمال انجام دئے ہیں (امر معروف اور نہی منکر کے حکم کے بعد) ان کی تعداد کے مطابق دس گنا نیکیاں اسے دی جائیں گی" ایک اور حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے:

من قرء سورۃ لقمان فی لیلۃ وکل اللہ بہ فی لیلۃ فلا ینزل علیہ من ابلیس وجنودہ حتی یصبر فاذا قرءھا بالنهار لم یزالوا یحفظونہ من ابلیس وجنودہ حتی یمسی۔

"جو شخص رات کو سورہ لقمان کی تلاوت کرے تو خداوند عالم تیس فرشتوں کو اس کی حفاظت کے لیے صبح تک شیطان اور اس کے لشکر کے مقابلہ کے لیے مامور کر دیتا ہے۔ اور اگر دن کو اس کی تلاوت کرے تو تیس فرشتے غروب آفتاب تک شیطان اور اس کے لشکر سے اس کی حفاظت کرتے ہیں"۔

ہم بار بار عرض کر چکے ہیں اور اب بھی یہی کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی ایک سورت پڑھنے کے اس قدر فضائل اس قدر ثواب اور اعزاز اس بنا پر ہیں کہ چونکہ تلاوت، فکر و نظر اور غور و فکر کا پیش قدمی ہوتی ہے اور غور و فکر عمل کرنے کا مقدمہ ہے۔ ورنہ محض زبانی قرآن پڑھ لینے سے ان تمام فضیلتوں کی توقع نہیں رکھنا چاہیے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱- اَلَمْ

۲- تِلْكَ اٰیٰتِ الْكِتٰبِ الْحَكِیْمِ

۳- هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِیْنَ

۴- الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ

هُمْ یُوقِنُوْنَ

۵- اُولٰٓئِكَ عَلٰی هُدًى مِّنْ رَبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمَفْلِحُوْنَ

ترجمہ

اللہ کے نام سے شروع جو رحمان و رحیم ہے

۱- الم-

۲- یہ کتاب حکیم کی آیات ہیں (مطاب سے بیز اور محکم آیات)۔

۳- نیک لوگوں کے لیے ہدایت و رحمت کا سبب ہیں۔

۴- وہی جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

۵- وہی لوگ اپنے پروردگار کی ہدایت پر ہیں اور وہی فلاح اور نجات پانے والے ہیں۔

تفسیر

نیکو کار کون لوگ ہیں؟

یہ سورہ قرآن مجید کی عظمت و اہمیت کے ذکر کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور حروف مقطعات کا اس کی ابتداء میں ہونا بھی اس

حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ یہ آیات جو الف باء جیسے مادہ سے حروف سے مرکب ہیں اس قسم کے عظیم اور اعلیٰ معنا حامل بھی ہیں جو انسانوں کی تقدیر کو بدل کر رکھ دیتی ہیں: (الم ۱)۔

لہذا حروف مقطعات کے ذکر کے بعد ارشاد ہوتا ہے: "یہ کتاب حکیم کی آیات ہیں" (تلك آیات الكتاب الحكيم)۔ "تلك" عربی زبان میں دور کے اشارے کے لیے آتا ہے اور جیسا کہ ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ یہ تعبیر خاص طور پر ان آیات کی عظمت و اہمیت کو زہی ہے۔ گویا یہ آیات آسمان کی سی ہندی اور نہایت ارفع مقام کی حامل ہیں۔

"کتاب" کو "حکیم" کے ساتھ موصوف کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یا تو اس کے مندرجات کا استحکام ہے کیونکہ باطل ہرگز اس تک حاصل نہیں کر سکتا۔ اور ہر قسم کی خرافات اور بیہوشی اس سے کوسوں دور ہے۔ یہ کتاب برائے حق کے کوئی بات نہیں کہتی اور براہ حق کے کسی چیز کی دعوت نہیں دیتی، ٹھیک "لعوا لحدیث" (نعوا اور یہودہ باتوں) کے مقابلے میں ہے جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

یاد رہے اس معنی میں ہے کہ یہ قرآن ایک دانشمند اور حکیم دانا عالم کی طرح ہے جو خاموش رہ کر بھی ہر ہرزبان گفتگو کرتا ہے تبلیغ ہے۔ پسند و نصیحت کرتا ہے، تشریح و ترمیم دلاتا ہے، غلاب سے ڈراتا ہے اور عبرت انگیز داستانیں بیان کرتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ ہر لحاظ سے حکمت سے لبریز ہے۔ اور یہ آغاز حضرت "لقمان حکیم" کی باتوں سے براہ راست مناسبت رکھتا ہے جن کا اس سر میں تذکرہ ہے۔

البتہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ مذکورہ بالا آیت میں "حکمت" کے دونوں معانی مراد لیے جائیں۔

بعد والی آیت نزول قرآن کا اصلی مقصد یوں بیان کرتی ہے: "یہ کتاب حکیم نیکو کاروں کے لیے سبب ہدایت و رحمت ہے

(ہدی و رحمة للمحسنین)۔

"ہدایت" و حقیقت مقدم اور تمہید ہے، رحمت پروردگار کے لیے کیونکہ انسان پہلے نور قرآن کی روشنی میں حقیقت کو معلوم کرے اور اس پر عقیدہ رکھتا ہے اور اسے اپنے عمل کا پیش خیمہ بناتا ہے اس کے بعد اپنے پروردگار کی وسیع رحمت اور بے انتہا نعمتوں کا حقدار بنتا ہے۔

یہاں پر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں قرآن بھی "حکیم" کے لیے ہدایت اور رحمت کا سبب شمار کیا گیا ہے اور سورہ نمل کی ابتداء میں "مؤمنین" کے لیے باعث ہدایت و بشارت بنا گیا ہے: (ہدی و بشری للمؤمنین)

اور سورہ بقرہ کی ابتداء میں "مؤمنین" کے لیے سبب ہدایت و بشارت بنا گیا ہے: (ہدی للمؤمنین)

یہ سبب ہے کہ یہ مختلف تعبیریں اس لیے ہوں کہ تقویٰ اور بیہوش نگاری کے بغیر حقائق کو قبول اور تسلیم کرنے کی روح انسان میں پیدا نہیں ہوتی اور نہ ہی طبعی طور پر کوئی ہدایت کا گشت ثابت ہوتی ہے۔ اور اگر حق کو قبول کرنے کے اس مرحلے سے گزر جائیں اور ایمان کا مرحلہ آجائے تو پھر ہدایت کے علاوہ نعمات خداوندی کی بشارت بھی موجود ہوگی۔

اور اگر ایمان اور تقویٰ کے مراحل سے گزر کر عمل صالح کی حد تک جانیں تو وہاں رحمت خدا میں بھی اضافہ ہوگا۔

اسی بناء پر اوپر والی آیت بندگان خدا کے تقدیر بھی کمال اور اتقانی مراحل میں سے سلسلہ دار تین مراحل کو بیان کرتی ہیں۔ حق کو

قبول کرنے کا مرحلہ، ایمان کا مرحلہ اور عمل صالح کا مرحلہ۔ اور قرآن ان تینوں مراحل میں بالترتیب "ہدایت" "بشارت" اور "رحمت" کا سرما ہے (غور کیجئے)۔

بعد والی آیت معین کو تین اوصاف کے ساتھ متصف کرتے ہوئے کہتی ہے "وہ ایسے لوگ ہیں جو نماز قائم کرنے میں متکون اور کرتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں" (الذین یقیمون الصلوة ویؤتون الزکوٰۃ وہم بالآخرۃ ہم یوقنون)۔ ان کا خالق کے ساتھ نماز کے ذریعہ اور مخلوق کے ساتھ زکوٰۃ کے ذریعہ اثر و رابطہ ہے اور قیامت کی عدالت کے بارے میں یقین ان کا قومی سبب ہے کہ وہ گناہ سے پرہیز اور فرائض کو ادا کرتے ہیں۔

اور عمل بھشت آخری آیت میں "معین" کی عاقبت اور انجام کار کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ "وہ اپنے پروردگار کے طریق ہدایت پر ہیں اور وہی رنگاری اور علاج پانے والے ہیں" (۱۱) وَلَقَدْ عَلَّمْتَهُ مَن رَّبِّهِمْ وَأَوَّلَتْكَ هُمُ الْمَفْجُوحُونَ۔ "اور لطف علی ہدای من ربہم" کا جملہ ایک طرف تو اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ پروردگار ان کی ہدایت کا ضامن ہے اور دوسری طرف "علی" کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ گویا ہدایت ان کے لیے ایک راہ ہمارا اور رکت ہے اور وہ اس پر سوار ہو کر مکمل طور پر اس پر تسلط ہیں۔

اور یہاں پراس "ہدایت" کا فرق اس ہدایت سے جو اسی سورہ کے آغاز میں آئی ہے واضح ہو جاتا ہے کیونکہ پہلی ہدایت حق کے قبول کرنے کی آمادگی ہے اور یہاں پر بیان شدہ ہدایت مقصد تک پہنچنے کا سرنامہ ہے۔ یاد رہے کہ "وَلَقَدْ عَلَّمْتَهُ مَن رَّبِّهِمْ" کا جملہ عربی ادب کے مطابق صحر کی دلیل ہے اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ نجات اور علاج کی راہ میں یہی ہے یعنی نیک لوگوں کی راہ، ان کی راہ جو خدا اور خلق خدا کے ساتھ قریبی رابطہ رکھتے ہیں، اور ان کی راہ جو مبدار اور معاد پر کامل ایمان رکھتے ہیں۔

۲۔ وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۗ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ۝

۴۔ وَإِذْ تَتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتِنَا وَلِي مُّسْتَكْبِرًا ۖ كَان لَّمْ يَسْمَعْهَا كَان فِي أذْنَيْهِ وَقَرَّ ۖ فَبَشَّرَهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝

۸۔ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتُ النَّعِيمِ ۝

۹۔ خَالِدِينَ فِيهَا وَعَدَّ اللَّهُ حَقًّا ۖ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

ترجمہ

۲۔ بعض لوگ باطل اور سمودہ باتیں (باقاعدہ) خریدتے ہیں تاکہ لوگوں کو جہالت و نادانی کی بنا پر گمراہ کریں اور آیات الہی کا استزاء کریں اور مذاق اڑائیں۔ ان کے لیے ذلیل اور خوار کرنے والا عذاب ہے۔

۴۔ جس وقت اس پر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ تکبر کی بنا پر ان سے منہ موڑ لیتا ہے گویا اس نے سنا ہی نہیں۔ گویا اس کے کان بالکل بہرے ہیں۔ اسے دروناک عذاب کی بشارت دے دو۔

۸۔ (لیکن) جو لوگ ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال انجام دیئے ہیں نعمتوں سے بھرے ہوئے بہشت کے باغات ان کے لیے ہیں۔

۹۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے، یہ خدا کا مسلم اور یقینی وعدہ ہے اور وہی عزیز و حکیم ذات قابل شکست اور دانائے ہے۔

شان نزول

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ زیر بحث پہلی آیات "انفسین" حادث کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، جو ایک تاجر شخص تھا اور تہمت

کی عرض سے ایران کا سفر کیا کرتا تھا اور ساتھ ہی ایرانیوں کی داستانیں قریش کے سامنے بیان کیا کرتا تھا۔ اور کتنا تھا کہ اگر محمد (ص) تمہارے سامنے ماہ و ثمود کی داستانیں بیان کرتا ہے تو میں رستم اور اسفندیار کے قصے کہانیاں اور کسری اور سلطین عجم کی خبریں سننا ہوں چنانچہ وہ اس کے گرو بیٹھ جاتے اور قرآن کو چھوڑ کر اس کی داستانوں کو خوب غور سے اور کان لگا کر سنتے تھے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ آیات کا یہ حصہ اس شخص کے بارے میں نازل ہوا ہے جس نے ایک گویا لوندی خرید رکھی تھی جو وہ دن رات گانے گا گا کر اسے یاد دلا رہے غافل کشتی تھی۔

عظیم مفسر طبری مرحوم اس شان نزول کو ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ وہ حدیث جو بیخبر اسلام سے اس سلسلے میں نقل ہوئی ہے وہ اسی نظریے کی تائید کرتی ہے کیونکہ آنحضرت فرماتے ہیں:

لا یحل تعلیم المغنیات ولا بیعہن ، و اشعانہن حرام ، و قد نزل تصدیق ذلک فی کتاب اللہ " و من الناس من یشتری لہوا الحدیث

گانے والی کیزوں کو تعلیم دینا اور ان کی خرید و فروخت کرنا اور اس طریقہ سے حاصل کی ہوئی آمدنی سب کچھ حرام ہے۔ اور یہ آیت اسی مطلب پر شاہد ہے: (و من الناس من یشتری لہوا الحدیث)

تفسیر

غنا ثیاطین کے بڑے جالوں میں سے ایک جال ہے :

ان آیات میں گفتگو اس گروہ کے بارے میں ہے جو "غنین" اور "مومنین" کے گروہ کے بالکل مد مقابل قرار دیئے گئے ہیں جن کا ذکر گذشتہ آیات میں ہو چکا ہے۔

یہاں پر گفتگو ان لوگوں کے بارے میں ہے جو اپنے سرمائے کو بیوہ اور لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور اپنے لیے دنیا و آخرت کی بد بختی مول لیتے ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: "بعض لوگ وہ ہیں جو باطل اور بے ہودہ باتیں خرید کرتے ہیں تاکہ خلق خدا کو جہالت اور نادانی کی بنا پر راہِ خدا سے گمراہ کر دیں" (و من الناس من یشتری لہوا الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بخیر علم) اور یہ آیات خدا کا مذاق اڑاتے ہیں: (و یشخذ ہا ہنؤا)

اور آیت کے آخر میں ارشاد فرماتا ہے: "یہ لوگوں کے لیے رسوا کن عذاب ہے" (و اولئک لہم عذاب مہین)۔

باطل اور بے ہودہ باتوں کی خریداری یا تو اس طرح ہے کہ وہ واقفاً باطل اور خرافات سے بھر پور داستانیں پیسے دے کر حاصل

لے۔ لیکن یہاں کی تفسیر "آیات الکتاب" کی طرف لوٹ رہی ہے جس کا ذکر گذشتہ آیات میں ذکر ہو چکا ہے۔ اور بعض مفسرین کا احتمال یہ ہے کہ یہ فقط "بہن" کی طرف لٹتی ہے جو قرآن مجید میں بھی مذکور کبھی مونت استعمال ہوا ہے۔

کرتے ہیں جیسا کہ "مفسرین عارث" کا واقعہ بیان ہو چکا ہے۔

اور یا اس طرح سے ہے کہ لہو و لعب اور راگ و رنگ کی محفلیں گانے والی کیزیں خرید کر منعقد کرتے ہیں جیسا کہ اسی آیت کے شان نزول کے ضمن میں بیخبر اکرم کی حدیث بیان ہو چکی ہے۔

یاد وہ مال و دولت کو اس طرح خرچ کرتے ہیں کہ چاہے کچھ ہو جائے وہ اس غیر شرعی مقصد یعنی باطل اور بے ہودہ باتوں تک رسائی ضرور حاصل کر لیں۔

تعب کی بات یہ ہے کہ بیول کے اندھے باطل اور لغویات کو تو گراں ترین قیمت ادا کر کے بھی خرید لیتے ہیں لیکن آیات الہی اور حکمت سے بھر پور اقوال جو خداوند عالم نے طاہریت انہیں دینے میں ان کی پروا تک نہیں کرتے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہاں پر اشتراء یعنی خریداری کو کتنا یہ سے طرز پر استعمال کیا گیا ہو جس سے مراد اس مقصد تک پہنچنے کے لیے ہر قسم کی سعی و کوشش ہے۔

لیکن "لہوا الحدیث" کا ایک وسیع مفہوم ہے جو ہر قسم کی باتوں یا سرگرم رکھنے اور غافل کرنے والی راگ و رنگ کی سڑوں اور جگڑوں کو بھی شامل ہے جو انسان کو بے ہودگی یا برائی کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہیں۔ چاہے وہ غنا ہو گا نا ہو، شہوت انگیز و ہوس آور لٹن اور آہنگیں ہوں یا ایسی تقریریں اور تحریریں جو آہنگ و طرز کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنے مفہوم و مطالب کے لحاظ سے انسان کو برائیوں کی طرف کھینچ کر لے جائیں۔

یاد لوں طریقوں سے جیسا کہ عام گانے والوں کی تصنیفات اور عقیدہ اشعار ہوتے ہیں۔ اور ان کے مضامین بھی گمراہ کن ہوتے ہیں اور آہنگیں اور سری بھی۔

یاد وہ باہیات اور خرافات قصے کہانیاں اور داستانیں ہوتی ہیں جو لوگوں کو خدا کے مقرر کردہ "مراط مستقیم" سے انحراف کا سبب بنتی ہیں۔

یا تفسیر آمیز اور سہی مذاق پر مبنی باتیں جو تہی کو مٹانے اور ایمان کی بنیادوں کو کمزور کرنے کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔ جیسا کہ ابو جہل اور اس کے اصحاب کے بارے میں ابھی بیان کر چکے ہیں کہ وہ قریش کی طرف منہ کر کے کہتا تھا:

" آیاتم چاہتے ہو کہ تمہیں وہ "زقوم" کھلاؤں جس سے تمہیں ڈراتے ہیں؟ "

پھر وہ کسی کو بھیج کر کہیں اور فرما " منکوا لیتا اور کہتا " یہ وہی زقوم ہے " اور اس طرح سے وہ آیات الہی کا مذاق اڑاتا تھا۔

بہر حال "لہوا الحدیث" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو ان تمام مذکورہ اشیاء اور امور کو شامل ہے۔ اور اگر اسلامی روایات اور مفسرین کے اقوال میں ان میں سے کسی ایک کو اختیار کیا جائے تو وہ ہرگز آیت کے مفہوم کے انحصار اور محدودیت کی دلیل نہیں ہے۔

جو احادیث اہل بیت اطہار (ع) سے بہت پہنچی ہیں ان میں ایسی تفسیریں نظر آتی ہیں جو اس لفظ کے مفہوم کی وسعت کو بیان کرتی ہیں۔

مجملاً ان کے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے :

الغناء مجلس لا یسئل اللہ ائی اھلہ، و هو من قال اللہ عن وجہ " و من الناس من یشتری لہوا الحدیث لیضل عن سبیل اللہ ۔

غنا اور لودھیب کی محض ایسی محض ہے جس کے اہل پر خدا اپنے لطفت و کرم کی نگاہ نہیں ڈالتا۔ اور یہ اسی آیت کا مصداق ہے کہ خداوند عزوجل فرماتا ہے بعض لوگ ایسے ہیں جو بہرہ و بائوں کو خرید کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو راہ خدا سے گمراہ کریں یہ الحدیث اللغو کی بجائے لھو الحدیث کہ بیان کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا اصل مقصد ترویج لودھیب سے بائت یا گفتگو تو اس تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔

”لیصل عن سبیل اللہ“ کا جملہ بھی ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جہاں عقائدات سے گزرا کر سنے کو بھی شامل ہے جیسا کہ اسی نص میں صراحت اور ابو جہل کی داستان میں بیان ہو چکا ہے۔ اور اخلاقی طور پر گمراہ کرنے کو بھی شامل ہے جیسا کہ غنا کے بارے میں مذکور احادیث میں آیا ہے۔ ”بخیر صلہ“ کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ گمراہ اور مخرف گروہ اپنے باطل مذہب پر بھی ایمان نہیں رکھتا بلکہ صرف جہالت اور اندھی تقلید کی وجہ سے دوسروں کی پیروی کرتے ہیں اور ایسے جاہل ہیں کہ دوسروں کو بھی اپنی جہالت اور نادانی میں پھنساتے ہیں۔

یہ اس صورت میں ہے کہ گمراہ ”بخیر صلہ“ کی تعبیر کو گمراہ کرنے والوں کی صفت قرار دیں۔ لیکن بعض مفسرین کا یہ خیال بھی ہے کہ شاید ”گمراہ ہونے والوں“ کی صفت ہے یعنی وہ جاہل اور بے خبر لوگوں کو لاشعوری طور پر وادی انحراف و باطل کی طرف پہنچانے جانتے ہیں۔

یہ بے خبر لوگ بھی کھٹار اس سے بھی اگے چلے جاتے ہیں یعنی وہ صرف ان سرگرمیوں کھیل کر اور غافل کرتے والی حرکتوں پر ہی قانع نہیں ہوتے بلکہ اپنی فضول لالچین اور بے ہودہ باتوں کو آیات الہی کے مذاق اور تفسیر کا ذریعہ قرار دیتے ہیں اور یہ وہی چیز ہے جس کی طرف اوپر والی آیت کے آخر میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ”وینخذھاھن فی“

باقی رہا ”عذاب“ کو مہین... (خوار اور سوا کرنے والا) کے ساتھ مصروف کرنا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سزا کو جرم کے مانند ہرنا چاہیے۔ انہوں نے آیات الہی کی توہین کی تو خدا نے بھی ان کے لیے وہی سزائیں کی ہے جو دردناک ہونے کے علاوہ وقت آمیز بھی ہے۔

بعد والی آیت، آیات الہی کے مقابل میں اس گروہ کے رد عمل کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ حقیقت لہو الحدیث کے مقابل میں ان کے رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے فرماتا ہے ”جس وقت ان کے سامنے آیات پر ظہی جاتی ہیں تو وہ تنگی انداز میں متہم پھرتے گویا اس نے ہماری آیات کو سنا ہی نہیں۔ گویا اس کے کان بہرے ہیں“ اور وہ بالکل ہی کوئی بات نہیں سنا: (و اذا تتلى عليه آياتنا ولى مستكبرا كان لم يسمعها كاذبا في اذنيه و حقرا)۔

اور آخر میں اس شخص کی سزا اور دردناک عذاب کو اس طرح بیان کرتا ہے ”اس کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو اور بخشو بعد عذاب الیم“۔

”ولی مستکبرا“ کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس کا گردن کرنا اس لیے نہیں ہوتا کہ اس کے دنیاوی مفادات اور ہوس رانی پر زور پڑ رہی ہوتی ہے بلکہ معاملہ تو اس سے بھی بالاتر ہے اور وہ یہ کہ خدا و آیات خدا کے مقابل میں استکبار و تکبر جو عظیم ترین گناہ ہیں اس کے عمل میں موجود ہیں۔

توجہ طلب بات یہ ہے کہ پچھلے تو یہ کہا ہے کہ ”وہ اس طرح آیات الہی سے بے اعتنائی کرتے ہیں گویا انہیں سنا ہی نہیں اور مکمل طور

پر بے اعتنائی کے ساتھ ان کے قریب سے گزر جاتے ہیں“ پھر مزید کتاب کے کردہ معرفت یہ کہ ان آیات کو سنا ہی نہیں ہو رہا باطل بہرہ ہے اور کوئی بات نہیں سن پاتا۔

اس قسم کے افراد کی سزا بھی ان کے اہمال سے مطابقت رکھتی ہے کہ جس طرح ان کا عمل اہل حق کے لیے دردناک تھا خدا نے اس کی سزا بھی دردناک مقرر کی ہے کہ انہیں دردناک عذاب میں گرفتار کرے گا۔

اس نکتہ کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ ”بخیر“ (خوشخبری دیدار) کی تعبیر خدا کے دردناک عذاب کے سلسلہ میں ایسے مشکربین کے کام کے شایان شان ہے جو آیات الہی کا مذاق اڑاتے اور ابھل جیسے افراد جو ”تقوم بہتم“ کی ”کھن اور غر“ سے تعبیر کرتے تھے۔

بعد والی آیت میں پچھلے مومنین کے حالات کی تفصیل و تشریح کی طرف اشارہ ہے کہ ابتداء میں جن کے ساتھ یہ نقل و حرکت ہوا آخرین مقام بھی ان ہی پر کرتا ہے فرماتا ہے ”جو لوگ ایمان لائے اور صل صالح انجام دیا تو نعمت سے بھر پور جنت کے باغات ان سے لیے ہیں؛ الذین آمنوا و سئلوا الصالحات لھم جنت النعیم“۔

جی ہاں یہ گروہ مومنان، بے ایمان مستکربین اور دل کے اندھوں کے بالکل برعکس ہے جو زندگی میں خدا کے آیتوں کو دیکھتے ہیں اور نہ ہی خدا کے بھیجے پیغمبروں کے ارشادات کو دل کے کانوں سے سنتے ہیں بلکہ یہ مومنین لوگ بیدار عقل و ذرہ اور خیر ہیں۔ اللہ شکر کے علم سے جہل انہیں عطا فرماتے ہیں آیات الہی پر ایمان بھی لاتے ہیں اور اپنے اہمال صالحین انہیں استعمال ہی کرتے ہیں۔ پھر ہرگز سے کی بات یہ ہے کہ وہ مشکربین ”عذاب الیم“ کے اور یہ مومنین ”جنت النعیم“ کے متعلق ہیں۔

زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جنت کے یہ نعمتوں بھرے باغات ان کے لیے جاودا نہ اور ہمیشہ کے لیے ہیں ہمیشہ ہی میں رہیں گے؛ (خالدين فيها)۔

”خدا کا اہل اور قوم وہ جس کی خداوندی برگزینی ہوگی“ ”وعد اللہ حقا“ خدا تو جو جو تمادادہ کرتا ہے اور نہ ہی وہ اپنے اللہ کی وقائی سے عاجز ہے کیونکہ ”وہ عزیز“ صاحب قدرت اور حکیم و آگاہ ہے؛ (و هو العزیز الحکیم)۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ مشکربین کے بارے میں ”عذاب“ بصورت مفرد ذکر ہوا ہے اور صالح مومنین کے بارے میں ”جنت“ کو جمع کی صورت میں بیان کیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کی رحمت ہمیشہ اس کے غضب پر سہکتا رہتی ہے۔

خدا اور خدا کے وعدہ حق پر تاکید کرنا بھی ”رحمت“ کے غضب پر زیادہ ہونے کی تاکید ہے ”نعیم“ جو نعمت کے لیے ہے ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو ہر قسم کی مادی اور معنوی نعمتوں کو شامل ہے یہ بھی ایک گناہ کی سزا ہے کہ ان نعمتوں کو بھی جھٹکا کر دینا ہے۔ ان میں مجوس و تنقید لوگوں کے لیے قابل اور آگ ہیں۔ ”راغب“ اپنی کتاب ”مفردات“ میں کہتے ہیں کہ ”نعیم“ بہت سی نعمتوں کے معنی میں ہے (النعیم النعمة) لکھی ہے۔

چند قابل توجہ نکات

۱۔ غنا کی حرمت؛

اس میں شک نہیں کہ غنا کا نام مشہور شیعوں علماء کی نظر میں حرام ہے اور اجماع و اتفاق کی حد تک شہرت کا حساب ہے۔

بغض الفساق "فاسق لوگ ہی اس کے پیچھے چلتے ہیں" اور امام شافعی نے تو صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ: "گانے والوں کی شہادت روگوا ہی قابل قبول نہیں ہے اور یہ خود ان کے فسق کی دلیل ہے" شافعی کے اصحاب سے بھی نقل ہوا ہے کہ وہ اس بارے میں ان کا فتویٰ حرمت پر مبنی جانتے ہیں باہر خلافت اس کے برخلاف لوگوں نے خیال کیا ہے بلکہ

۲- غنا کیا ہے؟

حرمت غنا کے بارے میں تو چنداں مشکل نہیں، مشکل امر تو غنا کے موضوع کی تشریح ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر اچھی اور خوبصورت آواز غنا ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہے! کیونکہ اسلامی روایات میں بھی ہے اور مسلمانوں کی بہت سی بات کو بیان کرتی ہے کہ قرآن، اذان اور اس قسم کی دوسری چیزوں کو اچھی اور زیبا آواز سے پڑھنا چاہیے۔ کیا غنا ہر وہ آواز ہے جس میں "ترجیح بزدلگی میں آواز کی الٹ پھیر سے اصطلاح میں آواز کا پھیرنا یا اگر گری مارنا کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ثابت نہیں۔ اس بارے میں تو کچھ فقہاء اور اہل سنت کے بیانات سے مجموعی طور پر استفادہ کیا جاسکتا ہے یہ ہے کہ غنا، طرب، اُغیر، آبتلون، شرود، السواور باطل کو کہتے ہیں۔

زیادہ واضح الفاظ میں وہ آبتلون اور طرب میں جو فسق و فجور اور اہل گناہ و فساد کی محفلوں کے لائق اور شایان ہیں۔ غنا میں شامل ہیں۔ بالفاظ دیگر غنا اس آواز کو کہا جاتا ہے جو انسان کے اندر شہوانی طاقتوں کو بھان میں لائیں اور انسان اس حالت میں محسوس کرے کہ اگر اس آواز کے ساتھ ساتھ شراب اور سستی لذت بھی ہوں تو مکمل طور پر مہلک ہوگا۔ یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ کبھی ایک "آبتنگ" و طرب تو وہی غنا۔ لہذا اور باطل ہے، اور اس کے مشمولات اور مضامین بھی وہ اس لحاظ سے کہ عشق اور فساد اچھا۔ اشارہ کو مطرب یا آبتنگوں اور طربوں کے ساتھ پڑھا جائے۔ اور کبھی صرف آبتنگ و طرب فتنہ ہوتی ہے اس طرح سے کہ اچھے مطالب پر مبنی اشعار یا قرآنی آیات، دعا اور مناجات کو اس طرز کے ساتھ پڑھیں جو عیاش اور بدکار افراد کی محافل کے لائق ہوتی ہیں تو ان دونوں صورتوں میں حرام ہے۔ (غور کیجئے)۔

اس نکتہ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ بعض اوقات غنا کے دو معنی رکھے جاتے ہیں "عام معنی" اور "خاص معنی" خاص معنی تو وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ یعنی شہوت کو بھڑکانے والی اور فسق و فجور کی محفلوں سے تعلق رکھنے والی آبتنگ، طربوں اور سرس، لیکن اس کا عام معنی ہر قسم کی اچھی آواز ہے۔ لہذا جن لوگوں نے غنا کی عام معنی سے تفسیر کی ہے اس کی دو تفسیریں ہیں، "حلال غنا" اور "حرام غنا"۔

لہذا تفسیر روح المعانی اسی کے ذیل میں۔

حرام غنا سے مراد وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اور حلال غنا سے مراد زیبا اور اچھی آواز ہے جو فساد اچھا بھی نہ ہو اور فسق و فجور کی محفلوں سے بھی اس کا تعلق نہ ہو۔

تو اس بنا پر تقریباً اصل تحریم غنا میں کوئی اختلاف نہیں ہے صرف اس کی تفسیری نوعیت میں اختلاف ہے۔ البتہ دوسرے معانی میں کی طرح غنا کے مشکوک مصداق بھی ہیں جہاں انسان واقفا نہیں جان سکتا کہ حلال آواز فسق و فجور کی محافل سے تعلق رکھتی ہے یا نہیں؟ تو اس صورت میں اصل برائت کے حکم کے تحت اس پر حلال ہونے کا حکم لگایا جائے گا، البتہ تعریف بالا کے مطابق غنا کے عربی معنوم کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد۔

یہاں یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ سماج یعنی عربی آوازیں، طربوں اور آبتنگوں جو جنگ یا ورزش وغیرہ کے میدانوں سے تعلق رکھتی ہیں، ان کی حرمت پر کوئی دلیل نہیں ملتی۔

البتہ غنا کے سلسلے کی ایک مباحث میں از قبیل ان چند استثنیات کے جن کے بعض علماء قائل ہیں اور بعض قائل نہیں ہیں۔ اسی طرح کئی اور مسائل جن کا تعلق غنا سے ہے۔

آخری بات جس کا تذکرہ یہاں پر ضروری سمجھتے ہیں یہ ہے کہ جو کچھ ہم نے اوپر لکھا ہے اس کا تعلق صرف اور صرف غنا اور گانے سے ہے، رہا موسیقی اور اس کے آلات کا استعمال وہ ایک علیحدہ بحث ہے جو ہمارے اس موضوع سے باہر ہے۔

۳- حرمت غنا کا فلسفہ:

"غنا" کے معنوم میں ان شرائط کے ساتھ مکمل طور پر غرض سے کہ جن کی تفصیل و تشریح ہم بیان کر چکے ہیں، اس کی حرمت کا فلسفہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔

اگر اس میں غنڈا سماجی غور و فکر سے کام لیا جائے تو اس کے مندرجہ ذیل مفسد اور تباہ کاریوں کا پتہ چلتا ہے: **الف: اخلاقی تباہ کاریوں کی رغبت**، تجربہ بتاتا ہے اور تجربہ ہی بہترین شاہد ہے کہ بہت سے افراد غنا اور راگ کی سرود اور طربوں سے متاثر ہو کر تقویٰ اور پرہیزگاری کی راہ کو چھوڑ کر خواہشات نفسانیہ کی تکمیل کا رخ کر چکے ہیں۔

عام طور پر مجالس غنا انواع و اقسام کی خرابیوں کا مرکز ہیں اور جو چیز ان خرابیوں کو دعوت بخشتی ہے وہ غنا ہی ہے۔ بعض غیر ملکی اخبارات کی رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ راگ و رنگ کی کسی محفل میں جہاں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے تھے وہاں پر غنا کی ایک ایسی طرز دکائی گئی کہ اس سے ان کے جذبات اس قدر بھڑک اٹھے کہ وہ بیٹے قابو ہو کر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے اور اس قدر جنسی برائیوں کا ارتکاب کیا کہ ان کے ذکر سے شرمتا ہے۔

تفسیر روح المعانی "میں" جنی امیر نے کسی مردار سے یہ بات نقل کی گئی ہے کہ اس نے امویوں سے کہا راگ و رنگ اور گانے بجانے سے پرہیز کرو کیونکہ یہ شرم و حیا کو کم، شہوت میں اضافہ اور شخصیت کو بے آبرو کر دیتے ہیں، شراب کے بانٹین ہیں اور وہی سب کچھ کر گزرتے ہیں جو مستی کرتی ہے بلکہ

لہذا تفسیر روح المعانی جلد ۲ صفحہ ۶۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ راگ و رنگ اس قدر بڑی چیزیں ہیں، انہیں یہ لوگ بھی سمجھ چکے تھے۔

اور اگر اسلامی روایات میں ہمیں بار بار یہ چیز نظر آتی ہے کہ غنا اور راگ دل میں روح نفاق کی پرورش کرتا ہے تو اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ روح نفاق وہی فساد سے آلودہ اور تقویٰ اور پرہیزگاری سے کنارہ کشی اختیار کرنے والی روح ہوتی ہے۔ نیز اگر روایات میں آئیے کہ جس گھر میں گانا گایا جاتا ہے فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے تو بھی اسی فساد کی آلودگی کی وجہ ہوتی ہے کیونکہ فرشتے خود پاک ہیں اور پاکیزہ چیزوں کے طالب ہوتے ہیں لہذا وہ اس قسم کے آلودہ ماحول سے بیزار ہوتے ہیں۔

ب۔ یاد خدا سے غفلت: بعض اسلامی روایات میں غنا کی تفسیر میں اسے "لغو" بھی کہا گیا ہے، تو یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ غنا انسان کو شہوات میں اس طرح مست کر دیتا ہے کہ وہ یاد خدا سے غافل ہو جاتا ہے۔

اوپر والی روایات میں ابھی ہم پڑھ چکے ہیں کہ "لغو الحدیث" "سبیل اللہ" سے "مخالفت" مگر ابی کا ایک عامل اور عذاب الیم کا موجب ہے۔

ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

كل ما الهی عن ذكر الله فهو من العیبر۔ ہر وہ چیز جو انسان کو یاد خدا سے غافل اور شہوات

نفسانیہ میں داخل کر دے وہ تمار یا جوئے کے حکم میں سے ہے۔

ج۔ اعصاب پر اس کے مضر اثرات: غنا اور موسیقی درحقیقت اعصابی نشے کے اہم عامل ہیں۔ دوسرے لفظوں میں منشیات کبھی تو منہ کے ذریعہ یا پینے کی وجہ سے انسان کے جسم میں داخل ہوتے ہیں (جیسے شراب ہے)۔

کبھی سوئگھنے یا قوت شاکر کے ذریعہ (جیسے بیرون ہے)۔

کبھی انجکشن INJECTION کے ذریعہ (جیسے مارفین ہے)۔

اور کبھی قوت سامعہ (کانوں کے ذریعہ) جیسے راگ و رنگ اور غنا دگانا ہے)۔

اسی بنا پر کبھی کبھی غنا اور اس کی مخصوص طرز میں انسان کو نشے میں اس قدر غرق کر دیتی ہیں کہ اس میں مستی ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے

البتہ بعض اوقات اس مرحلے تک نہیں پہنچتا لیکن پھر بھی معمولی سا نشہ ضرور ابھی جاتا ہے۔

اسی بنا پر غنا میں منشیات کے بہت سے مفسد پائے جاتے ہیں چاہے وہ منصفیت ہوں یا شدید مشرور موسیقی دانوں کے

حالات زندگی کا اچھی طرح مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی عمر کے دوران تدریجاً ایسی روحانی تکالیف اور پریشانیوں سے دوچار

ہو جاتے ہیں کہ زمرہ ذمہ اپنے اعصاب کھو بیٹھے ہیں بلکہ کچھ لوگ تو نفسیاتی بیماریوں میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں اور بعض لوگ اپنے عقل و

شعور کو کھو بیٹھے ہیں اور پھر دیار جنوں کی طرف اس پار ہو جاتے ہیں۔ کچھ مفلوج، عاجز اور ناتواں ہو جاتے ہیں۔ اور بعض تو موسیقی کے دوران

ہی خون کے دباؤ BLOOD PRESSURE میں مبتلا ہو کر ناگمانی سکتے کا شکار ہو جاتے ہیں۔

بعض کتب جو انسانی اعصاب پر موسیقی کے مضر اثرات کے سلسلے میں لکھی گئی ہیں، ان میں موسیقی دانوں اور گلوکاروں کی ایک

جماعت کے بارے میں آیا ہے کہ وہ اپنا پروگرام پیش کرتے ہوئے حرکت قلب بند ہو جاتی ہے کی وجہ سے قہراً اجل بن گئے۔

۱۔ دماغی نشید جلد ۱۲ صفحہ ۲۲۵ - ۲۲۶ کتاب تاثیر موسیقی بر روان و اعصاب صفحہ ۲۰۷ - ۲۰۸ تاثیر موسیقی بر روان و اعصاب صفحہ ۹۲ اور ابجد۔

غلاصہ یہ کہ اعصاب پر غنا اور موسیقی کے مضر اثرات، جنون کی پیدائش، خون کے دباؤ اور دوسری ناپسندیدہ تحریکات اس کثرت سے ہیں کہ ان پر زیادہ بحث کرنے کی جہلا ضرورت نہیں۔

موجودہ دور میں اس قسم کی اموات کے بارے میں جو اعداد و شمار جمع کئے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ دور کی نسبت اس زمانہ میں ناگمانی اموات کی تعداد زیادہ ہے اور اس اضافے کے متعدد عوامل ہیں جن میں سے ایک عالمی سطح پر موسیقی اور غنا کی افزائش ہے۔

۴۔ غنا، استعمار کا ایک حربہ ہے:

عالمی استعمار ہمیشہ سے عوام خاص کر نوجوان نسل کی بیداری سے دشت زدہ ہے اس بنا پر وہ اپنے ناپاک مرام کی تکمیل کے لیے اپنے وسیع پروگراموں میں معاشرے کو غفلت، لاعلمی اور ناگمانی اور انواع و اقسام کی غلط سرگرمیوں کو شامل کئے ہوئے ہے تاکہ اس طرح سے وہ ان کا بیڑہ فرق کر دے۔

چنانچہ موجودہ دور میں اشیاء منشیات صرف تجارتی اہمیت کی حامل ہی نہیں رہیں بلکہ استعمار کا ایک اہم سیاسی حربہ بھی ہیں۔ غنائی کے مراکز کا قیام، جوئے اور قمار بازی کے کلبوں CLUBES کی دست اسی طرح کی دوسری غلط سرگرمیاں ہیں جن میں سے غنا اور موسیقی کو رواج عام دینا بھی شامل ہے اور وہ استعمار کے عظیم آلات میں سے ایک ہے جس کے ذریعہ وہ لوگوں کے افکار کو مفلوج کرنے کی کوشش میں مہر دہ ہے۔ اسی بنا پر دنیا بھر کے ریڈیو کے اوقات کا بیشتر حصہ موسیقی پر درگام پر مشتمل ہوتا ہے اور ذرائع ابلاغ عامہ کا ایک اہم اور عمدہ موضوع ہے۔

۱۰۔ خَلَقَ السَّمَوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَالْأَرْضِ فِي الْأَرْضِ
رَوَّاسِي أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَأَنْزَلْنَا
مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ
كَرِيمٍ ۝

۱۱۔ هَذَا خَلْقُ اللَّهِ فَأَرُونِي مَاذَا خَلَقَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ بَلِ الظَّالِمُونَ
فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ۝

ترجمہ

۱۰۔ آسمانوں کو قابل رویت ستاروں کے بغیر خلق کیا اور زمین میں پہاڑ رکھے تاکہ تمہیں لرزنا نہ دے اور ہر قسم کے حرکت کرنے والے کو اس پر پھیلا دیا۔ اور ہم نے آسمانوں سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعہ ہم نے روئے زمین پر مختلف قسم کے قیمتی نباتات کے جوڑے جوڑے اگائے۔

۱۱۔ یہ خدا کی خلقت ہے لیکن مجھے دکھاؤ کہ خدا کے علاوہ جو معبود ہیں انہوں نے کس چیز کو پیدا کیا ہے؟ لیکن ظالم تو واضح گمراہی میں ہیں۔

تفسیر

دوسروں نے کیا پیدا کیا؟

اس بحث کے بعد جو گذشتہ آیات میں مشرکان اور اس پر ایمان کے بارے میں تھی موجودہ دو آیات میں توحید کے بارے میں ایک اور دلیل کا ذکر ہے جو عقیدہ کی نہایت بنیادی اصل ہے۔ پہلی آیت میں پروردگار عالم کی آفرینش کے پانچ حصوں کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو آپس میں اوسط رشتہ رکھتے ہیں آسمان کی

خلقت، کرات کا فضا میں معلق ہونا، زمین کا اپنی جگہ برقرار رہنا، پہاڑوں کی پیدائش اور پھر جانداروں کی تخلیق، اس کے بعد پانی اور نباتات کی پیدائش جو ان کی غذا کا ذریعہ ہیں، چنانچہ فرماتا ہے:

خدا نے آسمانوں کو ایسے ستاروں کے بغیر پیدا کیا ہے جو قابل رویت ہوں (خلق السماوات بغير عمد ترونها)۔

”عمد“ (بروزن قرآن) عمود کی جمع ہے جس کا معنی ہے ستون اور اسے ”ترونها“ کے ساتھ مقید کرنا، اس بات کی دلیل ہے کہ آسمان مرنی (دیکھے جانے والے) ستون نہیں رکھتے۔ بالفاظ دیگر اس کے ستون تو ہیں لیکن قابل رویت نہیں چنانچہ اس سے پہلے بھی ہم سورہ رعد کی تفسیر میں کہہ چکے ہیں کہ یہ تعبیر قانون جاذبہ و دافعہ (کشش ثقل) کی جانب ایک لطیف اشارہ ہے جو نظر نہ آنے والے بہت ہی قوی ستاروں کی طرح آسمانی کرات کو اپنی جگہ برقرار رکھے ہوئے ہے۔

اس حدیث میں جسے ”حسین بن خالد نے امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے نقل کیا ہے اس معنی کی تفسیر موجود ہے۔ امام نے فرمایا:

سبحان اللہ! لیس اللہ يقول بغير عمد ترونها؛ قلت بلى؛ فقال: نعم عمد ولكن لا ترونها

”سبحان اللہ! کیا خدا نہیں فرماتا بغیر ستاروں کے کہ جنہیں تم مشاہدہ کرو؟“

راوی کہتا ہے، میں نے عرض کیا جی ہاں! تو فرمایا:

پس ستون ہیں لیکن تم انہیں نہیں دیکھ پاتے۔ صلہ وصلہ

بہر حال اوپر والا جملہ قرآن مجید کے علمی معجزات میں سے ایک ہے جس کی مزید تفصیل سورہ رعد کی آیت ۲ کے ذیل میں جلد ۵ صفحہ ۱۶۱ میں لائے ہیں۔

اس کے بعد پہاڑوں کی آفرینش کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے ”خدا نے زمین میں پہاڑ رکھے ہیں تاکہ زمین تمہیں مضطرب اور متزلزل نہ کرے“ (وَاللّٰهُ فِي الْاَرْضِ رَوَّاسِيٌّ لِّئَلَّا تَمِيدَ بِكُمْ)۔

یہ اور اس قسم کی دوسری قرآنی آیات اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ پہاڑ زمین کے ٹھکانہ اور نباتات کا ذریعہ ہیں۔ موجودہ زمانے میں علمی لحاظ سے بھی یہ حقیقت ثابت ہو چکی ہے کہ پہاڑ متعدد جہات سے ثبات زمین کا سبب ہیں۔

اس لحاظ سے بھی کہ ان کی جڑیں ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں جو ایک حکم نرہ کی طرح کڑا جنس کو اندرونی حرارت سے پیدا ہونے والے دباؤ کے مقابلہ میں محفوظ رکھتے ہیں۔ اور اگر یہ نہ ہوتے تو نہایت خطرناک اور تباہ کن زلزلے اس قدر ہوتے کہ شاید کسی بھی انسان کو زندگی گزارنے کی مجال ہی نہ ہوتی۔

اور اس لحاظ سے بھی کہ یہ مضبوط اور محکم طبقہ چاند اور سورج کی کشش کے دباؤ کا سختی سے مقابلہ کرتا ہے اور اگر پہاڑ نہ ہوتے

صلہ ”تفسیر برہان“ جلد ۲ صفحہ ۶۷، ۶۸۔ صلہ جو لوگ آیت بالا کو مطلق ستاروں کی نفی کی دلیل سمجھتے ہیں مجبور ہیں کہ آیت میں تقدیم و تاخیر کے قائل ہوں۔ اور میں کہ آیت دراصل یوں ہے ”خلق السماوات ترونها بغير عمد“ جو فیضاً خلقت ظاہر ہے، صلہ ”تفسیر“ ”مید“ ”بروزن صید“ کے اردو سے اشیاء عظیمہ کے متزلزل و مضطرب کے معنی میں ہے اور ”ان تمیید بكم“ کا لغوی معنی لحاظ سے (السلام) تمیید بكم ہے۔

توزین کی خالی پوست میں سمندروں جیسے عظیم مدوجزر پیدا ہوتے جو انسان کے لیے زندگی کو ناممکن بنا دیتے۔

اور اس لحاظ سے بھی کہ آرمی اور طوفان کے دباؤ کو کم کر دیتے ہیں، اور زمین سے فتنے ہوائی طاب کو زمین کی وضعی حرکت کے موقع پر کم سے کم حد تک پہنچا دیتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو صفحہ ارضی خشک اور بے آب و گیاہ صحرائوں کے مانند تمام دن رات تباہ کن طوفانوں اور آندھریوں اور جھکلاؤں کی آماجگاہ ہوتا۔

اب جیکو غیر مری (دو کھائی نہ دینے والے) ستروں کی وجہ سے آسمان کے سکون اور پہاڑوں کے ذریعہ زمین کے سکون کی نعمتوں کی بات پروری ہوگئی تو زندہ موجودات کی آفرینش اور ان کے آرام و سکون کی نوبت آتی ہے کہ وہ سکون اور آرام وہ ماحول اور عمدہ حیات میں قدم رکھتے ہیں جہاں فرماتا ہے "اور دوسرے زمین میں ہر پھلنے والے کو پھیلا یا اور بوت فیہا من کل دابتہ"۔

"من کل دابتہ" کی تعبیر چلنے پھرنے والے جانوروں کی زندگی کے مختلف اور گونا گوں پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے۔ ان جانوروں سے لے کر جو اس قدر چھوٹے ہیں کہ آنکھ سے نظر نہیں آتے اور ہمارے سارے ماحول کو پر کر رکھا ہے، غول پیکر اور کوہ پیکر جانوروں تک جو عظیم الجثہ ہوتے ہیں کہ انہیں دیکھ کر انسان وحشت زدہ ہو جاتا ہے۔

اسی طرح وہ جانور جن کے رنگ اور چہرے مختلف ہوتے ہیں کچھ تو فضا میں اڑنے والے پرندے اور زمین پر ریگنے والے اور گونا گوں مشرکات کہ جن میں سے ہر ایک کی اپنی علیحدہ دنیا ہے اور مسائل زندگی کو لاکھوں آئینوں میں منعکس کرتے ہیں۔

اور پھر یہ بھی واضح ہے کہ چلنے پھرنے والے جاندار آب و غذا کے محتاج ہیں لہذا بعد والے جہوں میں ان دو موضوعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے "ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعہ زمین پر انواع و اقسام کی نباتات کے قیمتی جوڑے لگائے، اور اواز لٹنا من السماء ماء فابیتنا فیہا من کل زوج کریم"۔

اور اس طرح سے تمام چلنے پھرنے والے جانداروں خصوصاً انسان کی زندگی کی بنیاد کو پانی اور نباتات تشکیل دیتے ہیں لہذا سے بیان کر رہا ہے، ایسا متنوع اور انواع و اقسام کی غذاؤں کے ساتھ تمام دوسرے زمین پر بچھا ہوا ہے جس میں سے ہر ایک آفرینش و خلقت کے لحاظ سے پروردگار کی عظمت و قدرت پر دلیل ہے۔

قابل توجہ یہ کہ پچھلے تین حصوں کی آفرینش کے بیان میں افعال کو غیب کے صیغوں کے ساتھ بیان کیا ہے، جب نزول ہاراں اور نباتات کی پرورش کے مسئلہ پر پہنچا ہے تو افعال کو متکلم کی صورت میں پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا اور ہم نے ہی زمین میں نباتات کو لگایا:

یہ خود فصاحت کا ایک فن ہے کہ مختلف امور کے ذکر کے وقت انہیں دو یا چند مختلف شکلوں میں بیان کرتے ہیں تاکہ سننے والے کو کسی قسم کی تھکاوٹ یا اکتاہٹ کا احساس نہ ہو۔ علاوہ ازیں یہ تعبیر نشان دہی کرتی ہے کہ بارش کے نزول اور نباتات کی پرورش پر خاص توجہ دی گئی ہے۔

یہ آیت ایک بار پھر "عالم نباتات میں زوجیت" کی طرف اشارہ کرتی ہے جو قرآن کے علمی معجزات میں سے ایک ہے کیونکہ

مزید وضاحت تفسیر نمونہ کی جلد ۵ صفحہ ۶۲۰ کے بعد کے صفحات کا مطالعہ فرمائیے۔

اس زمانے میں عالم نباتات میں زوجیت (زوجہ کی جنس کا وجود) کا تصور وسیع طور پر ثابت نہیں ہوا تھا اور قرآن ہی نے اس سے پردہ اٹھایا ہے۔ اس سلسلہ کے سلسلہ میں مزید تشریح کے لیے سورہ شعراء کی آیہ ۱۷ کے ذیل میں تفسیر نمونہ جلد ۵ کا مطالعہ فرمائیں۔

یہ بات بھی بتاتے ہیں کہ نباتات کے جنس کی "کریم" کے ساتھ توصیف، انواع و اقسام کی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جو ان میں موجود ہیں۔

عالم آفرینش میں خدا کی عظمت اور خلقت کے مختلف پہلوؤں کے ذکر کے بعد دوسرے سخن مشرکین کی طرف کرتے ہوئے اور ان کو جواب دہ قرار دے کر ان سے جواب طلبی کرتے ہوئے کتاب ہے "یہ خدا کی آفرینش و خلقت ہے لیکن مجھے یہ دکھاؤ کہ اس کے علاوہ جو عبود ہیں انہوں نے کسی چیز کو خلق کیا ہے؟" (ہذا خلق اللہ فاروقی ما اذ خلق الذین من دوتہ)۔

یقیناً وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے تھے کہ اس جہان کی مخلوقات میں سے کوئی بھی چیز انہوں کی تخلیق ہے اسی بنا پر وہ توحید خالقیت کے تو معترف تھے لیکن اس حالت میں وہ کس طرح عبادت میں شرک کی توجیہ کر سکتے تھے؟ کیونکہ خالقیت کی توحید، ربوبیت کی توحید اور مدبر عالم کی یکتائی یہ سب کچھ عبودیت میں توحید کی دلیل ہے۔

لہذا آیت کے آخر میں ان کے عمل کو ظلم و گمراہی پر مبنی شمار کرتے ہوئے کتاب ہے "لیکن ظالم واضح گمراہی میں ہیں" (سبلی الظالمون فی ضلال مبین)۔

ہر ایک کو معلوم ہے کہ "ظلم" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے، جو کسی چیز کو اس کے غیر محل میں قرار دینے کو شامل ہے اور چونکہ مشرکین عبادت کو اور گناہے تدبیر عالم کو بتوں کے اختیار میں قرار دیتے تھے، لہذا عظیم ترین ظلم و ضلالت کے مرتکب تھے۔

یاد رہے اور پر والی تعبیر "ظلم" و "ضلالت" کے درمیان باہمی رابطے کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کیونکہ انسان جب اس دنیا میں عینی موجودات کی حیثیت اور ان کے موقع و محل کو نہ پہچانتے یا پہچانے تو سہی لیکن اس کی رعایت نہ کرے اور ہر چیز کو اس کے پسے مقام میں نہ دیکھے تو یقیناً یہ ظلم اس کی ضلالت و گمراہی کا سبب بن جائے گا۔

۱۲- وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنْ اشْكُرْ لِلَّهِ ۖ وَمَنْ يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ۝

۱۳- وَإِذْ قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهِ وَهُوَ يَعِظُهُ يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ۝

۱۴- وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَى وَهْنٍ وَفِضْلَةٌ فِي عَامَيَيْنِ أَنْ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ ۖ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ۝

۱۵- وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَى أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّتُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

ترجمہ

۱۲- ہم نے لقمان کو حکمت دی (اور ان سے کہا) خدا کا شکر ادا کرو، اور جو شکر ادا کرے وہ اپنے فائدہ کے لیے شکر ادا کرے گا۔ اور جو شخص کفران کرے تو خدا کو کوئی نقصان نہیں دیتا، کیونکہ خدا بے نیاز اور لائق تعریف ہے۔

۱۳- اس وقت کو یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا جبکہ وہ اسے وعظ و نصیحت کر رہے تھے بیٹا! کسی چیز کو خدا کا شریک قرار نہ دو کیونکہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

۱۲- اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے بارے میں وصیت کی، اس کی ماں زحمت پر زحمت اٹھا کر حاملہ ہوئی رحل کے زمانے میں ہر روز نئی تکالیف کی تحمل ہوتی تھی، اور اس کے دودھ پلانے کی مدت دو سال میں مکمل ہوتی ہے۔ (جی ہاں! ہم نے اسے وصیت کی) کہ میرا شکر ادا کرو اور ماں باپ کا شکر یہ ادا کرو کیونکہ تم سب کی بازگشت میری طرف ہے۔

۱۳- اور جس وقت وہ دونوں کوشش کریں کہ کسی کو تم میرا شریک قرار دو کہ جس سے تم آگاہی نہیں رکھتے (بلکہ جانتے ہو کہ باطل ہے) تو ان کی اطاعت نہ کرنا، تاہم دنیا میں ان کے ساتھ شانستہ طرز کا سلوک کرو۔ اور ایسے لوگوں کی پیروی کرو جو میری طرف آتے ہیں۔ اس کے بعد تم سب کی بازگشت میری طرف ہے اور میں تمہیں اس عمل سے آگاہ کروں گا جو تم انجام دیتے تھے۔

تفسیر

ماں باپ کا احترام:

گزشتہ مباحث توحید و شرک اور اہمیت و عظمت قرآن اور اس آسمانی کتاب میں استعمال ہونے والی حکمت کے بارے میں تھے۔ اسی مناسبت سے زیر بحث اور چند بعد والی آیات میں "لقمان حکیم" کے بارے میں اور اس مرد خدا کے چند نصحی، توحید کی عظمت اور شرک سے برسر پیکار رہنے کے سلسلے میں درمیان میں آئی ہیں۔ اور اہم اخلاقی مسائل کہ جن میں لقمان کی اپنے بیٹے کو چند نصحی کا بیان ہے۔ یہ دس نصیحتیں جو چھ آیات کے اندر بیان ہوئی ہیں اعتقاد ہی مسائل کو بھی دکھش طور پر بیان کرتی ہیں اور وہی فراموش اور ذمہ داریوں کے اصول اور اخلاقی مباحث کو بھی۔

اس بارے میں کہ "لقمان" کون تھے اور کن خصوصیات کے حامل تھے؟ انشاء اللہ آگے چل کر نکات کی بحث میں بیان کریں گے یہاں پر تو صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ قرآن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پیغمبر نہیں تھے۔ بلکہ وہ ایک سلیمے ہونے، نجیدہ اور منہذب انسان تھے جو ہر انسان کے نفس کے میدان مقابلہ میں سرخروا، کامیاب ہوتے۔ اور خدا نے ان کے دل پر علو حکمت کے چٹھے جاری کر دیئے، ان کے مقام عظمت کے لیے آتا کافی ہے کہ خدا نے ان کے چند نصحی کو اپنے ارشادات کے ساتھ ذکر کیا ہے اور آیات قرآن کے اندر بیان فرمایا ہے۔ جی ہاں! جب انسان کا دل پاکیزگی اور تقویٰ کے زیر اثر نور حکمت سے روشن ہو جائے تو خدا کے ارشادات اس کی زبان پر جاری ہوتے ہیں اور وہی کچھ کتاب ہے جو خدا کتاب ہے، اور وہی سچا ہے جو خدا

پسند کرتا ہے۔

اس مختصر سی وضاحت کے ساتھ آیات کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں۔

پہلی آیت میں فرماتا ہے "ہم نے لقمان کو حکمت دی اور انہیں کہا کہ خدا کا شکر ادا کرو کیونکہ جو شخص نعمت کا شکر ادا کرتا ہے وہ اپنے ہی نفع کے لیے کرتا ہے۔ اور جو شخص کفرانِ نعمت کرتا ہے وہ خدا کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ کیونکہ خدا بے نیاز اور لائق تعریف ہے: (وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ إِذْ اشْكُرْنَا لَهُ وَمَنْ يَشْكُرْ فَانْمَا يَشْكُرْ لِنَفْسِهِ إِنَّ الشُّكْرَ لَأَنْفُسِكُمْ وَإِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ)۔ کیا ہے؟ تو جواب میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ "حکمت" کے بہت سے معانی بیان ہوئے ہیں مثلاً "عالمِ سستی کے اسرار کی پہچان"، "حقائقِ قرآن سے آگاہی"، "گفتار و عمل کے لحاظ سے حق تک پہنچنا اور خدا کی معرفت اور پہچان"۔ لیکن ان تمام معانی کو ایک جگہ پر جمع بھی کیا جاسکتا ہے اور حکمت کی تفسیر میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ جس حکمت کے بارے میں قرآن نے گفتگو کی ہے اور خدا نے لقمان کو عطا فرمائی ہے وہ جو جمع ہے "معرفتِ علم، پاکیزہ اخلاق، تقویٰ اور ہدایت کا نور"۔ ایک حدیث میں اسی آیت کی تفسیر کے سلسلے میں حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام بنام بن حکم سے ارشاد فرماتے ہیں کہ "حکمت سے مراد فہم و فضل ہے"۔

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

اوقد معرفة امام زمانہ یعنی حکمت یہ ہے کہ لقمان اپنے زمانہ کے امام اور خدائی ریسر کی معرفت رکھتے تھے۔

ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا حکمت کے وسیع مفہوم میں شمار ہوتا ہے اور آپس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے۔

بہر حال "لقمان" نے اس حکمت کا حامل ہونے کی بنا پر اپنے پروردگار کا شکر شروع کیا، وہ نعمتِ الہی کے امداد اور نجات کو جانتے تھے۔ اور انہیں شکیب اسی میں کہ جس کے لیے وہ پیدا ہوئی تھیں استعمال میں لائے، اور اصولی طور پر حکمت اسی چیز کا نام ہے۔

"بہر چیز کو اس کی جگہ پر استعمال کرنا" اس بنا پر "شکر" و "حکمت" کی بازگشت ایک ہی نقطہ کی طرف ہوتی ہے۔

ضمنی طور پر آیت میں نعمتوں کے "شکر" اور کفران کے نتیجے اسی صورت میں بیان ہوا ہے کہ "شکر نعمت خود انسان کے اپنے فائدہ کے لیے ہے"۔ اور کفران نعمت اس کے اپنے نقصان میں ہے۔ کیونکہ خداوند عالم تو تمام دنیا سے بے نیاز ہے اگر کائنات کی بہر چیز شکر گزاری کرے تو اس کی عظمت میں اضافہ نہیں ہوگا اور اگر تمام کائنات کافر ہو جائے تو اس کے دامن کبر بانی پر گرو نہیں

۱۔ ان اشکرہ - کے جس میں کوئی چیز مقدر ہے یا نہیں، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بعض کا نظریہ یہ ہے کہ "حکمت" کا جملہ اس سے پہلے مقدر ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ خدا کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ "ان اشکر" کے جملہ میں خود "ان" تفسیر یہ ہے۔ کیونکہ شکر گزاری میں حکمت ہے اور حکمت میں شکر گزاری اور دونوں تفسیریں قابل قبول ہیں۔ ۲۔ اصل کافی جلد اول صفحہ ۱۱۱ کتاب العقل والجلل حدیث (۱۲)۔

سے نورا شہین جلد ۱۱ صفحہ ۱۱۱۔

بیٹہ سکتی"۔

"ان اشکرہ" کے جملہ میں "لام" "لام" اختصاصاً ہے اور لغتوں کی "لام" "لام نفع" ہے۔ اسی بنا پر شکر گزاری کا نفع اور فائدہ جو کہ آخرت کے ثواب کے علاوہ دوامِ نعمت اور اس کا اضافہ ہے، خود انسان کی طرف لوٹتا ہے۔ جیسا کہ "کفران" کا مزاج اور نقصان صرف اسی کے دامگیر ہوتا ہے۔

"غنی حمید" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عام افراد کا شکر ادا کرنے والا یا تو کوئی چیز نعمت دینے والے کو دیتا ہے یا اگر نہیں دیتا تو اس کا مقام لوگوں کی نگاہ میں ضرور بلند کرتا ہے لیکن خدا کے بارے میں ان دونوں میں سے کوئی چیز صادق نہیں آتی۔ وہ تو سب سے بڑے نیاز ہے اور سب تعریف کرنے والوں کی ستائش و تعریف کے لائق اور مستحق ہے۔ فرشتے اس کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور موجودات کے تمام ذرات اس کی حمد و تسبیح میں مشغول ہیں۔ اور اگر کوئی انسان "زیانِ حال" سے کفران کرے تو اس کا ذرہ برابر بھی اس پر اثر نہیں پڑتا۔ جبکہ اس کے وجود کے تمام ذرات "زیانِ حال" سے اس کی حمد و ثنا میں مشغول ہیں۔

قابلِ توجہ یہ نکتہ ہے کہ "شکر" مفہوم کے سبب سے آج کل کے دور میں اور استمرار کے علامت ہے اور "کفر" ماضی کے صیغہ کے ساتھ جو ایک مرتبہ پر بھی صادق آتا ہے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک بار کفران ممکن ہے کہ دوبارہ انجام کا سبب بن جائے۔ لیکن شکر گزاری ضروری ہے اور اسے ہمیشہ جاری رہنا چاہیے تاکہ انسان ارتقا کے تدریجی مراحل کو طے کرتا رہے۔

حضرت لقمان اور ان کے مقامِ علم و حکمت کے تعارف کے بعد ان کی یہی نصیحت۔ جہان کے ایسے بیٹے کے لیے ہے وہ اہم ترین نصیحت ہے اور اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے "اس وقت کو یاد کر، جب انسان نے اپنے بیٹے کو موعظ کرنے ہوئے کہا بیٹا! کسی چیز کو خدا کا شریک قرار نہ دے کیونکہ شرک بہت بڑا ظلم ہے (وَإِذْ قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهِ وَهُوَ يَعِظُهُ يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ إِنَّ الشُّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ)۔

لقمان کی حکمت اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ سب سے پہلے اہم اور بنیادی اعتقادی سلسلہ کی طرف جانے اور وہ ہے "توحید" کا مسئلہ۔ توحید تمام اطراف اور جہات سے کیونکہ تخریب پر مبنی اور خدا کے خلاف تخریب کا سرچشمہ شرک ہے خواہ وہ دنیا پرستی ہو یا مقام پرستی اور اہم پرستی اور ان جیسے دوسرے امور جو شرک کا شعبہ شمار ہوتے ہیں جس طرح کہ تمام صحیح تعمیری اور تربیتی تخریجوں کی اساس توحید ہے یعنی دل کو صرف خدا سے وابستہ رکھنا، اس کے فرمان کے سامنے تسلیمِ تم کرنا اور اس کے غیر سے ناتوازی اور تمام باتوں کو اس کی کبریائی کے آستان پر چکنا چور کرنا۔

قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ لقمان حکیم نقی شرک کی یہ دلیل ذکر کرتے ہیں کہ شرک ظلمِ عظیم ہے اور وہ بھی خدا کے بارے میں ایسی تعبیر کے ساتھ توجہی لحاظ سے "تاکید کی حامل ہے"۔

اور اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہو سکتا ہے کہ بے قدر و قیمت چیز کو اس کے مقابلہ میں قرار دیا جائے اور مخلوق کے بارے میں یہ کہ اسے گمراہی کی طرف کھینچ کر لے جائیں اور اپنے جبراً اعمال کے ذریعہ انہیں گمراہی کی طرف لائیں، ان پر ظلم و ستم کریں اور اپنے

۱۔ "ان" اور "لام" اور "بناد" کا امیر ہوتا ہے۔ ایک "تاکید پر دلالت کرتا ہے۔

بارے میں یہ کہ پروردگار کی عبودیت کے شرف اور عزت و عظمت سے مرٹ کر اس کے بغیر کی پرستش کرنے کے خود کو تعزیرت میں گراویں۔ بعد والی دونوں آیات درحقیقت جملہ مترسہ ہیں جو تہمان کے پند و نصائح کے درمیان خدا کی طرف سے بیان ہوئی ہیں لیکن بے باطن معانی میں نہیں بلکہ خداوند عالم کا حکم ہے جو تہمان کی باتوں سے واضح ربط رکھتا ہے۔ کیونکہ ان دو آیات میں ماں باپ کے وجود کی نعمت ان کی زحمات، خدمات اور حقوق اور اللہ کے "شکر" کے ساتھ والدین کے "شکر" کو بھی قرار دیا ہے۔

علاوہ ازیں تہمان نے اپنے بیٹے کو جو نصیحتیں کی ہیں وہ ان کے پر غلوں نے پر بھی دلالت کرتی ہیں کیونکہ اولاد کے ساتھ والدین کو ولی محبت، قلبی لگاؤ اور غلوں دل سے پیار بڑا ہے، قطعاً ناممکن ہے کہ وہ اولاد کی بہتری کے علاوہ کچھ اور سوچ بھی سکیں۔

پسے فرماتا ہے کہ "ہم نے انسان کو ہرنے ماں باپ کے باہر میں سفارش اور وصیت کی (و وصیت الانسان ببوالدین)۔

اس کے بعد ماں کی حد سے زیادہ تکالیف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے "ان کی ماں نے اسے ایسی حالت میں عمل کیا کہ ہر روز اس کے ضعف اور کمزوری پر نئے ضعف کا اضافہ ہوتا (حملتہ امہ و حسا علی و حسن)۔

علمی لحاظ سے بھی اور تجربہ کی روش سے بھی یہ بات باہر ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ ماں یا باپ کی مہربانی اور سستی میں مبتلا ہو جاتی ہیں کیونکہ اپنی جان کا شیرہ اور ہڈیوں کا گودہ شکم میں موجود اپنے بچے کی پرورش کے ساتھ مخصوص کر دیتی ہیں اور اپنے وجود کے ساتھ جیاتی مواد کا بہترین حصہ اسے پیش کرتی رہتی ہیں۔

اسی بنا پر ماں یا باپ کے زمانہ میں مختلف قسم کے ڈراموں کی کاشتکار ہو جاتی ہیں اور اگر اس کی تلقینی نہ کی جائے تو انہیں کئی تکالیف اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ یہی عمل زمانہ رضاعت (یعنی دودھ پلانے) کے دوران میں بھی جاری رہتا ہے کیونکہ دودھ عورت کی جان کا شیرہ ہوتا ہے۔

لہذا اس کے بعد کہتا ہے کہ "اس کے دودھ پلانے کے انتہام کا زمانہ دو سال ہے" (و فضالہ فی عامین)۔

جیسا کہ قرآن کی ایک دوسری جگہ بھی اشارہ ہوا ہے: "والسوالدات یرضعن اولادھن حنولیں حاکمیں" (بائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال دودھ پلائیں گی)۔ (بقرہ - ۲۳۳)

البتہ مراد مکمل دودھ پلانے کی مدت ہے اگرچہ ممکن ہے کہ اس سے کم مدت بھی انجام پائے۔

بیرحال بائیں ان ۳۳ ماہ داخل اور دودھ پلانے کی مدت (میں اپنے بچے کے لیے روحانی اور جسمانی ہر طرح سے خدمت کر کے عظیم ترین قربانی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔

قابل تجربہ بات ہے کہ ابتدا میں تو ماں اور باپ دونوں کے بارے میں وصیت کرتا ہے لیکن تکالیف اور خدمات کے بیان کے موقع پر صرف ماں کی زحمات کا ذکر کرتا ہے: "ماں انسان کو ماں کے ایثار و قربانی اور عظیم حق کی طرف متوجہ کیا جائے۔

لے "و حسا علی و حسن" کا جملہ ہو سکتا ہے کہ لفظ "ام" کا "حال" ہو اور لفظ "ذات" کو مقدر (پوشیدہ) مانا جائے۔ تو اس وقت مکمل جملہ یعنی "حملتہ امہ ذات و حسن علی و حسن" اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ "و حسن" کے مادہ سے مقدر (پوشیدہ) فعل کا مفعول ملحق ہو۔ تو پھر اس صورت میں جملہ یعنی "و حسن علی و حسن"۔

اس کے بعد کہتا ہے کہ "ہم نے اسے وصیت کی کہ میرا شکر بھی ادا کرو اور ماں باپ کا بھی" (ان اشکروا لوالدین)۔ میرا شکر ادا کرو کہ میں تمہارا خالق اور منعم ہوں اور اسی نعم کے مہربان ماں باپ بننے دیئے ہیں اور اپنے ماں باپ کا بھی شکر ادا کرو جو اس نفیخ کا واسطہ اور تمہاری طرف میری نعمتوں کے منتقل کرنے کا ذریعہ ہیں۔

کس قدر توجہ طلب اور معنی خیز ہے یہ کہ ماں باپ کے شکر یہ کہ بائیں ہی خدا کے شکر کے ساتھ اور اس کے پہلے میں ذکر فرمایا ہے۔

آیت کے آخر میں جو ایک نعم کی تنبیہ اور عقاب سے خالی نہیں فرماتا ہے "تم سب کی بازگشت میری طرف ہے (الذالک لضعیف)۔ جی ہاں! اگر تم نے یہاں کسی نعم کی کوتاہی کی تو وہاں پر ان حقوق تکالیف اور خدمات کے بارے میں باز پرس کی جائے گی اور زور سے ذرے کا حساب لیا جائے گا جہاں تمہیں خدا کی نعمتوں کے شکر اور اسی طرح ماں باپ کے وجود کی نعمت اور ان کے پاک اور سبے آلائش شکر کے سلسلہ میں خدائی حساب سے عمدہ برآ ہونا ہے۔

بعض مفسرین نے یہاں ایک نکتہ کی طرف توجہ کی ہے کہ قرآن مجید میں والدین کے حقوق کی رعایت پر تو بار بار تاکید کی ہے لیکن اولاد کے بارے میں بہت کم سفارش نظر آتی ہے (سوائے ایک موقع پر کہ جس میں اولاد کو قتل کرنے سے روکا گیا ہے جزو مانہ جاہلیت کی ایک منحوس اور بڑی عادت تھی، تو یہ اس بنا پر ہے کہ اپنے زبردست پیار کی وجہ سے بہت کم ممکن ہوتا ہے کہ والدین اپنی اولاد کو فراموش کر دیں جبکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ والدین جب بہت بوڑھے اور بے کار ہو جاتے ہیں تو اولاد انہیں فراموش کر دیتی ہے اور یہ ان کے لیے دردناک ترین حالت اور اولاد کے لیے بدترین ناشکری شمار ہوتی ہے۔

اور ماں باپ کے بارے میں بھی ان کی وصیت سے برکتنا ہے کہ بعض لوگوں کے دل میں بیخیاں پیدا ہو جائے کہ عقائد کفر اور ایمان کے سلسلہ میں بھی ان کی پیروی کی جائے یا زنی برتی جائے، لیکن بعد والی آیت میں فرماتا ہے "جس وقت وہ سنی و کوشش کریں کہ کسی چیز کو میرا شکر ادا کرو کہ جس سے (کم از کم) آگاہی نہیں رکھتے تو ان کی اطاعت نہ کرو" (وان جاہد الک علی ان تشکرک فی مالیس لک بہ علم فلا تطعہما)۔

کبھی بھی انسان اور اس کے والدین کے رابطے کو خدا کے رابطے پر مقدم نہ کرنا اور نہ ہی رشتہ داری کی محبت اختیار پر حاکم ہو۔

"جاہد الک" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ والدین کبھی کبھی اس بنا پر کہ وہ اپنی اولاد کی سعادت چاہتے ہیں کوشش کرتے ہیں کہ انہیں اپنے غلط عقائد کی طرف گھسیٹیں اور یہ چیز ہر ایک والدین کے بارے میں دکھانی دیتی ہے۔

اولاد کا فرض بنتا ہے کہ کبھی بھی اس قسم کے دباؤ کے آگے نہ جھکیں اور اپنے ٹکری استقبال کو محفوظ رکھتے ہوئے عقیدہ توحید کا کسی چیز سے تبادلا نہ کریں۔

ضعفاً "مالیس لک بہ علم" (یعنی وہ چیز کہ جس کا تمہیں علم نہیں) کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر بالفرض شرک کے باطل ہونے کو مد نظر نہ بھی رکھا جائے تو کم از کم اتنا تو ضرور ہے ہی کہ اس کے اثبات پر کوئی دلیل نہیں مل سکتی اور نہ ہی کوئی سبب جو شخص اس کے اثبات پر دلیل قائم کر سکتا ہے۔

علاوہ ازیں اگر شرک کی کوئی حقیقت ہوتی تو یقیناً اس کے باعث پر کوئی دلیل ضرور ہوتی اور اس قسم کی کسی دلیل کا نہ ہونا یقیناً اس کے بطلان کی دلیل ہے۔

برسکتا ہے کہ اس فرقان سے یہ وہم و گمان پیدا ہو کہ مشرک ماں باپ کے سامنے سختی اور بے احترامی کا استعمال کیا جانا چاہیے؟ تو فوراً ہی کہتا ہے کہ مشرک اور کفر کے مسندیں ان کی پیروی نہ کرنا، مطلقاً قطع رابطہ کی دلیل نہیں ہے بلکہ اس کے باوجود "ان کے ساتھ دنیا میں شائستگی کا سلوک کرنا" اور صاحبِ عبادت دنیا سے بیزاری اور مادی زندگی میں ان سے مروت و محبت سے پیش آؤ اور نرمی کا سلوک کرو اور مذہبی امور میں ان کے افکار اور نظریات کے سامنے ہتھیکو۔ یہ ٹھیک احتمال کا نقطہ اصلی ہے جس میں خدا اور ماں باپ کے حقوق کا صحیح امتزاج ہے۔

لہذا اس کے بعد یہ کہتا ہے "ایسے لوگوں کی پیروی کرو جنہوں نے میری طرف رجوع کیا ہے" (واقع سبیل من اناب الی)۔ یہ کلمہ "اس کے بعد" ہم سب کی بازگشت میری طرف ہے اور میں نہیں اس عمل سے آگاہ کروں گا جو تم انجام دیا کرتے تھے، اور اس کے مطابق ہی جزا اور سزا دلنا؛ (شرائع مرجعکم فان شکم بما کتتم تعملون)۔

اور پر والی آیات میں پے در پے کے اثبات و نفی اور سردی اس لیے ہیں تاکہ مسلمان اس قسم کے مسائل کہ جن میں ابتدائی نظر میں دو ضروری فراموشی اور ذمہ داریوں کے انجام دینے میں تضاد کا تصور ہوتا ہو صحیح طور پر تلاش کریں اور تھوڑی سی بھی افراط و تفریط کے بغیر صحیح راہ پر گامزن ہو جائیں، اور قرآن مجید میں اس قسم کی بڑی بات کو اس باریک بینی اور ظرافت و لطافت کے ساتھ بیان کرنا اس کی فصاحت و بلاغت کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک پہلو ہے۔

بہر صورت اور پر والی آیت مکمل طور پر سورہ عنکبوت کی آیت ۱۷ کے عین مشابہ ہے جس میں خدا کتاب سے (ووصینا الانسان بوالدینہ حسناً وان جاءک عنکبوتک فمالیس لک بہ علم فلا تظلمہما الی مرجعکم فان شکم بما کتتم تعملون)۔ بعض تفسیروں میں مذکورہ آیت کا شان نزول منقول ہے جسے ہم سورہ عنکبوت کی آیت ۱۷ کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ لقمان کون تھے؟ داننا اور صاحبِ حکمت انسان تھے، قرآن میں اس کی کوئی وضاحت نہیں ملتی، لیکن ان کے بارے میں قرآن کا تب و توثیق نشان ہی کتاب ہے کہ وہ پیغمبر نہیں تھے کیونکہ عام طور پر پیغمبروں کے بارے میں جو گفتگو ہوتی ہے اس میں رسالت، توحید کی طرف دعوت، شرک اور ماحول میں موجود بے راہ روی سے تہذیب و تمدنی رسالت کی ادائیگی کے سلسلے میں کسی قسم کی اجرت کا طلب نہ کرنا نیز امتوں کو بشارت و اندازے کے مسائل وغیرہ دیکھنے میں آتے ہیں، جبکہ لقمان کے بارے میں ان مسائل میں سے کوئی بھی بیان نہیں ہوا صرف ان کے پسند و ناصح بیان ہوئے ہیں جو اگرچہ خصوصی طور پر تو ان کے اپنے بیٹے کے لیے ہیں لیکن ان کا مفہوم عمومی حیثیت کا حامل ہے اور یہی چیز اس بات پر گواہ ہے کہ وہ صرف ایک مروت و حکیم دروہا تھے۔

جو حدیث پیغمبر گرامی اسلام سے نقل ہوئی ہے اس طرح درج ہے،

حَقًّا اَقُولُ لَعَلَّيْكَ لِقَامٌ بَشِيًّا، وَلَكِنْ كَانَ عَمْدًا كَثِيْرًا لِّلشُّكْرِ حَسَنَ الْبَقِيْنِ احبَّ اللهُ فَاَحِبُّهُ وَمَنْ عَلَيْهِ بِالْحِكْمَةِ..... یعنی سچی بات یہ ہے کہ لقمان پیغمبر نہیں تھے بلکہ وہ اللہ کے ایسے بندے تھے جو زیادہ غور و فکر کیا کرتے، ان کا ایمان و یقین اعلیٰ درجے پر تھا، خدا کو دوست رکھتے تھے اور خدا بھی انہیں دوست رکھتا تھا اور اللہ نے انہیں اپنی نعمتوں سے مالا مال کر دیا تھا.....

بعض تواریخ میں ہے کہ لقمان مصر اور سوڈان کے لوگوں میں سے سیاہ رنگ کے تھام تھے باوجودیکہ ان کا چہرہ خوبصورت نہیں تھا لیکن روشن دل اور مصفاوح کے مالک تھے وہ ابتدائے زندگی سے سچ بولنے اور امانت کو خیانت سے آلودہ نہ کرنے اور جو امور ان سے تعلق نہیں رکھتے تھے ان میں دخل اندازی نہیں کرتے تھے۔

بعض مفسرین نے ان کی محبت کا احتمال دیا ہے لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ واضح شواہد اس کے خلاف موجود ہیں۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ ایک شخص نے لقمان سے کہا کیا ایسا نہیں ہے کہ آپ ہمارے ساتھ مل کر جانور چرایا کرتے تھے، آپ نے جواب میں کہا ایسا ہی ہے، اس نے کہا تو پھر آپ کو یہ سب علم و حکمت کہاں سے نصیب ہوئے؟ لقمان نے فرمایا: قد رزقناہ واداء الامانة وصدق الحدیث والصمت عمالا یعنی اللہ کی قدر، امانت کی ادائیگی، بات کی سچائی اور جو چیز مجھ سے تعلق نہیں رکھتی اس کے بارے میں خاموشی اختیار کرنے سے امانت۔

حدیث بالا کے ذیل میں آنحضرت سے ایک روایت یوں بھی نقل ہوئی ہے کہ

ایک دن حضرت لقمان دوپہر کے وقت آرام فرما رہے تھے کہ اچانک انہوں نے ایک آواز سنی کہ لے لقمان اکیا آپ چاہتے ہیں کہ خداوند عالم آپ کو زمین میں خلیفہ قرار دے تاکہ لوگوں کے درمیان سنی کے ساتھ فیصلہ کریں؟ لقمان نے اس کے جواب میں کہا کہ اگر میرا پروردگار مجھے اختیار دے دے تو میں ماییت کی راہ کو قبول کروں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر اس قسم کی ذمہ داری میرے کندھے پر ڈال دے گا تو یقیناً میری مدد بھی کرے گا اور مجھے لغزشوں سے بھی محفوظ رکھے گا۔

فرشتوں نے اس حالت میں کہ لقمان انہیں دیکھ رہے تھے کہما لے لقمان کیوں دایسا نہیں کرتے؟ تو انہوں نے کہا اس لیے کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنا سخت ترین منزل اور ہرگزین مرحلہ ہے اور ہر طرف سے ظلم و ستم کی موجیں اس کی طرف منہ بھر رہی ہیں اگر خدا انسان کی حفاظت کرے تو وہ نجات پاجائے گا لیکن اگر خطا کی راہ پر چلے تو یقیناً جنت کی راہ سے خوف ہو جائے گا اور جس شخص کا سر دنیا میں جھکا ہوا اور آخرت میں بلند ہو اس سے بہتر ہے کہ جس کا سر دنیا میں بلند اور آخرت میں جھکا ہوا ہو اور جو شخص دنیا کو آخرت پر ترجیح دے تو وہ دنیا کو پالے گا اور نہ ہی آخرت کو حاصل کر سکے گا۔

لے "تفصیر قرآن" (شرح حالات لقمان) حصہ "جمع البیان" اسی آیت کے ذیل میں۔

فرشتے لقمان کی اس دلچسپ گفتگو اور منطقی باتوں پر بے حد متعجب ہوئے۔ لقمان نے یہ بات کہی اور سر گئے اور خدا نے نورِ حکمت اُن کے دل میں ڈال دیا جس وقت بیدار ہوئے تو اُن کی زبان پر حکمت کی باتیں تھیں۔۔۔۔۔ لے

۲۔ لقمان کی حکمت کا ایک نمونہ بعض مفسرین نے یہاں لقمان کے چند نصائح کے سلسلے میں جو سورہ کی آیتوں میں بیان کی گئی ہیں ان میں سے بعض کی حکمت آمیز باتوں کا ایک حصہ بیان کیا ہے کہ ہم اس کا خلاصہ یہاں پر پیش کرتے ہیں۔

الف۔ لقمان اپنے بیٹے سے اس طرح کہتے ہیں۔

يا بني ان الدنيا بحر عميق ، وقد هلك فيها عالم كثير ، فاجعل سفينةك فيها الايمان بالله ،

واجعل شراعها التوكل على الله ، واجعل زادك فيها تقوى الله ، فان نجوت فبحرمة الله و

ان هلكك فبذنوبك ! بیٹا دنیا ایک گمراہ بہت سندر ہے جس میں

بہت سی مخلوقات غرق ہو چکی ہیں لہذا اس سمندر میں تمہارا سفینہ خدا پر ایمان ہونا چاہیے جس کا بادبان خدا

پر توکل ہے جس کا زادو راه خدا کا تقویٰ اور پرہیزگاری ہو اگر تم نے اس سمندر سے نجات پائی تو سمجھو کہ رحمت خدا

کی برکتوں سے ہے اور اگر ہلاک ہو گئے تو جانو کہ اپنے گناہوں کی بدولت ہے یہ

یہی مطلب کتاب کافی میں امام موسیٰ کاظمؑ کے ارشادات کے ضمن ہشام بن حکم سے زیادہ مکمل صورت میں لقمان حکیم سے نقل

ہوا ہے فرمایا ، يا بني ان الدنيا بحر عميق ، قد غرق فيها عالم كثير ، فلتكن سفينةك

فيها تقوى الله ، وحشوها الايمان وشراعها التوكل ، وقيمها العقل ، وليدها

العلم ، وسكانها الصبر ۔ بیٹا دنیا ایک عمیق اور گمراہ سمندر ہے جس میں بہت بڑی دنیا

مغرق ہو چکی ہے اس سمندر میں تمہاری کشتی خدا کا تقویٰ ہونا چاہیے اور زادو راه ایمان اس کا بادبان توکل

نا خدا عقل اور رہنما علم اور اس کے سکان صبر و شکیبائی ہیں یہ

ب۔ ایک اور گفتگو میں اپنے بیٹے سے مسافرت کے آداب میں کہتے ہیں:

بیٹا! جب تم سفر کرو تو اپنے ساتھ اسلحہ، لباس، خیمہ اور پانی پینے اور بیٹے پر رونے کے وسائل اور

ضروری دوائیاں رکھیں سے تم خود اور تمہارے ساتھی استفادہ کر سکیں گے لیا کرو۔ اور اپنے ہم سفر لوگوں

کے ساتھ خدا کی نافرمانی کے سوا باقی تمام امور میں ہاتھ بٹایا کرو۔

بیٹا! جب کسی گروہ کے ساتھ سفر کرو تو اپنے کاموں میں ان سے مشورہ کر لیا کرو، اور ان سے خندہ پیشانی

۱۔ مجمع البیان جلد ۱ ص ۳۱۹ زیر بحث آیت کے ضمن میں۔ ۲۔ مجمع البیان اسی آیت کے ضمن میں۔

۳۔ اصل کافی جلد اول ص ۱۲ کتاب المغل والجلل۔

کے ساتھ پیش آیا کرو۔

جو زادو راه تمہارے پاس ہے اس میں سے سخاوت کیا کرو۔

تمہارے ساتھی جب بھی تمہیں بلائیں تو فوراً ان کو جواب دیا کرو۔

اگر تمہاری اداؤں کے طالب ہوں تو ان کی مدد بھی کیا کرو۔

جتنا ہو سکے سکوت اختیار کرو۔

نماز زیادہ سے زیادہ پڑھا کرو۔

سواری اور آب و غذا کو جو تمہارے پاس ہو اس میں سخاوت سے کام لیا کرو۔

اگر تم سے حق کی گواہی طلب کریں تو گواہی دے دیا کرو۔

اگر مشورہ چاہیں تو صحیح اور صائب نظریہ کو حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

اچھی طرح غور و فکر اور سوچ بچار کے بغیر جواب نہ دیا کرو۔ اور اپنی ساری فکری قوتوں کو مشورے کے

جواب کے لیے استعمال کیا کرو۔ کیونکہ جو شخص مشورہ طلب کرنے والوں کو اپنے خاص ترین نظریہ سے

نوازے تو خدا تعالیٰ اور سوچ بچار کی نعمت اس سے چھین لیتا ہے۔

جب دیکھو کہ تمہارے ساتھی ایک راستے پر چل رہے ہیں اور سبھی میں معروف ہیں تو تم بھی

کوشش میں لگ جاؤ۔ اپنے سے بڑوں کا کہنا مانو۔

اگر تم سے کوئی شخص جائز اور شرعی تقاضا کرتا ہے تو ہمیشہ اس کا مثبت جواب دیا کرو اور کبھی بھی

”نہ مت کمو۔ کیونکہ نہ کہنا عجز و توانائی کی نشانی اور ملامت کا سبب ہے۔۔۔۔۔“

کبھی بھی نماز کو اول وقت سے تاخیر کے ساتھ نہ پڑھا کرو، اور اپنے اس قرعے کو فوراً ادا کیا کرو۔

جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کرو خواہ تم سخت ترین حالات میں ہو۔

جس غذا کو کھانا چاہتے ہو کھانے سے پہلے اس کا فی صورت میں اس سے کچھ مقدار راہ خدا میں دیا کرو۔

کتاب خدا کی تلاوت کیا کرو اور یاد خدا سے غافل نہ ہو جاؤ۔ لے

ج۔ یہ داستان بھی لقمان کے بارے میں مشورہ ہے جس زمانے میں وہ غلام تھے اور اپنے آقا کے لیے کام کر رہے تھے ایک

دن آقائے ان سے کہا کہ ایک گوسفند میرے لیے فروج کرو اس کے اعضا میں سے دو بہترین عضو میرے لیے لے آؤ چنانچہ

انہوں نے گوسفند کو فروج کیا اور اس کی زبان اور دل اس کے لیے لے آئے چند دن کے بعد ایک اور گوسفند کے فروج کرنے کا حکم دیا

لیکن کہا اس کے بزرگین عضو میرے لیے لے آؤ تو لقمان نے پھر گوسفند کو فروج کیا اور وہی زبان اور دل اس کے لیے لے گئے اس

نے تعجب کیا اور اس ماجرے کے بارے میں سوال کیا تو لقمان نے جواب میں کہا دل اور زبان اگر پاک رہیں تو وہ ہر چیز سے بہتر ہیں اور

اگر ناپاک جو عاقل تو ہر چیز سے صحبت فرمیں بلکہ

آخر میں ہم اس گفتگو کو امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

خدا کی قسم وہ حکمت جو لقمان کو خدا کی طرف سے عنایت ہوئی تھی ان کے نسب، مال و جمال اور جسم کی بنا پر تھی۔ بلکہ وہ ایک ایسے مرد تھے جو حکم خدا کی انجام دہی میں قوی اور طاقتور تھے۔ گناہ اور شہوات سے اجتناب کیا کرتے تھے، سبکدوش اور خاموش رہتے تھے، خوب غور و خوض کے ساتھ دیکھا کرتے تھے، بہت زیادہ سوچا کرتے تھے، نیز بین اور دن کے اول تھے، میں کبھی نہیں سوتے تھے اور مجالس میں دستگیرین کی طرح تمکیر نہیں لگاتے تھے۔ اور آداب کو پورے طور پر نظر رکھتے تھے۔ لعاب دہن نہیں پھیلتے تھے، کسی چیز سے نہیں کھلتے تھے۔ اور کبھی بھی غیر مناسب حالت میں انہیں نہیں دیکھا گیا.... جب بھی دو آدمیوں کو ملتا جھگڑتا دیکھتے ان کے درمیان صلح کر دیتے اگر کسی سے کوئی اچھی بات سنتے تو ضرور اس کا حوالہ، مافہم اور تفسیر و تشریح اس سے پرتھتے۔ فقہاء اور علماء کے ساتھ زیادہ تر نشست و برخاست رکھتے.... ایسے علوم کی طرف جاتے جن کے ذریعہ ہر آنے نفس پر غالب آسکیں، اپنے نفس کا علاج قوت و فکر و نظر، سوچ، بچار اور عبرت سے کرتے اور صرف ایسے کام کی طرف جاتے جو اس کے دین و دنیا کے لیے سود مند ہوں۔ جہاں ان سے متعلق نہیں ہوتے تھے ان میں ہرگز دخل اندازی نہ کرتے۔ اس بنا پر خدا نے انہیں حکمت و دانائی عطا فرمائی بلکہ

۱۶- يٰبُنَيَّ اِنَّهَا اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِي
صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يٰٓاْتِ بِهَا اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ
لَطَيْفٌ خَبِيْرٌ ۝

۱۷- يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَاَنْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَاَصْبِرْ عَلٰى مَا اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝

۱۸- وَلَا تَصْعِرْ خَدَكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرْحًا اِنَّ اللّٰهَ
لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝

۱۹- وَاَقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ اَنْكَرَ
الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ۝

ترجمہ

۱۶- بیٹا! اگر رائی کے دانہ کے برابر دیک یا بد عمل، ہو اور پتھر کے دل میں یا آسمانوں اور زمین کے گوشہ میں قرار پائے خدا سے (قیامت میں حساب کے لیے) اے گناہ اور خدا نہایت ہی باریک بین و اگاہ ہے۔

۱۷- بیٹا! نماز کو قائم کرو اور امر بالمعروف اور نہی ازمنکر کرو اور ان مصائب کے مقابلے میں جو تجھے پہنچیں بااستقامت اور صابر ہو کیونکہ یہ ایسے کاموں میں سے ہیں جو اہم اور اساسی ہیں۔

۱۸- بیٹا! بے اعتنائی کے ساتھ لوگوں سے روگردانی نہ کرو اور غرور کے ساتھ زمین پر نہ چلو کیونکہ خدا کسی تکبر اور مغرور کو دوست نہیں رکھتا۔

۱- تفسیر "میسنادی" و "مجلسی" بیان تفسیر بیان نے لقمان کی گفتگو کا صرف پہلا حصہ نقل کیا ہے۔

۲- "جمع البیان" (غلام کے ساتھ)۔

۱۹۔ بیٹا! چلنے میں اعتدال کو پیش نظر رکھو اپنی آواز کو دھیما رکھو اور ہرگز اونچی آواز سے تربولو کیونکہ بدترین آواز گھصوں کی آواز ہے۔

تفسیر

پہاڑ کی طرح ڈٹ جاؤ اور لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرو:

لقمان کی پہلی نصیحت مسند توحید اور شرک سے نبرد آزمائی کے سلسلہ میں اور دوسری نصیحت حساب و کتاب اعمال و معاد کے بارے میں ہے جو "مبدأ و معاد" کے حلقہ کی تکمیل کرتا ہے۔

جناب لقمان کہتے ہیں "بیٹا! اگر ٹیک و بد اعمال یہاں تک کرانی کے دانے کے وزن کے برابر ہوں پتھر کے اندر یا آسمان کے گوشے میں یا زمین کے اندر کسی جگہ بھی خدا ان کو دیکھ لے گا۔ قیامت میں حاضر کرے گا اور اس کا حساب و کتاب کرے گا کیونکہ خدا لطیف باریک بین اور آگاہ و خبردار ہے" (یا بخی انھان تلک مشقان حیا من خرد لفتک فی صخرة او فی السموات او فی الارض یا ت بھا اللہ ان اللہ لطیف خبیر)۔

"خرد" (رانی) ایک پودا ہے جس کے بت چھوٹے سیاہ دانے ہوتے ہیں جو تھوٹا ہونے کی وجہ سے کمی اور حقارت میں ضرب اٹل ہے۔

اس طرف اشارہ ہے کہ ٹیک اور بد عمل جس قدر چھوٹے اور کم قیمت اور جس قدر مخفی و پنهان ہیں مثل رانی کے دانے کے جو پتھر کے اندر زمین کی گہرائیوں میں یا آسمان کے گوشے میں مخفی ہو خداوند لطیف و خبیر جو عالم سستی کی تمام چھوٹی بڑی موجودات سے آگاہ ہے اُسے حساب و کتاب اور سزا و جزا کے لیے حاضر کرے گا اور کوئی چیز اُس کے ہاں گن نہیں ہوتی!

ضمیر "انھا" کی "حسنات و سیئات" اور ٹیک و بد اعمال کی طرف لڑتی ہے۔

انسان کے اعمال سے پروردگار کا آگاہ ہونا اور تمام نیکیوں اور بدیوں کا پروردگار عالم کی کتاب علم میں محفوظ ہونا اور اس کا ناسات میں کسی چیز کے نابود نہ ہونے کی طرف توجہ تمام انفرادی و اجتماعی اصلاحات کی اصل و بنیاد اور اچھا بیوں کی طرف لے جانے کا طاقتور محرک ہے اور شر و برائیوں سے روکنے کی بڑی طاقت۔

"سماوات" و "ارض" کا ذکر "صخرہ" کے بعد درحقیقت خاص کے بعد عام کے ذکر کرنے کے قبیل سے ہے۔

"اصول کافی" میں امام محمد باقر سے ایک حدیث نقل ہوئی ہے فرماتے ہیں:

استغفر المحقرات من الذنوب فان لها طالباً، یقول احدکم اذنب واستغفر ان اللہ

لے بعض نے استمال و یا ہے کہ اوپر والی ضمیر یا توجہ شرک اور لوگوں استمال مجید ہے۔

عزوجل یقول سکتب ما قدموا و اثارہم و کل شیء احصیناہ تا امام مبین، وقال عزوجل انھان تلک متفان حیا من خرد لفتک فی صخرة او فی السموات او فی الارض یا ت بھا اللہ ان اللہ لطیف خبیر۔ چھوٹے گناہوں سے بھی پرہیز کر دو کیونکہ آخر کار کوئی اس کو بھی دریافت کرے گا۔ تم میں سے بعض لوگ کہتے ہیں ہم گناہ تو کرتے ہیں لیکن اس کے بعد استغفار کر لیتے ہیں حالانکہ خداوند عزوجل فرماتا ہے ہم تمام اس کو جو انہوں نے آگے بھیجا ہے اور اسی طرح ان کے تمام آئنا غرض کہ سب کچھ کو ہم نے لوح محفوظ میں محفوظ کر دیا ہے۔

نیز فرمایا ہے اگر اچھے اور برے اعمال اپنی کرانی کے دانے کے برابر ہوں پتھر کے اندر یا آسمان کے کسی گوشے میں یا زمین کے اندر خدا ان کو حاضر کرے گا۔ کیونکہ خدا لطیف و خبیر ہے۔

مبدأ و معاد جو مکتبی اعتقادات کی اساس ہے کی بنیادوں کو محکم طور پر بیان کرنے کے بعد اہم ترین عمل یعنی مسند نماز کو پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں "بیٹا نماز کو قائم کرو" (یا بخی اقم الصلوۃ)۔

کیونکہ نماز ہمارے خالق کے ساتھ ہمارا اہم ترین رابطہ ہے۔ ہمارے دل کو بیدار اور روح کو صاف و شفاف اور زندگی کو متحرک ہے۔ ہماری جان سے گن ہوں گے اُن کو دھو ڈالتی ہے ہمارے دل کے خاتمہ میں نور ایمان کی روشنی ڈالتی ہے اور ہمیں فشاہ و نکلات سے روکتی ہے۔

نماز کے پروگرام کے بعد ایک اہم ترین اجتماعی فریضہ امر بمعروف اور نہی از منکر کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں "لوگوں کو نیکیوں اور معروف کی دعوت دو اور منکرات اور برائیوں سے روکو" (و أمر بالمعروف و نہی عن المنکر)۔

ان تین اہم عملی احکام کے بعد ایک ایسے اہم مسئلے کی طرف متوجہ کیا ہے جسے ایمان سے وہی نسبت ہے جو سر کو بدن سے ہوتی ہے، اور وہ ہے عبر و استقامت، فرمایا۔ "مصائب و مشکلات کے مقابلے میں جو تم پر نازل ہوتے ہیں صابر و شکیبایہ کیونکہ یہ چیز ہر انسان کے حقیقی فرائض اور بنیادی کاموں سے ہے؟ (و اصبر علی ماصابک ان ذلک من عزم الامور)۔

مسلم ہے کہ تمام اجتماعی کاموں میں خصوصاً امر بمعروف اور نہی از منکر کے پروگرام میں بہت زیادہ مشکلات ہوتی ہیں اور مفاد پرست حکام گناہوں سے آلودہ اور منکبر و خود پسند لوگ آسانی کے ساتھ تسلیم نہیں کرتے بلکہ امر بمعروف اور نہی از منکر کرنے والوں کے درپے آزار ہو کر قتل کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں لہذا صبر و استقامت اور شکیبائی کے بغیر ان مشکلات پر کسی وقت بھی قابو نہیں پایا جاسکتا۔

"عزم" حکم ارادے کے معنی میں ہے اور "عزم الامور" کی تعبیر یہاں پر یا تو ان کاموں کے معنی میں ہے جن کے متعلقہ پروردگار کی طرف سے تاکید کی گئی ہے اور یا ایسے کام جن کے بارے میں انسان کو عزم مصمم اور اہمیتی زیادہ رکھنا چاہیے معنی خواہ کچھ ہو دونوں میں اہمیت کی طرف اشارہ ہے یعنی انسان اپنی عزم اور تقصیر واضح رکھتا ہو۔

”ذات کی تعبیر و تشبیہ کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ ان تمام اموری طرف اشارہ ہو جو اولیٰ آیت میں ذکر ہوئے ہیں، مجملان کے نماز، امر معروف اور نہی من المنکر ہے۔ لیکن قرآن کی بعض دوسری آیات میں یہ تعبیر صبر کے مسئلہ کے بعد بیان ہوئی ہے جو پہلے احتمال کو تقویت پہنچاتا ہے۔

اس کے بعد لقمان اپنے اور دوسرے لوگوں سے متعلق اخلاقی مسائل کو بیان کرتے ہیں اور سب سے پہلے تو امین اور سخی اور خندہ پیشانی سے پیش آنے کی ہدایت کرتے ہوئے کہتے ہیں ”یے اثنائی کے ساتھ لوگوں سے روگردانی نہ کرو“ (لا تصغر حدک لک لک من) اور مغرورانہ انداز میں دوسرے زمین پر نہ چلو“ (لا تمش فی الارض مسرعا)۔ کیونکہ خدا کسی شکر اور مغرور کو دوست نہیں رکھتا“ (ان الله لا یحب کل مختال فخور)۔

”تصغر“ ”صغر“ کے مادہ سے ہے جو دراصل ایک قسم کی بیماری ہے جو اونٹ کو لاحق ہوتی ہے جس سے وہ اپنی گردن بڑھی کرتا ہے۔

”سرح“ (برقن فرس) نعمت سے پیدا ہونے والے غرور اور مستی کے معنی میں ہے۔

”مختال“ ”خیال“ اور ”خیلا“ کے مادہ سے ہے۔ ایسے شخص کے معنی میں ہے جو دوسروں پر اپنی بڑائی بتائے۔ فخور، فخر کے مادہ سے اس معنی میں ہے کہ جو شخص دوسرے کے مقابل فخر کرتا ہے (مختال اور فخر میں فرق یہ ہے کہ پہلے کا تعلق ذہن میں پیدا ہونے والے شکرانہ خیالات سے ہوتا ہے اور دوسرے کا تعلق نیکر آمیز اعمال سے ہے)۔

اور اس طرح سے لقمان حکیم بیان دو بری اور ناپسندیدہ صفات کی طرف جو معاشرہ کے عیسائے زہد و اہل کے منقطع ہونے کا سبب ہیں اشارہ کرتے ہیں ایک تو شکر اور بے اثنائی اور دوسری غرور اور خود پسندی ہے۔ اور اس سلسلے میں دونوں مشترک ہیں جو انسان کو نوبہم خیال اور اپنے آپ کو برتر سمجھنے کی دنیا میں غلط فہمی پیدا کرتی ہیں اور دوسروں سے اس کے رد اہل کر منقطع کرنے کا باعث بنتی ہیں۔ خصوصاً ”صغر“ کے اصل اور لغوی مادہ کو مدنظر رکھتے ہوئے واضح ہوجاتا ہے کہ اس طرح کے ناپسندیدہ صفات ایک قسم کی نفسیاتی اور اخلاقی بیماری اور تشکیک و تفکر میں ایک قسم کی بے راہروی ہے۔ ورنہ روح اور نفس کے لحاظ سے ایک صحیح اور سالم انسان کبھی بھی اس قسم کے نعورات اور خیالات میں گرفتار نہیں ہوتا۔

کے بغیر واضح ہے کہ ”لقمان“ کی مراد صرف لوگوں سے روگردانی کرنا یا مغرورانہ انداز میں منک منک کر چلنا ہی نہیں بلکہ تکبر اور غرور کے تمام مصادیق کے ساتھ نبرہ آزمائی بھی ہے۔ لیکن چونکہ اس قسم کی صفات سب سے پہلے اپنے آپ کے عادی اور روزانہ حرکات کی نشان دہی کرتی ہیں لہذا ان مخصوص مظاہر کو ہی بیان فرمایا ہے۔

بعد والی آیت میں دو اور اخلاقی پروگرام بیان کئے ہیں جو مثبت پہلو کے حامل ہیں۔ گزشتہ پروگراموں کے مقابلہ میں جو منفی پہلو رکھتے ہیں فرماتا ہے: ”بیٹا! پہلے پھرے میں اعتدال کا راستہ اختیار کرو“ (واخصد فی مشیئک)۔

”اور بات کرنے میں بھی اعتدال کو مدنظر رکھو اور آواز دینے میں بھی آہستگی اختیار کرو، اور شور مچا کر بلند آواز سے نہ پکارو“ (واختصص من صوتک)۔

”کیونکہ بدترین آواز گھروں کی ہے“۔ (ان نکر

الاصوات لصوت لحمیہ)۔

درحقیقت ان دو آیات میں دو صفات سے نبی اور دو صفات کے بارے میں امر ہوا ہے۔

”نبی“ ”اپنے آپ کی برتری“ اور خود پسندی سے کہ جن میں سے ایک تو اس بات کا سبب بنتی ہے کہ انسان خدا کی مخلوق کے ساتھ تکبر کرے اور دوسری سبب بنتی ہے کہ انسان اپنے آپ کو حد کمال میں تصور کرے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے لیے مندیجی کمال اور ارتقاء کے دروازے بند کر دیتا ہے۔ اگرچہ وہ اپنا دوسروں سے موازنہ نہ کرے۔

اگرچہ یہ دونوں صفات عام طور پر جڑواں ہوتی ہیں اور ان کی اصل (جڑ) مشترک ہے لیکن کبھی ایک دوسرے سے جدا بھی ہوجاتی ہیں۔

اور ”امر“ ”عمل“ اور ”گفتار“ میں اعتدال کی رعایت کا، چوچھو چلنے پھرنے اور گفتگو کرنے میں اعتدال درحقیقت مثال کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور جس شخص میں واقفانہ چار صفات پائی جاتی ہوں وہ منق، نخرش قسمت اور کامیاب انسان ہوتا ہے جو لوگوں میں محبوب اور بارگاہِ خدا میں معزز ہوتا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ممکن ہے کہ ہماری زندگی کے ماحول میں گدھے کی آواز سے بھی زیادہ تکلیف دہ آوازیں ہوں زمثلاً جب وہ حقائق کے ٹکڑے ایک دوسرے سے نکالتے ہیں اور ان سے ایسی آوازیں نکالتی ہے کہ انسان سمجھتا ہے کہ اس کے بدن کا گوشت گر رہا ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ آوازیں نہ تو عمومی ہوتی ہیں اور نہ ہی ہر موقع و محل پر رد ہوتا ہوتی ہیں۔ علاوہ انہیں تکلیف دہ ہونے اور زیادہ قبیح ہونے میں بھی فرق ہے۔ اور چونکہ عام آوازوں میں سے جنہیں انسان سنا ہے سب سے زیادہ قبیح اور بری گدھے کی آواز ہی ہوتی ہے۔ اور مغرور اور بے وقوف لوگوں کے نعرے اور شور و غوغا اسی آواز سے مشابہت رکھتے ہیں۔

صرف اونچا اور بے منہ ہونے کے لحاظ سے قبیح نہیں بلکہ کبھی بلاتوجہ ہونے کے لحاظ سے بھی ہے۔ کیونکہ بعض مفسرین کے بقول دوسرے جانوروں کی آواز عام طور پر بوقت ضرورت ہوتی ہے لیکن یہ جانور کبھی بلا توجہ بغیر کسی قسم کی ضرورت اور بغیر کسی تمہید و مقدمہ کے وقت بے وقت ہینگنا شروع کرتا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ بعض روایات میں ذکر ہوا ہے کہ جب گدھے کی آواز بلند ہوتی ہے اس وقت وہ شیطان کو دیکھتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ہر جانور کی آواز تسبیح ہوتی ہے سوائے گدھے کی آواز کے۔

ہر حال ان تمام باتوں سے ہٹ کر جو بات مسلم ہے وہ یہ کہ تمام آوازوں میں اس کی آواز ہی قبیح ہے۔ اور یہ بات کسی بحث و گفتگو کی محتاج نہیں۔

اگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض روایات میں امام جعفر صادق سے منقول ہوا ہے کہ یہ آیت بلند آواز کے ساتھ چیلنے یا پلوتے وقت شور مچانے سے تعبیر ہوتی ہے تو درحقیقت اس کے روشن معلق کا بیان ہے یہ

”لحم حمیہ“ ”حماد“ کی جمع ہے جس کا معنی ہے گدھا۔ ”لحم“ ”انکر“۔ افضل التفضیل کا صیغہ ہے۔ اگرچہ یہ صیغہ عام طور پر مفرول کے معنی میں آتا لیکن عرب کے باب میں یہ صیغہ شاذ و نادر ہی جاتا ہے۔ ”انکر“ ”انکر“۔ افضل التفضیل ہے۔

”لحم حمیہ“ ”حماد“ کی جمع ہے جس کا معنی ہے گدھا۔ ”لحم“ ”انکر“۔ افضل التفضیل ہے۔

”لحم حمیہ“ ”حماد“ کی جمع ہے جس کا معنی ہے گدھا۔ ”لحم“ ”انکر“۔ افضل التفضیل ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ چلنے پھرنے کے آداب : برٹیک ہے کہ پہننا پھرنا ایک عام اور سادہ سا مسلہ ہے لیکن یہی سادہ مسلہ انسان کے اندرونی حالات اور اخلاق و اطوار اور بسا اوقات اس کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے کیونکہ پہننے میں ہم کمر پکے ہیں کہ انسان کے عادات و اطوار اس کے اعمال کے اندر منکس ہوتے ہیں اور کبھی ایک چھڑنا سا معمولی عمل بھی اس کی گہری عادات کی غمازی کرتا ہے۔ اور چونکہ اسلام زندگی کی تمام جہات کو توجہ کا مرکز قرار دیتا ہے لہذا اس سلسلہ میں اس نے کسی بھی چیز کو فرو گزاشت نہیں کیا۔ ایک حدیث میں رسول خدا سے مروی ہے :

”من مشى على الارض اختيا لالعتة الارض ومن تحتها ومن فتر شها :“
پھر شخص غمزہ و خبثت کے ساتھ زمین پر چلتا ہے تو زمین اور زمین کے اندر کی اور اس کے اوپر کی چیزیں سب اس پر لعنت کرتی ہیں : ۱۰

پھر ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم سے روایت ہے :

”نهي ان يختال الرجل في مشيه وقال من لبس ثوبا فاخذت فيه خسف الله به من شفيبه جهنم وكان حزين قارون لانه اول من اختال :“

پیغمبر نے متروک اور متکبرانہ انداز میں چلنے سے روکا ہے اور فرمایا جو شخص لباس پہنے اور اس کے ساتھ تکبر دکھائے تو خداوند عالم اسے جہنم کے کنارے سے زمین کی تہ میں بھیجے گا اور وہ قارون کا مقرب اور ساتھی ہو گا۔ کیونکہ قارون پہلا شخص تھا جس نے کبر و غرور کی بنیاد رکھی تھی۔ نیز امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ آپ نے فرمایا :

خدا نے ایمان کو انسان کے اعضا و جوارح پر واجب کیا اور ان کے درمیان اسے تقسیم کیا۔ مگر ان کے انسان کے پاؤں پر واجب کیا ہے کہ گناہ اور مصیبت کی طرف رجحان رکھے۔ خدا کی راہ میں اٹھیں، اسی لیے قرآن فرماتا ہے ”زمین میں بجز سے نہ چلو“ نیز فرمایا ہے ”چلنے میں اعتدال کی راہ کو پیش نظر رکھو :“

ایک دوسری روایت میں یہ ماجرا پیغمبر اسلام سے نقل ہوا ہے کہ آپ ایک کوچہ سے گزر فرما رہے تھے لوگوں کو دیکھا کہ ایک دیوانے کے گرد جمع ہیں اور اس کی طرف دیکھ رہے ہیں فرمایا :

علی ما اجتمع هؤلاء ؟ ”یہ لوگ کیوں جمع ہیں ؟“

لے ثواب الامال اور انالی صدوق زکوالر اقلین جلد ۱ ص ۲۰۰ سے ثواب الامال انالی صدوق ۱ بجز تفسیر (راشعین جلد ۲ صفحہ ۲۰۰) سے اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۲۸ باب ایمان مشورت بمرح البدران کلمہ۔

عرض کیا گیا کہ علی المجنون یصع ”ایک دیوانے کے لیے جو انسانی حملہ کا شکار ہے !“
پیغمبر نے اس کی طرف دیکھا اور فرمایا :

ما هذا مجنون الا حکمہ بجمنون حق المجنون یہ تو دیوانہ نہیں ہے تم یہاں تھے بکہ واقعی مجنون کا تم سے تعارف کراؤں ؟

انہوں نے عرض کیا جی ہاں یا رسول اللہ! تو آپ نے فرمایا :

ان المجنون : المتبختر في مشيه ، الناظر في عطفیه ، المحرط جنبیه بتمکبیه
فذاک المجنون و هذا العبد المتختر حقیقی مجنون تو وہ ہے جو غرور سے شانے جھٹک کر چلتا ہے، ہمیشہ اپنے پہلوؤں کی طرف دیکھتا ہے، اپنے بازوؤں کو اپنے کندھوں کے ساتھ بلاتا ہے، اور کبر و غرور اس کے سارے وجود سے پکتا ہے، ایسا شخص واقعی دیوانہ ہے جسے تم دیکھ رہے ہو، یہ تو بیمار ہے : ۱۰

۲۔ گفتگو کے آداب : لقمان کے پند و نصائح میں بات کرنے کے آداب کے ضمن میں اشارہ کیا گیا تھا، اور اسلام میں اس مسئلہ کے لیے ایک وسیع باب کھولا گیا ہے۔ مگر اس کے یہ سب کچھ تک بات کرنا ضروری نہ ہو تو سکوت بہتر ہے۔

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے :

السکوت راحة للعقل ”سکوت، فکر کے آرام و راحت کا باعث ہے : ۱۰
ایک اور حدیث میں امام علی بن موسی الرضا سے مروی ہے کہ :

من عن مات الفقه العلم و الحلم والصمت - ان الصمت باب من ابواب الحكمة -
”عقل و فہم کی نشانیوں میں سے آگاہی، بروہاری اور خاموشی ہے۔ سکوت اور خاموشی حکمت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے : ۱۰

لیکن دوسری روایات میں یہ بات بھی زور دے کر کہی گئی ہے کہ :

”جن منقول پر گفتگو کرنا ضروری ہے مومن کو کبھی بھی خاموشی اختیار نہیں کرنا چاہیے“

پیغمبروں کو بات کرنے کی دعوت دی گئی ہے مگر سکوت کی : ۱۰

”جنت میں پہنچنے اور دوزخ سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ برعمل بات کرنا ہے : ۱۰

۳۔ معاشرتی آداب : پیغمبر اسلام اور آئمہ اہلبیت علیہم السلام کے ذریعہ اسلامی روایات میں جن قدر تواضع، حسن خلق اور بوقت ملاقات فری کا مظاہرہ اور رہن سہن میں سختی نہ برتنے کے مسئلہ کو اہمیت دی گئی ہے

لے بخارالانوار جلد ۹، صفحہ ۵۰۰ سے وسائل الشیوخ جلد ۲ صفحہ ۵۲۲۔

اُتی بہت کم چیزوں کو اہمیت دی گئی ہے۔

بے تہن اور ناشن دلیل اس سلسلے میں خود اسلامی روایات ہیں جن کا ایک نمونہ ہم یہاں پر نظر فرما کر دیتے ہیں، ایک شخص بچپن (کم ایس) کی خدمت میں آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ! اوصانی فکان فیما اوصاد ان قال الن اخساک برہم مہبطاً، جسے نصیرت کہیئے تو آپ نے فرمایا اپنے مسلمان بھائی سے کشادہ روی سے کے ساتھ ملاقات کرو۔

ایک اور مروی حدیث میں پیغمبر اکرم سے مروی ہے:

ما وضع فی میزان امرء یوم القیامۃ فضل من حسن لخلق۔ قیامت کے دن کوئی چیز کسی کے ترازو سے عمل میں حسن خلق سے بڑھ کر بالاتر نہیں رکھی جائے گی۔ ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مذکور ہے،

الخیر وحسن الخلق بعد الذی ویزید ان فی الاعمار۔ نیچو کاوی اور حسن خلق کھول کر آباد اور عمروں کو زیادہ کر کے ہے۔ نیز رسول خدا سے منقول ہے:

اکثر ما تلج بہ اصفی اللہ تعالیٰ فی اللہ وحسن الخلق۔ جو چیز میری امت کے زیادہ سے زیادہ بہشت میں داخل کرنے کا سبب بنے گی وہ خدا کا تقویٰ اور حسن خلق ہے۔

تواضع اور فروتنی کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

ربنہ الشرف التواضع شرافت ناب انسانوں کی تربیت فروتنی اور تواضع ہے۔ نیز آخر میں ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام بیان فرماتے ہیں:

التواضع اصل کل خیر نفسی، امر تباہر فبعا۔ ولو کان لتواضع لغز یفہمها الخلق لنتق عن حقائق ما فی مغفیت العواقب۔ ومن تواضع لله سفرفه الله عن کثیر من عبادہ۔۔۔ ربیب لله عزوجل عبادة یقبلها و یرضاها الا و باہنا التواضع۔

فروتی اور تواضع ہر خیر و مساوت کی جڑ ہے، تواضع ایک بلند مقام اور تہ ہے اور اگر تواضع کی کوئی زبان ہوتی کہ جسے لوگ سمجھتے تو بہت سے امر انسانی اور کاموں کی طاقت کو بیان کرتی۔۔۔۔۔

پوشش خدا کے لیے فروتنی کر کے خدا اس کو اپنے بہت سے بندوں پر برتری بخشے گا۔۔۔۔۔ کوئی ایسی عبادت نہیں جو مقبول بارگاہ خدا اور اس کی رضا کا موجب ہو مگر یہ کہ وہ فروتنی کی راہ ہی سے داخل ہوتی ہے۔

شہ ہمارا انوار جلد ۱۔ نمبر ۱۴۰۔ صفحہ ۱۲۰۔ تھان ۱۶۔ صفحہ ۱۹۔ ہمارا انوار جلد ۲۔ باب حسن الخلق ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ہمارا انوار جلد ۵۔ صفحہ ۱۲۰۔ ہمارا انوار جلد ۵۔ صفحہ ۱۰۔

۲۰۔ الم تر و ان اللہ سخر لکم ما فی السموت و ما فی الارض و اسبع علیکم نعمۃ ظاہرۃ و باطنۃ و من الناس من

یجادل فی اللہ بغير علم و لا ہدی و لا کتب منیر۔

۲۱۔ و اذ اقیل لہم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما وجدنا

علیہ اباءنا اولو کان الشیطن یدعوہم الی عذاب سعیر۔

۲۲۔ و من یتسلّم و وجہہ الی اللہ و ہو محسن فقد استمسک

بالعروۃ الوثقی و الی اللہ عاقبۃ الامور۔

۲۳۔ و من کفر فلا یحزنک کفرہ ا لینا امر جمعہم فنبتہم بما عملوا

ان اللہ علیہم بذات الصدور۔

۲۴۔ نمتعہم قليلاً ثم نضطرہم الی عذاب علیظ۔

ترجمہ

۲۰۔ کیا تو نے دیکھا نہیں کہ خدا نے ان چیزوں کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں تمہارے لیے مخر کیا ہے اور اپنی نعمتوں کو چاہے وہ ظاہری ہوں یا باطنی تم پر بچھا دیا ہے اور زیادہ کر دیا ہے، لیکن بعض لوگ بغیر کسی علم و دانش اور ہدایت اور واضح کتاب کے خدا کے بارے میں لڑائی جھگڑا کرتے ہیں۔

۲۱۔ جس وقت ان سے کہا جائے جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں نہیں اہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے کہ جس پر اپنے آباء (واجہاد) کو پایا ہے، کیا اگر شیطان انہیں بھڑکتی ہوئی

آگ کے عذاب کی طرف بھی دعوت دے پھر بھی پیروی کریں گے؟

۲۲- جو شخص اپنی روح کو خدا کے سپرد کر دے جبکہ وہ نیکو کار ہو اس نے حکم دستہ اور وسیلہ کو پکڑا ہے اور قابل اطمینان سہارے کا سہارا لیا ہے، اور تمام کاموں کی عاقبت خدا کی طرف ہے۔

۲۳- اور جو شخص کافر ہو جائے تو اس کا کفر تجھے نکلے گا نہ کر دے، ان سب کی بازگشت ہماری طرف ہے۔ اور ہم انہیں ان اعمال سے جو انہوں نے انجام دیئے ہیں اور ان کے برے نتائج سے آگاہ کریں گے۔ بیشک خدا لوگوں کے راز سے بھی خوب واقف ہے۔

۲۴- ہم تمہارے سے دنیاوی فائدے کو ان کے اختیار میں دے دیں گے پھر انہیں مذاہب شہید کے برداشت کرنے پر مجبور کریں گے۔

تفسیر

قابل اطمینان سہارا:

حضرت لقمان کے مبداء و معاد اور وہ درمجم زندگی اور اجتماعی و اخلاقی پروگراموں کے سلسلہ میں دس نکتاتی بندوبست کے اختتام پر قرآن ان کی تکمیل کے لیے خدائی نعمتوں کے بیان کی طرف جاتا ہے تاکہ لوگوں کے احساسات و فکر و اندیشی کو اجاگر کرے وہ نکتہ جو ”معرفة الله“ کا منبع اور اس کے فرمان کی اطاعت کا سبب ہے۔

دوئے سخن تمام انسانوں کی طرف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے آسمانوں اور زمین میں موجود چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا تاکہ وہ تمہارے مفادات کے لیے سرگرم عمل رہیں؟ واللہ تعالیٰ اعلم ما فی السموات وما فی الارض۔

انسان کے لیے آسمانی اور زمینی موجودات کی تسخیر ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے جو ان امور کو بھی شامل ہے جو اس کے فیض و اختیار میں ہیں، اور وہ اپنی مرضی اور ارادہ سے انہیں اپنے مفادات کی راہ میں استعمال کرتا ہے جیسے زمین کے بہت سے مفادات۔ یا وہ امور جو انسان کے اختیار میں نہیں ہیں لیکن خدا نے انہیں مامور کیا ہے کہ وہ انسان کی خدمت کریں جیسے سورج اور چاند وغیرہ۔ اس بنا پر تمام موجودات انسانوں کی منفعت کی راہ میں فرمان خدا کے مطابق مسخر ہیں۔ چنانچہ وہ حکم انسان کے مسخر ہوں

۱۔ بعض مفسرین مثلاً ”آر سی“ ”روح المعانی“ اور ”تفسیر“ میں زیر بحث آیات کو حقان کی دستوں سے پیٹے ذکر شدہ آیات سے مربوط جانتے ہیں جن میں مشرکین کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے ”یہ خدا کی مخلوق ہے م نشانہ ہی کر دو کہ تو نے کیا کچھ بنایا ہے؟“ اور زیر بحث آیات میں کہتا ہے ”کیا تم نے دیکھا نہیں کہ جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے خدا نے تمہارے لیے مسخر کیا ہے، لیکن اس آیت کا بول اور اس کے بعد دہائی آیات اور روایات جو اس کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں، وہ آیت کے مفہوم کی عمقیت کے ساتھ زیادہ سا دکھائی دیتی ہے۔

یا نہ ہوں۔ اور اس طرح سے ”لکھتے ہیں“ ”لام“ اصطلاح کے مطابق ”لام منقذت“ ہے۔ لہٰذا آگے چل کر مزید کہتا ہے: خدا نے اپنی نعمتوں کو خواہ وہ ظاہری ہوں یا باطنی، وسیع اور زیادہ کیا ہے، ”او اسبیغ علیکم نعمہ ظاہرہ و باطنہ“۔

”اسبیغ“ مادہ ”سبغ“ (بروزن صبر) اصل میں کھلی اور کشادہ پیراہن یا زہرہ اور وسیع و کمال کے معنی میں ہے اور پھر ”وزدان“ نعمت پر بھی بولا جانے لگا ہے۔

یہ کہ یہاں ”ظاہری“ و ”باطنی“ نعمتوں سے مراد اس آیت میں کیا ہے؟ اس پر مفسرین نے بہت کچھ گفتگو کی ہے بعض ”ظاہری نعمت“ اس چیز کو سمجھتے ہیں جو کسی بھی شخص کے لیے قابل انکار نہیں ہے جیسے خلق، حیات اور انواع و اقسام ذوق وغیرہ اور ”باطنی“ نعمتیں ان امور کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو غور و فکر اور سوچ بچار اور مطالعہ کے بغیر قابل انکار نہیں ہیں۔ (جیسے بہت سی روحانی طاقتیں اور تعمیری غریبے۔

بعض نے نعمت ”ظاہر“ اعضاء ظاہرہ کو اور نعمت ”باطن“ دل کو شمار کیا ہے۔

بعض دوسروں نے ”نعمت ظاہر“ چہرہ کی زیبائی اور خوبصورتی، تدوینات کی راستی اور اعضاء کی سلامتی اور نعمت ”باطن“ معرفت اللہ کو تسلیم کیا ہے۔

ہم بغیر اسلام کی ایک حدیث میں پڑھتے ہیں۔ جبکہ ابن عباس نے آنحضرتؐ سے اس سلسلے میں سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا: اے ابن عباس! نعمت ظاہرہ اسلام اور پروردگار کی طرف سے کمال اور منظم خلقت اور وہ رزق و روزی ہے، جو اس نے تم پر ارزانی کی ہیں۔ اور نعمت باطن تمہارے برے اعمال پر پردہ پوشی اور لوگوں کے سامنے تمہیں سزا نہ کرنا ہے۔

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

نعمت ظاہرہ بغیر معرفت اللہ اور توحید ہے، جسے بغیرہ لاسکتے ہیں۔ اور نعمت باطن دوشیدہ ہم اہل بیت کی ولایت اور ہماری دوستی کا عہد و پیمانہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان تفسیر کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ آیت کے مفہوم کو محدود کیے بغیر ان میں سے ہر ایک ظاہری اور باطنی نعمت کے ہر مصداق کو بیان کرتی ہے۔

اور آیت کے آخر میں قرآن ایسے لوگوں کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، جو خدا کی ان عظیم نعمتوں کا انکار کرتے ہیں جو انسان کا امداد اور باہر سے احاطہ کیے ہوئے ہیں اور حق کے ساتھ لڑنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ فرماتا ہے ”جن ایسے لوگ

۱۔ انسان کے لیے تسخیر موجودات کے بارے میں تفسیر نمونہ کی جلد ۱۱، سورہ مدنی آیت ۲ کے ذیل میں بھی ہم نے بحث کی ہے۔

۲۔ مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۳۔ مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

بے غمہ کے بارے میں بغیر علم و دانش اور ہدایت و واضحی کے، مجاہد کرتے ہیں، اومن الناس من یجادل فی اللہ
بغیر علم ولا ہدی ولا کتاب مہر۔

اور بجائے اس کے کہ ان تمام ناخبری اور باطنی نعمتیں سمجھنے والے کو بچانے، جمالت و سرکشی کی بنا پر شرک اور کفر کا
شرح کرتے ہیں۔

”علمًا“ و ”ہدایت“ اور ”کتاب منیر“ کے درمیان کیا فرق ہے؟ شاید بہترین بیان یہ ہو کہ علم ایسے ادراکات کی طرف
اشارہ ہے، جنہیں انسان اپنی عقل و غرہ کے ذریعہ سے درک کرتا ہے اور ”ہدی“ ایسے خدائی اور آسمانی علمین در بہران اور علم
کی طرف اشارہ ہے جس کی راہ میں انسان کا ہاتھ پڑ کر اسے منزل مقصود تک پہنچاتے ہیں۔ اور ”کتاب منیر“ سے وہ آسمانی کتابیں
سزا ہیں جو وحی کے ذریعہ انسان کے دل و جان کو منور کرتی ہیں۔

حقیقت میں یہ صدی اور ہمت و عزم گروہ نہ خود علم و دانش رکھتا ہے، نہ کسی راہبر و رہنما کا اتباع کرتا ہے، اور نہ ہی وحی الہی سے مدد
ہے، چونکہ باہدایت ان تینوں چیزوں میں منحصر ہے، لہذا ان کے ترک کرنے سے انسان گمراہی اور ضلالت میں ڈال دیا جاتا ہے۔

عبدوانی آیت میں اس گمراہ گروہ کی بوری اور گمراہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: اور جس وقت ان سے کہا جائے پوچھو
خدا نے نازل کیا ہے، اس کی پیروی کرو تو وہ کہتے ہیں: نہیں ہم تو ان چیز کی پیروی کریں گے، جس پر ہم نے اپنے آباء و اجداد کو پایا
ہے، اواذ اقبل لہم یتبعوا من انزل اللہ فانوا لیتبعوا ما وجدنا علی اباہم۔

اور چونکہ ان کے جاہل و منحرف مذہب کی پیروی اور پروا سے ہدایت آفرین طریقوں میں سے کسی کی بھی جڑا نہیں لہذا قرآن سے
راہ شیطان کے عنوان سے ذکر کرتا ہے اور فرماتا ہے: ”کیا حق اگر شیطان نہیں بھرتی ہوئی آگ کے شعلوں کی طرف دعوت دے
تو پھر بھی انہیں اس کا اتباع کرنا پائے؟“ اولوکان الشیطان یدعوہم الی عذاب السعیر: ۱۷

حقیقت میں قرآن نے یہاں بڑوں کی سنت اور ان کے طور و اطوار کی پیروی کے نقاب کو الٹ دیا ہے۔ جو ظاہر بظاہر
قریب پر ہوتے ہیں اور ان کے عمل کے واقعی حیرہ کو ناپا کر دیا، یعنی وہی جنم کی راہ اختیار کرنے میں ہی شیطان کی پیروی ہے۔

جی ہاں شیطان کی راہبری ہی اس بات کے لیے تنہا کافی ہے کہ انسان اس کی مخالفت کرے، اگرچہ وہ حق کی طرف دعوت
کے پردوں میں کیوں نہ چھپی ہوئی ہو۔ کیونکہ وہ یقیناً ایک گمراہ کن نقاب ہے جس کے اندر سے جنم کی آگ کے لیے دعوت دی جاتی
ہے اور جنم کی آگ کی طرف دعوت دینا ہی اس بات کے لیے کافی ہے کہ اس کی مخالفت کی جائے، اگرچہ دعوت دینے والا مجہول الحال
ہو، لیکن اگر دعوت دینے والا شیطان ہو اور اس کی دعوت بھی تہذیب کی بھرتی ہوئی آگ کی طرف ہو تو بات صاف ظاہر ہے، کیا کوئی عقلمند
انسان اللہ کے پیغمبروں کی ہدایت کی طرف دعوت کو بھی ذکر شیطان کی دعوت کے پیچھے جنم کی طرف جاسکتا ہے؟

سہ منسبن مام پر لہو، کو بیان السورۃ السعیرۃ، کہ معنی یہ ہے کہ جس کی جڑا منحرف ہے اور جہل کی تقدیریں ہے، (الوکان الشیطان
یدعوہم الی عذاب السعیرا یتبعونہ)

اس کے بعد دو رد و جواب یعنی خالص مومن اور گناہوں سے آلودہ کفار کے حالات کو بیان کر کے ان کا آپس میں تقابل کرتا ہے اور اس
بارے میں بھی تقابل کرتا ہے کہ تو لوگ شیطان کے پیروکار اور اپنے بزرگوں کی اندھی تقلید کرتے ہیں، اصل تو یہ قرار دیتے ہوئے
کہتا ہے: جس شخص نے اپنے دل و جان کو خدا کے سپرد کر دیا اور پروردگار عالم کے آستان پر تسلیم فرم کر دیا، جبکہ وہ محسن اور نیکوکار
بھی ہے تو اس نے حکم دے کو بچا لیا ہے: (ومن سیلہ وجہہ الی اللہ وهو محسن فقد استمسک
بالعروة الوثقی)۔

”خدا کے لیے اپنے چبکے کو تسلیم اور تم کرنے سے مراد حقیقت میں پروردگار کی ذات پاک کی طرف اپنے تمام وجود کے ساتھ
مکمل توجہ کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ ”وجہہ“ (جس کا معنی پہرہ ہے) چونکہ بدن کا شریف ترین عضو اور حواس انسانی کا اہم ترین مرکز
ہے، لہذا انسان کی ذات کے کنارے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

”ہو محسن“ کی تعبیر ایمان کے ابد عمل صالح کے ذکر کی قسم ہے۔
حکم عروہ اور دست کو بچانا اس حقیقت کے متعلق ایسی لطیف تشبیہ ہے کہ انسان ماہریت کے گہرے کھڑے سے نکلنے اور
معرفت، معنویت اور روحانیت کی بلند ترین چوٹی تک پہنچنے کے لیے، ایک ٹھکر اور تقابل، ٹیناں کا وسیلہ کا محتاج ہے اور یہ وسیلہ
ایمان اور عمل صالح کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی، ان کے علاوہ باقی سب کچھ فرسودہ، پارہ پارہ ہونے والا، سقوط اور موت کا
سبب ہیں۔ علاوہ انہیں صرف وسیلہ ہی کو بقا حاصل ہے، اس کے علاوہ سب کچھ فانی اور نابود ہونے والا ہے۔ اس لیے آیت
کے آخر میں فرماتا ہے: ”تمام کاموں کی عاقبت خدا کی طرف ہے: (والی اللہ عاقبۃ الامور)۔

اس حدیث میں جو تفسیر برہان میں اہل سنت کے طریقوں سے امام علی بن موسیٰ رضا کے ذریعہ بغیر اسلام سے نقل ہوئی
ہے، اس طرح آیا ہے:

”سیکون بعدی فتنة مظلمة، التاجی منہا من تصد بالعروة الوثقی،
فقیل یارسول اللہ وما العروة الوثقی؟ قال ولا یة سید الوصیین، قیل یارسول
اللہ ومن سید الوصیین؟ قال امیر المؤمنین، قیل یارسول اللہ ومن امیر المؤمنین؟
قال مولی المسلمین واما مہد بعدی، قیل یارسول اللہ ومن مولی المسلمین واما
بعدي؟ قال اخی علی بن ابی طالب“ (ع)

”میرے بعد تاریک اور ظلمانی فتنہ رونما ہوگا، صرف وہ لوگ اس سے نجات حاصل کریں گے جو عروہ
الوثقی اور مضبوط دستہ کو بچالیں گے، عرض کیا گیا اسے اللہ کے رسول! عروہ الوثقی کیا ہے؟ فرمایا سید الوصیاء
کی دلالت! لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! سید الوصیاء کون ہے؟ فرمایا امیر المؤمنین! عرض کیا امیر المؤمنین
کون ہے؟ فرمایا مسلمانوں کا مولیٰ اور سیکر بعد ان کا امام و پیشوا! پھر انہوں نے اس بنا پر کہ زیادہ صریح جواب حاصل
کریں، عرض کیا وہ کون ہے؟ فرمایا امیر اہل بیت علی بن ابی طالب (ع)۔

سہ تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۲۰۹، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

اور روایات بھی اس سلسلے میں کہ عودۃ الوثقیٰ ہے اور ابی بیت یا آل محمد یا اولاد حسینؑ میں سے آمد کی دوستی ہے، نقل ہوئی ہیں۔

ہم بار بار کہہ چکے ہیں کہ اس قسم کی تفسیریں اپنے واضح مصداق کا بیان ہوتی ہیں اور توحید و تعویذ وغیرہ جیسے دوسرے مصداقوں کی متفاد نہیں ہیں۔

اس کے بعد دوسرے گروہ کی حالت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے "جو شخص کافر ہو جائے اور ان واضح حقائق کا انکار کرے، اس کا کفر آپ کو ٹھیک منکر ہے: (ومن کفر فلا یجوز لک کفرہ)۔"

کیونکہ آپ نے اپنی ذمہ داری کو ایسی طرح انجام دے دیا ہے۔ اب وہ ہے کہ جو اپنے اور ظلم دستم کو تباہ ہے۔

اس قسم کی تعبیریں جو قرآن مجید میں بار بار آئی ہیں نشان دہی کرتی ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ جو مشاہدہ کرتے تھے کہ ایک جاہل، ضدی، ہٹ دھرم اور کھڑے سراج گروہ ان واضح و روشن دلائل اور نشانیوں کے باوجود خدا کی راہ کو ترک کر کے بے راہ روی اختیار کرتا ہے تو پیغمبر اسلامؐ کو اس سے سخت رنج پہنچتا، اور وہ اس قدر ٹھیک ہوتے کہ بار بار خدا ان کی دل داری کرتا اور تسلی دیتا ہے اور دل سوز رسی کی بھی راہ و رسم تو ہوتی ہے۔

نیز ۱۰۔ پیغمبر! آپ ان سے پی پریشان نہ ہوں کہ اگر ایک گروہ دُنیا میں باوجودیکہ کفر اختیار کرتا اور ظلم ڈھاتا ہے، پھر بھی خدائی نعمتوں سے بہرہ ور ہے اور سزا اور عذاب میں مبتلا نہیں۔ کیونکہ اسی پر نہیں ہوتی۔

"ان سب کی باگشت جہاں طرف ہے اور ہم انہیں ان کے اعمال اور ان کے تلخ اور منحوس نتائج سے آگاہ کریں گے:" (الینا مرجعہم فننبتہنہم بما عملوا)۔

ہم نہ صرف ان کے اعمال سے آگاہ ہیں بلکہ ان کی نیتوں اور دل کے اندر فی اسرار سے بھی باخبر ہیں۔ "کیونکہ خدا اس سے جو سینوں کے اندر ہے آگاہ ہے: (ان اللہ علیہم بذات الصدور)۔"

یہ تعبیر کہ خدا لوگوں کو قیامت میں ان کے اعمال سے باخبر کرے گا یا جس میں وہ اختلاف کرتے تھے اس سے باخبر کرے گا، قرآن مجید کی بہت سی آیات میں نازل ہوا ہے اور اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "نبتکم" "نبأ" کے مادے سے ہے۔ مفردات راغب کی تفسیر بحات کے مطابق "نبأ" اس خبر کو کہتے ہیں جو اہم مضمون اور نامدہ کی حامل ہو اور صریح و آشکار ہو اور ہر قسم کے جھوٹ سے خالی ہو۔ اسی سے واضح ہوتا ہے کہ یہ تعبیرات اس طرف اشارہ ہیں کہ خداوند عالم قیامت میں انسانوں کے اعمال کو اس طرح فاش کرے گا کہ کسی کے لیے بھی کسی قسم کے اعتراض و انکار کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ لوگ جو کچھ اس دُنیا میں انجام دیتے ہیں اور عام طور پر ان سے فراموش کر دیتے ہیں، سب کو یقیناً (جو بہر حال ظاہر کرے گا اور حساب جزا کے لیے حاضر کرے گا)۔

یہاں تک کہ جو کچھ انسان کے دل میں گزرتا ہے اور خدا کے علاوہ کوئی شخص بھی اس سے آگاہ نہیں ہوتا وہ سب کچھ ان کے

کوشش کرے گا۔

پھر مزید کہتا ہے کہ ان کا دنیاوی زندگی سے بہرہ ور ہونا آپ کو تعجب اور حیرت میں نہ ڈال دے، "ہم بتھوی سی متابع دُنیا ان کے اختیار میں دے دیتے ہیں، اور متابع دُنیا جتنا بھی زیادہ ہو، پھر بھی کم اور ناچیز ہے۔ پھر انہیں جبری طور پر عذاب شدید کی طرف کھینچ کر لے جائیں گے۔ مسلسل اور دردناک عذاب کی طرف؛ (استمتعہم قليلاً ثم نضطرہم الی عذاب غلیظ)۔"

جو کہتا ہے کہ یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہو کہ وہ یہ تصور نہ کریں کہ وہ اس جہاں میں خدا کے قبضہ قدرت سے خارج ہیں، بلکہ وہ خود چاہتا ہے کہ انہیں آزمائش، اتمام حجت اور دوسرے مقاصد کے لیے آزاد کرے اور ان کی یہ متابع قلیل بھی اس کی طرف سے ہے۔ اس گروہ کی حالت جو قلت و غوری اور جبر و اکراہ کے ساتھ خدا کے شدید اور سخت عذاب کی طرف کھینچا جائے گا، ان لوگوں کی حالت سے کتنی مختلف ہے، جن کا سارا وجود خدا کے اختیار میں ہے اور انہوں نے عودۃ الوثقیٰ کو پکڑ رکھا ہے اور دُنیا میں پاکت پاکیزہ اور نیکی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور آخرت میں رحمت خدا کے جو اہم نعمتوں سے بہرہ ور ہوں گے۔

۲۵- وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ○

۲۶- اللَّهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْجَمِيدُ ○
 ۲۷- وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ○

۲۸- مَا خَلَقَكُمْ وَلَا بَعَثَكُمْ إِلَّا كَفَّيْسٍ وَاحِدَةً إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ○

۲۹- الْمُرْتَانَ اللَّهُ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُؤَلِّجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى وَإِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَخِيرٌ ○
 ۳۰- ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الْبَاطِلُ وَأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ○

ترجمہ

۲۵- اگر تم ان سے سوال کرو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو خلق کیا ہے؟ تو یقیناً

وہ کہیں گے اللہ نے۔ کہہ دو، الحمد للہ! (کہ تم خود معترف ہوئے) لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

۲۶- اللہ کے لیے وہ کچھ ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے، کیونکہ خدا بے نیاز اور لائق حمد و ستائش ہے۔

۲۷- جو کچھ روئے زمین پر درخت ہیں، اگر وہ قلم بن جائیں اور سمندر ان کے لیے سیاہی بن جائے۔ اور سات دیگر سمندروں کا اضافہ کیا جائے یہ سارے ختم ہو جائیں گے لیکن خدا کی باتیں ختم نہیں ہوں گی۔ خدا عزیز و حکیم ہے۔

۲۸- تم سب کی دوبارہ خلقت و زندگی ایک فرد کی زندگی سے زیادہ نہیں ہے، خدا سننے اور دیکھنے والا ہے۔

۲۹- کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، اور اس نے سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے اور ہر ایک معین اور مقررہ (وقت تک اپنی) حرکت کو جاری رکھے ہوئے ہے، جسے تم انجام دیتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

۳۰- یہ سب کچھ اس امر کی دلیل ہے کہ خدا حق ہے، اور اس کے علاوہ جس کو وہ پکارتے ہیں باطل ہے اور خدا بلند مقام اور عظیم مرتبے والا ہے۔

تفسیر

پروردگار کی دس صفات :

اور پرانی چھ آیات میں خدا کی صفات کا ایک مجموعہ بیان ہوا ہے جو حقیقت میں دس اچھے صفات یا اسما حسنہ ہیں سے دس اسماء کو بیان کرتا ہے۔ یعنی: حمید، عزیز، حکیم، سمیع، بصیر، خبیر، حق، علی اور کبیر۔
یہ تو ہوا ایک ناما نسبتاً زیادہ سرا پہلو تو پہلی آیت میں خدا کی "خالقیت" کے بارے میں گفتگو جوتی ہے اور دوسری آیت میں اس کی "مالکیت عامہ" سے تیسری آیت میں اس کے بلے انتہا "علمتے" اور چوتھی دیا پانچویں آیت میں اس کی غیر متناہی قدرت سے اور آخری آیت میں نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ جو ذات ان صفات کی حامل ہے، وہ "حق" ہے اور جو اس کے علاوہ ہے، وہ باطل ناپسند اور حقیر ہے۔

اس اجمالی بحث کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم آیت کی تشریح کی طرف لوٹتے ہیں۔

پہلے دہنا ہے۔ "اگر ان سے سوال کرو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو خلق کیا ہے تو یقیناً وہ جواب دیں گے کہ "اللہ" نے: (ولم یسألہم من خلق السماوات والارض لیقولن اللہ)۔

یہ تعبیر جو دوسری قرآنی آیات میں بھی نظر آتی ہے (جیسے سورہ عنکبوت آیت ۶۱ تا ۶۲۔ سورہ زمر آیت ۲۸۔ سورہ زخرف آیت ۹) جہاں ایک طرف اس امر کی دلیل ہے کہ مشرک لوگ خالق کی توحید کے ہرگز منکر نہیں تھے۔ اور تینوں کی خالقیت کے قائل بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ صرف عبادت میں شرک اور تینوں کی شفاعت کا عقیدہ رکھتے تھے۔

وہاں دوسری طرف توحید کے نظری ہونے اور تمام انسانوں کی فطرت میں نور الہی کی تکلی کی دلیل بھی ہے۔

اس کے بعد کہتا ہے۔ اب جبکہ وہ خالق کی توحید کے معترف ہیں "تو کہہ دے کہ محمد ستائش اللہ کے ساتھ مخصوص ہے ہر چیز کا خالق ہے نہ کہ تینوں کے ساتھ جو خود مخلوق ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے اور وہ نہیں سمجھتے کہ عبادت کو خالق عالم کے لیے نصح ہونا چاہیے: (قل الحمد لله بل اکثرہم لا یعلمون)۔

اس کے بعد حق تعالیٰ کی "مالکیت کے ثبوت کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے، فرماتا ہے "خدا کے لیے ہے تمام وہ کچھ جو آسمانوں اور زمین میں ہے: (الله مافی السماوات والارض)۔

واضح رہے کہ وہ ذات جو "خالق" اور "مالک" ہے، وہی امور جہاں کی مدبر بھی ہے اور اس طرح سے توحید اپنی تینوں قسموں (توحید خالقیت، توحید مالکیت اور توحید ربوبیت) سمیت ثابت ہو جائے گی۔

اور جو ذات ان صفات کی حامل ہے، وہ ہر چیز سے بلے نیاز اور ہر قسم کی ستائش کے لائق ہوگی اسی بنا پر آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے۔ "خدا غنی و مدید ہے: (ان الله هو الغنی الحمید)۔

وہ غنی مطلق اور ہر لحاظ سے مدید ہے۔ کیونکہ جو نعمت و عطا بخشش جہاں میں ہے، اسی کی طرف لوتی ہے اور ہر شخص جو کچھ رکھتا ہے اس کی طرف سے ہے اور تمام اچھائیوں کے خزانے اس کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ اور یہی اس کے غنا اور توکل کی زندہ دلیل ہے۔

اور چونکہ "ہم" کا معنی کسی اچھے کام کی تعریف و ستائش ہے، جو ارادہ و اختیار کے ساتھ کسی سے انجام پاتا ہے اور اس عالم میں جو اپنی اور نیکی نہیں نظر آتی ہے وہ چونکہ پروردگار عالم کی طرف سے ہوتی ہے۔ لہذا ہر قسم کی تعریف اور ستائش بھی اسی کے لیے ہی ہوگی۔ یہاں تک کہ اگر ہر نبیوں کی زیبائی اور خوبصورتی کی تعریف کرتے ہیں یا ملکوتی مشن کی کشش کی توصیف کرتے ہیں یا کسی ایسا قربانی کرنے والے شخص کے کام کی عظمت کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں تو درحقیقت اسی کی ہی ستائش و تعریف کر رہے ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ زیبائی ہو یا وہ وقت جا زہ اور عظمت سب کچھ اسی کی طرف سے ہے۔ پس وہی "حمید علی الاطلاق" ہے۔

بعد والی آیت خدا کے غیر متناہی اور بے پایاں علم کی تصویر کشی کرتی ہے۔ جو ایک بہت ہی واضح اور روشن مثال کے ساتھ مجسم ہوتی ہے۔ لیکن پہلے اس بحثے کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جیسے علی بن ابراہیم کی تفسیر کے مطابق "یہودیوں کے ایک گروہ نے جس وقت مسئلہ روح کے بارے میں پیغمبر سے سوال کیا اور قرآن نے ان کے جواب میں کہا (قل الروح من امر ربی) وما اوتیتہم من العلم الا قلیلاً" روح میرے پروردگار کا امر اور حکم ہے اور علم سے تمہارا حصہ بہت ہی مختصر ہے، تو یہ گفتگو ان پر گراں گزری اور پیغمبر سے پوچھا کہ یہ حکم ہمارے ہاں سے ہے؟ فرمایا نہیں بلکہ سب کو شامل ہے زبان تک کہ یہی ہے۔

لیکن انھوں نے مزید کہا: اے محمد! آپ اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ آپ بھی علم کا غنودہ اسما جنت رکھتے ہیں۔ حالانکہ آپ کو قرآن عطا ہوا ہے اور میں بھی تو ذات دی گئی ہے۔ آپ کے قرآن میں آیا ہے "جسے حکمت دی گئی اسے غیر کثیر دی گئی ہے"۔ یہ باتیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتیں تو اس مقام پر "ولسوان" مافی الارض من شجرة اقلام (زیر بحث) آیت نازل ہوئی اور واضح کیا کہ انسان کا علم جتنا بھی وسیع ہو، خدا کے علم کے مقابلہ میں ایک بلے مقدار ذرہ سے زیادہ نہیں ہو کچھ تمہارے نزدیک بہت زیادہ ہے، وہ خدا کے ہاں بہت ہی کم ہے۔ لہ۔

اس طرح کی ایک اور روایت ایک دوسرے طریق سے ہم نے سورہ کہف کی آیت ۱۰۹ کے ذیل میں بیان کی ہے۔ یہ حال قرآن مجید خدا کے غیر متناہی علم کی تصویر کشی کرتے ہوئے، اس طرح کہتا ہے: "بہت کچھ روئے زمین پر رشت ہیں، علم ہو جائیں اور سمندر اس کے لیے سیاہی بن جائیں اور سات سمندر دل کا اس پر اضافہ ہو جائے تاکہ وہ علم خدا کو گھسیں۔ یہ سب ختم ہو جائیں گے لیکن کلمات خدا ختم نہیں ہوں گے۔ خداوند عالم عزیز حکیم ہے: (ولسوان مافی الارض من شجرة اقلام والبحر سبعة ابحر ما فسدت کلمات الله ان الله عزیز حکیم)۔

"بیمدہ" "مداد" کے مادہ سے سیاہی یا کوئی دوسرا رنگین مادہ ہوتا ہے، جس کے ساتھ کہتے ہیں اور اصل "مد"

سے جو کشتش کے معنی میں ہے لیا گیا ہے۔ کیونکہ خط و قلم کی کشتش کے ذریعہ کاغذ کے صفحہ پر ظاہر ہوتے ہیں۔

بعض مفسرین نے اس کے لیے ایک اور معنی بھی نقل کیا ہے اور وہ تیل ہے جو چراغ میں ڈالتے ہیں، اور وہ چراغ کی روٹی کا سبب بنتا ہے اور دونوں معنی حقیقت میں ایک ہی اصل کی طرف لوٹتے ہیں۔ کلمات "جمع ہے" کلمہ کی اور اصل میں ان الفاظ کے معنی میں ہے، جن کے ساتھ انسان بات کرتا ہے اور پھر وہ اس سے زیادہ وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے اور وہ ہر وہ چیز ہے، جو کسی مطلب کو بیان کر سکے اور چونکہ اس جہان کی گونا گوں مخلوقات میں سے ہر چیز خدا کی پاک ذات اور اس کے علم و قدرت کو بیان کرتی ہے۔ لہذا ہر موجود کو "کلمتہ اللہ" کہا جاتا ہے، خصوصاً صاحبان شرافت و عظمت موجودات کے بارے میں یہ تعبیر استعمال ہوتی ہے، جیسا کہ حضرت عیسیٰ کے بارے میں سورہ نسا کی آیت ۱۷۱ میں ہم پڑھتے ہیں انما المسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ وکلمتہ (اور اس جیسا معنی سورہ آل عمران کی آیت ۴۵ میں آیا ہے)۔

اس کے بعد اسی مناسبت سے "کلمتہ اللہ" پر دروگر کا عالم کے علم و دانش کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔

اب ہمیں شبک طرح سے غور و فکر کرنا چاہیے کہ ایک انسان کی تمام معلومات کو معرض تحریر میں لانے کے لیے کبھی تو ایک قلم سیما ہی کی کچھ مقدار کے ساتھ کافی ہوتی ہے۔ بلکہ جو کتاب ہے کہ اسی ایک قلم سے دوسرے انسان بھی اپنی معلومات کے مجموعہ کو کاغذ کے صفحہ پر لے آئیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے۔ اگر روئے زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں۔ ظاہر ہے کہ بسا اوقات ایک تنوع مند درخت کے تنوں اور شاخوں سے ہزاروں بلکہ لاکھوں قلم وجود میں آسکتے ہیں، روئے زمین کے تمام عظیم درختوں اور جنگلوں کی تعداد کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ جن سے کائنات کے پہاڑ، دشت اور صحرا اٹے پڑے ہیں۔ پھر ان سے تیار ہونے والے قلم اور اسی طرح اگر روئے زمین کے تمام سمندر سیما ہی بن جائیں، جو تقریباً کرۂ ارض کے تین چوتھائی حصہ پر محیط مسبق اور گہرے ہیں۔ تو کھنے کے لیے اس وقت کس قدر عجیب و غریب کیفیت رونا ہو گی اور علم و دانش کی کتنی مقدار کو کجا جاسکے گا؟ خصوصاً اس وقت ان کے ساتھ سات دوسرے سمندروں کا بھی اضافہ کر دیا جائے کہ جن میں سے ہر ایک سمندر روئے زمین کے تمام سمندروں کے برابر ہوا اور خاص کر جب اس امر کو مد نظر رکھا جائے کہ یہاں پر سات کا عدد شمار کے معنی میں نہیں، بلکہ کثرت اور زیادتی کے معنی میں ہے اور بے شمار سمندروں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ تو ایسی صورت میں واضح ہو جاتا ہے کہ علم الہی کی وسعت کس قدر عظیم اور نا پید کارہ ہے اور پھر یہ کہ یہ سب تو ختم ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کے علوم پھر بھی ختم ہونے میں نہیں آئیں گے۔ کیا کسی لائق تہا ہی کے لیے اسی سے زیادہ خوبصورت انداز میں تصویر کشی کی جاسکتی ہے؟ ہر عدد اس قدر واضح اور ناطق ہے کہ اس کے ساتھ انسانی فکر کی لہریں بے حوال اور لامحدود آفاق کی طرف پرواز کر جاتی ہیں اور خود انسان کو حیرت و استعجاب کے سمندریں ڈبو دیتیں۔

اس واضح ترین بیان کی طرف توجہ کرنے سے انسان محسوس کرتا ہے کہ خدائی علم کے سامنے تو اس کی معلومات ایسی ہیں جیسے کسی لائق تہا ہی کے سامنے ایک صفحہ کی ہوتی ہے اور اس مقام پر پہنچ کر اسے نرم ویتا ہے کہ کہے "میرا علم و دانش وہاں تک جا پہنچا ہے کہ میں نے اپنی نادانی کو بپا لیا ہے۔ یہاں تک کہ اس واقعیت کو بیان کرنے کے لیے قطرہ اور سمندر کی تشبیہ بھی ناکافی نظر آتی ہے۔

مخملہ لطیف کلمات کے جو آیت میں نظر آتے ہیں، ایک یہ بھی ہے کہ لفظ "مشجدة" مفرد کی شکل میں اور "اقلامہ" جمع کی صورت میں آیا ہے تاکہ قلموں کی تعداد کی فراوانی کو بیان کرے۔ جو ایک درخت کے تنوں اور شاخوں سے وجود میں آتے ہیں۔

اور نیز "السبحر" کی تعبیر مفرد کی صورت میں اور اس پر "الغف لام نہیں" اس لیے ہے کہ یہ دو سنے زمین کے تمام سمندروں کو کہتا ہے۔ خصوصاً اس لیے کہ تمام دنیا کے سمندر آپس میں مربوط و متصل ہیں اور واقع میں۔ ایک ہی وسیع و عریض سمندر کے حکم میں ہیں۔ اور مزید بات یہ ہے کہ "قلموں" کے بارے میں اضافی اور ملکہ کرنے اور مدد کرنے والے قلموں کی بات نہیں کی۔ بلکہ سمندروں کے بارے میں سات دوسرے سمندروں کی گفتگو درمیان میں آئی ہے۔ وہ اس لیے کہ کھتے وقت قلم کا مصرف کم اور سیما ہی کا مصرف زیادہ ہوتا ہے۔

لفظ "سبع" سات کا اثنا عشر لغت عرب میں تعداد کی کثرت اور زیادتی بیان کرنے کے لیے ہے اور یہ شاید اس لحاظ سے ہے کہ گذشتہ زمانہ میں لوگ منظومہ شمس کے کروں کی تعداد کا عدد سات سمجھتے تھے۔ (اور حقیقت میں موجودہ زمانہ میں بھی آلات لگائے بغیر منظومہ شمس میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ سات کروں سے زیادہ نہیں) اور پھر یہ کہ "بفتہ" سات دنوں کی ایک کامل سیٹ سے زیادہ نہیں ہے اور تمام کرۂ ارض کو بھی سات حصوں میں تقسیم کرتے تھے۔ اور اس کا نام سات "تقسیم" رکھا ہوا تھا۔ ان باتوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اکائیوں میں سے سات کا عدد ایک کامل عدد کے نمونہ سے اور تعداد کی کثرت بیان کرنے کے لیے کیوں استعمال ہوا؟ پروردگار کے غیر متناہی علم کے ذکر کے بعد اس کی بے انتہا قدرت کی بات درمیان میں لاتے ہوئے فرماتا ہے۔ تم سب کی خلقت و آفرینش نیز موت کے بعد تم سب کا اٹھنا ایک فرد کی مثال سے زیادہ نہیں ہے۔ خدا سننے اور دیکھنے والا ہے، اما خلق حکم ولا لہب حکم الا لکنفس واحدۃ ان اللہ سبع بصیر۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ لغت قریش کی ایک جماعت سب سے معاہدہ پر توجہ کرتی اور اسے بعید سمجھتی تھی اور کہتی تھی کہ خدانے ہمیں مختلف شکلوں میں پیدا کیا ہے اور گونا گوں مراحل کے اندر ایک دن ہم نظفہ تھے پھر ملکہ ہوئے۔ اس کے بعد کو مٹا رہے اور پھر تدریجی طور پر مختلف صورتوں میں اس دنیا میں آئے تو کس طرح ہم سب کو خدا ایک ہی لمحہ میں نئی خلقت دے گا؟ تو زیر بحث آیت نازل ہوئی اور اس کا جواب دیا۔

درحقیقت وہ اس غلطی سے غافل تھے کہ "سخت" "داسان" اور "چوٹے" اور "بڑے" جیسے لفظوں کے مفہوم ہمارے عینی موجودات کے لیے ہیں جو محدود قدرت رکھتی ہے۔ لیکن حق تعالیٰ کی غیر متناہی قدرت کے سامنے میں برابر ہیں۔ خلقت خواہ ایک شخص کی ہو یا کئی اشخاص کی، ایک موجود کی خلقت ایک لمحہ میں ہو یا ساہا سال کے دوران میں اس کی بارگاہ قدرت میں سب ایک جیسا ہے۔

اگر کفار کا قہقہہ اس بنا پر ہے کہ یہ مختلف طبیعی، گونا گوں شکلیں اور انواع و اقسام کی شخصیتیں اور وہی انسان کے خاک اورٹی ہو جانے اور خاک کے منتشر ہوجانے اور ایک دوسرے سے مل جانے کے بعد کس طرح ممکن ہے کہ وہ ایک دوسرے

۱۰ پروردگار کے لائق تہا ہی علم کے سلسلے میں سورہ کہف کی آیت ۱۰۹ میں ہم نے گفتگو کی ہے۔

سے جہازوں اور ہر چیز اپنی جگہ کی طرف لوٹ آئے، تو اس کا جواب خدا کا غیر متناہی علم اور لازوال قدرت دیتی ہے۔

اس نے موجودات عالم کے درمیان ردابط کچھ اس طرح برقرار کیے ہیں کہ ایک اکائی مثل ایک مجموعہ کے اور ایک مجموعہ مثل ایک اکائی کے ہے۔

اصولی طور پر اس جہان کا باہمی اتصال و ارتباط کچھ اس طرح ہے کہ ہر کثرت ایک آن میں وحدت کی صورت اختیار کر سکتی ہے اور تمام انسانوں کی خلقت بھی اسی طرح اس اصول اور فارمولے کے تابع ہے، جس طرح ایک انسان کی خلقت۔

اگر ان کا تعجب زمانہ کے اختصار کے لحاظ سے ہے کہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ مراحل جو انسان حالت نطفہ سے لے کر جوانی کے دور تک گئی ہوں ان میں طے کرتا ہے مختصر سے لحاظ میں طے کرے؟ تو اس کا جواب بھی پروردگار کی قدرت دہنی ہے۔ جہاں تک ہم جاندار کی دنیا میں انسانی بچوں کو دیکھتے ہیں کہ انہیں ایک طویل مدت گزارنا چاہیئے تاکہ وہ چلنا پھرنا اچھی طرح سیکھ سکیں یا نوری غذا سے استفادہ کر سکیں۔ اس کے عکس جب پرندوں کے بچوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنا سارا نمٹے سے باہر نکالتے ہی اور پیدا ہوتے ہی کھڑے ہو جاتے ہیں اور چلنے پھرنے لگتے ہیں بلکہ غذا کھانے میں وہ اپنی مال کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔ یہ امور نشان ہی کرتے ہیں کہ اس قسم کے مسائل کی خدا کے سامنے کوئی اہمیت نہیں۔

اس آیت کے آخر میں خدا کے "سین" و "صیر" ہونے کا ذکر ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تشریح کن کی طرف سے ہونے والے ایک اور اعتراض کا جواب ہو اور وہ اس طرح کہ چلو مان لیا کہ تمام انسان اپنی گونا گوں اور مختلف تخلیقی خصوصیات کے باوجود ایک وقت مقررہ پر اپنی قبروں سے باہر آجائیں گے، لیکن ان کے اعمال اور اقوال کا کس طرح محاسبہ کیا جائے گا جو جو وہیں آنے کے بعد فوراً امتیازت نالود ہو جاتے ہیں؟

تو قرآن جواب دیتا ہے کہ خدا سننے اور دیکھنے والا ہے۔ اُس نے ان کی تمام باتیں سنی ہیں اور ان کے تمام اعمال دیکھے ہیں (علاوہ ان کے جہان میں مطلق فنا اور نابودی نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے بلکہ ان کے اعمال و اقوال ہمیشہ موجود رہتے ہیں، اس سے قطع نظر اُپر والا جملہ ان لوگوں کے لیے تشبیہ ہے جو جیلوں بہانوں سے کام لیتے ہیں کہ یاد رکھو یہ جو تم تمام لوگوں کے انکار کو محسوس کر رہے ہو، خدا تمہاری اس زہریلی گفتگو سے بے خبر نہیں ہے۔ حتیٰ کہ جو کچھ تم دل میں رکھتے ہوئے ہو اور زبان پر نہیں لاتے، خدا اس سے بھی آگاہ ہے۔

بعد والی آیت تاکید اور خدا کی وسیع قدرت کے لیے ایک اور بیان ہے۔ روستے سخن پیغمبر کی طرف کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ حضرات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے؟" (الرحمن ان الله یولج اللیل فی النهار ویولج النهار فی اللیل)۔

نیز کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ "خدا نے سورج اور چاند کو انسانوں کے مفادات کے لیے مسخر کیا ہے؟" (وسخر الشمس والقمر)۔

"اور ان میں سے ہر ایک مقررہ مدت تک اپنی حرکت کو جاری رکھے ہوئے ہے؟" (کل یجرى علی اجل مستق)۔

"اور یہ کہ خدا اس سے کہ جو تم انجام دیتے ہو آگاہ ہے؟" (وان الله بما تعملون خبیر)۔

"وسوج" اصل "ذخول" کے معنی میں ہے۔ اور رات کا دن میں داخل ہونا اور دن کا رات میں ہوسکتا ہے کہ تدریجی انداز میں بھر جس رات دن کے کم اور زیادہ ہونے کی طرف اشارہ ہو۔ کہ تدریجاً ایک میں کمی اور دوسرے میں غیر محسوس شکل میں اضافہ ہوتا ہے تاکہ چاروں موسم اپنی خصوصیات اور بابرکت آثار کے ساتھ ظاہر ہوں۔ (صرف رُستے زمین کے دو خطے ایسے ہیں کہ جن میں نہ تو یہ تدریجی تبدیلی ہوتی ہے اور نہ ہی چاروں موسم، ایک تو قطب شمالی ہے اور دوسرا قطب جنوبی، جہاں سارے سال میں چھ ماہ رات اور چھ ماہ دن ہوتا ہے اور دوسرا بالکل ہی بالیک خط استوا ہے، جہاں سال بھر میں رات دن یکساں ہوتے ہیں اور یا اس طرف اشارہ ہے کہ زمینی فضا میں رات کا دن ہیں اور دن کا رات میں تبدیل ہونا ناگہانی شکل میں صورت پذیر نہیں ہوتا تاکہ انسان اور زندگی کے مختلف نظریات کا سامنا کرنا پڑے۔ بلکہ سورج کی شعاعیں طویل فاصلے کے وقت پہلے تاریکی کی گہرا بڑوں میں داخل ہوتی ہیں اور پھر آہستہ آہستہ برقی جاتی ہیں یہاں تک کہ تمام آسمان کو گھیرتی ہیں دن کے اختتام اور رات کے آغاز کے بالکل برعکس۔

یہ تدریجی اور مکمل منظم سوچا سمجھا اتصال قدرت خدا کے مظاہر میں سے ہے۔

الغیبتان دونوں تفسیر کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ دونوں مل کر ہی آیت کا معنی دے رہی ہوں۔

انسانوں کے لیے "شمس" و "قمر" اور باقی آسمانی کرات کی تسخیر کے بارے میں، جیسا کہ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں، مراد انسان کی خدمت کی راہ میں تسخیر ہو اور دوسرے لفظوں میں "سخر لکم" میں "لاہ" "لاہر نفع" ہے، "لاہر" "لاہر" اور یہ سب اختصاف اور یہ تعبیر قرآن میں سورج، چاند، رات، دن، نہروں اور یاؤں اور کشتیوں کے بارے میں آئی ہے اور یہ سب انسانی عظمت کی عظمت اور خدا کی نعمتوں کی وصت کو بیان کرتی ہیں کہ زمین و آسمان کے تمام موجودات حکم خدا کے آگے سر جھکے فرما نہ راری میں مصروف ہیں۔ جب صورت حال یہ ہو تو پھر انصاف سے بعید ہوگا کہ انسان خدا کا فرمایا نہ وار نہ ہو۔

"کل یجرى علی اجل مستق" کا جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ چنانچہ حساب شدہ اور منظم نظام ایک جاری رساری نہیں ہے بلکہ کسی نہ کسی دن اسے ختم ہونا چاہیئے اور اس کے خاتمہ کے ساتھ ہی دنیا بھی ختم ہو جائے گی۔ وہی کچھ ہوگا جو توراہ تحریر میں کہا گیا ہے:

"اذا الشمس کوردت واطالالتجو مان کدرت"

"جس وقت سورج بے نور ہو جائے گا اور ستارے سیاہ اور تاریک ہو جائیں گے۔"

(ان الله بما تعملون خبیر) ہماری مندرجہ بالا گفتگو کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس جملہ پر غور کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ اس کا اسی بحث کے ساتھ کیسا تعلق ہے۔ کیونکہ وہ خدا جس نے با عظمت سورج اور چاند کو اس منظم حساب کتاب کے ساتھ چلایا، جو اسے اور رات دن کو مخصوص نظم و ضبط کے ساتھ لاکھوں کروڑوں سال سے ایک دوسرے میں وارد کرتا

ملے "انسان کے لیے سورج چاند اور دوسرے موجودات کی تسخیر کے بارے میں علامت شہر سورہ زمرہ کی آیت ۲۷ کے ذیل میں۔ اور سورہ الزلزال

۱۱۳ میں ہم نے تفصیل بحث کی ہے۔ (اردو ترجمہ)

آ رہا ہے، اس سے کس طرح ممکن ہے کہ وہ انسانوں کے اعمال سے بے خبر رہ جائے؟ جی ہاں! وہ ان کے اعمال کو بھی جانتا ہے اور ان کی نیات و افکار اور تصورات کو بھی۔

آیت کے آخر میں بحث کو سیٹھتے ہوئے نتیجے کے طور پر فرماتا ہے ”یہ امور اس چیز کی دلیل ہیں کہ خدا حق ہے اور اس کے علاوہ نہیں وہ لوگ پکارتے ہیں و باطل ہیں اور خدا بلند مقام اور بزرگ مرتبہ والا ہے؛ ذالک بان الله هو الحق وان ملید عون من دونہ الباطل وان الله هو العلی الصبیر“

گذشتہ آیات میں خداوند عالم کی خالقیت، مالکیت اور غیرتناہی علم و قدرت کے بارے میں بحث سے ثابت ہو گیا ہے کہ ”حق“ صرف وہی ہے اور اس کے علاوہ سب زائل، باطل، محدود اور عاجت مند و نیاز مند ہے اور ”علی و صبیر“ کہ جو ہر چیز سے برتر اور توصیف و تعریف سے بالاتر ہے، وہ اس کی پاک ذات ہے۔ شاعر کے بقول ہے

الاکل شمیء ملہ فلا الله باطل وکل نعیم لا محالہ زائل

”اگاہ رہو کہ خدا کے علاوہ جو کچھ ہے وہ باطل ہے اور ہر نعمت آخر کار زوال پذیر ہے“

اس بات کو فلسفی تبصر میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے

حق اصلی اور پایدار وجود کی طرف اشارہ ہے اور اس جہان میں وہ وجود حقیقی جو قائم بالذات اور ثابت برقرار اور جاودانی ہو، وہ صرف وہی ہے اور باقی جو کچھ بھی ہے بالذات کوئی وجود نہیں رکھتا اور مین بطلان ہے کہ جو اپنی ہستی کو اس وجود حق سے وابستگی کی بنا پر نظر کرتا ہے اور جس لمحہ وہ اپنی نظر لطف ان سے اٹھائے تو وہ فنا و نیستی کی تاریکیوں میں مٹ کر ناپید ہو جائیں۔

تو اس طرح دوسرے موجودات کا ارتباطی تعالیٰ کے وجود کے ساتھ جس قدر زیادہ ہوگا، اسی نسبت سے وہ زیادہ حقانیت کسب کریں گے۔

بہر حال جیسا کہ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ یہ آیات خدا کی رحبتہ صفات میں سے دس صفات کا مجموعہ اور اس کے اسماء حسنیٰ میں سے دس نام ہیں اور ہر قسم کے شرک کی نفی اور تمام مراحل عبودیت میں توحید کے لازم پر قوی دلائل پر مشتمل ہیں۔

سُئِلَ «بَا» دجان الله هو الحق؟ میں اگرچہ بادی النظر میں ”باہر بیت“ نظر آتی ہے اور شاید اسی بنا پر بعض مفسرین نے جیسے آویس نے روح المعانی میں، اس آیت کے مضمون کو گذشتہ مطلب کا سبب قرار دیا ہے، لیکن آیات کا سیاق اور گذشتہ صفات کا ذکر یعنی خالقیت، مالکیت و علم و قدرت اور عالم غفلت میں اس کی نشانیاں بظاہر ہے کہ وہ سب اس تہجد کے گوشے سے، اس بنا پر اس آیت کا مضمون گذشتہ آیات کا نتیجہ ہے نہ کہ سبب۔

۳۱- الْمَتَرَانِ الْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ نِعْمَتِ
اللَّهِ لِيُرِيَكُمْ مِنْ آيَاتِهِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ
لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ

۳۲- وَإِذَا عَشِيَ هُمْ مَوْجٌ كَالظُّلْمِ دَعَا اللَّهُ مُخْلِصِينَ
لَهُ الدِّينَ؛ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ
وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا كَلٌّ خِتَارٍ كَفُورٍ

ترجمہ

۳۱- کیا تو نے نہیں دیکھا کہ کشتیاں سمندر کے سینے پر حکم خدا اور اس کی نعمت کی برکت سے چلتی ہیں، وہ تمہیں اپنی آیات کا ایک حصہ دکھانا چاہتا ہے۔ بیشک اس میں تمام صبر و شکر کرنے والوں کیلئے (قدرت خدا کی بہت سی نشانیاں ہیں۔

۳۲- اور جس وقت (دریائی سفر میں) بادلوں کی طرح کوئی موج انہیں چھپا دے (اور ان کے سر کے اوپر آجائے) تو وہ خدا کو خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں، لیکن جس وقت اس نے انہیں خشکی کی طرف نجات دی تو بعض اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں (اور اپنے ایمان کے وفادار رہتے ہیں، جب کہ دوسرے بعض بھول جاتے ہیں اور کفر کی راہ اختیار کر لیتے ہیں) اور ہماری آیات کا کوئی شخص سوائے عہد شکن کفر کرنے والے کے اور کوئی انکار نہیں کرتا۔

تفسیر

گرداب بلا میں!

ایک بار پھر زیر بحث دو آیات میں خدا کی نعمتوں اور آفاق و انفس میں توحید کے دلائل کے متعلق گفت گو ہے۔ پہلی آیت میں دلیل نظم کے متعلق ہے اور دوسری آیت میں توحید فطری کے، اور مجموعی طور پر ان مباحث کی تکمیل کرنی ہے جو گذشتہ آیات میں ہو چکی ہیں۔

کہتا ہے "کیا تو نے نہیں دیکھا کہ کشتیاں دریاؤں کے سینے پر خدا کے حکم اور اس کی نعمت کی برکت سے پلٹی ہیں۔"

إلہ تران الفلک تجری فی البحر نعمة اللہ

مقصود یہ ہے کہ اپنی عظمت کی آیات کا ایک پہلو تمہیں دکھائے: (لپریکھ من آیات اللہ)

جی ہاں "ان میں نشانیاں ہیں، ان کے لیے جو بہت عبرت کرنے والے ہو، لیکھا اور شکر گزار ہیں: "ان فی خلک لآیات لکل صبار شکور۔"

اس میں شک نہیں کہ کشتیوں کا سمندروں کے سینہ پر چلنا قوانین آفرینش کے ایک مجموعہ کا نتیجہ ہے۔ وہ یوں کہ:

۱- ہواؤں کا منظم ہو کر چلنا۔

۲- مخصوص وزن کی کٹڑی یا درہ مواد جس کے کشتی بناتے ہیں۔

۳- خورد پانی کا اپنا بوجھ۔

۴- پانی پر تیرنے والے اجسام پر پانی کا دباؤ۔

اور جس وقت ان امور میں سے کسی ایک میں خلل پیدا ہو جائے تو کشتی سمندر میں ڈوب جاتی ہے یا الٹ جاتی ہے اور یا وسط سمندر میں حیران و سرگرداں رہ جاتی ہے۔

لیکن جس خدا نے سمندروں کو انسان کی مسافت اور ایک جھٹے سے دوسرے کی طرف اشیاء کے حمل و نقل کے لیے بہترین شاہراہ قرار دیا ہے، وہی خدا مذکورہ حالات پیدا کرتا ہے، جن میں سے ہر ایک یقیناً خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ سمندروں میں قدرت خدا کی عظمت اور اس کے مقابلے میں انسان کی پستی اس قدر ہے کہ گذشتہ زمانہ میں جب کہ صرف ہوا کی قوت کشتی چلانے میں استفادہ ہوتا تھا، اگر ساری دنیا کے لوگ جمع ہو کر بھی تند ہوا کی حرکت کی مخالف سمت میں اسے چلا کر سمندر کے اندر تک لے جانا چاہتے تو نہیں لے پاسکتے تھے۔

لہ "بعمرة اللہ" میں ہو سکتا ہے "باسبیت" جو اور یا "بمصاحبت" ہو لیکن بلا احتمال زیادہ مناسب ہے۔

موجودہ زمانہ میں بھی جب کہ بحری جہازوں میں انجن کی طاقت ہوا کی نیچے لے چکی ہے، پھر بھی سمندری طوفان اس قدر سخت ہوتے ہیں کہ وہ عظیم ترین جہازوں کو بھی اپنی راہ سے ہٹا دیتے ہیں اور بسا اوقات ان کا ستیا ناس کر دیتے ہیں۔

اور یہ جو آیت کے آخر میں "صباراً و تشکوراً" (بہت زیادہ صبر کرنے والا اور بہت زیادہ شکر گزار) ایسی صفات کا ذکر ہوا ہے تو یہ یا تو اس بنا پر ہے کہ دنیاوی زندگی مجموعہ ہے "بلا" و "نعمت" کا، جن میں سے ہر ایک آزمائش کا ذریعہ ہے سخت حوادث کے مقابلے میں صبر و استقامت اور نعمتوں کے مقابلے میں شکر گزاری انسان کے مجموعی فرائض کو تشکیل دیتے ہیں۔

اس لیے ایسی ایک حدیث ہے جسے بہت سے مفسرین نے پیغمبر اسلام سے نقل کیا ہے کہ

ألا ییمان نصفان نصف صبر و نصف شکر

ایمان کے دو حصے ہیں، آدھا صبر اور آدھا شکر ہے، لہ

اور یا اس طرف اشارہ ہے کہ خلقت کے خدا کی با عظمت آیات کے ادراک کرنے کے لیے کسی سبب کی ضرورت ہے جیسے منہم کا شکر جو زیادہ سے زیادہ غور و فکر کے لیے صبر و شکیبائی کے ساتھ ملا ہوا ہو۔

کشتیوں کے دریا میں چلنے کی نعمت کے بیان کے بعد جو گذشتہ زمانہ میں بھی اور موجودہ زمانہ میں بھی انساؤں اور مال و اسباب کے حمل و نقل کا عظیم اور مفید ترین وسیلہ ہیں، اسی مسئلہ کے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "جس دقت و کشتی پر سوار ہوں اور سمندروں کے درمیان پہنچ جائیں اور سمندر میں طوفان آجائے اور کوہ پیکر امواج بادلوں کی طرح ان کے سروں پر چھا جائیں تو وہ خدا کو خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں: "واذا غشیہم موج کالظلل دعوا اللہ مخلصین لہ الدین۔"

"ظلل" "ظلمہ" (بروزن قلم) کی جمع ہے، جن کے مفسرین نے کئی معانی بیان کیے ہیں:

"راغب" "مفردات" میں کہتے ہیں: "ظلمہ" اس بادل کے معنی میں ہے کہ جو سایہ ڈالتا ہے۔ اور زیادہ تر انجیل و واقعات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

بعض نے اسے مادہ "ظل" سے سائیاں کے معنی میں لیا ہے۔

اور بعض نے اسے پارہ کے معنی میں لیا ہے۔

اگرچہ زیر بحث آیت کے رابطہ میں ان معانی کا آپس میں زیادہ فرق نہیں، لیکن پھر بھی جب دیکھا جاتا ہے کہ قرآن میں بار بار یہ نظائر لیکن بادلوں کے معنی میں آیا ہے اور "غشیہم" (انھیں ڈھانپ لیا کی تعبیر جو بادل کے معنی سے زیادہ تناسب رکھتی ہے۔ لہذا یہ تفسیر ترمیم تر نظر آتی ہے۔

یعنی سمندر کی عظیم موجیں اس طرح اٹھتی اور ان کے اطراف کو یوں گھیر لیتی ہیں گویا بادلوں نے ان کے سر پر سایہ کیا ہوا ہے

لہ تفسیر مجمع البیان، قرطبہ، فخر رازی اور صفائی۔

ایسا یہ جو وحشت ناک اور ہول انگیز ہے۔

یہ وہ مقام ہے، جہاں انسان اپنی تمام ظاہری طاقتوں کے باوجود اس نے جو اپنے لیے جمع کر رکھی ہیں، اپنے آپ کو خوف و ناچیز اور ناتواں پاتا ہے، ہر جگہ سے اس کا ہاتھ کٹ چکا ہوتا ہے۔ تمام عادی اور ادوی وسائل بے کار ہو جاتے ہیں، سامیہ کا کوئی پہلو باقی نہیں رہ جاتا۔ سوائے اس نور کے کہ جو اس کی جان کے اندر اور اس کی غفلت کی گہرائی سے چمکتا ہے۔

یہ غفلت کے پردوں کو ہٹا دیتا ہے اور اس کے دل کو روشن کرتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ کوئی ہے، جو تجھے رہائی اور نجات دے سکے؛

وہی ذات کہ ستم کی مویں جس کے تابع فرمان ہیں اور پائی ہوا اورٹی اس کے لیے سرگرداں نہیں۔

یہ وہ مقام ہے، جہاں غافل توحید انسان کے سارے دل کا اعلاہ کر لیتی ہے، وہ دین اور عبادت کو صرف اُسی کے ساتھ مخصوص سمجھتا ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے "جس وقت خدا نے انہیں اس ہلاکت سے نجات دے دی، مویں مانند پڑ گئیں اور صحیح دسامہ حاصل نجات تک پہنچ گئے تو لوگ، وہ گروہ ہو گئے، بعض نے اعتدال کی راہ اختیار کی اور اس عہد پیمان کے بادل میں ان حساس لمحات میں غلامی سے کیے یا نبرد و فساد رہتے ہیں۔" اذ لعلنا نجاہم الی البتوف عنہم مقتصد ہیند

لیکن وہ سرگرد ہر چیز کو فراموش کر دیتا ہے اور دوبارہ شرک و کفر کا لٹیلا لٹکا اس کے دل کی مملکت پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔

مفسرین کی ایک جماعت از پر وہی آیت کو "عکرمہ" بن اپنی جہل "کے اسلام لانے کی طرف اشارہ سمجھتی ہے۔

فتح کھڑے موقع پر چونکہ پیغمبر اکرمؐ نے چار افراد کے علاوہ سب لوگوں کے لیے عام معافی کا اعلان کر دیا تھا اور جن چار افراد کے بارے میں سزائے موت کا حکم تھا، ان میں ایک عکرمہ بن ابوجہل تھا۔ ان کے بارے میں حکم تھا کہ جہاں کہیں انہیں یا وہ ختم کر دو، کیونکہ انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے برخلاف کسی قسم کی رشتہ دہانی، کینہ پروری اور جرم و گناہ کا کوئی لمحہ ہاتھ سے نہیں جانے دیا تھا، یہ حکم سن کر عکرمہ کو مجوزا مکہ سے بھاگنا پڑا۔

بیچہ احمدیہ پینچ کر کشی پر سوار ہو گیا، سندر میں غلظتاً کہ تیز ہوا چلی، اہل کشتی نے ایک دوسرے سے کہا، اڈیوں سے اپنا ناطقہ ڈر کر صرف لطف "خدا" کے دامان سے شرمک ہو جائیں، کیونکہ ہمارے لیے ان خداؤں سے کچھ نہیں ہو سکتا۔

"عکرمہ" نے کہا اگر توحید کے علاوہ ہمیں سندر سے کوئی نجات نہیں دے سکتا تو خشکی پر بھی نہیں دے سکتا۔ بار اللہ! میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ تو نے اس نصیب سے نجات دے دی تو میں محمدؐ کے پاس جا کر ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں گا۔ کیونکہ اسے میں رحیم اور کریم سمجھتا ہوں۔

آخر کار اس نے نجات پائی اور حضرت پیغمبرؐ میں اکر مسلمان ہو گیا۔

۱۱ "مقتصد" مقصد کے مادہ سے کام میں اعتدال اور وعدہ دنا، کے معنی میں ہے۔

۱۲ "صح ابیمان ذیل آیتیر بیٹ" اسلام غایب فی عرۃ الصلابہ ۳۷۳ میں جی جی ماہر المفسر نے نزق کے ساتھ آیات اعلیٰ کے کمرے کے لیے لکھے۔

آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے "ہماری آیات کا سوائے پیمان شکن کفران کرنے والوں کے کوئی انکار نہیں کرتا؛" و ما یجحد ہا آیاتنا الا کل خستار کفوراً۔

"خستار" "خستار" (بروزن "چستار") کے مادہ سے ہے جو عہد شکنی کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ بیانہ کا صیغہ ہے، کیونکہ مشرکین اور مجاہد گار بار ہا مصائب میں خدا کی طرف رجوع کرتے اور خدا سے عہد پیمانہ باندھتے ہیں اور ندریں مانتے ہیں لیکن جس وقت طوفان حوادث تم جاتے ہیں تو اپنا عہد پیمانہ توڑ دیتے ہیں اور خدا کی نعمتوں کو کفران کے سپرد کر دیتے ہیں اور یہ ان کا بار ہا معمول ہے۔

حقیقت میں "خستار" و "کفور" کہ جو اس آیت کے ذیل میں آئے ہیں "صبتار" اور "شکور" کے بالکل مقابل میں آئے ہیں۔ جو گذشتہ آیت کے ذیل میں آچکے ہیں (کفران شکر گزاری کے مقابلہ میں، اور عہد شکنی" شکیبائی اور عہد پیمانہ پر باقی رہنے کے مقابلہ میں ہے) جو اپنے اندر فطری ایمان کے جلوہ گر ہونے کے وقت کوشش کرتے ہیں کہ اس نور الہی کو دوبارہ خاموش نہ ہونے دیں اور اس کے اُپر حجاب اور پردے نہ پڑنے دیں۔

۳۳- يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ وَاحْشُوا يَوْمًا لَا يَجْزِي
وَالِدَ عَنْ وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَارِعٌ عَنْ وَالِدِهِ
شَيْئًا إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ
الدُّنْيَا إِنَّهَا بَاطِلَةٌ وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللَّهِ الْغُرُورُ ۝

۳۴- إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنزِلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ
مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا
وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ
خَبِيرٌ ۝

ترجمہ

۳۳- اے لوگو! خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور اس دن سے ڈرو کہ جس میں نہ باپ
اپنے بیٹے کے اعمال کی جزا کا بار اٹھائے گا اور نہ بیٹا باپ کی جزا میں
سے کسی چیز کا۔ یقیناً خدا کا وعدہ حق ہے۔ لہذا دنیاوی زندگی تمہیں فریب نہ دے
اور شیطان تمہیں مغرور نہ کرے۔

۳۴- قیام قیامت کے وقت سے آگاہی خدا کے ساتھ مخصوص ہے اور وہی ہے
جو بارش کو نازل کرتا ہے اور جو کچھ ماؤں کے رحم میں ہے اسے جانتا ہے، اور
کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس زمین پر مرے گا

صرف خدا ہی عالم و آگاہ ہے۔

تفسیر

خدا کے علم کی وسعت:

ان دو آیات میں جو سورہ لقمان کی آخری آیات میں پہلے مجموعی طور پر اور ایک اجمالی صورت میں گذشتہ چند نصاب اور توجید
و معارف کے دلائل کے ذریعہ تمام انسانوں کو خدا اور قیامت کے دن کی طرف متوجہ کرتا ہے، پھر دنیا اور شیطان کی طرف سے پیدا ہونے
والے غرور و تجسس سے ڈراتا ہے اور اس کے بعد علم خدا کی وسعت اور تمام چیزوں کو اس کی شمولیت اور اس کی عمومیت کو بیان کرتا ہے۔
فرماتا ہے "اے لوگو! خدا سے ڈرو" (یا ایہا الناس اتقوا ربکم)۔

"اور اس دن سے ڈرو کہ جس میں نہ تو باپ اپنے بیٹے کے گناہ کا بوجھ اپنے کندھے پر اٹھائے گا۔ نہ ہی بیٹا باپ کی ذمہ داری
میں سے کسی چیز کا متحمل ہوگا" (واخشوا یومًا لا یجزی والد عن ولده ولا مولودٌ ہو جازع عن
والده شیئًا)۔

حقیقت میں پہلا فرمان مسبار کی طرف توجہ ہے اور دوسرا معارف کی طرف۔

پہلا حکم انسان میں خبردار رہنے کی قوت کو زندہ کرتا ہے اور دوسرا پاداش و کیفر اور جزا و سزا کے احساس کو، اور اس میں شک
نہیں کہ جو شخص یہ جانتا ہو کہ ایک خیر اور آگاہ ذات اس کے تمام اعمال کو دیکھتی اور جانتی ہے اور اسے محفوظ کرتی جاتی ہے، اور
دوسری طرف سے عدل و انصاف کا حکم اس کے تمام چھوٹے بڑے اعمال کی چھان بین کرنے کا تو اس قسم کا انسان بہت کم گناہ
کا اور بے زاہ روی کا شکار ہوتا ہے۔

"لا یجزی" کا جملہ جزا کے مادہ سے ہے اور لغوی طور پر "جزا" دو معنی کے لیے آتا ہے، ایک تو کسی چیز کے
مقابلہ میں پاداش و کیفر یعنی سزا اور جزا دینے کے معنی میں۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے "جزا لا اللہ خیر"؛ خدا سے اچھی
پاداش (جزا) دے۔

اور دوسرا کفایت کرنے لگنا یعنی ہونا اور تحمل کرنا، جیسا کہ زیر بحث آیت میں آیا ہے "لا یجزی والد عن ولده
کوئی باپ اپنے بیٹے کی ذمہ داری اور مسئولیت کو قبول نہیں کرے گا اور اس کی جگہ پر نہیں بیٹھے گا اور اس کی کفایت نہیں
کرے گا"۔

ہو سکتا ہے کہ دونوں معنی ایک ہی اصل کی طرف پلٹتے ہوں۔ کیونکہ جزا اور سزا بھی عمل کی جانشین اور اس کے برابر
ہوتی ہیں۔ مغرور کیجئے گا،

بہ حال اس دن ہر شخص اس طرح اپنے آپ کے ساتھ معروف و مشغول اور اپنے اعمال کے بیچ نرمی گنہگار ہوگا کہ دوسرے کی طرف توجہ بھی نہیں کر سکے گا۔ یہاں تک کہ باپ اور بیٹا جو آپس میں نزدیک ترین رابطہ رکھتے ہیں، ان میں سے کسی کو بھی دوسرے کا خیال نہ ہوگا۔

یہ آیت بعینہ اسی آیت کی طرح ہے جو سورہ حج کی ابتدا میں آئی ہے، جس میں قیامت اور اس کے زلزلہ کے بارے میں کہا گیا ہے: (یسو تر و نہات ذہل کل مروضۃ عمقا صنعت) جس دن تم اسے دیکھو گے کہ دو در پلٹنے والی مائیں اپنے شیر خوار بچوں کو بھول جائیں گی:

قابل توجہ یہ ہے کہ "باپ" کے بارے میں "لا یجزی" (فعل مضارع) کی تعبیر کرتا ہے اور بیٹے کے بارے میں "بحاز" (اسم فاعل) کی تعبیر ہے۔ یہ تعبیر کا فرق ہو سکتا ہے گفتگو میں تنوع کے طور پر یا باپ کے مقابلہ میں بیٹے کے فرائض اور ذمہ داری کی طرف اشارہ ہو۔ کیونکہ اسم فاعل زیادہ دوام و استمرار پر دلالت کرتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں محبت پوری سے یہ توقع ہے کہ کم از کم کچھ صورتوں میں تو بیٹے کے مذاب کو برداشت کرے۔ جیسا کہ دنیا میں اس کی نامناسب چیزوں کو اپنی جان پرسلے لیتا تھا۔ لیکن بیٹے کے بارے میں تو یہ ہے کہ وہ باپ کی زیادہ سے زیادہ ناپسندیدہ باتوں اور سختیوں کو اس کے لیے شائق کی وجہ سے تحمل و جاسے گا۔ جبکہ ان دونوں میں سے کوئی بھی اس دن ایک دوسرے کی کم سے کم مشکل بھی حل نہیں کرے گا۔ اور ہر ایک اپنے اعمال میں گرفتار اور اپنے گریبان میں جھانک رہا ہوگا۔ آیت کے آخر میں انسان کو دو چیزوں سے ڈراتے ہوئے فرماتا ہے: "خدا کا وعدہ حق ہے۔ مبادا کہیں تمہیں زندگی فریب دے اور شیطان دھوکہ دے والے: "الذی وعد اللہ حق فلا تغربنکم الحیلولة الدنیا ولا یغرنکم باللہ الغرور"۔

واقع میں یہاں پر دو نواہی نظر آتی ہیں جو ان دو ادارے کے مقابلہ میں ہیں، جو آیت کے ابتدا میں تھے، کیونکہ اگر خدا کی طرف توجہ حساب و کتاب اور جزاء و سزا کا خوف انسان میں زندہ ہو جائے تو پھر اس کے بائیں پاؤں راست سے انحراف اور بے راہ روی کی رغبت باقی نہیں رہتی، مگر دو راستوں سے ایک تو یہ کہ دنیا کی چمک دمک اور رنگینی اس کی نگاہوں میں حقائق اور واقعات کو بالکل برعکس بنا کر پیش کرے اور اچھائی اور برائی کے درمیان تمیز کی قدرت اس سے سلب کرے۔ وہی بات کہ دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے۔ دوسرا یہ کہ شیطان دوسرے سے فریب اور دھوکہ میں مبتلا کر کے اسے مغرور اور مبہر و معاوے کو سوں دور کر دے۔

اگر کتاب گناہ کے یہ دونوں راستے بند ہو جائیں تو پھر کوئی خطرہ بھی اسے پہنچ نہیں کر سکتا اور اس طرح سے اوپر والے چار احکام آدمی کی نجات کے پروگرام کا مکمل مجموعہ فراہم کر دیتے ہیں۔

گذشتہ آیت میں قیامت کے سلسلہ میں ہونے والی محبت کی مناسبت سے اس سورہ کی آخری آیت میں بھی ایسے معلوم کے بارے میں گفتگو کی جا رہی ہے جو پروردگار کے ساتھ مخصوص ہیں۔ کہتا ہے "قیامت کے وقت کی آگاہی خدا کے ساتھ مخصوص ہے: ان اللہ عندہ علم الساعة"۔

"اور وہی ہے جو بارش کو نازل کرتا" اور اس کے نزول کے تمام جزئیات سے آگاہ ہے، ویسٹزل الغیث)۔

اور نیز "وہی ہے جو ایسے بچوں سے کہ جو رحم مادر میں ہوتے ہیں ان کی تمام تفصیلات کے ساتھ، آگاہ ہے: (و یعلم ما فی الارحام)۔

اور "کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا؟" (و ما تدری نفس ماذا اتکسب عذاباً)۔ اور "کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا؟" (و ما تدری نفس باء ارض تصوت)۔ "خدا عالم اور آگاہ ہے: (ان اللہ علیہ خبیر)۔

گویا یہ آیت مجموعی طور پر اس سوال کا جواب ہے جو قیامت کے بارے میں پیش ہوا ہے۔ وہی سوال جو مشرکین قریش نے پیغمبر سے بار بار کیا اور کہا "مستی ہو" (قیامت کا دن کب ہوگا؟) (امراء ۵)۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے کوئی شخص خدا کے علاوہ قیامت کی گھڑی اور وقت سے آگاہ نہیں ہے اور وہی صریح آیات کے مطابق خدا نے اس علم کو سب سے مخفی رکھا ہے:

(ان الساعة آتیة اکاد اخفیہا) "بے شک قیامت آنے کی اور میں چاہتا ہوں کہ اس کو مخفی رکھوں: (طہ ۱۵)۔

تا کہ ضرور غفلت کبھی بھی افراد بشر کے دامن گیر نہ ہوں۔

اس کے بعد کہتا ہے کہ نہ صرف قیامت کا مسئلہ تم سے پوشیدہ ہے بلکہ تمہاری روزمرہ کی زندگی اور نزدیک ترین مسائل میں سے جو تمہاری موت و حیات سے سروکار رکھتے ہیں، بہت سے مطالب ایسے ہیں جن سے تم بے خبر ہو۔

بارش کے زندگی عطا کرنے والے قطرات کے نزول کا وقت جن سے تمام جانداروں کی زندگی وابستہ ہے، تمہیں سے کسی پر بھی آشکار نہیں اور تم کو صرف اندازہ اٹھل پچھل اور وہم و گمان کے ساتھ اس کے بارے میں بحث کرتے ہو۔

اسی طرح شکم مادر میں تمہاری پیدائش کے وقت اور جنین کی خصوصیات سے کوئی آگاہ نہیں ہے۔ اور نیز آئندہ نزدیک یعنی تمہارے کل کے حوادث نیز موت، زندگی کو الوداع کہنے کا مقام سب سے پوشیدہ ہے۔

جب تم اپنی زندگی سے ان کے نزدیک ترین مسائل کی اطلاع نہیں رکھتے تو کون سے تعبیر کی بات ہے کہ قیامت قیامت کے لمحے سے بے خبر رہو؟ سہ

سہ یہ ٹھیک ہے کہ اوپر والی آیات میں "ویسٹزل الغیث" (خدا بارش کو نازل کرتا ہے) کے جملہ میں مسلم خدا کے مسند کے بارے میں گفتگو نہیں ہے اس بنا پر یعنی اس قبیلہ کو ان جملوں کے درمیان استثناء کے طور پر قدرت خدا کے بیان کے لیے ذکر اس کے علم کے لیے سمجھا ہے۔ لیکن اوپر والی جملوں کی ایک دوسرے سے ہم آہنگی اور دوسری طرف سے متعدد روایات جو بیخ اہل لغت اور دوسری کتب میں آئی ہیں، ذکر جن کی طرف مقرر اشارہ کریں گے، اس چیز پر ہم یہ نہیں کہ وہ جملہ میں علم خدا کے ساتھ مربوط ہے۔

تفسیر "درمنثور" میں منقول ہے کہ قبیلہ "بنی مازن" سے "دارت" نامی ایک شخص پیغمبر اکرم کی خدمت میں آیا اور کہا "اے محمد! قیامت کب برپا ہوگی؟ علاوہ انہیں ہمارے شہر خشک سالی کا شکار ہو چکے ہیں، کب نعمت سے مالا مال ہوں گے؟ نیز جس وقت میں آیا ہوں میری بیوی حاملہ تھی کب اسے بچہ پیدا ہوگا؟ میں تو یہ جانتا ہوں کہ آج میں نے کیا کام کیا ہے لیکن یہ بتاؤ کہ کل کیا کروں گا؟ خلاصہ یہ کہ میں جانتا ہوں کہ میں کہاں پیدا ہوا ہوں۔ تم بتاؤ کہ میں کس سرزمین میں مروں گا؟ تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور کہا ان تمام امور کا علم خدا کے پاس ہے۔ لہ

چند اہم نکات

۱۔ غرور و فریب کی قسمیں: اوپر والی آیات تشبیہ کرتی ہیں کہ دنیاوی زندگی کی چمک دمک تمہیں فریب میں مبتلا نہ کرے۔ پھر شیطان کے دھوکہ دینے کی بات ہے اور اس کی نسبت خطرے کا الارم ہے کیونکہ لوگوں کی چند قسمیں ہیں، بعض اتنے ضعیف و ناتواں ہوتے ہیں جن کے فریب اور دھوکے کے لیے صرف دنیا کے رزق و برق کا مشاہدہ ہی کافی ہوتا ہے۔

لیکن بعض دوسرے جو مزاحمت کی طاقت رکھتے ہیں، تو ان کے لیے رزق و برق کے علاوہ شیطان و وسوسوں کا امانہ بھی ہوتا ہے اور اندرونی اور بیرونی شیطان ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالتے ہیں تاکہ وہ انہیں دھوکہ دے سکیں۔ اوپر والی آیت کی تعبیر ایسے سب کے لیے تشبیہ ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "غرور" (بروزن جسور) ہر فریب اور دھوکہ دینے والی چیز کو کہتے ہیں ماوریہ جو اس کی شیطان کے ساتھ تفسیر کی گئی ہے، درحقیقت اس کے واضح مصداق کا بیان ہے درنہر فریب کا انسان دھوکہ دینے والی کتاب، ہر دوسرے پیدا کرنے والا مقام و مرتبہ اور ہر وہ چیز جو انسان کو گمراہ کر دے، اس لفظ کے وسیع مفہوم میں داخل ہے یا یہ کہ شیطان کے مفہوم کو اس قدر وسعت دیں کہ ان تمام امور کو شامل ہو جائے۔

اس لیے راعب مفردات میں کہتے ہیں "عسود" ہر وہ چیز ہے جو انسان کو مغرور کر دے اور فریب میں مبتلا کر دے خواہ وہ مال ہو یا مقام و مرتبہ یا شہرت اور شیطان۔ اور شیطان کے ساتھ اس کی جو تفسیر ہوئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان ہمیشہ ترین فریب کار ہے۔

اور بعض لوگوں نے غرور کی دنیا کے ساتھ جو اس کی تفسیر کی ہے تو دنیا کے فریب اور دھوکہ دینے کی بنا پر ہے۔ جیسا کہ بیچ البلاغ میں ہم پڑھتے ہیں "غرور و تغرور" فریب دیتی ہے، ضرر پہنچاتی ہے اور گزر جاتی ہے۔ لہ

۲۔ دنیا کی فریب کاری: اس میں شک نہیں کہ زندگی دنیا کے بہت سے مظاہر غرور آمیز ہوتے ہیں اور غفلت

لہ تفسیر مفہور بحوالہ تفسیر المیزان جلد ۱۶ ص ۲۵۴۔

لہ بیچ البلاغ مفہومات فقہا شمارہ ۱۵۔

پیدا کرتے ہیں اور کبھی کبھار تو اس طرح انسان کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں کہ اپنے سامنے باقی ہر ایک چیز سے غافل کر دیتے ہیں۔ اسی بنا پر بعض اسلامی روایات میں حضرت امیر المؤمنین علیؑ سے منقول ہے کہ جس وقت آپ سے لوگوں نے سوال کیا "أحس الناس اثبت رأياً" کون شخص تمام لوگوں میں سے صاحب فکر و رائے اور تندہیر کے لحاظ سے زیادہ ثابت قدم ہے تو آپ نے فرمایا "من لم يفتره الناس من نفسه ولم تغره الدنيا بنشوبيقها" وہ شخص کہ جسے فریب کار لوگ فریب نہ دے سکیں اور دنیا کی رغبت اسے دھوکہ نہ دے سکے۔ لہ

لیکن اس کے باوجود اسی فریب کار دنیا کے مختلف مناظر کے اندر زبان حال سے بولنے والے کچھ ایسے مناظر بھی ہیں جو اس جہاں کی ناپائیداری اور اس کے کھوکھلے رزق و برق کو واضح ترین انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وہ حوادث جو ہر ہوش مند انسان کو بیدار کر سکتے ہیں بلکہ جو ہوش مند نہیں انہیں بھی ہوشیار کر دیتے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے حضرت امیر المؤمنین علیؑ نے کسی سے سنا کہ وہ دنیا کی خدمت کر رہا تھا اور اسے فریب کار بنا رہا تھا تو آپ نے اس کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

أيها الذمار للذميا المغتر بغرورها، المخدوع بابا طيلها، اغتر بالذميا
شعرتذمها؛ انت المتجرم عليها امرهي المتجرمة عليك؛ متى استهوتك؟
امر متى غرتك؟ ابمصارع اباثلث من السبلى امر بمصانع امهاثلث تحت الثلثى؛
ان الدنيا دار صدق لمن صدقها، ودار عافية لمن فهم عنها، ودار غنى
لمن تزود منها، ودار موعظة لمن اعطى بها، مسجد احبب الله، ومصلى ملائكة
الله، ومهبط وحى الله، ومتجر اولياء الله.....

اسے دنیا کی خدمت کر لینے! اس کی دل فریبیوں کے فریب خوردہ اس کی رام کہانیوں کا دھوکہ کھائے ہوئے کیا بات ہے کہ دنیا پر فریبیہ بھی ہوا اس کی خدمت بھی کہے ہو؟ کیا تم آگ کی تہ کی تمہارے ہو یا وہ تمہیں مجرم ٹھہرائی؟ اس نے تمہیں کب تڑا لایا؟ یا کب تمہارا دل لچکایا؟ کیا اس وقت جب تمہارے آباء سال خوردہ ہو کر ڈھیر ہوئے یا اس وقت جب تمہاری مائیں گولیاں مٹی کے بیچے ہمیشہ کو سو گئیں؟ کتنے ہی بیادوں کی تم نے (رپے سے) خدمت کی۔ اور کتنے ہی مرغیبوں کی ہاتھوں سے تیار داری کی؟ تم چاہتے تھے کہ وہ شفا یاب ہو جائیں اور ان کے علاج کے لیے اطباء سے مشورے طلب کرتے پھرتے تھے۔ وہ بھی اس دن جب سے تمہاری دوا ان کے کسی کام نہ آئی۔ نہ ان پر تمہارا رونا دھونا ہی مفید ہوا۔ ان میں سے کسی کو بھی تمہاری مہربانی کا فائدہ نہ پہنچا اور نہ تمہاری مراد ہی برآئی اور تم اپنا زور لگا بیٹھے، مگر کسی کو (موت سے) نہ بچا سکے۔ اور دنیا نے اس (مرنے والے) کو تمہارے لیے مثال بنا دیا اور اس کی موت کو تمہاری موت کا نقشہ بنا دیا۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا نباہ کا گھر ہے۔ مگر اس کے لیے جو اس سے بنا کر سے اور دار

لہ من لا يحضره الفقيه (بحوالہ نور الثقلين جلد ۱ ص ۲۱۶)

ماہیت ہے اس کے لیے جو اس کی حقیقت کو سمجھے اور دست کدہ سے اس کا جو اس سے زائد آفرت حاصل کر سکے۔ اور عبرت کا گھر ہے اس کے لیے جو اس سے سبق سیکھ لے۔ (وہ) خدا کے دوستوں کی سمجھ سے، اللہ کے ملائکہ کی جگہ نماز ہے، وہی خدا کے اترنے کی جگہ ہے اور خدا کے ارادیاں کی تمنا گاہ ہے۔

۳۔ یہ پانچ علوم خدا کے ساتھ مخصوص ہیں؛ اس سے قطع نظر کہ اوپر والی آیت کا لب و لہجہ حکایت کرتا ہے کہ قیامت ہا پیش کے نزدیک، رحم مادر میں جنین کی کیفیت، وہ امور کہ جنہیں انسان آئندہ انجام دے گا اور اس کی موت کی جگہ سے آگاہی اور اس کا علم خدا کے اختیار میں ہے اور خدا کے علاوہ کس اور کون تک کوئی رسائی نہیں، وہ روایات بھی جو اس آیت کی تفسیر میں وارد ہوتی ہیں، نیز اس حقیقت کی تاکید کرتی ہیں۔

مفسران کے ایک حدیث میں ہے (ان مفاتیح الغیب خمس لا یعلمہن الا اللہ وقرأ هذه الآية غیب کی چابیاں پانچ ہیں کہ جنہیں خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ پھر آپ نے اوپر والی آیت کی تلاوت فرمائی۔ ملہ پنج السباع کی ایک اور روایت میں ہم پڑھتے ہیں کہ جس وقت حضرت علیؑ امیرؑ نے اس آیت کے واقعات کے بارے میں خبر دے رہے تھے۔ تو ایک صحابی نے عرض کیا یا امیر المؤمنین آپ غیب کی خبر دے رہے ہیں؟ اور آپ علم غیب سے آشنا ہیں؟ امام نے "بئى كلب" کے اس شخص سے سکا کر فرمایا:

يا اياك كلب! ليس هو يعلم غيب، وانما هو تعلم من ذي علم، وانما تعلم الغيب علم الساعة وما عده الله سبحانه بقوله ان الله عنده علم الساعة..... فيعلم الله سبحانه ما في الامم حاصر، من ذكر وانثى، وقبيح وجميل، وسخى وخبيل، وشقى ووسيد، ومن يكون في النار حطباً وفي الجنان للنبين مرفعتاً، فهذا علم الغيب الذي لا يعلمه احد الا الله، وما سوى ذلك فعلم علمه الله نبيه فعلمه ودمالي بان يحيه صدرى وتضطر عليه جوانحى۔!

اے بھائی کلب! یہ علم غیب نہیں ہے، بلکہ یہ اس (رسول) سے حاصل کی ہوئی باتیں ہیں جو خزانہ علمِ الہی تھے۔ علم غیب تو قیامت کا وقت اور ان چیزوں کے جاننے کا نام ہے، جنہیں خداوند عالم نے اپنے ارشاد "ان الله عنده علم الساعة... الخ میں شاکر کیا ہے۔

پس خدا ہی جانتا ہے کہ رحم اور میں کیا ہے؟ نہ ہے یا مادہ؟ بدصورت ہے یا خوبصورت؟ سنی ہے یا بخیل؟ شقی ہے یا نیک اور کون جہنم کا ایندھن بنے گا؟ اور کون جہنم میں نبیوں کے ساتھ ہوگا؟ پس یہ ہے وہ علم غیب جسے خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا، رہا وہ کسی چیزوں کا علم تو وہ ہم جانتے ہیں، خدا نے اپنے نبی کو عطا فرمایا اور نبی نے مجھے بتلادیا اور میرے لیے دعا فرمائی کہ میرا سینہ انہیں اس طرح محفوظ رکھے، جیسے ترکش تیروں کو محفوظ رکھتا ہے اور میری پیدل

لے صحیح مسلمان ذیل آیت پر بحث۔

انہیں سمجھے رہیں۔

اس روایت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ لوگوں کی ان پانچ امور سے عدم آگاہی سے مراد ان کی تمام خصوصیات ہیں مثلاً اگر کسی دن ایسے وسائل و ذرائع انسان کے اختیار میں آجائیں (جب کہ انہیں تک وہ دن نہیں آیا) اور جنہیں کے لڑکے یا لڑکی ہونے سے قطع طور پر آگاہ ہو جائیں تو کوئی نئی بات نہیں ہوگی کیونکہ جنین سے آگاہی یہ ہے کہ اس کے تمام جسمانی خصوصیات بد صورتی اور خوبصورتی سلاستی و بیاری اور ذہنی استعدادیں علمی و فلسفی و ادبی ذوق اور دوسرے روحانی اوصاف اور کیفیات جان لیں اور یہ امر خدا کے علاوہ کسی اور کے بس میں نہیں ہے۔

اسی طرح یہ کہ بارش کب ہوگی؟ اور کون سے علاقہ پر برسے گی؟ اور ٹھیک ٹھیک کتنی مقدار دریا، صحرا، درہ، کوہ و بیابان میں برے گی؟ خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا!

اور کل اور آئینہ دونوں کے حوادث اور ان کی خصوصیات و جزئیات بھی اسی طرح ہیں۔

اور یہاں سے اس سوال کا جواب جو عام طور پر یہاں پیش آتا ہے، اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ یہ جو کہتے ہیں کہ ہم تاریخوں اور متعدد روایات میں پڑھتے ہیں کہ صرف ائمہ اہل بیت ہی نہیں بلکہ اللہ کے علاوہ دو سکندر اولیاء اللہ نے اپنی موت کے متعلق خبر دی یا اپنے مومن کو بیان کیا، جن میں سے کہ بلا سے تعلق رکھنے والے واقعات بھی ہیں، چنانچہ ہم نے کئی روایات میں پڑھا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ، امیر المؤمنینؑ اور انبیا و مسلف نے امام حسینؑ اور ان کے یار انصاری کی اس سرزمین میں شہادت کی خبر دی ہے۔ اور کتاب اصول کافی میں ایک باب ائمہ کی اپنی وفات کے وقت سے آگاہی کے سلسلہ میں نظر آتا ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان بعض امور سے آگاہی علم اجمالی کی صورت میں ہوتی ہے اور وہ بھی تعلم الہی کے طریق سے، تو اس کا خدا کی ذات پاک سے مخصوص تفصیلی علم کے ساتھ کسی قسم کا محاذ نہیں ہے۔

اور پھر یہ کہ جیسا ہم کہہ چکے ہیں کہ ان کا یہ عالمی علم بھی ذاتی اور استقلالی نہیں۔ بلکہ بالعرض اور خدا کی طرف سے تعلیم کی وجہ سے ہوتا ہے کہ جتنا خدا چاہتا اور مصلحت سمجھتا ہے۔

اسی لیے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آپ کے صحابی نے سوال کیا کہ کیا امام علم غیب جانتا ہے؟

قال لا، ولكن اذا اراد ان يعلم الشيء، علمه الله ذلك

"فرمایا نہیں، امام علم غیب ذاتی طور پر نہیں جانتا۔ لیکن جب بھی کسی چیز کو جاننا چاہتا ہے تو خدا اسے آگاہ کر دیتا ہے۔"

علم غیب اور انبیا و ائمہ کے علم کی کیفیت کے بارے میں بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں، جن کے متعلق متعلقہ آیات کے ذیل میں ہم بحث کریں گے۔ لیکن مسلم ہے کہ ان کے درمیان کچھ ایسے علوم ہیں کہ جن سے خدا کے علاوہ کوئی

ملہ پنج السباع ۱۲۰

۱۔ اصول کافی جلد اول ص ۲۰۶ باب ان الاسعة يعلمون متى يموتون۔

۲۔ اصول کافی جلد اول ص ۲۰۱ باب نادرونه ذكر الغيب۔

یہی آگاہ نہیں سے۔

پروردگارا! ہمارے دل کی آنکھ علم و دانش کے نور سے منور فرما اور اپنے بے پایاں علم کا ایک گوشہ مرحمت فرما۔
خداوند! ایسا کر کہ اسی دنیا کا رزق و برق ہمیں فریب نہ دے اور دھوکہ باز شیطان اور ہوائے نفس ہمیں مغرور
نہ کرے۔
بارالہا! ایسا کر دے کہ ہم ہمیشہ تیسرے احاطہ علمی سے آگاہ رہیں اور تیسرے حضور تیری رضا کے عطا کوئی کام انجام
نہ دیں۔

سورۃ لقمان کا اختتام
۱۵ ذی الحجہ ۱۴۰۳ھ بمصری

سُورَةُ

الْمُرْسَلَاتِ

اس سورت کی ۳۰ آیات ہیں

۱۰۰
مکہ میں نازل ہوئی

لے کتاب "امول کافی" میں ہمیں متعدد روایات ملتی ہیں کہ خدا ایسا علم بھی رکھتا ہے، جس سے اس کے علاوہ کوئی آگاہ نہیں
اور کچھ مسلم ایسا ہے، جس کی مثال کراہت ہے اور اس نے تسلیم دی ہے۔ عبادتوں میں ۱۹۹ باب ان الاثمة بیسویں
جميع العلوم التي خرجت الى المسألة نكدة۔

اس سُوْرَة کے نام

مشہور یہ ہے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ بعض مفسرین نے تو اس کی کسی آیت کا استثناء بھی نہیں کیا ہے۔ لیکن بعض نے آیہ ۲۰ تا ۲۸ کو مدنی سمجھا ہے اور ان کا نظریہ ہے کہ یہ تین آیات مدینہ میں نازل ہوئیں۔ حالانکہ ان آیات میں ان کے مدنی ہونے کا کوئی قرینہ اور ثبوتی نظر نہیں آتی۔

اس سورہ کا نام بعض روایات میں اور مشہور مفسرین کی زبان میں "سورہ سجدہ" یا "الم سجدہ" ہے۔ اور کبھی اسے "سجدہ" سے جدا بیان کرنے کے لیے "سورہ لقمان" کے نام سے پکارتے ہیں۔ کیونکہ یہ سورہ لقمان کے بعد قرار پایا ہے۔ بعض روایات میں اسے الم تنزیل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ "فخر رازی" اور "آلوسی" نے تو اس کے ناموں میں سورہ "مفارج" کا نام ذکر کیا ہے (اس سورہ کی آیت نمبر ۱۰ تنجانی جنودہم عن المضاجع کی مناسبت سے)۔

سورہ سجدہ کی تلاوت کی فضیلت:

ایک حدیث میں پیغمبر اسلام سے یوں مذکور ہے:

"من قرأ الم تنزیل وتبارک الذی بیدہ المملک ، فکانتما احیا لیلۃ القدر"

"جو شخص سورہ الم تنزیل اور "تبارک الذی" کو پڑھے تو گویا اس نے شب قدر جاگ کر گزاری ہے۔"

ایک دوسری حدیث میں امام جعفرین محمد صادق سے اس طرح نقل ہوا ہے:

"من قرأ سورۃ السجدۃ فی کل لیلۃ جمعہ اعطاه اللہ کتابہ بیمنہ"

ولم یحاسبہ بما کان منہ۔ وکان من رفقاء محمد واهل بیتہ"
"جو شخص سورہ سجدہ ہر شب جمعہ پڑھے خدا اس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دے گا اور اس کے گوشہ گناہوں کو بخش دے گا اور محمد و اہل بیت محمد علیہم السلام کے دوستوں میں ہوگا۔"

چونکہ اس سورہ میں مبداء و معاد اور قیامت کے دن مجرمین کے عذاب و سزا اور ہوشیار و بیدار کرنے والے دنوں و مہینوں اور کافروں کے متعلق وسیع اور تفصیلی مباحث آئی ہیں، یقیناً اس کی تلاوت انسان کی اس حد تک اصلاح کر سکتی ہیں کہ ان تمام فضائل اور اعزازات کا مستحق قرار پایا ہے۔ اور اس کا بیدار کرنے والا اگر شب قدر کی بیداری کے مانند ہوتا ہے، جس کا نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ اصحابِ نبیین کی صف میں گھرا نظر آتا ہے اور پیغمبر اور ان کی آل کی دوستی اور رفاقت کے احسان و انعام کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن تلاوت ایسی جو سورج و چاند کا سرچشمہ ہو اور سورج و چاند ایسی جو چیت ارادے اور تحرک کا منبع ہو۔

سورہ سجدہ کے مندرجات:

یہ سورہ چونکہ "مکئی" سورتوں میں سے ہے۔ لہذا دوسری مکی سورتوں کی طرح اپنے اصلی خطبہ یعنی "مبداء و معاد" اور "بغات و اعزاز" کے مباحث پر مشتمل ہے اور بطور مجموعی اس میں چند مباحث توجیہ طلب ہیں:

- ۱۔ سب سے پہلے عظمت قرآن کے بارے میں گفتگو ہے اور اس کا پروردگار عالمین کی طرف سے نازل ہونے اور دشمنی کے الزامات کی نفی ہے۔

- ۲۔ اس کے بعد آسمان و زمین میں خدا کی نشانیوں اور اس کائنات کے چلانے کے سلسلہ میں بحث ہے۔
- ۳۔ ایک اور بحث انسان کی "مٹی" اور نطفہ کے پانی" اور "خدا کی رُوح" سے خلقت اور علم و دانش کو حاصل کرنے کے ذرائع یعنی آنکھ، کان اور عقل کا خدا کی طرف سے عطیہ ہونا ہے۔

- ۴۔ اس کے بعد قیامت اور اس کے پہلے کے حوادث یعنی موت اور اس کے بعد یعنی سوال و جواب حساب کے بارے میں گفتگو ہے۔

۵۔ مؤخر اور بلا دینے والی بشارت و اعزاز کی مباحث ہیں۔ جن میں مومنین کو جنتہ المادنی کی نوید دیتا ہے اور کافروں کو جہنم کی آگ سے ڈراتا ہے۔

۶۔ اسی مناسبت سے بنی اسرائیل کی تاریخ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگذشت اور امت کی کامیابیوں کی طرف مختصر اشارہ بھی ہے۔

۷۔ دوبارہ بشارت و اعزاز کی بحث کے پیش نظر گزشتہ امتوں میں سے ایک گروہ کے حالات اور اس کے

درد ناک انجام کی طرف اشارہ ہے۔

۱۹ اور ۱۰۔ دہ بارہ مسئلہ توحید اور عظمت خدا کی نشانیوں کی طرف لوٹتا ہے اور "خدی و ہٹ دھرم دشمنوں" کو متنبہ کرنے کے بعد صورت اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔

تو اس طرح سے اس سورہ کا اصل مقصد مسبہ و معاد پر ایمان کی بنیادوں کو مضبوط کرنا اور اس کے ذریعے تقویٰ کی طرف تحرک کی ایک قومی موج ایجاد کرنا ہے۔ جس سے لوگ طغیان اور سرکشی سے باز آجائیں اور اپنے بندہ انسانی مرتبہ کی قدر و قیمت کو پہچانیں۔ جس کی اسلام کی ابتدائی تحریک کے ایام میں سر زمین مکہ کے ماحول کے لیے از حد ضرورت تھی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

۱۔ اَلَمْ ۝

۲۔ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

۳۔ اَمْ یَقُولُوْنَ اَفْتَرٰهُۤ اَبَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا اَتٰهُمْ مِنْ نَّذِیْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ یَهْتَدُوْنَ ۝

۴۔ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِۚ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا شَفِیْعَۚ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝

۵۔ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمٰوٰءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرِجُ اِلَیْہِ فِیْ یَوْمٍ مِّمَّا كَانَ مِقْدَارُہٗ اَلْفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝

ترجمہ

اللہ کے نام سے شروع جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ الم

۲۔ یہ وہ کتاب ہے جو عالمین کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوئی ہے

اور اس میں شک و تردید نہیں ہے۔

۳۔ لیکن وہ کہتے ہیں (محمد نے) خدا پر جھوٹ باندھا ہے۔ لیکن انہیں جاننا چاہیے کہ تیسرے پروردگار کی طرف سے حق بات ہے، تاکہ تم ایسے گروہ کو ڈراؤ جس کی طرف تم سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا ہے شاید (وہ پسند و نصیحت حاصل کر کے) ہدایت پا جائیں۔

۴۔ خدا وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، چھ دنوں (ادوار) میں پیدا کیا ہے، پھر عرش، قدرت پر قرار پایا۔ تمہارے لیے اس کے علاوہ اور کوئی ولی اور شفاعت کرنے والا نہیں ہے کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟

۵۔ اس جہاں کے امور کی آسمان سے زمین کی طرف تدبیر کرتا ہے، پھر اس دن جس کی مقدار ہزار سال ہے، ان سالوں کے (حساب سے) جو تم شمار کرتے ہو، اس کی طرف لوٹ جائے گا (اور دنیا ختم ہو جائے گی)۔

تفسیر

عظمت قرآن اور مبدء و معاد

اس سورہ میں ہم "حروف مقطعات" الف۔ لام۔ میم سے ایک بار پھر روبرو ہو رہے ہیں اور یہ پندرہویں دفعہ ہے کہ ہم قرآنی سورتوں کے آغاز میں اس قسم کے حروف دیکھ رہے ہیں۔

سورہ بقرہ کے آفاز (اس تفسیر کی مبداء اول: اور آل عمران (جلد دوم)، اور اعراف (جلد ششم) میں ہم ان حروف کی مختلف تفسیروں سے تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔ جو بحث قرآن کی اہمیت کے سلسلہ میں ان حروف کے فزاعاد

ہے ایک بار پھر اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ "الْحَمْدُ" قرآن کی عظمت اور پروردگار عالم کی عظیم قدرت کی طرف اشارہ ہے۔ کہ اس قسم کی عظیم اور مطالب سے بھرپور کتاب جو حضرت محمد مصطفیٰ کا جادوئی معجزہ ہے "الف باء اے" سادہ حروف سے وجود میں آئی ہے اور جن پر ہر ایک کی دسترس ہے۔

فرماتا ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو عالمین کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں (تفزیل الکتاب لاریب فیہ من رب العالمین) اے واقع میں یہ آیت و رسالوں کا جواب ہے۔ گویا پہلے اس آسمانی کتاب کے مضامین اور مندرجات کے بارے میں سوال ہوتا ہے تو جواب میں کہتا ہے اس کے مندرجات اور مضامین حق ہیں اور اس میں کم ترین شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ پھر اس کے وجود میں لانے والے کے بارے میں سوال ہوتا ہے تو جواب میں کہتا ہے۔ یہ کتاب "رب العالمین" کی طرف سے ہے۔

یہ تفسیر بھی حق ہے کہ "من رب العالمین" کا جملہ "لاریب فیہ" کے لئے دلیل ہوگی کوئی سوال کرتا ہے کہ کس بنا پر یہ کتاب حق ہے۔ تو کہتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ عالمین کے اس پروردگار کی طرف سے ہے، جس کے وجود سے حق اور حقیقت جلوہ گرتے ہیں۔

منا خدا کے تمام اوصاف میں سے "رب العالمین" کی صفت پر وارد ملتا ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب عبادت عالم مجموعہ اور عالم وجود کے متعلق کا جو ہے۔ کیونکہ عالمین کے پروردگار کی طرف سے ہے۔ اس عظیم صفت پر توجہ بھی ضروری ہے کہ قرآن میں نہیں چاہتا کہ یہاں صرف دعویٰ پر تکیہ کرے، بلکہ یہ بھی کہنا چاہتا ہے کہ "عیان راجعہ بیان" کے مصداق خود اپنی کتاب کے مضامین ہی اس کی حقانیت اور صداقت کے گواہ ہیں۔

پھر اس تہمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ جو بار بار مشرکین اور بے ایمان منافقین اس عظیم آسمانی کتاب پر باندھتے تھے۔ "وہ کہتے ہیں محمد نے خدا پر جھوٹ باندھا ہے۔ حالانکہ یہ پروردگار عالمین کی طرف سے نہیں ہے، "دأفر بقولون افتراء"۔

ان کے بے دلیل دعوے کے جواب میں کہتا ہے "وہ افتراء نہیں ہے، بلکہ تیسرے پروردگار کی طرف سے حق

۱۔ "تفزیل الکتاب" مبداء من مدون هذا کفر ہے اور "لاریب فیہ" اس کی صفت اول اور "من رب العالمین" دوسری صفت ہے۔ یعنی نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ ہو سکتا ہے۔ جنہوں کے بعد دیگرے خبریں ہوں۔ لیکن یہاں معنی زیادہ مناسب ہے۔ بہر حال تفزیل مصدر ہے جو اسم مفعول کے معنی میں آیا ہے اور کتاب کی طرف اس کی اضافت صفت کی صورت کی طرف اضافت کے قسموں سے ہے یہ احتمال بھی ہے کہ شاید مصدر اپنے اصلی معنی میں آخر بنا لفظ کا معنی بتا رہا ہو۔

۲۔ "یاں" "بن" کے معنی میں ہے۔ بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ تقدیری طور پر یہ ٹکڑے ہو سکتا ہے (ایعتقون بہ اعر بقولون افتراء) تفسیر غررانی والی العتق، لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے۔

بات ہے۔" بل هو الحق من ربك "

اور اس کی حقانیت کی دلیل خود اسی میں آشکار و نمایاں ہے۔

پھر اس کے نزول کے ہفت اور قصہ کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے "ہفت اور قصہ یہ تھا کہ ایک گروہ کو تو انداز کر سے اڈ ڈرائے کہ جنہیں تجھ سے پہلے انذار کرنے والا نہیں آیا ہے، شاید وہ پند و نصیحت اور ہدایت حاصل کریں؟" (لست نذر قسوما ما اتاہم من نذیر من قبلك لعلہم یتدوون)۔

اگرچہ پیغمبر اسلام کی دعوت "بشارت" یعنی خوشخبری بھی ہے اور "انذار" یعنی ڈرانا بھی۔ اور پیغمبر "بشیر" سے زیادہ "نذیر" ہے۔ لیکن گمراہ اور بٹا دھرم قوم کے مقابلہ میں "انذار" پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

"هو الحق من ربك" کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کی حقانیت کی دلیل خود اسی میں مشہود ہے اور لعلہم یتدوون کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن ہدایت کے لیے صرف سرزمین مہمراہ کو تیار نہیں کیا تھا بلکہ تمام لوگوں کو جاننا ہی کرتا ہے۔

یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں:

۱۔ اس قوم سے کوئی قوم مراد ہے جن کی طرف پیغمبر اسلام سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا؟

۲۔ علاوہ ازیں کیا خود قرآن نہیں کہتا:

"وان من امة الا خلا فيها نذیر"

"کوئی امت ایسی نہیں تھی کہ جس میں ڈرانے والا نہ آیا ہو" (فاطرہ ۲۴)

پہلے سوال کے جواب میں مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ مراد قبیلہ قریش ہے، جس میں پیغمبر اسلام سے پہلے کوئی انذار کرنے اور ڈرانے والا نہیں تھا۔

لیکن دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ مراد دورِ فترت ہے یعنی حضرت عیسیٰ کے قیام اور پیغمبر اسلام کے ظہور کا درمیانی زمانہ)۔

لیکن ان دونوں جوابوں میں سے کوئی بھی جواب صحیح نظر نہیں آتا، کیونکہ سوال کرنے والے کے نظریہ کے مطابق زمین کبھی بھی جنتِ خدا سے خالی نہیں رہتی اور ہر دور میں پیغمبر یا وحی پیغمبر تمام جنت کے لیے انسانوں کے درمیان موجود رہتے ہیں۔

اس بناء پر یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "نذیر" سے مراد کوئی عظیم پیغمبر ہو جو اپنی دعوت کو آشکارا اور صحوات کے ساتھ اور وسیع و عریض ماحول میں ظاہر کرے اور ہم جانتے ہیں کہ اس قسم کا انذار کرنے والا جزیرہ مناسے عرب اور قبائل "نمکہ" کے درمیان ظاہر نہیں ہوا۔

اور دوسرے سوال کے جواب میں یوں کہنا چاہیے "وان من امة الا خلا فيها نذیر" کے جملہ کا مضمون یہ ہے کہ ہر امت میں انذار کرنے والا موجود رہا ہے۔ لیکن یہ کہ وہ ہر جگہ ذاتی و شخصی طور پر بھی موجود ہو، یہ ضروری نہیں ہے۔ یہی بات کہ خدا نے عظیم کے پیغمبروں کی دعوت کی صدا ان کے ادھیار کے ذریعے دنیا کے تمام لوگوں تک پہنچا جا کافی ہے۔

یہ بات ٹھیک اس طرح ہے کہ ہم کہیں کہ ہر امت میں اول العزم پیغمبر بھی تھے اور آسمانی کتاب بھی، تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ تاریخی طور پر اس پیغمبر کی صدا اور اس کی آسمانی کتاب اس کے نامزدوں اور ادھیار کے ذریعے سے اس ساری امت تک پہنچی ہے۔

عظمت قرآن اور رسالت پیغمبر اکرم کے بعد اسلام کے ایک اور اہم ترین بنیادی عقیدہ یعنی توحید کے اثبات اور شرک کی نفی کو بیان کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: "خدا وہ ہے، جس نے آسمانوں اور زمین اور ہر اس چیز کو جو دونوں میں پیدا کیا جو ان دونوں کے درمیان ہے" (اللہ الذی خلق السماوات والارض وما بینہما فی ستة ایام)۔

ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ اس قسم کی آیات میں چھ دنوں سے مراد "چھ روز" ہیں۔ کیونکہ معلوم ہے کہ "دن" کے معانی میں سے ایک معنی روزِ مژدہ کے استعمال میں "دور" بھی ہے۔ جیسا کہ ہم کہتے ہیں، ایک دن تھا کہ استبدادی لڑاکو حکومت کرتا تھا اور آج "شورائی" نظام ہے۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں، استبدادی ٹوٹے ہزار ہا سال حکومت کرتے رہے ہیں۔ لیکن اسے "ایک دن" سے تعبیر کرتے ہیں:

اور دوسری طرف پر بھی ہم جانتے ہیں کہ آسمان زمین پر مختلف دور گزرے ہیں:

ایک دن نظامِ شمسی کے تمام کڑات ایک پچھلے ہوئے تودے کی صورت میں تھے۔

تو دوسرے دن سیارے شمس سے الگ ہو گئے اور اس کے اطراف گردش کرنے لگے۔

ایک دن زمین آگ کا ایک ٹکڑا تھی۔

دوسرے دن ٹھنڈی اور سرد ہو کر نباتات اور حیوانات کی زندگی کے قابل بن گئی، پھر زندہ موجودات مختلف مراحل میں وجود میں آئے۔

(ہم اس معنی کی تشریح اور اسی طرح چھ ادوار کی تفصیل چوتھی جلد کے صفحہ ۱۳۰ پر سورہ اعراف کی آیہ ۵۴ کے ذیل میں پیش کر چکے ہیں)۔

دعا ہے کہ پروردگار کی بے انتہاء قدرت اس سارے نہاں کی ایجاد کے لیے ایک مختصر سے لمحہ بلکہ اس سے بھی کم تر کے لیے کافی ہے۔ لیکن یہ تدریجی نظامِ عظمتِ خدا اور اس کے علم اور قیامِ مراحل میں اس کی تدبیر کو بہتر طریقہ سے بیان کر سکتا ہے۔

مثلاً اگر "جینس" ایک ہی لمحہ میں اپنے مکالمہ دار تھا، کے تمام ادوار کو طے کر کے متولد ہو جاتا ہے تو اس کے عجائبات انسان کی نظر سے دور رہ جاتے ہیں۔ لیکن جس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ ان نو ماہ کے دوران میں ہر دن اور ہر منٹہ نئے نئے

لہ لفظ اللہ اس جملہ میں مبتدا ہے اور "الذی" اس کی خبر ہے، اس جملہ کی ترکیب میں اور احتمال بھی دیئے گئے ہیں۔
نہلان کے یہی ہے کہ "اللہ" خبر ہے مبتدا و معذوف کی۔ یا یہ کہ اللہ مبتدا ہے اور اس کی خبر "مالک" من و صلب
من ولی" ہے لیکن یہ دونوں احتمالات چندال مناسب نظر نہیں آتے۔

عجائب و غرائب شکل اور حالات اپنے اندر لیتا ہے اور ایسے بعد و بگڑت عجیب و غریب اور مختلف مراحل سے گزرتا ہے تو فریاد کی عظمت سے ہم بہتر طور پر آشنا ہوتے ہیں۔

مسئلہ افزائش و خلقت کے بعد عالم ہستی پر حاکمیت خدا کے مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

”پھر خدا عرش پر مستقر ہوا اور اسے عالم ہستی پر حکومت کی: اشق استوا علی العرش“

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ لفظ ”عرش“ اصل میں بلند پایہ تختوں کے معنی میں ہے اور عام طور پر کنا یہ ہوتا ہے۔ قدرت اور طاقت سے جیسا کہ روزمرہ تعبیرات میں ہم کہتے ہیں۔ غلام شخص کے تحت کے پائے کر گئے یعنی اس کی قدرت اور طاقت ختم ہو گئی ہے۔

اس بنا پر خدا کا عرش پر قرار پانا اس کے سبحانی معنی میں نہیں ہے کہ خدا بادشاہوں کی طرح کوئی تخت رکھتا ہو اور اس کے اوپر بیٹھا ہو۔ بلکہ اس معنی میں ہے کہ وہ جہان ہستی کا خالق بھی ہے اور اسے عالم پر اس کی حکومت بھی ہے۔

اور آیت کے آخر میں توحید“ ولایت“ و ”شفاعت“ کے مسئلہ کی طرف اشارہ کر کے مراحل توحید کو مکمل کرتے ہوئے فرمایا ہے: ”اس کے علاوہ تمہارا کوئی ولی و شفیع نہیں ہے۔“ (الحکم من دونہ من ولی و شفیع)۔

اس واضح دلیل کے باوجود کہ جہان کی خالقیت اس کی حاکمیت کی دلیل ہے اور حاکمیت ولی شفیع اور عبودیت کی توحید پر دلالت کرتی ہے۔ تو پھر تم کیوں بے راہ روی اختیار کرتے ہو اور تمہوں کے دامن کو پھرتے ہو۔ تم سوچتے سمجھتے کیوں نہیں: (افلا تتذکرون)۔

حقیقت میں توحید کے تین مراحل جو اوپر والی آیت میں بیان ہوئے ہیں۔ ہر ایک مرحلہ ایک دوسرے کی دلیل شمار ہوتا ہے۔ توحید خالقیت، توحید حاکمیت کی دلیل ہے اور توحید حاکمیت ولی و شفیع و عبودیت کی دلیل ہے۔

بیان پر بعض مفسرین کے لیے ایک سوال پیش ہوتا ہے، جس کا جواب چنداں مشکل یا پیچیدہ نہیں ہے اور وہ یہ کہ آیت کا آخری نید کہتا ہے کہ خدا کے علاوہ تمہارا کوئی سرپرست اور شفاعت کرنے والا نہیں ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ تمہارا ولی و شفیع صرف خدا ہے اور بس! تو کیا ممکن ہے کہ کوئی اپنے پاس کسی کی شفاعت کرے؟

① اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ تمام شفاعت کرنے والوں کو اس کی اجازت سے شفاعت کرنا پائیے۔

”من ذالذی یشفع عندہ الٰہ باذنہ“ (بقرہ - ۲۵۵) اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ شفاعت اگرچہ ہوتی اجنبیاء اور اولیاء الہی کی طرف سے ہے لیکن کوئی ذات پاک کی طرف سے شفاعت چاہے گناہوں کی بخشش کے لیے ہو یا لغات الہی تک پہنچنے کے لیے۔

اس بات کی شاہد و گواہ وہ آیت ہے کہ جو ٹھیک اسی آیت کے مضمون میں سورہ یونس کی آیت ۱۰۱ میں آئی ہے۔

اور ہم وہاں پڑتے ہیں:

”یبدبر الامر من شفیع الامن بعد اذ نہ“ (یونس - ۱۰)

”کوئی شفاعت کرنے والا اس وقت تک شفیع کہلائے گا۔ جب اس ذات کی اجازت ہوگی۔“

④ اس امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ ہم پروردگار کی بارگاہ میں توسل کے وقت اس کی صفات سے متوسل ہوتے ہیں اس کے رحمان، رحیم، غفار اور مغفور ہونے اور اس کے فضل و کرم سے مدد چاہتے ہیں، گویا اس کے پاس خود ایسے ہی شفیع قرار دیئے ہیں۔ ہر چند کہ اس کی صفات اس کی عین ذات ہیں۔ پھر بھی ان صفات کو اپنے اور اس کی پاک ذات کے درمیان واسطہ شمار کرتے ہیں۔

یہی چیز دعا کے مکمل میں حضرت علیؑ کی پُر معنی عبارت میں آئی ہے:

”واستشفع بلس الی نفسک“

”تیں تیرے ذریعہ تجھ سے شفاعت کا طلب گا ہوں!“

⑤ ”شفیع“ سے مراد یہاں ناصر اور یار، یار اور ہستہ اور ہم جانتے ہیں کہ یار و یاور اور ناصر صرف خدا ہے اور بعض لوگوں نے یہاں شفاعت کو آفرینش و خلقت اور تکمیل نفوس کے معنی میں لیا ہے تو یہ حقیقت اسی معنی کی طرف دلتا ہے۔

زیر بحث آخری آیت میں پہلے توحید پروردگار کی طرف اور پھر مسئلہ معاد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جو گذشتہ آیت میں توحید کی تین قسمیں بیان ہوئی ہیں: توحید خالقیت، توحید مالکیت، اور توحید عبودیت، یہاں توحید پرہیزگی کے ذکر سے پہلے گفتگو مکمل ہو جاتا ہے۔ یعنی جہان ہستی کا نظم و نسق صرف خدا ہی کے ذریعہ پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔

فرمایا ہے ”خدا اس جہان کے امور کو اپنے قرب کے مقام سے زمین کی طرف تدبیر کرتا ہے:“ (یبدبر الامر من السماء الی الارض)۔

دوسرے لفظوں میں خدا آسمان سے لے کر زمین تک تمام کائنات کو اپنے حیطہ تدبیر اور نظم و نسق میں لیے ہوئے ہے اور اس کے علاوہ اس جہان کا کوئی مدبر نہیں ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے ”پھر تدبیر امور کے لیے اس دن کہ جس کی مقدار ہزار سال ہے ان سالوں میں سے جنہیں تم فرما کرتے ہو، اس کی طرف لوٹے گا:“ (شجر یخرج المیلہ فی یوم مکان مقدارہ الف سنۃ صفا تعدون)۔

اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ مفسرین نے اوپر والی آیت کی تفسیر میں بہت سے اقوال پیش کیے ہیں۔ اور کئی اختلاف

پہلی تعبیر کے مطابق ”سما“ مقام قرب خدا کے معنی میں ہے اور دوسری تعبیر کے مطابق ”سما“ ہی آسمان کے معنی میں ہے۔

دائرہ کیجئے گا۔

۱۔ اس بات کی مزید وضاحت تفسیر نور عبدالمستاجر سورہ اعراف آیت ۴۰ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔

پیش کیے ہیں:

- ۱۔ بعض نے اسے اسی دنیا میں تدبیر عالم کے "قوس نزولی" اور "قوس صعودی" کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔
 - ۲۔ بعض خدائی فرشتوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، جو آسمان و زمین کے درمیانی فاصلہ کو پانچ سو سال کی مدت میں طے کرتے اور اسی مدت میں واپس بھی آجاتے ہیں اور اس جہاں کی تدبیر میں کچھ خدا سے مشغول ہیں۔
 - ۳۔ بعض اس عالم میں خدائی تدبیر کے دور کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں اور ان کا نظریہ یہ ہے کہ تدبیر کے مختلف ادوار ہیں اور پھر ایک دور کی مدت ایک ہزار سال ہے اور خدا ہزار سال میں آسمان و زمین کے تدبیر اور اس کا اپنے فرشتوں کو حکم دیتا ہے اور اس ہزار سالہ دور کے ختم ہونے پر دوسرے دور کا آغاز ہو جاتا ہے۔
- یہ تفسیریں علاوہ اس کے کہ ناقلاً اور ہم مطالب کو پیش کرتی ہیں، کوئی قرینہ اور مخصوص شاہد بھی خود اس آیت یا دوسری آیات سے بھی پیش نہیں کرتیں۔

ہمارے نظریہ کے مطابق قرآن کی دوسری آیات کے قرینہ نیز ان روایات کی بنا پر جو اس آیت کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں، اس آیت سے مراد کوئی اور چیز ہے اور یہ کہ خدا نے اس جہاں کو خلق کیا ہے اور آسمان و زمین کو مخصوص تدبیر کے ساتھ نظم عطا کیا ہے اور انسانوں اور دوسرے زندہ موجودات کو لباس حیات پہنا پایا ہے۔ لیکن اس کائنات کے خاتمہ پر سب کچھ ختم کرنے گا۔ سورج تاریک اور ستارے بے نور ہو جائیں گے اور قرآن کے بقول آسمانوں کو کاغذ کی طرح لپیٹ دے گا، یہاں تک کہ مذکورہ چیزیں اس جہاں کے پھیننے سے پہلے کی حالت میں آجائیں گی:

"یوم نطوی السماء کطی السجل للکتب کما بدأنا اول خلق نعیدہ"
 "وہ دن کہ جب آسمان کو طواری کی طرح ہم لپیٹ دیں گے، پھر جنس طرح ہم نے خلقت کا آغاز کیا تھا ہے
 واپس پٹا دیں گے:"

اور اس جہاں کے پٹیٹے جانے کے بعد ایک نئے نقشے اور زیادہ وسیع جہاں کا اختراع ہوگا۔ یعنی اس دنیا کے نقتلاً پر ایک دوسرے جہاں کا آغاز ہوگا۔

یہ معنی قرآن کی دوسری آیات میں بھی آیا ہے، منجملہ ان کے سورہ بقرہ کی آیت ۱۵۶ میں ہم پڑھتے ہیں:

"اننا یلذہ وانا الیہ راجعون"

"ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف سے ہیں اور اسی کی طرف پلٹ کر جائیں گے۔"
 اور سورہ روم کی آیت ۲۶ میں اس طرح آیا ہے:

"وهو الذی یبدؤ الخلق ثم یرجع الیہ وهو الہون علیہ"

"وہ وہی ہے جو خلقت کا آغاز کرتا ہے اور پھر اسے واپس پٹا دیتا ہے اور یہ بات اس کے لیے نہایت

آسان ہے:-

اور سورہ یونس کی آیت ۳۴ میں ہم پڑھتے ہیں،

"قل اللہ یبدؤ الخلق ثم یرجع الیہ فانی توفکون"

"کہہ دو خدا آفرینش کا آغاز کرتا ہے پھر اس کو واپس لٹاتا ہے، پھر تم کو جن سے روگرداں تہستے ہو؟"

ان تعبیرات اور اس طرح کی دوسری تعبیرات کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو کبھی ہیں کہ تمام امور خدا کی طرف لوٹ جائیں گے،

"والیہ یرجع الامر کلہ" سورہ ہود آیت ۱۲۳

واضح ہو جاتا ہے کہ ہر بحث آیت میں کائنات کے آغاز و انجام اور روز قیامت کے بچا ہونے کے متعلق گفتگو جو رہی ہے جسے کبھی "قوس نزولی" اور "قوس صعودی" سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس بنا پر آیت کا معنی اس طرح ہوگا کہ "خدا اس جہاں کے امر کی تدبیر آسمان سے زینہ تک کرتا ہے۔ اور آسمان سے ابتدا اور زمین پر انتہا ہوتی ہے، پھر یہ سب قیامت کے دن اس کی طرف پلٹ جائیں گے۔"

تفسیر علی بن ابراہیم میں اسی آیت کے ذیل میں ہم پڑھتے ہیں کہ تدبیر امور سے مراد یہ ہے کہ خدا ان کی تدبیر کرتا ہے اور اس طرح امر ذہبی جو شریعت میں بیان ہوئے ہیں اور تمام بندوں کے اعمال یہ تمام چیزیں قیامت کے دن واضح ہوں گی اور اس دن کی حوالت اس دن کے سالوں کے حساب سے ہزار سال ہوگی۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ سورہ معارج کی آیت ۴ میں روز قیامت کے طول کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں:

"تفسیح المسئلۃ والسروح الیہ فی یوم کان مقداره خمین الفسنۃ"

"قرشتے اور روح اس کی طرف عروج کریں گے، ایسے دن میں کہ جس کی مدت پچاس ہزار سال ہے۔"

تو کس طرح زیر بحث آیت کو اس کی مدت صرف ہزار سال میں کرتی ہے اور سورہ معارج کی آیت کو آپس میں جمع کیسا جا سکتا ہے؟

اس سوال کا جواب اسی حدیث میں موجود ہے جو امامی شیخ طوسی "میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے۔ امام فرماتے ہیں،

"ان فی القیامۃ خمین موقفاً، کل موقف مثل الفسنۃ مفاقتہ ون"

"شقت لا ہذہ الایۃ فی یوم کان مقداره خمین الفسنۃ،"

"قیامت میں پچاس موقف (اعمال کی دیکھ بھال اور حساب کے لیے محل توقف) ہیں کہ جن میں سے ہر

موقف ہزار سال کی مقدار ہے، ان سالوں میں جنہیں تم شمار کرتے ہو، پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت کی،

اس دن میں کہ جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔"

البتہ ان تعمیروں کا اس مطلب سے کوئی تضاد نہیں ہوگا جب ہزار سال اور پچاس ہزار سال کا عدد یاں کنٹی کی صورت میں ہو۔ بلکہ ہر ایک میں کثرت اور زیادتی بیان کرنا مقصود ہو۔ یعنی قیامت میں پچاس موقوف ہیں کہ جن میں سے ہر ایک پر انسان کو بہت زیادہ رکتا پڑے گا۔

چند ایک نکات

”یدبرا الامر“ کی آیت سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ہمارے زمانے کے کچھ خود ساختہ مسلک کے پیروکاروں نے اپنے مسلک کی توجیہ کے لیے اور والی آیت کے دستاویز قرار دیتے ہوئے عوام الناس کو فریب دینے اور مغالطہ میں ڈالنے کے لیے اس آیت کو اپنے مقصد پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ ان کے اکثر مبلغین سے جب انسان رد ہو جاتا ہے۔ جملہ ان دلائل کے کہ جس کا وہ خواہتے کی طرح تنکے کا سبار لینے کی کوشش کرتے ہیں یہی آیت ہے (یدبرا الامر من السماء الى الارض...) وہ کہتے ہیں۔

”امر“ سے مراد اس آیت میں ”دین اور مذہب“ ہے اور ”تدبیر“ دین کے بھیجنے کے معنی میں ہے اور ”عروج“ دین کو اٹھانے اور نفع کرنے کے معنی میں ہے۔ اور اس حساب سے کوئی مذہب ایک ہزار سال سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ لہذا ہزار سال کے بعد اسے اپنی جگہ دوسرے مذہب کو دے دینی چاہیے۔ اسی بنا پر وہ کہتے ہیں ”ہم قرآن کہتے ہیں“ لیکن اسی قرآن کے مطابق ایک ہزار سال گزر جانے کے بعد دوسرا مذہب آئے گا!

اس ہم چاہتے ہیں کہ ایک غیر جانب دار فرد کے عنوان سے مذکورہ آیت کا صحیح طریقہ پر تجزیہ و تحلیل کریں اور دیکھیں کہ جس چیز کا یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں، آیا آیت کا بھی اس چیز کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ اس بات سے قطع نظر کہ یہی آیت کے مفہوم سے اس قدر دور ہے کہ خالی الذہن پڑھنے والے کی نگرانی میں آج بھی نہیں سکتا۔

خوب غور و خوض کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ جس چیز پر وہ آیت کو مطابقت دینا چاہتے ہیں، نہ صرف یہ کہ آیت کے مفہوم کے ساتھ سازگار نہیں، بلکہ بہت سی جہات سے واضح اشکالات سے بھی دوچار ہے۔

① لفظ ”امر“ کو دین و مذہب کے معنی میں لینا نہ صرف یہ کہ اس پر کوئی دلیل نہیں بلکہ قرآن کی دوسری آیات بھی اس کی لفظی کرتی ہیں۔ کیونکہ دوسری آیات میں ”امر“ فرمان، آفرینش و خلقت کے معنی میں استعمال ہوا ہے،

”استما امرہ اذا اراد مشیانا ان یقول لہ کن فیکون“ (سورہ یس آیت ۸۲)

”اس کا امر تو ہے یہ ہے کہ جس وقت کسی چیز کا ارادہ کرے تو کہتا ہے ہو جا، تو وہ فوراً ہو جاتی ہے“

اس آیت میں اور سورہ قمر کی آیت ۵۰ اور سورہ مومنون کی آیت ۶۰، سورہ اعراف کی آیت ۴۴؛ ”سورہ ابراہیم“ کی آیت ۲۔ اور سورہ نحل کی آیت ۱۲، سورہ روم کی آیت ۲۵، اور سورہ جاثیہ کی آیت ۱۲ اور بہت سی دوسری آیات میں ”امر“ لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے، نہ کہ دین و مذہب کی تشریح کے معنی میں۔

بنیادی طور پر جہاں آسمان و زمین اور آفرینش و خلقت وغیرہ کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے، اس میں معنی میں آتا ہے۔ (نو کیجئے گا)

② لفظ ”تدبیر“ بھی خلقت و آفرینش اور کائنات کی وضع و کیفیت کو سنوارنے کے لیے استعمال ہوتا ہے نہ کہ مذہب نازل کرنے کے معنی میں، اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کی دوسری آیات میں (آیات ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں اور دین و مذہب کے بارے میں بالکل لفظ تدبیر استعمال نہیں ہوا بلکہ لفظ ”تشریح“ یا ”تنبیہ“ یا ”انزال“ استعمال ہوا ہے؛

”شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحاً“ (مشورہ ۱۰۳)

”تشریح کا آغاز اس چیز سے ہوا جس کی نوح کو وصیت کی تھی۔“

”ومن لربحکم بما انزل اللہ فنا والیہم الکافرون“

”جو شخص خدا کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو وہ کافر ہے“ (مائتہ ۱۰۳)

”نزل علیک الکتاب بالحق مصداقاً لما بین یدیک“ (آل عمران ۴)

”برحق قرآن کو تجھ پر نازل کیا ہے، جو پہلے کی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے۔“

③ محل بحث آیت سے پہلے اور بعد کی آیت عالم کی خلقت و آفرینش سے متعلق ہے، نہ کہ تشریح اور بیان سے۔ کیونکہ قبل والی آیت میں چھ دن اور دوسرے لفظوں میں چھ دن آسمان و زمین کی خلقت کے بارے میں گفتگو تھی اور بعد والی آیات میں خلقت انسان کے متعلق گفتگو تھی۔

کہے بغیر واضح ہے کہ آیات کی مناسبت تقاضا کرتی ہے کہ یہ آیت بھی جو آیات ”خلقت“ کے درمیان واقع ہوئی ہے، اس خلقت اور آفرینش کے انتظامی امور سے مربوط ہو۔

یہی وجہ ہے کہ جب سیکڑوں سال پہلے کی کلمہ ہوئی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس آیت میں گوناگوں احتمالات کے باوجود کسی نے یہ احتمال نہیں دیا کہ یہ آیت تشریح اور بیان سے مربوط ہے۔ مثلاً تفسیر ”جمع البیان“ میں مشہور ترین اسلامی تفسیر ہے اور جس کے مؤلف کا تعلق سنہ چھ سو چوبیس سے ہے اور والی آیت کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کرنے کے باوجود کسی بھی مسلم دانشور کا یہ قول نقل نہیں کیا کہ اس آیت کا تعلق تشریح اور بیان سے ہے۔

④ لفظ ”عروج“ ”صعود کرنے اور اُپر جانے“ کے معنی میں ہے، نہ کہ نفع اور ان کے رائل ہونے کے معنی میں، اور قرآن میں کسی جگہ بھی ”عروج“ نفع کے معنی میں نظر نہیں آیا یہ لفظ قرآن کی پانچ آیات میں ذکر ہوا ہے، لیکن ہمیں بھی اس کے معنی میں نہیں آیا ہے بلکہ ادیان کے بارے میں وہی لفظ ”نفع“ یا ”تنبیہ“ وغیرہ استعمال ہوئے ہیں۔

بنیادی طور پر ادیان اور کتب آسمانی کوئی ایسی چیز نہیں جو مثلاً ارواح بشر کی طرح اختتام زندگی کے بعد فرشتوں کے ساتھ آسمان کی طرف پرواز کر جائیں، بلکہ نفع شدہ دین اسی زمین پر موجود ہیں، ان کے صرف چند ایک مسائل منسوخ ہوئے ہیں، جبکہ ان کے اصول اپنی قوت کے ساتھ باقی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ لفظ ”عروج“ باوجودیکہ قرآن مجید میں کسی جگہ بھی نفع اور بیان کے معنی میں استعمال نہیں ہوا،

اصولی طور پر نسخ ادیان کے مفہوم کے ساتھ سازگار بھی نہیں ہے، کیونکہ مسوخ ادیان آسمان کی طرف عودت نہیں کرتے۔
 ⑤ ان سب کے علاوہ یہ معنی واقعتاً عین کے ساتھ بالکل مطابقت نہیں رکھتا۔ گذشتہ ادیان کا ایک دوسرے سے فاصلہ کہیں پر بھی ایک ہزار سال نہیں تھا۔
 مثلاً حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے ظہور کے درمیان کا فاصلہ ۱۵۰۰ سال سے زیادہ تھا اور حضرت عیسیٰ اور پیغمبر اسلام کے ظہور کا فاصلہ ۶۰۰ سال سے کم تھا۔
 جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں ان لوگوں کے قول کے مطابق ان دونوں میں سے کوئی فاصلہ بھی ہزار سال کا نہیں بلکہ زیادہ بھی ہے۔

ایک اولو العزم نبی اور مخصوص شریعت کے بانی حضرت نوحؑ کا اولو العزم شریعت کے دوسرے بانی اور نبی ہیسرو حضرت ابراہیم کے درمیان ۱۲۰۰ سال سے زیادہ فاصلہ ہے اور اسی طرح حضرت "ابراہیم" اور حضرت موسیٰ کے درمیان فاصلہ ۵۰۰ سال سے کم لکھا ہے۔

اس موضوع سے ہم یہ نتیجہ حاصل کرتے ہیں کہ مذکورہ طور پر بھی گذشتہ مذاہب و ادیان کا ایک دوسرے کے ساتھ کا فاصلہ ایک ہزار سال نہیں تھا۔ "تو خود حدیث مفضل بخوان ایز میں"

④ ان سب باتوں سے قطع نظر سید علی محمد باب کے جس دعوے کے لیے یہ سب لوگ ناروا تو جہات کے متحمل ہوئے ہیں، اس حساب سے بالکل سازگار نہیں ہے، کیونکہ خود انہیں کے اعتراف کے مطابق اس کے دعوے کی ابتدا ۱۲۶۰ ہجری قمری میں تھی۔ اور اس بات کے پیش نظر کہ پیغمبر اسلام کی دعوت کی ابتدا ہجرت سے ۱۳ سال قبل تھی تو ان دونوں کے درمیان فاصلہ ۱۲۴۲ سال بنتا ہے، یعنی ہزار سال سے ۲۴۲ سال زائد بنتے ہیں۔ اب وہ خود ہی بتائیں کہ ہم کس نقتی کے تحت ان ۲۴۲ سالوں کو ادھر ادھر کریں؟ اور کس طرح اتنے بڑے عدد کو نظر انداز کریں؟

⑤ اور فرض کیجیے کہ ہم ان چھ اعتراضات کو بھی ایک طرف کیے دیتے ہیں اور اس قدر واضح اور روشن تجزیات کو بھی بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور صرف عقل و خرد کو فیصلہ کے لیے بلا تے ہیں اور فرض کرتے ہیں کہ قرآن کے پچاسے چاہتے ہیں کہ نبوت کے نئے دعوے واروں کے سامنے آنے والے لوگوں کی ذمہ داری کو واضح کریں اور کہیں کہ "ہزار سال گزرنے کے بعد نئے پیغمبر کے انتظار میں رہو" تو کیا اس کا یہی راستہ تھا، جیسا مذکورہ آیت میں ذکر ہوا ہے، مطلب کو بیان کریں اور بارہ تیرہ صدیوں تک کوئی عالم اور غیر عالم اس آیت کے معنی سے ذرہ برابر بھی مطلع نہ ہو سکے اور ۱۲۴۲ سال گزرنے کے بعد صرف ایک گروہ "کنفیج جدید" کے عنوان سے جو صرف اور صرف اس کے نزدیک ہی قابل قبول ہے، اس سے پردہ اٹھاتے

کیا زیادہ عقل مندی کی بات نہیں تھی کہ اس جملہ کی جگہ پر یوں کہا جاتا۔ "تھیں میں بشارت دیتا ہوں کہ ایک ہزار سال کے بعد ایک پیغمبر اس نام کا ظہور کرے گا۔"
 جیسا کہ حضرت عیسیٰ نے پیغمبر اسلام کے متعلق کہا:

"ومبشراً برسول يأتي من بعد اسمہ احمد"

(سورہ صف آیہ ۶)

بہر حال شاید یہ اس حد تک جتنا ہم نے بحث کی ہے، بحث کا محتاج نہ ہوتا، لیکن مسلمانوں کی فوجانہ لنگر و مالی استعمار کے ہتھکنڈوں اور اسلام کے مورچوں کو کمزور کرنے اور نقصان پہنچانے والے ساختہ ممالک کی پالیوں سے خبردار کرنے کے لیے قدرے تفصیلی گفتگو کی تاکہ وہ ان کی اس منطوق کے صرف ایک گوشہ سے باخبر ہو جائیں اور باقی کا وہ خود حساب کر لیں۔

- ۶۔ ذٰلِكَ عَلِيمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ
 ۷۔ الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ
 الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ
 ۸۔ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلالَةٍ مِنْ مَاءٍ
 مَهِينٍ
 ۹۔ ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوحِهِ وَجَعَلَ
 لَكُمْ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَّا
 تَشْكُرُونَ

ترجمہ

- ۶۔ وہ وہی خدا ہے کہ مخفی و آشکار سے بانبر ہے اور ناقابل شکست اور
 مہربان ہے۔
 ۷۔ وہ وہی ہے جس نے جس چیز کو پیدا کیا، اچھا پیدا کیا اور خلقت
 انسان کی ابتداء مٹی سے قرار دی۔
 ۸۔ پھر اس کی نسل کو ناپسین اور بے قدر و قیمت پانی کے پنچوڑ سے
 خلق کیا۔
 ۹۔ پھر اس کے بدن کو موزوں بنایا اور اپنی روح میں سے اس میں پھونکا

اور تمہارے لیے کان آنکھیں اور دل قرار دیئے، لیکن تم بہت کم اس کی نعمتوں کا شکر
 ادا کرتے ہو۔

تفسیر

خلقت انسان کے حیران کن مراحل

زیر بحث آیات پہلے تو اشارہ اور تاکید ہیں، ان توحیدی مباحث پر جو پہلے کی آیات میں گزر چکی ہیں جو چارہ اصل میں خلاصہ
 ہوتی ہیں، (توحید غالیقت، عاکست، ولایت اور ربوبیت) فرماتا ہے: "وہ جیسے کہ ان صفات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے وہی
 ہے خدا کہ جو مخفی و آشکار سے بانبر ہے اور ناقابل شکست اور مہربان ہے؛ (ذالک عالم الغیب والشہادۃ
 العزیز الرحیم)۔

ظاہر ہے جو چاہتا ہے کہ آسمان و زمین کے امور کی تدبیر کرے اور ان پر عاقل اور ولایت، شفاعت اور غلاتیت کے قیام
 کا ذمہ دار ہو، اسے تمام چیزوں کے پنہاں و آشکار سے آگاہ ہونا چاہیے، کیونکہ آگاہی اور وسیع علم کے بغیر ان امور میں سے کوئی بھی
 امکان پذیر نہیں ہے۔
 اس کے ساتھ ساتھ ایسی ذات کو "عزیز" قدرت مند اور ناقابل شکست، ہونا چاہیے، تاکہ ان اہم کاموں کو
 انجام دے سکے۔

لیکن ایسی عزت و قدرت جو سنگدلی سے ملی ہوئی نہ ہو بلکہ رحمت اور عطف و کرم سے بڑھاوا ہو۔
 بعد والی آیت بطور عموم آفرینش کے نظام احسن کی طرف بطور خاص اور خلقت انسان کے آغاز اور اس کے ارتقائی مراحل
 کی طرف بطور عام اشارہ ہے اور فرماتا ہے "وہ وہی ہے جس نے جس چیز کو پیدا کیا بہت اچھا پیدا کیا،" (الذی احسن
 کل شیء خلقہ)۔

ہر چیز کو جس شے کی ضرورت تھی اس نے دی، دوسرے لفظوں میں خلقت کے عظیم عمل کی بنیاد کو "نظام احسن" یعنی ایسے نظم و
 ضبط پر استوار کیا، جس سے زیادہ کامل کا تصور نہیں ہو سکتا تھا۔
 تمام موجودات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کی اور ہر ایک کو اپنی کچھ عطا فرمایا جو وہ زبان حال سے چاہتا تھا۔
 اگر انسان کے وجود پر نگاہ کریں اور اس کے بدن کے مختلف کارخانوں میں سے ہر ایک کو مد نظر رکھیں تو معلوم ہوگا، کہ وہ
 مانت، عجم، ساموں کی وضع اور کیفیت ان کی طرز کار بالکل اسی طرح خلق کیے گئے ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داری کو احسن طریقہ پر انجام دے
 سکتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اعضاء کے درمیان اس طرح مربوط نظام اور ہم آہنگی عطا کی ہے کہ وہ سب بغیر استثناء کے یا تو

ایک دوسرے پر متبرہ ہوتے ہیں اور یا ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔

اور میں حتیٰ بطور کلی تمام عالم پر حکم فرما ہے۔ باوجودیکہ اس کی مخلوقات خصوصاً زندہ موجودات کی دنیا میں تنوع پایا جاتا ہے اور بڑا فرق بھی۔

خلاصہ

دھندہ ای کہ بر گل نخت و بہ گلا ~ سان داد
بر ہر کہ آئینہ سزاویہ حکمتش آن داد

وہ جس نے بیول کو خوشبودار مٹی میں روت بھری جو جس چیز کے لائق تھا، خالق حکمت نے اسے وہی کچھ دیا، جی ہاں وہی ہے جو بیولوں کو انواع و اقسام کی دل انگیز خوشبوئیں عطا کرتا ہے اور وہی ہے جو خاک اور مٹی کو رُوح اور جان دیتا ہے اور اس سے ایک آزاد اور باہوش انسان کو پیدا کرتا ہے اور اسی سیبہ مٹی سے کبھی انواع و اقسام کے بیول کبھی انسان اور کبھی دوسرے موجودات کی انواع پیدا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ خود مٹی کو بھی اپنی حد تک جس چیز کا حاصل ہونا چاہئے، اسی کی حامل ہے۔

اسی طرح کی گفتگو ہم سورہ طہ کی آیت ۵۰ میں حضرت موسیٰ و ہارون کے قول سے پڑھتے ہیں:

”ربنا الذی اعطی کل شئ خلقه شئہ ہڈی“ (سورہ طہ)
”ہمارا پروردگار تو وہ ہے، جس نے ہر موجود کو جو کچھ اس کی آفرینش کے لیے ضروری تھا عطا کیا اور ہر اس کی تمام سرائل وجود میں رہبری کی“

یہاں پر ایک سوال بڑیوں کی خلقت اور کائنات کے احسن نظام کے ساتھ سازگاری کی کیفیت کے بارے میں مانتے آتا ہے، ہجے ہم انشاء اللہ نکات کی بحث میں پوری تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔
اس کے بعد قرآن اس آفاق کے مقدمہ اور تمہید کو ذکر کرنے کے بعد ”افس“ کی بحث میں وارد ہوتا ہے۔ اور جس طرح آفاقی آیات کی بحث میں توحید کی مختلف اقسام کے بارے میں گفتگو کی تھی، یہاں انسان کے بارے میں چند عظیم نعمتوں کی بات کرتا ہے۔

پہلے کہتا ہے ”خدا نے انسان کی خلقت کی ابتداء مٹی سے فرمائی“ (وبدا خلق الانسان من طین)۔

تاکہ اس سے ایک طرف تو اپنی قدرت کی عظمت بھی بیان کرے کہ اس قسم کی رصبتہ مخلوق کو اس طرح کے سادہ اور معمولی قیمت کے موجود سے خلق کیا ہے اور اس ”دل آویز“ نقش کو ”پانی اور مٹی“ سے خلق فرمایا ہے۔

اور اس انسان کو تنبیہ اور خبردار بھی کرے کہ تو کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا؟

واضح رہے کہ یہ آیت ”آدم“ کی خلقت کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے، نہ کہ تمام انسانوں کے بارے میں کیونکہ ان کی نسل کو جاری رکھنا بعد والی آیت میں پیش کیا گیا ہے اور اس آیت کا عمود واضح دلیل ہے، انسان کی مستقل خلقت اور حکم از م نوع انسانی کے بارے میں تحول انواع کے مفروضہ کی نفی کے لیے یعنی نظریہ ارتقاء کی نفی کی ہے۔

اگرچہ بعض لوگوں نے اس آیت کی اس طرح تفسیر کرنا چاہی ہے کہ وہ انواع کے ارتقاء کے ساتھ بھی سازگار ہو، کیونکہ انسان کی خلقت پست تر انواع کی طرف ٹوٹی ہے اور پھر وہ پانی اور مٹی پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔

لیکن آیت کی ظاہری تعبیر یہ ہے کہ ”آدم“ اور مٹی کے درمیان دوسری بے شمار انواع زندہ موجودات کا فاصلہ نہیں تھا بلکہ انسان کی خلقت، بغیر کسی واسطہ کے مٹی سے ہی صورت پذیر ہوئی ہے۔

البتہ قرآن نے دوسری جاندار انواع کے بارے میں گفتگو نہیں کی ہے۔

یہ معنی سورہ آل عمران کی آیت ۵۹ کی طرف توجہ کرتے ہوئے زیادہ واضح ہو جاتا ہے، جہاں وہ کہتا ہے:

”ان مثل عبی عند اللہ کمثل آدم خلقہ من تراب“ (آل عمران)

”عبید کی باپ کے بغیر خلقت کوئی عجیب چیز نہیں ہے وہ آدم کی خلقت کی طرح ہے کہ اسے مٹی سے پیدا کیا۔“

اور سورہ حجر کی آیت ۲۶ میں فرمایا ہے:

”ولقد خلقنا الانسان من صلصال من حمأ مسنون“

”ہم نے انسان کو خشک مٹی سے کہ جو بدبودار مٹی سے پیدا ہوئی تھی بنایا ہے۔“

ان تمام آیات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدم کی خلقت ایک تنقل مخلوق کی صورت میں خشک اور گیلی مٹی سے وجود میں آئی ہے۔ اور سب کو معلوم ہے کہ تحول انواع کا مفروضہ ہرگز ایک قطعی و یقینی علمی مسئلہ کی صورت اختیار کیے ہوئے نہیں ہے تاکہ ہم اور والی آیات کے ساتھ اس کے تضاد کی وجہ سے ان کی کسی اور طرح سے تفسیر کریں، دوسرے لفظوں میں جب تک واضح قرینہ ظواہر آیات کے برخلاف موجود نہ ہو تو انہیں ان کے ظاہری معنی پر ہی تطبیق کرنا ہوگی اور آدم کی مستقل خلقت ثابت نہ ہوگی بالکل ہی ہے۔

بعد والی آیت نسل انسانی کی خلقت اور اولاد آدم کی ولادت کے بعد کے مراحل کی کیفیت کے بارے میں اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے ”پھر خدا نے اس کی نسل کو ناپید اور بے قدر پانی کے پھرنے سے قرار دیا“ (شئ جعل نسلہ من سلالۃ من ماء مہین)۔

یہاں ”جعل“ دراصل خلقت کے معنی میں ہے۔ اور نسل ”اولاد اور تمام مراحل میں اولاد و اولاد کے معنی میں ہے۔ ”سلالہ“ اصل میں ہر چیز کا خالص اور پختہ کے معنی میں ہے اور یہاں پر مراد آدمی کا نطفہ ہے۔ جو حقیقت میں اس کے گل وجود کا پختہ ہوتا ہے اور اولاد کی پیدائش سبب اور نسل کو جاری رکھنے کا منبع ہے۔

یہ پانی جو ظاہر ہے قدر قیمت اور اپنی ساخت اور اس میں تیسرے والے حیاتیاتی سالموں کے لحاظ سے اور معنی مخصوص مانع اور سیال ترکیب کے لحاظ سے کہ جس میں سالے تیسرے ربتے ہیں، بہت ہی ظریف اور حد سے زیادہ پیچیدہ ہے اور عظمت پروردگار اور اس کے علم و قدرت کی نشانیوں میں شمار ہوتا ہے اور لفظ ”مہین“ جو ضعیف، حقیر اور ناتجربہ کے معنی میں ہے، اس کی ظاہر وضع اور کیفیت کی طرف اشارہ ہے ورنہ تو مرموز ترین موجودات میں سے ہے۔ بعد والی آیت رحم کی دنیا میں انسانی ارتقاء کے پیچیدہ اور اسی طرح ان مراحل کی طرف اشارہ ہے۔ جو آدم نے

مٹی سے خلقت کے وقت طے کیے تھے، فرماتا ہے: "پھر انسان کے بدن کو موزوں بنایا؛ (مشعر مستواہ)۔

"اور اپنی رُوح میں سے اس میں پھونکا؛ (ونفخ فیہ من روحہ)۔

"اور تمہارے لیے کان آنکھیں اور دل قرار دیئے؛ (وجعل لکم السمع والابصار و

الافئدة)۔

"لیکن بہت کم تم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہو؛" (قلیلاً ما تشکرون)۔

"سواد" مادہ "تسویہ" سے تمثیل کرنے کے معنی میں ہے اور یہ ان تمام مراحل کی طرف اشارہ ہے کہ جنہیں انسان

نطفہ کی صورت سے لے کر اس مرحلہ تک جبکہ اس کے بدن کے تمام اعضاء ظاہر ہوتے ہیں طے کرتا ہے اور اسی طرح وہ مراحل

کہ جو آدم نے مٹی سے خلق ہونے سے لے کر نفع رُوح تک طے کیے تھے۔

"نفخ" دھونے کی تعبیر رُوح کے آدمی کے بدن میں رُوح کے حلول سے کنایہ ہے، گویا اسے ہوا اور تنفس

سے تشبیہ دی گئی ہے، اگرچہ نہ یہ معنی سزا ہے اور نہ وہ۔

اور اگر کہا جائے کہ انسان کا نطفہ تو اب تدارق سے، جب کہ وہ رحم میں قرار پاتا ہے اور اس سے پہلے ہی تو ایک زندہ

موجود ہے، تو پھر اس بنا پر نفع رُوح کا کیا معنی ہے؟

تو ہمارا جواب یہ ہے کہ اب تدارق میں جب نطفہ منعقد ہوتا ہے تو صرف ایک قسم کی حیات باقی کا حامل ہوتا ہے، یعنی نطفہ

خدا حاصل کرنا اور نشوونما پانا ہے، لیکن نہ تو اس میں حس و حرکت جو "حیات حیوانی" کی نشانی ہے اور نہ ہی قوت ادراک جو

"حیات انسانی" کی نشانی ہے، موجود ہوتی ہے۔

لیکن رحم میں نطفہ کا ارتقاء اس مرحلہ تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ حرکت کرنے لگتا ہے اور تدریجاً دوسری انسانی طاقتیں

اس میں زندہ ہوجاتی ہیں اور یہ وہی مرحلہ ہے، جسے قرآن نفع رُوح سے تعبیر کرتا ہے۔

"رُوح" کی "خدا" کی طرف اصنافت اصطلاح کے مطابق "اصنافت تشریفی" ہے یعنی ایک زبردست قیمتی

اور با شرافت رُوح جو اس قابل ہے کہ اسے رُوح خدا کا نام دیا جائے انسان میں پھونکی جاتی ہے اور یہ بات اس

حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ انسان اگرچہ "مادی جہات" کے لحاظ سے "تاریک مٹی" یا جبکہ تدریجیت پانی سے ہے۔

لیکن معنوی اور روحانی لحاظ سے "روح الہی" کا حامل ہے۔

ایک طرف تو اس کا وجود مٹی پر اور دوسری طرف شرف پروردگار پر جا کر ختم ہوجاتا ہے اور ایک سیران کی حیثیت سے

ملہ قابل توجہ یہ ہے کہ بعض نے اس آیت کو صرف حیثیتی ارتقا کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور معنی نے احتمال دیا ہے

مکن ہے کہ آدم کے مٹی سے پیدا ہونے کے بعد جو مراحل طے کئے ہیں، صرف اس کی ناظر ہو دیکھو کہ قرآن کی دوسری آیات میں بعینہ

یہی تعبیر تعلق آدم کے بارے میں آئی ہے، لیکن دونوں کی طرف لوٹے تو کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ آدم کی مٹی سے خلقت بھی اور نطفہ

کہ فرشتہ سرشتہ در حیوان" (فرشتہ اور حیوان کا ہجمن مرکب ہے)، اور ان دونوں کے حامل ہونے کی وجہ سے اس

میں تو یہ محدودی و نزولی اور تکامل و انحطاط حد سے زیادہ وسیع ہے۔

قرآن کے آخری مرحلہ میں جو خلقت انسان کا پانچواں مرحلہ شمار ہوتا ہے، کان اور آنکھ اور دل ایسی نعمتوں کی طرف اشارہ

کیا ہے، البتہ یہاں مقصد ان اعضاء کی خلقت نہیں ہے، کیونکہ یہ خلقت تو نفع رُوح سے پہلے صورت پذیر ہوتی ہے، بلکہ

مراد سننے، دیکھنے اور درک و خوردگی حس ہے۔

یہ جو تمام "ظاہری" اور "باطنی" حواس میں سے صرف ان تین پر اکتفا کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے

اہم ترین ظاہری حواس جو انسان اور اس کی بیرونی دنیا کے درمیان طاقت و دریا بطن قائم کرتے ہیں، وہ کان اور آنکھ ہیں، کان

آوازوں کا ادراک کرتے ہیں۔ خاص کر تعلیم و تربیت ان کے ذریعے ہی انجام پاتے ہیں اور آنکھ بیرونی دنیا اور اس عالم

کے مختلف مناظر کے دیکھنے کا ذریعہ ہے۔

اور عقل و حس و قوت انسان کے باطنی حواس میں سے اہم ترین حس ہے، جو دوسرے لفظوں میں وجود بشر

پر نگران ہے۔

جالب توجہ یہ کہ "افئدة" "هنواد" کی جمع ہے کہ جو قلب (دل) کے معنی میں ہے۔ لیکن اس سے زیادہ

ظریف و عمدہ معنی رکھتا ہے۔ یہ لفظ عام طور پر دباں بولا جاتا ہے، جہاں "افئدة" "رکشی" اور "سنگی" جو۔

اور اس طرح سے خدا نے اس آیت میں شاعت اور معرفت کے اہم ترین آلات جو انسان کے وجود کے ظاہر و

"باطن" میں ہیں، بیان کیے ہیں کیونکہ علم انسانی یا "تجربہ" کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں، اور اس کا ذریعہ آنکھ

اور کان ہیں۔

اور یا عقلی تجربہ و تمجیل اور استدلالات کے ذریعہ ہوتا ہے اور ان کا ذریعہ عقل و خورد ہے کہ قرآن میں وہ "افئدة"

سے تعبیر ہوا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ادراکات و حوجی، انشراق اور شہود کے طریقہ سے قلب انسان میں صورت پذیر ہوتے

ہیں۔ وہ بھی اپنی "افئدة" کے ذریعہ سے ہوتے ہیں۔

اگر شناخت اور پہچان کے یہ ذرائع انسان سے جھین لیے جائیں تو اس کے وجود کی قدر و قیمت مستطی بھر خاک اور

سنگینوں کی حد تک سقوط کر جائے گی۔ اسی بنا پر زبیر بخت آیت کے آخر میں انسانوں کو ان عظیم نعمتوں کی شکر گزاری کے

مسئلہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہتا ہے، بہت کم اس کا شکر بجالاتے ہو، جو اس طرف اشارہ ہے کہ جس قدر ہمیں ان

عظیم نعمتوں کا شکر بجالاؤ، یہ پھر بھی کم ہے۔

ملہ اس سلسلہ میں تفسیر نمونہ جلد تیسرا میں سورہ صبر کی آیت ۲۹ کے ذیل میں بھی ہم بحث کر چکے ہیں۔

ایک نکتہ

مٹی سے آدم کی خلقت کی کیفیت : اگرچہ قرآن کی مختلف آیات میں کبھی تو ”مٹی“ سے انسان کی خلقت کی گفتگو کی ہے (جیسے اوپر والی آیات میں) سورہ اسراء کی آیت ۶۱ میں آدم و ابلیس کی داستان میں آیا ہے :
 ”فسجدوا للآ ابلیس قال ءا سجد لمن خلقت طینا“
 ”تمام فرشتوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ اس نے کہا، کیا میں اس کو سجدہ کر دوں جو مٹی سے پیدا شدہ ہے ؟“
 (سورہ اسراء، ۶۱)

اور کبھی ”پانی“ سے خلقت کی گفتگو کی ہے۔ مثلاً ”وجعلنا من السماء کفرا حی“
 (انبیاء، ۲۰)

لیکن واضح رہے کہ یہ سب چیزیں ایک ہی مطلب کی طرف لوٹتی ہیں، یہاں تک کہ وہ جگہ بھی کہ جہاں آدم کی تراب (مٹی) سے خلقت کی گفتگو ہے ”ان مثل علی علی عند اللہ کمثل آدم مخلقه من تراب“
 (ابن عمران، ۵۹) کیونکہ مراد گیل مٹی ہے۔ (یعنی گارہ ہے)۔
 یہاں پر دو نکتے واضح ہو جاتے ہیں :

- ① جن لوگوں نے احتمال یہ دیا ہے کہ انسان کی مٹی سے خلقت مراد یہ ہے کہ افراد بشر نباتات سے براہ راست یا غیر مستقیم طور پر پیدا حاصل کرتے ہیں اور نباتات بھی سارے مٹی سے ہیں ٹیکس نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن کی آیات ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں اور زیر بحث آیات کے تفسیر سے ”خود آدم“ کی خلقت کی طرف اشارہ ہیں جو مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔
- ② یہ تمام آیات ”نظریہ ارتقاء“ کی نفی پر دلیل ہیں (کم از کم انسان کے بارے میں) اور نوع بشر جو ”آدم“ پر منتہی ہوئی ہے ایک مستقل خلقت کی حامل ہے۔

اور جن لوگوں نے یہ گمان کیا کہ مٹی سے خلقت والی آیات نوع انسانی کی طرف ہیں جو ہزار ہا واسطوں سے اکیلے اور طاق سالے واسطوں سے موجودات کی طرف لوٹتی ہیں، اور وہ آخری مفروضات کی بنا پر سمندروں کے ساحلوں کی وادوں سے وجود میں آئے ہیں۔

باقی رہے خود حضرت آدم وہ ایک نرسندہ کہ جنہیں فرج بشر کے درمیان سے منتخب کیا گیا۔ لیکن وہ کوئی مستقل خلقت نہیں رکھتے تھے، بلکہ ان کا استیذان کے خصوص صفات سے تھا، کسی طرح بھی آیات قرآنی کے ظاہر سے سازگار نہیں ہے۔

ہم ایک بار پھر تاکید کرتے ہیں کہ تحول انواع کا مسئلہ کوئی مسلم علی تافرن و کلیہ قاعدہ نہیں ہے، بلکہ صرف ایک مفروضہ ہے کیونکہ وہ چیز کبھی کبھی لاکھ سال قبل قاعدہ تک جاسکتے ہیں، جو یقیناً قابل تجربہ اور مشاہدہ نہیں ہے اور نہ ہی ثابت شدہ

مٹی قرآنی کی صفت میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ بلکہ ایک ایسا مفروضہ ہے کہ جو مختلف انواع و اجناس کے ظہور کی توجیہ کے لیے وجود میں آیا ہے اور اس کی قدر قیمت صرف اسی قدر ہے کہ وہ عالم میں ظہور پذیر ہونے والی چیزوں کی اندازاً توجیہ کرتے ہیں۔ اور ہم سب جانتے ہیں کہ مفروضے ہمیشہ ایک حال پر باقی نہیں رہتے، بلکہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور نئے مفروضے ان کی جگہ لیتے رہتے ہیں۔

اسی بنا پر کبھی بھی ایسے مفروضوں پر فلسفی مسائل کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی، کیونکہ فلسفی مسائل کی بنیادیں ٹھوس اور محکم ہوتی ہیں۔

ہم ارتقاء انواع کے مفروضہ کی بنیادوں اور ان کے غیر مستحکم ہونے کے بارے میں جلد ۶ صفحہ ۱۸۰ کے بعد کے صفحات ”قرآن اور خلقت انسان“ کے عنوان کے تحت سورہ حجر کی آیت ۲۸ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں۔

اس بحث کے آخر میں اس نکتہ کی یاد آوری ضروری سمجھتے ہیں کہ ارتقاء کے مفروضہ کا مسئلہ ”توحید اور خدا شناسی“ سے کسی قسم کا کوئی ارتبا ط نہیں رکھتا اور نہ ہی وہ ماوراء طبیعت عالم کی نفی پر دلیل شمار ہوتا ہے۔ کیونکہ اعتقاد توحیدی کہنا ہے کہ کائنات خدا کی طرف سے خلق ہوئی ہے اور خدا نے اسے موجودات کے تمام خواص عطا کیے ہیں اور خدا کی طرف سے تمام مراحل میں ان پر فیض نازل ہوتا ہے۔ اس معنی کو ”ثبوت انواع“ کے نظریہ کا مقصد بھی اسی طرح قبول کر سکتا ہے، جس طرح تحول انواع کے مفروضہ کا کوئی معتقد قبول کرتا ہے، صرف ایک مشکل جس سے تحول کا مفروضہ دوچار ہے، یہ کہ وہ اس تفصیل کے ساتھ میل نہیں کھاتا، جسے قرآن نے خلقت آدم کے بارے میں بیان کیا ہے کہ اس کی تخلیق مٹی اور گارہ سے ہوئی ہے۔

اس بنا پر ہم ارتقاء کے نظریہ کی صرف اسی دلیل سے نفی کرتے ہیں نہ کہ مسئلہ توحید کی مخالفت کی بنا پر۔ یہ بات تو صحیح تفسیری لحاظ سے۔

رہا علمی (دانشی) اعتبار سے، تو اس کی نفی کا تعلق، چونکہ اس کے ثبوت کے لیے قطعی دلائل موجود نہیں ہیں، لہذا ہم اس لحاظ سے بھی اس کی نفی کرتے ہیں۔

- ۱۰- وَقَالُوا إِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ أَإِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ
بَلْ هُمْ بِلِقَائِ رَبِّهِمْ كَفِرُونَ ۝
- ۱۱- قُلْ يَتَوَفَّكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ
بِكُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ ۝
- ۱۲- وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الْمُجْرِمُونَ نَاكِسُو رُءُوسِهِمْ عِنْدَ
رَبِّهِمْ طَرْبِنَا أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجَعْنَا نَعْمَلْ
صَالِحًا إِنَّا مُوقِنُونَ ۝
- ۱۳- وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدًىٰ وَلَٰكِن
حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ
النَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝
- ۱۴- فَذُوقُوا بِمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا
إِنَّا نَسِينَاكُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا
كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

ترجمہ

- ۱۰- انھوں نے کہا کیا جس وقت ہم مر جائیں گے اور زمین میں گم ہو جائیں گے تو نئی زندگی پائیں گے؟ لیکن وہ تو اپنے پروردگار کی ملاقات کا انکار

- کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ معاد کے انکار سے آزاد ہو جائیں اور اپنی ہو بس رانی کو چاری و ساری رکھیں۔
- ۱۱- کہہ دو کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مامور ہوا ہے، تمھاری (روح کو) قبض کر لے گا، پھر تم اپنے پروردگار کی طرف پلٹ جاؤ گے۔
- ۱۲- اور اگر تم ان مجرموں کو دیکھو، جس وقت کہ وہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں سر نیچے کیے ہوئے کہیں گے، پروردگار! جو کچھ تو نے وعدہ کیا تھا، ہم نے اسے دیکھا اور سنا ہے، ہمیں واپس پلٹا دے، تاکہ ہم عمل صالح بجا لائیں، ہم قیامت پر ایمان رکھتے ہیں۔
- ۱۳- اگر ہم چاہتے تو ہر انسان کو (جبری طور پر اور) لازمی ہدایت دیتے۔ لیکن ہم نے (انہیں آزاد چھوڑ رکھا ہے اور) مقرر کیا ہے کہ دوزخ کو (بے ایمان اور گناہگار) جن دالنس کے تمام افراد سے بھر دیں۔
- ۱۴- (اور ان سے کہو کہ عذاب جہنم کو) چکھو۔ اس لیے کہ آج کی ملاقات کو تم نے فراموش کر دیا تھا، ہم نے بھی تمہیں فراموش کیا ہے اور ہمیشہ کے عذاب کو ان اعمال کی وجہ سے چکھو جو تم نے انجام دیئے ہیں۔

تفسیر

ندامت اور بازگشت کا تقاضا

یہ آیات معاد کے بارے میں ایک بولتی ہوئی ناخوش بخت کے ساتھ شروع ہو رہی ہیں۔ اس کے دوسرے جہان

میں "بحرین" کی حالت کو بیان کرتا ہے اور مجموعی طور پر گزشتہ بخشوں کی تکمیل ہے جو "مبدأ" کے بارے میں بیان ہوئی ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ "مبدأ و معاد" کی بحث قرآن مجید میں عام طور پر ایک دوسرے سے مل جاتی ہے۔ پہلے لکھتا ہے "انہوں نے کہا کیا جس وقت ہم مر گئے اور مٹی ہو گئے اور زمین میں ہم گم ہو گئے تو نئی پیداوارس پائیں گے؟" (وقالوا ۱۵۱۶ مثلنا فی الارض ۱۷ انا لفی خلق جدید)۔

"زمین میں گم ہو جانے" کی تعبیر (مثلنا فی الارض) اس طرف اشارہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد پانی مٹی کی طرح خاک ہو جاتا ہے اور اس کا ہر ذرہ عوامل طبیعی اور غیر طبیعی کی بنا پر ایک گوشہ میں جا پینچتا ہے اور پھر اس کی کوئی چیز بھی باقی نظر نہیں آتی تاکہ اسے قیامت میں دوبارہ پٹانے کا یقین دلائے۔

لیکن حقیقت میں وہ اپنے اس کام سے قدرت خدا کے منکر نہیں ہیں۔ بلکہ وہ اپنے پروردگار کی ملاقات کا انکار کرتے ہیں: ابل ہم بلیقاء ربہم کافرون)۔ وہ چاہتے ہیں کہ پروردگار کی ملاقات کے سرحد کا انکار کریں جو حساب و کتاب اور ثواب و عقاب کا مرحلہ ہے اور ان کے بعد عمل میں آزادی حاصل کریں تاکہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں انجام دیں۔

در حقیقت یہ آیت سورہ قیامت کی پہلی آیات سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے جہاں قرآن نے کہا ہے:

"ایجدب الانسان ان لسن نجمع عظامہ بلب قادیین علی دن نسوی بنا نہ سل بیرید الانسان لیفجر امامہ یسئل ایان یوم القیامۃ" "کیا انسان گمان کرتا ہے کہ اس کی پرانہ اور پھری ہوئی ہڈیوں کو ہم جمع نہیں کر سکیں گے؟ ہم تو یہاں تک قادر ہیں کہ تمہاری انگلیوں کے پوروں (کے خطوط) پہلے نظام کی طرف پٹا دیں۔ لیکن انسان کا بدت و مقصد یہ ہے کہ وہ دن جو اس میں اس کے سامنے ہے (انکار قیامت کر کے) فسق و فحور اور گناہ کے ساتھ گویا دے۔ اس لیے پوچھتا ہے کہ قیامت کب آئے گی؟" (سورہ قیامت ۴۷)

اس بنا پر وہ استدلال کے لحاظ سے کوسلے لنگڑے نہیں بلکہ ان کی تن آسانی نے ان کے دل پر حجاب ڈال رکھا ہے اور ان کی بُری نیتیں مسئلہ معاد کے قبول کرنے سے مانع ہیں۔ ورنہ وہی خدا جس نے مقناطیس کو یہ اثر بخشا ہے کہ لوہے کے بہت ہی چھوٹے ذرات کے جڑوں مٹی کے اندر چھپے ہوئے ہیں، انہیں ایک گردش سے اپنی طرف جذب کر کے آسانی کے ساتھ انہیں جمع کر لیتا ہے، کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ انسان کے جسم کے ذرات کے درمیان بھی اس قسم کی کشش پیدا کرے؟ کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ ایک انسان کے جسم میں موجود مختلف پانی (اور جسم انسانی کا اکثر حصہ پانی پر مشتمل ہے) اور اسی طرح اس کے غذائی مواد میں سے ہر ایک، مثلاً ایک ہزار سال قبل اس کی ہر ہر جزا اس عالم کے کسی گوشہ میں پھری پڑی تھی۔ ہر قطرہ ایک سمندر میں اور ہر ذرہ ایک اقلیم اور ہر اقلیم میں، لیکن وہ بادل و بارش اور دوسرے قدرتی عوامل کے ذریعے جمع ہوئے اور آخر کار وجود انسان کو تشکیل دیا، تو کونسا مقام تعجب ہے کہ پرانہ اور منتشر ہونے کے بعد دوبارہ پہلی حالت کی طرف پلٹ آئیں اور ایک دوسرے سے آملیں؟

بعد والی آیت ان کا جواب ایک دوسرے طریقے سے دیتی ہے۔ کہتی ہے "یہ تصویر کرو کہ تمہاری شخصیت تمہارے ہی جسمانی جن کے ساتھ ہے۔ بلکہ تمہاری شخصیت کی اساس و بنیاد کو تمہاری روح تشکیل دیتی ہے اور وہ محفوظ ہے" کہہ دے کہ موت کا فرشتہ جو تم سے جدا ہو گیا ہے تمہاری روح، قبض کرنا ہے۔ پھر تم اپنے پروردگار کی طرف پلٹ جاتے ہو،" (قل یتوفنا کما مملکت الموت السدی وکل بکما تمثرا الی ربکم ترجعون)۔

"یتوفنا کما" کے مفہوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو مادہ "توفی" (بروزن تصدی) میں ہے وہاں لینے کے معنی میں ہے۔ موت فنا اور نابودی کے معنی میں نہیں ہے بلکہ فرشتے کے ایک طرح سے آدمی کی روح کو قبضے میں لے لینے کے معنی میں ہے۔ روح خود وجود انسان کے ام اور بنیادی حصہ کو تشکیل دیتی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ قرآن سادہ جہانی کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور روح اور مادی جسم کی بازگشت کو قیامت میں قطع اور یقینی سمجھتا ہے۔ لیکن اور والی آیت سے اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ انسانی شخصیت کی اساس یہ مادی اجزاء نہیں ہیں جنہوں نے تمہاری تمام فکر کو اپنی طرف مشغول کر رکھا ہے۔ بلکہ وہ روحانی جوہر ہے۔ جو خدا کی طرف سے آیا ہے اور اسی کی طرف لوٹ جائے گا۔

اور علامہ کے طور پر اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اور والی یہ آیت معاد اور قیامت کے منکرین کو اس طرح جواب دیتی ہے کہ اگر تمہاری شکل جسمانی اجزاء کا منتشر اور پراگندہ ہونا ہے تو تم خود قدرت خدا کو قبول کرتے ہو اور اس کے منکر نہیں ہو اور اگر اس پراگندگی کی وجہ سے انسان کی شخصیت کے اضمحلال اور نابودی والی مشکل ہے تو وہ بھی ٹھیک نہیں ہے کیونکہ انسانی شخصیت کی بنیاد روح پر استوار ہے۔

یہ اعتراض مشہور شبہ "اکل و مأکول" سے ملتا جلتا ہے اور اس کا جواب بھی دو مقامات پر ایک دوسرے سے مشابہت رکھتا ہے۔

ضمناً اس محکمہ کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ چند آیتیں قرآنی آیات میں "توفی" اور "قبض ارواح" کی نسبت خدا کی طرف لگی گئی ہے۔

"اللہ یتوفی الانفس حین موتہا" (نمر ۴۲)

"خدا جانوں اور نفسوں کو موت کے وقت سے لیتا ہے۔"

اور بعض آیات میں فرشتوں کی ایک جماعت کی طرف نسبت ہے:

"الذین یتوفواہم الملائکۃ ظالمی الفسہم" (نمل ۲۸)

وہ کہ فرشتے جن کی ارواح کو قبض کرتے ہیں دروغاً بلکہ وہ ظالم و مستکرم لوگ ہیں۔

شبہ "اکل و مأکول" کے سلسلہ میں مزید مدناحت اور اس کے تفصیلی جواب کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۹ سورہ بقرہ کی آیت ۱۷۱ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

اور زبردست آیات میں قبض اور ان کی نسبت "ملک الموت" (موت کے فرشتے) کی طرف دی گئی ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو ان تفسیروں کے درمیان کمی قسم کا تضاد نہیں ہے "ملک الموت" جس کا معنی رکھتا ہے اور ان تمام فرشتوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور یا پھر ان کے رئیس اور سب سے بڑے فرشتے کی طرف اشارہ ہے اور چونکہ تمام فرشتے حکم خدا سے قبض رُح کرتے ہیں، لہذا خدا کی طرف بھی نسبت دی جاسکتی ہے۔

اس کے بعد ان کا فرحرم اور عباد کے منکرین کی کیفیت جو قیامت میں اس کے مختلف مناظر کو مشاہدہ کرنے سے ہوگی اپنے کیے پر سخت نادم اور پشیمان ہوں گے۔ اس طرح مجھ اور ان کی تصور رکھتی کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "اگر تو دیکھے جہنم میں جن وقت کہ وہ اپنے پروردگار کے سامنے سر بیچنے کے ہوئے کہیں گے۔ پروردگار جو کچھ تو نے وعدہ کیا تھا، اس کو ہم نے دیکھا اور سنا ہے۔ ہم اپنے کیے پر نادم ہیں۔ ہمیں واپس پلٹا دے تاکہ ہم عمل صالح انجام دیں۔ ہم اس جہان قیامت پر یقین رکھتے ہیں۔" تو تم لعجب میں ڈوب جاؤ گے، اولوتسری اذا المجرمون ناکسوا ربہم عند ربہم ربنا البصرون وسمنا فارجعنا لعمل صالحا انا مسوقون بہت

یقیناً آپ تعجب کریں گے کہ کیا یہ سر بیچنے کے ہوئے نادم اور پشیمان افراد وہی مغرور، سرکش اور منہ زور لوگ ہیں جو دنیا میں ہی حقیقت کے مقابلہ میں سر نہیں جھکاتے تھے؛ لیکن اب جبکہ قیامت کے مناظر گہرے دیکھیں گے اور مقام شہود پر پہنچ جائیں گے، تو کل طور پر تغیر ہو کر بدل جائیں گے۔ لیکن یہ تغیر اور بیداری جلدی گزر جائے وانی ہے اور قرآن کی دوسری آیات کے مطابق اگر اس جہان کی طرف پلٹ آئیں تو اپنی اسی روش و طریقہ کو جاری رکھیں گے۔ (انعام: ۱۰)

"ناکس" "نکس" "بروزن نکس" کے مادہ سے کسی چیز کا اوڑھنے سے منہ ہونے کے معنی میں ہے۔ لیکن یہاں سر بیچنے کرنے کے معنی میں ہے۔

"ابصرون" "ابصرون" "سبعنا" (ہم نے سنا ہے) پر مقدم رکھنا اس بنا پر ہے کہ قیامت میں پہلے انسان اس کے مناظر سے رو برد ہوگا اور پھر اس کے بعد خدا اور اس کے فرشتوں کی بارہاس کو سنے گا۔

ضمانہ کو کچھ ہم نے کہا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "مجرمین" سے مراد ایمان کفار اور خصوصیت سے قیامت کے منکرین ہیں۔

بہر حال یہ پیدا موقع نہیں کہ ہم آیات قرآنی میں اس سلسلہ سے رو برد ہو رہے ہیں کہ جہنم میں تباہی و تباہی کے اعمال کے اور عذاب الہی کے آثار کے مشاہدے سے سخت پریشان ہوں گے اور دنیا کی طرف بازگشت کا تقاضا کریں گے۔ مالاخر سنت الہی کے لحاظ سے اس قسم کی بازگشت امکان نہیں رکھتی، جس طرح کہ نوزاد سچے کی بازگشت رحم مادر کی طرف اور دُخت سے منکرین ہیں۔

لہٰذا آیہ شریفہ میں "لو شرفیہ ہے اور" تسوی" کا جملہ اس کی شرط ہے اور اس کی جزا مذمت ہے اور تقدیری طور پر اس طرح ہے۔ ولو تسوی اذا المجرمون لو آیت عجباً۔ ربنا ابصرون کے جملہ کا بھی ایک مندرج ہے اور دراصل "یسولون ربنا البصرون" ہے۔

بازگشت کی بازگشت درخت کی طرف ممکن نہیں ہوتی۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ جہنم کا دنیا کی طرف بازگشت کا تقاضا صرف عمل صالح انجام دینے کے لیے ہے۔ اور اس سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ قیامت میں سرمایہ بخت صرف اعمال صالح ہی ہیں۔ ایسے اعمال جو پاک اور ایمان سے برتر اور خالص نیت سے انجام پائیں۔

اور چونکہ ایمان کو قبول کرنے کے لیے آیت کا سارا اصرار اور زیادہ زور ممکن ہے، ایزہ تو ہم پیدا کرے۔ کہ کیا خدا اس قدر قدرت و توانائی نہیں رکھتا کہ نوریان کا پر تو ان کے دل میں ڈال دے، تو بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے۔ اگر ہم چاہتے تو ہر انسان کو (جبری طور پر) ضروری ہدایت دے دیتے، "ولوشنا لآیتنا کل نفس ہداھا۔"

یقیناً ہم ایسی قدرت رکھتے ہیں، لیکن ایسا ایمان جو ہمارے جبری طریقے سے وجود میں آئے تو ایسے ایمان کی چندال قیمت نہیں ہے، لہذا ہم نے ارادہ کر لیا کہ نئی نوع انسان کو یہ اعزاز اور امتیاز بخشیں کہ وہ "مقار" ہو اور ارتقائی مراحل اپنے قدموں سے طے کرے۔

لہذا آیت کے آخر میں فرماتا ہے۔ "میں نے انہیں آزاد چھوڑ دیا، لیکن مقرر کر دیا کہ دوزخ کو بسے ایمان اور گناہگار جن دہ ان کے تمام افراد سے بھر دوں" (ولکن حق القولی لا ملئین جہنم من الجنة والناس اجمعین)۔

جی ہاں انہوں نے اپنے غلط اختیار سے اس راہ کو طے کیا ہے، لہذا وہ سزا و عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں اور ہم نے بھی قطعی ارادہ کر لیا ہے کہ دوزخ کو ان سے بھر دوں۔

اگر اس بات کو مد نظر رکھا جائے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے، اسی طرح قرآن مجید کی سینکڑوں آیات کو دیکھا جائے جو انسان کو متحار، صاحب ارادہ، مکلف، تکالیف شریعہ اپنے اعمال کا جواب دہ، انبیاء، تنذیب نفس اور خود سازی کے ذریعہ قابل ہدایت و اصلاح سمجھتی ہیں تو اوپر والی آیت کے بارے میں ہر قسم کا توہم دور ہو جاتا ہے کہ یہ جہنم کی دلیل ہے میرا کہ فخر رازی وغیرہ نے خیال کیا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ اوپر والا دو لوگ فیصلہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ کہیں یہ تصور نہ کرنا کہ خدا کی رحمانیت و رحمت گناہوں سے آلودہ اور تم گمراہوں کی سزا اور عذاب سے مانع ہے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ آیات رحمت سے مغرور ہو جاؤ اور اپنے آپ کو خدا کی سزا اور عذاب سے صاف تصور کرو۔ کیونکہ اس کی رحمت کا اپنا مقام ہے اور غضب کا اپنا مقام۔

"لا ملئین" کے جملہ کے اول میں لام قسم اور آخر میں نون تاکیدی کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے اس وعدہ کو پورا کرے گا اور دوزخ کو ان دوزخیوں سے بھر دے گا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو حکمت کے خلاف ہے اس لیے بعد کی آیت میں کہتا ہے، ہم ان دوزخیوں سے کہیں گے کہ جہنم کا عذاب اس بنا پر چلو کہ آج کی ملاقات کو تم قبول گئے تھے۔ اور ہم نے بھی تمہیں فراخوشی کے حوالے کر دیا، "فخذوا بئنا نسیئنا لقاہ لیومکم ملئنا انا نسیئنا کما"۔

”اور نیز پیشگی کے عذاب کو ان اعمال کی وجہ سے چھو جائیں تم انجام دیتے تھے“ (و ذوقوا عذاب الخلد بما كنتم تعملون)۔

اس آیت سے ایک بار پھر معلوم ہوتا ہے، قیامت کی داغ و ادھار علامت کو جنھوں جانا ہی انسان کی پختی کا اصل پرچہ ہے اور یہی وہ صورت ہے کہ جس میں وہ اپنے آپ کو قانون شکنی اور مظالم کے سلسلہ میں آزاد سمجھتا ہے، نیز اس آیت سے یہ بات بھی اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ ابدی اور ہمیشہ کی سزا عذاب ان اعمال کی وجہ سے ہی ہے جنہیں انسان خود انجام دیتا ہے۔

نکوئی اور چیز! لے

مناجذ بندوں کے بارے میں پروردگار کی خاموشی سے مراد یہاں خدا کی بے اعتنائی، ترک حمایت اور فریاد رس نہ کرنا ہے۔ درنہ سارا جہان ہمیشہ پروردگار کے سامنے ہے، اور اس کے بارے میں خاموشی ایک بے معنی سی بات ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ روح کا استقلال اور اس کی اصلیت : اور پر دالی آیات میں سے پہلی آیت جو موت کے فرشتے کے استقلال کی دلیل ہے۔

کیونکہ تو فی ”سے تعبیر جو حاصل کرنا اور قبض کرنا کے معنی میں ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ بدن سے بدانی کے بعد روح نابود نہیں ہوتی بلکہ باقی رہ جاتی ہے اور اصولاً اور دالی آیت میں انسان کو روح یا نفس سے تعبیر کرنا اس معنی پر ایک اور نوادہ ہے کہ مادہ پرستوں کے عقیدے کے مطابق روح سالموں کے ”فنزیکل اور کیمیکل“ خواص کے علاوہ کچھ نہیں جو بدن کے فنا ہونے کے ساتھ نابود ہوجاتے ہیں جیسے گھڑی کے ناوڈ ہونے کے ساتھ ہی اس کی ٹوٹی حرکت بند ہوجاتی ہے۔

اس نظر سے کے مطابق روح کوئی ایسی چیز نہیں کہ جو انسانی شخصیت کی محافظ ہو بلکہ اس کے جسم کے خواص کی ایک جزو ہے، جو جسم کے ختم ہوجانے سے ختم ہوجاتی ہے۔

روح کی اصلیت اور استقلال کے سلسلے میں ہمارے پاس متعدد فلسفی دلائل موجود ہیں۔ جن کا ایک گوشہ سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۸۵ کے ذیل میں جلد ۶ میں ہم بیان کر چکے ہیں، یہاں پر مقصود صرف اس موضوع پر نقلی دلیل کو بیان کرنا تھا اور اور دالی آیت کا شمار اس معنی پر دلالت کرنے والی آیات میں ہوتا ہے۔

۲۔ موت کا فرشتہ (ملک الموت) : قرآن مجید کی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم فرشتوں کے ایک گروہ کے ذریعہ اس جہان کے امور کی تدبیر کرتا ہے جیسے

لے ”فلود اور عذاب بادوانی کے فلسفہ“ کے بارے میں جلد ۵ میں۔۔۔ سورۃ جود آیت ۱۰ کے ذیل میں ہم ایک تفصیل بحث کر چکے ہیں۔

سورۃ الزمات کی آیت ۵ میں فرماتا ہے (فالمعدبات امر) ”تم سب ان فرشتوں کی جو حکم خدا سے تمہیں پہنچاتے ہیں“ ہم سب جانتے ہیں کہ سنت الہی اس پر ہے کہ وہ اپنی مشیت کو سبب کے ذریعے عملی شکل دیتا ہے۔ اور فرشتوں میں سے ایک گروہ قبض ارواح کرنے والا ہے جن کی طرف سورۃ نوح کی آیت ۷۸ اور ۷۹ میں قرآن کی بعض دوسری باتیں بھی اشارہ ہوا ہے اور ان سب میں سرفہرست ”ملک الموت“ قرار پاتا ہے۔

اس سلسلہ میں بہت سی احادیث بیان ہوئی ہیں، جن میں سے ہمیں صرف اشارہ ضروری نظر آتا ہے۔

۱۔ ایک حدیث میں پیغمبر اسلام سے منقول ہے۔ آپ نے فرمایا:

لاما نزلوا لاجماع کلھا برید الموت ورسر۔۔۔ موت انفاذا حان الاجد ف

ملك الموت بنفسه فقاتل یا ايتها البرکة رخص بعد خبر؛ وکفر رسد

بعد رسول؛ وکفر برید بعد برید؛۔۔۔ خبر الذاہی لیس بعدی حرب۔

”ہماریاں اور درود نکالیف سب موت کے قاصد اور ان کے بھیجے ہوئے ہیں، جس وقت انسان کی

زندگی انتہا کو پہنچ جاتی ہے اور موت کا فرشتہ آجاتا ہے تو وہ اس فرشتہ کو دیکھ کر وحشت کرتا ہے اور

کسی پیشگی اطلاع دیئے بغیر خیال کرتا ہے کہ وہ کتنا ہے۔۔۔ بندہ خدا اس قدر متواضع نہیں ہے کہ وہ اپنے قاصد اور

سلسل پیغمبر رسال تیری طرف بھیجے ہیں۔ اب میں آخری خبروں اور سیکرے بعد کوئی خبر نہیں ہے۔“

پھر وہ کہتا ہے ”اپنے پروردگار کی دعوت کو قبول کرے۔ پھر خدا فرشتے کے ساتھ یا جبر واکراہ کے ساتھ اور جس

وقت موت کا فرشتہ اسکی روح قبض کرتا ہے اور اس کے عزیز و اقارب نامہ مشیون ٹینڈ کرتے ہیں تو وہ کچھ کہتا ہے:

اعلیٰ من نصرخون؛ وعلیٰ من تبحون؟ فواللہ ما ضمت له اجلاً ولا اکلت له رزقاً بل

دعاه ربہ“۔۔۔ کس پڑھنے پکار کر رہے ہو؟ اور کس کے لیے کسویا رہے ہو؟ خدا کی قسم اس کا وقت پہنچا ہے اور

وہ ساری روزی کھا چکا ہے۔ اس کے پروردگار نے اسے دعوت دی ہے، اور اس نے اس کی دعوت کو نہ کیا ہے۔“

”فلیلک الباک علی نفسه، وان لی فیکم عودات وعودات حتی لا البقی فیکم

احداً“

”اگر روزنا چاہتے ہو تو اپنے آپ پر گریہ کرو، میں پھر بھی بارہا تمہارے پاس آؤں گا یہاں تک کہ تم میں

سے ایک شخص کو بھی باقی نہیں چھوڑوں گا۔“ لے

۲۔ ایک اور حدیث میں امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ایک انصاری شخص کی عیادت کے لیے مکہ کے گھر

تشریف لے گئے، موت کے فرشتے کو اس کے سر ہانے دیکھ کر ڈرنا یا، میسکراں دوست سے نرمی کا سکوت کر، کیونکہ یہ

ایک با ایمان شخص ہے۔ ملک الموت نے عرض کی آپ کو بشارت ہو کہ میں تمام مومنین کے ساتھ محبت کرتا ہوں۔ اور آپ

جان لیجئے کہ جس وقت میں بعض اولاد آدم کی مدوح قبض کرتا ہوں تو اس کے گھر واسے آدھ فریاد کرتے ہیں تو میں گھر کے پاس کھڑا ہوجاتا ہوں اور کہتا ہوں، اس میں میرا کوئی گناہ نہیں، بلکہ اس کی اپنی زندگی ختم ہوگئی ہے، بارہا تمہاری طرف ٹوٹ کر آؤں، خبردار، ہوشیار!

پھر کہتا ہے (ما خلق الله من اهل بيت مدر ولا نعير ولا جبر ولا بحر ولا وانا انصفهم في كل يوم وليلة خمس مرات حتى لا اعرف بصفيرهم وكبيرهم منهم بالفسهم) خدا نے کسی بھی شہر و بیابان، گھر اور غیر ہشک اور دریا میں رہنے واسے انسان کو پیدا نہیں کیا، مگر یہ کہ میں ہر شہر و دریا میں پانچ مرتبہ بڑے عذر کے ساتھ ان کی طرف نگاہ کرتا ہوں، یہاں تک کہ میں ان کے تمام پھوٹے بڑوں کو خود ان سے بہتر پہچانتا ہوں۔

اس مضمون کی دوسری روایات بھی مختلف اسلامی ماخذ میں موجود ہیں کہ جن کا مطالعہ تمام انسانوں کو مفید اور خبردار کرتا ہے، تاکہ وہ جان لیں کہ ان کے اور موت کے درمیان زیادہ ناسمجھ نہیں ہے، بلکہ ممکن ہے کہ ایک منظر سے لمحے میں تمام چیزیں ختم ہوجائیں۔

کیا ان حالات کے باوجود اس بات کا موقع ہے کہ انسان اس دنیا کی چمک و کمک پر فریفتہ اور عرج طرح کے غلام و گناہ سے آلودہ ہو کر عاقبت کار سے غافل ہوجائے؟

۱۵- اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِرُوا بِهَا حَبَرُوا
سُجَّدًا وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا
يَسْتَكْبِرُونَ ۝

۱۶- تَتَجَافَى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ
خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ۝

۱۷- فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ
جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

۱۸- أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا
يَسْتَوُونَ ۝

۱۹- أَمْ آتَيْنَا الْبَنِيَّانَ الْفَاسِقِينَ إِذْ أَخَذْنَا مِنْهُمُ
بَيْعَاتٍ يَخْرِجُونَ عَلَى النَّاسِ آيَاتُنَا وَيَكْتُمُونَ
الْحَقَّ وَالَّذِينَ يَكْتُمُونَ الْحَقَّ يَكُونُونَ كَالنَّجَاسَاتِ
الَّتِي لَا تَعْلَمُ مَا تَعْمَلُ ۝

۲۰- وَأَمْ آتَيْنَا الْبَنِيَّانَ الْفَاسِقِينَ إِذْ أَخَذْنَا مِنْهُمُ
بَيْعَاتٍ يَخْرِجُونَ عَلَى النَّاسِ آيَاتُنَا وَيَكْتُمُونَ
الْحَقَّ وَالَّذِينَ يَكْتُمُونَ الْحَقَّ يَكُونُونَ كَالنَّجَاسَاتِ
الَّتِي لَا تَعْلَمُ مَا تَعْمَلُ ۝

ترجمہ

۱۵- صرف وہی لوگ ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں جنہیں جس وقت

آیات انھیں یاد دلانی جائیں تو سجدہ میں گر پڑتے ہیں، وہ اپنے پروردگار کی تسبیح و حمد بجالاتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے۔

۱۶۔ ان کے پہلو رات کو بستروں سے دُور رہتے ہیں (وہ کھڑے ہو جاتے ہیں اور خدا کی بارگاہ کی طرف رُخ کرتے ہیں) اپنے پروردگار کو خوف و امید کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں روزی دی ہے، اُس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

۱۷۔ کوئی شخص نہیں جانتا کہ کیسی اہم جزائیں جو آنکھوں کی روشنی کا سبب بنتی ہیں، ان کے لیے چھپی ہوئی ہیں۔ یہ ان اعمال کی جزا ہے جنہیں وہ انجام دیتے تھے۔

۱۸۔ کیا وہ شخص جو صاحب ایمان ہو، اس شخص کی طرح ہے جو فاسق ہے؟ نہیں! یہ دونوں کبھی بھی برابر نہیں ہو سکتے۔

۱۹۔ لیکن وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور جنہوں نے عمل صالح انجام دیئے، اُن کے لیے دائمی بہشت کے باغات ہوں گے یہ (خدا کی طرف سے) ان کی میزبانی کا وسیلہ ہے، ان اعمال کے مقابلہ میں جنہیں وہ انجام دیتے تھے۔

۲۰۔ لیکن وہ لوگ جو فاسق ہو گئے (اور اپنے پروردگار کی اطاعت سے نکل گئے) ان کی ہمیشہ کی جگہ آگ ہے، جس وقت چاہیں کہ اس سے نکلیں تو انھیں اس کی طرف واپس لوٹا دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا، اس آگ کا عذاب چکھو جس کا تم انکار کرتے تھے۔

تفسیر

عظیم جزائیں جنہیں کوئی نہیں جانتا!

ہم سب کو معلوم ہے کہ قرآن کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ بہت سے حقائق کو ایسے دلنشین انداز میں ایک دوسرے کے تقابل اور موازنہ کے ساتھ بیان کرتا ہے تاکہ وہ اچھی طرح ہر ایک کی سمجھ میں آجائیں۔

گذشتہ آیات میں بھرتی اور کافروں کے بارے میں بیان شدہ تشریح کے بعد یہاں پر بھی بڑھتے ہوئے مومنین کی صفات اور ان کے اصول عقاید اور عملی پروگرام کو اختصار کے ساتھ دو آیات کے ضمن میں آٹھ صفات کے ذکر کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

پہلے ذرا آجے۔ "صرف وہی لوگ ہماری آیات پر ایمان لے آتے ہیں کہ جنہیں جب بھی ان آیات کی یاد دہانی کرائی جائے تو سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔ اور اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد بجالاتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے۔" (استحیاء مومن بآیاتنا الذین اذا ذکرنا سبحوا سجداً وسبحوا بحمد ربهم وهم لا يستکبرون)۔ "استحیاء" کی تفسیر جو عام طور پر صبر کے لیے ہے، اس نکتہ کو بیان کرتی ہے کہ جب کوئی شخص ایمان کا دم بھرتا ہے لیکن ان خصوصیات کا حامل نہیں جو ان آیات میں آئی ہیں تو وہ پختہ مومنین کی صف میں نہیں ہے۔ بلکہ ایسا تنیف الایمان شخص ہے جو کسی کھاتے میں شام کے خاں نہیں۔

اس آیت میں ان کی صفات کے چار حصے بیان ہوئے ہیں۔

۱۔ آیات الہی کے سنتے ہی سجدہ میں گر پڑتے ہیں "سجدوا" کے بجائے "سجدوا" کی تعبیر ایک لطیف نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ بیدار دل مومنین کا گردہ آیات قرآن سننے کے وقت اس طرح شیفٹہ اور پروردگار کے ارشادات کا مجذوب ہے کہ بے اختیار سجدہ میں گر پڑتا ہے اور اس راہ میں دل و جان کو ہاتھ سے دے بیٹھا ہے۔

۲۔ تو جہر رکنا چاہیے کہ یہ آیت قرآن مجید میں واجب سجدہ کی پہلی آیت ہے۔ چنانچہ جو شخص اس ساری آیت کو پڑھے۔ یا کسی دوسرے سے سنتے تو زواجب ہے کہ سجدہ کرے۔ البتہ اس میں وضو واجب نہیں ہے۔ لیکن احتیاطاً واجب ہے کہ پیشانی اسی چیز پر رکھے کہ جس پر سجدہ صحیح ہے۔

۳۔ "واعقب" "مفردات" میں لکھے ہیں "خسرو"۔ دراصل "خسرو" کے مادہ سے ہے، جو پانی وغیرہ کی اس آواز کے معنی میں ہے۔ یہ جہدی سے سینچے کی حرف گرہا ہو اور اس تعبیر کو سجدہ کرنے والوں کے بارے میں استعمال کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ وہ جس کو بھی سجدہ کے لیے نہیں پرگرتے ہیں، اسی وقت ان کی تسبیح کی صدا بلند ہوتی ہے۔

جی ہاں ان کی یہ خصوصیت اپنے محبوب و محبوبہ کے عشق و محبت سے ان کا عشق سوزنا اور لگاؤ ہے۔
یہی خصوصیت قرآن کی دوسری آیات میں ایسی ہی ایک برجستہ ترین صفت کے عنوان سے ذکر ہوئی ہے جیسا کہ علامہ
عظیم انبیا کے ایک گروہ کے متعلق لکھتا ہے،

”اذا متلى عليلهم آيات الرحمن خسر واستجدوا وجعاً“ (سورہ مريم - ۵۸)
”جس وقت خداوند تبارک و تعالیٰ کی آیات ان پر پڑھی جاتی تھیں تو وہ خاک پر گر پڑتے اور سجدہ کرتے اور گریہ شروع
کرتے تھے“

اگرچہ لفظ ”آیات“ یہاں بطور مطلق ذکر ہوا ہے۔ لیکن واضح ہے کہ ان سے مراد زیادہ تر وہ آیات ہیں جن میں توحید کی دولت
ہے اور شرک سے نہروانی کی ترغیب۔

۲- دوسری اور تیسری نشانی ان کی پروردگار کی تسبیح ”اؤحمد“ ہے۔ ایک طرف جہاں وہ خدا کو نفاذ سے پاک اور منزه شمار
کرتے ہیں تو دوسری طرف اس کے صفات کمال و جمال کی بنا پر اس کی حمد و ستائش کرتے ہیں۔

۳- ان کی ایک اور صفت تواضع، فروتنی اور ہر قسم کے استکبار سے دوری ہے۔ کیونکہ کبر و غرور کفر نبی الہامی کے زینہ کی
پہلی سیڑھی ہے اور حقیقی و حقیقت کے سامنے جھک جانا ایمان کا پہلا قدم ہے۔

وہ لوگ جو تکبر اور خود پسندی کی راہ میں قدم اٹھاتے ہیں وہ نہ تو خدا کے سامنے سجدہ کرتے ہیں اور نہ ہی اس کی تسبیح
و حمد بجالاتے ہیں اور نہ ہی اس کے بندوں کا حق تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ اپنے سامنے ایک مظلوم بت رکھتے ہیں اور بڑا جنت
نور ان کی اپنی ذات ہے۔

اس کے بعد ان کی دوسری صفات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے پہلو رات کے وقت بہتوں سے
دور ہو جاتے ہیں اور وہ کھڑے ہو جاتے ہیں اور بارگاہ خدا کا رخ کر کے اس سے راز و نیاز کرتے ہیں: (استجافی جنوہم
عن المضاجع) صلہ

جی ہاں! ہم وقت، غافل لوگوں کی آنکھ سوری ہوتی ہے تو وہ رات کا ایک حصہ بیدار ہوتے اور اس وقت جبکہ زندگی
کا کاروبار ٹھہر رہا ہے، فکری مشاغل کم سے کم ہو کر سوچ جاتے ہیں۔ اور آرام و سکون اور خاموشی سے ہر جگہ کو گھیر رکھا ہوتا ہے
اور عبادات میں ریا کا شائبہ بہت ہی کم ہوتا ہے اور خلاصہ یہ کہ اس وقت حضور قلب کے بہترین مواقع میسر ہوتے ہیں، یہ
لوگ اپنے پورے وجود کے ساتھ بارگاہ مجید کا رخ کرتے ہیں اور اپنے مشوق و محبوب کے آستانے پر سر جھکا دیتے ہیں۔
اور جو کچھ ان کے دل میں ہوتا ہے اس کی بارگاہ میں پیش کر دیتے ہیں۔ یہ اس کی یادیں زندہ ہیں اور اپنے دل کے پیانے

صلہ ”استجافی“ مادہ ”جف“ سے اصل میں اٹھانے اور دور کرنے کے معنی میں ہے۔ ”جوب“ جمع ہے ”جب“ کی جو پہلو کے
نہیں ہے اور مضاجع ”جمع ہے ”مضجع“ کی جو بہتر کے معنی میں اور بہتر سے پہلو کا دور ہونا رات کے وقت بہتر خواب سے اٹھنے اور
پروردگار کی عبادت کرنے سے کنارہ ہے۔

کو اس کی ہر محبت سے لبریز اور سرشار رکھتے ہیں۔
اس کے بعد مزید لکھتا ہے ”وہ اپنے پروردگار کو ”خوف“ اور امید کے ساتھ پکارتے ہیں: ”ایدعون ربکم
خوفاً وطمئناً“۔

جی ہاں ان کی دو اور صفات ”خوف“ و ”رجا“ یا ”ڈر“ اور ”امید“ ہے۔ نہ تو اس کے غضب اور عذاب سے مامون رہتے
ہیں اور نہ اس کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں۔ اس خوف اور امید کا توازن جو خدا کی راہ میں ان کے تدریجی کمال و ارتقاء اور پیش
رفت کا ضامن ہے، ہمیشہ ان کے وجود میں کارفرما ہے۔

وجہ یہ ہے کہ امید پر خوف کا غلبہ انسان کو مایوسی اور سستی کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے اور رجاء اور طمع کا غلبہ است
غور و غفلت پر آمادہ کرتا ہے اور یہ دونوں خدا کی طرف انسان کے ارتقائی مراحل کے دشمن ہیں۔

آخری اور اٹھویں خصوصیت ان کی یہ ہے کہ جو کچھ ہم نے انھیں رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں: (اوربما
رزقناھم ینفقون)۔

نہ صرف یہ کہ اپنے مال ضرورت مندوں کو بخش دیتے ہیں، بلکہ اپنے علم و دانش، قوت اور قدرت، صحیح رائے اور تجربہ
اور فکری ذخیرے کو ضرورت مند لوگوں پر خرچ کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

وہ غیر برکت کا مرکز ہیں اور نیکیوں کے آب زلال یعنی صاف ستھرے پانی کا لازوال چشمہ ہیں کہ ترشہ کا مول کو سیراب اور
معاہدوں کو اپنی ہستی کے مطابق بنے بنا کر دیتے ہیں۔

جی ہاں! ان کے اسلاف محکم عقیدہ، قوی ایمان، خدا سے حقیقی عشق، عبادت و اطاعت، کوشش و حرکت اور بنگلن
خدا کی ہر لحاظ سے مدد کرنے کا مجموعہ ہیں۔

پھر بعد والی آیت میں پتے مومنین کے عظیم اور اہم اجر کو بیان کرتا ہے، جو پہلے کی دو آیات میں مذکورہ نشانیوں کے حامل
ہیں، ایک ایسی قابل توجہ تعبیر کے ساتھ جو ان کے اجر کی حد سے زیادہ اہمیت کی ترجمانی کرتی ہے۔ فرماتا ہے، ”کوئی شخص
نہیں مانا کہ انھوں کی زندگی میں کیا ہم اجر و ثواب ان کے لیے چھپا رکھے گئے ہیں: ”افللا تعلمون نفس ما اضعی لہم من قورۃ اعین۔“
یہ بڑا عظیم اور بلند تر اجر ہے جو ان کے اعمال کے بدلے میں دیا گیا۔

”کوئی شخص نہیں جانتا“ کی تعبیر نیز ”قورۃ اعین“ (آنھوں کی روشنی اور ٹھنڈک کا باعث ہے) کی تعبیر ان نعمتوں
کی بے حساب عظمت کو بیان کرتی ہے، خصوصاً جب لفظ ”نفس“ سیاق و سباق نفی میں نحوہ کی شکل میں آیا ہے اور عموم کا
معنی دے رہا ہے اور ملائکہ مقرب اور اولیاء اللہ سمیت تمام نفوس کو شامل ہے۔

”نفس“ کی طرف اضافت کے بغیر ”قورۃ اعین“ کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ خدا کی
نعمتیں جو آخرت کے گھر کے لیے پتے مومنین کے ثواب اور اجر کے طور پر مقرر کی گئی ہیں، اس طرح ہیں کہ ہر ایک کی مخلوق
کی روشنی اور ٹھنڈک کا سبب ہوں گی۔

”قورۃ“ مادہ ”قور“ (بروزن تحسن) سے ٹھنڈک اور خشکی کے معنی میں ہے اور چونکہ مشہور ہے کہ محبت

اور شوق کے آنسو ہمیشہ ٹھنڈے اور خشک اور غم و حسرت کے آنسو گرم اور سوزان ہوتے ہیں " قسرة اعین " کی تعبیر لغت عرب میں ایسی چیز کے معنی میں ہے جو انسان کی آنکھ کے ٹھنڈا ہونے کا سبب ہو۔ یعنی شوق اور محبت کے آنسو اپنی آنکھوں سے جاری کرتا ہے اور یہ انتہائی خوشنمائی اور سرور کا لطیف کنایہ ہے۔

لیکن فارسی زبان میں اس قسم کی تعبیر موجود نہیں ہے بلکہ ہم کہتے ہیں، اس کی آنکھ کی روشنی کا سبب ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ موجودہ فارسی کی یہ تعبیر "بوست و یعقوب" کی قرآنی داستان سے لی گئی ہو کہ قرآن کے بقول جس وقت بشارت دینے والا یعقوب کے پاس آیا اور یوسف کا پیرا بن ان کے چہرے پر رکھا تو ان کی نامینا آنکھیں روشن ہو گئیں (سورۃ یوسف آیت ۹۰) اور یہ تعبیر بھی زبردست سرور اور خوشی سے کنایہ ہے۔

پیغمبر اکرمؐ کی ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں:

"ان الله يقول اعددت لعبادي الصالحين مالا عين رأت، ولا اذن سمعت، ولا خطر على قلب بشر!

"خدا فرماتا ہے میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے ایسی نعمتیں فراہم کر رکھی ہیں کہ جنہیں نہ تو کسی آنکھ نے دیکھا ہے اور نہ کسی کان نے سنا اور نہ ہی کوئی فرد بشر ان کے متعلق سوچ سکتا ہے! لہذا یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے، جسے عظیم مفسر مرحوم طبری نے "مجمع البسیان" میں جن پیش کیا ہے اور وہ یہ کہ آخر یہ عظیم ثواب و اجر کیوں محض رکھا گیا ہے؟

اس کے بعد موصوف اس سوال کے تین جواب دیتے ہیں:

۱۔ اہم اور نہایت قیمتی امور اس طرح ہیں کہ لفظوں سے آسانی کے ساتھ ان کی حقیقت کا ادراک نہیں کیا جاسکتا لہذا اس وقت ان کا معنی رکھنا زیادہ فرحت بخش اور فصاحت کی رُو سے زیادہ بیخ ہے۔

۲۔ معمولی طور پر جو چیز آنکھوں کی ٹھنڈک اور روشنی کا باعث ہو، اس کا دامن اس قدر وسیع ہوتا ہے کہ انسان کا دل و دماغ اس کے تمام خصوصیات تک نہیں پہنچ سکتا۔

۳۔ چونکہ یہ اجر نماز تہجد کے لیے قرار دیا گیا ہے جو محض صورت میں ادا کی جاتی ہے لہذا مناسب یہ ہے کہ اس عمل کی جزا بھی عظیم اور محض ہو تو جو رہے کہ گذشتہ آیت میں "تتجافی جنوبہ عن المضاجع" کا مہل نماز شب کی طرف اشارہ ہے۔

ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

"ما من حسنۃ الا ولها ثواب مبین فی القرآن، الا صلوة اللیل، فان

۱۔ اس حدیث کو طبری ہی بہت سے مفسرین نے تہمدان کے "طبری" نے "مجمع البسیان" میں "آلوسی" نے "تذکرۃ المسانیف" میں "قرطبی" نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے، مشہور محدثین "بخاری" اور "مسلم" نے بھی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔

الله عذاسمه لم یبین ثوابها العظم خطرہا، قال: فلا تعلم نفس ما اخفی لہم من قسرة اعین۔

"کوئی نیک عمل نہیں مگر یہ کہ اس کا واضح ثواب قرآن میں بیان ہوا ہے سوائے نماز تہجد کے۔ خدائے عظیم نے اس کے ثواب کو واضح طور پر بیان نہیں کیا۔ یہ اس کی اہمیت کی وجہ سے ہے، اس لیے فرماتا ہے کہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ کیسے عمدہ ثواب جو آنکھوں کی روشنی اور ٹھنڈک کا باعث ہیں، ان کے لیے پوشیدہ رکھے گئے ہیں۔"

لیکن ان تمام چیزوں سے قطع نظر جیسا کہ پہلے ہی ہم نے اشارہ کیا ہے، عالم قیامت ایک ایسا جہان ہے، جو اس جہان کی نسبت حد سے زیادہ وسیع ہے۔ دنیاوی زندگی اس کے مقابلے میں ایسی ہے جس طرح دنیا کے مقابلے میں شکم ماہرین موجود شیچے کی زندگی، بلکہ وہ عالم اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ اور معمولی طور پر ہم جیسے دنیا کی چار دیواری میں مقید افراد کے لیے اس کے تمام اطراف و جهات قابل نگاہ نہیں ہیں۔ بلکہ کسی کے لیے ابھی قابل تصور ہی نہیں۔

ہم نے صرف اس کے بارے میں بات سُننے اور دُور سے ایک سایہ کے مانند اسے دیکھتے ہیں۔ لیکن جب تک اس جہان والا ادراک اور نظر پیدا نہ کریں، اس کی اہمیت کا درک ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ جیسا کہ بچہ کے لیے شکم ماہرین کا عمل عقل و ہوش رکھتا ہو تو اس دنیا کی نعمتوں کا ادراک ناممکن ہے۔

یہی تعبیر شہدائے راہ خدا کے بارے میں آئی ہے کہ جس وقت کوئی شہید زمین پر گرتا ہے تو زمین کہتی ہے: "آفرین ہے اسے پاکیزہ روح پاکیزہ بدن سے پرواز کر رہی ہے۔ تیرے لیے بشارت اور خوشخبری ہو!" ان لث مالا عین رأت و لا اذن سمعت، ولا خطر علی قلب بشر! لہذا

بعد والی آیت اس تقابل کو جو گذشتہ آیات میں تھا، زیادہ صراحت کے ساتھ واضح کرتے ہوئے کہتی ہے: "کیا وہ شخص جو مومن ہے، مثل اس شخص کے ہے جو فاسق ہے؟ نہیں یہ دونوں ہرگز برابر نہیں ہیں! (افمن کان مؤمناً کمن کان فاسقاً لا یستویون)۔"

یہ جملہ استفہام انکاری کے طور پر بیان ہوا ہے، وہ استفہام جس کا جواب ہر انسان کی عقل و فطرت سے پیدا ہوتا ہے کہ یہ دونوں ہرگز برابر نہیں ہو سکتے، اس کے باوجود پھر بھی تاکید کے لیے "لا یستویون" کا جملہ ذکر کیا ہے جو ان کے برابر نہ ہونے کو مزید واضح کرتا ہے۔

اس آیت میں "فاسق" "مؤمن" کے مقابلہ میں ذکر ہوا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ فسق ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جو کفر کو بھی شامل ہے اور دوسرے گناہوں کو بھی، کیونکہ یہ لفظ اصل میں "فسقت الشجرة" (یعنی پھل

۱۔ "مجمع البسیان" محل بحث آیات کے ذیل میں۔

۲۔ مجمع البسیان ذیل آیت ۱۴، اکل مران جلد ۲۔ تفسیر نمونہ جلد ۳، ص ۱۰۱ کے ذیل میں۔

اپنے پیسلے سے باہر نکلا یا جب ٹھوکر کھٹل اپنے گودے سے جلا ہوا درباہر جا کر سے) سے یہ نکلے لیا گیا ہے۔ پھر خدا اور عقل کے حکم کی اطاعت سے خارج ہونے پر اطلاق ہوا ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ جو شخص کُفر اختیار کرتا ہے یا گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ ہر دردگار اور عقل و خرد کے فرمان سے خارج ہو جاتا ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ چل جب تک اپنے پیسلے اور عقل کے اندر رہتا ہے صحیح و سالم ہے اور جس وقت پوست و پچھلے سے خارج ہو جائے، خراب ہو جاتا ہے۔ تو اس نما پر جو نبی انسان ناسق ہوتا ہے، فرزا خراب اور ناسد بھی ہو جاتا ہے۔

عظیم مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے کہ ایک دن "ولید بن عقبہ" نے حضرت علیؓ سے عرض کیا۔ انا اوسط منک لسائنا واحد منک سنائنا "میں آپ سے زیادہ وسیع و فیض زبان اور زیادہ تیز نیزہ رکھتا ہوں یا اس حرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے خیال میں تقریر اور جنگ دونوں میں حضرت سے بڑھا ہوا ہے۔

حضرت علیؓ نے اس کے جواب میں فرمایا لیس کما تقول یا فاسق "اے ناسق! بیسے تو کتابتہ دیں نہیں ہے" (اس طرف اشارہ ہے کہ تو وہی شخص تھے جس نے قبیلہ "بنی مصلط" کی زکوٰۃ میں کٹنے کے وقت ان کے اسبہ کے خلاف قیام کرنے کا الزام لگایا تھا اور خدا نے سورہ جرات کی آیت (یا ایہا الذین امنوا ان جاءکم فاسق سبباً فنبیئنا) میں نے تیری تکذیب کی اور تجھے ناسق کہا ہے۔

بعض مفسرین نے یہاں اختلاف کیا ہے کہ آیہ "افمن کان مؤمناً کم من کان فاسقاً" اس گفتگو کے بعد نازل ہوئی ہے اور "ولید" و "بنی مصلط" کا واقعہ مدینہ میں رونما ہوا اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت ایک مصداقِ قرآنی کے قبیلہ میں سے ہے۔

لیکن ان بعض مفسرین کے قول کے مطابق جو اور پر والی آیت کو اور اس کے بعد والی دو آیات کو مدنی سمجھتے ہیں کوئی شکل باقی نہیں رہ جاتی اور کوئی مانع اور حرج نہیں ہے کہ یہ تین آیات اور پر والی گفتگو کے بعد نازل ہوئی ہوں۔

بہر حال نہ امیر المؤمنین حضرت علیؓ ابن ابی طالبؓ کے عین ایمان میں کوئی بحث و اختلاف ہے اور نہ ہی "ولید" کے فسق میں جن دونوں کی طرف قرآنی آیات میں اشارہ ہوا ہے۔

بعد والی آیت میں اس عدم مساوات اور برابر ہونے کو زیادہ وسیع شکل میں بیان کرتے ہوئے آیا ہے۔ باقی رہے وہ جو ایمان لے آئے اور عمل صالح انجام دیا، ان کے لیے بہشت جاوداں کے باغات ہوں گے۔ (امت الذین امنوا وعملوا الصالحات فلہم جنات

لہ عقبہ (بروزن عقبہ)۔

لے اسی روایت کو مرحوم "طبرسی" نے مجمع البیان میں اور "قرطبی" نے اپنی تفسیر میں اور فاضل "برسوی" نے روح البیان میں نقل کیا ہے۔ قابل توجہ یہ کہ کتاب "الغابہ فی معرفۃ الصغیر" میں ہے کہ تفسیر قرآن سے آگاہ افراد کے درمیان اختلاف نہیں ہے کہ آیت ان جاہک فاسق سبباً ولید بن عقبہ کے بارے میں قبیلہ بنی مصلط کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے۔

المعاویہ)۔

اس کے بعد مزید کتاب ہے کہ بیچناٹ ماوی ان کے انجام شدہ اعمال کے بدلے میں (منزلًا بما کانوا یعملون) خدا کی ان کے لیے مہمانی کا ذریعہ ہیں۔

"منزل" کی تعبیر جو ایسی عموماً چیز کے لیے بولی جاتی ہے جو مہمان کی خاطر تواضع کے لیے آمادہ کرتے ہیں اور یہ اس بات کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ نو مین کی جنت میں ہمیشہ مہمانوں کی طرح خاطر تواضع کی جاتی رہے گی۔ جبکہ دوزخی جیسا کہ بعد والی آیت میں آئے گا قیدیوں کی طرح ہیں۔ جس وقت باہر نکلنے کی خواہش کریں گے تو انہیں پٹا دیا جائے گا۔

اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ سورہ کتب کی آیہ ۱۰۲ میں اس طرف آیا ہے (انا عندنا جہنم لکافرنین منزلہ) ہم نے جہنم کو کافروں کی خاطر تواضع کے لیے آمادہ کیا ہے۔ حقیقت میں افسوسناک عذاب الیمہ! انہیں دناک عذاب کی بشارت دینے کی قسم سے ہے جو کہ یہ ہے اس بات کے بجائے پذیرائی (خاطر تواضع) کے سزا عذاب ملے گا اور بشارت کی گہرا نہیں تہذیب کرتا ہے۔

بعض کا نظر یہ ہے کہ "منزل" دو پہلی چیز ہے کہ جس سے سننے وار ہونے والے مہمان کی خاطر تواضع کی جاتی ہے (ہمارے زمانے میں وہی چائے اور شہریت) اس بنا پر یہ امر اس کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ جنات ماوی اپنی تمام نعمت برکات کے ساتھ ان خدائی مہمانوں کی پذیرائی کا پھلا مرطلہ ہے۔ اور ان نعمت کے بعد ایسے برکات ہیں کہ جنہیں خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہے۔

"لہم جنات" کی تعبیر ہو سکتا ہے کہ اس نکتہ کی طرف اشارہ ہو کہ خدا جنت کے باغات ماریہ انہیں نہیں دیتا، بلکہ ہمیشہ کے لیے ان کی ملکیت میں دے دے گا۔ اس طرح سے کہ کبھی بھی ان نعمتوں کا زوال ان کے فکری سکون کو منتشر نہیں کرے گا۔

اور بعد والی آیت میں ان کے نقطہ مقابل کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے "لیکن وہ لوگ جو ناسق ہو گئے ہیں اور اپنے پروردگار کی اطاعت سے نکل گئے ہیں، ان کے لیے ہمیشہ رہنے کی جگہ جہنم کی آگ ہے" (واما الذین فسقوا فلہم اذہا لہم النار)۔

وہ ہمیشہ کے لیے اس وحشت ناک جگہ میں مقید اور محسوس ہیں۔ اس طرح سے کہ "جس وقت اس سے نکلنا چاہیں گے، انہیں واپس لٹا دیا جائے گا" (کلما اراد ان یتخرجوا منها اعمید وافیہا)۔

اور انہیں کہا جائے گا کہ چکھو تم اس کے عذاب کو جس کا ہمیشہ انکار کیا کرتے تھے؛ (وقیل لہم ذوقوا عذاب النار الذی کفرتہم بہ تکذبون)۔

دوبارہ ہم یہاں دیکھ رہے ہیں کہ عذاب الہی "کفر و تکذیب" کے مقابلہ میں آیا ہے اور اس کا ثواب دوزخ "عمل" کے مقابلہ

لے ماوی مادہ "اوی" (بروزن قوی) سے ایک چیز کے دوسرے چیز سے انضمام دل جانے کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد کان و سکون اور مہاش گاہ کے لیے بولا گیا ہے۔

میں ہے۔

جو اس طرف اشارہ ہے کہ تنہا "ایمان" ہی کافی نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ وہ اس کے لیے سبب بھی بنے۔ لیکن کفر ایسا عذاب کے لیے کافی ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ عمل نہ بھی ہو۔

ایک نکتہ

عابد شب زندہ دار: (تتجافی جنودہم عن المضاجع) "رات کے وقت ان کے پہلو بستر سے دور ہوتے ہیں کے جملہ کی تفسیر میں روایات اسلامی میں دو تفسیری دارو ہوئی ہیں۔

ایک تفسیر نماز عشاء کی جو اس طرف اشارہ ہے کہ سچے مومنین نماز مغرب کے بعد اور عشاء سے پہلے بستروں پر نہیں بستے کہ کہیں انہیں نیند نہ آجائے اور ان کی نماز عشاء ہاتھ سے نکل نہ جائے کیونکہ اس زمانہ میں معمول تھا کہ رات کی ابتدا میں گویا استراحت کرتے تھے اور پھر گناہ نمازوں کے درمیان استقبالی حیاتی کے حکم کے مطابق نمازوں کو جدا گانہ پڑھنے اور ہر ایک کو ان کی فضیلت کے وقت میں بھلا سنے تھے۔ اور جس وقت نماز مغرب کے بعد اور وقت عشاء سے پہلے سو جاتے تو ممکن ہوتا کہ نماز عشاء کے لیے بیدار نہ ہوں۔

اس تفسیر کو ان جہاں "نہ" در مشورہ کے مطابق پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے اور "امالی" شیخ میں بھی "امام جعفر صادقؑ" سے منقول ہے۔

لیکن زیادہ تر روایات اور مفسرین کے کلمات میں نماز شب اور تہجد کے لیے بستر سے اٹھنے کی تفسیر آئی ہے۔ ایک روایت میں امام محمد باقرؑ سے اس طرح ہم چہتے ہیں کہ آپ نے اپنے ایک صحابہ سے فرمایا۔

"الا اخبرک بالاسلام اصلہ وضرعہ وذرورۃ سنامہ"

"کیا تجھے اسلام کی اصل وضرعہ اور بلند ترین چوٹی کا تعارف نہ کروں؟"

راوی نے عرض کیا کہ ہاں جاؤں ارشاد فرمائیے!

تو فرمایا۔

"اما اصلہ الصلوٰۃ وضرعہ الزکوٰۃ وذرورۃ سنامہ الجہاد"

"اس کی اصل نماز اس کی ضرعہ زکوٰۃ اور اس کی بلند چوٹی جہاد ہے۔"

پھر آپ نے مزید فرمایا اگر تم چاہو تو تمام ابواب خیر کا تم سے تعارف کرواؤں؟

راوی کہتا ہے میں آپ پر قربان جاؤں، ارشاد!

امام نے فرمایا:

الصوم جنة، والصدقة تذهب بالخطيئة، وقيام الرجل في جوف الليل بذكر الله، ثم قراء "تتجافی جنودہم عن المضاجع"

"روزہ جنہم کی آگ سے پھر اور ڈھال ہے، اور صدقہ گناہ کو مٹا دیتا ہے، اور انسان کا رات کی تاریکی میں اٹھنا اسے باوجود خدائیں ڈالتا ہے، پھر آپ نے "تتجافی جنودہم عن المضاجع" کی آیت تلاوت فرمائی: "لے"

تفسیر "مجمع البیان" میں "معاذ بن جبل" سے یوں نقل ہوا ہے کہ میں جنگ "بوک" میں رسول خدا کی خدمت میں حاضر تھا۔ گرمی نے سب کو پریشان کر رکھا تھا اور ہر شخص کسی نہ کسی کو نہ میں پناہ لینے ہوئے تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ پیغمبرؐ سے زیادہ میرے قریب میں۔ میں آپ کی خدمت میں گیا اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے کوئی ایسا عمل بتائیے جو مجھے جنت میں لے جائے اور جہنم کی آگ سے دور رکھے۔

فرمایا تو نے بہت بڑا سوال کیا ہے۔ لیکن اس کا جواب ایسے شخص کے لیے مشکل نہیں، جس پر خدا نے آسان کیا ہو۔ پھر آپ نے مزید فرمایا:

"تعبد الله ولا تشرك به شيئاً وتقيم الصلوة المكتوبة وتؤدى الزكوة المفروضة وتصوم شهر رمضان"

"خدا کی پرستش کرو اور کسی چیز کو اس کا شریک قرار نہ دو، واجب نمازوں کو بجالاؤ، واجب زکوٰۃ جو محتاجوں کا حق ہے ادا کرو اور ماہ رمضان کے روزے رکھو۔"

اس کے بعد آپ نے فرمایا اگرچہ تو خیرات کے دروازوں کی جلی تمہیں خبر دوں؟ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ضرور فرمائیے! فرمایا:

"الصوم جنة من النار والصدقة تكفر بالخطيئة وقيام الرجل في جوف الليل يبتغى وجهه الله شقراً هذه الالسية تتجافی جنودہم عن المضاجع"

روزہ جنہم کی آگ سے ڈھال اور راہ خدائیں خرچ کرنا گناہوں کا کفارہ اور رات کی تاریکی میں انسان کا خدا کی خوشنودی کے لیے قیام۔ پھر آپ نے "تتجافی جنودہم عن المضاجع" والی آیت کی تلاوت کی۔ "لے"

اگرچہ کوئی مانع نہیں کہ آیت ایک وسیع منہج رکھتی ہو کہ نماز عشاء کے لیے رات کے ابتدائی حصے میں بیدار

۱۔ "اموال کافی" جلد ۲ باب "دعاء الاسلام" حدیث ۵۱ ص ۱۰۱ مدک گذشتہ۔

۲۔ مجمع البیان ذیل آیات زیر بحث و تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۲۴۹۔

۳۔ "در مشورہ" اور "امالی شیخ" بحوالہ "تفسیر المیزان" جلد ۱۶ ص ۲۸۳۔

رہنے کو بھی شامل ہو اور وقت سحر نماز شب کے لیے اٹھنے کو بھی، لیکن اگر - تنجانی کے مفہوم پر زیادہ غور کیا جائے تو دوسرا معنی ذہن میں بہتر منسلک ہوتا ہے۔ کیونکہ اس جگہ کہ ظہور یہ ہے کہ پہلے ان کے پہلو بہتر میں آرام و سکون میں ہوتے ہیں۔ پھر اس سے ٹپا ہو جاتے ہیں اور یہ رات کے آخر حصہ میں نماز شب کی ادائیگی کے لیے قیام کرنے کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔ اس بنا پر پہلی روایات مفہوم کو وسعت دینے اور خصوصیت کو ختم کرنے کے قیام سے ہیں۔

اگرچہ اس بابرکت نماز کی اہمیت کے بارے میں وہی اور پر دالی چند روایات ہی کافی نظر آتی ہیں۔ لیکن یہ بحث قابل ذکر ہے کہ اسلامی روایات میں جس قدر اس عبادت کو اہمیت دی گئی ہے، کسی اور عبادت کے بارے میں بہت ہی کم گفتگو ہوئی ہے۔

حق تعالیٰ کے پیچھے دوسری راہ فضیلت کے راہی اس لیے بے ریا عبادت کو ہمیشہ ہی سے بہت زیادہ اہمیت دیتے آ رہے ہیں جو دل کو نور اور جلا بخشتی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ اس بابرکت عبادت سے ہمیشہ فائدہ اٹھانے کی توفیق نہ رکھتے ہوں۔ لیکن کیا مانع ہے کہ بعض راتوں میں جب بھی یہ توفیق حاصل ہو، اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اس وقت جب خاموشی ہو چکے ہو اور ہر قسم کے کاہل ہونے سے بچنے کا غم غم غم میں ہوں اور ماحول حضور قلب اور خدا سے راز و نیاز کے لیے آمادہ ہو تو انھیں اور خاندان خدا کے دروازے پر جائیں اور دل کو دوست کے عشق کے نور سے روشن کریں۔ لہ

۲۱- وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُونَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝

۲۲- وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيٰتِ رَبِّهِ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ۗ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنتَقِمُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۱- ہم انہیں (اس دنیا کا) نزدیک عذاب (آخرت کے) بڑے عذاب سے پہلے چکھائیں گے۔ شاید کہ وہ پلٹ آئیں۔

۲۲- اس شخص سے بڑھ کر کون زیادہ ستم گربے، جسے اس کے پروردگار کی آیات کی یاد دہانی کرائی گئی ہو، لیکن وہ اس سے اعراض کرے، یقیناً ہم مجرمین سے انتقام لیں گے۔

تفسیر

ترجمہ اور اصلاحی سناریاں:

گناہگاروں اور ان کی دردناک سزاؤں کے بارے میں تو گذشتہ آیات میں بحث ہو چکی ہے۔ موجودہ آیات میں ان کے اسے میں خدا کے ایک منفی نطف کی طرف اشارہ ہے، جو دنیا میں غنیف اور بیدار کرنے والی سزاؤں کی صورت میں ہے۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ خدا ہرگز نہیں چاہتا کہ بندہ عذاب جاودانی میں گرفتار ہو۔ لہذا بندے کی نجات کے لیے اسے بیدار کرنے والے ہر قسم کے وسائل کو بروئے کار لاتا ہے۔

۱۰ نماز شب کی اہمیت اور اس کے جلال نے کا طریقہ جلد ۹ میں سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۱۹ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں

خدا اپنے پیغمبر پر بھیجتا ہے، آسانی کتابیں نازل کرتا ہے۔ نعمت دیتا ہے، مصیبت میں گرفتار کرتا ہے اور اگر ان میں سے کسی چیز سے فائدہ نہ اٹھائیں تو پھر اس قسم کے اشناس کا سوا کسے جہنم کی آگ کے کوئی اور انجام نہیں ہے۔
 فرماتا ہے: "ہم انہیں دنیا کا نزدیک عذاب آفرت کے عذاب سے پہلے پکھلائیں گے۔ شاید وہ بیدار ہو کر پلٹ آئیں۔"
 (ولنذیقنہم من العذاب الادنی دون العذاب الاکبر لعلہم يرجعون)۔
 یقیناً عذاب ادنیٰ ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو زیادہ تر ان احتمالات کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے جنہیں مفسرین بطور جدا گانہ بیان کیا ہے۔
 منجملہ ان کے اس سے مراد مصائب و درو اور رنج و غم ہیں۔

یا مکہ کا سات سالہ شدیدی قحط اور خشک سالی، جس میں مشرکین اس قدر گرفتار ہوئے کہ انہیں مجبوراً سردار لاشے کھانا پڑے یا وہ کاری خرابی جو ان کے پیکر پر جنگ "بدر" میں دار ہوئی۔
 اس قسم کے دوسرے امور۔

باقی راہہ جو بعض نے احتمال دیا ہے کہ مراد "عذاب قبر" یا "رجعت کا عذاب" ہے۔ وہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ لعلہم يرجعون "شاید وہ اپنے اعمال سے پلٹ آئیں" کے مجملہ کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

البتہ اس نکتہ کی طرف توجہ کرنا چاہیے کہ اس دنیا میں بھی مختلف عذاب ہیں جن کے نزول کے ذمہ توبہ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور وہ "عذاب استیصال" یعنی وہ عذاب جو سرکش اقوام کی نابودی کے لیے اس وقت نازل ہوتا ہے جب ان میں اصلاح کا کوئی وسیلہ کارگر ثابت نہیں ہوتا اور طبعاً اس قسم کا عذاب بھی آیت کے موضوع بحث سے خارج ہے۔

باقی رہا "عذاب اکبر" جو قیامت کے دن کا عذاب ہے تو وہ ہر سزا اور عذاب سے بہت بڑا اور زیادہ دردناک ہے۔
 اس بار بار سوال کو کیوں "ادنیٰ" (زیادہ نزدیک) "اکبر" (زیادہ بڑے) کے مقابل میں قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ یا تو "ادنیٰ" "بعث" (زیادہ دور) کے مقابل میں ہو یا "اعظم" "اکبر" کے مقابل میں قرار پاتا؟ اس میں بھی ایک نکتہ منظر ہے، جس کی طرف بعض مفسرین نے اشارہ کیا ہے اور وہ یہ کہ دنیاوی عذاب و اوصاف کا حامل ہونا ہے "چھوٹا ہونا" اور نزدیک ہونا اور تہید اور تشبیہ کے موقع پر نہایت نہیں ہوتا کہ اس کے چھوٹے پن کو مد نظر رکھا جائے بلکہ اس کے نزدیک ہونے کو دیکھا جائے گا۔

اور عذاب آفرت بھی دو اوصاف کا حامل ہوتا ہے "دور ہونا" اور "بڑا ہونا" اور اس کے بارے میں بھی مناسب یہ ہے کہ اس کے بڑے ہونے کو مد نظر رکھا جائے تاکہ دور ہونے کو خوب غور کیجیے۔

"لعلہم يرجعون" کے مجملہ میں "لعل" کی تعبیر جیسا کہ پہلے ہی ہم نے کہا ہے، اس بنا پر ہے کہ تشبیہ اور تلمیح کرنے والے عذاب بیداری کے لیے عفت تامہ نہیں ہیں بلکہ عفت کی چیز ہیں اور انہیں سازگار و آمادہ زمین کی ضرورت ہے جو اس شرط کے بغیر کسی تعبیر پر نہیں پہنچتے اور لفظ "لعل" اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

ضمناً اسی آیت سے مصائب و آلام اور رنج و بلاؤں کا ایک اہم فلسفہ واضح ہو جاتا ہے جو توحید، خدا شناسی اور عدل پر دلکشاہی کی مباحث میں زیادہ سوال انگیز مسائل میں سے ہے۔

نصرف یہاں بلکہ قرآن کی دوسری آیات میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ موجود ہے منجملہ ان کے سورہ اعراف کی آیت ۹۲ میں ہم پڑھتے ہیں:

"وَسَارِسْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ سَبْغِ الْاِخْذْنَا اَهْلَهَا بِالْبِاسِ وَالْمُصْرَاةِ
 لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ"

"ہم نے کسی شہر اور دیار میں کوئی پیغمبر نہیں بھیجا۔ مگر یہ کہ وہاں کے لوگوں کو مشکلات اور نقص و زیان میں مبتلا کیا ہے تاکہ وہ بیدار ہوں اور خدا کی بارگاہ کی طرف رجوع کریں"

اور چونکہ جس وقت بیدار کرنے والے وسائل میں سے کوئی بھی وسیلہ سبکی کہ نذاتی عذاب بھی سود مند ثابت نہیں ہوتا، تو پھر اس گروہ کے ظالم ترین لوگوں سے پروردگار کے انتقام کے علاوہ کوئی راہ باقی نہیں رہ جاتی۔

بعد وال آیت میں اس طرح فرماتا ہے: "کون سا شخص زیادہ ستم گر ہے اس شخص سے، جسے اس کے پروردگار کی آیات یاد دلائی جائیں اور وہ ان سے اعراض اور زکرائی کرے،" (ومن اظلم ممن ذكر بايات ربه ثم اعرض عنها)۔

"یقیناً" ہم ان بے ایمان مجرموں سے ضرور انتقام لیں گے، (انا من الجحيم من منتقون)۔

حقیقت میں یہ ایسے لوگ ہیں جن پر نہ خدائی نعتیں موثر ہیں اور نہ اس کا عذاب اور خبردار کرنے والی بلائیں اور مصائب، اسی بنا پر ان سے زیادہ ظالم کوئی شخص نہیں ہے۔ لہذا اگر ان سے انتقام نہ لیا جائے تو پھر کس سے لیا جائے؟ ظاہر ہے کہ گذشتہ آیات کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہاں "مجرمین" سے مراد مبداء یا معاد کے منکر اور بے ایمان گناہگار ہیں۔

آیات قرآن میں بار بار ایک گروہ کا "اظلم" سب سے بڑھ کر ظالم افراد کے عنوان سے تعارف کرایا گیا ہے اگرچہ اس کی مختلف تعبیریں ہیں۔ لیکن واقع میں سب کی سب ایک اصل کی طرف لوٹتی ہیں، اور وہ جسے کفر و مشرک اور بے ایمانی کی جسٹراس بنا پر "ظالم ترین" کا مفہوم جو اصطلاح کے مطابق سب سے بڑھ کر بری صفت ہے، وہ محدود نہیں ہوتی۔

اد پر دالی آیت میں "سخت" کی تعبیر جو عام طور پر فاسد کو بیان کرنے کے لیے ہے، ہو سکتا ہے اس طرف اشارہ ہو کہ اس قسم کے افراد کو سوچنے سمجھنے کے لیے کافی موقع اور سہولت دی جاتی ہے۔ کبھی بھی ابتدائی مخالفتیں انتقام الہی کا سبب نہیں بنتیں۔ لیکن ضروری فرصت اور سہولت کے غم ہونے کے بعد خدا کے انتقام کے مستحق ہوں گے۔

ضمناً توجہ کرنا چاہیے کہ "انتقام" کی تعبیر عربی لغت کے لحاظ سے "سزا دینے" کے معنی میں ہے۔ اگرچہ "دلی تشفی" (نزدنی تشفی کا بھگانا) اس لفظ کے مفہوم میں روز مرہ کے استعمال کے لحاظ سے اس میں پچھا بڑا ہے لیکن اگر اس کے اصلی اور لغوی معنی کو دیکھا جائے تو اس میں موجود نہیں ہے۔

اس لیے قرآن مجید میں یہ تعبیر خداوند عالم کے بارے میں بار بار استعمال ہوتی ہے۔ حالانکہ وہ اس سب کے منافقین سے برتر اور بالاتر ہے۔ وہ صرف حکمت و مصلحت کی بناء پر کام کرتا ہے۔

۲۳- وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَلَا تَكُنْ فِي مِرْيَةٍ
مَنْ لِقَائِهِ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ ۚ
۲۴- وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أُمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا
وَكَانُوا بِالْآيَاتِنَا يُوقِنُونَ ۝
۲۵- إِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُم يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا
كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝

ترجمہ

۲۳- ہم نے موسیٰ کو آسمانی کتاب دی اور تجھے شک نہیں ہونا چاہیے کہ
اس نے آیاتِ الہی کو حاصل کر لیا۔ اور ہم نے اسے بنی اسرائیل کے لیے
ہدایت کا ذریعہ قرار دیا۔

۲۴- اور ان میں سے ہم نے ائمہ (اور پیشوا) منتخب کیے جو ہمارے حکم سے
(لوگوں کی) ہدایت کرتے تھے۔ اس بناء پر کہ انھوں نے صبر کیا اور ہماری
آیات پر یقین رکھتے تھے۔

۲۵- یقیناً تمھارا پروردگار ان کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا، جس چیز میں
وہ اختلاف کرتے تھے۔ (اور ہر شخص کو اس کے اعمال کی سزا
دے گا)۔

تفسیر

امامت کا اہم ترین سرمایہ؛

زیر بحث آیات میں حضرت "موسیٰ" اور "بنی اسرائیل" کی داستان کی طرف ایک مختصر سا اشارہ ہے تاکہ بخیر اسلام اور مومنین کی تسلی ہو اور ان کی دلداری کی جائے اور مشرکین کی تکذیب، انکار اور روڑے اٹکانے کے مقابلہ میں جن کی طرف گذشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے، صبر و شکیبائی اور استقامت اور پابندی کی دعوت اور مومنین کے ایسے بشارت بھی ہو کہ آخر کار وہ اس کا فرادہ ہوتے ہیں، صبر و شکیبائی اور استقامت اور پابندی حاصل کریں گے، جس طرح کہ بنی اسرائیل اپنے دشمنوں پر کامیاب ہوئے اور دوسرے زمین کے پیشوا اور امام و سرپرست بن گئے۔

اور چونکہ موسیٰ ایک عظیم پیغمبر ہیں کہ جن پر عبودیت ہی ایمان رکھتے ہیں اور عیسائی بھی تو اس لحاظ سے ہو سکتا ہے کہ وہ قرآن و اسلام کی طرف اہل کتاب کی حرکت کا سبب بنیں۔

پہلے کتاب ہے "ہم نے موسیٰ کو کتاب دی" (ولقد اتینا موسیٰ الكتاب)۔

"اس بنا پر آپ اپنے دل میں کسی قسم کے شک و شبہ و تردد کو نہ آنے دیں کہ موسیٰ نے آیات الہی کو حاصل کر لیا؟

فلا تکتن فی میریة من لقاہ بہ۔"

"ہم نے موسیٰ کی آسمانی کتاب تواریح کو بنی اسرائیل کی ہدایت کا ذریعہ قرار دیا؟" (وجعلناہ ہدیٰ لقبی اسرائیل۔)

"من لقاہ بہ" کی ضمیر کس چیز کی طرف لوٹتی ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان بہت کچھ اختلاف ہے اور اس سلسلے میں سات یا اس سے زیادہ احتمال دینے گئے ہیں۔

لیکن جو احتمال سب سے زیادہ نزدیک نظر آتا ہے، یہ ہے کہ کتاب (یعنی تورات) کی طرف لوٹتی ہے اور مفعول کا پہلو رکھتی ہے اور اس کا فاعل موسیٰ ہے۔

اس بنا پر سارے جملہ کا معنی یوں ہوگا "تجھے شک نہیں ہونا چاہیے کہ موسیٰ علیہ السلام کتاب آسمانی کی لقاؤ کو پہنچا، اور جو چیز خدا کی ہادگہ سے ان پر لقا ہوئی تھی اسے حاصل کر لیا۔"

اس تفسیر کا ناطق گواہ یہ ہے کہ اور پر والی آیت میں تین جملے وارد ہوئے ہیں پہلا اور آخری جملہ یقیناً تورات کے متعلق گفتگو کرتا ہے۔ اس بنا پر سب یہی ہے کہ درمیانی جملہ بھی اس معنی کو بیان کرے۔ تاکہ قیامت یا قرآن مجید کی بات کرے کہ جو کہ اس صورت میں جملہ معترضہ ہوگا اور ہم جانتے ہیں کہ جملہ معترضہ ظاہر سے اور صریح تک اس کی ضرورت نہ ہو اس کی طرف نہیں جانا چاہیے۔

تنبہا سوال جو اس تفسیر میں باقی رہ جاتا ہے وہ لفظ "لقاہ" کے آسمانی کتاب کے بارے میں استعمال کا مسئلہ ہے، کیونکہ قرآن میں تمام طور پر یہ لفظ "اللہ" یا "رب" یا "آخرت" وغیرہ کی طرف اضافت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے جو قیامت کی طرف اشارہ ہے۔

اور اسی بنا پر بعض مفسرین اس احتمال کو ترجیح دیتے ہیں کہ اور پر والی آیت نے پہلے تو موسیٰ پر تورات کے نزول کو بیان کیا ہے، پھر پیغمبر اسلام کو حکم دیا ہے کہ "لقاہ اللہ" اور مسئلہ معاد میں شک و شبہ نہ کریں اور پھر از سر نو سب تواریح کی طرف لوٹا ہے۔

لیکن یقین جانیے کہ اس صورت میں اس آیت کے جملوں کے درمیان مناسبت بالکل ختم ہو جائے گی اور ان کا باہمی رابطہ اور تعلق بالکل ختم ہو جائے گا۔

البتہ توجہ رکھنا چاہیے کہ "لقاہ" کا کلمہ اگرچہ قرآن میں کتب آسمانی کو حاصل کرنے کے معنی میں استعمال نہیں ہوا، لیکن "لقاہ" اور "تلقی" بارہا اس معنی میں استعمال ہوئے ہیں جیسا کہ سورہ قمر کی آیت ۲۵ میں ہم پڑھتے ہیں "الغی الذکر علیہ من بیننا" کیا ہم سب کے درمیان ہیں سے قرآن مجید پر القاء ہوا ہے؟

اور ایمان اور مکہ سبا کی داستان میں ہم پڑھتے ہیں کہ جس وقت سیماں کا خط مکہ سبا کو ملا تو اس نے کہا:

"ان الغی المکتتاب کریم"

"گرامی قدر خط مجھ پر القاء ہوا ہے۔" (مثل - ۲۹)

اور اسی سورہ کی آیت ۶ میں قرآن مجید کے بارے میں ہے:

"وانت لتلقى القرآن من لدن حکیم علیہ"

"تو قرآن کو خدا نے حکیم و عظیم سے تلقی کرتا ہے۔" (مثل - ۱۶)

اس بنا پر فعل "لقاہ" و "تلقى" بارہا اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔

یہاں تک کہ خود فعل "لقاہ" انسان کے نام و اعمال کے بارے میں قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔ سورہ اسراء کی آیت ۱۳ میں ہے،

"ونخرج لہ یوم القیامۃ کتابا یلقاہ منشورا" (اسراء ۱۳)

"قیامت کے دن اس انسان کے لیے ہم کتاب باہر نکالیں گے جسے کھلا ہوا دیکھے گا۔"

مجموعی طور پر جو کچھ ہم نے کہا ہے، اس سے اس تفسیر کی ترجیح اور پر والی آیت میں دیکھے گئے باقی سارے احتمال پر واضح ہو جاتی ہے۔ لہ

مفسرین کی ایک جماعت نے "لقاہ" کی ضمیر کا مرجع موسیٰ علیہ السلام کو سمجھا ہے۔ تو اس قول کی سبب اور آیت کا معنی یوں ہوگا "اے محمد! تمہیں شک نہیں ہونا چاہیے کہ تم موسیٰ سے ملاقات کر دو گے" اور اس کو انہوں نے شب و صبح کی طرح کی ملاقات (یعنی عاشق و معشوقہ کے ملاقات) سے منسوب کیا ہے۔

لیکن ہر صورت میں اس بحث کی طرف توجہ ضروری ہے کہ پیغمبر اس قسم کے مسائل میں کسی قسم کا ٹھک و شبہ نہیں رکھتے تھے بلکہ اس قسم کی تعبیریں عموماً مقصد کی تائید اور دوسروں کے لیے فائدہ دہنی تھیں۔

بعد والی آیت میں ان اعزازات کی طرف اشارہ ہے جو بنی اسرائیل کو استقامت و ایمان کے زیر سایہ نصیب ہوئے تاکہ دوسروں کے لیے درس ہو فرماتا ہے: "اور ان میں سے ہم نے امام اور پیشوا قرار دیئے کہ جنہوں نے ہمارے فرمان اور حکم سے خلق خدا کی ہدایت کے امور کو اپنے ذمہ لیا کیونکہ انہوں نے صبر کا مظاہرہ کیا اور ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے" (وجعلنا منہم ائمة یہدوون بامرونا لخاص صبروا وکانوا بایاتنا یوقنون)۔

یہاں پر کامیابی کا راز اور پیشوائی اور امامت کی شرط دو چیزوں کو بیان کرتا ہے۔ ایک آیات الہی پر ایمان و یقین اور دوسری صبر و استقامت۔

یہ چیزیں بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام امتوں اور ماضی حال و مستقبل کے مسلمانوں کے لیے درس ہے کہ وہ اپنے یقین کی بنیادوں کو محکم کریں اور ان مشکلات سے غور زدہ نہ ہوں جو خط توحید بار آور کرنے کے راستے میں پیش آتی ہیں۔ صبر و استقامت کو اختیار کریں تاکہ تاریخ عالم میں مخلوق کے امام اور امتوں کے رہبر اور رہنما قرار پائیں۔

"یہدوون" ہدایت کرتے ہیں، کی تعبیر فعل مضارع کی شکل میں اور اسی طرح "یوقنون" (یقین رکھتے ہیں) بھی فعل مضارع کی شکل میں ہے۔

گذشتہ صفحہ کا باقی مابقیہ، یا قیامت کے دن کی طمانت کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ لیکن یہی مفہوم جملہ کے ساتھ مناسب نظر نہیں آتا، بعض دوسروں نے کہا ہے کہ

ضمیر کا مرجع "الکتاب" ہے اور اس سے مراد قرآن ہے، تو اس صورت میں آیت کا ترجمہ یوں ہوگا:

"اے پیغمبر! اس سلسلہ میں کہ قرآن وہی الہی ہے، ٹھک و شبہ نہ کو اپنے اندر راہ نہ دو۔"

یہ معنی اگرچہ اس سورہ کی ابتدائی آیات کے ساتھ مناسب ہے لیکن دوسرے جملوں کے ساتھ جو خود اس آیت میں ہیں، چندان مناسب نہیں ہے۔ علاوہ ازیں زیر بحث آیت میں "کتاب" قرأت کے معنی میں ہے اور ضمیر کی سوسے قرآن بازگشت اس سے ہائیکلی نہیں ہو سکتی اور اس معنی کی یہ توجیہ کہ اس سے مراد مطلق آسمانی کتاب ہے، پھر بھی اس کے خلاف ظاہر ہونے میں کمی نہیں کرتی۔

بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ

"لقاب" کی تعبیر خدا کی طرف موعی ہے اور یہ جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ معاد اور قیامت کے معاملہ میں کسی قسم کا ٹھک و شبہ نہ کرو۔ یہ معنی بھی اگرچہ گذشتہ آیات کے نامناسب نہیں ہے لیکن خود زیر بحث آیت کے مفسرین کے ساتھ تقریباً ہر قسم کی مناسبت نہیں رکھتا۔

اور یہاں سے واضح ہو جاتا ہے جو بعض تفاسیر نے آیت کو "توسی" اور پیغمبر اسلام کے پرگرام کے دو خطوط کے اہم و کی طرف اشارہ سمجھا ہے نیز ایک باذن طلب قرآن کے الفاظ کے واقعہ مفہوم کے ساتھ سازگار نہیں ہے ہونا پر واضح ترین تعبیر وہی ہے جو ہم نے پیش کی ہے۔

مضارع کی صورت میں ان کی تمام عمر میں ان دو اوصاف کے دوام کی ذیل ہے، کیونکہ ہر ہی کا مسئلہ ایک لمحہ کے لیے بھی مشکلات سے خالی نہیں ہے اور ہر ہر قدم پر رہبر اور لوگوں کے پیشوا کی ذات نئی مشکل سے دوچار ہوتی رہتی ہے۔ لہذا اسے چاہیے کہ یقین اور دائمی استقامت کی قوت کے ساتھ ان کا مقابلہ کرے اور اس راہی کے خط ہدایت کو دوام عطا کرے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ سند ہدایت کو "امر الہی" سے مقید کرتے ہوئے فرماتا ہے "یہدوون بامرونا" اور امر ہدایت میں ہم یہ ہے کہ اس کا سرچشمہ خدا کا فرمان ہونا کہ لوگوں کا اور نہ ہی اپنی خواہش اور وہی تنہا اور نہ ہی ہر کہ دوسری تقلید ہو۔

امام جعفر صادقؑ اپنی ایک حدیث میں قرآن مجید کے معانی سے استفادہ کرتے ہوئے "انہم اور پیشواؤں کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اور زمانے میں ایک وہ امام جو اس خدا سے ناکہ لوگوں کے حکم سے ہدایت اپنے ذمہ لیتے ہیں اور اس خدا کو اپنے امر پر مقدم شمار کرتے ہیں۔ اور اس کے حکم کو اپنے حکم سے برتر قرار دیتے ہیں۔

اور دوسرے وہ امام جو ہمہ تن کی طرف دعوت دیتے ہیں اپنے حکم کو فرمان تہی پر مقدم کرتے ہیں اور اپنے فرمان کو حکم الہی سے پہلے قرار دیتے ہیں اور اپنی خواہشات نفسانی کے مطابق اور کتاب اللہ کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ لہ

یہاں امر سے مراد امر تشریحی (خدا کے شرعی احکام) ہیں، یا امر تکوینی (عالم افزائش میں خدا کا حکم) ہے۔ ظاہر آیت میں تو وہی پہلا معنی ہے اور روایات و مفسرین کی تعبیر میں ہی اسی معنی کی طرف توجہ کرتی ہیں۔

لیکن بعض عظیم مفسر اسے "امر تکوینی" کے معنی میں بھی سمجھتے ہیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ آیات اور روایات میں ہدایت و معنی کے لیے آئی ہے۔ "ارائہ طریق" (راست دکھانا) "واہیال الی المطلوب" (مقصد تک پہنچانا)۔

خدا کے مقرر کردہ پیشواؤں کی ہدایت بھی دو طریقوں سے صورت پذیر ہوتی ہے۔ کبھی تو صرف امر وہی پر قناعت کرتے ہیں اور کبھی لائق اور آمادہ دلوں میں باطنی تاثیر کے ذریعہ انہیں تربیت کے مقاصد اور روحانی درجات تک پہنچاتے ہیں۔

لفظ "امر" بعض قرآنی آیات میں "امر تکوینی" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً:

"استعوا امرہ اذا اراد شیئان یقول لہ کئن فیکون" (سورہ یس آیت ۸۲)

"جس وقت کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا فرمان صرف یہ ہوتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے"

زیر بحث آیت میں "یہدوون بامرونا" کا جملہ بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی وہ ایسے امام اور پیشوا تھے جو

لہ ان الائمة فی کتاب اللہ عز ووجل امامان، قال اللہ تبارک و تعالی وجعلنا ائمة یهدوون بامرونا لا بامر الناس یعدمون امر اللہ قبل امرہم وحکم اللہ قبل حکمہم قال وجعلنا ائمة یدعون الی التار یدعمون امرہم قبل امر اللہ وحکمہم قبل حکم اللہ و یاخذون باھوا شہم خلاف ما فی کتاب اللہ عز ووجل۔ (کافی جلد اول ص ۱۰۰) باب ان الائمة فی کتاب اللہ امامان

پروردگار کی قدرت سے آمادہ نفوس میں اثر کرتے تھے اور انہیں تربیت کر کے انسانیت کے اعلیٰ دار فخر مقاصد کی طرف لے جاتے ہیں۔

یہ معنی فی لغت ایک قابل توجہ معنی ہے جو امر امامت اور فروغ ہدایت میں سے ایک ہے۔ لیکن "یہدوں بامرنا" کے جملہ کو اس معنی میں مختصر سمجھنا ظاہر آیت کے ساتھ موافق نہیں ہے۔ البتہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ ہم لفظ "امر" کو اس جملہ میں اس لفظ کے وسیع معنی میں لیں جو "اسرئیل" اور "اسرائیلی" دونوں کو شامل ہو اور ہدایت کے دونوں معنی آیت میں جمع ہو جائیں۔ یہ معنی بعض ان احادیث کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہے کہ جو آیت کی تفسیر میں ہم تک پہنچی ہیں۔

ہر حالت میں امام اور پیشوا کا اس مقام تک پہنچنا صرف یقین و استقامت کے پر توہین ہی امکان پذیر ہے۔ البتہ جو بحث یہاں باقی رہ جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ آیا نبی اسرائیل میں ائمہ اور پیشواؤں سے مراد انبیا، کرام ہیں جو اس قوم میں موجود تھے یا وہ علماء و دانش مند ہیں جو حکم الہی سے لوگوں کو نیکوں کی ہدایت کرتے تھے؟

آیت اس بارے میں خاموش ہے۔ وہ صرف اس قدر کہتی ہے کہ ہم نے ان میں ایک جماعت کو امام اور ہادی قرار دیا ہے۔ لیکن "جعلنا اہم" نے قرار دیا، کے جملہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے زیادہ تر یہی نظر آتا ہے کہ مراد پیغمبر ہیں جو خدا کی طرف سے اس مقام کے لیے مسموب تھے۔

اور چونکہ نبی اسرائیل نے دوسری امتوں کی طرح ان پیغمبروں اور پیشواؤں کے بعد اختلاف شروع کر دیئے، مختلف راستے طے کئے اور لوگوں کے درمیان فرقہ بندی کو مروی۔ لہذا آخری محل بحث آیت میں تعدید امیر لہجہ میں کہتا ہے "تبار پروردگار ان کے درمیان نبی کے دن ان اختلافات کے بارے میں جو ان کے درمیان تھے، فیصلہ کرے گا۔" اور ہر شخص کو اس کے کیفر کردار تک پہنچائے گا۔

(ان ربنا موبدعل بنہم یوم القیامۃ فیما كانوا یمتدعون)۔

ہمیشہ حق کو خواہشات نفسانی کے ساتھ مخلو کر دینے سے ہی اختلاف پیدا ہوتے ہیں۔ لہذا قیامت کے دن تمام خواہشات اور ہوا اور ہوس کا فورہ ہو جائیں گی اور حق اپنی اصلی شکل و صورت میں ظہور پزیر ہوگا۔ یہ وہ مقام ہے، جہاں خدا اپنے فرمان کے ذریعہ تمام اختلافات کو ختم کر دے گا۔ یہ معاد و قیامت کا ایک اور فلسفہ ہے۔ (مور کھینچے گا)

ایک نکتہ:

ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ زیر بحث آیات میں پیشواؤں اور ائمہ کے لیے دو شرائط ذکر ہوئی ہیں، پہلی صبر و استقامت اور دوسری آیات الہی پر ایمان و یقین۔

صبر و استقامت کی بہت زیادہ شائیں ہیں۔ یہ کبھی تو ان مصائب کے مقابلہ میں ہوتا ہے جو خود انسان کو درپیش ہوتے ہیں۔

کبھی ان رنج و فہم اور تکالیف کے مقابلہ میں ہوتا ہے جو انسان کے دوست اور احباب اس کو دیتے ہیں۔ اور کبھی اس کے مقدس مقامات کے بارے میں طعن و تشنیع کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ کبھی کچھ لوگوں کو کج اندیش لوگوں کی طرف سے تکلیف پہنچتی ہے۔

کبھی بدخواہوں کی طرف سے۔

کبھی جاہلوں اور نادانوں کی طرف سے۔

اور کبھی آگاہ اور سمجھدار بدخواہوں کی طرف سے!

غلامدیر کہ ایک آگاہ اور دور اندیش رہبر کو ان تمام مشکلات وغیرہ کے مقابلہ میں استقامت و خستہ یار کرنا چاہیے۔ کبھی بھی میدان توادرت سے نہ ہٹے، بسے تابی اور جزع اور فرح نہ کرے، زمام خستہ یار ہاتھ سے نہ جانے دے، مایوس نہ ہو، نظر آرا اور پیشوا کی کا مظاہرہ نہ کرے تاکہ وہ اپنے عظیم مقصد تک پہنچ جائے۔

اس سلسلہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک جانت حدیث نقل ہوئی ہے جس کا ذکر نامزدی معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے اپنے ایک صحابی سے ارشاد فرمایا:

"جو شخص صبر کرتا ہے تو اس کا یہ سیر تھوڑی ہی مدت کے لیے ہوتا ہے اس کے بعد کامیابی ہوتی ہے اور جو شخص بے تابی کرتا ہے۔ تو اس کی بے تابی بھی مختصر مدت کے لیے ہوتی ہے (آخر کار شکست ہے)۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا:

"تم پر لازم ہے کہ تمام امور میں صبر و شکیبائی کا مظاہرہ کرو، کیونکہ خدا نے بزرگ و برتر سے حضرت محمد کو موبوت کیا اور انہیں صبر و مدارت کا حکم دیا۔"

اور فرمایا،

"جو کچھ وہ کہتے ہیں اس کے مقابلہ میں صبر اختیار کرو اور ضرورت کی صورت میں ان سے الگ ہو جاؤ۔ لیکن اس حد تک بھی جدائی ٹھیک نہیں کہ وہ حق کی طرف دعوت دینے سے ہی روک دے۔"

نیسر فرمایا،

"نیکیوں کا ہتھیار لے کر برا بھلاؤں کے مقابلہ میں کھڑے ہو جاؤ۔ کیونکہ اس موقع پر جو لوگ تمہارے ساتھ عداوت اور دشمنی رکھتے ہیں، جنہیں اور غمناک دوست کی مانند ہو جائیں اور اس مقام پر سوائے صابرین اور ان لوگوں کے اور کوئی نہیں پہنچ سکتا جن کے پاس ایمان ایک عظیم حصہ ہے۔"

پھر فرمایا،

"پیغمبر نے صبر و شکیبائی خستہ یار کی، یہاں تک کہ لوگوں نے ان پر انواع و اقسام کی تہمت کے تہتیر پلائے اور انہیں جنون اور سحر کہا، شاعر کہہ کہ پکارا اور انہیں دعوت نبوت میں جھٹلایا، ان کی باتیں سن کر پیغمبر تنگ آگئے، خدا نے یہ ارشاد ان پر نازل کیا، "ہم جانتے ہیں کہ تمہارا سینہ ان کی باتوں سے تنگ ہو جاتا ہے لیکن تم اپنے

پروردگار کی تسبیح و حمد بجلاؤ اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جاؤ۔ (کیونکہ یہی عبادتیں تمہیں آرام و سکون بخشیں گی۔
دوبارہ انھوں نے آپ کی تعزیر کی اور آپ کو متہم کیا تو آنجناب علیؓ نے جوئے تو خدا نے ان پر یہ ارشاد
نازل کیا کہ ہم جانتے ہیں کہ ان کی باتیں آپ کو ٹھیک کرتی ہیں، لیکن آپ جانیں کہ ان کا مقصد آپ کو ٹھیک کرنا نہیں بلکہ
یہ ظالم تو آیات خدا کی تعزیر کرتے ہیں۔ آپ سے پہلے جو پیغمبر آئے تھے وہ بھی ان کی تعزیر کی آماجگاہ تھے لیکن
انھوں نے صبر کیا۔ انہیں آزاد دیا گیا۔ مگر انھوں نے صبر کیا، یہاں تک کہ ان کے پاس جاری مدد و نصرت آج نہیں۔
پیغمبر نے بھی صبر کیا۔ یہاں تک کہ وہ حد سے زور گئے اور خدا کا نام بھی بڑے الفاظ کے ساتھ زبان پر جاری کیا
اور تعزیر کی۔

پیغمبر اکرمؐ نے عرض کیا: خداوند! میں نے اپنے بارے میں اپنے خاندان اور عزت و آبرو کے بارے میں
صبر اختیار کیا، لیکن میرے تمام مقدس کے بارے میں صبر نہ ہو سکا۔ میں نے صبر نہیں کر سکتا۔ پر بھی خدا نے انہیں صبر کا نکتہ
دیا اور فرمایا: "وہ جو بچھڑ سکتے ہیں اس پر صبر کرو۔"

پھر مزید کہتا ہے کہ اس کے بعد وہ پیغمبر تمام حالات میں اور تمام مشکلات کے مقابلہ میں صابر و شکیبا تھے۔
یہی وجہ ہے کہ یہاں انہیں شہادت دینا ہے کہ تمہارے خاندان میں اللہ اور پیشوا پیدا ہوں گے، اور ان کو بھی صبر
کی ذہنیت کی۔ اسی موقع کے لیے پیغمبر نے فرمایا:

"انصبر من الایمان کالنز من الجسد"

"صبر کو ایمان سے ذہنی نسبت ہے جو سر کو بدن سے ہوتی ہے۔"

اور آخر کار آپ کا یہ صبر و استقلال شکرین پر آپ کی کامیابی کا سبب بنا اور ان تمام گاروں سے انعتاب
لینے کا حکم صادر ہوا جو قابل ہدایت نہیں تھے۔ اور ان کی زندگی کا روزنامہ پیغمبر اور ان کے رفقاء کے ہاتھوں
پلٹ دیا گیا۔ یہ تو دنیا میں ان کے صبر کی جزا تھی، لیکن آخرت کا جو ثواب و جزا، آپ کے لیے ذخیرہ کیا گیا ہے، وہ ان
کے علاوہ ہے۔

پھر امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

"فمن صبر واحتسب لم یخرج من الدنیا حتی یقر اللہ علیہ فی اعدائہ مع ما
یدخراہ فی الآخرة"

جو شخص صبر کرے اور اس صبر کو خدا کے کھاتے میں ڈال دے وہ دنیا سے اس وقت تک خارج نہیں ہوگا جب
تک خداوند عالم اس کی آنکھوں کو اس کے دشمنوں کی شکست کے ذریعہ ٹھنڈا نہیں کر دیتا۔ لیکن آخرت کا وہ اجر اس
کے علاوہ ہے جو اس کے لیے ذخیرہ کیا جا چکا ہے۔ واللہ

۲۶- اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمَا اهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ
الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسْكِنِهِمْ اِنَّ فِي
ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولٰٓئِيْ اَلْبٰسِ

۲۷- اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ
فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهٗ اَنْعَامُهُمْ وَانْفُسُهُمْ
اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ

۲۸- وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ
۲۹- قَدْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِيْمَانُهُمْ
وَلَا هُمْ يُنظَرُوْنَ
۳۰- فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَاَنْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنتَظَرُوْنَ

ترجمہ

۲۶- کیا ان کی ہدایت کے لیے یہی کافی نہیں کہ ہم نے بہت سے افراد
کو ہلاک کر دیا ہے، جو ان سے صدیوں پہلے گزر چکے ہیں؟ یہ ان کے

(دوران شدہ) گھروں میں چلتے پھرتے ہیں۔ اس میں (خدا کی قدرت اور اس
کے دردناک عذاب کی نشانیاں ہیں) کیا وہ سنتے نہیں؟

۲۷- کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم پانی کو خشک زمینوں کی طرف چلا تے

ہیں اور اس کے ذریعہ زراعتیں اگاتے ہیں کہ جن سے ان کے چوپائے بھی کھاتے ہیں اور وہ خود بھی۔ کیا وہ دیکھتے نہیں؟

۲۸۔ اور وہ کہتے ہیں، اگر تم سچ کہتے ہو تو یہ تمہاری کامیابی اور فتح کب ہوگی۔

۲۹۔ کہہ دوے کامیابی کے دن ایمان لانا کا فزوں کے لیے سود مند نہیں ہوگا اور انھیں کسی قسم کی بہمت نہیں دی جائے گی!

۳۰۔ اب جبکہ ایسا ہی ہے تو ان سے منہ پھیر لے اور منتظر رہو، وہ بھی منتظر ہیں۔ (تو رحمت خدا کا منتظر رہو اور وہ اس کے عذاب کے منتظر ہیں)۔

تفسیر

ہماری کامیابی کا دن:

گذشتہ آیات میں بے ایمان مجرمین کی تشبیہ موجود تھی اور زیر بحث پہلی آیت بھی اس تشبیہ کی تشریح اور تخیل کے طور پر فرماتا ہے۔ ”کیا یہی بات ان کی ہدایت کے لیے کافی نہیں ہے کہ لوگوں میں سے بہت سے افراد جو ان سے صدیوں پہلے زندگی بسر کرتے تھے، ہم نے انھیں ہلاک کیا اور انھیں ان کے اعمال کی سزا دی؟“ اولم یریدلہم کم اہلکنا من قبلہم من القرون ہست۔ ”یہ ان کے ویران شدہ گھروں میں چلتے پھرتے ہیں“ اور ان نضرین شدہ اقوام کے آثار اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں؛ ہمیشوں فی مساکنہم) یت۔

”لہ“ لم یرید“ کا نامل ایک منہج ہے جو ”کم اہلکنا من قبلہم“ کے جملہ سے سمجھا جاتا ہے۔ تقریباً پانچ سو برس پہلے ”اولم یریدلہم کثرۃ من اہلکنا“۔

یہ کثر مفسرین اس آیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں، جس طرح ہم اوپر کہ چکے ہیں، لیکن بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ ہمیشوں کا جذبہ ہلاک ہونے والوں کی حالت بیان کر رہا ہے یعنی ان کی حالت پر بھی کہ وہ مذاب الہی سے پوری طرح بے خبر تھے، بقیہ عاشرہ اگلے صفحہ پر،

”عاد“ و ”ثمود“ کی عذاب میں جتنا سرزمین اور قوم لوٹانے کے ویران شدہ شہر شام کی طرف جاتے ہوئے ان کے راستوں میں موجود ہیں۔ جس وقت ان سرزمینوں سے گزرتے ہیں۔ جو ایک دن قدرت مندین گمراہ لوڈ گناہ اقوام کا مرکز تھیں، جتنا پتھر دانسیا انھیں خیر وار کرتے، اس کا کوئی اثر نہ ہوتا اور آخر کار عذاب الہی نے ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ تو گویا بیان کا ایک ایک سنگریزہ دوران کے ویران شدہ قصور و مہلکت زبان حال کے ساتھ پیکار پیکار کر ان کی گنہگاروں کو زندگی کا انجام بیان کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مکمل طور پر اپنے کان کھو بیٹھے ہیں جو سُن نہیں پاتے۔

اس لیے آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے ”اس موضوع میں قدرت خدا کی نشانیاں اور عبرت کے درس ہیں۔ کیا وہ سُنتے نہیں ہیں؟“ (ان فی ذلالت لایاتہ۔ فلا یسمعون)۔

بعد والی آیت میں ایک اہم ترین نکتہ الہی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو تمام زمینوں کی آبادی کا سبب اور تمام نذرہ موجودات کی حیات کا ذریعہ ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ جس طرح خدا گنہگار لوگوں کی زمینوں کے ویران کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اسی طرح ویران اور مژدہ زمینوں کے آباد کرنے اور اپنے بندوں کو ہر قسم کی نعمت و بخشش عطا کرنے پر بھی قادر ہے۔

فرماتا ہے ”کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم پانی کو خشک اور بے آب و گیاہ زمینوں کی طرف چلا دیتے ہیں اور اس کے ذریعہ فضلیں اگاتے ہیں کہ جن سے ان کے چوپائے بھی کھاتے ہیں اور وہ خود بھی غذا حاصل کرتے ہیں۔ کیا وہ دیکھتے نہیں؟“ (اولم یرورانا نسوق الماء الی الارض الخرز فنخرج بہ زرعاً تاکل منه الغنم و انفسہم فلا یریدلہم من القرون)۔

”خرز“ (بروزن شتر) اس زمین کو کہتے ہیں جس سے ہر قسم کے سبزہ کی بیج گئی کی پانی ہو یا بالفاظ دیگر جس میں کسی قسم کی گھاس پھوس نہ آگ سکے اور یہ دراصل ”خرز“ (بروزن شتر) کے مادہ سے قطع کرنے یا کاٹ دینے کے معنی میں ہے۔ گویا ہر قسم کی گھاس اس سرزمین سے کاٹ دی گئی ہے یا خود زمین نے اس سبزے کو کاٹ دیا ہے۔

قابل توجہ یہ ہے کہ یہاں ”نسوق الماء“ ہم پانی کو چلاتے ہیں، کی تعبیر بیان ہوئی ہے۔ جو اس طرف اشارہ ہے کہ پانی کی طبیعت اور اس کا مزاج اپنی سنگینی کی بنا پر اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ وہ زمین کے اوپر اور گڑھوں میں موجود ہو اور اس کے سیال ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ اسے زمین کی گہرائیوں کے اندر ہونا چاہیے، لیکن جس وقت اسے ہلانا پانچ جاتا ہے تو وہ اپنی طبیعت کو چھوڑ کر چلنے پھرنے کی طرف متوجہ ہوا کے چلنے سے ہر طرف حرکت کرتا رہتا ہے۔

جی ہاں! میں بادل جو آسمان کی ٹہنیوں میں ہیں درحقیقت بیٹھے پانی کے عظیم سندر ہیں۔ جو ختم خدا کے مطابق ہواؤں کی مدد سے خشک زمینوں کی طرف بھیجے جاتے ہیں۔

سچ سچ اگر بارش نہ ہوتی تو بہت سی زمینیں پانی کا ایک قطرہ بھی نہ دیکھ پاتیں۔ حتیٰ کہ اگر بالعموم دریا اور ندی، اسے پانی سے

پہلے صفا پانی کا مشیہ، اور اپنے گھروں میں جل پھر رہے تھے کہ اچانک عذاب الہی آپس اور انھیں بک کر دیا۔ لیکن یہ احتمال بعینہ نظر آتا ہے۔

کوئی چیز تیار سے ایسے باقی نہیں رہے گی۔

آخر کار اس سورہ (سورہ بقرہ) کی آخری آیت کے ساتھ ناطق اور معنی غیر تہید کے ذریعہ سورہ کو ختم کرتے ہوئے کہتا ہے۔
 ”اے پیغمبر! اب جبکہ ایسا ہے۔ ان سے منہ پھیر لو اور تم بھی منتظر ہو اور وہ بھی منتظر ہیں: (فاعرض عنہم وانظروا انہم منتظرون)۔“

اب جبکہ نہ تو بشارت انہیں اتر کر تھی ہے اور نہ انذار (ڈرانا) اور نہ ہی وہ اہل منطق و استدلال ہیں تاکہ وسیع عالم غفلت میں آثار الہی کے مشاہدہ کرنے سے اسے پہچانیں اور اس کے غیر کی پرستش ترک کر دیں۔ اور نہ ہی بیمار ضمیر رکھتے ہیں کہ اپنی جان کے اندر سے بلند ہونے والے نعمت تو حید پر کان دھریں۔ لہذا ان سے روگردانی کر کے منہ پھیر لیجئے اور اپنے خدا کی رحمت کے منتظر رہیے اور وہ اس کے عذاب کے منتظر رہیں۔ کیونکہ وہ صرف عذاب کے لائق ہیں۔
 پروردگار! میں ایسے لوگوں میں سے قرار دے جو حق کی اذہمیں نشانی کو دیکھ کر اس کے سامنے ٹھک جاتے اور ایمان لے آتے ہیں۔

بارالہ! تجھ، مغرور، سرکش اور ہٹ و مہر کی رُوح ہم سب سے دور فرما۔
 خداوند! افسوس استغبار اور استعمار کے لشکروں پر لشکر اسلام کو مکمل کامیابی جلد سے جلد عطا فرما۔

سورہ بقرہ کا اختتام
 ۲ محرم الحرام ۱۴۰۴ - ۱۸ دسمبر ۱۳۲۲

سُورَةُ احزاب

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوئی
 اور

۳ آیات پر مشتمل ہے

سورۃ احزاب

کی
وجہ تسمیہ اور فضیلت

یہ سورہ باتفاق مکہ کے اسلام مدینہ میں نازل ہوا اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ اس کی کل ۲۰ آیات ہیں اور چنانچہ اس سورہ کا اہم جھڑک احزابِ اشدق کے واقعہ کو بیان کرتا ہے، اس لیے اس کا یہ نام انتخاب ہوا ہے۔

اس سورہ کی فضیلت کے لیے یہی کافی ہے کہ پیغمبر اسلام فرماتے ہیں:

"من قرء سورۃ الاحزاب و علمہا اھلہ..... اعطى الامان من عذاب القبر"

"جو شخص سورہ احزاب کی تلاوت کرے اور اپنے گھروالوں کو اس کی تفسیر دے تو وہ عذابِ قبر سے مومن رہے گا۔"

اور انام مادی سے بھی منقول ہے:

"من كان كثيرا لقراءة سورة الاحزاب كان يوم القيامة في جوار محمد (ص) والہ وازواجہ"

"جو شخص سورہ احزاب کی زیادہ تلاوت کرتا ہے قیامت کے دن پیغمبر اکرم اور ان کے خاندان والوں کے جوار میں رہے گا۔"

ہم بار بار کہہ چکے ہیں کہ اس قسم کے فضائل اور اعزازات صرف بے رُوح اور برہنہ فکری کے فکر اور عمل سے عاری تلاوت کے ذریعہ حاصل نہیں ہوتے۔ ایسی تلاوت کی ضرورت ہے جو غور و فکر کا مرکز ہو اور ایسا غور و فکری جو فکر انسانی کے اہم کو اس طرح منور اور روشن کر دے کہ اس کا پرتو اس کے اعمال میں ظاہر ہو۔

۱۔ "مجمع البيان" جلد ۲۳ ص ۲۳۳ (ابتداء سورہ احزاب)

۲۔ "مجمع البيان" جلد ۲۳ ص ۲۳۳ (ابتداء سورہ احزاب)

سورۃ احزاب کے مندرجات

یہ سورہ قرآن مجید کی علیہ سورتوں میں سے ایک ہے اور اسلامی اصول و فروع کے سلسلہ میں مختلف النوع اور نسبت میں اہم مسائل کو نکھرتا ہے۔

جو جہاں جہاں اس سورہ میں آئے ہیں ان میں اساتذہ کبار نے تفسیر کیا جا سکتا ہے۔

--- چوتھا حصہ ---

سب سے پیش یہ کہ سورہ احزاب میں ان کے خیال کی اظہار کرنے اور کفار کی بیہوشی اور منافقین کی ہوش کشی کو ترک کرنے کی دعوت ہے اور ان کے دل و جان سے کہ وہ ان کی تجزیہ کریں اور اس کے مقابلہ میں اس کی حمایت فرمائیں۔

--- پانچواں حصہ ---

زمانہ مبارک کے کچھ بچے فرما رہے تھے ان کا مسئلہ جیسے تعلق اور عورت و مرد کے لیے ایک دوسرے سے عدالتی کھینچنے اور اس طرح "مشرقیوں کے بیٹے" کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس پر غلط فہمی کو چھینچنا ہے اور اس طرح کے دشمنوں کو حقیقی اور نظری دشمنوں تک محدود کرتا ہے۔

--- تیسرا حصہ ---

جو اس میں سب سے اہم ترین حصہ ہے، جنگ احزاب اور اس کے بلا دینے والے عداوت، مسلمانوں کی کفار پر عزائم فتح و کامرانی، منافقین کی تجزیہ کاری اور گونا گوں زمانہ تراشی اور ان کی فہم شکنی سے تعلق رکھتی ہے اور اس سلسلہ میں نہایت ہی جامع اور جامع نظر کو متورا اور ان کا بیان جو ہے۔

--- چوتھا حصہ ---

ان اہم ترین حصوں کے تعلق سے سورہ احزاب میں مسلمانوں کے اپنے امور و مسائل اور امور نبوی ہونا چاہئے اور اس سلسلہ میں قرآن ان میں اہم دستور اور فہم دہی کا کتب ہے۔

پانچواں حصہ

ہیں "زینب بنت جحش" کی داستان ہے جو ایک زمانہ تک پیغمبر کے منہ بولے بیٹے "زید" کی بیوی تھیں۔ پھر ان سے الگ ہو گئیں اور محمد خدا کے تحت پیغمبر سے ان کا عقد ہوا اور منافقین کے لیے دستاویز بن گئی کہ قرآن اس سلسلہ میں بہانہ جو افراز کو قانع جواب دیتا ہے۔

چھٹا حصہ

مسجد حجاب کی بات کرتا ہے، جس کا گذشتہ پانچ حصوں سے بھی قریبی رابطہ ہے اور تمام صاحب ایمان عورتوں کو اس سلاسنے اور کی پابندی کی تلقین کرتا ہے۔

ساتواں حصہ

اور آئینی حصہ "معاذ" جیسے اہم مسئلہ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس عظیم میں راہ و نجات اور اس طرح عظیم انسان کی امانت یعنی اس کی ذمہ داری، فرائض کی بجا آوری اور ذمہ داری کی تشریح کرتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

- ۱- يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَلَا الْمُُنَافِقِينَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا
- ۲- وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا
- ۳- وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا

ترجمہ

اللہ کے نام۔ ۳۰ شریعت جو رحمان اور رحیم ہے

- ۱- اے پیغمبر! تقوایے اہم سے اجتناب کرو اور کفار و منافقین کی اطاعت نہ کرو۔ خدا عالم اور حکیم ہے۔
- ۲- اور جو کچھ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہیں وحی ہوتی ہے، اس کی پیروی کرو کیونکہ جو کچھ تم انجام دیتے ہو، خدا اس سے آگاہ ہے۔
- ۳- اور خدا پر توکل کرو اور یہی کافی ہے۔ خدا انسان کا محافظ اور دفاع کرنے والا ہے۔

شان نزول

مفسرین نے یہاں مختلف شان نزول نقل کیے ہیں جو تقریباً ایک ہی موضوع پر دلالت کرتے ہیں۔

ان کے انہوں نے کہا ہے کہ یہ آیات "ابو سفیان" اور بعض دوسرے کافر و شرک کے سرخوشوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ وہ نیکت احد کے بعد ہجرت اسلام سے ایمان پانچ مدینہ میں داخل ہوئے اور عبدالمطلب بن ابی اور ان کے کچھ دوسرے دوستوں کے ساتھ رسول خدا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا "یا محمد! اپنے اور ہمارے ساتھ اور اللہ اور عیسیٰ و منات نامی بتوں کو بڑھا جلا کہنے سے گناہ نہ مانیے اور کہنے کو وہ اپنے پرستش کرنے والوں کی شقاوت سے گریز کرے گا۔ ہم بھی آپ سے لڑائی جھگڑے سے دست بردار ہو جائیں۔ پھر جو کچھ آپ اپنے خدا کی تعریف و ثناء میں لکھنا چاہیں کریں، آپ آناویں۔"

اس میں پیش کش ہے پھر انہوں نے کہا کہ اللہ سے ہونے والی بات کو بھلا جاننا اور اللہ کے رسول کے انہوں نے دیا "میں نے انہیں ایمان دیا ہے" اور ان کی کوئی چیز ممکن نہیں ہے۔ ان کے آپ سے خوشی یا کدھیر سے یہ لکھنا چاہو۔ یہاں سے تو اس میں حق یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کے رسول کے ساتھ لڑائی کی اور انہوں نے اللہ کے رسول سے ہتھیار ڈال دیا۔

تفسیر

صرف وحی اللہ کی پیروی کریں

غلامانک لعرضیں جو پیغمبر میں کے دستوں میں تھری ہیں۔ مخالفین کی ہمت سے سوہ سے ہاتھ پر ہتھیار لگایا کرتی ہیں اور ایسے ہی موقع پر ابواست سے جہاد میں اسے خطو طرہ سیروا۔ سکے و پیشہ ہوتے ہیں اور اللہ کے رسول کو تا بے کہ انہیں وہ ابست اور ابواست سے مارنے اور یہ ان کے لیے ایسے ہی ہتھیار تھری ہوتی ہے۔

"مشرکین کو اور منافقین کو" میں "باہا" کو ششش کی کہ سوہ سے ہاری پر ہتھیار پیش کشوں کے ذریعہ پیغمبر سے ہم کو خط تو حید سے منحرف کریں۔ محمد بن کے وہی پیش کش سے جو اور شان نزول میں ذکر ہو چکی ہے۔ لیکن سورہ انزاب کی پہلی آیات نے نازل کیا۔ ان کی سازش کو مستحکم کر دیا اور اس پر پانی پھیر دیا اور پھر کو دوڑ گئے انہیں خط تو حید کی روش کو کو قسم کی سوہ سے ہاری کے بغیر جاری رکھنے کا حکم دیا۔

یہ آیات مجموعی طور پر پیغمبر کو حکم دیا کہ ہاتھ سے روکیں ہیں۔ پہلا حکم :- "تقولے اور پر ہیز گاری کے سلسلہ میں ہے۔ جو دوسرے تمام پروگراموں کے لیے زیادتی منظر ہے۔ فرماتا ہے "اسے بکیرا قولے، اختصار کر دو" (یا ایضاً الشیخ استق اللہ :-

"تقولے" (تحقیقت میں باطنی ذمہ داری اور جواب دہی کا احساس ہے، اور یہی ہے کہ انہوں نے اس کو روکا ہے۔

لے جسے ایمان لڑی ہر وقت منہ اور ہوتی ہے۔

ہو انسان کسی بھی اصلاحی پروگرام کے لیے حرکت نہیں کرتا۔

"تقولے" بدایت اور آیات الہی سے بہرہ ور ہونے اور فائدہ اٹھانے پر آمادہ کرنا ہے، جیسا کہ سورہ بقرہ کی دوسری آیت میں ہم پڑھتے ہیں "هدی للمحققین" یہ قرآن پر ہیز گاروں کے لیے سبب ہدایت ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ قولے کا آخری اور حقیقی مراد ایمان اور احکام خداوندی پر عمل کرنے کے بعد حاصل ہو سکتا ہے، لیکن اس کا پہلا مرحلہ ان تمام مسائل سے پہلے قرار پاتا ہے کیونکہ انسان اگر اپنے اندر ذمہ داری کا احساس نہ کرے تو نہ پیغمبروں کی دعوت کی تحقیق کرنے کی زحمت کرتا ہے اور نہ ہی ان کی باتوں پر کان دہرتا ہے یہاں تک کہ "دفع ضررہم" کا مسئلہ ہے، علماء علم کلام و عقائد نے معرفت الہی کے لیے کوشش کی بنیاد کے طور پر ذکر کیا ہے، تحقیقت میں تقویٰ کی ایک شاخ ہے۔ دوسرا حکم و کفار و منافقین کی اطاعت کی نفی ہے، خدا فرماتا ہے "کفار و منافقین کی اطاعت نہ کرو" (ولا تقطع الکافرین و المنافقین :-

اس آیت کے آخر میں اس موضوع کی تاکید کے لیے کہتا ہے "خدا عالم اور حکیم ہے" ان اللہ کان علیما حکیمًا :-

اگر وہ آپ کو ان کی پیروی ترک کرنے کا حکم دیتا ہے تو وہ اس کے لائق ہیں علم و حکمت کی بنا پر ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ان کی اس اطاعت اور سوہ سے ہاری میں کیا کیا دردناک مصائب اور کیسے کیسے بے شمار مفسد پنہاں ہیں۔

بہر حال قولے اور احساس ذمہ داری کے بعد پہلا فریضہ صفحہ قلب کو بغیر خدا کی محبت سے صاف اور پاک کرنا ہے اور اس سرزمین سے مزاحمت کرنے والے کانٹوں کی بیخ کنی کرنا ہے۔

تیسرے حکم میں عقیدہ توحید کی تعمیری اور وحی الہی کی اتباع کرنے کے سلسلہ کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "جو کچھ تم سے پروردگار کی طرف سے تم پر وحی ہوتی ہے اس کی پیروی کرو" (وا تبیع ما یوحی الیک من ربک :-

اور اچھی طرح خبردار رہو کہ "جو کچھ تم انجام دیتے ہو اللہ اس سے آگاہ ہے" (ان اللہ کان بعا نقملمون خبیرا :-

اس بنا پر پہلے عفریت کو دل و جان سے نکالیں تاکہ اس میں فرشتہ آسکے۔ کانٹوں کو ختم کریں تاکہ بھولوں کی تخم بیزی ہو سکے۔

طاغوت کو دور کر کے اس سے خود کو پاک کرنا چاہیے تاکہ اللہ کی حکومت اور نظام الہی اس کی جگہ لے سکے۔ اور چونکہ اس راہ پر چلنے کے لیے مصائب و مشکلات بہت زیادہ ہیں، سازشوں کے جال بچھے ہوئے ہیں۔ قدم پر روٹے اٹکائے جاتے ہیں، لہذا جو تھے حکم کو اس شکل میں صادر کرتا ہے :- خدا پر توکل کرو اور ان لوگوں کی سازشوں سے شذر و برہ! (وتوکل علی اللہ :-

"اور یہی کافی ہے کہ خدا انسان کا دلی و محافظ اور مدافع و حامی ہے" (وکفی باللہ وکیلاً :-

اگر ہزار دشمن بھی آپ کو شہید کرنے کا ارادہ کریں، لیکن چونکہ میں آپ کا دوست اور یاد ہوں لہذا دشمنوں سے کبھی ہراس نہ ہوں۔

اگرچہ ان آیات میں مخاطب پیغمبر کی ذات ہے، لیکن واضح ہے کہ یہ تمام مؤمنین اور تمام عالم اسلام کے لیے یہاں حکم ہے۔ یہ ہر دور اور ہر زمانہ کے لیے نجات بخش نسخہ ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے "یا ایہا" کا خطاب ان موارد کے ساتھ مخصوص ہے جہاں مقصد سب لوگوں کی توجیہ کو کسی مطلب کی طرف مبذول کرنا ہو۔ اگرچہ مخاطب ایک ہی شخص ہو بخلاف "یا" کے خطاب کے جس کا عام طور پر اطلاق ایسے موارد میں ہوتا ہے، جہاں مراد مخاطب کی ذات ہوتی ہے۔

اور چونکہ زیر بحث آیات میں "یا ایہا" سے خطاب شروع ہوا ہے لہذا ان آیات کے مقصد کی عموماً پر دلالت کرتا ہے۔

عمومیت (سب) کے لیے ہونے کا ایک اور شاہد یہ ہے کہ "ان اللہ کان بما تعملون خبیروا" کا جملہ جمع کی صورت میں آیا ہے یعنی "خدا تم سب کے اعمال سے آگاہ ہے"۔ اگر صرف پیغمبر مخاطب ہوتے تو کہا جاتا کہ خدا تیرے عمل سے آگاہ ہے۔ (مخبر کیجئے گا)

کچھ کہے بغیر واضح ہے کہ پیغمبر کو یہ حکم دینے کا مقصد یہ نہیں کہ آنجناب تقویٰ کے بارے میں یا کفار و منافقین کی اطاعت ترک کرنے کے مسئلہ میں کسی قسم کی کوتاہی سے کام لیتے تھے۔ بلکہ اس قسم کے احکام جہاں ایک طرف پیغمبر کے وظائف اور ذمہ داریوں کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے، وہاں پر تمام مؤمنین کے لیے درس بھی ہے۔

۴- مَا جَعَلَ اللَّهُ لِلرَّجُلِ مِنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهِ وَمَا جَعَلَ أَزْوَاجَكُمْ الَّتِي تَظْهَرُونَ مِنْهُنَّ أُمَّهَاتِكُمْ وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ ذَلِكَ قَوْلُكُمْ بِأَفْوَاهِكُمْ وَاللَّهُ يَقُولُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ ۝

۵- اَدْعُوهُمْ لِأَبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ فَإِنْ لَمْ تَعْلَمُوا آبَاءَهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ وَمَوَالِيكُمْ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُمْ بِهِ وَلَكِنْ مَا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝

۶- اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهُ اُمَّهَاتُهُمْ وَاُولُو الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ اِلَّا اَنْ تَفْعَلُوْا اِلٰى اَوْلِيَائِكُمْ مَّعْرُوفًا كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝

ترجمہ

۴۔ خدا نے کسی شخص کے لیے دودل اس کے وجود میں خلق نہیں کیے اور اس نے ہرگز تمہاری بیویوں کو جنہیں تم محل "ظہر" قرار دیتے ہو، تمہاری مائیں قرار نہیں دیا اور (نیز) تمہارے منہ بولے بیٹوں کو بھی حقیقی بیٹا قرار نہیں دیا۔ یہ ایسی بات ہے کہ جو تم صرف اپنی زبان سے کہتے ہو (جھوٹی اور بغیر ثبوت کے بات ہے، لیکن خدا حق بات کرتا ہے اور راہ راست کی ہدایت کرتا ہے۔

۵۔ انھیں ان کے بالوں کے نام کے ساتھ پکارا کرو، کیونکہ یہ کام خدا کے نزدیک زیادہ صاف ہے اور اگر تم ان کے بالوں کو نہیں پہچانتے تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور تمہارے موالی (دوست) ہیں، لیکن تم پر ان خطاؤں میں کوئی گناہ نہیں (جو ایسے موقع پر) تم سے سرزد ہوتی ہیں (اور بغیر توجہ کے تم دوسروں کے نام سے انھیں پکارتے ہو) لیکن جو کچھ تم جان بوجھ کر کہتے ہو (اس کا ضرور حساب لے گا) اور خدا غفور و رحیم ہے۔

۶۔ پیغمبر مومنین کی نسبت خود ان سے ادلی ہیں اور پیغمبر کی بیویاں ان مومنین کی مائیں شمار ہوتی ہیں اور رشتہ دار مومنین اور مہاجرین میں سے جو چیز خدا نے مقرر کی ہے، اس میں سے ہر ایک دوسرے سے ادلی نہیں، لیکن اگر تم چاہو کہ اپنے دوستوں کی نسبت نیکی کرو (اور اپنے اموال کا ایک

حصہ انھیں دے دو تو) یہ حکم، کتاب خدا میں لکھا ہوا ہے۔

تفسیر

فضول دعویٰ:

گذشتہ آیات کے بعد جو پیغمبر کو حکم دیا تھا کہ صرف وحی الہی کی اتباع کریں، نہ کہ کفار و منافقین کی، تو یہ بحث آیات میں ان کی پیروی کے نتیجے کو بیان کرتا ہے۔ ان کی پیروی انسان کو بڑی حد تک خرافات، باطل اور بے روزگار دعوت دیتی ہے، جن میں سے تین موارد تو پہلی زیر بحث آیت میں بیان ہوئے ہیں۔

ابتدا میں فرماتا ہے "خدا نے کسی شخص کے لیے بھی دودل اس کے وجود میں قرار نہیں دینے والا ہے" لرجل من قلبین فی جوفہ۔

مفسرین کی ایک جماعت نے آیت کے اس حصہ کے شان نزول میں لکھا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ہمیں بن معمر نامی ایک شخص تھا جو بلا کا حافظ رکھتا تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ میرے اندر "دودل" ہیں جن میں سے ہر ایک سے مجھ کی نسبت بہتر کچھ لکھا ہے۔ اس لیے مشرکین قریش اسے "دو قلبین" (دو دل رکھنے والے) کا نام دیتے تھے۔

جنگ بدر کے دن جب مشرکین بھاگ کھڑے ہوئے تو جمیل بن عمر بھی ان کے درمیان تھا۔ ابوسفیان نے اسے اس حالت میں دیکھا کہ اس کا ایک جوتا اس کے پاؤں میں تھا اور دوسرا ہاتھ میں لے کر بھاگ رہا تھا تو ابوسفیان نے اس سے کہا: کیا بات ہے؟ اس نے کہا: لشکر بھاگ گیا ہے۔ ابوسفیان نے پوچھا، پھر ایک بڑا ہاتھ میں اور دوسرا پاؤں میں کیوں کیے ہو؟ اس نے کہا: سچ میں تو اس طرف متوجہ ہی نہیں تھا بلکہ سمجھتا تھا کہ دونوں جوتے میرے پاؤں میں ہیں (معلوم ہوتا ہے کہ ان سب دعویوں کے باوجود اس طرح اپنے ہاتھ پاؤں گم کر چکا تھا کہ ایک دل کی مقدار بھی کوئی چیز نہیں سمجھتا تھا۔ البتہ ایسے مواقع پر درے مراد عقل ہوتی ہے)۔

بہر حال کفار و منافقین کی پیروی اور وحی الہی کی اتباع کو ترک کرنا انسان کو اس قسم کے بے ہودہ اور فضول مطالب کی طرف دعوت دیتا ہے۔

لیکن اس سے قطع نظر اس جملہ کا ایک نایب ہی معنی اور گہرا معنی بھی ہے اور یہ کہ انسان ایک سے زیادہ دل نہیں رکھتا اور یہ دل ایک مجبور کے عشق کے علاوہ کوئی گناہ نہیں رکھتا۔ وہ لوگ جو مشرک اور متعدد دوسروں کی دعوت دیتے ہیں، ان کے متعدد

لے "مع البسیان" ذیل آیت محل بحث اور تفسیر قرطبی۔

دل ہونے چاہئیں تاکہ ہر ایک کو ایک مہر و عود کے عشق کا مرکز بنائیں۔

اصولی طور پر انسان کی شخصیت ایک صحیح و سالم واحد انسانی شخصیت ہے اور اس کی فکری لائن بھی ایک ہے۔ تنہائی اور اجتماع میں ظاہر و باطن میں اندر و باہر میں فکر و عمل میں غرض کہ سب میں ایک ہے اور اسے ایسا ہونا چاہیے۔ ہر قسم کا فتناء و دوگانگی انسان کے وجود پر ایک مسلط شدہ امر ہے اور اس کی طبیعت اور مزاج کے بالکل خلاف ہے۔

چونکہ انسان ایک سے زیادہ دل نہیں رکھتا لہذا اسے چاہیے کہ اس کی مہر و محبت کا مرکز جن ایک ہو اور ایک ہی قانون کے سامنے سر تسلیم خم کرے۔

ایک ہی معشوق و محبوب کی الفت دل میں رکھتا ہو۔

ایک ہی مقررہ راستے پر زندگی کے سفر کو جاری رکھے۔

ایک گروہ اور ایک ہی جماعت سے ہم آہنگ ہو ورنہ یہ انفریق اور مختلف راستے اور پراگندہ مقاصد سے ایک نظری رائے سے بٹا کر بے ہودگی اور انحراف کی طرف کھیچ کرے جائیں گے۔

اس لیے ایک حدیث میں امیر المؤمنین حضرت علیؑ سے اس آیت کی تفسیر میں ہم پڑھتے ہیں۔

آپ نے فرمایا:

”لا یجتمع حبنا وحب عدونا فی جوف انسان، انت اللہ لم یجعل لرجل قلبین فی جوفہ۔ فیجب بھذا ویبغض بھذا فاما محبنا فیخلص المحب لنا کما یخلص الذہب بالنار لاکدرفیہ فمن اراد ان یخلص فلیمتحن قلبہ فان شارک فی حبنا حب عدوانا فلیس منا ولسنا منہ“

ہماری دوستی اور ہمارے دشمن کی دوستی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتی، کیونکہ خدا نے ایک انسان کے لیے دو دل قرار نہیں دیئے ہیں کہ ایک کے ساتھ کسی کو دوست رکھے اور دوسرے کے ساتھ کسی کو دشمن! ہمارے دوست ہماری محبت میں خالص ہیں۔ جیسا کہ سونا کھٹائی سے نکل کر گند بن جاتا ہے۔ جو شخص اس حقیقت کو جاننا چاہتا ہے وہ اپنے دل کی آزمائش کرے۔ اگر ہمارے دشمنوں کی محبت کا کچھ احساس کے دل میں ہماری محبت کے ساتھ ملا رہا ہے

تو وہ ہم سے ہے اور نہ ہم اس سے۔

اس بنا پر ایک دل ایک ہی اعتقاد کا مرکز ہے اور وہ بھی ایک ہی عملی پروگرام پر عمل درآمد کرتا ہے کیونکہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ انسان حقیقتاً کسی چیز کا متفقہ تو ہو لیکن عملی شکل میں اس سے جدا ہو یا وہ یہ جو بعض لوگ ہمارے زمانہ میں اپنے لیے متحد و شخصیتوں کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ میں نے فلاں عمل سیاسی لحاظ سے انجام دیا اور فلاں دینی لحاظ سے اور فلاں کام اجتماعاً لفظاً نظر سے، اس طرح سے وہ اپنے متضاد اعمال کی توجیہ کرتے ہیں۔ تو وہ بدکردار منافق ہیں جو چاہتے ہیں کہ قانون آفرینش و مخلقت کو

روند دلیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ انسان کی زندگی کے مختلف پہلو ہیں لیکن ان سب پر ایک ہی قانون حاکم ہونا چاہیے۔

قرآن اس کے بعد زمانہ جاہلیت کی ایک اور بے ہودہ رسم اور خرافات کو بیان کرتا ہے اور وہ ”ظہار“ کی خرافات ہے۔ مرد جس وقت اپنی بیوی سے نواضع ہو جاتے اور چاہتے کہ اس سے نفرت کا اظہار کریں تو اس سے کہتے (انت علی کظہر امی) تو میرے لیے میری ماں کی پشت کی طرح ہے، اور اس کے ساتھ اسے اپنی ماں کی طرح سمجھنے لگتے اور اس بات کو طلاق کے مانند خیال کرتے۔

قرآن اس آیت کے آخر میں کہتا ہے ”خدا نے ہرگز تمہاری بیویوں کو جنس تم محل ظہار قرار دیتے ہو، تمہاری مائیں قرار نہیں دیا ہے اور ماؤں والے احکام ان کے لیے مقرر نہیں کیے، (وما جعل ازواجکم اللاتی تظاہرون منہن امہاتکم)۔ اسلام نے اس زمانہ جاہلیت کے پروگرام کو صرف مسترد ہی نہیں کیا بلکہ اس کے لیے شرابھی مقرر کی ہے اور وہ یہ کہ جو شخص یہ بات کہے وہ ضروری کفارہ ادا کیے بغیر اپنی بیوی کے پاس نہیں جاسکتا اور اگر کفارہ بھی ادا نہ کرے اور بیوی کے پاس بھی نہ جائے تو بیوی حاکم شریعت کے ذریعہ سے اسے دو کاموں میں سے ایک کو قبول کرنے پر آمادہ کر سکتی ہے۔ یا تو باقاعدہ طور پر اور قانون اسلام کے مطابق اسے طلاق دے کر اس سے الگ ہو جائے۔ یا کفارہ ادا کر کے حسب سابق اپنی ازدواجی زندگی کو جاری رکھے۔

آخر یہ کیا بات ہوئی کہ انسان اپنی بیوی سے یہ جملہ کہنے سے کہ تو میری ماں کی طرح ہے، اس کو ماں کے حکم میں لے آئے؟ ہاں اور بیٹے کا ایک نظری رابطہ ہوتا ہے جو لفظوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس لیے سورہ مجادلہ کی آیت ۲ میں صراحت سے کہتا ہے: ”ان امہاتہم الا اللاتی ولدنہنہم و انہم لیسوئون منکم من القبول و زوراً“

”ان کی مائیں تو وہ ہیں جنہوں نے انہیں جنم دیا ہے اور وہ بری اور باطل بات کہتے ہیں۔“

یہ بات کہنے سے اگر ان کا مقصد بیوی سے جدائی اختیار کرنا ہے۔ جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں تھا کہ اس سے طلاق کا کام لیتے تھے تو عورت سے علیحدگی اس غلط اور ناشائستہ قول کی محتاج نہیں ہے۔ کیا ایک درست اور صحیح تعمیر کے ساتھ علیحدگی کے مسئلہ کو بیان نہیں کیا جاسکتا؟

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ظہار زمانہ جاہلیت میں ایک دوسرے سے جدائی کا سبب نہیں ہونا تھا بلکہ عورت کو مطلق سرگردان کی حالت میں قرار دینا ہونا تھا اگر واقعاً ایسا ہی ہے تو یہ گھناؤنا اور تکلیف دہ فعل بن جاتا ہے کیونکہ ایک بے معنی لفظ کے کہنے سے میاں بیوی کا باہمی رابطہ منقطع ہو جاتا اور بغیر اس کے کہ عورت مطلقہ ہو شوہر اپنی بیوی کو اپنے اوپر حرام کر لیتا ہے۔ پھر زمانہ جاہلیت کی تیسری بے ہودہ اور فضول چیز کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: ”خدا تمہارے منہ بوسے بیٹوں کو تمہارے حقیقی بیٹے قرار نہیں دیتا، (وما جعل ادعیانکم ابنا تکفراً)۔“

ان کی وضاحت یہ ہے کہ زنا جاہلیت میں معمول تھا کہ بچہ لوگ چھوٹے بچوں کو اولاد کے طور پر انتخاب کر لیتے اور انہیں اپنا بیٹا کہہ کر پکارتے تھے اور ایسا کرنے کے بعد تمام وہ حقوق جو ایک بیٹے کے کسی باپ پر ہوتے ہیں، اس کے قابل ہو جاتے تھے۔ وہ منہ پوسٹ، باپ کے وارث ہوتے اور منہ بولے ان کے وارث ہوتے۔ ایسے باپ کی بیوی بیٹے پر اور ایسے بیٹے کی بیوی باپ پر زنا ہو جاتی۔

اسلام نے غیر منطقی اور بے ہودہ قواعد و ضوابط کو سختی سے مسترد کر دیا جیسا کہ ہم آگے کے پل کر دیکھیں گے کہ بغیر منہ پوسٹ کے غلط طور پر بیٹے نہ سرکولی کے لیے اپنے منہ بولے بیٹے "زیرین عارضہ" کی بیوی سے مطلقہ ہونے کے بعد نکاح کر لیا تاکہ واضح ہو جائے کہ یہ کونسا غلط عقائد و عقول کو دور کرے کہ بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا تاکہ واضح ہو جائے بیٹان اور غمخ بازی سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

آزادی کے بعد میں ہم بتائیں گے کہ پیغمبر کا زہد کی مطلقہ بیوی سے شادی کرنے کے باعث دشمنان اسلام نے ایک بہت بڑا جنجال کھڑا کر دیا اور ان کے غلط پروپیگنڈے کے لیے ایک دستاویز بن گیا، لیکن یہ سب کچھ زمانہ جاہلیت کی اس غلط فہمی کو مٹانے کے لیے منگنا ثابت نہیں ہوا۔

اس لیے قرآن اس جملے کے بعد کہتا ہے: "یہ ایسی بات ہے کہ جو تم زبان سے کہتے ہو؛ (ذالکرم قولکم) باخفا و محکم۔"

تم کہتے ہو فلاں میرا بیٹا ہے حالانکہ دل میں جانتے ہو کہ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ آواز کی یہ لہری صرف تمہارے منہ کی نفضا میں گھوم بھر کر باہر نکل جاتی ہے اور کسی بھی صورت میں یہ دل کی آواز نہیں ہوتی۔

یہ غلط اور فضول باتوں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ "لیکن خدا حق بات کہتا ہے اور راہ راست کی ہدایت کرتا ہے؛ (واللہ یقول الحق وہ یرشدی السبیل)۔"

حق بات اسے کہا جاتا ہے جو اقلیت میں کے ساتھ مطابقت رکھتی ہو یا اگر کوئی طے شدہ معاملہ ہے تو وہ ہر لحاظ سے اس معاملہ کی تمام مصلحتوں سے ہم آہنگ ہو اور معلوم ہے کہ زمانہ جاہلیت میں غلبہ "ایسا ناپسندیدہ مسئلہ یا" منہ بولا بیٹا" جو دوسروں کی اولاد کے حقوق کو بڑی حد تک پامال کرتا تھا، نہ تو اقلیت میں رکھتا تھا اور نہ ہی کوئی ایسا طے شدہ معاملہ تھا جس میں مصلحت عامہ کو نظر رکھا گیا ہو۔

اس کے بعد قرآن مزید تاکید اور اسلام کے صحیح اور منطقی خط و خد کو واضح کرنے کے لیے یوں اضافہ کرتا ہے: "انہیں ان کے باپوں کے نام سے پکارا کرو کیونکہ یہ کام خدا کے نزدیک زیادہ عادلانہ ہے؛ (ادعوہم لآباہم ہوا قسط عند اللہ)۔"

"اقسط" (زیادہ منصفانہ) کی تعبیر کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اگر انہیں منہ بولے باپ کے ساتھ پکارا تو یہ منصفانہ فعل ہے اور حقیقی باپ کے نام سے پکارا تو زیادہ منصفانہ ہے، بلکہ جیسا کہ ہم بار بار کہہ چکے ہیں کہ "افضل التفضیل" کا صحیح معنی ایسے موقع پر بھی استعمال ہوتا ہے کہ طرف مقابل میں صفت کا بالکل وجود نہیں ہوتا۔ مثلاً کہا جاتا ہے:

"انسان احتیاط کرے اور اپنی جان کو خطر سے بچنے کے لیے بہتر ہے، تو اس بات کا یہ مفہوم نہیں کہ جان کو خطرے میں نہ ڈالنا اچھا ہے لیکن احتیاط کرنا اس سے بہتر اور زیادہ اچھا ہے، بلکہ مرزا "اپنے" اور "برے" کا ایک دوسرے سے تقابل اور موازنہ ہے۔

اور "بہانے" کو دور کرنے کے لیے مزید کہتا ہے: "اگر ان کے باپوں کو تم نہیں پہنچاتے تو وہ تمہارے دینی بھائی اور سواہلی ہیں؛ (فان لم تعلموا ابائہم فاخوانکم فی الدین ومساویکم)۔ یعنی ان کے باپوں کو نہ پہنچانا اس چیز کی دلیل نہیں بنتا کہ دوسرے شخص کا نام "باپ" کے عنوان سے اس پر رکھ دیں بلکہ انہیں دینی بھائی کے عنوان سے یاد دست اور آشنا کے طور پر خطاب کرو۔

"مولیٰ" تو "مولا" کی جمع ہے اور مضرین نے اس کے لیے متعدد معانی ذکر کیے ہیں۔ بعض نے اسے برائی و دوست کے معنی میں اور بعض نے آزاد شدہ غلام کے معنی میں لیا ہے۔ لہذا کوئی بھی مضمون لے بیٹے غلام تھے جنہیں خرید کر آزاد کر دیا جاتا اور چونکہ وہ اپنے آقا کی توجہ کا مرکز ہوتے لہذا انہیں اپنے بیٹے کے طور پر پکارتے تھے۔

اس بحث کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ "مولا" کی تعبیر اس قسم کے موارد میں کہ جہاں مقابلے میں آزاد شدہ غلام ہوں، اس وجہ سے مولا کہ وہ آزادی کے بعد اپنا رابطہ اپنے مالک کے ساتھ برقرار رکھنے ایسا رابطہ جو قانونی لحاظ سے کئی ایک جہات میں رشتہ داری کا باعث بن جاتا اور "ولادعتق" سے تعبیر کرتے۔

اس لیے اسلامی روایات میں ہے کہ "زیرین عارضہ" کو پیغمبر اکرم کے آزاد کرنے کے بعد بھی "زیرین عارضہ" کے عنوان سے پکارا جاتا، یہاں تک کہ قرآن نازل ہوا اور اذیر والا حکم لایا۔ اس کے بعد پیغمبر نے اس سے فرمایا تو "زیرین عارضہ" ہے تو اب اسے لوگ مولیٰ رسول اللہ" (رسول اللہ کا آزاد کردہ) کہہ کر پکارتے تھے۔

نیز علماء نے کہا ہے کہ ابوذر غفیر کا سالم نامی ایک غلام تھا جسے انہوں نے آزاد کر کے اپنا بیٹا بنایا جس وقت اوپر والی یہ آیت نازل ہوئی تو اسے سالم" مولیٰ صدیق کا نام دیا گیا۔

لیکن چونکہ انسان کبھی گذشتہ عادت کے ماتحت یا سبقت لسانی کی بناء پر یا بعض افراد کے نسبت میں اشتباہ کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ کسی کو اس کے باپ کے علاوہ کسی اور سے نسبت دے دے اور یہ چیز انسان کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ لہذا خداوند عادل و حکیم ہے۔ ایسے شخص کو سزا نہیں دے گا۔ اس لیے آیت کے ذیل میں اضافہ کرتا ہے: "جس وقت اس موقع پر غلطی کے مرتکب ہو جاؤ تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے؛ (ولیس علیکم جناح فیما اخطا توبہ)۔

لیکن جو کچھ تم جان لو پھر کہہ کر اپنے ارادہ و اختیار سے کہتے ہو، اس پر سزا سزا دی جائے گی؛ (ولکن ما تعددت قلوبکم)۔ آیت

۱۔ "روح البیان" جلد ۱ ص ۱۴۱ ذیل آیہ محل بحث۔
۲۔ "روح البیان" ذیل آیہ محل بحث۔

”اور خدا ہمیشہ غفور و رحیم ہے“ (وكان الله غفوراً رحيمًا)۔

تھما سے گزشتہ گناہوں کو بخش دے گا اور سوسو سیان اور خطاؤں کو معاف کر دے گا۔ لیکن اگر اس حکم کے نازل ہونے کے بعد تم نے عمداً اس کی مخالفت کی اور افراد کو ان کے پاؤں کے نام کے بغیر پکارا اور منہ بوسے بیٹے اور منہ بولے باپ والی رسم کو جاری رکھا تو خدا تمہیں نہیں بخشنے گا۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ موضوع خطا ایسے موارد کو بھی شامل ہوگا، جب انسان محبت کی بنا پر کسی سے کہتا ہے ”میرے بیٹے“ یا ”اثرام“ سے کہتا ہے ”میرے باپ“!

البتہ یہ بات صحیح ہے کہ تعبیرات گناہ نہیں ہے۔ لیکن خطا کے عنوان سے نہیں بلکہ اس بنا پر کہ اس قسم کی تعبیرات گناہ و مجاز کا پہلو رکھتی ہیں اور عام طور پر ان کا قرین ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ لہذا قرآن یہاں پر حقیقی تعبیرات کی نفی کرتا ہے نہ کہ مجازی کی بعد والی آیت ایک اور اہم مسئلہ یعنی اس کے نظام ”موافات“ کے ابطال کو پیش کرتی ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ وقت مسلمانوں نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی اور اسلام نے ان کا تعلق مشرک رشتے والوں کے ساتھ کہ جو مکہ میں تھے اگلی طور پر توڑ دیا اور پیغمبر نے حکم خدا سے سلسلہ اخوت، بیگان برادری ان کے درمیان کیا۔ اس طرح سے کہ ”مہاجرین“ و ”انصار“ کے درمیان (دو دو کر کے) اپمان اخوت و برادری باندھا گیا اور وہ دو حقیقی بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے وارث بنے لیکن یہ حکم عارضی اور صرف موجودہ سخت ترین حالات سے مخصوص تھا اور جس وقت اسلام نے وسعت پیرائی ہے اور گزشتہ ردابط تدریجاً برقرار ہوئے تو اب اس حکم کو باقی اور جاری رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔

اوپر والی آیت نازل ہوئی اور نظام موافات کو جو نسب کا جانشین تھا باطل کیا۔ اور اسٹ وغیرہ کے حکم کو حقیقی رشتہ داروں کے ساتھ مخصوص کر دیا۔

اس بنا پر نظام اخوت و برادری اگرچہ ایک اسلامی نظام تھا (برخلاف منہ بولے بیٹے کے نظام کے جو ایک جاہلانہ نظام تھا) لیکن ضروری تھا کہ حد سے زیادہ خراب حالت کے برطرف ہونے کے بعد اسے باطل ہونا چاہیے تھا اور ایسا ہی ہوا۔ البتہ زیر بحث آیت میں اس نکتہ کے ذکر سے پہلے دو احکام یعنی ”مؤمنین کی نسبت پیغمبر کا اولیٰ ہونا“ اور ”پیغمبر کی بیویوں کا مال کی مانند ہونا“ مقدمہ کے طور پر ذکر ہوا ہے۔

فرماتا ہے ”پیغمبر مؤمنین کی نسبت خود ان سے اولیٰ ہیں“ (النبي اولیٰ بالمؤمنین من انفسہم)۔ اور ان کی بیویاں مؤمنین کی مائیں شمار ہوتی ہیں“ (وازواجہ امہاتھم)۔

باد جو اس کے کہ پیغمبر بمنزلہ باپ کے اور ان کی بیویاں بمنزلہ ماؤں کے ہیں، لیکن کبھی بھی ان سے میراث نہیں لیتے تو کس طرح توقع رکھی جاسکتی ہے کہ منہ بولے بیٹے وارث بنتے ہوں۔

پچھلے صفحہ کا ماحشیہ، عمدت ہے اور تقدیری طور پر اس طرح تھا ”لکن ما تعدت قلوبکم فانکم تتواخذون سباً“

پیغمبر یہ کہتا ہے ”رشتہ دار ایک دوسرے کی نسبت مؤمنین و مہاجرین میں سے اس میں جو خدا نے مقرر کیا ہے اولیٰ ہیں“ (و اولوا الارحام بعضهم اولیٰ بعض فی کتاب اللہ من المؤمنین و المہاجرین)۔

لیکن اس کے باوجود اس بنا پر کہ کئی طور پر مسلمانوں پر راستہ بند نہ کریں اور دستوں کے لیے اور ان کے لیے بن کے ساتھ ان کا کسی قسم کا کوئی تعلق یا لگاؤ ہو تو کوئی چیز بطور میراث چھوڑ سکتے ہیں۔ اگرچہ وصیت کے طریق سے تہائی مال کی بابت ہی یہی آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے ”مگر یہ کہ تم چاہو کہ اپنے دستوں کی نسبت کوئی نیک کام انجام دو“ تو کوئی مانع نہیں ہے (الا ان تفضلوا الی اولیائکم معروفاً)۔

اور آخری جگہ میں گزشتہ تمام احکام کی تاکید کے لیے یا آخری حکم کی تاکید کے لیے فرماتا ہے ”یہ حکم کتاب الہی میں الراجحاً یافتران مجیب میں لکھا جا چکا ہے“ (اكان ذالک فی الکتاب مسطوراً)۔

یہ تھا خلاصہ اوپر والی آیت کی تفسیر کا۔ اب ہم ان مذکورہ چار احکام میں سے ہر ایک کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔

الف۔ مؤمنین کی نسبت پیغمبر کے اولیٰ ہونے سے کیا مراد ہے؟

قرآن نے اس آیت میں پیغمبر کے اولیٰ ہونے کو مسلمانوں کی نسبت مطلق طور پر ذکر کیا ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ تمام اختیارات جو ”انسان“ اپنی بابت رکھتا ہے ”پیغمبر“ کو اس سے بھی اولیٰ ہے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے ”امور اجتماعی کی تدبیر“ کے مسئلہ میں یا ”اولویت مسئلہ تضاموت“ میں یا ”حکم و فرمان کی اطاعت“ کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ لیکن حقیقت واقع یہ ہے کہ ان تین امور میں سے کسی ایک تک محدود کرنے کی دلیل ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اسلامی روایات میں اولویت کی سلسلہ ”حکومت“ کے ساتھ تفسیر ہوئی ہے تو حقیقت اس اولویت کی ایک شاخ کو بیان کرنا مقصود ہے۔

لہذا کہنا چاہیے کہ پیغمبر اسلام اجتماعی مسائل میں اور انفرادی و خصوصی مسائل میں بھی حکومت سے مربوط مسائل میں بھی تضاموت و دعوت سے متعلق مسائل میں بھی ہر انسان سے خود اس کی نسبت اولیٰ تھے اور آپ کا ارادہ اور خواہش خود اس کے ارادہ اور خواہش پر مقدم ہے۔

اور اس مسئلہ میں حیران ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ کیونکہ پیغمبر موصوم ہوتا ہے اور خدا کا نمائندہ سوائے معاشرے اور فرد کی غیر د صلاح کے کچھ بھی مد نظر نہیں رکھتا اور کبھی بھی وہ ہوا و ہوس کا تابع نہیں ہوتا اور کسی وقت بھی اپنے مفادات کو دوسروں کے مفادات پر مقدم نہیں سمجھتا بلکہ اس کے برعکس مفادات کی کشش و تضاد اور معاوضہ کی صورت میں اس کا پروگرام ہمیشہ اہمیت کے لیے ایثار و قربانی اور نڈا کا کار کا ہوتا ہے۔

یہ اولویت حقیقت میں مشیت الہی کی اولویت کی ایک شاخ ہے کیونکہ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے وہ خدا کی جانب سے ہے۔

مزید برآں انسان اس وقت ایمان کی بندھی پر پہنچ سکتا ہے جب ان کا مضبوط ترین تعلق اپنی ذات کے ساتھ عشق و محبت خدا کے تابع ہوا اور اسی طرح اس کے نماندوں کے ساتھ عشق و محبت کے تابع ہو۔

اس لیے تو ہم ایک حدیث میں پڑھتے ہیں،

”لایؤمن احدکم حتی یشکون ہواہ تبعاً لما جئت بہ“

”تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک حقیقت ایمان تک نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کی خواہش اس چیز کے تابع نہ ہو جسے میں نذالک طرف سے لے کر آیا ہوں۔“

نیز ایک اور حدیث میں آیا ہے:

”والذی نفسی بیدہ لایؤمن احدکم حتی یشکون احب الیہ من نفسه وصالہ وولده والناس اجمعین“

”تم ہے اس کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک حقیقت ایمان تک نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کے نزدیک خود اس سے اس کے مال و اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔“

نیز یہ بھی خود آنحضرت سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

”ما من مؤمن الا وانا اولی الناس بہ فی الدنیا والاخرۃ“

”کوئی نون نہیں جب تک کہ میں دنیا و آخرت میں اس کے نزدیک خود اس کی نسبت اولی نہ ہوں۔“

ہوں۔“

قرآن بھی اسی سورہ احزاب کی آیت ۳۶ میں کہتا ہے:

”وما یدعون للمؤمن ولا المؤمنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امران یشکون لہما الخیرۃ من امرہما“

”کس یا ایمان مرد و عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ جب خدا اور اس کا رسول کوئی فیصلہ کریں تو پھر وہ اپنی طرف سے کوئی اختیار رکھتا ہو۔“

ہم ایک بار چھریات زور دے کر کہتے ہیں کہ اس بات کا یہ مقصد نہیں کہ خدا نے اپنے بندوں کو مکمل طور پر ایک فرد کی خواہشات کا پانچہرہ دیا ہے۔ بلکہ اس بات کے پیش نظر کہ پیغمبر مقام عصمت کا حامل ہوتا ہے اور ”ما یطق عن الہوی ان سواہ“ وحی بیوٹی“ (بخاری ج ۲، ص ۲۰۰) کا مصداق ہونے کی بنا پر جو کچھ بھی کہتا ہے، سب خدا کا فرمان ہوتا ہے اور اس کی ہی

تفسیر صحیحہ میں ہے۔

تفسیر صحیحہ میں ہے۔

تفسیر صحیحہ میں ہے۔

جانب سے ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ باپ سے بھی زیادہ دل سوز اور مہربان ہے۔

یہ اولویت درحقیقت لوگوں کے مفاد اور ان کے حق میں ہے، حکومت اور اسلامی معاشرہ کو چلانے کی صورت میں بھی اور انسان کے شخصی اور انفرادی مسائل میں بھی۔

اس بنا پر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ اولویت پیغمبر کے کاندھوں پر عظیم مسؤلیت اور ذمہ داری ہے۔ اسی لیے مشہور روایت میں کہ جو شیخ اور اہل سنت کی کتب میں وارد ہوئی ہے، پیغمبر نے فرمایا:

”انا اولی بکمل مؤمن من نفسه، ومن ترک ما لا فلولوارث ومن ترک دیناً او ضیاعاً

فسلق وعلی۔“

”میں ہر مومن کے لیے اس کی نسبت اولی ہوں، جو شخص اپنی طرف سے مال چھوڑ جائے تو وہ اس کے وارث کے لیے ہے اور جو شخص قرض چھوڑ کر جائے یا مال و عیال چھوڑ جائے تو ان کی کنکالت میرے ذمہ ہے۔“

تو جو کرنا چاہیے کہ یہاں پر ”ضیاع“ اہل عیال کے معنی میں ہے جو سرپرست کے بغیر گئے ہوں اور ”دین“ کی تعبیر اس سے پہلے بھی اس معنی پر واضح قرینہ ہے کیونکہ مراد مال کے بغیر قرض دار ہونا ہے۔

سب:۔ دوسرا حکم پیغمبر کی بیویوں کے سلسلہ میں ہے کہ وہ تمام مومنین کے لیے دامن کی حیثیت رکھتی ہیں نسبت معنی اور

روحانی مائیں ہیں جیسا کہ پیغمبر اُمت کے روحانی اور منوی باپ ہیں۔

اس معنی میں ربط اور شدت کا تاثر صرف ”حفظاً احترام“ اور پیغمبر کی بیویوں سے ”ازواج کی حرمت“ کے سلسلہ میں ہے، جیسا کہ

اسی سورہ کی آیات میں پیغمبر کی رحلت کے بعد ان کی ازواج سے نکاح کرنے کی تحریم کا صریح حکم آیا ہے۔ ورنہ مسئلہ میراث کے لحاظ سے اور اسی طرح دوسرے ”بنتی“ اور ”سببی“ محرمات کے لحاظ سے ذرہ برابر بھی اثر نہیں رکھتا، یعنی مسلمان حق رکھتے ہیں کہ پیغمبر کی بیویوں کے ساتھ شادی کریں۔“

حالانکہ کوئی شخص اپنی ماں کی بیٹی کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا، نیز محرمیت کا مسئلہ اور پیغمبر کی بیویوں کی طرف نگاہ کرنا ان کے محرم کے سوا کسی شخص کے لیے بھی جائز نہیں تھا۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک عورت نے بنی عائشہ سے کہا ”یا اقرۃ“ اسے آنا۔ اس پر انہوں نے جواب دیا۔ میں

تھاری ماں نہیں ہوں، تمہارے مردوں کی ماں ہوں۔“

سلسلہ مسائل شیعہ جلد ۱، ص ۵۵۱۔ یہ بات امام صادق علیہ السلام سے پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل ہوئی ہے اور یہی مضمون مختصر سے فرق کے ساتھ تفسیر قرمی اور روح المعانی میں زیر بحث آیات کے ذیل میں آیا ہے اور صحیح بخاری میں بھی ہے۔ دیکھو جلد ۱، ص ۲۰۰، تفسیر سورہ احزاب میں آیا ہے۔

جیسا کہ حضرت علی کی شادی آنحضرت کی دختر سے ہوئی یا آپ کی نوادہ کی شادی حضرت جعفر طیار کے

سے ”جمع البیہان“ اور ”روجر المناذیر“ اور ”تفسیر ابن کثیر“ میں آیا ہے۔

یہاں اہل عرف کے بارے میں ہے کہ اس تعبیر کا مقصد نکاح کی حرمت ہے اور یہ صرف امت کے مردوں کے بارے میں صادق ہے۔ لیکن عیسائے کفار نے کہا ہے کہ مسئلہ ازدواج کے علاوہ احترام اور بزرگی سمجھنے کا موضوع بھی پیش نظر ہے۔ اسی لیے مسلمان عورتیں بھی احترام کے طور پر اپنی ماں کی طرح خطاب کریں۔

ابن عباس کا شاہ خود قرآن ہے جبکہ کتاب ہے: "التبستی اولی بالمؤمنین من انفسہم" پیغمبر کی اولویت تمام عورتوں اور مردوں کی نسبت ہے اور بعد ازاں جملہ کی صفیر بھی اسی عنوان کی طرف لٹتی ہے جو ایک دین مفہوم رکھتا ہے۔ اسی لیے عہد میں جو "ام سلمہ" پیغمبر کی ایک بیوی سے نقل ہوا ہے کہ وہ فرماتی ہیں۔

انا امر الرجال منکم والنساء

میں تمہارے مردوں اور عورتوں کی ماں ہوں۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ کہ کیا "ازواجہ امہاتھم" پیغمبر کی بیویوں نمونوں کی ماںیں شمار ہوتی ہیں؟ کی تعبیر اس کے ساتھ جو قبل کی چند آیات میں گوری ہے۔ تقاضا نہیں کہتی؟ کیونکہ وہاں فرماتا ہے: "وہ لوگ کہ جو کبھی اپنی بیویوں کو اپنی ماں کے برابر قرار دیتے ہیں، باطل بات کہتے ہیں۔ ان کی ماں صرف وہی ہے جس سے وہ متولد ہوئے ہیں۔" اس حالت میں کس طرح پیغمبر کی بیویوں کو ان سے مسلمان متولد نہیں ہوئے ماںیں شمار ہوتی ہیں؟

اس سوال کے جواب میں اہل حق کی طرف توجہ کرنا چاہیے کہ کسی عورت کو ماں سے مخاطب کرنا یا تو جسمانی لحاظ سے ہوتا ہے یا روحانی لحاظ سے۔ جسمانی لحاظ سے تو یہ معنی صرف اس صورت میں واقعیت رکھتا ہے کہ انسان اس سے متولد ہوا ہو۔ اور یہ وہی چیز ہے جو گذشتہ آیات میں آئی ہے کہ انسان کی جسمانی ماں تو صرف وہ ہے جس سے وہ پیدا ہوا ہے۔ لیکن روحانی ماں باپ تو وہ ہیں جو ایک قسم کا معنوی حق اس پر رکھتے ہوں جس طرح پیغمبر جو امت کے روحانی باپ شمار ہوتے ہیں اور آپ ہی کی وجہ سے آپ کی بیویاں ماں کا احترام رکھتی ہیں۔

جو اعتراض زمانہ جاہلیت کے عربوں کی طرف "ظہار" کے بارے میں تھا، یہ تھا کہ جس وقت وہ اپنی بیویوں کو ماں کر کے مخاطب کرتے تو یقیناً ان کی مراد معنوی ماں نہ ہوتا۔ بلکہ ان کی مراد یہ ہوتی کہ وہ جسمانی ماں کی طرح ہیں، اسی لیے ایک قسم کی طلاق شاکر کرتے تھے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ جسمانی صورت میں الفاظ کے کبہ دینے سے ماں نہیں بن جاتی بلکہ اس کی شرط تولد جسمانی ہے۔ اس بنا پر ان کا یہ قول جھوٹ اور باطل تھا۔ لیکن پیغمبر کی بیویوں کے بارے میں اگرچہ وہ جسمانی ماںیں نہیں ہیں لیکن پیغمبر کے احترام کی وجہ سے وہ روحانی ماںیں تھیں اور ایک ماں ایسا احترام رکھتی تھیں۔

اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن آئندہ کی آیات میں پیغمبر کی بیویوں سے شادی کرنے کو حرام قرار دیتا ہے، وہ بھی درحقیقت پیغمبر کے احترام کی قسموں میں سے ایک ہے جیسا کہ اس کی وضاحت آگے چل کر تفصیل کے ساتھ آئیگی۔ اللہ اعلم۔

ابستہ اسلام میں ماں کی ایک اور قسم رضاعی ماں کے عنوان سے موجود ہے جس کی طرف سورہ نساء کی آیت ۲۳ میں

لے روح انشاء ذلی آیات زمرہ۔

انشاء ہوا ہے کہ: "وامہاتکم اللاتی ارضنکم۔۔۔" تو درحقیقت وہ جسمانی ماں کی ایک قسم ہے۔ حج: تیسرا حکم رشتہ داروں کی ایک دوسرے کی بابت میراث کے بارے میں اولویت کا مسئلہ ہے کیونکہ ابتداء اسلام میں کہ مسلمان ہجرت کی وجہ سے اپنا رشتہ اپنے اعزاء و اقارب سے کم کر چکے تھے تو میراث کا قانون "ہجرت" اور "مواخات" کی بنیاد پر منظم ہوا یعنی مہاجرین ایک دوسرے سے یا انصار سے جن سے برادری کا رشتہ چھوڑ چکے تھے، میراث لیتے تھے۔ یہ ایک عارضی حکم تھا جو اسلام کے وسعت پانے اور بہت سے گذشتہ رشتہ داری کے روابط کے برقرار ہوجانے سے ان کے اسلام لانے کی بناء پر اب اس حکم کے جاری رکھنے کی ضرورت نہیں تھی آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ سورہ احزاب ہجرت کے پانچویں سال جنگ احزاب کے سال نازل ہوا۔

اس لیے اوپر والی آیت نازل ہوئی اور اولوا الارحام "درشتہ داروں" کی اولویت کو حکم کر دیا۔ ابستہ کچھ قرآنی موجود ہیں کہ بیان اولویت سے مراد الزامی اولویت ہے نہ کہ استثنائی۔ کیونکہ علماء اسلام کا اجماع بھی اس معنی پر ہے اور بہت سی روایات بھی جو اسلامی ماخذ میں وارد ہوئی ہیں، اس موضوع کو ثابت کرتی ہیں۔ یہاں اس حکم کی طرف بھی خوب غور کے ساتھ توجہ کرنا چاہیے کہ یہ آیت خبیروں کی نسبت رشتہ داروں کی اولویت کو بیان کر رہی ہے۔ تاکہ میراث کے تین طبقات کی ایک دوسرے کی نسبت اولویت کے بیان کے لیے۔ دوسرے لفظوں میں یہاں "مفضل علیہم" مومنین و مہاجرین ہیں جو حق قرآن میں آئے ہیں: (من المؤمنین والمہاجرین)

اس بنا پر آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا "بعض رشتہ دار دوسرے بعض سے میراث لینے میں خبیروں سے اولیٰ ہیں۔ باقی رہا کہ رشتہ دار کس طرح میراث لیتے ہیں؟ اور کس میعار اور ضابطہ کے تحت؟ تو قرآن یہاں اس بارے میں ساکت ہے! اگرچہ سورہ نسا کی چند آیات میں اس کے بارے میں تفصیل سے بحث ہوئی ہے۔ لے

۵: جو تھا حکم کہ اوپر والی آیت میں ایک استثناء کی شکل میں آیا ہے، دوستوں اور تعلق رکھنے والے افراد کو ان اموال سے بھرہ مند کرنا ہے۔ جنہیں یادگار کے طور پر چھوڑا ہے جو (الا ان تفضلوا الی اولیائکم معروفاً) مگر یہ کہ اپنے دوستوں کے ساتھ تم نیک کرنا چاہو" کے جملے سے بیان ہوا ہے اور اس کا واضح مصداق وہی حکم وصیت ہے کہ جسے انسان اپنے ثانی مال کے حصے میں جس شخص کے بارے میں چاہے انجام دے سکتا ہے۔

لے اسی بنا پر بعض فقہاء طبقات میراث میں ایک دوسرے سے اولویت کی تعبیر کا استدلال درست نظر نہیں آتا، معلوم ہوتا ہے کہ "اولیٰ بعض" میں حرت "با" اس قسم کی غلط فہمی کا سبب ہوا اور بعض علماء نے گمان کر لیا ہے کہ یہاں پر "مفضل علیہم" (جن پر فضیلت دی گئی) بعض دارست ہیں، حالانکہ قرآن صراحت کے ساتھ (مفضل علیہم) من المؤمنین والمہاجرین لایا ہے "ابستہ اولوا الارحام" کی تعبیر صرف یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ رشتہ داری ہی میراث کا میعار ہے۔ اور جس قدر رشتہ داری کا درجہ بلند ہوگا اسے اتنا ہی حق تقسیم حاصل ہوگا۔

اس طرح سے جب میراث کی عمارت رشتہ داری کی بنیاد پر استوار کی گئی اور گذشتہ رشتوں کی قائم مقام ہوئی۔ پھر بھی انسان کا رابطہ مکمل طور پر اپنے قلبی دوستوں اور مسلمان بھائیوں سے منقطع نہیں ہوتا۔ البتہ کیفیت و کیفیت و مقدار اور تعداد، خود اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے، لیکن پھر بھی اس کی شرط یہ ہے کہ مال کی ایک تہائی سے زیادہ نہ ہو، البتہ اگر انسان وصیت نہیں کرتا تو اس کے تمام اموال اس کے رشتہ داروں کے درمیان میراث کے قوانین کے مطابق تقسیم ہوں گے اور ان کے لیے تہائت یعنی ایک تہائی مقصود نہیں ہوگی۔

ایک نکتہ:

بہت سی روایات اہل بیت سے اوپر والی آیت کی تفسیر میں اولوالارحام کے بارے میں نقل ہوئی ہیں کہ بن میں سے بعض میں یہ آیت "میراث مال" کے سلسلہ سے تفسیر ہوئی ہے جیسا کہ مفسرین کے درمیان مشہور ہے۔ جبکہ بعض دوسری روایات میں خلافت و ملکیت کی میراث "نانداں بغیر ادرامہ اہل بیت کے لیے تفسیر ہوئی ہے۔

منجملہ ان کے ہم ایک حدیث میں امام جعفر صادق سے پڑھتے ہیں۔ جس وقت آپ سے اس آیت کی تفسیر کے متعلق سوال ہوا تو امام نے فرمایا:

"یہ فرزندانِ حسین کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔"

اور جب راوی نے سوال کیا کہ کیا یہ میراث اموال سے متعلق نہیں ہے؟ تو امام نے ارشاد کیا:

"نہیں۔ یہ تو حکومت و ولایت کے بارے میں ہے۔"

واقعہ یہ ہے کہ ان احادیث سے مراد میراث اموال کے مسئلہ کی نفی نہیں ہے بلکہ مراد اس نکتہ کی طرف توجہ دلانا ہے کہ میراث ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے کہ جو میراث اموال کو بھی شامل ہے اور میراث خلافت حکومت کو بھی۔ اور یہ تو ارث بادشاہوں کے سلسلہ میں تو ارث سلطنت کی طرح نہیں ہے۔ یہاں تو شائستگی اور لیاقت کی بناء

سے مفسرین کی ایک جماعت کا نظریہ ہے "الا ان تعلقوا" کے مفہوم میں جو استثناء ہے وہ استثناء منقطع سے کیونکہ وصیت کا محل میراث کے حکم سے علیحدہ ہے۔ لیکن ہمارا نظریہ ہے کہ اگر یہاں استثناء متصل ہو تو کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ "اولوالارحام" کا محلا اس بات کی دلیل ہے کہ رشتہ داران مالوں کی بابت جو وصیت سے باقی رہ جاتے ہیں، مفسرین کی نسبت ادنیٰ ہیں۔ لیکن اگر وصیت کی ہو تو اس صورت میں "موصی لہ" تہائی ترکہ کی حدود تک رشتہ داروں سے ادنیٰ اور زیادہ تر رکھتے ہیں۔ یہ حقیقت میں استثناء کے مشابہ ہے جو آیات میراث میں "من بعد وصیة..." میں آیا ہے۔

تہ ان احادیث کو مرحوم سید باقر بحرانی نے تفسیر زبان علیہ ص ۱۰۰ اور ص ۱۰۱ میں نقل کیا ہے۔ منجملہ ان کے اوپر والی حدیث ہے اور سب سے پہلی حدیث بھی اسی سلسلہ احادیث میں سے ہے۔

یہ تو اٹھ ہے، اسی لیے امہ کی اولاد میں سے صرف ان افراد کی حالت کو شامل ہے جو اس شائستگی کے حامل ہیں، ٹھیک اسی طرح حضرت ابراہیم اپنی اولاد کے لیے خدا سے چاہتے ہیں اور خدا ان سے کہتا ہے کہ امامت و ولایت تیری اولاد میں سے اس گروہ تک نہیں پیچھے گی جو ظالموں کی صف میں قرار پاتے ہیں۔ بلکہ ان میں پاکیزہ افراد سے مخصوص ہے۔

نیز اس چیز کے مشابہ ہے جو زیارت میں شہداء راہ خدا منجملہ امام حسین کی قبر کے سامنے کھڑے ہو کر کہتے ہیں۔ آپ پر سلام ہو اے حسین کہ آپ آدم کے وارث، نوح کے وارث، ابراہیم کے وارث، موسیٰ کے وارث و عیسیٰ و محمد کے وارث ہیں۔ یہ میراث تو اعتقادی، اخلاقی معنوی اور روحانی پہلوؤں کے لحاظ سے میراث ہے۔

۷۔ وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ
وَمِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ ابْنِ مَرْيَمَ
وَأَخَذْنَا مِنْهُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا

۸۔ لَيْسَ لَكَ الصُّدَقِينَ عَنْ صِدْقِهِمْ وَأَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ
عَذَابًا أَلِيمًا

ترجمہ

۷۔ اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے پیغمبروں سے عہد لیا اور تجھ سے اور
نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم سے اور ان سب سے ہم نے محکم
پیمان لیا کہ تبلیغ و رسالت اور رہبری کی ادائیگی کے فرائض میں کوتاہی
نہ کریں۔

۸۔ تاکہ خدا بچوں کی صداقت کے بارے میں سوال کرے اور کافروں کے
لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تفسیر

خدا کا محکم عہد و پیمان:

چونکہ گذشتہ آیات میں پیغمبر اسلام کے وسیع اختیارات "النَّبِيِّينَ أُولَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنَ الْفَسْهَةِ" کے عنوان
کے تحت بیان ہوئے، ذریعہ بحث آیات میں پیغمبر اسلام اور باقی عظیم انبیاء کے زبردست اور سنگین فرائض کو بیان کرتا ہے

کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہمیشہ اختیارات اور ذمہ داریاں لازم اور ملزم ہوتے ہیں اور جس جگہ "حقوق" موجود ہوں، وہاں فرائض
بھی ہوتے ہیں کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے سے کبھی بھی جدا نہیں ہو سکتے۔ اس بناء پر اگرچہ پیغمبر اسلام وسیع حق رکھتے
ہیں تو اس کے مقابلہ میں ان پر بھاری ذمہ داریاں بھی قرار دی گئی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے "یاد کرو اس وقت کو جب تم نے پیغمبروں سے عہد و پیمان لیا۔ اسی طرح تجھ سے اور نوح، ابراہیم، موسیٰ
اور عیسیٰ بن مریم سے جب ہاں ان سب سے ہم نے محکم پیمان لیا: "وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ
وَمِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ ابْنِ مَرْيَمَ وَأَخَذْنَا مِنْهُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا"۔
اس طرح سے پہلے تو تمام انبیاء کو مسئلہ ميثاق میں پیش کرتا ہے۔ پھر پانچ اولوالعزم پیغمبروں کے نام سے
ہیں کہ سب سے پہلے پیغمبر اسلام کی ذات کا ذکر ان کی شرافت و عظمت کی وجہ سے جو وہ رکھتے ہیں آیا ہے۔ اس کے بعد
چار دوسرے اولوالعزم پیغمبر زما، ظہور کی ترتیب کے ساتھ نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ ذکر ہوئے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ عہد و پیمان سب کے لیے عمومی تھا، جو تمام انبیاء سے لیا گیا جبکہ اولوالعزم زیادہ تاکید
کے ساتھ اس پیمان کے پابند تھے۔ ایسا پیمان جو "أَخَذْنَا مِنْهُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا" کے قبلہ کے ساتھ حد سے زیادہ
تاکید کو ظاہر کرتا ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ یہاں ہم جانیں کہ وہ کونسا تاکید ہی عہد و پیمان تھا جس کے تمام پیغمبر زیر بار ہیں؟ مفسرین نے اس
مقام پر مختلف قسم کی گفتگو کی ہے۔ مجموعی طور پر جن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ سب ایک اصل کلی کی مختلف
شاخیں ہیں اور وہ پیمان تمام مراحل میں فریضہ تبلیغ و رسالت کی ادائیگی، لوگوں کی قیادت اور ہدایت کے فرائض کو پورا کرنا
ہے۔

وہ پابند تھے اور ان کے فرائض میں شامل تھا کہ تمام انسانوں کو ہر چیز سے پہلے توحید کی دعوت دیں۔
 نیز اس کے بھی پابند تھے کہ ایک دوسرے کی تائید کریں اور پہلے انبیاء اپنی امتوں کو پیغمبروں کو قبول کرنے کے لیے
آمادہ کریں جیسا کہ بعد واسے پیغمبر سابقہ انبیاء کی دعوت کی تصدیق و تائید کریں۔
 خلاصہ یہ کہ سب کی دعوت کا رخ ایک ہو اور سب ایک ہی حقیقت کی تائید کریں اور امتوں کو ایک ہی پرہم
کے گرد جمع کریں۔

اس بات کی شہادت باقی آیات قرآن میں بھی مل سکتی ہے سورہ آل عمران کی آیت ۸۱ میں ہم پڑھتے ہیں: "وَإِذْ أَخَذَ
اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ تَشْرَعُوا بِهِمْ تَقُولُونَ إِنَّا نَعْلَمُ مَا نَعْلَمُ
لَمَّا مَعَكُمْ لَتَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ قَالَ إِذْ أَقْرَبْتَهُمْ وَأَخَذْتَهُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ

لے "ميثاق" جیسا کہ اغلب نے منادات میں کہا ہے، ایسے تاکید ہی پیمان کے معنی میں ہے جو قسم و عہد سے تو اہم ہوا ہے اس بناء پر "غلیظاً"
کا ذکر اس معنی پر مزید تاکید ہے۔

اصری قالوا اقرنا قال فشاہدوا وانا معکم من الشاہدین۔

(اس وقت کو یاد کرو) جب خدا نے پیغمبروں (اور ان کے پیروکاروں) سے پختہ عہد و پیمانہ لیا کہ جس وقت میں تمہیں کتاب و حکمت دول اور پھر تمہاری طرف ایک پیغمبر آئے گا جو اس چیز کی تصدیق کرے گا جو تمہارے ساتھ ہے تو اس پر ایمان لے آنا اور اس کی نصرت بھی کرنا۔ پھر (خدا نے) ان سے کہا کیا تم نے اس موضوع کا اقرار کر لیا اور اس پر پختہ عہد و پیمانہ باندھ لیا ہے؟ تو انہوں نے کہا ہاں، ہم نے اقرار کیا تو خدا نے ان سے فرمایا (اس مقدس عہد و پیمانہ پر) گواہ رہو، میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔

اس طرح ایک اور معنی سورہ آل عمران کی آیت ۵۴ میں بھی آیا ہے جس میں سہامت کے ساتھ کہتا ہے کہ خدا نے اہل کتاب سے عہد و پیمانہ لیا ہے کہ وہ لوگوں کے لیے آیات الہی کو بیان کریں اور انہیں مرگزنہ چھپائیں۔

اسی طرح سے خدا نے انبیاء سے بھی حکم عہد و پیمانہ لیا ہے کہ لوگوں کو توحید خدا، دین حق اور ایمان آسمانی کی وحدت کی غرض و عورت دیں اور علماء اہل کتاب سے بھی کہ وہ جتنا جو سکے دین الہی کو بیان کرنے کی کوشش کریں اور اسے چھپانے سے منکر رہیں۔

بعد والی آیت بخت انبیاء اور اس پختہ عہد و پیمانہ کے مقصد کو جو ان سے لیا گیا ہے اس طرح بیان کرتی ہے "فرضیہ کہ خدا پھول کی صداقت کے بارے میں پوچھے اور کفار کے لیے دردناک عذاب تیار کیا ہے" (لیسئل الصادقین عن صدقہم واعد للکافرین عذاباً الیماً)۔

یہاں "صادقین" سے کون لوگ مراد ہیں؟ اور یہ سوال کیا سوال ہے؟ مفسرین نے اس کی بہت سی تفسیر بیان کی ہیں۔ لیکن جو کچھ ان آیات اور قرآن کی دوسری آیات سے ہم آہنگ نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ مومنین ہیں جو اپنے دعووں کی سچائی میں عملی ثبوت پیش کریں۔ دوسرے لفظوں میں آزمائش کے میدان اور خدائی امتحان میں سرخرو اور سرفراز ہوں۔ اس بات کا شاہد یہ ہے کہ:

(وَلَا يَصْدَقِينَ) "کلمہ یہاں پر کافرن" کے مقابلہ میں آیا ہے اور مقابلہ کے قرینہ سے یہ معنی بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

ثانیاً، اسی سورہ الاحزاب کی آیت ۲۳ میں یوں پڑھتے ہیں،

"من المؤمنین رجال صدقوا ما عاهدوا اللہ علیہ"

"مومنین میں سے ایک ایسا گروہ بھی ہے جو اس عہد و پیمانہ میں پہنچے ہیں جو انہوں نے خدا کے ساتھ باندھا ہے اور اس عہد پر کاربند ہیں۔

پھر فرمائی آیت نمبر ۲۱ میں فرماتا ہے،

"لیجزی اللہ الصادقین بصدقہم وبعذب المنافقین ان شاء اویتوب علیہم"

"مقصود یہ ہے کہ صادقین کو ان کے صدق کے بدلے اجر و جزا دے اور جب چاہے منافقین کو عذاب کرے یا ان کی توبہ قبول کرے۔"

مثلاً: سورہ حجرات کی آیت پنہارہ اور سورہ شوریٰ کی آیت ۱۸ میں "صادقین" کا اچھے طریقے سے تعارف ہوا ہے۔

چنانچہ سورہ حجرات میں ہے،

"انما المؤمنون الذین امنوا باللہ ورسولہ شہد لہم ربہم وجاهدوا باسم اللہ وفسھم فی سبیل اللہ اولئیک حسناتھم انھم یؤمنون"

"واقعی مومن وہ ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے، جنہیں اللہ کے ساتھ راہ خدا میں جہاد کیسی۔ یہی سادہ ترین ہیں۔

اور سورہ شوریٰ میں فرماتا ہے،

"للفقراء المهاجرین الذین اخرجوا من ديارهم واموالہم یتفقون فضلاً من اللہ ورضواناً وینصرون اللہ ورسولہ اولئیک ہما المتصدقون"

"وہ مال غنیمت جو جنگ کے بغیر مسلمانوں کے ہاتھ آتا ہے، مہاجر فقراء کے لیے ہے، وہی جو اپنے گھروں اور مالوں سے باہر نکلنے گئے ہیں، اس حالت میں کہ وہ پروردگار کے فضل و کرم اور اس کی رضا کے طالب ہیں، جو خدا اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں وہی "صادقین" ہیں۔"

اس طرح سے واضح ہو گیا کہ "صادقین" سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین خدا کی حمایت کے میدان میں جہاد اور مشکلات کے سامنے استقامت اور ایستادگی اور جان و مال کے خرچ کرنے میں اپنی صداقت اور راستگاری کو پایہ ثبوت تک پہنچا دیا ہے۔

یہاں یہ سوال کہ "صادقین سے صدق کے متعلق سوال کرنے سے کیا مراد ہے؟ تو جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اگر اس کی طرف توجہ کی جائے تو واضح ہو رہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ آیا وہ اپنے اعمال میں غلطیوں سے توبہ اور اپنے دعوے کی صداقت کو پایہ ثبوت تک پہنچاتے ہیں یا نہیں؟ راہ خدا میں خرچ کرنے میں جہاد میں، مشکلات کے مقابلہ میں، صبر و

لہ مفسرین کی ایک جماعت نے آیت کے معنی میں ایک اور احتمال بھی دیا ہے کہ "صادقین" سے مراد یہاں پر خوراجیہ و عیسائیہ ملیم اسلام ہیں اور ان سے قیامت کے دن سوال ہوگا کہ انہوں نے کس حد تک اپنے عہد و پیمانہ پر عمل کیا ہے؟ لیکن مذکورہ بالا تینوں شاہد اس تفسیر کی تائید کرتے ہیں۔ یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ یہ ایک عام کلمہ ہے جس سے انبیاء اور مومنین دونوں مراد ہیں۔ لیکن جو تفسیر اوپر کر کے گئی ہے وہ اس کی تائید اور قرآن پاک کی دوسری آیتوں کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے۔

شکیبانی میں، خصوصاً میدان جنگ کی سختیوں میں۔

یہ سوال کہاں اٹھایا جائے گا اور کہاں صورت پذیر ہوگا؟ آیت کا غلط ہر تو یہ بناتا ہے کہ یہ سوال بروز قیامت پروردگار عالم کی دادگاہ عدل میں ہوگا! قرآن کی متعدد آیات بھی قیامت کے دن اس قسم کے سوال کے تحقق کی کئی طور پر خبر دیتی ہیں۔ لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ یہ سوال، عملی سوال کی حیثیت رکھتا ہو اور دنیا میں ہی صورت پذیر ہو۔ کیونکہ انبیاء کی بعثت کے ساتھ ہی تمام اہل ایمان مسؤل قرار پاتے ہیں اور ان کا عمل اس سوال کا جواب ہے کہ کیا وہ اپنے دعوے میں پیٹھے ہیں۔

۹۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ۱۰
 إِذْ جَاءُوكُمْ مِنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ
 إِذْ زَاغَتْ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ
 وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونًا ۱۱
 هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا ۱۱

ترجمہ

۹۔ اے وہ لوگ جو ایمان لائے ہو! اپنے اوپر خدا کی نعمت کو یاد کرو، اس وقت کہ جب (عظیم) لشکر تمہاری طرف آئے۔ لیکن ہم نے سخت آندھی اور طوفان ان پر بھیجا اور ایسے لشکر جنہیں تم نہیں دیکھ سکے (اور اس طرح سے انہیں درہم برہم کر دیا) اور جسے تم انجام دیتے ہو، خدا سے دیکھ رہا ہے۔
 ۱۰۔ اس وقت کو یاد کرو، جب وہ تمہارے (شہر کے) اوپر اور نیچے سے وارد ہوئے (اور مدینہ کا محاصرہ کر لیا) اور اس وقت کو جب کہ آنکھیں شدت و وحشت سے نیرہ ہو گئی تھیں اور جان لبول تک پہنچ چکی تھی اور تم خدا کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں کر رہے تھے۔

۱۱۔ وہاں مومنین کی آزمائش کی گئی اور وہ سختی سے بل گئے۔

تفسیر

میدان احزاب میں کڑی آزمائش

یہ اور چند بعد والی آیات جو مجھدی طور پر سترہ آیات بنت ہیں اور مومنین اور منافقین کے بارے میں خدا کی کڑی آزمائش اور عمل کے سلسلہ میں ان کے صدق گفتار کے امتحان کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں، آپس کے متعلق گذشتہ آیات میں بحث ہو چکی ہے۔

یہ آیات تاریخ اسلام کے ایک اہم ترین حادثہ یعنی جنگ احزاب کے متعلق گفتگو کرتی ہیں، ایسی جنگ جو تاریخ اسلام میں ایک اہم تاریخی موڑ ثابت ہوئی اور اسلام و کفر کے درمیان طاقت کے موازنے کے پڑے کو مسلمانوں کے حق میں جھکا دیا اور اس کی کامیابی آئینہ دنیا کی عظیم کامیابیوں کے نیلے کھینچی حیثیت اختیار کر گئی اور حقیقت یہ ہے کہ اس جنگ میں دشمنوں کی کمزوری اور اس کے بعد وہ کوئی خاص قابل ذکر کامیابیوں کے قابل نہ رہ سکے۔

یہ جنگ احزاب "جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے، تمام مسلمان دشمن طاقتوں اور ان مختلف گروہوں کی طرف سے ہر طرح کا مقابلہ تھا اور اس دین کی ترقی و ترقی کے نام سے ان لوگوں کے ناجائز مفادات خطرے میں پڑ گئے تھے۔

جنگ کی آگ کی چمکا رہی، خوفناک اور دلچسپ، ایک گروہ کی طرف سے بھڑکی ہوئی آگ اور قبیلہ "قریش" کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ زبردستی پر کھینچا اور ان سے وعدہ کیا کہ آخری دم تک ان کا ساتھ دیں گے۔ پھر قبیلہ "مظناں" کے پاس گئے اور انہیں جی کارزار کے لیے آمادہ کیا۔

ان قبائل نے اپنے ہم پیمان اور علیوں مثلاً قبیلہ "بنی اسد" اور "بنی سلیم" کو بھی دعوت دی اور چونکہ یہ سب قبائل خطرہ محسوس کیے ہوئے تھے، لہذا اسلام کا کام ہمیشہ کے لیے تمام کرنے کے لیے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا، تاکہ وہ اس طرح سے پیغمبر کو شہید، مسلمانوں کو سرکوب، مدینہ کو غارت اور اسلام کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل کر دیں۔

لہذا انہوں نے جب اپنے آپ کو ایک عظیم گروہ کے مقابلہ میں دیکھا تو حکم رسالت پناہ سے مشورہ کرنے بیٹھ گئے اور سب سے پہلے مسلمان فارسی یعنی اللہ عنہ کی پیشکش پر مدینہ کے اطراف میں خندق کھودی گئی، تاکہ دشمن اسے آسانی کے ساتھ عبور نہ کر سکے اور شہر لوٹ مار سے بچ جائے، اسی بنا پر اس جنگ کا ایک نام "جنگ خندق" بھی ہے۔ مسلمانوں پر بہت سخت اور خطرناک لحاظات گزر رہے تھے۔ جانیں بول تک آتی ہوئی تھیں، منافقین لشکر اسلام کے درمیان زبردست ٹکٹ دو میں پڑے ہوئے تھے، دشمن کا انہوہ کوئی اور اس کے مقابلہ میں لشکر اسلام کی کمی

لشکر کفر کی تعداد دس ہزار اور لشکر اسلام کی تین ہزار تھی ہے، دشمن کی تیاری، جنگی ساز و سامان اور ضروری وسائل کی فراہمی ایک سخت اور درناک مستقبل کو مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے مجسم کر رہے تھے۔

لیکن خدا چاہتا تھا کہ یہاں بیکر کفر پر آخری ضرب پڑے اور منافقین کو مسلمانوں کی صفوں سے جدا کر دے، سازشی عناصر کا بھانڈا پھوڑ دے اور سچے مسلمانوں کو آزمائش کی بجلی میں ڈالے۔

آخر کار یہ جنگ جیسا کہ اس کی تفصیل آگے آئے گی مسلمانوں کی کامیابی پر منتج ہوئی، حکم خدا سے سنت آمدھی عمل جس نے کفار کے یمنے، تنہو اور تمام بساط زندگی کو لپیٹ کر رکھ دیا، ان کے دلوں میں زبردست رعب و وحشت ڈال دی اور دشمن کی نفسی طاقتیں مسلمانوں کی مدد کے لیے زچھیں۔

عمر بن عبدود کے مقابلہ میں حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی تدرت نمانی عینی عجیب و غریب خدائی طاقتوں کے مظاہرے کا اضافہ ہوا اور مشرکین کوئی کارنامہ سرانجام دینے بغیر جھاگ کھڑے ہوئے۔

اوپر والی سات آیات میں مشرکین کی سرکوبی کرنے والا تجزیہ و تحلیل پیش کیا گیا ہے اور اسلام کی فیصلہ کن کامیابی اور منافقین کی سرکوبی کو احسان انداز میں بیان فرمایا ہے۔

یہ سختی جنگ احزاب کی ایک جھلک جو ہجرت کے پانچویں سال واقع ہوئی، یہاں سے ہم آیات کی تفسیر کی طرف جاتے ہیں اور اس جنگ کی دیگر تفصیلات اور نکات کو بحث کے لیے اٹھائے رکھتے ہیں۔

قرآن اس ماجرا کو پہلے تو ایک ہی آیت میں خلاصہ کرتا ہے، پھر دوسری ۱۲ آیات میں اس کی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے کتاب ہے، "اسے وہ لوگ جو ایمان لائے جو اپنے اوپر خدا کی عظیم نعمت کو یاد کرو، اس موقع پر جب کہ عظیم لشکر تمہاری طرف آئے، "یا ایہا الذین آمنوا اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جاءکم جنود"۔

"لیکن ہم نے ان پر آدمی اور طوفان بھیجے اور ایسے لشکر جنہیں تم نہیں دیکھتے تھے، اور اس ذریعہ سے ہم نے ان کی سرکوبی کی اور انہیں تتر بتر کر دیا، "افارسلنا علیہم رجیمًا و جنودًا لم تروہا"۔

"اور خدا ان تمام کاموں کو جنہیں تم انجام دیتے ہو دکھ رہا ہے (اور وہ کام بھی جو ہر گروہ نے اس عظیم میدان میں انجام دیئے) بصیر اور بینا ہے، "وکان اللہ بما تعملون بصیرًا"۔

لے جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے، اس تفصیل کا ایک اجمالی خاکہ ہے جسے اسلامی مورخین نے منجملہ "ابن اثیر" و "کامین" میں درج کیا ہے۔

چند قابل غور مطلب:

- ۱- "اذکروا" کی تعبیر بتاتی ہے کہ یہ آیات جنگ کے ختم ہونے اور کچھ وقت گزر جانے کے بعد نازل ہوئیں یعنی اب مسلمانوں کے لیے موقع تھا کہ جو کچھ انھوں نے دیکھا تھا، اس کا اپنی فکر و نظر کے مطابق تجزیہ و تحلیل کریں تاکہ اس کا گہرا اثر ہو۔
- ۲- "جنود" کی تعبیر زمانہ جاہلیت کے مختلف گروہ اور قبائل کی طرف اشارہ ہے، اشٹل قریش، عطفان، بنی سبیر، بنی اسد، بنی فزارہ، بنی اشج، اور بنی سترہ، جن میں مدینہ کے اندر رہنے والا یہودیوں کا قبیلہ بھی ہے۔
- ۳- "جنوداً لکھتروہا" سے مراد جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت کے لیے آئے تھے، وہی فرشتے تھے جن کا غوشین کی جنگ بدر میں مدد کرنا بھی صراحت کے ساتھ قرآن مجید میں آیا ہے۔ لیکن جیسا کہ سورۃ الفال کی آیت ۹ کے ذیل میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ فرشتے آنے والا فرشتوں کا خدائی لشکر باقاعدہ طور پر میدان میں داخل ہوا اور وہ جنگ میں بھی مصروف ہوا بلکہ ایسے قرآن موجود ہیں جو واضح کرتے ہیں کہ وہ صرف مومنین کے ترسے بند کرنے اور ان کا دل گرمانے کے لیے نازل ہوئے تھے۔
- بعد والی آیت جو جنگ احزاب کی بحرانی کیفیت، دشمنوں کی عظیم طاقت اور محبت سے مسلمانوں کی شدید پریشانی کی تصویر کشی کرتے ہوئے یوں کہتی ہے: "اس وقت کو یاد کرو جب وہ تمہارے شہر کے اوپر اور نیچے سے داخل ہو گئے۔ اور مدینہ کو اپنے محاصرہ میں لے لیا، اور اس وقت کو جب آنکھیں شدت و وحشت سے پتھر لگی تھیں اور جان لبوں تک آتی ہوئی تھی اور خدا کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں کرتے تھے: (اذ جاووکم من فوقکم ومن اسفل منکم واذ زاغنت الابصار وبلغت القلوب الحناجر ووظننوا بالله الظنوناً۔)
- بہت سے مفسرین اس آیت میں لفظ "فوق" کو مدینہ کی مشرقی جانب کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کیونکہ تعبیراً عطفان اور سے دار ہوا تھا۔ اور "اسفل" (نیچے) کو مغرب کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کیونکہ "قریش اور ان کے ساتھی وہیں سے داخل ہوئے تھے۔
- البتہ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ مکہ ٹھیک مدینہ کی جنوبی سمت میں واقع ہے لہذا مشرق میں مکہ کے قبائل کو جنوب سے آنا چاہیئے لیکن شاید شہر مدینہ میں داخل ہونے کے راستے کی کیفیت کچھ اس طرح تھی کہ انھوں نے شہر کا پتھر سا چکر لگا یا: اور مغرب کی طرف سے شہر کے اندر آگئے۔ صورت حال خواہ کچھ بھی ہو، اور پر والا جملہ اسلام کے مختلف دشمنوں کی طرف سے اس شہر کے محاصرہ کی طرف اشارہ ہے۔

۱۰۔ اس سلسلے میں مزید وقت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۹ میں مذکورہ آیت کے ذیل میں جرح کریں۔

"زاغنت الابصار" کے معنی میں "لفظ زغنت" ذریعہ کے مادہ سے ایک طرف جھکاؤ کے معنی میں ہے جو ایسی حالت کی طرف اشارہ ہے جو زبردست خوف اور وحشت کی صورت میں انسان پر طاری ہوتی ہے۔ اس وقت اس کی آنکھیں ہر طرف سے ہٹ کر ایک معین لفظ پر ٹھہر جاتی ہیں اور خیرہ ہو جاتی ہیں۔

"بلغت القلوب الحناجر" اول، حقیقہ تک پہنچ چکے تھے، کا جملہ ایک عمدہ جملہ ہے جس طرح فارسی زبان میں بھی ہے کہ اس کی جان ہوں تک پہنچ گئی، ورنہ دل جس کا ایک مخصوص معنی ہے یعنی جو خون کی تقسیم کا مرکز ہے کسی سببی صورت میں اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا اور نہ ہی کبھی حلق تک پہنچتا ہے۔

اور "وظننوا بالله الظنوناً" کا جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ اس کیفیت سے مسلمانوں کی ایک جماعت کے لیے غلط قسم کے گمان پیدا ہو گئے تھے کیونکہ وہ ابھی تک ایمانی قوت کے حاملہ کمال کے مرحلہ تک نہیں پہنچ پائے تھے۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں بعد والی آیت میں کہتا ہے کہ وہ شدت سے متزلزل ہوئے۔

شاید ان میں سے کچھ لوگ گمان کرتے تھے کہ آخر کار ہم شکست کھا جائیں گے اور اس قدرت و قوت کے ساتھ دشمن کا لشکر کامیاب ہو جائے گا۔ اسلام کے زندگی کے آخری دن آپہنچے ہیں اور پیغمبر کا کامیابی کا وعدہ کبھی پورا ہونا دکھائی نہیں دیتا۔

البتہ یہاں ذکا و نظر بات ایک عقیدہ کی صورت میں نہیں بلکہ ایک دوسرے کی شکل میں بعض لوگوں کے دل کی گہرائیوں میں پیدا ہو گئے تھے بالکل ویسے ہی جیسے جنگ احد کے سلسلے میں قرآن مجید ان کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے: "وظننوا انفسہم انفسہم یظننوا بالله غیباً الحق ظن الجاہلیۃ" یعنی تم میں سے ایک گروہ جنگ کے ان بحرانی لمحات میں صرف اپنی جان کی فکر میں تھا اور جاہلیت کے دور کے گمانوں کی مانند خدا کے بارے میں غلط گمان رکھتے تھے۔ (آل عمران ۱۵۴)

البتہ اصل بحث آیت میں مخاطب یقیناً مسلمان ہیں اور "یا ایہذا الذین امنوا" کا جملہ جو اس سے قبل کی آیت میں ہے اس معنی کی دلیل سے اور جنہوں نے ان کا مخاطب منافقین کو سمجھا ہے گویا انھوں نے یا تو اس نکتہ کی طرف توجہ نہیں کی یا پھر خیال کیا کہ اس قسم کی بدگمانی ایمان اور اسلام کے ساتھ میل نہیں کھاتی۔ حالانکہ اس قسم کے انکار کا دوسرے کی حد تک ظاہر ہونا اور وہ بھی سخت بحرانی حالات میں ایک فحری اور معمول کے مطابق بات ہے۔

یہی وہ منزل تھی کہ خدائی آسمان کی بھی سخت گرم تھی جیسا کہ بعد والی آیت کہتی ہے کہ "وہاں مومنین کو آزمایا گیا اور وہ سخت بل گئے تھے: اھنا لک امبلی المؤمنون وزلزلوا زلزلاً شدیداً۔"

فطری امر ہے کہ جب انسان فکری طوراً ان لوگوں میں گھر جاتا ہے تو اس کا جسم بھی ان طوفانوں سے لالعلق نہیں رہ سکتا۔ بلکہ

۱۱۔ مفسرین کی ایک جماعت نے یہاں "ظنون" کا عمومی معنی اپنے اور بڑے گمان کہا ہے لیکن اس آیت میں اور اس سے بعد والی آیت میں جو جہد قرآن بتاتے ہیں کہ مراد بڑے گمان ہیں۔

وہ بھی اضطراب اور تزلزل کے سندر میں ڈوب جا آئے۔ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ جب لوگ ذہنی طور پر پریشان ہوتے ہیں تو وہ جہاں بھی بیٹھے ہوتے ہیں اکثر بے چین رہتے ہیں، ہاتھ ملتے رہتے ہیں اور اپنے اضطراب اور پریشانیوں کو اپنی حرکت سے ظاہر کرتے رہتے ہیں۔

اس شدید پریشانی کے نشاہ میں سے ایک یہ بھی تھا جسے مورخین نے بھی نقل کیا ہے کہ عرب کے پانچ مشہور جنگجو پہلوان جن کا سرخیل عربوں میں عدد و ستا، جنگ کا لباس پہن کر اور مخصوص غرور اور شجرت کے ساتھ میدان میں آئے اور اہل من مبارزہ دہست کوئی مقابلہ کرنے والا نہ کی آواز گانے لگے، خاص کو عربوں میں بعد در بدر چڑھ چڑھ کر جنت اور آخرت کا مذاق اڑا رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا کہ کیا تم یہ نہیں کہتے جو کہ تمہارے مقتول جنت میں جائیں گے، تو کیا تم میں سے کوئی بھی جنت کے دیوار کا شوقین نہیں ہے؟ لیکن اس کے ان نغروں کے مقابلہ میں لشکر پر بری طرح خاموشی طاری تھی اور کوئی بھی مقابلے کی جرات نہیں رکھتا تھا سوائے علی بن ابی طالب کے جو مقابلہ کے لیے کھڑے ہوئے اور مسلمانوں کو حشیر کا میاں سے ہم کنار کر دیا۔ اس کی تفصیل نکات کی بحث میں آئے گی۔

جی ہاں! جس طرح فولاد کو گرم بھیجی میں ڈالتے ہیں تاکہ وہ ٹھکرائے اسی طرح احوال کے مسلمان بھی جنگِ احزاب میں معرکوں کی بھی گرمیوں میں تاکہ کندہان بن کر ٹھیکیں اور حواذات کے مقابل میں جرات اور پامردی کا مظاہرہ کر سکیں۔

۱۲- **وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ
مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا** ○

۱۳- **مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوا وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ مِنْهُمْ
إِنْ يُرِيدُونَ الْإِفْرَارَ** ○

۱۴- **وَلَوْ دَخَلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ أَقْطَارِهَا شِمْسٌ سَبِيلُوا
الْفِتْنَةَ لَأَتَوْهَا وَمَاتَتْ شَوَابِهَا إِلَّا يَسِيرًا** ○

۱۵- **وَلَقَدْ كَانَ نَوَاعِمُهَا مَعَهُ وَاللَّهُ مِنْ قَبْلِ لَا يُولُونَ
إِلَّا دُبَارًا وَكَانَ عَهْدُ اللَّهِ مَسْئُولًا** ○

۱۶- **قُلْ لَنْ يَنْفَعَكُمْ الْفِرَارُ إِنْ فَرَرْتُمْ مِنَ الْمَوْتِ
أَوِ الْقَتْلِ وَإِذْ الْأَتْمَثَعُونَ الْأَقْلِيلَ** ○

۱۷- **قُلْ مَنْ ذَا الَّذِي يَعْصِمُكُمْ مِنَ اللَّهِ إِنْ أَرَادَ بِكُمْ
سُوءًا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً وَلَا يَجِدُونَ لَهُمْ
مَنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا** ○

ترجمہ

۱۲۔ اس وقت کو یاد کرو جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری تھی، کہتے تھے کہ خدا اور اس کے رسولؐ نے ہمیں جھوٹے وعدوں کے سوا کچھ نہیں دیا۔

۱۳۔ اس وقت کو بھی یاد کرو جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا، اے اہل یثرب (مدینہ والو!) یہاں تمہارے ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہیں ہے، اپنے گھروں کی طرف پلٹ جاؤ اور ان میں سے ایک گروہ پیغمبرؐ سے واپس پلٹ جانے کی اجازت لیتا اور کہتا تھا، ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں۔ حالانکہ وہ غیر محفوظ نہیں تھے بلکہ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ جنگ سے بھاگ جائیں۔

۱۴۔ وہ تو ایسے لوگ تھے کہ اگر دشمن مدینہ کے اطراف و جوانب سے ان پر وارد ہوتے اور ان کو مشرک کی طرف لوٹ جانے کی پیشکش کرتے تو وہ ضرور قبول کر لیتے اور سوائے تھوڑی سی مدت کے اس راہ کے انتخاب کرنے سے دریغ نہ کرتے۔

۱۵۔ انہوں نے اس سے پہلے خدا سے عہد کیا تھا کہ وہ دشمن کی طرف پشت نہیں کریں گے۔ اور خدا کے عہد و پیمان کے بارے میں ان سے سوال کیا جائے گا (اور وہ اس کے سامنے جواب دہ

ہوں گے)۔

۱۴۔ کہہ دیجیے کہ اگر موت یا مارے پانے سے فرار کرتے ہو تو وہ تمہارے لیے سود مند نہیں ہے اور اس وقتی زندگی کے تھوڑے سے فائدہ کے سوا تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔

۱۵۔ کہہ دیجیے کہ خدا کے ارادے کے مقابلہ میں کون تمہاری حفاظت کر سکے گا؟ اگر اس نے تمہارے لیے مصیبت یا رحمت کا ارادہ کر لیا ہے؟ اور خدا کے علاوہ تمہیں کوئی بھی سرپرست اور یار دیاور نہیں ملے گا۔

تفسیر

منافقین اور ضعیف الایمان میدانِ احزاب میں:

ہم کہہ چکے ہیں کہ استمان کی بڑی جنگ احزاب میں گرم ہوئی اور سب کے سب اس عظیم امتحان میں گھر گئے۔ واضح رہے کہ اس قسم کے جراتی دور میں جو لوگ عام حالات میں ظاہراً ایک ہی صف میں قرار پاتے ہیں، کئی صفوں میں بٹ جاتے ہیں۔ یہاں پر بھی مسلمان مختلف گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک جماعت پتے موئین کی تھی، ایک گروہ ہٹ و دھرم اور سخت قسم کے منافقین کا تھا اور ایک گروہ اپنے گھر بار، زندگی اور بھاگ کھڑا ہونے کی فکر میں تھا۔ اور کچھ لوگوں کی یہ کوشش تھی کہ دو گروہوں کو جہاد سے روکیں۔ اور ایک گروہ اس کوشش میں مصروف تھا کہ منافقین کے ساتھ اپنے رشتہ کو محکم کریں۔ غلامیہ یہ کہ ہر شخص نے اپنے باطنی اسرار اس عجیب "عرصہ محشر" اور یومِ اہر روز" میں آشکار کر دیئے۔

گذشتہ آیات میں ضعیف الایمان مسلمانوں کی جماعت کے بارے میں اور بڑے دوسوں اور بدگمانوں کے بارے میں جو اخصی لائق تھیں گفتگو ہو رہی تھی۔ اور قرآن پہلی زیر بحث آیت میں منافقین اور ان کے پیارے لوگوں کے بارے میں گفتگو کو بیان کر رہا ہے۔ فرماتا ہے۔ "اس وقت کو یاد کرو جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دل پیارتھے، کہتے تھے کہ خدا اور اس کے رسولؐ نے سوائے جھوٹے وعدوں کے ہمیں کچھ نہیں دیا" (واذ یقول المنافقون

قلوبہم مرض ما وعدنا اللہ ورسولہ (اعزروا)۔

جنگِ احزاب کی تاریخ میں آیا ہے کہ خندق کھودنے کے دوران میں جب ہر ایک مسلمان خندق کے ایک حصے کو کھودنے میں مصروف تھا تو ایک مرتبہ پتھر کے ایک تخت اور بڑے ٹھوسے سے ان کا سامنا ہوا کہ جس پر کوئی مہتور یا کارگر ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر دی گئی تو آنحضرت بنفس نفیس خندق میں تشریف لے گئے اور اس پتھر کے پاس کھڑے ہو کر اور پتھر اسے کہ پہلی مرتبہ ہی اس کے دل پر ایسی مضبوط چوٹ لگا کر کہ اس کا کچھ حصہ بڑھ بڑھ ہو گیا اور اس سے ایک پتھر نکل گیا جس پر آپ نے فتح و کامرانی کی تحکیر بلند کی۔ آپ کے ساتھ دوسرے مسلمانوں نے بھی تحکیر کی۔

آپ نے ایک اور سخت چوٹ لگائی تو اس کا کچھ حصہ اور ٹوٹا اور اس سے بھی پتھر نکل گیا۔ اس پر بھی سرور کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تحکیر کی اور مسلمانوں نے بھی آپ کے ساتھ تحکیر کی اور آپ نے سری ریش لگائی جس سے پہلی کوئی اور باقی ماندہ پتھر بھی ٹوٹ گیا۔ حضرت اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پتھر تحکیر کی اور مسلمانوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس موقع پر جناب سلمان فارسی نے اس ماجرہ کے بارے میں دریافت کیا تو سرکار رسالت مآب نے فرمایا: "پہلی چمک میں میں نے "سیرہ" کی سرزمین اور ایران کے بادشاہوں کے قصر و محلات دیکھے ہیں اور جبرائیل نے مجھے بشارت دی ہے کہ میری امت ان پر کامیابی حاصل کرے گی۔ دوسری چمک میں "شام اور روم" کے سرخ رنگ کے محلات نمایاں ہوئے اور جبرائیل نے پھر بشارت دی کہ میری امت ان پر فتح پائے گی۔ تیسری چمک میں مجھے "صنعا و مین" کے قصر و محلات دکھائی دیئے اور جبرائیل نے نوید دی کہ میری امت ان پر بھی کامیابی حاصل کرے گی، اے مسلمانو! تمہیں خوشخبری ہو!!

منافقین نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا کہ یہ عجیب و غریب باتیں ہیں اور کیا ہی باطل اور بے بنیاد پروردگار ہے؟ مدینہ سے حیرہ اور مدائن کسری کو تو دیکھ کر تمہیں ان کے فتح ہونے کی خبر دیتا ہے۔ حالانکہ اس وقت تم چندوں کے چنگل میں گرفتار ہو (اور خود ناصحی پوزیشن اختیار کیے ہوئے ہو) تم تو بیت المقدس (خوف کی جگہ) تک نہیں جاسکتے کیا ہی خیال غامد اور گمان باطل ہے؟

تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور کہا کہ یہ منافق اور دل کے مریض کہتے ہیں کہ خدا اور اس کے رسول نے سوائے دھوکے فریب کے ہمیں کوئی وعدہ نہیں دیا۔ (وہ پروردگار کی بے انتہا قدرت سے بے خبر ہیں) یہ لہ اس وقت اس قسم کی بشارت اور خوشخبری سوائے آگاہ اور باخبر مومنین کی نظر کے (باقی لوگوں کے لیے) دھوکا اور فریب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی لیکن پیغمبر کی علوقی آنکھیں ان آتشیں چنگاریوں کے درمیان سے جو کمانوں اور چوڑوں کے

ملے کامل ابن اثیر جلد ۲ ص ۱۰۰ سیرۃ ابن ہشام میں بھی یہی واقعہ مختصر سے نسخہ کے ساتھ ذکر ہوا ہے اور وہ یہ کہ آنحضرت نے فرمایا، بھئی کی پہلی کوئی نہیں نے فتح میں کوئی اور دوسری کوئی نہیں فتح شام و مغرب اور تیسری چمک میں مشرق اور زمین پرانے کی فتح دکھائی گئی ہے۔ تاریخی حقائق سے بھی ان تینوں علاقوں کی فتح ترقیبی حیرت پر نہ ہونگے۔

خندق کھودنے کے لیے زمین پر گئے سے نکلی تھیں، ایران، روم اور یمن کے بادشاہوں کے تصور و محلات کے دروازوں کے کھلنے کو دیکھ سکتے تھے اور اپنی جان کو تھیلی پر لیے جوئے بھی اُمت کو بشارت دے سکتے تھے اور آئندہ کے اسرار و رموز سے پردہ بھی اٹھا سکتے تھے۔

شاید یاد دہانی کی ضرورت نہ ہو کہ "الذین فی قلوبہم مرض" سے مراد وہ منافقین ہی تو ہیں اور اس جملہ کا ذکر درحقیقت "منافقین" کے لفظ کی وضاحت ہے جو چاہے آپ کا ہے۔ نفاق کی بیماری سے بڑھ کر اور کوئی بیماری ہو سکتی ہے؟ کیونکہ صحیح و سالم اور خدائی نظرت رکھنے والے انسان کا صرف ایک ہی چہرہ ہوتا ہے، وہ یا دوسے زیادہ چہروں والا انسان بنا۔ ہوتا ہے جو ہمیشہ اضطراب، تضاوت اور تناقض کا شکار ہوتا ہے۔

اس بات کی گواہ وہ آیت ہے جو سورہ بقرہ کی ابتدا میں آئی ہے اور منافقین کے بارے میں کہتی ہے:

"فقلوبہم مرض فزادہم اللہ مرضاً" (بقرہ - ۱۰)

ان کے دلوں میں ایک قسم کی بیماری ہے اور خدا ان کے اعمال کی بنا پر ان کی بیماری میں اضافہ کرتا ہے۔

بعد والی آیت میں منافقین اور دل کے بیمار لوگوں میں سے ایک خطرناک گروہ کے حالات تفصیل سے بیان کرتا ہے جو درپردہ کی نسبت زیادہ ہیبت اور آلوہ گناہ میں چنانچہ کہتا ہے "اور اس وقت کو بھی یاد کرو جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا اے شہداء مدینہ کے رہنے والو! یہاں تمہارے رہنے کی جگہ نہیں ہے، اپنے گھروں کی طرف لوٹ جاؤ؟" او ذقالت طائفۃ منہم یا اہل یشرب لامقام لکم فارجعوا۔

خلاصہ یہ کہ دشمنوں کے اس انہوہ کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ اپنے آپ کو مگر کہ راز سے نکال کر لے جاؤ اور اپنے آپ کو بلاکت کے اور بیوی بچوں کو قید کے حوالے نہ کرو۔

اس طرح سے وہ چاہتے تھے کہ ایک طرف سے تو وہ انصار کے گروہ کو لشکر اسلام سے جدا کر لیں اور دوسری طرف سے "انہی منافقین کا ٹولہ جن کے گھر مدینہ میں تھے، بنی اکرم سے اجازت مانگ رہے تھے کہ وہ واپس چلے جائیں اور اپنی اس واپسی کیلئے جیلے پلانے بنا رہے تھے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہمارے گھروں کے در در پور ضیک نہیں ہیں حالانکہ ایسا نہیں تھا اس طرح سے وہ میدان کو خالی چھوڑ کر فرار چاہتے تھے؟" (و یستأذن فریق منہم النسبی یقولون ان بیوتنا عورۃ وما ہی بعورۃ ان یریدون الافراز)۔

لفظ "عورۃ" "عار" سے ہے اور عورۃ اس چیز کو کہا جاتا ہے جسے ظاہر کرنا ننگ و عار کا باعث ہو۔ وہ شکاف جو گھر کی دیوار میں ظاہر ہوتے ہیں، اسی طرح سرحدوں کے نازک اور خطرناک مقامات اور وہ چیزیں جو راز سے انسان خوف کھاتا ہو، سب اسی زمرے میں آتے ہیں اور یہاں مراد وہ گھر ہیں جن کے قابل اطمینان در و دیوار نہ ہوں اور ہر وقت دشمن کے حملے کا خوف طاری رہتا ہو۔ منافقین اس قسم کا مدبر پیش کر کے یہ چاہتے تھے کہ وہ میدان جنگ چھوڑ کر اپنے گھروں میں جا کر رہ جائیں۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ قبیلہ "بنی حارثہ" نے کسی شخص کو حضور رسالت پناہ کی خدمت میں بھیجا اور کہا کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں اور انصار میں سے کسی کا گھر بھی ہمارے گھروں کی طرح نہیں اور ہمارے اور قبیلہ "غطفان" کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں۔

مدینہ کی مشرقی جانب سے حملہ آور ہو رہے ہیں۔ لہذا اجازت دیکھیں تاکہ ہم اپنے گھروں کو پلٹ جائیں اور جا کر اپنے بچوں کا دفاع کریں تو سرکار رسالت نے انہیں اجازت عطا فرمادی۔

جب یہ بات انصار کے سردار "سعد بن معاذ" کے گوش گزار ہوئی تو انہوں نے پیغمبر اسلام کی خدمت میں عرض کیا "سربکار! انہیں اجازت نہ دیکھئے، بخدا آج تک جب بھی کوئی مشکل درپیش آئی تو ان لوگوں نے یہی جہاد تراشا، یہ جھوٹ بولتے ہیں، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ وہ واپس آجائیں۔

"بیترب" مدینہ کا قدیمی نام ہے، جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس شہر کی طرف ہجرت کرنے سے پہلے تک اس کا نام "بیترب" رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا نام "مدینۃ الرسول" (پیغمبر کا شہر) پڑ گیا جس کا مخفف "مدینہ" ہے۔ اس شہر کے کئی ایک نام اور بھی ہیں۔ سید مرتضیٰ (رحمۃ اللہ علیہ) نے ان دونوں (مدینہ اور بیترب) کے علاوہ اس شہر کے گیارہ اور نام بھی ذکر کیے ہیں، مگر ان کے "طیب"، "سکینہ"، "محبوبہ"، "مصر حوملہ" اور "قاصدہ" ہیں۔ اور بعض لوگ اس شہر کی زمین کو "بیترب" کا نام دیتے ہیں، جہاں

چند ایک روایات میں آیا ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "اس شہر کو بیترب نہ کہا کرو، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ بیترب اصل میں "ترب" (بردزن حب) کے مادہ سے ملامت کرنے کے معنی میں ہے اور آپ اس قسم کے نام کو اس بابرکت شہر کے لئے پسند نہیں فرماتے تھے۔

ہر حال منافقین نے اہل مدینہ کو "یا اہل بیترب" کے عنوان سے جو خطاب کیا ہے وہ بلاوجہ نہیں ہے اور شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس نام سے نفرت ہے۔ یا چاہتے تھے کہ اسلام اور "مدینۃ الرسول" کے نام کو تسلیم نہ کرنے کا اعلان کریں۔ یا لوگوں کو نمازِ جاہلیت کی یاد تازہ کرائیں۔

بعد والی آیت میں خداوند عالم اس گروہ کے ایمان کی کمزوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "وہ اسلام کے انہما میں اس قدر ضعیف اور ناتواں ہیں کہ اگر دشمن مدینہ کے اطراف و جوانب سے اس شہر میں داخل ہو جائیں اور مدینہ کو فوجی کنٹرول میں کر انہیں پیش کش کریں کہ کفر و شرک کی طرف پلٹ جائیں تو جلدی سے اس کو قبول کر لیں گے اور اس راہ کے انتخاب کرنے میں ڈرنا بھی توقف نہیں کریں گے" (ولسو دخلت علیہم من اقطارہا ثم سئلوا الفتنة لا توھاوم تبشوا بها الا یسیرا)۔

ظاہر ہے کہ جو لوگ اس قدر ضعیف، کمزور اور غیر مستقل مزاج ہوں کہ نہ تو دشمن سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہوں اور نہ ہی راہِ خدا میں شہادت قبول کرنے کے لیے ایسے لوگ بہت جلد ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور اپنی راہ فوراً بدل لیتے ہیں۔

اسی بنا پر فتنہ کی لفظ سے مراد یہاں پر کفر و شرک ہی ہے جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات ہشلا سورہ بقرہ کی آیت ۱۹۳ میں آیات میں آیا ہے۔

لیکن بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں "فتنہ" سے مراد مسلمانوں کے خلاف جنگ ہے کہ اگر اس منافق ٹوسے کو پیش کش کی جائے تو وہ فوراً اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے فتنہ پردازوں کے ساتھ تعاون کرنے لگ جائیں۔

لیکن یہ تفسیر "ولسو دخلت علیہم من اقطارہا".... "کہ اگر مدینہ کے اطراف سے ان پر حملہ آور ہو جائیں (....) کے ظاہری جملہ سے سازگار نہیں ہے اور شاید اسی بنا پر اکثر مفسرین نے اس سے پہلے معنی کو متنب کیا ہے۔ پھر قرآن اس منافق لڑنے کو عدالت کے کٹہرے میں لا کر کہتا ہے: "انہوں نے پہلے سے خدا کے ساتھ عہد و پیمانہ باندا ہوا تھا کہ دشمن کی طرف پشت نہیں کریں گے اور اپنے عہد و پیمانہ پر قائم رہتے ہوئے توحید، اسلام اور پیغمبر کے لیے دفاع میں کھڑے ہوں گے۔ کیا وہ جانتے نہیں کہ خدا سے کیے گئے عہد و پیمانہ کے بارے میں سوال کیا جائے گا؟ (ولفئذ کانوا عاہدوا اللہ من قبل لایولون الا دبار وکان عہد اللہ مسئولاً)۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس بیان سے مراد وہی معاہدہ ہے جو بنی حارثہ نے جنگ اُحد کے دن خدا اور اس کے رسول کے ساتھ کیا تھا جب کہ انہوں نے میدان سے پلٹنے کا ارادہ کیا تھا اور عہد میں پشتیمان ہو گئے تھے اور عہد کیا تھا کہ پھر کبھی ان امور کے پیچھے نہیں جائیں گے۔ لیکن وہی لوگ جنگِ احزاب کے میدان میں دوبارہ عہد شکنی کی فکر میں پڑ گئے۔ لہ

بعض نے اس عہد کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو جنگِ بدر میں یا ہجرتِ پیغمبر سے پہلے عقبہ میں آنحضرت سے باندا تھا۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ اوپر والی آیت ایک ایسا وسیع مفہوم رکھتی ہے جو ان کے ان معاہدوں کو بھی شامل ہے اور دوسرے معاہدوں کو بھی اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔

اصولی طور پر جو شخص ایمان لاتا اور رسول اسلام کی بیعت کرتا ہے، درحقیقت وہ آپ سے یہ عہد کرتا ہے کہ وہ اسلام اور قرآن کا جان کی حد تک دفاع کرے گا۔

یہاں پر عہد و پیمانہ پر زیادہ تر زور اس لیے دیا گیا ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عرب تک بھی کیے گئے عہد و پیمانہ کا احترام کرتے تھے۔ تو پھر کیوں ممکن ہے کہ کوئی شخص اسلام کا دعویٰ کرنے کے بعد اپنے معاہدہ کو پامال کر ڈالے؟

جب خدا نے منافقین کی نیت کو ناخ کر دیا کہ ان کا مقصد گھروں کی حفاظت کرنا نہیں، بلکہ میدانِ جنگ سے فرار کرنا ہے تو انہیں دود لیلوں کے ساتھ جواب دیتا ہے۔

پہلے تو پیغمبر سے فرماتا ہے: "کہہ دیجئے کہ اگر موت یا قتل ہونے سے فرار کرتے ہو تو یہ فرار تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے گا۔ اور تم دنیاوی زندگی کے چند دن سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھاؤ گے؛ (قل لمن ینفککم القرار ان قدرتم من الموت او القتل واذا لا تمتعون الا قلیلاً)۔

فرض کر دو کہ تم جان بچا کر فرار کر رہی گے تو یہ دو حال سے خالی نہیں ہے۔ یا تو تمہاری اہل اور ختی موت کا وقت آن پہنچا ہے

لے تفسیر قرہی "اور" تفسیر فی ظلال القرآن "ذریعہ آیت کے ضمن میں۔

لے "آوی" نے روح البسیان میں اس قول کو نقل کیا ہے۔

تو تم جہاں بھی ہو گے، موت تمہارے دامن گیر ہو کر رہے گی۔ حتیٰ کہ خود تمہارے اپنے ہی گھروں میں اور تمہارے بیوی بچوں کے پاس بھی تمہیں موت آ کر رہے گی۔ اندر یا باہر کا مادہ تمہاری زندگی کا خاتمہ کر دے گا۔ اور اگر اہل نہیں آئی تو ذلت، خواری اور رسوائی کے ساتھ یہ چار روزہ دہنادی زندگی بسر کرنے اور دشمن کے چنگل میں اسیر ہو جانے کے بعد عذاب الہی میں گرفتار ہو جاؤ گے۔
درحقیقت یہ بیان اس بیان سے ملتا جلتا ہے جو جنگ اُمد میں کمزور اساس منافقین کے ایک اور گروہ سے خطاب کی صورت میں نازل ہوا کہ

”قل لو كنتم فبيوتكم لبرز الذين كتب عليهم القتل الى مضاجعهم“

یعنی: کہہ دیجیے کہ اگرچہ تم اپنے گھروں میں بھی ہو، پھر بھی وہ لوگ جن کے لیے قتل ہو جانا مقدر ہو چکا ہے تو ان کے بستروں تک پہنچ کر انہیں تہ تیغ کر دیں گے۔ (آل عمران - ۱۵۴)
دوسرا یہ کہ کیا تم جانتے نہیں ہو کہ تمہارا سارا انجام خدا کے ہاتھ میں ہے اور تم اس کی قدرت و مشیت کے دائرہ اختیار سے ہرگز بھاگ نہیں سکتے۔

”اسے پیغمبر! ان سے کہہ دیجیے کون شخص خدا کے ارادہ کے مقابلہ میں تمہاری حفاظت کر سکتا ہے، اگر وہ تمہارے لیے مصیبت یا رحمت چاہتا ہے؟“ (قل من ذا الذي يعصمكم من الله ان اراد بكم سوءا او اراد بكم رحمة)

جی ہاں! ”وہ خدا کے علاوہ کوئی سرپرست اور یار و مددگار نہیں پائیں گے؟“ (ولا يجدون لهم من دون الله وليا ولا نصيرا)

اب جبکہ تمام تقدیریں اس کے ہاتھ میں ہیں لہذا جہاد کے سلسلہ میں اس کا فرمان جو دنیا میں بھی اور اللہ کی بارگاہ میں بھی باحیث عزت و سرفرازی ہے، دل و جان سے قبول کرو۔ یہاں تک کہ اگر تمہیں اس راہ میں شہادت ہی نصیب ہو جائے تو اس کا خندہ پیشانی سے استقبال کرو۔

۱۸- قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ الْمُعَوِّقِينَ مِنْكُمْ وَالْقَائِلِينَ لِإِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ إِلَيْنَا وَلَا يَأْتُونَ الْبَاسَ إِلَّا قَلِيلًا

۱۹- أَشِحَّةً عَلَيْكُمْ؟ فَإِذَا جَاءَ الْخَوْفُ رَأَيْتَهُمْ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ تَدُورُ أَعْيُنُهُمْ كَالَّذِي يُغْشَى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَإِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوكُمْ بِالسِّنَةِ حِدَادٍ أَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ أُولَئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوا فَأَحْبَطَ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ وَكَانَ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا

۲۰- يَحْسَبُونَ الْأَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوا وَإِنْ يَأْتِ الْأَحْزَابُ يَوَدُّوْنَ أَلْوَانَهُمْ بِأَدْوَانٍ فِي الْأَعْرَابِ يَسْأَلُونَ عَنْ أَنْبَاءِكُمْ وَلَوْ كَانُوا فِيكُمْ مَا قُتِلُوا إِلَّا قَلِيلًا

ترجمہ

۱۸- خدا ان افراد کو اچھی طرح جانتا ہے جو لوگوں کو جنگ سے روکتے ہیں اور ان کو بھی جو اپنے بھائیوں سے کہتے تھے کہ ہماری طرف

آؤ اور اپنے آپ کو معرکہ جنگ سے باہر نکالو، وہ کمزور افراد ہیں۔ اور) سوائے تھوڑی سی مقدار کے جنگ نہیں کرتے۔

۱۹۔ وہ تمہارے بارے میں ہر چیز میں نجیل ہیں اور جس وقت خوف اور حیرانگی کے لمحات پیش آتے ہیں، تو آپ دیکھیں گے کہ وہ آپ کی طرف اس طرح سے دیکھتے ہیں اور ان کی آنکھوں کے ڈھیلے یوں چمک لگاتے ہیں، گویا (اپنے قالب کو چھوڑ رہے ہیں اور) ان پر موت کی غشی طاری ہے۔ لیکن جب خوف اور وحشت کی یہ حالت ختم ہو جاتی ہے تو وہ تمہارے خلاف غیظ و غضب سے لبریز تیز اور تند زبانیں کھولتے ہیں۔ (اور مالِ غنیمت سے اپنے حصے کا مطالبہ کرتے ہیں، حالانکہ وہ اس میں بھی حریص اور بنجیل ہیں وہ ہرگز ایمان نہیں لائے۔ لہذا خدا نے ان کے اعمال کو جبر اور نابلود کر دیا اور یہ کام خدا کے لیے آسان ہے۔

۲۰۔ وہ گمان کرتے ہیں کہ ابھی احزاب کا لشکر نہیں گیا اور اگر پلٹ آئیں تو یہ دوست رکھتے ہیں کہ بادیہ نشین بدوؤں کے درمیان منتشر اور مخفی ہو جائیں اور تمہاری خبریں حاصل کرتے رہیں اور اگر تمہارے درمیان رہیں تو سوائے تھوڑی سی دیر کے جنگ و پیکار نہ کریں۔

تفسیر روکنے والا لولہ:

اس کے بعد منافقین کے اس گروہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جو جنگ احزاب کے میدان سے خود بھی باز کش ہوا اور دوسروں کو بھی کنارہ کشی کی دعوت دیتا تھا۔ فرماتا ہے "خدا تم میں سے اس گروہ کو جانتا ہے جو کوشش کرتے تھے کہ لوگوں کو جنگ سے منحرف کر دیں؛ (قد یعلم اللہ المعرقتین منکم)۔ اور اسی طرح سے ان لوگوں کو بھی جانتا ہے جو اپنے بھائیوں سے کہتے تھے کہ ہماری طرف آؤ۔ اس خطرناک جنگ سے دستبردار ہو جاؤ، (والقائلین لاخوانہم ہللا لہنا)۔

وہی لوگ جو ابلیج جنگ نہیں ہیں اور سوائے کم مقدار کے اور وہ بھی بطور حیرانگہ یا دکھاوے کے جنگ سے بچنے نہیں جاتے؛ (ولایأتون البأس الا قلیلاً)۔

"معرقتین" "عوق" (بروزن شوق) کے مادہ سے کہی چیز سے روکنے اور باز رکھنے کے معنی میں ہے۔ اور "باس" اصل میں سختی کے معنی میں ہے اور یہاں پر اس سے مراد "جنگ" ہے۔

اور دہلی آیت احتمالاً صورت میں دو گروہوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ایک منافقین کے گروہ کی طرف جو مسلمانوں کی صفوں میں موجود تھا ("منکم" کی تعبیر اس امر کی گواہ ہے) اور ان کی کوشش تھی کہ ضعیف الایمان مسلمانوں سے روکے رکھیں یہ وہی "معرقتین" تھے۔

دوسرے منافقین یا یہودیوں کے اس گروہ کی طرف اشارہ ہے جو میدان سے باہر بیٹھے ہوئے تھے اور جس وقت اسلام کے مجاہد سپاہیوں سے آمناسا منا ہوتا تو کہتے کہ ہمارے پاس آ جاؤ اور اپنے آپ کو اس معرکہ سے بچاؤ۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کی طرف دوسرے گروہ میں اشارہ ہوا ہے۔

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ شاید یہ آیت ایک ہی گروہ کی دو مختلف حالتوں کا بیان ہو۔ وہ لوگ جب دوسروں کے درمیان ہوتے ہیں تو انہیں جنگ سے روکتے ہیں اور جب ایک طرف ہو جاتے ہیں تو دوسرا ہوا کرتے ہیں اور حکومت دیتے ہیں۔

ہم ایک روایت میں پڑھتے ہیں کہ ایک صحابی رسولؐ کسی ضرورت کے تحت میدان احزاب سے تشریف لایا ہوا تھا۔ اس نے اپنے بھائی کو دیکھا کہ اس نے اپنے سامنے روٹی، بھنا ہوا گوشت اور شراب رکھے ہوئے تھے، تو صحابی نے کہا تمہاری عیاشی و عشرت میں مشغول ہو اور رسولؐ خدا نیروزوں اور تلواروں کے درمیان مصروف پیکار ہیں۔ اس نے جواب میں کہا اسے بے وقوف! تم بھی ہمارے ساتھ بیٹھا جاؤ اور منہ سے اڑاؤ۔ اس خدا کی قسم جس کی محمدؐ تمہارے ساتھ ہے وہ

اس میدان سے ہرگز ہٹ کر واپس نہیں آئے گا۔ اور یہ عظیم شکر جو صحیح ہو چکا ہے اسے اور اس کے ساتھیوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

یہ سن کر وہ عجمانی کہنے لگے تو جھوٹ بچتا ہے، خدا کی قسم میں ابھی رسول اللہ کے پاس جا کر تمہاری اس گفتگو سے باخبر کرتا ہوں۔ چنانچہ انھوں نے بارگاہ رسالت میں پہنچ کر تمام ماجرا بیان کیا تو ادرودالی آیت نازل ہوئی۔

اس شان نزول کی بناء پر اخوانہما ان کے بھائی کا لفظ ہو سکتا ہے کہ حقیقی بھائی کے معنی میں ہو یا پھر ہم ملک کے معنی میں ہو جیسا کہ سورہ اسراء ذی اسرائیل کی آیت ۲۷ میں اسراء اور فضول غریبی کرنے والوں کو شیطانوں کے بھائی کا نام دیا گیا ہے؛ ان المبذورین كانوا اخوان الشیاطین

بعد دالی آیت میں فرماتا ہے ان تمام رکاوٹوں کا باعث یہ ہے کہ وہ تمہاری بابت تمام چیزوں میں بخیل ہیں؛ اشعة علیکم علیہ

صرف میدان جنگ میں جان قربان کرنے میں بلکہ دسائل جنگ متبا کرنے کے لیے مالی امداد اور خندق کھودنے کے لیے جہانی امداد حتیٰ کہ فکری امداد مینا کرنے میں بھی نکل سے کام لیتے ہیں۔ ایسا نکل جو حرص سے تو اُم ہوتا ہے اور ایسا حرص جس میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

ان کے نکل اور ہر قسم کے ایشارے دیر لٹ کرنے کے بیان کے بعد ان کے ان دورہ سے اوصاف کو جو ہر مہم اور ہر دور کے تمام منافقین کے لیے تقریباً عمومی تہمت کا درجہ رکھتے ہیں، بیان کرتے ہوئے کہتا ہے جس وقت خوفناک اور بھرائی لمحات آتے ہیں تو وہ اس قدر بزدلی اور ڈر پوک ہیں کہ آپ دیکھیں گے کہ وہ آپ کو دیکھتے ہیں حالانکہ ان کی آنکھوں میں ڈھیلے بے غیا گردش کر رہے ہیں، اس شخص کی طرح جو جاں کنی میں مبتلا ہو؛ دنا اذا جاء الخوف رأیتهم ينظرون الیک مستورا عینہم کالذی یغشی علیہ من الموت۔

چونکہ وہ صحیح ایمان کے مالک نہیں ہیں اور نہ ہی زندگی میں ان کا کوئی مستحکم سارا ہے، جس وقت کسی سخت حادثے اور چارہ ہوتے ہیں تو کئی طور پر اپنا توازن کھو بیٹھتے ہیں گویا چاہتے ہیں کہ ان کی رُوح قبض ہو جائے۔

پھر مزید کہتا ہے؛ لیکن یہی لوگ جس ذقت کہ طوفان رگک جاتا ہے اور حالات معمول پر آجاتے ہیں تو تمہارے پاس یہ توقع لے کر آتے ہیں کہ گویا جنگ کے اصل فاتح ہی ہیں اور قرض خواہوں کی طرح پیکار پیکار کر دہشت اور دہشت العافا کے ساتھ مال غنیمت سے اپنے حصے کا مطالبہ کرتے ہیں اور اس میں سخت گیر، بخیل اور حریص ہیں (فنا اذا ذهب الخوف سلقوک وبالسنۃ حداد اشعة علی الخیر)۔

۱۔ اشعد "شع" کے مادہ سے "شعیح" کی معنی ہے اس کا معنی ہے ایسا نکل جس سے حرص ملتا ہو اور یہ لفظ اکثر معزین کے بقول بیان مل اعزاب کے لغت سے "حال" واقع ہو رہا ہے۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ بیان لغت کے مقام میں حال ہو۔ (غریب اللغہ)

"سلقوک" "سلق" (دردن خلق) کے مادہ سے کسی چیز کو غیظ و غضب سے کھونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، چاہے ہاتھ کا کھولنا ہو یا زبان کا۔ یہ تعبیر ان لوگوں کے بارے میں استعمال ہوئی ہے جو امرانہ اور شکرانہ لب لہجے میں توجیح دیکار کر کسی چیز کو طلب کرتے ہیں۔

"السنۃ حداد" تیز زبند زبانوں کے معنی میں ہے اور یہاں پر سختی کے ساتھ بات کرنے سے کنا یہ ہے۔ آیت کے آخر میں ان کی آخری صفت کی طرف جو واقع میں ان کی تمام بد بختیوں کی جڑ اور بنیاد ہے، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے تو ہرگز ایمان نہیں لائے؛ اولئک لعدیو مننوا۔

"اور اسی بنا پر خدا نے ان کے اعمال نیست و نابود کر دیئے ہیں؛ (فاحیط اللہ اعمالہم)۔ کیونکہ ان کے اعمال ہرگز خدا کی نشا اور ان کے فلوں پر مبنی نہیں ہیں اور یہ کام خدا کے لیے بہت ہی آسان ہے؛ اولئک ذالک علی اللہ یسیرا۔

مجموعی طور پر ہم اس طرح نتیجہ نکالتے ہیں کہ "موقین" (باز رکھنے والے) ایسے منافق تھے جن کی یہ صفات تھیں،

- ۱۔ بہت ہی کم تعداد کے علاوہ باقی کوئی بھی اہل جنگ و جہاد نہیں تھے۔
- ۲۔ وہ کبھی جان و مال کے لحاظ سے اہل ایثار و قربانی نہیں تھے۔ اور عورتوں سے عورتوں پریشانی کے متحمل بھی نہیں ہوتے تھے۔

- ۳۔ طوفانی اور بھرائی لمحات میں شدت خوف کی وجہ سے اپنے آپ کو کلی طور پر کھو بیٹھتے تھے۔
- ۴۔ کامیابی کے موقع پر اپنے آپ کو تمام اعزازات کا وارث سمجھتے تھے۔
- ۵۔ چونکہ وہ بے ایمان تھے لہذا ان کے اعمال بھی بارگاہ الہی میں بے قدر و قیمت تھے۔

یہی حال ہر دور اور زمانہ کے ہر معاشرہ کے منافقین کا رہا ہے۔

قرآن مجید نے ان کی کئی ظریفانہ انداز میں صفات بیان کی ہیں، جن کے ذریعہ ان کے ہم نگر لوگوں کو بچانا جا سکتا ہے اور جو وہ دور میں ہم اس کے کئے نونے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں !!

بعد دالی آیت اس گروہ کی بزدلی اور خوف کی زیادہ فصیح انداز میں تصویر کشی کرتے ہوئے کہتی ہے۔ "وہ اس قدر وحشت زدہ ہو چکے ہیں کہ اعزاب اور دشمن کے لشکروں کے پراگندہ ہوجانے کے بعد بھی یہ تصور کرتے ہیں کہ ابھی وہ نہیں گئے؛ (یحسبون الاحزاب لمدیو مننوا)۔

دشمن تاک اور بھیجا تک تصور نے ان کی نگر پر سایہ ڈالا ہوا ہے۔ گویا کفر کی افواج سپے در سپے ان کی آنکھوں کے سامنے قطار در قطار جاری ہیں، ننگی تواریں لیے اور تیز سے تانے ان پر ٹکراتی ہیں۔

یہ بزدلی جھگڑاؤ، ڈر پوک منافق اپنے سامنے سے بھی ڈرتے ہیں، جب کسی گھوڑے کے ہنہانے یا کسی ادنیٰ کے بلانے کی آواز سنتے ہیں تو مارے خوف کے لرزے لگتے ہیں کہ شاید اعزاب کے لشکر واپس آ رہے ہیں۔

آگے چل کر کہتا ہے "اگر اعزاب دوبارہ ہٹ کر آجائے تو وہ اس بات پر تیار ہیں کہ بیابان کا رخ کر لیں اور پلہ ریشہ بدوں

کے درمیان منتشر ہو کر پہاں ہو جائیں؟ (وان یأت الاحزاب یود والواقہم بادون فی الاعراب)۔
 ہاں، ہاں وہ چلے جائیں اور وہاں جا کر رہیں اور ہمیشہ تمہاری خبروں کے جوہار ہیں؟ (یسئلون عن انبائکم)۔
 ہر مسافر سے تمہاری ہر پہل کی خبر کے جوہار ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں احزاب ان کی جنگ کے قریب آجائیں اور ان کا سایہ ان
 کے گھر کی دیواروں پر آپڑے اور تم پر یہ احسان جتلائیں کہ وہ ہمیشہ تمہاری حالت اور کیفیت کے متلاشی تھے۔
 اور آخری جملہ میں کہتا ہے کہ "بالفرض وہ فزار بھی نہ کرتے اور تمہارے درمیان ہی رہتے۔ پھر بھی سوائے تھوڑی سی جنگ
 کے وہ کچھ نہ کرتے۔" (ولسوکا نوا فیکم ما قاتلوا الا قلیلاً)۔
 نہ ان کے جانے سے تم پریشان ہونا اور نہ ہی ان کے موجود رہنے سے خوشی منانا، کیونکہ نہ تو ان کی قدر و قیمت ہت
 ادر نہ ہی کوئی خاص حیثیت، بلکہ ان کا نہ ہونا ان کے ہونے سے بہتر ہے۔
 ان کی یہی تھوڑی سی جنگ بھی خدا کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کی سزائش اور ملامت کے خوف اور ظاہر داری یا ریا کاری
 کے لیے ہے۔ کیونکہ اگر خدا کے لیے ہوتی تو اس کی کوئی حد و انتہا نہ ہوتی اور جب تک جان میں جان ہوتی وہ اس میدان
 میں ڈٹے رہتے۔

۲۱- لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن
 كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ۝
 ۲۲- وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَذَا مَا
 وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ ۝
 وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا ۝
 ۲۳- مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ
 عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَن قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَن يَنْتَظِرُ ۝
 وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا ۝
 ۲۴- لَبِ جَزَىٰ اللَّهُ الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ وَيَعَذِّبُ
 الْمُنْفِقِينَ إِنْ شَاءَ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنْ اللَّهُ كَانَ
 غَفُورًا رَّحِيمًا ۝
 ۲۵- وَرَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِغِيظِهِمْ لَمَنَّالُوا
 خَيْرًا ط وَكَفَى اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ ط وَكَانَ اللَّهُ
 قَوِيًّا عَزِيزًا ۝

ترجمہ

۲۱ تم لوگوں کے لیے رسول خدا کی زندگی میں تیز ترین نمونہ تھا ان لوگوں کے لیے جو

رحمتِ خدا اور روزِ جزاء کی امید رکھتے ہیں اور خدا کو بہت زیادہ یاد کرتے ہیں۔

۲۲۔ جب مؤمنین نے احزاب کے لشکر کو دیکھا تو کہا یہ وہی ہے جس کا خدا اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا ہے اور خدا اور اس کے رسول نے سچ فرمایا ہے اور اس چیز نے سوائے ان کے ایمان اور تسلیم کے کسی اور چیز کا اضافہ نہیں کیا۔

۲۳۔ مؤمنین میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ سے باندھے گئے عہد و پیمانہ پر صدق دل سے قائم ہیں، بعض اپنے عہد کو پورا کر گئے اور انہوں نے اس کی راہ میں شہادت نوش کر لیا، اور کچھ انتظار میں ہیں اور انہوں نے ہرگز اپنے عہد و پیمانہ میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی۔

۲۴۔ مقصد یہ ہے کہ خدا بچوں کو ان کی سچائی کی بناء پر اجر دے اور جب چاہے منافقین کو عذاب دے۔ یا (اگر توبہ کریں تو) ان کی توبہ قبول کرے کیونکہ خدا غفور و رحیم ہے۔

۲۵۔ خدا نے کافر احزاب کا منہ پھیرا دیا وہ جلتے کڑھتے نامراد لوٹ گئے اور خدا نے اس میدان میں مؤمنین کو جنگ سے بے نیاز کر دیا۔ (انہیں فتح عطا کی) اور خدا طاقت ور اور ناقابل شکست ہے۔

تفسیر

جنگ احزاب میں سچے مؤمنین کا کردار:

اب تک مختلف گروہوں اور ان کے جنگی احزاب میں کارناموں کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی جن میں ضعیف الایمان مسلمان، منافق لوگ، کفر و نفاق کے سرسٹنے اور جہاد سے روکنے والے شامل ہیں۔ قرآن مجید اس گفتگو کے آخر میں "سچے مؤمنین" ان کے بلند حوصلوں، پامردوں، جراتوں اور اس عظیم جہاد میں ان کی دیگر خصوصیات کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔

اس بحث کی تمہید کو پیغمبر اسلام کی ذات سے شروع کرتا ہے جو مسلمانوں کے پیشوا، سردار اور اسوۂ کامل تھے، خدا کہتا ہے: "تمہارے لیے رسول اللہ کی زندگی اور (میدانِ احزاب میں) ان کا کردار ایک اچھا نمونہ اور اسوۂ تھا، ان لوگوں کے لیے جو رحمتِ خدا اور روزِ قیامت کی امید رکھتے ہیں اور خدا کو بہت زیادہ یاد کرتے ہیں؛ (لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۂ حسنة لمن کان یرجو اللہ والیوم الآخر و ذکر اللہ کثیرا)۔"

تمہارے لیے بہترین اسوۂ اور نمونہ، نہ صرف اس میدان میں بلکہ ساری زندگی پیغمبر اسلام کی ذات والا صفات ہے۔ آپ کے بلند حوصلے، صبر و استقامت، پامردی، زیرکی، دانائی، خلوص، خدا کی طرف توجہ، عبادت پر کنٹرول، مشکلات اور مصائب کے آگے سر تسلیم خم نہ کرنا، غرض کہ ان میں سے ہر ایک چیز مسلمانوں کے لیے نمونہ و کامل اور اسوۂ حسنہ ہے۔

وہ ایسا عظیم نا خدا ہے کہ جب اس کی کشتی سخت ترین طوفانوں میں گھر جاتی ہے تو ذرہ برابر بھی کمزوری، گھبراہٹ اور سرسٹگی کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ وہ کشتی کا نا خدا بھی ہے اور اس کا قابلِ اطمینان نگر اور چراغِ ہدایت بھی۔ وہ اس میں بیٹھنے والوں کے لیے آرام و سکون کا باعث بھی ہے اور ان کے لیے راحت جان بھی۔

وہ دوسرے مؤمنین کے ساتھ مل کر کدال ہاتھیں لیتا ہے اور خندق کھودتا ہے، بیلچے کے ساتھ پتھر اکٹھا کر کے خندق سے باہر ڈال آتا ہے اپنے اصحاب کے حوصلے بڑھانے اور ٹھنڈے دل سے سوچنے کے لیے ان سے مزاج بھی کرتا ہے، ان کے قلبِ رُح کو گرم کرنے کے حربی اور جوش و جذبہ دلانے والے اشارے پر پڑھ کر انہیں ترغیب بھی دلاتا ہے، ذکر خدا کرنے پر سلسلہ امر کرتا ہے اور انہیں درخشاں مستقبل اور عظیم فتوحات کی خوشخبری دیتا ہے۔ انہیں منافقوں کی سازشوں سے متنبہ کرتا ہے اور ان سے ہمیشہ خبردار رہنے کا حکم دیتا ہے۔

صحیح حربی طریقوں اور بہترین فوجی چالوں کو انتخاب کرنے سے لمحہ بھر بھی غافل نہیں رہتا۔ اس کے باوجود مختلف طریقوں

سے دشمن کی صفائی میں اور
جی ہاں اور دشمنوں کی صفائی میں بھی۔

سے جی نہیں چوکتا۔
سے اور ان کے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ اس میدان میں بھی اور دوسرے تمام میدانوں میں اس حالت کے معنی میں ہے جو انسان دوسرے کی پیروی کے وقت اپنا تابعدار ہے۔ اس بنا پر اس کا معنی مصدری ہوگا تاکہ وضعی اور لفظی لفظوں میں کسی کی تابعداری ہو۔
ہے کہ تمہارے لیے پیغمبر خدا کی ذات میں اچھی اقتداء اور پیروی ہے۔ ان کی اقتداء کو اختیار کر سکتے ہو۔
اس آیت میں اس اسوۂ حسنہ کو ان اشخاص کے ساتھ مخصوص سمجھنا ہے جو تین خصوصیات میں امتیاز رکھتے ہیں اور خدا کو بہت زیادہ یاد کرتے ہیں۔

ان اس بات کا سبب ہے اور ذکر خدا اس کو دوام بخشتا ہے کیونکہ اس میں شک نہیں ہے وہ پیغمبر کے نقش قدم پر چل نہیں سکتا۔ نیز اس راہ پر چلنے سے بھی اگر ہمیشہ ذکر خدا کرے۔ تا ناسی اور اقتدار کو جاری و ساری نہیں رکھ سکے گا۔

تاریخ علیہ السلام باد جو اس جوال سردی اور شجاعت کے جو جنگ کے تمام میدانوں میں اس آیت کا سبب ہے اور ذکر خدا اس کو دوام بخشتا ہے کیونکہ اس میں شک نہیں ہے وہ پیغمبر کے نقش قدم پر چل نہیں سکتا۔ نیز اس راہ پر چلنے سے بھی اگر ہمیشہ ذکر خدا کرے۔ تا ناسی اور اقتدار کو جاری و ساری نہیں رکھ سکے گا۔

اباس القینا برسول اللہ فلم یکن احد منا
منہ

ملازم ہوتی تو ہم رسول اللہ کی طرف پناہ لیتے اور ہم سے کوئی شخص بھی ان سے

پیش نمونین کی حالت کو بیان کرتے ہوئے قرآن یوں فرماتا ہے: "جس وقت مؤمنین نے یہ کہ ان پر گھبراہٹ طاری نہ ہوئی بلکہ کہا کہ یہ وہی چیز ہے جس کا خدا اور اس کے رسول کا ہوجی ہے اور خدا اور اس کے رسول نے سچ کہا ہے اور اس واقعے نے ان کے دل میں اضافہ نہیں کیا: (ولخارا المؤمنون الاحزاب قالوا هذا ما نطق الله ورسوله وما زادهم الا ايماناً وتسلیمًا)۔

ہم نے کیا تھا؟

یعنی کہتے ہیں کہ یہ اس گفتگو کی طرف اشارہ ہے جو پہلے پیغمبر اکرم سے کی تھی کہ غنقریب تو ان سے اب اور تمہارے مختلف دشمن ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر تمہاری طرف آئیں گے۔ لیکن جان لو کہ آخر کار فتح تمہاری ہوگی۔
مؤمنین نے جب احزاب کے ہجوم کو دیکھا تو یقین کر لیا کہ یہ پیغمبر کا وہی وعدہ ہے اور کہا کہ اب ہجر و عدا سے کام لیا جائے

و وقوع پذیر ہو چکا ہے تو دوسرا حصہ یعنی فتح و کامرانی بھی یقیناً اس کے پیچھے پیچھے آئے گی۔ لہذا ان کے ایمان و رغبت سے تسلیم میں اضافہ ہو گیا۔

دوسرا یہ کہ خدا نے سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۴ میں مسلمانوں سے فرمایا تھا:

"کیا تم گمان کرتے ہو کہ آسانی کے ساتھ بشت میں داخل ہو جاؤ گے، لیکن جس کے کچھ تو مشل گذشتہ لوگوں کے حوادث کے تمہارے لیے ظاہر ہوں، وہی لوگ جو شدید پریشانیوں میں مبتلا ہوئے اور

اس طرح سے ان کا عرصہ حیات ان کے لیے تنگ ہو گیا کہ انہوں نے کہا کہ خدا کی ہر وہ کمال ہے۔
خلاصہ یہ کہ ان سے کہا گیا تھا کہ تم آزمائش کی سخت کھالیوں میں آزمائے جاؤ گے۔ اور وہ احزاب کو پیغمبر خدا اور رسول کی گفتگو کی صداقت کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کے ایمان میں اضافہ ہوا گیا۔

البتہ ان دونوں تفسیر کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ خصوصاً جب اس بات کی طرف توجہ کی جائے کہ ایک تو اصل میں خدا کا وعدہ ہے اور دوسرا اس کے پیغمبر کا وعدہ ہے اور یہ دونوں چیزیں زیر بحث آیت میں اکٹھی آئی ہیں۔ لہذا ان دونوں کو جمع کرنا نہایت ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

خدا کا وعدہ ہے اور دوسرا اس کے پیغمبر کا وعدہ ہے اور یہ دونوں چیزیں زیر بحث آیت میں اکٹھی آئی ہیں۔ لہذا ان دونوں کو جمع کرنا نہایت ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بعد والی آیت مؤمنین کے ایک خاص گروہ کی طرف اشارہ ہے جو پیغمبر اکرم کی اقتداء میں سب سے زیادہ پیش قدمی کرتے تھے، وہ خدا سے ہونے اپنے اس عہد پر ایمان پر قائم تھے کہ وہ آخری سانس اور آخری قطرہ خون تک فداکاری اور قربانی کے لیے تیار ہیں۔ فرمایا گیا ہے: "مؤمنین میں ایسے بھی ہیں جو اس عہد پر ایمان پر قائم ہیں جو انہوں نے خدا سے باندھا ہے ان میں سے کچھ نے تو میدان جہاد میں شہادت نوش کر لیا ہے اور بعض انتظار میں ہیں: من المؤمنین رجال صدقوا ما عاهدوا الله عليه فمهم من قضیٰ عليهم ومنهم من ينظر۔"

"اور انہوں نے اپنے عہد پر ایمان میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی۔" اور نہ ہی ان کے قدموں میں لغزش پیدا ہوئی ہے: (ومسبذوا تبديلاً)۔

منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کے برعکس کہ جنہیں طوفان حوادث اور حسرت اور حیرت دیتے ہیں اور جو روزانہ اپنے نالوں و دماغ میں نت نئے اور ناپاک منصوبے پر دان چڑھاتے رہتے ہیں وہ یہ ثابت الایمان مؤمنین پر اپنی طرح محکم اور استوار ہیں۔ انہوں نے ثابت کر دکھایا ہے کہ جو عہد پر ایمان انہوں نے اس کے ساتھ باندھا ہے وہ ہرگز ٹوٹنے والا نہیں ہے: "۔

اپنے نالوں و دماغ میں نت نئے اور ناپاک منصوبے پر دان چڑھاتے رہتے ہیں وہ یہ ثابت الایمان مؤمنین پر اپنی طرح محکم اور استوار ہیں۔ انہوں نے ثابت کر دکھایا ہے کہ جو عہد پر ایمان انہوں نے اس کے ساتھ باندھا ہے وہ ہرگز ٹوٹنے والا نہیں ہے: "۔

لفظ "غيب" (بروزن "عہد") عہد، تدار اور پیمان کے معنی میں ہے اور کبھی موت یا شہادت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

اسوۂ حسنہ کے معنی میں ہے جو انسان دوسرے کی پیروی کے وقت اپنا تابعدار ہے۔ اس بنا پر اس کا معنی مصدری ہوگا تاکہ وضعی اور لفظی لفظوں میں کسی کی تابعداری ہو۔
ہے کہ تمہارے لیے پیغمبر خدا کی ذات میں اچھی اقتداء اور پیروی ہے۔ ان کی اقتداء کو اختیار کر سکتے ہو۔
اس آیت میں اس اسوۂ حسنہ کو ان اشخاص کے ساتھ مخصوص سمجھنا ہے جو تین خصوصیات میں امتیاز رکھتے ہیں اور خدا کو بہت زیادہ یاد کرتے ہیں۔
ان اس بات کا سبب ہے اور ذکر خدا اس کو دوام بخشتا ہے کیونکہ اس میں شک نہیں ہے وہ پیغمبر کے نقش قدم پر چل نہیں سکتا۔ نیز اس راہ پر چلنے سے بھی اگر ہمیشہ ذکر خدا کرے۔ تا ناسی اور اقتدار کو جاری و ساری نہیں رکھ سکے گا۔
تاریخ علیہ السلام باد جو اس جوال سردی اور شجاعت کے جو جنگ کے تمام میدانوں میں اس آیت کا سبب ہے اور ذکر خدا اس کو دوام بخشتا ہے کیونکہ اس میں شک نہیں ہے وہ پیغمبر کے نقش قدم پر چل نہیں سکتا۔ نیز اس راہ پر چلنے سے بھی اگر ہمیشہ ذکر خدا کرے۔ تا ناسی اور اقتدار کو جاری و ساری نہیں رکھ سکے گا۔
اباس القینا برسول اللہ فلم یکن احد منا
منہ
ملازم ہوتی تو ہم رسول اللہ کی طرف پناہ لیتے اور ہم سے کوئی شخص بھی ان سے
پیش نمونین کی حالت کو بیان کرتے ہوئے قرآن یوں فرماتا ہے: "جس وقت مؤمنین نے یہ کہ ان پر گھبراہٹ طاری نہ ہوئی بلکہ کہا کہ یہ وہی چیز ہے جس کا خدا اور اس کے رسول کا ہوجی ہے اور خدا اور اس کے رسول نے سچ کہا ہے اور اس واقعے نے ان کے دل میں اضافہ نہیں کیا: (ولخارا المؤمنون الاحزاب قالوا هذا ما نطق الله ورسوله وما زادهم الا ايماناً وتسلیمًا)۔
ہم نے کیا تھا؟

اباس القینا برسول اللہ فلم یکن احد منا
منہ
ملازم ہوتی تو ہم رسول اللہ کی طرف پناہ لیتے اور ہم سے کوئی شخص بھی ان سے
پیش نمونین کی حالت کو بیان کرتے ہوئے قرآن یوں فرماتا ہے: "جس وقت مؤمنین نے یہ کہ ان پر گھبراہٹ طاری نہ ہوئی بلکہ کہا کہ یہ وہی چیز ہے جس کا خدا اور اس کے رسول کا ہوجی ہے اور خدا اور اس کے رسول نے سچ کہا ہے اور اس واقعے نے ان کے دل میں اضافہ نہیں کیا: (ولخارا المؤمنون الاحزاب قالوا هذا ما نطق الله ورسوله وما زادهم الا ايماناً وتسلیمًا)۔
ہم نے کیا تھا؟

لفظ "غيب" (بروزن "عہد") عہد، تدار اور پیمان کے معنی میں ہے اور کبھی موت یا شہادت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ یہ آیت کن افراد کے بارے ہے۔۔۔ اہل سنت کے مشہور عالم، حاکم ابوالقاسم حکافی سند کے ساتھ حضرت علیؑ سے نقل کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا:

”فینانزلت (رجال صدقوا ما عاهدوا الله عليه) فانا والله المنتظر و ما بدلت تبديلا“

آیہ رجال صدقوا ما عاهدوا الله عليه ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہے اور بخدا میں ہی وہ شخص ہوں جو شہادت کا، انتظار کر رہا ہوں اور قبل ازیں ہم میں سے منہ سید الشہداء جیسے لوگ مردانہ وار شہادت نوش کر چکے ہیں اور میں نے ہرگز اپنی روش اور اپنے طریقہ کار میں تبدیلی نہیں کی اور اپنے سیکے ہوئے عہد پر پختہ ہوں۔

بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ ”من قضی نحبہ کا مجید شہداء بدر و احد کی طرف اشارہ ہے اور منہم من ينتظر“ کا جملہ دوسرے پختہ مسلمانوں کی طرف اشارہ ہے جو فتح یا شہادت کے انتظار میں تھے۔

”انس بن مالک سے بھی نقل ہے کہ ان کے چچا ”انس بن نضر“ جنگ بدر کے دن حاضر نہیں تھے۔ جنگ کے خاتمے پر جب انھیں معلوم ہوا تو انھوں نے سمت افسوس کیا کہ وہ اس جہاد میں کیوں شریک نہیں ہوئے؟ تو اس وقت خدا کے ساتھ عبد کیا کہ اگر کوئی جنگ پیش آئی تو اس میں ضرور شریک ہوں گے اور جب تک جان میں جان ہے، میدان میں ڈٹے رہیں گے۔ لہذا انھوں نے دوسری جنگ ۲ میں شرکت کی اور جس وقت کچھ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے تو وہ ڈٹے رہے۔ بڑی بے جگری کے ساتھ لڑنے کے بعد مجروح ہوئے اور آخر کار درج شہادت پر نازل ہوئے۔

ابن عباس سے بھی منقول ہے کہ انھوں نے کہا:

”منہم من قضی نحبہ“ کا مجید منہ بن عبدالمطلب، باقی شہداء احد اور انس بن نضر اور ان کے ساتھیوں کی طرف اشارہ ہے۔

ان تفسیروں کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ آیت کا ایک وسیع مفہوم ہے جو تمام ان شہداء اسلام پر محیط ہے جو جنگ احزاب سے پہلے شہادت نوش فرما چکے تھے۔ اور منتظرین بھی تمام وہ لوگ ہیں جو فتح و کامرانی اور شہادت کے انتظار میں زندہ رہے ہیں۔ اور پہلے گروہ کے سردار حضرت حمزہؑ اور دوسرے کے سردار

درجہ شہداء

۱۔ جمع البسیان اور سان العرب (نخب)

۲۔ جمع البسیان آیہ زیر بحث کے ذیل میں۔

۳۔ تفسیر قرطبی، فی ظلی القرآن اور مجمع البسیان (مختصر سے فرق کے ساتھ)

۴۔ جمع البسیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

جناب علی بن ابی طالبؑ قرار پاتے ہیں۔ اسی لیے تفسیر صافی میں آیا ہے:

”ان اصحاب الحسين بكم بلا كل من اراد الخروج ودع الحسين وقال! السلام عليكم يا بن رسول الله! فيجيبه عليك السلام وذن خلفك، ويقره: ”فمنهم من قضى نحبه ومنهم من ينتظر“

اصحاب امام حسینؑ میں سے جو بھی کربلا میں میدان کی طرف جانا چاہتا تو امام عالی مقام سے الوداع کرتا اور کہتا آپؑ پر سلام جو اسے فرزند رسولؐ (اسلام و دواع کرتا) تو امام بھی انہیں جواب دیتے اور پھر اس آیت کی تلاوت کرتے: ”فمنهم من قضى نحبه ومنهم من ينتظر“۔

اور جس وقت ”عبداللہ بن یقظر“ کی خبر شہادت آپؑ کو ملی اس وقت بھی اس آیت کو تلاوت فرمایا۔ یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ آیت اس قسم کا وسیع مفہوم رکھتی ہے جو ہر زمانے کے تمام پختہ مومنین پر محیط ہے۔ چاہے وہ ہوں، جنہوں نے جامہ شہادت زیب تن کیا اور چاہے وہ ہوں جو بغیر کسی قسم کے تہنزل کے اپنے خدا سے کیے ہوئے عہد و پیمانہ پر قائم رہے اور جہاد و شہادت پر آمادہ رہے۔

لہذا والی آیت میں مومنین اور منافقین کے اعمال کے نتیجے اور آخری ہدف کو ایک مختصر سے جملے میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ ”مقصود یہ ہے کہ خدا پیچوں کو ان کی سچائی کی وجہ سے جزائے خیر دے اور منافقین کو جب چاہے عذاب دے۔ اور اگر وہ توبہ کریں تو انہیں بخش دے اور ان کی توبہ قبول کرے۔ کیونکہ خدا غفور و رحیم ہے“۔ لیجزمی اللہ الصادقین بصدقہم و یعذب المنافقین ان شاء او یتوب علیہم ان شاء اللہ کان غفوراً رحیماً۔

ز تو مخلص مومنین کی سچائی اور وفاداری بغیر جزائے خیر کے رہے گی اور نہ ہی منافقین کی کمزوری اور تخریب کاری بغیر عذاب اور سزا کے رہے گی۔

قرآن توبہ کے دروازے اور بازگشت کی راہیں منافقین تک کے لیے کھلی رکھتا ہے، لہذا ”او یتوب علیہم“ کے جملہ کے ساتھ ان پر توبہ کے دروازے کھولتا ہے اور ”غفور و رحیم“ کے ساتھ اپنی توصیف کرتا ہے تاکہ ایمان، صدق اور شرعی فرائض پر عمل درآمد کا جہان میں بیدار کیا جائے۔

۱۔ تفسیر صافی آیہ زیر بحث کے ذیل میں۔

۲۔ تفسیر زوالفقین ج ۲ ص ۲۵۹۔

پر نہ یہ سیدنا فاطمہ کے غلط اعمال سے نتیجے کے طور پر ذکر ہوا ہے لہذا بعض بزرگ مفسرین نے اس سے اس طرح استفادہ کیا ہے کہ ممکن ہے بعض اوقات ایک عظیم بنا، آنا وہ دلوں میں حق و حقیقت کی طرف حرکت، انقلاب اور بازگشت کا ذریعہ بن جائے اور وہ ایسی برائی بن جائے جو ایک نیا اور نیک کا نقطہ آغاز بٹھہرے۔

قریباً آٹھ آیت جنگ اس سلسلہ میں حرف آخر کی صورت میں اس بحث کو ختم کرتی ہے۔ مختصر سی باتوں میں اس ماجرے کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ "خدا نے کافروں کو ایسی حالت میں واپس لوٹا لیا کہ ان کے دل غلط و غریب بنا دیئے۔ وہ غم و غصہ سے بھر پور ہیں۔ یہ عقیدہ اور وہ کسی ایسے نتیجے پر شریعہ کے جوان کے پیش نظر تھا، اور ورد انوار السیدین کے فریاد و بغیہ فاطمہ کے دل سے ابھریا۔"

"غیر" کا معنی غصہ ہے۔ اور کبھی غم۔ وہ کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں یہ دونوں معانی مراد ہیں۔ لشکر احزاب، لشکر اسلام، یہاں آخری فتح کا امیدوار تھا، لیکن تاکہ مراد اس وقت کی حالت میں اپنے علاقوں کی طرف لوٹ گیا۔

یہاں "پر" غیر شکر سے مراد جنگ کا معنی ہے۔ اللہ لشکر کفر کی کامیابی بھی خیر نہیں سمجھتا، لیکن قرآن ان کی سوچ کی عکاسی کرتے ہوئے اسے "خیر" سے تعبیر کرتا ہے۔ اس حرف اشارہ ہے کہ وہ اس میدان میں کسی بھی قسم کی کامیابی سے بگڑتا نہیں پڑے گا۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں "خیر" سے مراد "مال" ہے کیونکہ یہ لفظ کئی دوسرے مقامات پر بھی مال کے لیے بولا گیا ہے۔ جن میں سے سورہ بقرہ کی آیت ۱۰۰ میں ہے جسے آئیہ وصیت کہتے ہیں، اس میں ہے: "ان ترک خیراً الوصیۃ للوالدین۔"

کیونکہ لشکر کفر کے حملے کے اصل مقامات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مدینہ کی غنیمتوں کو حاصل کریں اور اس سرزمین کو غارت کریں۔

لیکن "تعبیر" کے مفہوم کو یہاں "مال" کے معنی میں محدود کرنے پر ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ یہاں پر اس سے ہر قسم کی کامیابی مراد ہے جسے وہ مد نظر رکھنے ہوئے تھے اور مال ہی ان سے ایک تھا جس سے وہ محروم رہے۔ بعد اسے جملہ میں قرآن مزید کہتا ہے: "خدا نے اس میدان میں مؤمنین کو جنگ سے بے نیاز کر دیا" اور حکفی اللہ المؤمنین القتال۔

اس قسم کے اسباب و عوامل فراہم کیے، کہ کسی قسم کی ایسی فتح پیش نہ آئی جس سے مؤمنین کا زیادہ نقصان ہوتا اور جنگ ختم ہوگئی، کیونکہ ایک طرف سے تو شدید طوفان اور سردی نے مشرکین کو دم بدم کر دیا اور دوسری طرف خدا کے نظر نہ آنے والے لشکر کے ذریعے رعیت، انوش اور وحشت کو ان کے دلوں میں ڈال دیا اور تیسری طرف سے حضرت علیؑ ان کی غالب علیہ السلام کی نصیب دشمن کے مذہب سے بڑے پہلوان عمرو بن عبدود پر پڑی جس سے وہ دباؤ عدم میں

سے تفسیر امین ان آیت زبردست کے ذریعے ہیں۔

جائیں۔ اس سے ان کی امید دل اور آرزوؤں کی عمارت و محراب سے نیچے آگئی۔ یہ امر اس بات کا سبب ہوا کہ وہ مدینہ کا محاصرہ ترک کر کے اپنے اپنے قبائل کی طرف ناکام واپس لوٹ گئے۔

آیت کے آخری جملہ میں فرمایا گیا ہے: "خدا قوی اور ناقابل شکست ہے؛ اور وہ کان اللہ قویاً عزیزاً۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ "قوی" تو ہوں لیکن "عزیز" یعنی ناقابل شکست نہ ہوں یعنی ان پر زیادہ قوی شخص کا ہونا۔ لیکن "ناقابل شکست طاقتور" صرف اور صرف خدا ہے جس کی طاقت اور قدرت لامتناہی ہے۔ وہی قوت جس نے اس قسم کے بہت سخت اور خطرناک میدان میں اس قسم کی کامیابی مؤمنین کے نصیب کی کہ لڑائی، جنگ اور جان دینے تک کی نوبت بھی نہ آئی۔

جنگ احزاب کے چند اہم پہلو:

۱۔ جنگ کی اہمیت: جنگ احزاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے کہ اس میں تمام قبائل اور

مختلف اسلام دشمن طاقتیں نوخیز اسلام کی سرکوبی کے لیے متحد ہوگئی تھیں۔ جنگ احزاب کفر کی آخری کوشش، ان کے ترکش کا آخری تیر اور شرک کی قوت کا آخری مظاہرہ تھا۔ اسی بنا پر جب دشمن کا سب سے بڑا پہلوان عمرو بن عبدود عالم اسلام کے دیرمجاہد حضرت علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام کے مقابلے میں آیا تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"سبزل الایمان کلہ الی الشریک کلہ۔"

سارے کا سارا ایمان سارے کے سارے کفار، شرک کے مقابلہ میں آگیا ہے۔

کیونکہ ان میں سے کسی ایک کی دوسرے پر فتح کفر کی ایمان پر یا ایمان کی کفر پر مکمل کامیابی تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ فیصلہ کن معرکہ تھا جو اسلام اور شرک کے مستقبل کا تعین کر رہا تھا۔ اسی بنا پر دشمن کی اس عظیم جنگ اور کارنامہ میں کمر ٹوٹ گئی اور اس کے بعد ہمیشہ کے لیے ایسا کارگل مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہا۔

دشمن کا ستارہ اقبال غروب ہو گیا اور اس کی طاقت کے ستون ٹوٹ گئے۔ اسی لیے ایک حدیث میں ہے کہ حضرت رسول گرامی نے جنگ احزاب کے خاتمے پر فرمایا:

"الان نفس وھم ولا یغزونا"

"اب ہم ان سے جنگ کریں گے اور ان میں ہم سے جنگ کی سکت نہیں ہے۔"

۲۔ لشکروں کی تعداد: بعض مؤرخین نے لشکر کفار کی تعداد دس ہزار سے زیادہ لکھی ہے۔ مقررہ اپنی کتاب "الامتاع" میں لکھتے ہیں،

سے ہمارا لفظ کی جلد ۲۰ صفحہ ۱۰۰ میں یہ حدیث "کہ اچھی" سے نقل کی گئی ہے۔

تاریخ کا علی ابن اثیر علیہ ۲ ص ۱۰۰

” صرف قریش نے چار ہزار جنگ جڑوں، تین سو گھوڑوں اور پندرہ سو اونٹوں کے ساتھ خندق کے کنارے پڑاؤ ڈالا ہوا تھا۔ قبیلہ بنی سلیم سات سو افراد کے ساتھ اور بنی نضیر نے ہزاروں سے آگے قبیلہ بنی نضیر کے ساتھ، بنی اشج اور بنی مرہ کے قبائل میں سے بہت سے لوگوں کو افراد کے ساتھ پہنچ گیا۔ اور دوسرے قبائل نے بھی اپنے آدمی بھیننے اور کھینچنے کی مجبوری سے اس سے بھی زیادہ بنتے رہے۔“

جبکہ مسلمانوں کی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہ تھی انہوں نے مدینہ کے قریب ایک چھوٹی سی گاؤں کے نام کو جو ایک بلند جگہ تھی اپنے اصلی لشکر گاہ کے طور پر منتخب کیا تھا جو خندق پر اس عرصے سے مدینہ تھی کہ وہ اپنے شیرازہ نگاروں کے ذریعہ خندق سے آنے والوں پر کنٹرول کر سکتے تھے۔

بہر حال لشکر کفر نے مسلمانوں کا ہر طرف سے محاصرہ کر لیا۔ ایسی روایت ہے کہ تین دن دوسری کے مطابق پچیس دن اور بعض روایات کے مطابق ایک ماہ تک محاصرہ ہوا۔ یہی وہ عرصہ ہے جو کہ تاریخ میں مذکور ہے۔

باوجودیکہ دشمن مسلمانوں کی نسبت مختلف پہلوؤں سے برتری اٹھاتا تھا لیکن یہ کہہ سکتے ہیں کہ آخر کار ناکام ہو کر واپس پلٹ گیا۔

۲۔ خندق کی کھدائی: جیسا کہ معلوم ہے کہ خندق کے کھودنے کا سلسلہ حضرت سلمان فارسی کے مشورہ سے شروع پذیر ہوا۔ خندق اس زمانے میں ملک ایذان میں واقع تھا جو کہ جزیرہ نما اور جزیرہ نما عرب میں اس وقت تک اس کی مثال نہیں تھی اور عرب میں اس کا نام ہی ایجادات میں ہونا تھا۔ اطراف مدینہ میں اس کا کھودنا فوجی لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل تھا۔ یہ خندق دشمن کے دوسلوں کو پست کرنے اور مسلمانوں کو روحانی تقویت کا بھی ایک مؤثر ذریعہ تھی۔

خندق کے کوائف اور جزئیات کے بارے میں صحیح طور پر معلومات تک رسائی تو نہیں ہے البتہ مورخین نے اتنا ضرور لکھا ہے کہ اس کا عرصہ اتنا تھا کہ دشمن کے سوار جت لگا کر بھی اس کو جو نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی گہرائی یقیناً اتنی تھی کہ اگر کوئی شخص اس میں داخل ہو جاتا تو آسانی کے ساتھ دوسری طرف باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ علاوہ ازیں مسلمان تیر اندازوں کا خندق واسے علاقہ پر اتنا تسلط تھا کہ اگر کوئی شخص خندق کو عبور کرنے کا ارادہ کرتا تو ان کے لیے ممکن تھا کہ اسے خندق کے اندر ہی تیر کا نشانہ بنا لیتے۔

رہی اس کی لمبائی تو مشہور روایت کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ حضرت مسات ماب علیؑ علیہ وآلہ وسلم نے دس ہزار افراد کو چالیس ہاتھ (تقریباً ۲۰ میٹر) خندق کھودنے پر مامور کیا تھا اور مشہور قول کے پیش نظر کہ لشکر اسلام کی تعداد تین ہزار تھی تو مجموعی طور پر اس کی لمبائی اندازاً بارہ ہزار ہاتھ (دو ہزار میٹر) ہوگی۔

اس بات کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ اس زمانے میں نہایت ہی استبدانی وسائل کے ساتھ اس قسم کی خندق کھودنا بہت ہی طاقت فرسا کام تھا خصوصاً جب کہ مسلمان خوراک اور دوسرے وسائل کے لحاظ سے بھی محنت کش تھے۔

یقیناً خندق کھودی بھی نہایت کم مدت میں گئی۔ یہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ لشکر اسلام پوری ہوشیاری کے ساتھ دشمن کے حملہ آور ہونے سے پہلے ضروری پیش بندی کر چکا تھا اور وہ بھی اس طرح سے کہ لشکر کفر کے مدینہ پہنچنے سے تین دن پہلے خندق کی کھدائی کا کام مکمل ہو چکا تھا۔

۴۔ بہت بڑی آزمائش کا میدان: جنگ احزاب عام مسلمانوں اور ان لوگوں کے لیے جو اسلام کے دعوے دار تھے، آزمائش کی عجیب کسوٹی تھی۔ اس طرح ان لوگوں کے لیے بھی جو کبھی کبھار دعوے تو غیر جانبدار ہونے کا کرتے تھے، لیکن بالعمنی طور پر دشمنان اسلام سے ملے ہوئے تھے۔

اس جنگ سے تینوں گروہ اپنے نمونین، ضعیف الامان اور منافقین، کا موقف ان کے عمال و کردار کے ذریعے مکمل طور پر نمایاں ہو گیا اور اسلامی اقتدار پر سے طور پر آشکار ہو گئیں۔ ان تینوں نے جنگ احزاب کی گرم جلی میں اپنے شخصیتوں کو جان بوجھ کر دکھایا۔

اس حادثے کا طوفان اس قدر تند اور تیز تھا کہ کوئی بھی شخص جو کچھ اس کے دل میں تھا چھپانہ سکا۔ دشمن مطالب کے ظاہر ہونے کے لیے معمولی حالات میں سالہا سال کی ضرورت تھی وہ ایک مہینہ سے بھی کم مدت میں اللہ دشمن سوج ہو کر سامنے آ گئے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ پیغمبر نے اپنے صبر و استقامت، دلیرانہ مزاحمت، جوہلے، خدایہ توکل اور ایسے آپ پر اعتماد کا عظیم مظاہرہ کیا۔ اسی طرح مسلمانوں کے خندق کھودنے میں ان کے ساتھ مواصلات اور ہر کاری کر کے اور جنگ کے مشکلات برداشت کر کے آپ نے عملی طور پر ثابت کر دیا کہ جو کچھ آپ اس سے پہلے اپنی تعلیمات کی دعوت میں لائے تھے، ان پر آپ کو صدق دل سے یقین ہے اور آپ ان کے وفادار ہیں اور جو کچھ آپ لوگوں سے کہتے ہیں اس پر پہلے خود عمل کرتے ہیں۔

۵۔ حضرت علیؑ کی تاریخی جنگ: اس جنگ کا ایک اہم واقعہ حضرت علیؑ کا دشمن کے لشکر کے نامی گرامی سپہاں عمرو بن عبدود کے ساتھ مقابلہ تھا۔ تاریخ میں آیا ہے کہ لشکر احزاب نے جن دلاوران عرب میں سے بہت طاقت ور افراد کو اس جنگ میں اپنی امداد کے لیے دعوت دے رکھی تھی ان میں سے پانچ افراد زیادہ مشہور تھے: عمرو بن عبدود، عکرمہ بن ابی جہل، ہبیرہ، نوفل اور ضرار۔ یہ لوگ دوران محاصرہ ایک دن دست برد رانی کے لیے تیار ہوئے، لباس جنگ بدن پر سجایا اور خندق کے ایک کچھڑے جھٹے سے، جو جامدین اسلام کے تیروں کی پہنچ سے کسی قدر دور تھا، اپنے گھوڑوں کے ساتھ دوسری طرف جت لگائی اور لشکر اسلام کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ ان میں سے عمرو بن عبدود زیادہ مشہور اور نامور تھا۔ اس کی ”کوئی سہہ بہادر“ کی آواز میدان احزاب میں گونجی اور چونکہ مسلمانوں میں سے کوئی بھی اس کے مقابلے کے لیے تیار نہ ہوا لہذا وہ زیادہ گستاخ ہو گیا اور مسلمانوں کے عقائد اور نظریات کا مذاق اڑانے لگا اور کہنے لگا،

تم جو کہتے ہو کہ تمہارے مقتول جنت میں ہیں اور ہمارے مقتول جہنم میں تو کیا تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جسے میں جنت میں کیوں بارہ بجھے جہنم کی طرف روانہ کرے؟ اور اس موقع پر اس نے اپنے یہ مشہور اشارہ پڑھے:

ولقد بحتت عن المداہ بجمعکم هل من مبارزا
وروقت اذ جبن المشجع موقف البطل المناجزا
ان السماحة والشجاعة في الفتى خيرا للعرانزا
تمہارے اجتماع میں میں نے اتنا پکارا اور مبارز طلبی کی کہ میری آواز نہ بچے گی۔
میں اس وقت ایسی جگہ پر کھڑا ہوں کہ بہادر بنا جگو مشن اس کی جگہ پر کھڑا ہونے سے گھبراتے ہیں۔
جی ہاں! شرافت اور شجاعت جوں مردوں کی بہترین خصلتیں ہیں۔

اس موقع پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ کوئی شخص کھڑا ہو اور اس کے متروک مسلمانوں کے سر سے دور کر دے۔ لیکن حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کے سوا کوئی بھی اس کے ساتھ جنگ کے لیے آمادہ نہ ہوا تو آنحضرت نے علی بن ابی طالب سے فرمایا: "عمر بن عبدود ہے، حضرت علی نے عرض کی حضور! میں بالکل تیار ہوں، خواہ عمر ہی کیوں نہ ہو۔ پیغمبر اکرم نے ان سے فرمایا: "بے قریب آؤ، چنانچہ علی علیہ السلام آپ کے قریب گئے اور آنحضرت نے ان کے سر پر عامر باندھا اور اپنی مخصوص تلوار، الفاتحہ اتین عطا فرمائی اور ان الفاظ میں انہیں دعا دی:

"اللهم احفظنا من بين يديه ومن خلفه وعن يمينه وعن شماله ومن فوقه ومن تحته."
"نہا یا! علی! کے سامنے سے، پیچھے سے، دائیں اور بائیں سے اور اوپر اور نیچے سے حفاظت فرما۔"

حضرت علی علیہ السلام اپنی تیزی سے عمرہ کے مقابلہ میں یہ اشارہ پڑھتے ہوئے میدان میں اترے۔
لا تعجلن فقد استاك
ذونية وبصيرة
انف لا رجوان اقيم
عليك نائحة الجنائز
من ضربة غلابة يقي
صوتها بعد الهزاهز

جلدی نہ کرو کیونکہ تیری بیکار کا قوی اور طاقت و جواب دینے والا اب آگیا ہے۔
وہ شخص جو پاک نیت، شائستہ بعیرت اور فاتح انسان کے لیے نجات دینے والی صلوات رکھتا ہے۔
مجھے امید ہے کہ نوکر کرنے والیوں کی فوج زاری تیرے جنازہ کے پاس بلند کر اؤں گا۔
ابھی واضح حضرت سے کہ جس کی صدا جنگ کے میدانوں کے بعد بھی باقی رہے۔ اور ہر جگہ پہنچے۔

یہی وہ موقع تھا کہ پیغمبر ختمی المرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ مشہور علم ارشاد فرمایا۔

"سبزالایمان ککله الی الشرک ککله"

پورے کا پورا ایمان پورے کے پورے کفر کے مقابلہ میں جا رہا ہے۔

امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے پہلے تو اسے اسلام کی دعوت دی جسے اس نے قبول نہ کیا۔ پھر میدان چھوڑ کر چلے جانے کو کہا۔ اس پر بھی اس نے انکار کیا اور اپنے لیے باعث ننگ و عار سمجھا آپ کی تیسری پیشکش یہ تھی کہ گھوڑے سے اتر آئے اور پیادہ ہو کر دست بدست لڑائی کرے۔

عرد آگ بگولہ ہو گیا اور کہا کہ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ عرب میں سے کوئی بھی شخص مجھے ایسی تجویز دے گا۔ گھوڑے سے اتر آیا اور علی علیہ السلام پر اپنی تلوار کا دار کیا۔ لیکن امیر المؤمنین نے اپنی مخصوص مبارک سے اس دار کو اپنی سر کے ذریعے روکا۔ محو تلوار نے سر کو کاٹ کر آپ کے سر مبارک کو زخمی کر دیا۔ اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے ایک خاص حکمت عملی سے کام لیا۔ عمر بن عبدود سے فرمایا، تو عرب کا زبردست پہلوان ہے، جب کہ میں تجھ سے تن تہا لڑا رہا ہوں۔ لیکن تو نے اپنے پیچھے کن لوگوں کو جمع کر رکھا ہے۔ اس پر عمر نے جیسے ہی پیچھے مڑ کر دیکھا۔

حضرت علی علیہ السلام نے عمر کی بیڈنی پر تلوار کا دار کیا، جس سے وہ سر و قد زمین پر ٹوٹنے لگا۔ شدید گرو و غدار نے میدان کی نضا کو گھیر رکھا تھا۔ کچھ منافقین یہ سوچ رہے تھے کہ حضرت علیؑ، عمر و کے ہاتھوں شہید ہو گئے ہیں۔ لیکن جب انھوں نے نجیر کی آواز سنی تو علیؑ کی کامیابی ان پر واضح ہو گئی۔ اچانک دو گولوں نے دیکھا کہ آپ کے سر مبارک سے خون بہ رہا تھا۔ اور لنگر گاہ اسلام کی طرف خراماں خراماں واپس آ رہے تھے۔ جبکہ فتح کی مسکراہٹ آپ کے بول پر کھیل رہی تھی۔ اور عمر و کا بے سر پیکر میدان کے کنارے ایک طرف پڑا ہوا تھا۔

عرب کے مشہور پہلوان کے مارے جانے سے لشکر احزاب اور ان کی آرزوؤں پر ضرب کاری لگی۔ ان کے حوصلے پست اور دل انتہائی کمزور ہو گئے۔ اس ضرب نے ان کی فتح کی آرزوؤں پر پانی پھیر دیا۔ اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کامیابی کے بارے میں حضرت علیؑ سے ارشاد فرمایا:

"لو وزن اليوم عمالك بعمل جميع امة محمدا لرجع عملك علي
عملهم وذاك انه لم يبق بيت من المشركين الا وقد دخل ذل
بقتل عمرو ولم يبق بيت من المسلمين الا وقد دخل عز بقتل
عمرو!"

اگر تمہارے آج کل کے عمل کو ساری اُمت محمد کے اعمال سے موازنہ کریں تو وہ ان پر بھاری

ہوگا۔ کیونکہ عہد کے بارے جاننے سے مشرکین کا کوئی ایسا گھرباتی نہیں رہا جس میں ذلت و غوری داخل نہ ہوئی ہو اور مسلمانوں کا کوئی بھی گھربا نہیں ہے جس میں عہد کے قتل ہو جانے کی وجہ سے عزت داخل نہ ہوئی ہو۔ اہل سنت کے مشہور عالم، عالم نیشاپوری نے اس گفتگو کو نقل کیا ہے۔ البتہ مختلف الفاظ کے ساتھ اور وہ یہ ہے، "لمبارزة علی بن ابی طالب لعمر و بن عبدود یوم الخندق افضل من اعمال اُمّتی الی یوم القیامة" یعنی علی ابن ابی طالب کی خندق کے دن عمرو بن عبدود سے جنگ میری امت کے قیامت کے اعمال سے افضل ہے۔

آپ کے اس ارشاد کا فلسفہ واضح ہے، کیونکہ اس دن اسلام اور قرآن ظاہراً نابودی کے کنارے پر پہنچ چکے تھے، ان کے لیے زبردست بحرانی لمحات تھے۔ جس شخص نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فداکاری کے بعد اس میدان میں سب سے زیادہ ایثار اور قربانی کا ثبوت دیا، اسلام کو اس خطرے سے محفوظ رکھا، قیامت تک اس کے دوام کی ضمانت دے دی، اس کی فداکاری سے شجر اسلام کی جڑیں مضبوط ہو گئیں اور پھر اسلام عالمین پر پھیل گیا۔ لہذا سب لوگوں کی عبادتیں اس کی مرہون منت قرار پائیں۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ مشرکین نے کسی آدمی کو پیغمبر کی خدمت میں بھیجا تاکہ وہ عمرو بن عبدود کے لاشے کو دس ہزار درہم میں خرید لائے، مثالیہ ان کا یہ خیال تھا کہ مسلمان عہد کے بدلے کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو سنگدل ظالموں نے حضرت حمزہؓ کے بدلے کے ساتھ جنگ احد میں کیا تھا، لیکن رسول اکرمؐ نے فرمایا، اس کا لاشہ تمہاری ملکیت ہے، ہم مردوں کی قیمت نہیں لیا کرتے۔

یہ کھتے بھی قابل توجہ ہے کہ جس وقت عمر کی بن اپنے بھائی کے لاشے پر پہنچی اور اس کی قیمتی زرہ کو دیکھا کہ حضرت علیؓ السلام نے اس کے بدلے سے نہیں اتاری تو اس نے کہا،

ماقتلہ الاکفوکریم

"میں اعتراف کرتی ہوں کہ اس کا قاتل کریم اور بزرگوار شخص ہی تھا۔"

۶۔ پیغمبر اسلام کے فوجی اور سیاسی اقدام: پیغمبر اکرم کی اور مسلمانوں کی جنگ احزاب میں کامیابی کے بہت سے عوامل تھے۔ مثلاً تائید الہی جو آمدھی اور شدید طوفان کے فیصلے

۱۔ بحار الانوار جلد ۲۰، ص ۲۰۰

۲۔ مستدرک حاکم جلد ۱، ص ۲۰۰

۳۔ اس جگہ میں "حقائق اربعہ" جلد ۱، ص ۲۰۰، "تفسیر المیزان جلد ۱، ص ۲۰۰، "حیثیب الیز جلد ۱، ص ۲۰۰ اور "فروش ابیت علیؓ" سے استفادہ کیا گیا ہے۔

ہوئی اور اس نے احزاب کی تمام بساؤ کو لپیٹ کر رکھ دیا۔ نیز پروردگار کے نظر نہ آنے والے لشکران کے علاوہ اور بھی فوجی اور سیاسی عوامل تھے جن میں سے اہم ترین عامل خدا کی ذات پر ایمان اور عقیدہ تھا۔ بعض عوامل یہ تھے:

- ① حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خندق کھودنے کی تجویز کو قبول کر کے عربوں کی جنگی تکنیک میں ایک نئے عہد کا اضافہ کیا، جو اس زمانے تک موجود نہیں تھا۔ یہ ایک ایسی تکنیک تھی جس سے لشکر اسلام کے حوصلے بلند ہوئے اور سپاہ کفر کے پھلنے پھوٹنے گئے۔
- ② عمرو بن عبدود کا اسلام کے عظیم اور مایہ ناز پیرو علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے ہاتھوں مارا جانا اور اس کی موت سے لشکر احزاب کی امیدوں اور آرزوؤں پر پانی بھر جانا۔
- ③ لشکر اسلام کے ہاتھوں سوجھی بھی سکیم کے تحت بنائے گئے مورچے اور مناسب فوجی تکنیک اس بات کا سبب بن گئے کہ دشمن شہر مدینہ میں داخل نہ ہو سکا۔
- ④ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ کامیابی کا اہم ترین عامل ایمان اور اللہ کی ذات پاک پر توکل تھا۔ اس کا بیج مسلمانوں کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بویا تھا۔ اس طویل جنگ میں مسلسل آیات قرآن کی تلاوت ہوتی رہی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دل نشیں باتیں اہل ایمان کے سینوں میں ایمان و توکل کی آبیاری کرتی رہیں۔
- ⑤ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرز عمل آپ کی عظیم روح اور نفس پر اعتماد مسلمانوں کو قوت قلب اور تسکین خاطر عطا کر رہے تھے۔
- ⑥ اس پر مزید نعیم بن مسعود کی داستان لشکر احزاب میں تفرقہ ڈالنے اور اسے کمزور کرنے کا اہم اور موثر عامل تھی۔

۷۔ نعیم بن مسعود کی داستان اور دشمن کے لشکر میں پھوٹ: کوشش اسلام کی خیر نہیں تھی، وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آنے اور عرض کی کہ آپ مجھے جو حکم بھی دیں گے، میں حتمی کامیابی کے لیے اس پر کاربند رہوں گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا،

"تمہارے جیسا شخص ہمارے درمیان اور کوئی نہیں ہے۔ اگر تم دشمن کے لشکر میں پھوٹ ڈال سکتے ہو تو

ڈالو۔ کیونکہ جنگ پوشیدہ تدابیر کا مجموعہ ہے۔"

نعیم بن مسعود نے ایک عمدہ تدبیر سوچی اور وہ یہ کہ وہ بنی قریظہ کے یہودیوں کے پاس گیا۔ جن سے زمانہ جاہلیت میں ان کی دوستی تھی ان سے کہا بنی قریظہ! تم جانتے ہو کہ مجھے تمہارے ساتھ محنت ہے۔

انہوں نے کہا آپ سچ کہتے ہیں، ہم آپ کو اس بارے میں ہرگز کوئی الزام نہیں دیتے۔

نعیم بن مسعود نے کہا: قبیلہ قریش اور عطفان تمہاری طرح نہیں ہیں۔ یہ تمہارا اپنا شہر ہے۔ تمہارا مال اولاد اور عورتیں یہاں پر ہیں اور تم ہرگز پر نہیں کر سکتے کہ یہاں سے کوچ کر جاؤ۔

قریش اور قبیلہ غطفان محمد اور ان کے اصحاب کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے آئے، جو نے میں اور تم نے ان کی حمایت کی۔ جبکہ ان کا شہر کہیں اور ہے اور ان کے مال اور عورتیں بھی دوسری جگہ ہیں۔ اگر انھیں موقع ملے تو لوٹ مار اور غارتگری کر کے ساتھ سے جائیں گے، مگر کوئی مشکل پیش آجائے تو اپنے شہر کو لوٹ جائیں گے، لیکن تم نے اور محمد نے تو اسی شہر میں رہنا اور یقیناً تم اکیلے ان سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، تم اس وقت تک اسلام نہ اٹھاؤ جب تک قریش سے کوئی معاہدہ اور وہ اس طرح کہ وہ چند سرداروں اور بزرگوں کو تھلے سے پاس کر دی دکھ دیں تاکہ وہ جنگ میں کوتاہی نہ کریں۔

یہی قریش کے یہودیوں نے اس کو بہت سراہا۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے پاس گئے اور قریش کے چند سرداروں سے کہا کہ تم اپنے ساتھ میری دوستی کی کیفیت سے اچھی طرح آگاہ ہو۔ ایک بات میرے کانوں تک پہنچی ہے، پھر تم تک پہنچا میں اپنا فریضہ سمجھتا ہوں، تاکہ خیر خواہی کا حق ادا کر سکوں لیکن میری خواہش یہ ہے کہ یہ بات کسی اور کو معلوم نہ ہونے پائے۔ انہوں نے کہا کہ تم بالکل مطمئن رہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ تم ہونا چاہتے کہ یہودی محمد کے بارے میں تمہارے طرز عمل سے اپنی برائت کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ یہودیوں نے محمد کے پاس قاصد بھیجا ہے اور کہلوا رہا ہے کہ ہم اپنے لیے پریشیاں ہیں اور کیا یہ کافی ہو گا کہ ہم قبیلہ قریش اور غطفان کے چند سردار آپ کے لیے یہ خیال بنائیں اور ان کو بندھے ہاتھوں آپ کے سپرد کر دیں تاکہ آپ ان کی گردن اڑا دیں۔ اس کے بعد ہم آپ کے ساتھ مل کر ان کی بیخ کنی کریں گے؟ محمد نے بھی ان کی پیشکش کو قبول کر لیا ہے۔ اس بنا پر اگر یہودی تمہارے پاس کسی کو بھیجیں اور گروہ رکھنے کا مطالبہ کریں تو ایک آدمی بھی ان کے سپرد کرنا کیونکہ ظہر یقینی ہے۔

پھر وہ اپنے قبیلہ غطفان کے پاس آئے اور کہا: تم میرے اصل اور نسب کراچی طرح جانتے ہو۔ میں تمہارا عاشق اور فریفتہ ہوں اور میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ تمہیں میرے غلوں نیت میں ہتھوڑا سا بھی ٹکٹ سنبھالو۔ انہوں نے کہا: تم سچ کہتے ہو، یقیناً ایسا ہی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ لیکن ایسا ہو کہ گویا تم نے مجھ سے نہیں سنی۔ انہوں نے کہا: مطمئن رہو یقیناً ایسا ہی ہو گا، وہ بات کیا ہے؟

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی بات جو قریش سے کہی تھی، یہودیوں کے پریشیاں ہونے اور یہ خیال بنانے کے ارادے کے بارے میں حرف بجز ان سے بھی کہی اور انھیں اس کام کے انجام سے ڈرایا۔

اتفاق سے وہ (ماہ شوال ۳ھ ہجری کے) حجۃ اور ہفتہ کی درمیانی رات تھی۔ ابوسفیان اور غطفان کے سرداروں نے ایک گروہ بنی قرظہ کے یہودیوں کے پاس بھیجا اور کہا: ہمارے جانور یہاں تلف ہو رہے ہیں اور یہاں ہمارے لیے ٹھہرے ہوئے کوئی جگہ نہیں مل سکی ہے، ہمارے حملہ شروع کرنا چاہیے تاکہ کام کو کسی نتیجے تک پہنچائیں۔

یہودیوں نے جواب میں کہا: کل ہفتہ کا دن ہے اور ہم اس دن کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ علاوہ ازیں میں اس بات کا خوف ہے کہ اگر جنگ نے تم پر دباؤ ڈالا تو تم اپنے شہروں کی طرف پلٹ جاؤ گے اور میں یہاں تنہا چھوڑ دوں گے۔ ہمارے

اور ساتھ دینے کی شرط یہ ہے کہ ایک گروہ گروہ کے طور پر ہمارے حوالے کر دو۔

جب یہ خبر قبیلہ قریش اور غطفان تک پہنچی تو انہوں نے کہا: خدا کی قسم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ بات کالاً کالاً

لہذا انہوں نے اپنے قاصد یہودیوں کے پاس بھیجا اور کہا: بخدا ہم تو ایک آدمی بھی تمہارے ساتھ بھیجیں گے اور اگر تمہیں شریک ہو تو ٹھیک ہے بشرطیکہ وہ

بنی قرظہ جیب اس سے باخبر ہوئے تو انہوں نے کہا: واقفانہم بنی سعد نے حق بات کو کہہ دیا۔ تمہیں نہیں کرنا چاہتے کہ کوئی بچہ بھلا رہے ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ لوٹ مار کر کے اپنے شہروں کو لوٹ جائیں اور ہمیں محمد سے حق سے اکیلا چھوڑ جائیں۔

پھر انہوں نے پیغام بھیجا کہ اصل بات وہی ہے جو ہم کہ چکے ہیں۔ خدا اچھا ہے کہ یہ افروختہ سے تمہارے ہمارے سپرد نہیں کرے، ہم بھی جنگ نہیں کریں گے۔ قریش اور غطفان نے بھی اپنی بات پر اصرار کیا۔ لہذا ان کے سینے بھی اختلاف پڑ گیا۔

اور یہ وہی موقع تھا کہ رات کو اس قدر زبردست سرد طوفانی ہوا پھیلی کہ ان کے جسمے اکھڑ گئے اور کچھ حصے سے زمین پر آ پڑیں۔ یہ سب عوامل مل کر اس بات کا سبب بن گئے کہ دشمن کو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا پڑا اور ذریت۔ یہ تاریخ دینی پڑی۔ حتیٰ کہ

میدان میں ان کا ایک آدمی بھی نہ رہا۔

۸۔ خدیجہ کا واقعہ: حنظل، وحشت اور اضطراب سے اس قدر دوچار تھے کہ خود تہہ و تابہ سے ایک رات لشکر احزاب میں اختلاف پڑ جانے کے بعد اپنے گھر پر فرمایا کیا تم میں سے کوئی ایسا شخص ہے جو چاہے یہ دشمن کی لشکر کا میں

جائے اور ان کے حالات معلوم کر لائے تاکہ وہ جنت میں میرا رفیق اور ساتھی ہو۔ خدیجہ کہتے ہیں خدا کی قسم کوئی شخص بھی شدت وحشت، حنظل اور بھوک کے مارے اپنی جگہ نہ نظر

جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ حالت دیکھی تو مجھے آواز دی میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمایا جاؤ اور میرے پاس ان لوگوں کی خبر لے آؤ۔ لیکن وہاں کوئی اور کا انجام نہ دینا یہاں تک کہ میرے پاس نہ

میں ایسی حالت میں وہاں پہنچا جب کہ سخت آندھی چل رہی تھی اور طوفان ہوا تھا اور خاک شعلہ میں تھیں جس میں گر رہا تھا۔ مجھے تیرا آندھی کے سبب ہوا میں اڑ رہے تھے۔ آگ بیابان میں پھیل چکی تھی کھلنے پھٹنے کے آٹ پلٹ گئے

تھے۔ اچانک میں نے ابوسفیان کا سایہ محسوس کیا کہ وہ اس تاریکی میں بلند آواز سے کہہ رہا ہے: قریش تم میں سے ہر ایک اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے شخص کو اچھی طرح سے پہچان لے تاکہ یہاں کوئی بے گناہ نہ سمیٹے نہ پھیل کر کے فوراً ہی اپنے

پاس بیٹھنے والے شخص سے پوچھا کہ تو کون ہے؟ اس نے کہا: میں فلاں ہوں، میں نے کہا: بیٹا بھار۔ پھر ابوسفیان نے کہا خدا کی قسم! یہ ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے، ہمارے اذیت گھونٹے نتائج ہو چکے ہیں اور بنی قرظہ

۱۔ یہ تو ابن ہشام جلد ۳ ص ۲۰۲ بتائیں گے ساتھ۔

نے اپنا بیجان ترنڈا لایا ہے اور اس طوفان نے ہمارے لیے کچھ نہیں چھوڑا۔

پھر وہ بڑی تیزی سے اپنے اونٹ کی طرف بڑھا اور سوار ہونے کے لیے اسے زمین سے اٹھایا۔ وہ اس قدر طبعی کہ اونٹ کے پاؤں میں بندھی ہوئی رسی کو کھولنا بھول گیا۔ لہذا اونٹ تین یا ڈیڑھ گھنٹہ تک اس میں سوجا ایک ہی تیر کاہ تمام کر دوں گا یہی تیر چلے گا۔ میں چوڑا ہی تھا کہ فوراً آنحضرت کا فرمان یاد آ گیا کہ جس اونٹ نے فرمایا تھا کچھ کارروائی کے بغیر واپس آ جا۔ کام صرف وہاں کے حالات ہمارے پاس لانا ہے لہذا میں واپس پلٹ گیا اور جا کر تمام حالات عرض کیے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہلکا ہوا بیڑی میں عرض کیا:

”اللہ قرأنت منزل الكتاب، سریع الحساب، اھزم الاحزاب اللہ اھذمھم وزلزلھم“

”خداوند! تو کتاب کو نازل کرنے والا اور سریع الحساب ہے، تو خود ہی احزاب کو نیست دنا پور فرما! خدا یا! انھیں تباہ کر دے اور ان کے پاؤں نہ جھنے دے“

۹۔ جنگ احزاب کے نتائج: جنگ احزاب تاریخ اسلام میں ایک اہم موڑ اور سنگ میل ثابت ہوئی۔

میں فوجی اور سیاسی اعتبار سے ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کا پلا بھاری ہو گیا۔

بطور خلاصہ اس جنگ کے مفید نتائج چند جملوں میں بیان کیے جا سکتے ہیں۔

الف۔ دشمن کی آخری کوششوں کا ناکام ہو جانا اور ان کی برتری کی آخری طاقت کا ٹوٹ جانا۔

ب۔ منافقین کی سازش کا آشکارا ہو جانا اور ان خطرناک داخلی دشمنوں کا مکمل طور پر بھانڈا چھوٹ جانا۔

ج۔ جنگ احد کی شکست کی تلخ یادوں کی تلافی۔

د۔ دشمن کے دل میں مسلمانوں کی مزید طاقت اور ہدایت کا طاری ہو جانا۔

ہ۔ جو ہجرت مسلمانوں نے اس میدان میں دیکھے ان کی وجہ سے ان کے حوصلوں کا بلند ہو جانا۔

و۔ مدینہ کے اندر اور باہر آنحضرت کی حیثیت کا تسلیم ہو جانا۔

ز۔ سرزمین مدینہ کا بیرونی قریظہ کے شر سے صفایا کی راہ ہموار کرنا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسوۃ اور قدوۃ ہیں:

میں معلوم ہے کہ لوگوں میں سے خدا کے پیچھے ہوئے افراد کا انتخاب اسی لیے ہوتا ہے کہ وہ امتوں کے لیے نمونہ بن سکیں، کیونکہ انبیاء کی عملی تبلیغ اور دعوت کا اہم اور مؤثر ترین حصہ ان کی عملی دعوت ہوتی ہے۔ اسی بنا پر علماء کے مقام و منزلت کے لیے عصمت کو ایک لازمی شرط سمجھتے ہیں اور اس کے دلائل میں سے ایک یہ ہے کہ انہیں لوگوں کے لیے اسوۃ اور مخلوق کے لیے قدوۃ بنانا چاہیے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ زیر بحث آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتدار اور تاسی کا جو حکم آیا ہے وہ مطلق ہے۔ جو آپ کی زندگی کے ہر شعبے کو اپنے میں سیٹے ہوئے ہے۔ اگرچہ اس کی شان نزول جنگ احزاب ہے لیکن ان نزول آیات کے مضامیم کو کبھی بھی اپنے ساتھ محدود نہیں کرتی۔

اس لیے ہم اسلامی احادیث میں دیکھتے ہیں کہ پیردی کے سلسلے میں اہم سے اہم اور معمولی سے معمولی مسائل کا کہ ہے۔

ایک حدیث میں امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

”ان الصبر علی ولایة الامر مقروض لقول الله عز وجل لبیہ اص، فاصبر كما صبر اولوا النذر من النازل، وایجابہ مثل ذلك علی اولیائہ واهل طاعتہ، لقولہ، لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنة“

”صبر و شکیبائی اسلامی حکام پر واجب ہے کیونکہ خدا اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے، صبر کرو جس طرح اولوا النذر نے صبر و شکیبائی اختیار کی ہے اور اسی چیز کو آپ کے دوستوں اور اطاعت گزاروں پر آپ کی پیروی کرنے کے حکم کے ساتھ واجب فرمایا ہے“

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

”جس وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز عشا پڑھتے تو وضو کا پانی اور اپنی سواک اپنے سرانے رکھ لیتے اور پانی کے برتن کو ڈھکنے سے ڈھانپ دیتے۔۔۔۔“

پھر آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز تہجد کی کیفیت بیان فرمائی اور عرض فرمایا:

”لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنة“

تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اسوۃ حسنہ ہے“

واقعاً اگر ہم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کو اپنے لیے اسوۃ قرار دے دیں، آپ کے ایمان و توکل نکلے دشمنیت، تکلم و نظامت، زہد و تقویٰ کو اپنے لیے مشعل راہ بنالیں تو ہماری کایا پلٹ جائے اور ہماری زندگی روشن اور نور ہو جائے۔

آج سارے مسلمانوں پر ضرورنا ایمان اور پرجوشی و جواہر انہوں پر فرمیں ہے کہ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کو حرفت و محرف پڑھیں اور اسے دل میں جگہ دے کر ہر لحاظ سے اپنے لیے اسوۃ و نمونہ قرار دیں، کیونکہ سعادت

کام ترین وسیلہ اور کامیابی و کامرانی کی اصل کلید یہ ہے۔

خدا کو بہت یاد کرو،

خدا کو یاد کرنے کا حکم ضرورتاً ذکر کثیر بار ہا قرآنی آیات میں آیا ہے اور اسلامی روایات میں بھی اسے بہت اہمیت دی گئی ہے، یہاں تک کہ حضرت ابو ذرؓ سے ایک حدیث ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں مسجد میں داخل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے مجھ سے فرمایا:

”علیہ بتلاوة کتاب اللہ و ذکر اللہ کثیراً فانک ذکرک فی السماء و نورک فی الارض“

”تم پر قرآن کی تلاوت اور بہت یاد خدا لازم ہے۔ کیونکہ اس کے سبب آسمانوں میں فرشتے تمہیں یاد کریں گے اور زمین میں تمہارے لیے نور ہوگا“

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے:

”اذا ذکر العبد ربہ فی الیوم مائة مرة کان ذلک کثیراً“

”جب انسان خدا کو دن میں سو مرتبہ یاد کرے تو یہ ذکر کثیر شمار ہوگا“

نیز ایک اور حدیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

”الاخبرکم بخیر اعمالکم وازکاهاعندمیککم وارفعہا فی درجاتکم و خیر لکم من الدینار و الدرہم و خیر لکم من ان تلتوا عدوکم فتقتلونہم و یقتلونکم؟ قالوا: بلی یا رسول اللہ! قال: ذکر اللہ کثیراً“

”کیا میں تمہیں تمہارے پروردگار کے ہاں بہترین اعمال اور پاکیزہ ترین کاموں کے متعلق نہ بتاؤں؟ وہ عمل جو تمہارا بالاترین درجہ اور تمہارے لیے درہم و دینار سے بہتر ہو حتیٰ کہ جہاد اور راہ خدا میں شہادت سے بھی بہتر ہے“

انہوں نے عرض کیا ضرور۔

فرمایا: خدا کو زیادہ یاد کرنا۔

سنہ ۱۲۸۱ھ، جلد ۱، صفحہ ۲۵۰، بحوالہ فضائل۔

سنہ سفینۃ البحار، جلد ۱، صفحہ ۲۸۲

سنہ سفینۃ البحار، جلد ۱، صفحہ ۳۸۲۔

لیکن ہرگز یہ تصور نہیں کرنا چاہیے کہ ان تمام فضائل کے ساتھ ذکر پروردگار سے مراد صرف زبانی ذکر ہے بلکہ اسلامی آیات میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ اس سے مراد اس کے علاوہ قلبی اور عملی ذکر بھی ہے، یعنی جس وقت انسان کو یہ حرام کام کے ارتکاب کا سامنا ہو تو خدا کو یاد کر کے اسے ترک کر دے۔

مقصود یہ ہے کہ خدا انسان کی تمام زندگی میں حاضر ناظر ہو اور نور پروردگار اس کی تمام زندگی میں جلوہ مکن ہو۔ ہمیشہ اس یاد میں مگن ہو اور اس کے فرمان کو نصب العین قرار دے۔

جہاں پر جاہلوں کا ایک گروہ اکٹھا ہو جائے اور خود ساختہ ذکر و انکار کا درد محسوس کرے اور بدعتوں کو پھیلائے میں مصروف رہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”بادروا الی ریاض الجنۃ؟“

”جنت کے باغوں کی طرف جلدی بڑھو“

تو صحابہ نے عرض کیا:

”وما ریاض الجنۃ؟“

”جنت کے باغات کیا ہیں؟“

آپ نے فرمایا:

”حلق الذکر“

”محاسن ذکر ہیں“

اس سے مراد وہ محاسن ہیں جن میں علوم اسلامیہ کا احیاء ہو، تربیتی و اخلاقی پروگرام پیش ہوں جن میں انسانوں کی قربت اور اصلاح کی جائے تاکہ گناہگار گناہوں سے بچ جائیں اور راہ خدا پر چلیں۔

سنہ سفینۃ البحار، جلد ۱، صفحہ ۳۸۲۔

سنہ سفینۃ البحار، جلد ۱، صفحہ ۳۸۲۔

سنہ ”ذکر اللہ“ کی اہمیت اور اس کے مفہوم کے سلسلہ میں، تفسیر نمونہ جلد ۱، صفحہ ۲۵۰، درود ترجمہ میں بھی تفسیر گفتگو کی جا چکی ہے۔

۲۶- وَأَنْزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوهُمْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ صَيَاصِيهِمْ وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيقًا تَقْتُلُونَ وَتَأْسِرُونَ فَرِيقًا

۲۷- وَأَوْزَشَكُمْ أَرْضَهُمْ وَوَدْيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضًا لَمْ تَطَّوُّوهَا وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا

ترجمہ

۲۶- خدا نے اہل کتاب میں سے جن کی (مشرکین عرب کی طرف سے) حمایت کی گئی، انہیں ان کے محکم قلعوں سے نیچے کھینچا اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا (اور ان کا معاملہ یہاں تک پہنچا کہ) ان میں سے ایک گروہ کو تم قتل کر رہے ہو اور دوسرے گروہ کو قیدی بنا رہے ہو۔

۲۷- اور ان کی زمینوں، ان کے گھروں اور ان کے مالوں کو تمہارے اختیار میں دے دیا۔ اور (اسی طرح) اس زمین کو بھی جس میں تم نے کبھی قدم بھی نہیں رکھا تھا اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر ایک اور عظیم کامیابی

مدینہ میں یہودیوں کے تین مشہور قبائل رہتے تھے، بنی قریظہ، بنی النضیر اور بنی قینقاع۔ تینوں گروہوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معاہدہ کر رکھا تھا کس آپ کے دشمنوں کا ساتھ نہیں دیں گے، ان کے لیے جاسوسی نہیں کریں گے اور مسلمانوں کے ساتھ مل جل کر امن و آسشتی کی زندگی گزاریں گے لیکن قبیلہ بنی قینقاع نے ہجرت کے دوسرے سال اور قبیلہ بنی نضیر نے ہجرت کے چوتھے سال مختلف جہلوں پہانوں سے اپنا معاہدہ توڑ ڈالا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مقابلہ کے لیے تیار ہو گئے۔ آخر کار ان کی مزاحمت اور مقابلہ کی شکست ختم ہو گئی اور وہ مدینہ سے باہر نکال دیئے گئے۔

بنی قینقاع اذرمات شام کی طرف چلے گئے اور بنی نضیر کے کچھ لوگ تو خیبر کی طرف اور کچھ شام کی طرف چلے گئے۔

اسی بنا پر ہجرت کے پانچویں سال جبکہ جنگِ اُحزاب پیش آئی تو صرف قبیلہ بنی قریظہ مدینہ میں باقی رہ گیا تھا اور جیسا کہ جنگِ اُحزاب کی سترہ آیات کی تفسیر میں ہم نے کہا ہے، وہ بھی اس میدان میں اپنے معاہدہ کو توڑ کر مشرکین عرب کے ساتھ مل گئے اور مسلمانوں کے مقابلہ میں تلواریں سونت لیں۔

جب جنگِ اُحزاب ختم ہو گئی اور قریش، بنی مظنن اور دیگر قبائل عرب بھی رسوا کن شکست کے بعد مدینہ سے چلے گئے تو اسلامی روایات کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے گھر لوٹ آئے اور جنگی لباس اتار کر منانے دھونے میں مشغول ہو گئے تو اس موقع پر جبرائیل حکم خدا سے آپ پر نازل ہوئے اور کہا، یوں آپ نے ہتھیار اتار دیئے ہیں جبکہ فرشتے ابھی تک آمادہ پیکار ہیں۔ آپ فوراً بنی قریظہ کی طرف جائیں اور ان کا کام تمام کریں۔

واقعاً بنی قریظہ کا حساب چکانے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور موقع نہیں تھا۔ مسلمان اپنی کامیابی پر خوش و خرم تھے، بنی قریظہ شکست کی شدید وحشت میں گرفتار تھے اور قبائل عرب میں سے ان کے دوست اور حلیف ٹھکے ماندے اور بہت ہی پست و مصلوں کے ساتھ شکست خوردہ حالت میں اپنے اپنے شہروں اور علاقوں میں جا چکے تھے اور کوئی نہیں تھا جو ان کی حمایت کرے۔

بہر حال منادی نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے منادی کہ نماز عصر پڑھنے سے پہلے بنی قریظہ

کی طرف پہل پڑو مسلمان بڑی تیزی کے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہو گئے اور غروب آفتاب کے ساتھ ہی بنی قریظہ کے محکم و منبر کو مسلمانوں نے اپنے محاصرے میں لے لیا۔

پچیس دن تک محاصرہ جاری رہا۔ اس کے بعد جیسا کہ نکات کی بحث میں آئے گا، ان سب نے ہتھیار ڈال دیے اور اپنے آپ کو مسلمانوں کے سپرد کر دیا۔ ان میں سے کچھ کو قتل کر دیا گیا اور مسلمانوں کی کامیابیوں میں ایک اور فتح کا اضافہ اور سرزمین مدینہ ہمیشہ کے لیے ان منافع اوقاف اور بروست ہٹ دھرم اعلاء کے ناپاک وجود سے پاک ہو گئی۔

زیر بحث آیات اس اجراء کی طرف مختصر اور بلیغ اشارہ کرتی ہیں۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ آیات کامیابی کے حصول کے بعد نازل ہوئیں اور اس ماجرے کا تذکرہ خدا کی ایک عظیم نعمت اور عنایت کے طور پر ہوا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے۔ "خدا نے اہل کتاب میں سے ایک گروہ کو جنہوں نے مشرکین عرب کی حمایت کی تھی، ان کے محکم و منبر قلعوں سے نیچے کھینچا: (و انزلنا الذین ظاہروہم من اہل الکتاب من صی صیہم۔

"صی صی" جمع ہے "صیصہ" کی جو مضبوط قلعوں کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں اس لفظ کا دفاع کے ہر ذریعے پر اطلاق ہونے لگا، جیسے بیل کے سینک یا شرنے کی ٹانگ والا کاشا۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہودیوں نے اپنے قلعے مدینہ کے پاس بلند اور اونچی جگہ پر بنا رکھے تھے اور ان کے بلند برجوں سے اپنا دفاع کرتے تھے۔ "انزل" نیچے لے آیا، کی تعمیر اس معنی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے۔ "خدا نے ان کے دلوں میں خوف اور عجب ڈال دیا: (و نذف فی قلوبہم الرعب)۔

آخر کار ان کا معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ تم ان میں سے ایک گروہ کو قتل کر رہے تھے اور دوسرے کو اسیر بنا رہے تھے؟ (فریبتاً تقتلون وتأسرون فریبتاً)۔

"اور ان کی زمینیں گھر اور مال و متاع تمہارے اختیار میں دے دیا: (و اورشکم ارضہم و دیارہم و اموالہم)۔

یہ چند جملے جنگ بنی قریظہ کے عام نتائج کا خلاصہ ہیں۔ ان خیانت کاروں میں سے کچھ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے، کچھ قید ہو گئے اور بہت زیادہ مالی غنیمت جس میں ان کی زمینیں، گھر، مکانات اور ہاں و متاع شامل تھا، مسلمانوں کو ملا۔

ان غنائم کو "ارث" سے تعبیر کرنا اس بنا پر ہے کہ مسلمانوں نے ان کے حاصل کرنے میں کوئی زیادہ زحمت نہیں اٹھائی بلکہ آسانی کے ساتھ وہ تمام مال ان کے ہاتھ آ گیا جو یہودیوں نے سالہا سال کے عرصے میں غلام اور مجیدہ ادگری اور ٹوٹ کھوٹ کے ذریعہ حاصل کیا تھا۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے۔ "اسی طرح وہ زمین بھی تمہارے اختیار میں دے دی، جس پر ہرگز تم نے قدم نہیں رکھا تھا: (وارضنا لہم تسطوہا)۔

"اور خدا ہر چیز پر قادر و توانا ہے: (و کان اللہ علی کل شیء قدیداً)۔

"ارضنا لہم تسطوہا" سے مراد کوئی نہیں ہے؟ مفسرین کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے اسے سرزمین "خیبر" کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو بعد میں مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوئی۔

بعض نے سرزمین مکہ کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔

بعض اسے سرزمین "روم داریان" جانتے ہیں۔

اور بعض سب سرزمینوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو اس دن سے لے کر قیامت تک مسلمانوں کی قسملہ رو میں تسلسل پائیں گی۔

لیکن ان احتمالات میں سے کوئی بھی ظاہر آیت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔ کیونکہ آیت نفل ماضی کے قرینہ ہے جو اس میں آیا ہے یعنی "اورشکم" اس بات کی شاہد ہے کہ یہ سرزمین اسی جنگ بنی قریظہ کے واقعے میں مسلمانوں کے تصرف میں آئی تھی۔ علاوہ ازیں سرزمین مکہ ایسی نہیں تھی کہ جس میں مسلمانوں نے قدم نہ رکھا ہو جبکہ قرآن کہتا ہے کہ ایسی زمین تمہارے قبضے میں دی کہ جس میں تم نے قدم نہیں رکھا تھا۔ ظاہر ہے تمہارا ان مخصوص باغات و اراضی کی طرف اشارہ ہے جو بنی قریظہ کے قبضے میں تھے اور کوئی بھی ان میں داخل ہونے کا حق نہیں رکھتا تھا۔ کیونکہ یہود اپنے اموال کی حفاظت اور اس کا زبردست خیال رکھتے تھے۔

نیز اگر اس فتح و کامیابی کے ماضی میں ہونے سے صرف نظر کر لیں تو پھر زیادہ مناسب زمین خیبر سے تعلق رکھتی ہے جو بہت ہی مختصر عرصے میں یہودیوں سے لے لی گئی تھی اور مسلمانوں کے قبضے میں آ گئی تھی۔ (جنگ خیبر ہجرت کے ساتویں سال وقوع پذیر ہوئی تھی)۔

چند اہم نکات

۱۔ جنگ بنی قریظہ کے علل و اسباب: قرآن مجید اس چیز پر گواہ ہے کہ اس جنگ کا اصل سبب بنی قریظہ کے یہودیوں کی جنگ احزاب میں مشرکین عرب کی حمایت تھی، کیونکہ خدا فرماتا ہے:

"الذین ظاہروہم"

"وہ لوگ کہ جنہوں نے ان کی حمایت کی..."

اس کے علاوہ اصولی طور پر مدینہ کے یہودی دشمنان اسلام کا پانچواں ستون (FIFTH COLUMN) شمار ہوتے تھے۔ اسلام کے برخلاف پروپیگنڈے میں کو شال رہتے تھے اور مسلمانوں پر کاری ضرب لگانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

جیسا کہ ہم کہ چکے ہیں، یہودیوں کے تین قبائل، بنی قینقاع، بنی نضیر اور بنی قریظہ میں سے آخری گروہ جنگ

ازاب کے موقع پر مدینہ میں باقی رہ گیا تھا اور پہلا اہل بدر و سرگردوہ بالترتیب ہجرت کے دوسرے اور چوتھے سال عہد شکنی کی وجہ سے مدینہ سے نکال دیئے گئے تھے۔

ضروری تھا کہ یہ تیسرا گروہ جنہوں نے سب سے زیادہ کھلی عہد شکنی کی تھی اور دشمنان اسلام سے امان کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا، انہیں ان کے پست اعمال کی وجہ سے کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔

۲۔ جنگ بنی قریظہ کے واقعات : ہم بتا چکے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ احزاب ختم ہوتے ہی ماہر ہو گئے کہ بنی قریظہ کے یہودیوں کا حساب چکادیں لکھا ہے کہ مسلمانوں نے بنی قریظہ کے قلعوں کی طرف اس قدر طبری کی کہ بعض لوگ اپنی نماز عصر سے بھی غافل ہو گئے اور جموڑا انہیں بعد میں قضا بجالانی پڑی۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے قلعوں کا محاصرہ کا حکم صادر فرمایا۔ پچیس دن تک محاصرہ جاری رہا۔ قرآن کے فرمان کے مطابق خدا نے شدید عذاب اور وحشت و دشمنوں کے دلوں میں ڈال دی۔

کعب بن اسد کا شمار یہودیوں کے سرداروں میں ہوتا تھا۔ اس نے اپنی قوم سے کہا، مجھے یقین ہے کہ محمدؐ ہمیں ان وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک ہم جنگ نہ کریں۔ لہذا میری تین ہتھیاریں ہیں، ان میں سے کسی ایک کو قبول کرو۔ پہلی ہتھیاری تو یہ ہے کہ اس شخص کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس پر ایمان لے آؤ اور اس کی پیروی اختیار کرو۔ کیونکہ تم پر ثابت ہو چکا ہے کہ وہ خدا کا پیغمبر ہے اور اس کی نشانیاں تمہاری کتابوں میں پائی جاتی ہیں تو اس صورت میں تمہارے مال، جان اور اولاد اور عورتیں محفوظ ہو جائیں گی۔

وہ کہنے لگے کہ ہم ہرگز حکم تو راست سے دست بردار نہیں ہوں گے اور نہ ہی اس کا تبادلہ اختیار کریں گے۔ اس نے کہا اگر یہ تجویز قبول نہیں کرتے تو پھر آؤ اور اپنے بچوں اور عورتوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر ڈالو تاکہ ان کی طرف سے آسودہ خاطر ہو کر میدان جنگ میں کود پڑیں اور پھر دیکھیں کہ خدا کیا چاہتا ہے؟ اگر ہم مارے گئے تو اولاد و عیال کی جانب سے ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی اور اگر کامیاب ہو گئے تو پھر عورتیں بھی بہت نیچے بھی بہت۔

وہ کہنے لگے کہ ہم ان بے چاروں کو اپنے ہی ہاتھوں سے قتل کریں؟ ان کے بعد ہمارے لیے زندگی کی قدر و قیمت کیا رہ جائے گی؟

کعب بن اسد نے کہا اگر یہ بھی تم نے قبول نہیں کیا تو آج پھر ہفت کی رات ہے، ہفت روزہ، اور اس کے ساتھی یہ خیال کریں گے کہ ہم آج رات حملہ نہیں کریں گے انہیں اس غفلت میں ڈال کر ان پر حملہ کریں شاید کامیابی حاصل ہو جائے۔ وہ کہنے لگے کہ یہ کام بھی ہم نہیں کریں گے۔ کیونکہ ہم کسی بھی صورت میں ہفتہ کا احترام پالنا نہیں کریں گے۔ کعب کہنے لگا، پیدائش سے لے کر آج تک تمہارے اندر عقل نہیں آسکی۔

اس کے بعد انہوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بات کی کہ اب لوہا بے کو ان کے پاس بھیجا جائے تاکہ وہ ان سے صلاح مشورہ کر لیں۔

جس وقت ابولہبابہ ان کے پاس آئے تو یہودیوں کی عورتیں اور بچے ان کے سامنے گرے و زاری کرنے لگے۔ اس

کہ ان کے دل پر بہت اثر ہوا۔ اس وقت لوگوں نے کہا کہ آپؐ ہیں مشورہ دیتے ہیں کہ ہم محمدؐ کے آگے ہتھیار ڈال دیں؟ ابولہبابہ کہتے ہیں، جیسے ہی میں وہاں سے چلا تو مجھے اپنی خیانت کا شدید احساس ہوا۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل گیا۔ بلکہ سیدہ حامدہ کی طرف چلا اور اپنے آپ کو محمدؐ کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا اور کہا میں اپنی جگہ سے نہ ہٹتا ہوں۔

آخر کار خدا نے اس کا یہ گناہ اس کی صداقت کی بنا پر بخش دیا۔ اور اسی سلسلے میں یہ آیت "واخرون اعترفوا بذنوبهم....." نازل ہوئی۔ (توبہ-۱۰۲)

آخر کار بنی قریظہ کے یہودیوں نے مجبور ہو کر غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے۔ جناب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سعد بن معاذ تمہارے بارے میں جو فیصلہ کر دی لکھا وہ تمہیں قبول ہے؟ وہ راضی ہو گئے۔

سعد بن معاذ نے کہا کہ اب وہ موقع آن پہنچا ہے کہ سعد کس ملامت کرنے والے کی ملامت کو نظر میں رکھے۔ بغیر حکم خدا بیان کرے۔

سعد نے جس وقت یہودیوں سے دوبارہ یہی اقرار لے لیا تو انہیں بند کر لیں اور جس طرف پیغمبرؐ بڑھے ہوئے تھے ادھر رخ کر کے عرض کیا، آپؐ میرا فیصلہ قبول کریں گے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا، ضرور! تو سعد نے کہا، میں کہتا ہوں کہ جو لوگ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے پر آمادہ تھے (بنی قریظہ کے مرد)، انہیں قتل کر دینا چاہیے، ان کی عورتیں اور بچے قید اور ان کے اموال تقسیم کر دینے چاہئیں۔ البتہ ان میں سے ایک گروہ اسلام قبول کرنے کے بعد قتل ہونے سے بچ گیا۔

۳۔ جنگ بنی قریظہ کے نتائج : نتائج کی حالت تھی۔ ان میں سے بعض یہ ہیں،

- ۱۔ مدینہ کا داخلی ماحول ختم ہو گیا اور یہودی جاسوسوں سے مسلمان آسودہ خاطر ہو گئے۔
- ۲۔ مدینہ کے اندر مشرکین عرب کے اڈے منہدم ہو گئے اور اندرونی شورش سے ان کی امیدیں ختم ہو گئیں۔
- ۳۔ جنگ سے حاصل ہونے والے مال غنیمت سے مسلمانوں کی مالی بنیادیں مستحکم ہو گئیں۔
- ۴۔ آئندہ کی کامیابیوں کے لیے راہ ہموار ہو گئی، خصوصاً خیبر کی فتح کے لیے۔
- ۵۔ مدینہ کے اندر اور باہر دستوں اور دشمنوں کی نگاہ میں حکومت اسلامی کی حیثیت مستحکم ہو گئی۔

۴۔ آیات کی معنی خیز تعبیریں : جنگ میں قتل ہونے والوں کے بارے میں قرآن کتاب ہے "فدقیقتقتلون"

۱۔ بیروت ابن ہشام جلد ۲ ص ۲۲۲ اور کمال ابن اشرج ص ۱۵۱ (کچھ نہیں کے ساتھ)۔

یعنی "فردیثاً" کو "تقتلون" پر مقدم رکھا گیا ہے۔ حالانکہ قیدوں کے بارے میں فریقاً "کو اس کے فعل ہی" تاہم اس سے مؤخر رکھا گیا ہے۔ یعنی مفسرین نے اس بارے میں کہا ہے کہ یہ اس بنا پر ہے کہ قتل ہونے والے زیادہ تر مسلمانوں کے سر ہٹنے تھے۔ لیکن قید ہونے والے غیر معروف افراد تھے۔ علاوہ ازیں یہ تقدیم و تاخیر سبب ہوئی کہ قتل اور قید ہر دو پر کامیابی کے دو اہم عامل تھے ایک دوسرے کے ساتھ آگے ہیں اور ان کے درمیان تناسب اور تعلق کو ملاحظہ رکھا گیا۔ نیز پہلی نیر کی بحث آیت میں، یہودیوں کو ان کے قتلوں سے نیچے لانا "قد فنی قلوبہم الذرعیب" (خدا نے ان کے دلوں میں رعب و وحشت ڈال دی) سے پہلے ذکر کیا ہے۔ حالانکہ فخری ترتیب اس کے برخلاف ہے یعنی پہلے رعب پیدا ہوتا ہے اور پھر ان حکم قتلوں سے نیچے آنا ہوتا ہے۔ یہ اس بنا پر ہے کہ جو کچھ کلموں کے لیے زیادہ اہم اور مسردگن تھا اور ان کے اصل مقصد کو تشکیل دیتا تھا، وہ ان کے بہت ہی مستحکم قتلوں کا ٹوٹنا تھا۔

"اور شکر ارضہم و دیارہم" کی تعبیر بھی اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ تم بغیر اس کے کہ اس جگہ کے لیے کچھ بھی زحمت برداشت کرتے، خدا نے ان کی زمینیں، گھر اور مال و دولت سب کچھ تمہارے اختیار میں دے دیا۔

آخری آیت میں خدا کی لازوال قدرت کا ذکر ہے اور "وکان اللہ علی کل شیء قدیدراً" اس طرف اشارہ ہے کہ اس نے ایک دن آندھی اور طوفان اور نظر نہ آنے والے لشکر کے ذریعہ اہم خبر کو شکست دی اور دوسرے دن رعب و وحشت کے لشکر سے ان کے کامیوں یعنی بنی قریظہ کے یہودیوں کا ستیاناس کر دیا۔

۲۸- یَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِن كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ۝

۲۹- وَإِن كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالذَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا ۝

۳۰- يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ مَنْ يٰۤاَيَّتْ مِنْكُنَّ بِفٰحِشَةٍ مُّبِيْنَةٍ يُضَعِفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۙ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلٰى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝

۳۱- وَمَنْ يٰۤاَيَّتْ مِنْكُنَّ بِلَهٍ وَرَسُوْلِهِ وَتَعْمَلْ صٰلِحًا نُّوْتْهَا اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَاعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ۝

ترجمہ

۲۸- اے پیغمبر! اپنی بیویوں سے کہہ دیجیئے، اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ ہدیہ دے کر اچھے طریقے سے رخصت کر دوں۔

۲۹۔ اور اگر تم خدا، اس کے پیغمبر اور دایر آخرت کی طالب ہو تو خدا تم میں سے نیکو کاروں کے لیے عظیم اجر مہیا کر رکھا ہے۔

۳۰۔ اے نبی کی بیویو! جو کوئی تم سے صریح گناہ اور بُرے کام کی مرتکب ہوگی، اس کا عذاب ڈگنا ہوگا اور یہ خدا کے لیے آسان ہے۔

۳۱۔ اور تم میں سے جو کوئی خدا اور اس کے رسول کے لیے خضوع و خشوع اختیار کرے گی اور عمل صالح بجالائے گی، ہم اس کے اجر و جزاء کو ڈگنا کریں گے اور اس کے لیے ہم نے با عظمت روزی فرام کر رکھی ہے۔

شان نزول

مفسرین نے ان آیات کی کئی ایک شان نزول ذکر کی ہیں کہ جو تفسیر کے لحاظ سے آپس میں تعلقاً مختلف نہیں ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ چند جنگوں کے بعد بڑی مقدار میں غنیمتیں مسلمانوں کے ہاتھ لگ گئیں تو ازواج پیغمبر نے آپ سے نفقہ میں اضافہ اور زندگی کے گونا گوں لوازم کے لیے مختلف تقاضے شروع کر دیئے۔ معنی تقابیر کے مطابق حضرت اُم سلمہؓ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خدمت گزاری کے لیے کینز کا تقاضا کیا، میمونہؓ نے کوئی خاص لباس مانگا، زینب بنت جحش نے ایک خاص مینی کپڑے کی فرمائش کی، حفصہؓ نے مصری جامہ طلب کیا، جو بڑے پٹے کے ایک عمدہ لباس پایا، سوڈہؓ نے خیبری گیم کی درخواست کی۔ غلامہ یہ کہ ہر ایک نے الگ الگ فرمائش کی۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانتے تھے کہ اس قسم کی فرمائشوں کے سامنے جھک جانا جو عام طور پر ختم ہونے والی نہیں ہوتیں، "ہیئت نبوت" کو کیے انجام سے دوچار کر دیں گی لہذا آپ نے ان خواہشات کو پورا کرنے سے انکار کر دیا اور پورا ایک مہینہ ان سے کنارہ کشی اختیار کیے رکھی۔ یہاں تک کہ مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں اور دو ٹوک لیکن رحمت سے آمنت کے لہجہ کے ساتھ انہیں خبر دیا گیا کہ اگر زینب زینت سے آراستہ، دنیاوی زندگی چاہتی ہو تو تم پیغمبر سے الگ ہو سکتی ہو اور جہاں جانا چاہو جا سکتی ہو اور اگر خدا، رسول اور دروزہ جہاد سے وابستہ رہنا چاہتی ہو تو پیغمبر کے گھر کی سادہ لیکن پُر افتخار زندگی پر قانع ہو جاؤ اور پردہ گار کے عظیم اجر و ثواب سے حصہ لیتی رہو۔

اس طرح سے ازواج پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توقع کا جو دامن چھلایا ہوا تھا اس کے ضمن میں حکم اور دو ٹوک جواب دے دیا اور انہیں پیغمبر کے گھر میں ٹھہرے رہنے اور الگ ہو جانے کے درمیان اختیار میں غنایت فرمایا۔

تفسیر

سعادت ابدی یا دنیاوی ٹھاٹھ باٹھ

آپ جوڑے نہیں ہوں گے کہ اس سورہ کی آیات میں خداوند عالم نے عزت و افتخار کا تاج پیغمبر کی بیویوں کے سر پر رکھا ہے اور ان کا ام المؤمنین کے عنوان سے تعارف کروایا ہے۔ واضح رہے کہ ہمیشہ احساس اور افتخار آفرین مراتب کے ساتھ بھاری ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں۔ ازواج رسولؐ کیونکر امتات المؤمنین ہو سکتی ہیں حبیب کہ ان کی قلب و نظر دنیا کی زینت پر فریفتہ ہوں اور حبیب وہ یہ خیال کریں کہ اگر مسلمانوں کو مال غنیمت حاصل ہو تو بادشاہوں کی بیویوں کی طرح اس کا بہترین حصہ انہیں مل جائے اور شہداء کی ماں نشاری اور مقدس خون کے صدقہ میں جو چیز اٹھ آئی ہے وہ ان کے حوالہ کی جائے۔ جبکہ کئی لوگ نعر و نفاقت کی زندگی بسر کر رہے ہوں؟

اس سے قطع نظر گذشتہ آیات کے مطابق نہ صرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے لیے اسوہ و نمونہ ہیں بلکہ ان کے گھروالوں کو بھی دوسرے خاندانوں کے لیے اسوہ اور ان کی بیویوں کو دامن قیامت تک کی با ایمان عورتوں کے لیے مقتدار ہونا چاہیے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی بادشاہ نہیں ہیں کہ ان کا شان و شوکت والا حرم سرا ہو اور ان کی بیویاں قیمتی جوہرات اور زینب و زینت کی دوسری چیزوں سے لہی چھندی ہوں۔

شاید ابھی تک محنت کے کچھ مسلمان جو مہاجر ہو کر مکتہ سے مدینہ آئے تھے صرف وہ مخصوص نظر کہ مسجد نبوی کے ساتھ تھا، میں اہل بیت لہجہ کرتے تھے۔ اس شہر میں ان کا کوئی خانہ و کاشا نہیں تھا۔ ان حالات میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرہ جات نہیں دے سکتے تھے کہ آپ کی بیویاں آپ سے اس قسم کی توقعات رکھیں۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض بیویوں نے تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نعمت کلامی کی حد کر دی اور یہاں تک کہہ دیا:

«لعلک تظن ان حلققتا لانجد زوجا من قومنا غنیک»

«شاید آپ یہ گمان کرتے ہیں کہ آپ ہیں ملاق دے دیں تو ہمیں اپنی قوم قبیلہ میں کوئی شوہر نہیں ملے گا۔»

اس موقع پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے حکم سے مامور ہوئے کہ وہ اس نظریہ کا ڈٹ کر مقابلہ کریں اور اس کے سامنے ہمیشہ کے لیے پوزیشن واضح کر دیں۔

نہر حال زیر بحث آیات میں سے پہلی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہے! اسے پیغمبر! اپنی بیویوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم دنیاوی زندگی اور اس کی زینت کی طلب گار ہو تو آؤ میں کی لڑائی جھگڑے کے بغیر کچھ دیر دے کر تمہیں اپنے طریقے سے جدا کیے دیتا ہوں! یا ایہا النبی قل لا زواج لکم انکم کنتم تشرکتون بالحیاء الذنیاء وزینتھا فتعالین امتعکن واسرھکن سراحاً جمیلاً۔

”امتعکن“ = متعہ کے مادہ سے ہے اور جیسا کہ ہم سورہ بقرہ کی آیت ۲۳۶ میں کہہ چکے ہیں کہ اس سے مراد وہ دیر ہے جو عورت کے شایان شان ہوتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ مقرر شدہ مہر پر مناسب دیر دے دیں، اس قدر کہ وہ راضی اور خوش ہو جائیں اور ان کی علیحدگی دوستی ماحول میں ہو۔

”سراح“ اصل میں ”سرح“ (بروزن شرح) ایسی بنا سے کہ معنی میں ہے جس کے پھیل اور پتے ہوں اور ”سرحت الابل“ کا معنی ہے ”میلنے اور نٹ کو چھوڑ دینا تاکہ وہ نباتات کے پتوں کو چرتا پھرے“ بعد ازاں اس لفظ کا زیادہ وسیع معنی ہو گیا یعنی ہر چیز اور ہر شخص کو ہر قسم کی رہائی دینا اور چھوڑ دینا۔ کبھی یہ لفظ طلاق دینے کیلئے کنایہ کے طور پر بھی آتا ہے۔ ”تسریح الشعر“ بالوں کو نکلی کرنے کے لیے بولا جاتا ہے کیونکہ اس میں بھی ہلکانے اور چھوڑنے کا معنی پوشیدہ ہے۔

نہر حال زیر بحث آیت میں ”سراح جمیل“ سے مراد عورتوں کو اس انداز سے طلاق دینا ہے جس میں نیکی اور جلائی ہو اور کسی قسم کا لڑائی جھگڑا نہ ہو۔

اس ضمن میں اسلامی فقہاء اور مفسرین نے تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے کہ آیت میں اس سے مراد کیا ہے کہ پیغمبر اسلام نے اپنی ازواج کو بایں رہنے اور جدا ہوجانے کے بارے میں جو اختیار دیا تھا اگر وہ جدائی اختیار کر لیتیں تو کیا تو وہی اسر طلاق شمار ہوتا اور حیض طلاق کے اجراء کی ضرورت نہ ہوتی؟ یا اسر ادبی تھی کہ وہ ان دوران استوں میں سے کسی ایک کو انتخاب کر لیں۔ اگر جدائی کو انتخاب کرتیں تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حیض طلاق جاری کرتے درن طلاق نہ ہوتی۔ اگر دیکھا جائے تو آیت ان دونوں امور میں سے کسی پر بھی دلالت نہیں کرتی اور بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ آیت ازواج پیغمبر کو گھر میں رہنے یا گھر چھوڑ کر چلے جانے کے بارے میں اختیار دے رہی ہے۔ اور یہ حکم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے خاص ہے کیونکہ باقی لوگوں پر یہ حکم لاگو نہیں ہوتا۔ لیکن ان کا یہ نظریہ صحیح نہیں ہے۔

کیونکہ اس آیت اور آیات طلاق کو جب باہم طایا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی جدائی طلاق کے ذریعہ ہوگی۔ نہر حال یہ مسئلہ شیخ اور اہل سنت فقہاء کے درمیان اختلافی ہے اگرچہ دوسرا قول یعنی طلاق کے ذریعے جدا

ہو۔ آیات کے ظاہری مفہوم کے زیادہ قریب نظر آتا ہے۔ علاوہ ازیں ”اسرحکن“ (میں تمہیں آزاد کر دوں) کی تعبیر ظاہر کرتی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں جدا کرنے پر اقدام فرماتے، خصوصاً جب کماؤہ ”تسریح“ قرآن مجید میں ایک اور جگہ بھی طلاق کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (بقرہ ۲۲۹) لہ

بعد والی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے۔ لیکن اگر تم خدا اور اس کے پیغمبر کو چاہتی ہو اور آخرت کے گھر کو، نیز مادی لحاظ سے سادہ زندگی جس میں عمر دہشتیں بھی ہیں پر تانج ہو تو خدا نے تم میں سے نیک خواتین کے لیے عظیم جزاء اور اجر تیار کر رکھا ہے! (وان کنتن ترہدن اللہ ورسولہ والدار الاخرۃ فان اللہ اعلم بالمحسنات منکن احبوا علیہا)۔

درحقیقت ان چند جملوں میں ایمان کی تمام بنیادیں اور مومن کا لائحہ عمل بیان کیا گیا ہے۔ ایک طرف تو خدا پیغمبر اور روز قیامت پر ایمان و اعتقاد کا ذکر ہے اور دوسری طرف عملی طور پر نیکو کاروں اور عینین و محسنات کی صف میں قرار پانا تو اس نثار پر صرف خدا، آخرت کے گھر اور پیغمبر کے ساتھ عشق اور لگاؤ کا اظہار کافی نہیں ہے، عمل زندگی بھی اس کے ساتھ ہم آہنگ ہونی چاہیئے۔

اس طرح خدا نے ازواج پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذمہ داریوں کو جنہیں صاحب ایمان عورتوں کے لیے اسوہ اور نمونہ ہونا چاہئے، ہمیشہ کے لیے واضح کر دیا ہے۔ یعنی زہد و پارسانی کا حامل ہونا اور دنیاوی مٹھاٹھ ہاتھ سے بے اعتنائی اور ایمان، عمل صالح اور روحانیت کی طرف خاص توجہ، اگر وہ ان صفات کی حامل ہیں تو پھر رہ جائیں اور رسول خدا کی زوجیت کے عظیم اعزاز کی حامل رہیں۔ درنہ اپنی راہ میں اور ان سے الگ ہو جائیں۔

اگرچہ اس گفتگو میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مخاطب ہیں، لیکن اپنے مضمون اور نتیجہ کے لحاظ سے سب پر محیط ہے۔ خصوصاً وہ لوگ جو مخلوق کی رہبری اور لوگوں کی پیشوائی کے مقام بلند پر فائز ہیں۔ ایسے افراد ہمیشہ دورا ہے پر ہوتے ہیں کیا تو خوشحال زندگی تک پہنچنے کے لیے اپنی ظاہری حیثیت سے فائدہ اٹھائیں یا خدا کی رضا کے حصول اور مخلوق کی ہدایت کے لیے اپنے آپ کو ہر قسم کی محدودیوں کے لیے پیش کر دیں۔

پھر بعد والی آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج کی سنگین ذمہ داریوں کو قرآن واضح جہارت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔ اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو بھی آشکارا گناہ اور فحش و غلط کام انجام دے گی، اس کا عذاب دگنا ہوگا اور یہ خدا کے لیے آسان ہے! ”یا ایہا النساء النبی من آیات منکن بغا حشۃ مبینۃ بیضا عف لھا العذاب ضعیفین وکان ذالک علی اللہ یسیراً“۔

تم وحی کے گھر اور مرکز نبوت میں زندگی بسر کر رہی ہو، اسلامی مسائل کے سلسلہ میں تمہاری معلومات پیغمبر خدا سے ہمیشہ نزدیک رہنے کی بنا پر عام لوگوں سے زیادہ ہیں، علاوہ ازیں تمہاری طرف دوسری عورتوں کی توجہ ہوتی ہے اور

لہ اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے فقہی کتب خصوصاً جواہر الکلام جلد ۲۹ صفحہ ۱۰ کی طرف رجوع فرمائیں۔

توان کا اجر بھی گناہ ہے اور اگر کسی آشکارا گناہ کا ارتکاب کریں تو ان کی سزا کی گناہ سنے گی۔ لیکن چونکہ اصل معیار تو مقام و مرتبہ اور اجتماعی حیثیت کا حامل ہوتا ہے لہذا یہ حکم ان افراد کے بارے میں بھی صادق آتا ہے جو معاشرے میں اچھی حیثیت اور مقام کے حامل ہوتے ہیں۔

اس قسم کے افراد کا تعلق صرف اپنی ذات سے نہیں ہوتا بلکہ ان کا وجود دو جہات کا حامل ہوتا ہے۔ ایک جہت تو خود انہیں کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے اور دوسری جہت معاشرے سے تعلق رکھتی ہے۔ لہذا ان کی زندگی کا فرض عمل ہو سکتا ہے کہ کسی گروہ کو ہدایت یا کسی کو گمراہ کر دے۔ اسی بنا پر ان کے اعمال بظاہر اثر رکھتے ہیں یعنی ایک تو انفرادی اثر اور دوسرا اجتماعی۔ اسی لیے ان میں سے ہر عمل جہاں گناہ یا سزا کا حامل ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں،

”یفقر للجاهل سبعون ذنبا قبل ان یفسر للعالم الذنب واحد“

”جاہل کے ستر گناہ بخشنے جائیں گے اس سے پہلے کہ عالم کا ایک گناہ بخشا جائے“۔

اس سے قطع نظر ہمیشہ علی سطح اور سزا و جزا کے درمیان قربی رابطہ رہا ہے جیسا کہ بعض احادیث میں آیا ہے:

”ان الشواب علی قدر العقل“

”اجر انسان کی عقل و آگاہی سے ملتا ہے“۔

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

”انتھایداق اللہ العباد فی الحساب لیوم القیامۃ علی قدر ما اتاھم من

العقول فی السنیۃ“

”خداوند عالم قیامت کے دن بندوں کا حساب دنیا میں انہیں دی گئی عقل کے مطابق سنے گا“۔

یہاں تک کہ ایک روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے،

”عالم کی توبہ بعض مراحل میں قبول نہیں ہوگی (پھر اسے توبہ سے آپ نے استثناء فرمایا یا ماضی التوبۃ

علی اللذین یعملون التوبۃ بجهالة (توبہ تو صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو جہالت

سے اور تارانی سے بڑا کام انجام دیتے ہیں)۔ لہذا ۱۰۰ گناہ۔

یہاں پر واضح ہوجاتا ہے کہ ممکن ہے ”مضاعف“ یا ”صورتیں“ کا مفہوم یہاں ثواب و عقاب کی

۱۔ اصول کافی جلد اول صفحہ ۱۰۰ باب لزوم الحجۃ علی العالم

۲۔ اصول کافی جلد اول صفحہ ۱۰۰ کتاب العقول والجبس

۳۔ اصول کافی جلد اول صفحہ ۱۰۰ کتاب العقول والجبس

۴۔ اصول کافی جلد اول صفحہ ۱۰۰ باب لزوم الحجۃ علی العالم

تم ان کے نزدیک نوزعمیل ہوتی ہو۔ اس بنا پر خدا کی بارگاہ میں تمہارا گناہ بھی دوسروں کی نسبت زیادہ ہوگا کیونکہ تمہاری اور عذاب معرفت اور معلومات کے مطابق ملتے ہیں، اسی طرح ماحول پر اس کا اثر ہوتا ہے تمہیں آگاہی بھی زیادہ ہے معاشرے پر اثر انداز ہونے کے لحاظ سے بھی تمہاری حیثیت بہت حساس ہے۔

ان سب چیزوں سے قطع نظر تمہارے غلط اعمال ایک طرف تو پیغمبر کو آزرده خاطر کریں گے اور دوسری طرف ان کی حیثیت کو مجروح کریں گے اور یہ بجائے خود ایک گناہ ہے جو دوسرے عذاب کا مستوجب ہوتا ہے۔

”فاحشة مبینة“ سے مراد کلمے قسم کے گناہ ہیں اور واضح ہے کہ ان گناہوں کے مفاسد جو اہم شخصیت کے سرزد ہوتے ہیں، اس وقت زیادہ ہوتے ہیں جب وہ آشکارا اور ظاہر بظاہر ہوں۔

”ضعف و مضاعف“ کے بارے میں نکات کی بحث میں گفتگو ہوگی۔

باقی رہا یہ فرمان کہ ”یہ کام خدا پر آسان ہے“ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کبھی بھی یہ گمان نہ کرنا کہ تمہیں سزا دی جائے گی کیونکہ یہ کوئی مشکل کام ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تمہارا رابطہ اس سے مانع ہوگا، جس طرح دنیا کا دستور ہے کہ وہ اپنے دوستوں اور قریب کے رشتہ داروں کے گناہوں سے چشم پوشی کر لیتے ہیں یا انہیں بہت کم اہمیت دیتے ہیں۔ تو یہاں ہرگز ایسا نہیں ہے بلکہ یہ دو ٹوک فیصلہ ہے جو تم پر ہی نافذ ہے۔

اہمیت اس کے برعکس کے بارے میں حکم ہوتا ہے: ”اور جو کوئی تم میں سے خدا اور پیغمبر کے سامنے خضوع اور اطاعت کرے اور عمل صالح بجالائے تو ہم اس کو دو گنا اجر دیں گے اور اس کے لیے ہم نے قیمتی رزق فراہم کر رکھا ہے“۔ دو من یقنت منکن نذہ و رسولہ و تعمل صالحا نؤتھا اجرھا مستتین و اعتدنا لہا رزقا کثیرا۔

”یقنت“ قنوت کے مادہ سے ہے جس میں خضوع و ادب سے ملی ہوئی اطاعت کا معنی پایا جاتا ہے۔ اور قرآن یہ لفظ استعمال کر کے انہیں یہ جتنا چاہتا ہے کہ وہ فرمان خدا و رسول کی مطیع بھی ہوں اور شرط ادب بھی مکمل طور پر ملحوظ رکھیں۔

یہاں پھر ہمیں یہ نکتہ بھی ملتا ہے کہ صرف ایمان اور اطاعت کا دعویٰ کرنا کافی نہیں ہے بلکہ ”و تعمل صالحا“ اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کے آثار عمل میں بھی ظاہر ہوں۔

”رزق کثیر“ ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو تمام روحانی اور مادی نعمات الہی کا پختہ نذر ہونے سے ہے اور اس کا مفہوم جنت اس لیے کیا گیا ہے چونکہ بہشت ان تمام نعمات کا مرکز ہے۔

گناہ اور ثواب دو گنا کیوں؟

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اوپر والی آیات اگرچہ پیغمبر کی ازدواج کے بارے میں کہتی ہیں کہ اگر وہ خدا کی اطاعت کریں

۱۔ معراج، راضی و مادہ قنوت۔

افزائش ہے۔ کبھی دو گنا اور کبھی اس سے زیادہ، بالکل ان اعداد کی طرح جن میں "کثرت" کا مفہوم ہوتا ہے۔ خصوصاً رابعیہ کتاب مفردات میں ضعف کے معنی کے بارے میں کہتے ہیں:

• ضاعفته ضمنت الیہ مشلہ فصاعداً

"میں نے اسے مضاعف کیا یعنی اس کی مانند یا بیشتر اور کئی گنا کا اس میں اضافہ کیا"

(غور کیجئے گا)

مذکورہ روایت جس میں ہم نے عالم و جاہل کے گناہ کے فرق کے بارے میں ستر تک کے برابر کا ذکر کیا ہے، اس کا پراک اور گواہ ہے۔

اصولی طور پر افراد کی اجتماعی حیثیت اور ان کا معاشرتی مرتبہ نیز معاشرے میں ان کا اسوہ اور نمونہ ان کی سزا اور جزا میں کمی بیشی کا سبب بن جاتا ہے۔

اس بحث کو ہم امام سجاد علی بن حسین علیہ السلام کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ کسی نے امام سے عرض کیا:

"انکم اهل بیت معذور لکم"

"آپ کا وہ خاندان ہے جسے خدا نے بخش دیا ہے۔"

امام غصے میں آکر فرماتے گئے:

"نحن احقری ان یجری فینا ما اجرى الله فی اذواج النبی، من ان نکون کما تقول: انا نری لمحسنتنا ضعفین من الاجر ولمسیننا ضعفین من العذاب، شرفوا لایتین"

"خداوند عالم نے جو حکم ازواجِ نبیہ کے بارے میں جاری کیا ہے، ہم اس بات کے زیادہ حق دار ہیں کہ وہ ہمارے بارے میں بھی جاری ہو، اس طرح جیسے کہ کہتا ہے۔ ہم اپنے نیکو کاروں کے لیے دوہرے اجر کے اور بدکاروں کے لیے دو گنا عذاب اور سزا کے قائل ہیں۔ پھر آپ نے شاہد کے طور پر زبردست و آیات کی تلاوت فرمائی۔ صلہ"

۳۲- یٰنِسَاءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ

اِنَّ اَتَقِیْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِیْ

فِی قَلْبِہِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوفًا ۝

۳۳- وَقَرْنَ فِی بُیُوتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ

الْأُولٰٓئِی وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاَتِیْنَ الزَّكٰوةَ وَ

اِطَعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ

عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَيُطَهِّرَکُمْ

تَطْهِیْرًا ۝

۳۴- وَاذْکُرْنَ مَا یَتْلٰی فِی بُیُوتِکُنَّ مِنْ اٰیٰتِ

اللّٰهِ وَالْحِکْمَةِ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ لَطِیْفًا

خَبِیْرًا ۝

ترجمہ

۳۲- اے نبی کی بیویو! اگر تقوا سے اپناؤ تو تم عام عورتوں کی طرح نہیں

ہو، لہذا ہوس انگیز قسم کی گفتگو نہ کیا کرو، کہیں کوئی بیمار دل

شخص تمہارے بارے میں لالچ میں نہ پڑ جائے اور صاف

سیدھی بات کیا کرو

۳۲۔ اور اپنے گھروں میں نمک کر رہو، اور پہلی جاہلیت کی طرح لوگوں کے سامنے نہ نکلا کرو، اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو خدا تو یہی چاہتا ہے کہ سب سب اور گناہ تم اہل بیت سے دُور رکھے اور تمہیں ہر طرح سے پاک و پاکیزہ رکھے۔

۳۳۔ اور جو کچھ تمہارے گھروں میں آیاتِ خدا اور حکمت و دانش کی تلاوت کی جاتی ہے، اسے یاد رکھو اور خدا لطیف وخبیر ہے۔

تفسیر

ازواجِ نبوی کو کیسا ہونا چاہیے:

گذشتہ آیات میں ازواجِ پیغمبر کی حیثیت اور عظیم ذمہ داری کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر نظر آیات میں یہ موضوع اسی طرح جاری و ساری ہے۔ ان چند آیات میں ازواجِ نبوی کو سات اہم احکام دیئے گئے ہیں۔

پہلے ایک مختصری قبید میں فرمایا گیا ہے۔ "اسے ازواجِ پیغمبر اگر تعقوی اپناؤ تو تم کسی عام عورت کی طرح نہیں بنو گیانساء النبی لستن حکا حدم النساء ان تعیتن"۔

ایک طرف رسول اللہ سے تمہاری نسبت ہے۔ دوسری طرف تم مرکزی میں موجود ہو، آیات قرآنی سنٹی ہو اور تعلیمات اسلامی کو جانتی ہو۔ اس خاص حیثیت کا حامل ہونے کے باعث تم تقویٰ اور گناہ دونوں میں تمام عورتوں کے لیے نمونہ و مثال بن سکتی ہو۔

اس بنا پر تم اپنی حیثیت کو پہچانو اور اپنی ہماری ذمہ داری کو طاق نسایں کے سپرد کرو اور جان لو اگر تم نے تقویٰ اختیار کیا تو باگ و خدادندی میں تمہارا بہت ہی مقام و مرتبہ ہوگا۔

اس مقدمے میں قرآن مناسبت کو اپنی ذمہ داریاں قبول کرنے کے لیے آمادہ کرتا ہے اور انہیں ان کے مقام یاد دلانا ہے۔ اس کے بعد پہلا حکم عفت و پاکدامنی کے سلسلے میں صاف کر رہا ہے اور خصوصیت کے ساتھ ایک باریک جھکتی

ش اشارہ کرتا ہے تاکہ اس بارے میں دوسرے مسائل خود خود واضح اور روشن ہو جائیں۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے، "اس بنا پر اس انجیز انما زسے بات دلیکا کرد کہ جس سے دل کے بیمار تمہارے بارے میں پچھانے لگیں، افلا تخضعن بالقول فیطمع السدی فی قلبہ مرض"۔

بلکہ بات کرتے وقت دو ٹوک، سپاٹ اور معمول کے مطابق گفتگو کرو۔ بہت عورتوں کی سی گفتگو نہ کرو جو خوش فہمی میں کہیں انجیز اور تحریک خیز گفتگو ہو جس کے باعث شہوت پرست افراڈ گناہ کی سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔

"السدی فی قلبہ مرض" (وہ شخص کہ جس کے دل میں بیماری ہے) کی تعبیر یہ حقیقت واضح کرتی ہے کہ نبی جذبات کا اعتدال اور شروع حد میں ہونا عین سلامتی ہے اور جب اس حد سے گزر جائے، تو پھر ایک قسم کی بیماری ہے۔ یہاں تک کہ وہ کبھی کبھار جنون کی حد کو پہنچ جاتی ہے جسے "جنسی جنون" سے تعبیر کرتے ہیں۔ دور

عاصرین ماہرین نے ان نفسیاتی بیماریوں کی اقسام کو تفصیل کے ساتھ اپنی کتابوں میں درج کیا ہے، جو اس طاقت کے متواضعی سے تجاوز اور مختلف جنسی آلودگیوں اور گنہگاروں سے ماحول میں پڑ جانے کی وجہ سے وجود میں آتی ہیں۔

آیت کے آخر میں دو سکر حکم کی یوں تشریح کی گئی ہے، تمہیں ایسی شائستہ گفتگو کرنا چاہیے جو خدا و پیغمبر اکرم دونوں کی رضا کے مطابق اور حق و عدالت سے مزین ہو، (وقلن قولا معروفا)۔

حقیقت میں "لا تخضعن بالقول" کا جملہ گفتگو کے انداز اور قلوب معروفا گفتگو کے مطالب کی طرف اشارہ ہے۔

ابستہ "قول معروف" (اچھی اور شائستہ گفتگو) کا وسیع مفہوم ہے جو مذکورہ معنی کے علاوہ ہر قسم کی باطل، بے ہودہ گناہ سے آلودہ اور حق کی مخالفت گفتگو کی نفی ہے۔

یاد رہے کہ آخری جملہ جو سکتا ہے کہ پہلے جملہ کی وضاحت ہو۔ مبادہ کوئی یہ خیال کرے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں کا طرزِ حکم غیر مردوں سے سخت یا خلاف ادب ہونا چاہیے، نہیں بلکہ ان کی گفتگو شائستہ، مودبانہ لیکن کسی تحریک آمیز پہلو کے بغیر ہونا چاہیے۔

تیسرا حکم عفت و پاکدامنی کے سلسلے میں ہے، ارشاد ہوتا ہے۔ "تم اپنے گھروں میں رہو اور پہلی جاہلیت کی طرح لوگوں کے سامنے نہ آؤ" اور اپنے بدن اور اس کی زینت کو دوسروں کے سامنے ظاہر نہ کرو (وقلن فبیوتکن و لا تبرجن الجاہلیۃ الاولیٰ)۔

"قرن" و "قار" کے مادہ سے، بوجہ کے معنی میں ہے اور گھروں میں ٹھہرنے کے لیے کہنا یہ ہے۔ بعض نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ یہ لفظ "قرار" کے مادہ سے ہے، جو نتیجے کے لحاظ سے پہلے معنی سے چنداں مختلف نہیں ہے۔

سہ ابینہ اس صورت میں جب کہ قرآن کے مادہ سے جو اس کا اصل لفظ ہے، اس کا معنی ہے کہ اس کی پہلی "دار" تحنیف کے عنوان سے مذکور ہوئی ہے اور اس کا معنی ہے کہ اس کی طرف تعلق بڑا ہے جس کی وجہ سے مزبور لفظ کی مراد نہیں رہی۔ یہ "قرن" ہو گیا ہے (مذکورہ کیجئے گا)۔

سہ ابینہ اس صورت میں جب کہ قرآن کے مادہ سے جو اس کا اصل لفظ ہے، اس کا معنی ہے کہ اس کی پہلی "دار" تحنیف کے عنوان سے مذکور ہوئی ہے اور اس کا معنی ہے کہ اس کی طرف تعلق بڑا ہے جس کی وجہ سے مزبور لفظ کی مراد نہیں رہی۔ یہ "قرن" ہو گیا ہے (مذکورہ کیجئے گا)۔

"تبرج" کا معنی ہے لوگوں کے سامنے ظاہر ہونا اور "سبرج" کے مادہ سے لیا گیا ہے اور یہ کو کہتے ہیں جو سب کی نگاہوں کے سامنے ہو۔

باقی رہا یہ کہ جاہلیتِ اولیٰ سے کیا مراد ہے؟ تو ظاہر اس سے مراد جاہلیت ہے، جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے پہلے تھی اور جیسا کہ تواریخ میں آیا ہے کہ اس زمانے میں عورتیں ٹھیک طرح پردہ نہیں کرتی تھیں دوپٹے کا ایک حصہ اپنی پشت پر اس طرح ڈال لیتی تھیں جس سے ان کا گلا، سینہ اور گردن کا ایک حصہ اور گردن دکھائی دیتے تھے۔ قرآن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازدواج کو اس قسم کے اعمال سے روکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ ایک عام حکم ہے اور آیات کا ازدواج پیغمبر کو مخاطب کرنا زیادہ تاکید کے لیے ہے اس طرح جیسے ہم کسی دانشور سے کہیں کہ آپ تو ایک عالم ہیں، جوڑٹ نہ لڑو لائیں، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسروں کے لیے جوڑٹ ہونے کی اجازت ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ ایک عالم کو زیادہ سختی کے ساتھ اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔

بہر حال یہ تفسیر نشاندہی کرتی ہے کہ کوئی دوسری جاہلیتِ عربوں کی جاہلیت کی طرح درپیش ہے کہ جس کے آثار قرآن کی پیشین گوئی کے مطابق اپنی تمدن مادی دنیا میں بھی دیکھ رہے ہیں۔ لیکن گذشتہ مفسرین کے سامنے چونکہ ایسی تفسیر لفظی لفظی تفسیر میں ہی مشقت میں پڑے تھے اور وہ آدم اور نوح کے درمیانی ناصی کو جاہلیتِ اولیٰ تفسیر کرتے تھے۔ یا پھر داؤد اور سلیمان کے عصر کے درمیانی ناصی کو جاہلیت کہتے تھے جس میں عورتیں ایسا نہیں پہن کر باہر نکلتی تھیں، جس سے بدن بھلکتا تھا، اس طرح سے وہ اسلام سے پہلے والی جاہلیت کو جاہلیتِ ثانیہ سمجھتے تھے۔

لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ان تمام باتوں کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ظاہر یہ ہے کہ "جاہلیتِ اولیٰ" وہی اسلام سے پہلے والی جاہلیت ہے کہ جس کی طرف قرآن میں کئی جگہوں پر ارشاد بھی ہوا ہے۔ (آل عمران ۱۳۳، ماہ ۵۰ اور فتح ۱۲۶) اور "جاہلیتِ ثانیہ" وہ جاہلیت ہے جو بعد میں پیدا ہوگی، جیسا کہ ہمارا ماننا ہے۔ اس موضوع کی مزید تفصیل کتاب کی بحث میں پیش کریں گے۔

آخر میں جو سختے پانچویں اور چھٹے حکم کو بیان فرمایا گیا ہے، تم (پیغمبر کی بیوی!) نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، واقمن الصلوٰۃ و اتین الزکوٰۃ و اطعن اللہ ورسولہ، اگر عبادات میں سے نماز اور زکوٰۃ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز خالق کے ساتھ اہم ترین عبادت ہے اور زکوٰۃ بھی باوجود اس کے کہ ایک عظیم عبادت ہے، مخلوق خدا کے ساتھ ایک اور اہم رابطہ بھی ہے۔

باقی رہا "اطعن اللہ ورسولہ" تو یہ ایک کلی حکم ہے اور خدا کی طرف سے مقرر کردہ تمام امور پر عمل حادی ہے۔

یہ تین احکام بھی واضح کرتے ہیں کہ زکوٰۃ اور عبادتِ احکام ازدواج نبی کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہیں بلکہ سب کے لیے ہیں۔ اگرچہ ازدواج نبی کے بارے میں زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ آیت کے آخر میں فرماتا ہے "اے اہل بیت! خدا تو بس یہ چاہتا ہے کہ نجاست اور گناہ کو تم سے دور رکھے اور تمہیں ہر طرح پاک و پاکیزہ رکھے" انما یرید اللہ لیذهب عنکم الرجس اہل البیت و یطہرکم تطہیراً۔

انصاف کی تعبیر جو عام طور پر "صبر" کے لیے ہے اس بات کی دلیل ہے کہ یہ نعمت خاندان پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مخصوص ہے۔ لفظ "سیرید" پر درکار کے ارادہ تکوینی کی طرف اشارہ ہے ورنہ ارادہ تشویشی اہل بیت پیغمبر کے ساتھ مخصوص نہیں ہوگا، بلکہ سب کی نیکی کی مستشار کے حکم شریعت کے تحت اس بات کے پابند ہوں گے کہ وہ ہر قسم کے گناہوں اور نجاستوں سے پاک ہیں۔

ہو سکتا ہے کہا جائے کہ ارادہ تکوینی تو ایک قسم کے ہجر کا موجب ہے، لیکن جب ان جنوں کی طرف توجہ کی جائے جو انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کے معصوم ہونے کے بارے میں کی جاتی ہیں تو اس بات کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور یہاں پر بطور خلاصہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ معصومین ایک طرف تو اپنے اعمال کی وجہ سے ایک قسم کی اتسالی لیاقت کے حامل ہیں اور دوسری طرف اپنے پروردگار کی طرف ذاتی اور ذہنی لیاقت رکھتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کے لیے نمونہ و امونہ بن سکیں۔

دوسرے لفظوں میں معصومین کی ہمت، تائیدات الہی اور اپنے پاک اعمال کی وجہ سے ایسی ارفع و اعلیٰ ہے کہ گناہ پر قدرت و اختیار رکھنے کے باوجود گناہ کی طرف نہیں جاتے۔ یوں سمجھئے کہ کوئی معتاد قطعاً تیار نہیں ہوگا کہ گناہ کا نگارہ اٹھا کر اپنے منہ میں رکھے اور جو دیکھ اس میں نہ کوئی حیرت نہ اکراہ، بلکہ یہ ایسی حالت ہے جو کسی قسم کے جبر و اکراہ کے بغیر خود انسان کے وجود کے اندر سے اس کے علم و آگاہی اور فطری و طبعی مبادیات کی وجہ سے آتی ہے۔

لفظ "رجس" ناپاک شئی کے معنی میں ہے خواہ وہ انسان کے مزاج اور طبیعت کے لحاظ سے ناپاک ہو یا عقل حکم کی وجہ سے یا شریعت کی رو سے یا ان سب وجوہ کے اعتبار سے۔

یہ جو بعض نے "رجس" سے گناہ، خنک، محل و حسد یا باطل عقائد وغیرہ مراد لیا ہے تو درحقیقت یہ اس کے مصداق کا بیان ہے ورنہ اس لفظ کا مفہوم عام اور وسیع ہے اور ہر قسم کی نجاست اس کے معنی میں شامل ہے، کیونکہ الف لام یہاں جنس پر دلالت کرتا ہے۔ "تطہیر" کا معنی ہے پاک کرنا اور حقیقت میں نجاستوں اور ناپاکوں کو دور کرنے کے بارے میں تاکید ہے۔ نیز اس کا مفعول مطلق کی شکل میں ہونا یا اس معنی کی ایک اور تاکید شمار ہوتا ہے۔

باقی رہی "اہل بیت" کی تعبیر تو تمام علماء اسلام اور مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ جناب پیغمبر کے اہل بیت کی طرف اشارہ ہے یہی بات خود آیت کے ظاہر سے بھی سمجھ میں آتی ہے کیونکہ "بیت" اگرچہ یہاں مطلق صورت میں ذکر ہوا ہے لیکن قبل و بعد کی آیات کے قرینے سے اس سے مراد پیغمبر اکرم کا بیت اور گھر ہے۔

لے راعب نے کتاب مفردات میں جس کے ماہی مذکورہ بالا معنی اور اس کے چاروں کے مصداق کو بیان کیا ہے۔

سے بعض نے "بیت" کو حال "بیت اللہ الحرم" اور کعبہ کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور اس کے اہل متقی افراد کو مشتمل کیا ہے۔ یہاں آیات کے سیاق سے بہت ہی غیر مناسب ہے کیونکہ یہاں گفت کو پیغمبر اکرم اور ان کے گھر کے بارے میں ہے، مذکورہ بیت اللہ الحرم کے متعلق بلکہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے اس کے لیے کوئی بھی قرینہ موجود نہیں ہے۔

باقی رہا کہ اہل بیت پیغمبر سے مراد کون لوگ ہیں تو اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض اسے انہماک کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں اور قبل و بعد کی آیات کو جو ازواج کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں اس کا قرینہ سمجھتے ہیں۔

لیکن ایک مطلب کی طرف توجہ کرنے سے اس نظر پر یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ وہ ضمیریں جو قبل و بعد کی آیات میں آئی ہیں ان کی سبب جمع مؤنث کی شکل میں ہیں جب کہ آیت کے اس حصے "انما یرسید اللہ لیبذہب عنک والرجم اهل البیت" سے مراد ہے۔

اس لیے بعض دوسرے مفسرین نے اس سے وسیع تر نظریہ اختیار کرتے ہوئے آیت میں پیغمبر اکرم کے مہارے خاندان کو شامل ہے چاہے وہ مردوں یا آپ کی بیویاں۔

دوسری طرف بہت زیادہ روایات جو اہل سنت اور شیعہ منابع و معاصرین وارد ہوئی ہیں ایک اور معنی دیتی ہیں اور پیغمبر اکرم کے مہارے خاندان کے شمول کی بھی نفی کرتی ہیں کہ اس آیت میں مناسبت صرف پانچ افراد ہیں، یعنی حضرت پیغمبر اکرم، حضرت علی، حضرت فاطمہ زہرا، حسن اور امام حسین علیہم الصلوٰۃ والسلام۔

تو اس قدر واضح و مفصل ہے کہ ہوتے ہوئے ہر آیت کے مفہوم کی تفسیر کے لیے روشنی و واضح قرینہ میں اس آیت کے لیے قابل قبول تفسیر وہی تیسرا معنی ہے یعنی آیت "خمس طیبہ" سے مختص ہے۔

یہاں ایک سوال باقی رہتا ہے اور یہ ہے کہ حضرت پیغمبر کی ازواج کی ذمہ داریوں کے ذکر کے بیچ میں یہ بات کیونکر آگئی ہے کہ میں پیغمبر اکرم کی بیویاں شامل نہیں ہیں؟

تو اس کا جواب بزرگ مفسر مرحوم طبرسی مجمع البیان میں اس طرح دیتے ہیں: یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ آیات قرآن میں ہم ایسی آیات کو ملنا کہ رہے ہیں کہ جو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہونے کے باوجود مختلف موضوعات کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔ قرآن الہی شانوں سے بھرا ہوا ہے۔ اسی طرح فصحاء و عرب کے کام و اشاروں میں بھی اس کے واضح و مفصل ہونے ملتے ہیں۔

تفسیر المیزان کے عظیم مؤلف نے اس پر ایک اور جواب کا اضافہ کیا ہے کہ جن کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے:

ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کہ "انما یرسید اللہ لیبذہب عنک والزجم"....؛ کا جملہ ان آیات کے ساتھ نازل ہوا ہے، بلکہ روایات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ علیہ نازل ہوا ہے، لیکن پیغمبر اکرم کے دور میں آیات قرآن کی جمع آمد ہی موقع پر یا اس کے بعد ان آیات کے ساتھ قرار دیا گیا ہے۔

اس سوال کا جو تیسرا جواب دیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن چاہتا ہے کہ پیغمبر اکرم کی بیویوں سے کہے کہ تمہاری نسبت ایک ایسے گھرانے سے ہوگئی ہے کہ جس کے افراد معصوم ہیں۔ تو جو کوئی غیر عصمت کے سامنے اس میں اور معصومین کے مرکز میں ہو وہ اس بات کے نیا دعویٰ ہے کہ وہ معصومین کی نسبت اپنے بارے میں زیادہ شہرہ دار ہو اور اس بات کو ذمہ لیا جائے کہ جس کی نسبت ایسے خاندان سے ہو کہ جس میں پانچ پاک معصوم ہستیاں موجود ہیں، اس کی ذمہ داریاں بہت بھاری ہیں۔ خدا اور خلق خدا اس سے بہت سی توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں۔

انشائاً نہ ہم نکات کی بحث میں ان سنی و شیعہ روایات کے بارے میں تفصیل سے بحث کریں گے جو اس آیت کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں۔

آخری زیر بحث آیت میں ازواج پیغمبر کا تعلق اور آخری حصہ بیان ہوا ہے اور ان سب کو شہرہ دار اور متنبہ کیا گیا ہے کہ بہترین موقع نہیں میرے ساتھ اس سے استفادہ کریں اور حقائق اسلام سے آگاہی حاصل کریں، چنانچہ فرمایا گیا ہے: "تمہارے گھروں میں خدائی آیات اور حکمت و علم کی تلاوت ہوتی ہے اسے یاد کرو" اور اس کے سامنے میں اپنی اصلاح کرو، کیونکہ بہترین موقع تمہارے ہاتھ میں ہے" واذکرن مہایتی فی بیوتکم من آیات اللہ والحکمۃ۔

تم وحی کے مقام اور نور قرآن کے مرکز و منبع میں موجود ہو یہاں تک کہ اگر تم گھر میں ہی بیٹھی ہو تو بھی پیغمبر اسلام کی زبان تمہارے گھر کی فضا ان آیات سے گونج رہی ہے۔ لہذا تمہیں چاہیے کہ شایان شان طریقے سے اسلامی تعلیمات اور پیغمبر کے ارشادات سے بہرہ مند ہو جبکہ رسول اللہ کا ہر سانس درس ہے اور ہر بات ایک راہ عمل متعین کرتی ہے۔

ایک سوال یہ ہے کہ "آیات اللہ" اور "حکمت" کے درمیان کیا فرق ہے؟ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ دونوں الفاظ قرآن کی طرف اشارہ ہیں۔ البتہ آیات کی تفسیر اس کے اعجاز کے پہلو کو بیان کرتی ہے اور حکمت کی تفسیر اس کے معنی اور گہرے مفہوم اور علم کو بیان کرتی ہے۔ بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ "آیات اللہ" آیات قرآن کی طرف اشارہ ہے اور "حکمت" سنت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ و پیغمبر کے اطراف کی طرف اشارہ ہے۔

اگرچہ دونوں تفسیر آیت کے مقام و الفاظ سے مناسبت رکھتی ہیں، لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے، کیونکہ تلاوت کی تفسیر آیات الہی سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کی متعدد آیات میں آیات اور حکمت دونوں کے بارے میں نزول کی تعبیر آئی ہے۔ مثلاً سورۃ بقرہ کی آیت ۲۳۱ (وما انزل علیکم من الكتاب والحکمۃ) اسی طرح سورۃ نساء کی آیت ۱۱۳ میں بھی آیا ہے۔

خلاصہ کلام کے طور پر آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: "خدا لطیف و نرم ہے" ان اللہ کان لطیفاً خبیراً۔ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ نہایت ہی گہرے اور باریک مسائل سے بھی باخبر اور آگاہ ہے اور تمہاری نیتوں کو بھی اچھی طرح سے جانتا ہے اور تمہارے سینوں کے اندرونی اسرار سے بھی باخبر ہے۔

یہاں صورت میں ہے جب "لطیف" کی تفسیر ایسی ذات سے کی جائے جو باریک بین اور ذہن دار ہے اور آگاہ اور اگر صاحب لطف مراد ہو تو یہ اس طرف اشارہ ہوگا کہ اللہ تم ازواج رسول کی نسبت لطف و رحمت رکھتا ہے اور تمہارے اعمال سے "خبیتر" اور آگاہ ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "لطیف" آیات قرآنی کے اعجاز کی بنا پر ہے اور "خبیتر" اس کے حکمت آمیز معنوں کی بنا پر ہے۔ اس کے باوجود ان معانی کا آپس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور یہ سب مطالب معنی آیت میں جمع ہو سکتے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ آیت تطہیر عصمت کی واضح دلیل ہے۔ اشارہ سمجھتے ہیں جبکہ اس حمد و ستائش کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا اطلاق (اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اس کا الف اولیٰ، جنس کے لیے ہے، ہر قسم کی ناپاکی اور گناہ کا معنی لیے لیتے ہیں کیونکہ

برگتہ تمہیں ہے اسی لیے یہ لفظ قرآن میں "شکر" اٹھل دالے مشروبات " " بجا " " فاق " " حرام و ناپاک گوشت " اور اس قسم کی وہ چیزوں کے معنی میں آیا ہے۔ (ج - ۳۰، ۱۲۵، ۹۰، توبہ - ۱۲۵، الفہم - ۱۳۵)

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ خدائی ارادہ مختلف ناپذیر ہے اور استعا یہید اللہ لیدھب عنکم الرجس کا یہ اس کے تہی ارادہ پر دلیل ہے خصوصاً "انسا" کے لفظ کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو صبر اور تاکید کے لیے ہے واضح ہوا ہے کہ خدا کا یہ قطعی ارادہ ہے کہ اہل بیت ہر قسم کے جس و نہامت اور گناہ سے پاک ہوں اور اسی چیز کا نام عصمت ہے۔

یہ محکمہ بھی قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں ارادہ الہی سے مراد طلال و حرام کے بارے میں اس کا حکم اور فرائض نہیں ہیں، کیونکہ یہ احکام توبہ کے لیے ہیں اور اہل بیت سے انحصار نہیں رکھتے۔ اس بنا پر وہ لفظ "انسا" کے معنی کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہیں۔

پس یہ سلسل اور متواتر ارادہ ایک قسم کی خدائی امداد کی طرف اشارہ ہے جو اہل بیت کی عصمت اور اس کے دوام و تسلسل کے لیے ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ارادہ و اختیار کی آزادی کے بھی متافی نہیں ہے جیسا کہ ہم تشریح کر چکے ہیں۔

حقیقت میں آیت کا مفہوم وہی ہے جو "زیارت جامعہ" میں آیا ہے۔

"عصمکم اللہ من الذل والامنکم من الفتن، و طہرکم من الدنس، واذہب عنکم الرجس، و طہرکم تطہیراً"

"خدا نے لغزشوں سے تمہاری حفاظت کی اور انحراف کج روی کے فتنے سے امان میں رکھا اور آلودگیوں سے پاک تم سے ہر قسم کی ناپاکیوں اور نجاستوں کو دور کیا اور جس طرح پاک رکھنے کا حق ہے تمہیں پاک رکھا۔"

اس وضاحت کے بعد اور دال آیت کے عصمت اہل بیت پر دلالت کرنے میں شک و تردید نہیں کرنا چاہیے۔

۲۔ آیت تطہیر کن افراد کے بارے میں ہے؟ ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ آیت اگرچہ ان آیات کے درمیان آئی ہے "جمع موش" کی ضاکر کو "جمع ندر" میں تبدیل کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا معنی ان آیات سے بالکل الگ ہے۔

اس بنا پر ان لوگوں کا نظریہ بھی درست نہیں جو آیت کو پیغمبر اکرم، حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن و حضرت حسین علیہم السلام سے مخصوص نہیں سمجھتے، اس کے لیے دیکھیں مثنیٰ کے قائل ہیں کہ آیت ان بزرگواروں کے بارے میں بھی ہے اور پیغمبر اکرم کی بیویوں کے بارے میں بھی۔

ہمارے پاس بہت سی روایات موجود ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ آیت صرف ان بزرگواروں کے ساتھ مخصوص ہے اور ازواج پیغمبر اکرم اس میں داخل نہیں ہیں اگرچہ شایان شان، احترام کے لائق ہیں۔ ہم ذیل میں ان میں سے چند روایات تلامین کی نذر کرتے ہیں۔

(اللف) کچھ روایات وہ ہیں جو خود پیغمبر اکرم کی ازواج سے نقل ہوئی ہیں اور بتاتی ہیں کہ جس وقت پیغمبر اکرم اس آیت شریفہ کے بارے میں بات کرتے تو ہم آپ سے سوال کرتیں کہ ہم بھی اس کا مخاطب ہیں تو آپ فرماتے کہ تم ابھی تو جو لیکن اس میں شامل نہیں ہو۔

ان میں سے ایک روایت نقلی نے اپنی تفسیر میں جناب "ام سلمہ" سے نقل کی ہے۔

"پیغمبر اکرم اپنے گھر میں تھے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلا لیا اور رسول اللہ نے فرمایا اپنے شوہر اور دونوں بیٹوں حسن

وسین کو بلاؤ۔ فاطمہ انہیں بھی بلا لائیں، پھر ان سب نے مل کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد رسول اللہ نے ان پر عبادت دی۔ اور کہا:

"اللہم طہروا اہل بیتی و عترتی فاذہب عنکم الرجس و طہرکم تطہیراً"

خداوند! میرے اہل بیت ہیں اور میری عترت ہیں، ان سے ہر قسم کی نجاست دور رکھو اور انہیں پاک رکھ جس طرح پاک رکھنے کا حق ہے۔

اس موقع پر آیت "انعا یہید اللہ" نازل ہوئی۔

میں نے کہا کیا میں بھی آپ کے ساتھ ہوں اسے رسول خدا؟ فرمایا انک الیٰ خیر! تو خیر اور یہی کہ ہے، لیکن ان افراد کے زمرے میں شامل نہیں ہو۔

بیر شعلی حضرت عائشہ سے یوں نقل کرتے ہیں۔

"جس وقت نبی عائشہ سے جنگ جمل کے بارے میں اور اس تباہ کن جنگ میں ان کے عمل و عمل کے سلسلہ میں سوال کیا گیا تو انہوں نے انفس کے ساتھ کہا یہ ایک تقدیر خداوندی تھی اور جب ان سے حضرت علی کے بارے میں سوال ہوا تو کہا:

"تسئلنی عن احب الناس کان الی رسول اللہ و زوج احب الناس، کان الی رسول اللہ لقد رأیت علیاً و فاطمہ و حسناً و حسیناً علیہم السلام و جمع رسول اللہ (ص) بشوب علیہم دفعاً قال اللہم طہروا اہل بیتی و عاتمتی فاذہب عنکم الرجس و طہرکم تطہیراً، قالت، فقلت یا رسول اللہ! انما من اہلک قال تنفی فانک الیٰ خیر"

"کیا مجھ سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھو کہ رسول اللہ کے نزدیک سب لوگوں سے زیادہ محبوب اور آنحضرت کے نزدیک محبوب ترین خاتون کے شوہر تھے، میں نے اپنی ان آنسوؤں سے علی، فاطمہ، حسن اور حسین کو دیکھا کہ پیغمبر اسلام نے انہیں ایک کپڑے کے نیچے مع کیا اور فرمایا: خدا تھا! یہ میرے اہل بیت اور میرے حامی و مددگار ہیں ان سے ہر قسم کے جس کو دور رکھو اور انہیں آلودگیوں سے ایسا پاک رکھو جیسا پاک رکھنے کا حق ہوتا ہے۔

میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا میں بھی آپ کے اہل بیت میں سے ہوں؟

فرمایا: پیچھے ہٹو! تم خیر پر ضرور ہو، لیکن ان میں شامل نہیں ہو سکتے۔

اس قسم کی روایات صراحت کے ساتھ بتاتی ہیں کہ اس آیت میں ازواج رسول، اہل بیت کا جزو نہیں ہیں۔

(ب) حدیث کے بارے میں بہت سی روایات اجمالی طور پر وارد ہوئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت پیغمبر اکرم نے حضرت علی، فاطمہ حسن اور حسین علیہم السلام کو بلا یا، یا وہ حضرات خود آپ کی خدمت میں آئے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے اوپر عبادت دی اور

لے جمع السیماں از برکشاہت کے ذیلی میں۔

بارگاہ الہی میں عرض کیا:

”خداوند! میرے اہل بیت میں ان سے ہر قسم کی جس واکوڑگی کو دور رکھ“

تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ ”انتھا یرید اللہ لیذہب عنک الرجس“

مشہور عالم، حاکم حکانی نیشاپوری نے ”شواہد التنزیل“ میں ان روایات کو متعدد طریقوں سے نقل کیا ہے اور مختلف راویوں سے جمع کیا ہے۔

یہاں پر یہ سوال تو جہ طلب ہے کہ آخر اہل بیت کو کس کے نیچے جمع کرنے کا مقصد کیا تھا؟

جو اب اعراض ہے کہ گویا پیغمبر جانتے تھے کہ اپنے اہل بیت کو مکمل طور پر نمایاں اور ممتاز کر دیں اور بتادیں کہ یہ آیت صرف انہی لوگوں کے واسطے ہے۔ مبادا کوئی شخص رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام گھروں اور ان تمام افراد کو جو آپ کے خاندان میں تھے، اس آیت کا مصلحت سمجھ لے۔ حتیٰ کہ بعض روایات میں آلیسے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین مرتبہ یہ جگہ دہرایا:

”اللہم هؤلاء اہل بیتی وناصرتی فاذهب عنہم الرجس واطہرہم تطہیراً“

خداوند! میرے اہل بیت ہی ہیں، ان سے ہر قسم کی نجاست کو دور رکھ۔

(ج) بہت سی دوسری روایات میں ہے کہ مندرجہ بالا آیت کے نازل ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چھ ماہ تک بیابان صحرا میں نماز کے وقت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے گھر کے پاس سے گزرتے تو پکارتے کہتے:

”الصلوٰۃ یا اہل البیت! انتھا یرید اللہ لیذہب عنک الرجس اہل البیت ویطہرکم تطہیراً“

”نماز کا وقت ہے اے اہل بیت! تمہارا چاہتا ہے کہ ہر قسم کی نجاست اور پلیدی کو تم اہل بیت سے دور رکھے اور تمہیں دلیباہی پاک رکھے، جیسے پاک رکھنے کا حق ہے۔“

اس حدیث کے حاکم حکانی نے اس بن مالک سے نقل کیا ہے۔

ایک اور روایت میں ابو سعید خدری کے واسطے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے یہ سلسلہ آٹھ یا نو ماہ تک جاری رکھا۔

مذکورہ بالا حدیث کو ابن عباس نے بھی آنحضرت سے نقل کیا ہے۔

۱۔ شواہد التنزیل جلد ۲ ص ۱۰۰

۲۔ تفسیر در مشور آیت زیر بحث کے ذیل میں۔

۳۔ شواہد التنزیل جلد ۲ ص ۱۰۰۔

۴۔ شواہد التنزیل جلد ۲ ص ۱۰۰۔

۵۔ در مشور زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

یہ بحث قابل توجہ ہے کہ اس آیت کا بخراہر، آٹھ یا نو ماہ تک مسلسل فاطمہ زہرا علیہا السلام کے گھر کے پاس اس بنا پر ہے، تاکہ یہ بات مکمل طور پر واضح ہو جائے اور آئندہ کسی شخص کے لیے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے کہ یہ آیت صرف انہی ذوات مقدسہ کے واسطے ہے یا نازل ہوئی ہے، جن کے گھر کا صدر دروازہ مسجد نبوی میں اس وقت بھی کھلتا تھا، جب آنحضرت کے حکم سے دوسروں کے دروازے بند کر دیے گئے۔ فطری بات ہے کہ بہت سے افراد ہمیشہ نماز کے وقت یہ بات دہاں پیغمبر کی زبان مبارک سے سنتے تھے۔ (غور کیجئے گا) مقام تعجب ہے کہ اس کے باوجود بعض مفسرین کا اصرار ہے کہ آیت کا منہم عام ہے اور ازواج رسول بھی اس میں شامل ہیں۔ جبکہ علماء اسلام کی اکثریت فرما دہ مشیعہ ہوں یا اہل سنت اسے بچتیں ہی میں محدود سمجھتے ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اگر یہ آیت ازواج کے لیے بھی ہوئی تو زور پیر رسول جناب عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی گفتگو کے دوران میں کسی نہ کسی مناسب موقع پر اس کا اظہار ضرور کیا ہوتا، کیونکہ روایات کے مطابق انہوں نے اپنے فضائل اور آنحضرت سے اپنے رابطے کو بیان کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی، جبکہ اس سلسلہ میں ان سے کسی قسم کی کوئی چیز روایت نہیں ہوئی۔

(۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے متعدد روایات نقل ہوئی ہیں جو صراحت کے ساتھ گواہی دیتی ہیں کہ: ”نزلت فی خمسۃ فی رسول اللہ وعلی وفاطمۃ والحسن والحسین“ لہ یعنی یہ روایت صرف انہی پانچ سنیوں کے واسطے ہی نازل ہوئی ہے۔

یہ روایات اس قدر زیادہ ہیں کہ بعض محققین انہیں متواتر جانتے ہیں۔

جو کچھ ہم نے ابھی بیان کیا ہے، اس کا مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ احادیث کے مآخذ اور راوی جو آیت کو صرف پیغمبر تک محدود سمجھتے ہیں، اس قدر زیادہ ہیں کہ اس میں شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی، یہاں تک کہ احقاق الحق کی شرح میں سترہ سے زیادہ احادیث اہل سنت کی مشہور کتابوں سے جمع کی گئی ہیں اور شیخین مآخذ میں تو ایک ہزار سے بھی زیادہ ہیں۔

کتاب ”شواہد التنزیل“ کے مؤلف نے ہر راوی اور ان اہل سنت کے مشہور علماء میں سے ہیں اس سلسلے میں ۱۳۰ احادیث نقل کی ہیں۔

ان سب امور سے قطع نظر بعض ازواج پیغمبر نے اپنی زندگی کے دوران میں ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ جو ہرگز مقام عصمت کے لائق نہیں۔ مثلاً جنگ جمل کا واقعہ، جو امام وقت کے خلاف قیام تھا اور زبردست خون ریزی کا سبب بنا، بعض توحصین کے بقول اس جنگ میں سترہ ہزار افراد مارے گئے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ واقعہ کسی بھی طرح قابل توجیہ نہیں ہے یہاں تک کہ ہم دیکھتے ہیں کہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس واقعہ کے بعد اظہار مذمت کیا کرتی تھیں، جس کا ایک نمونہ گذشتہ مباحث میں پیش کیا جا چکا ہے۔

۱۔ شواہد التنزیل جلد ۲ ص ۱۰۰۔

۲۔ استحقاق الحق جلد ۱۲ اور اس کے حواشی کی طرف رجوع کریں۔

۳۔ شواہد التنزیل جلد ۲ ص ۱۰۰ سے لے کر ص ۱۰۱ تک رجوع کریں۔

حضرت عائشہ کا اسلام کی بزرگ ترین اور بافضیلت ترین خاتون جناب خدیجہ الکبریٰ پر تنقید کرنا تاریخ اسلام کے سینے محفوظ ہے۔ یہ عیب جوئی اسلام کے گرامی قدر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس قدر ناگواری گزری کہ غضب سے آپ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور فرمایا۔

”خدا کی قسم بے اس سے بہتر جوئی نصیب نہیں ہوئی، وہ اس وقت ایمان لائی جب باقی لوگ کافر تھے اور اس وقت سارا مال میرے پروردگار دیا جب سب لوگ مجھ سے کٹے ہوئے تھے۔“

۳۔ خدا کا ارادہ تشریحی ہے یا مخفی؟ ہم نے آیت کی تفسیر کے دوران میں اس موضوع کی طرف اشارہ کیا ہے ”استعابریذ اللہ لیدھب عنکھ الرجس“ میں ارادہ سے مراد ارادہ تشریحی نہیں بلکہ ارادہ مخفی ہے۔

مزید وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ ہم ذہن نشین کریں کہ ارادہ تشریحی سے مراد خدا کے اوامر و نواہی ہیں۔ مثلاً خدا سے ارادہ، حج و عباد وغیرہ جاتا ہے اور یہی ارادہ تشریحی ہے۔

معلوم ہوا کہ ارادہ تشریحی کا پاسا سے اعمال کے ساتھ تعلق ہوتا ہے نہ کہ خدا کے افعال کے ساتھ۔ حالانکہ زیر بحث آیت میں ارادے کا تعلق خدا کے فعل کے ساتھ ہے، قرآن کہتا ہے: خدا نے ارادہ کیا ہے کہ تم اہل بیت سے ہر قسم کی نجاست اور پلیدی کو دور رکھے اس بنا پر اس قسم کا ارادہ مخفی ہونا چاہیے جو عالم تکوین میں خدا کی مشیت سے مربوط ہے۔

مزید برآں پاکیزگی اور تقویٰ کے سلسلہ میں اولاد تشریحی کا مسئلہ اہل بیت کے ساتھ مخصوص نہیں رہتا، کیونکہ خدا نے تو سب لوگوں کو حکم دے رکھا ہے کہ وہ پاک ہوں اور تقویٰ اختیار کریں اور یہ اہل بیت کے لیے کوئی اعزاز نہیں ہوگا کیونکہ تمام مکلف اسی حکم میں شامل ہیں۔

بہر حال یہ موضوع یعنی ارادہ تشریحی صرف یہ کہ ظاہر آیت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں بلکہ گزشتہ آیات کے ساتھ بھی کسی طرح مناسبت نہیں رکھتا کیونکہ وہ سب احادیث ایک اعلیٰ خصوصیت اور زبردست قدر و قیمت کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں جو جاہلیت کے ساتھ مخصوص ہے۔

یہ بھی مسلم ہے کہ جس ”میاں پر ظاہری نہایت کے معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ باطنی ناپاکیوں کی طرف اشارہ ہے اور اسے شرک و کفر اور سنی عفت اعمال و شریوں میں ممد نہیں کیا جاسکتا اور ہر قسم کے اعتقادی، اخلاقی اور عملی گناہ اور کوئی گناہ اس میں شامل ہیں۔

دوسرا نکتہ جس کی طرف غور سے توجہ کرنا چاہیے یہ ہے کہ ارادہ مخفی جو خلقت و آفرینش کے معنی میں ہے، ایسا منصف کے مفہوم میں ہے کہ علت تامہ کے معنی میں، جو موجب جبر و اکراہ اور باعث سلب اختیار ہوتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ مقام عصمت تقویٰ کی الہی کی ایک حالت ہے جو پروردگار کی مدد سے انبیاء اور ان کے پیروں میں پیدا ہوتی ہے، لیکن اس حالت کے باوجود ایسا نہیں ہے کہ وہ گناہ نہ کر سکیں بلکہ اس کا کی قدرت رکھتے ہیں لیکن اپنے ارادہ و اختیار

۱۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم المرآجات ص ۲۹ خط ۴۲ کے مطابق۔

کر ساتھ گناہ کے نزدیک نہیں جاتے۔

بالکل اس ماہر طبیب کی مانند کسی زہریلی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتا کیونکہ وہ اس کے یقینی خطرات سے آگاہ ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ اس قدرت رکھتا ہے لیکن اس کی بھیرت اور فکری درومانی تقاضے اس امر کا سبب بنتے ہیں کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار سے دست بردار ہو جائے۔

میاں اس نکتے کو یاد دلانا بھی ضروری ہے کہ یہ خدائی تقویٰ اس کی خاص دین، عطیہ اور نعمت ہے جو اس نے انبیاء و مرسلین اور ائمہ اطہار علیہم السلام کو عطا فرمایا ہے نہ کہ دوسرے لوگوں کو لیکن توجہ رہے کہ خدا نے یہ اعزاز انہیں رہبری اور قیادت کی عبادی ضرورتی نجات کے بنا پر عطا فرمایا ہے اور یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس کا فائدہ سب کو پہنچتا ہے اور یہ عین عدالت ہے البتہ اس خاص امتیاز کے مانند جو خدا نے آنحضرت کے نازک اور بہت ہی حساس پردوں کو دیا ہے، جن سے سارا بدن فائدہ اٹھاتا ہے۔

علاوہ انہی انبیاء اور ائمہ جس قدر اعزازات کے حامل ہیں اور عنایات اللہ ان کے شامل حال ہیں اسی قدر ان کی ذمہ داری بھی سخت ہوتی ہے اور ان کا ایک ترک اولیٰ امام افراد کے ایک عظیم گناہ کے برابر شمار ہوتا ہے۔ یہی امر عدالت الہی کو واضح کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ یہ ارادہ مقتضی کی صورت میں ارادہ مخفی ہے (نہ کہ علت تامہ) اور اس کے باوجود نہ تو موجب جبر ہے اور نہ ہی اعزاز کو سلب کرتا ہے۔

۴۔ بیسویں صدی کی جاہلیت: کیا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ مفسرین کی ایک جماعت ”الجاہلیۃ الاولیٰ“ کی تفسیر کے سلسلے میں زیر بحث آیات میں شک و شبہ کا شکار ہوئی ہے۔ گویا وہ

یہ یاد نہیں کر سکے کہ ظہور اسلام کے بعد جاہلیت کی کوئی اور قسم بھی دنیا میں ظہور پذیر ہوگی جس کے سامنے اسلام سے پہلے عربوں کی جاہلیت بھی شرابا نہ گئی لیکن آج کے زمانے میں یہ امر ہمارے لیے جو بیسویں صدی کی جاہلیت کے وحشت ناک مظاہر کے شاہد ہیں پورے طور پر مل شدہ ہے اور اسے قرآن مجید کی معجزانہ پیش گوئیوں میں سے ایک شمار کرنا چاہیے۔

اگر عرب جاہلیت اولیٰ کے زمانے میں جنگ اور غارتگری کا بازار گرم رکھتے تھے اور بطور مثال متعدد بار بازار عکا کا ماحول ناز و نریزی کا مرکز بنا جس میں کچھ افراد قتل ہو گئے تو ہمارے زمانے کی جاہلیت میں ایسی عالمی جنگیں رونما ہوتی ہیں کہ بسا اوقات دو کروڑ افراد ان کی کھینٹ چڑھ جاتے ہیں اور اس سے زیادہ تعداد میں لوگ مجروح اور معذور ہو جاتے ہیں۔

اگر جاہلیت عرب میں حوریتیں ”تبرج بزنیت“ کرتی تھیں اور اپنے دوپٹے کو اس انداز سے استعمال کرتیں کہ سینہ، گلا، گردن کا ہار اور گوشوارے نمایاں ہو جاتے تو ہمارے زمانے میں ایسے کلب CLUB بھی ہیں جنہیں ”برہنوں کے کلب“ کا نام دیا جاتا ہے (جن کا نمونہ انگلستان میں موجود ہے) ہم نہایت حضرت کے ساتھ عرض کریں گے کہ ایسے کلبوں میں لوگ ماہر زاد لگے بن کر جاتے ہیں مسائل سمندر کے پلازوں، سونگک، لاولو جی کہ شوارع عام پر ہونے والی اخلاق باختگی ناقابل بیان ہے۔

اگر عربوں کی جاہلیت کے وہ ”دین ننان لوتہ ذوات لہا عظام“ صندھے تلے والی بد معاش حوریتیں، جو گناہ کی دعوت کی غرض سے اپنے مکانوں پر جھڑے نصب کرتی تھیں، موجود تھیں، تو ہماری صدی کی جاہلیت میں ایسے افراد بھی موجود ہیں تو جو اس بارے میں مخصوص روزناموں میں ایسے مطالب شائع کرتے ہیں جن کے ذکر سے قہر شرا جاتا ہے اور اس کے مقابلے میں عربوں کی جاہلیت، شرافت نظر آتی ہے۔

قصہ کوتاہ ہم ان مفاسد کی کیفیت کے بارے میں کیا کہیں جو ایمان سے خالی اس ادریشنی تمدن میں پائے جاتے ہیں جن کو
بزرگناہی بہتر ہے اور ہم اس مقدس تفسیر کو اس سے آلودہ نہیں کرنا چاہتے۔
جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے ایسے لوگوں کی زندگی کی نشان دہی کرنے کے لیے مشنٹے نمونہ از عروہ و عروہ تھا جو خدا سے اپنا ناتہ توڑتے
ہیں اور ہزار ہا دانش گاہوں، علمی مراکز اور مشہور دانش مندوں کے باوجود اخلاقی فساد کی دلدل میں پھنس چکے ہیں یا جنسی فساد کی منجھار میں
پھنسے ہیں۔ حتیٰ کہ خود انہی مراکز کے دانشور بھی ایسی تباہ کاریوں کا شکار ہو چکے ہیں۔

۳۵۔ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ
وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ
وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالخٰشِعِيْنَ وَالخٰشِعٰتِ
وَالْمُتَّصِدِقِيْنَ وَالْمُتَّصِدِقٰتِ وَالصّٰبِئِمِيْنَ
وَالصّٰبِئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ
وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ
مَغْفِرَةً وَّاجْرًا عَظِيْمًا ۝

ترجمہ

۳۵۔ بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، اور صاحبِ ایمان مرد اور صاحبِ ایمان
عورتیں، فرمانِ الہی کے مطیع مرد اور مطیع عورتیں، سچے مرد اور سچی عورتیں، صابر
مرد اور صابر عورتیں، باخشوع مرد اور باخشوع عورتیں، خرچ کرنے والے مرد اور
خرچ کرنے والی عورتیں، روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں، وہ مرد جو اپنے دامن
عفت کو آلودگی سے محفوظ رکھتے ہیں اور پاک دامن عورتیں، وہ مرد جو خدا کو زیادہ یاد
کرتے ہیں اور وہ عورتیں جو زیادہ یادِ خدا میں رہتی ہیں خدا نے ان سب کے لیے مغفرت
اور اجرِ عظیم فرمایا ہے۔

شان نزول

مفسرین کی ایک جماعت کے مطابق جس وقت جعفر بن ابی طالب کی زوجہ جناب اسما بنت عمیس اپنے شوہر کے ہمراہ حبشہ واپس لوٹیں تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئیں۔ سب سے پہلے جو انہوں نے سوالات کیے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ کوئی چیز عورتوں کے بارے میں بھی قرآن مجید میں نازل ہوئی ہے؟ ازواج رسول نے فرمایا کہ "نہیں" تو فرما رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض پر داز ہوئیں کہ یا رسول اللہ! کیا عورتیں خسارے کا شکار نہیں؟ آنحضرت نے فرمایا: "وہ کیسے؟"

اسما نے عرض کیا: "قرآن مجید میں مردوں کی طرح ان کے بارے میں کوئی فضیلت نہیں آئی"

چنانچہ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی اور انہیں مطمئن کر دیا گیا کہ عورت اور مرد باہر کا رب العزت میں قرب و منزلت کے لحاظ سے یکساں حیثیت کے حامل ہیں اور ان کی فضیلت اور برتری اعتقاد، عمل اور اسلامی اخلاق کے لحاظ سے ہوتی ہے۔

تفسیر

اسلام میں عورت کا مقام

ازواج رسول کی ذمہ داریوں کے سلسلے میں گزشتہ آیات میں مذکورہ گفتگو کے بعد زیر نظر آیت میں عورتوں اور مردوں ان کی برجستہ صفات کے متعلق ایک اور مفید گفتگو ہو رہی ہے۔ ان کی دس اعتقادی، عمل اور اخلاقی صفات کو شمار کر کے ان کے عظیم اجر کو آیت کے آخر میں بیان کیا گیا ہے۔

ان دس صفات کا ایک حصہ ایمان کے مراحل کے بارے میں ہے یعنی زبان سے اقرار، قلب رُوح سے تصدیق اور عمل کے ساتھ عمل۔

اس کا دوسرا حصہ زبان و شکم اور نفسی شہوت پر کنٹرول کے بارے میں ہے کیونکہ یہ تینوں عوامل انسان کی زندگی اور اخلاق کے لیے نہایت ہی مؤثر اور فیصلہ کن نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔ ایک اور حصے میں محرومیت کی حمایت اور سخت ترین حوادث میں منتقا یعنی صبر کا ذکر ہے جو ایمان کی جڑ ہے۔ آخر میں ان صفات کو اپنانے رکھنے اور انہیں دوام بخشنے یعنی ذکر پروردگار کے متعلق گفتگو ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: "مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں (ان المسلمین والمسلمات)۔"

مومن مرد اور مومن عورتیں (المؤمنین والمؤمنات) اور وہ مرد جو محکم خدا کے مطیع اور پیروکار ہیں اور وہ عورتیں جو قرآن حق تعالیٰ کی اطاعت کرتی ہیں (والقانتات من والقانتات)۔

اگرچہ اس آیت میں بہن مفسرین نے اسلم اور ایمان کو ایک ہی چیز میں لیا ہے لیکن واضح ہے کہ آیت میں تنگدلی کی بات کی تھی کہ ان سے مراد دو الگ الگ

نیز میں اور اس چیز کی طرف اشارہ ہے جو سورہ ہجرات آیت ۱۳ میں آئی ہے:

"قالت الاعراب انا قائلتم توؤمنوا ولكن قولوا اسلمنا ولما يدخل

الايحان في قلوبكم"

"اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں آپ کہہ دیجیے کہ ابھی تم ایمان نہیں لائے بلکہ کہو کہ ہم اسلام لائے

ابھی تو ایمان تھا سے دل کی گہرائیوں میں ترای نہیں

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اسلام وہ زبانی اقرار ہے جو انسان کو مسلمانوں کی صف میں لاکھڑا کرتا ہے اور اسی پر اسلامی احکام نافذ ہوتے ہیں، لیکن ایمان، دل کے ساتھ تصدیق کرنے کا نام ہے۔

اسلامی روایات میں بھی اس فرق کی طرف اشارہ ہوا ہے

ایک روایت میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے ایک صحابی نے اسلام اور ایمان کے بارے میں آپ سے سوال کیا کہ کیا یہ دونوں آپس میں مختلف ہیں؟ تو امام نے جواب میں فرمایا:

"جی ہاں ایمان، اسلام کے ساتھ ساتھ ہے لیکن ممکن ہے کہ اسلام، ایمان کے ساتھ نہ ہو۔"

صحابی نے یہ وضاحت بھی تو امام عالی مقام علیہ السلام نے فرمایا:

"الاسلام شهادة ان لا اله الا الله والتصدق برسول الله صلى الله عليه وآله

وسلم، به حقتن الدمار، وعليه جرت المناكح والموارث، وعلى ظاهره جماعة

الناس، والايحان الهدى ما ينبت في القلوب من صفة الاسلام، وما ظهر من

العمل به

اسلام توحید کی شہادت اور رسالت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق ہے۔ جو شخص ان امور کا اقرار

کرتے، اس کی جان و حکومت اسلامی کی پناہ میں محفوظ ہوگی اور مسلمانوں کا اس سے شادی بیاہ جائز ہوگا اور وہ مسلمانوں

کی میراث لے سکتا ہے، لوگوں کا ایک گروہ اس ظاہری اسلام ہی کا مصداق ہے لیکن ایمان نور و ہدایت اور

ابھی حقیقت کا نام ہے جو دل میں جاگزیب ہوتی ہے اور ایسے اعمال سے عبارت ہے جو ایمان کے پیچھے چلے آتے ہیں۔

"قانت" کے مادہ سے ہے اور جس طرح ہم پہلے بتا چکے ہیں، یہ ایسی اطاعت کے معنی میں ہے جس میں شہوت

و شہوت بیاہا جاتا ہے۔ ایسی عبادت جو ایمان اور اعتقاد کے ساتھ سجالاتی جائے۔ یہ ایمان کے عملی پہلوؤں اور اس کے آثار کی

جانب اشارہ ہے۔

اس کے بعد سچے مومنین کی ایک اہم ترین صفت یعنی زبان کی حفاظت کرنے کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے اور سچے

مرد اور سچی عورتیں (والصادقین والعادقات)۔

لہ اصل کاں بلدا صلا باب ان الایمان یشترک الاسلام

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے ایمان کی استقامت اور درستی اس کی زبان کی استقامت پر منحصر ہے۔ چنانچہ:

"لا یستقیم ایمان امر حتى یستقیم قلبہ، ولا یستقیم قلبہ حتى یستقیم لسانہ"

"انسان کا ایمان اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک اس کا دل درست نہ ہو، جب تک اس کی زبان درست نہ ہو اس کا دل درست نہیں ہوتا۔"

چونکہ مشکلات کے مقابلے میں ایمان کی بنیاد صبر و شکیبائی ہے اور معنویت کے لحاظ سے صبر کا مقام و مرتبہ انسان کے دل میں مثل "سر" کے ہے۔ لہذا ان کی پانچویں صفت کو یوں بیان کیا گیا ہے "اور صابر و شکیبامرد اور صابر و با استقامت عورتیں (والصابرون والصابرات)۔"

ہم جانتے ہیں کہ اخلاق کے آفات اور اس کے مصائب میں سے بگڑ و زور اور سب جاہ و مال بھی ہیں جبکہ اس کا متناہی "خشوع" ہے۔ لہذا چھٹی صفت یہ بتائی گئی ہے "اور با خشوع مرد اور با خشوع عورتیں" (والخاشعون والخاشعات)۔ صحت جاہ کے علاوہ صحت مال بھی ایک عظیم آفت ہے جس کے چنگل میں پھنس جانا ایک زبردست المیہ ہوتا ہے بلکہ قید و بند سے کم نہیں ہوتا۔ اس کا متناہی "انفاق" اور عاجت مندوں کی مدد کرنا ہے۔ اس لیے ساتویں صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے "اور انفاق کرنے والے مرد اور انفاق کرنے والی عورتیں" (والمصدقین والمصدقات)۔

ہم عرض کر چکے ہیں کہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ اگر انسان ان کے شر سے محفوظ ہو جائے تو بہت سے شر اور اخلاقی آفات سے بچ جاتا ہے اور وہ ہیں زبان، شکم اور طبی خواہشات۔ پہلے حصہ میں جو طبی صفت کی طرف اشارہ ہوا ہے، لیکن دوسرے اور تیسرے حصے میں سچے مومنین کی انکھوں اور نوزوں صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے "اور وہ مرد جو روزہ رکھتے ہیں اور وہ عورتیں جو روزہ رکھتی ہیں" (والصائمین والصابرات)۔

"اور وہ مرد جو اپنے دامن کو فرش کو لگایوں سے بچاتے ہیں اور وہ عورتیں جو پاک دامن ہیں" (والحافظین فروجہم والحافظات)۔

اور آخر میں دسویں اور آخری صفت بیان کی گئی ہے کہ جس سے عام گزشتہ صفات کا دوام و الہام ہے، ارشاد ہوتا ہے "اور وہ مرد جو خدا کو زیادہ یاد کرتے ہیں اور وہ عورتیں جو خدا کو زیادہ یاد کرتی ہیں" (والذکرین اللہ کثیرا والذاکرات)۔

جی ہاں! وہ خدا کے ساتھ ہر حالت میں اور تمام مقامات پر فطرت اور بے خبری کے پردوں کو اپنے دل سے ہٹانے ہیں، امتیاطین کے دوسروں اور بے ہودہ خیالات کو دور کر دیتے ہیں۔ اور اگر ان سے کوئی لغزش سرزد ہو جاتی ہے، تو فرمایا

فرمائی کر دیتے ہیں تاکہ خدا کے بتانے ہوئے صراطِ مستقیم سے ہٹ نہ جائیں

"ذکر کثیر" سے کیا مراد ہے؟ اسلامی روایات اور مفسرین کی گفتگو میں اس کی مختلف تفسیریں بیان ہوئی ہیں جو بنیاداً اس کا مصداق شمار ہوں گی اور اس لفظ کا وسیع مفہوم ان سب پر محیط ہوگا۔

بجملہ ان کے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مبارک حدیث ہے:

"اذا یقظ الرجل اہلہ من اللیل فتوضأ وصلیٰ کتابا من الذاکرین اللہ کثیرا والذاکرات"

جب کوئی مرد اپنی بیوی کو رات کے وقت بیدار کرے اور دونوں وضو کر کے نماز (تہجد) ادا کریں تو ان دونوں شماران مردوں اور عورتوں میں ہوگا جو خدا کو زیادہ یاد کرتے ہیں۔

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

جو شخص حضرت فاطمہ الزہراء علیہا السلام کی تسبیح رات کو پڑھے تو وہ اس آیت کا مصداق ہوگا۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "ذکر کثیر" یہ ہے کہ:

"قیام و قعود کی حالت میں اور بستر پر جا کر خدا کو یاد کیا جانے"

تفسیر چوتھی ہو کر ہر حال فکر کی نشانی ہے اور فکر عمل کا مقدمہ اور تمہید ہے اور مقصد قطعاً فکر عمل سے خالی ذکر نہیں ہے۔

آیت کے آخر میں ایسے مردوں اور عورتوں کے عظیم اجر کو اس طرح بیان کیا گیا ہے "خدا نے ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم فراہم کر رکھا ہے" (اعد اللہ لہم مغفرة واحببنا عظیمنا)۔

خداوند عالم پہلے مرحلے میں ان کے گناہوں کو دھو ڈالتا ہے جو ان کی روح کی آلودگی کا موجب بنتے ہیں۔ پھر انہیں عظیم اجر عطا کرتا ہے ایسا اجر جس کی عظمت خود اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ درحقیقت ان میں سے ایک میں ناگوار حالات کی نفی کا اور دوسرے میں خوشگوار حالات کے پیدا کرنے کا پہلو موجود ہے۔

"احسبنا" کی تفسیر ویسے ہی اس کی عظمت کی دلیل ہے اور پھر اس کو "عظیم" کی صفت کے ساتھ موصوف کرنا اس عظمت کی تاکید ہے اور پھر اس عظمت کو مطلق اور بغیر کسی قید کے ذکر کرنا اس کی دست دہان کی ایک اور دلیل ہے۔ واضح رہے، جس چیز کو خداوند عظیم، با عظمت شمار کرے وہ یقیناً اتہائی عظیم ہوگی۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ "اعد" (آمادہ کر رکھا ہے، فضل ماضی کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ جو یا تو اس اجر کے قطعی اور بزرگ نہ ہونے کی طرف اشارہ ہے یا پھر اس طرف اشارہ ہے کہ بہشت اور اس کی نعمتیں وہی سے مومنین کے لیے تیار ہیں۔

خدا کی بارگاہ میں مرد اور عورت برابر ہیں

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اسلام نے منزلت کا پلڑا مردوں کے لیے ہماری قرار دیا ہے اور اسلامی کلاموں میں عورتوں کے پتلاں مقام و منزلت حاصل نہیں۔ شاید انھیں یہ غلط فہمی اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ اسلام میں بعض مقامات پر عورت اور مرد کے درمیان فرق ہے جن میں سے ہر ایک کی اپنی علیحدہ وجہ اور خاص فلسفہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے فرق سے قطع نظر کہ جن کی مخصوص معاشرتی حیثیت اور خاص طبیعتی حالت ہوتی ہے، انسانی پہلو اور روحانی مقامات کے لحاظ سے اسلام کی نظر میں مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

مذکورہ بالا آیت اس حقیقت کی واضح دلیل ہے کہ چونکہ مؤمنین کی خصوصیات اور عقائد، اخلاقی اور عمل کے اہم ترین بنیادی مسائل بیان کرتے وقت ترازو کے پلڑوں کے مانند مرد اور عورت کو ایک دوسرے کے شانہ بشانہ قرار دیا گیا ہے اور ہر دو کے لیے بغیر کسی تمویزی کی بھی تفاوت اور فرق کے یکساں اجر بیان کیا گیا ہے۔

بالفاظ دیگر مرد اور عورت کے جسمانی فرق کے مانند ان کے روحانی فرق کا انکار نہیں کیا جاسکتا اور واضح بات ہے کہ یہ فرق انسانی معاشرے کے نظام کو جاری و ساری رکھنے کے لیے ضروری ہے، جس کے نتائج عورت اور مرد کے حقوق کے بعض قوانین میں مرتب ہوتے ہیں لیکن اسلام عورت کی انسانی شخصیت کے بارے میں بعض گزشتہ عیسائی علماء کی طرح یہ سوال نہیں کرتا کہ کیا عورت واقعا انسان ہے اور کیا اس کے اندر بھی انسانی رُوح پائی جاتی ہے؟ اسلام نہ صرف اس قسم کے سوال نہیں کرتا، بلکہ انسانی رُوح کے لحاظ سے مرد اور عورت کے درمیان کسی قسم کے فرق کا بھی قائل نہیں ہے۔ اسی لیے ہم سورہ نمل کی آیت ۹۷ میں پڑھتے ہیں،

”مَنْ عَمِلْ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ اُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّاهُ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ“

”جو شخص نیک عمل کرے چاہے وہ مرد ہو یا عورت، جبکہ وہ با ایمان ہو تو ہم اس کو زندہ کریں گے اور اسے پاکیزہ زندگی بخشیں گے اور اسے اس کے بہترین عمل کا بدلہ دیں گے۔“

اسلام عورت کے لیے اسی طرح اقتصادی آزادی کا قائل ہے جس طرح مرد کے لیے، برنات گزشتہ بلکہ موجودہ زمانہ کے بہت سے قوانین کہ جن میں عورت کو کسی قسم کی اقتصادی آزادی نہیں دی گئی۔

اسی بنا پر اسلامی ”علم الرجال“ میں ہمیں ایسی صاحبان علم خاتمیں کا تذکرہ بھی ملتا ہے جو فقہاء اور اولیاء کی صف میں موجود ہیں اور جنہیں ناقابل فراموش شخصیات کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔

اگر ہم اسلام سے پہلے کی عرب تاریخ کی طرف لوٹیں اور اس معاشرے میں عورت کی کیفیت کے سلسلے میں تحقیق کریں کہ کس طرح وہ اپنے بہت سے بنیادی حقوق تک سے محروم تھی تو معلوم ہوگا کہ بعض اوقات تو وہ لوگ اس کے جینے کے حق کے قائل بھی نہیں تھے اور پیدا ہونے کے بعد اسے زندہ دنگ کر دیتے تھے۔

اسی طرح اگر موجودہ دور میں عورت کی حالت دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ تمدن کے مٹی بھر جو ٹوٹے دعوے داروں نے عورت

کو ایک بے جان کھلونا سمجھا ہوا ہے اور بس!

ہیں پر پہنچ کر ہم اس امر کی تصدیق کریں گے کہ اسلام نے عورت کی کس قدر عظیم خدمت کی ہے اور عورت کی گردن پر اس کا کس

تک حق بنتا ہے؟

۱۔ اس سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد ۹ میں سورہ لقہو کی آیت ۲۲ کے ذیل میں اور جلد ۶ میں سورہ نمل کی آیت ۹۷ کے ذیل میں بھی بحث کی گئی ہے۔

ہے۔

۳۶- وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُمِئَةٍ إِذَا قَضَىٰ اللَّهُ
وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ
أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ
ضَلَالًا مُّبِينًا ۝

۳۷- وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ
أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ وَتُخْفِي
فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ
أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ فَلَمَّا قَضَىٰ زَيْدٌ مِنْهَا وَطَرًا
زَوَّجْنَاكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ
فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ
أَمْرًا لِلَّهِ مَفْعُولًا ۝

۳۸- مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللَّهُ لَهُ
سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَكَانَ
أَمْرًا لِلَّهِ قَدَرًا مَقْدُورًا ۝

ترجمہ

۳۶- کوئی با ایمان مرد اور با ایمان عورت یہ حق نہیں رکھتے کہ خدا اور اس کا

رسول کسی امر کو لازم سمجھیں (تو وہ خدا کے فرمان کے مقابلے میں، اپنی طرف سے خود مختار
ہوں اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ واضح گمراہی میں
گمراہ ہے۔

۳۷- وہ وقت یاد کرو جب اس شخص کو جسے خدا نے نعمت دی تھی اور تم نے بھی اس پر
احسان کیا تھا، تم اس سے کہتے تھے کہ اپنی بیوی کو روکے رکھو اور خدا سے
ڈرو (اور تم اسے یہ بات بار بار کہتے تھے) اور تم اپنے دل میں ایک چیز چھپائے
ہوئے تھے کہ جسے خدا نے آشکار کرنا تھا اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ خدا
اس بات کے زیادہ لائق ہے کہ اس سے ڈرو۔ جس وقت زید اپنی بیوی
سے جدا ہوا تو ہم نے اس کی بیوی کا نکاح تم سے کر دیا تاکہ مؤمنین کے لیے اپنے
منزلوں سے بیٹوں کی بیویوں سے مطلقہ ہونے کے بعد شادی کرنے میں کوئی مشکل باقی
نہ رہے اور خدا کا فرمان تو پورا ہو کر رہتا ہے۔

۳۸- جو چیز خدا نے نبی پر فرض کی ہے، اس کے بارے میں پیغمبر پر کسی قسم کا حرم
نہیں ہے، خدا کی سنت ان لوگوں کے بارے میں بھی جاری ہے جو اس سے
پہلے تھے اور خدا کا فرمان ٹھیک ٹھیک اور حساب و کتاب کے مطابق ہے۔

شان نزول

اکثر اسلامی مؤرخین اور مفسرین کے مطابق زیر نظر آیات (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیوی زینب بنت جحش
اور آنحضرتؐ کے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔
واقعہ کربلا میں اس طرح ہے کہ زینب بنت جحش سے پہلے اور اس کے بعد جب کہ حضرت خدیجہ الکبریٰ نے پیغمبر اسلام سے شادی

کی تو حضرت خدیجہ نے زین نامی ایک غلام خریدا، جسے بعد میں آنحضرت کو مہر کر دیا۔

آپ نے اسے آزاد کر دیا۔ چونکہ اس کے قبیلے نے اسے اپنے سے جدا کر دیا تھا، لہذا رسول رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا تھا، جسے اصطلاح میں متبنی کہتے ہیں۔

ظہور اسلام کے بعد زید مخلص مسلمان ہو گیا اور اسلام کے ہر اول دستے میں شامل ہو گئے اور اسلام میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا۔ آخر میں جنگ موتہ میں ایک مرتبہ لشکر اسلام کے کمانڈر بھی مقرر ہوئے اور اسی جنگ میں کشتربت شہادت نوش کیا۔

جب سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زید کا عقد کرنا چاہا تو اپنی پھوپھی زاد، زینب بنت جحش بنت امیر بنت عبدالمطلب سے اس کے لیے خواستگاری کی، زینب نے پہلے تو یہ خیال کیا کہ آنحضرت اپنے لیے اسے انتخاب کرنا چاہتے ہیں لہذا وہ خوش ہو گئی اور رضامندی کا اظہار کر دیا، لیکن بعد میں جب اسے پتہ چلا کہ آپ کی یہ خواستگاری زید کے لیے تھی تو سخت پریشان ہوئی اور انکار کر دیا۔ اس کے بھائی عبداللہ نے بھی اس چیز کی سخت مخالفت کی۔

یہی وہ مقام تھا جس کے بارے میں زیر تبصرہ آیات میں سے پہلی آیت نازل ہوئی اور زینب اور عبداللہ جیسے افراد کو تنبیہ کی کہ جس وقت خدا اور اس کا رسول کسی کام کو ضروری سمجھیں تو وہ مخالفت نہیں کر سکتے۔

جب انھوں نے یہ بات سنی تو تسلیم نہ کر دیا۔ البتہ آگے چل کر معلوم ہوا کہ یہ شادی کوئی عام شادی نہیں تھی بلکہ یہ زنا کے باطن کی ایک غلط رسم کو توڑنے کے لیے ایک تمہید تھی کیونکہ زنا جاہلیت میں کسی باوقار اور مشورہ خاندان کی عورت کسی غلام کے ساتھ شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی تھی، چاہے وہ غلام کتنا ہی اعلیٰ قدر قیمت کا ملک کیوں نہ ہوتا۔

لیکن یہ شادی زیادہ دیر تک نہ چھوڑ سکی اور طرفین کے درمیان اخلاقی ناچاقیوں کی بدولت طلاق تک نوبت جا پہنچی۔ اگرچہ پیغمبر اسلام کا اصرار تھا کہ یہ طلاق واقع نہ ہو لیکن ہو کر رہی۔

اس کے بعد پیغمبر اکرم نے شادی میں اس ناکامی کی تلافی کے طور پر زینب کو حکم خدا کے تحت اپنے جہالہ عقد میں سے لیا اور یہ بات سب سے ختم ہو گئی۔

لیکن دوسری باتیں لوگوں کے درمیان چلی گئیں جنہیں قرآن مجید نے بعض دیر بحث آیات کے ذریعے ختم کر دیا، جن کی تفصیل انشاء اللہ آئے گی۔

تفسیر

ایک بہت بڑی رسم ٹوٹی ہے:

سب جانتے ہیں کہ اسلام کی رُوں تسلیم ہے اور وہ بھی حکم خدا کے سامنے غیر مشروط طور پر یہ معنی قرآن کی مختلف آیات اور

۱۔ تفسیر مجمع البیان تفسیر قرطبی تفسیر ابن کثیر تفسیر فی ظلال القرآن اور دوسری تفاسیر زینب بنت جحش کی تفسیر میں اس طرح سے تواتر ہے، اطلاق صحت اور کمال پر ایشیا جلد ۲ ص ۵۴۔

مبارکات سے ظاہر ہوتا ہے، بخدا ان کے مندرجہ بالا آیت ہے جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے: "کسی ایسا نذر مرد اور یا ایمان عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ جب خدا اور اس کا رسول کسی امر کو ضروری سمجھیں تو حکم خدا کے سامنے ان کا اپنا اختیار پلٹے، (وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذْ قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ)۔"

انہیں چاہیے کہ وہ اپنا ارادہ حق تعالیٰ کے ارادے کے تابع کر لیں جیسا کہ ان کا وجود سراپا اسی کے ساتھ واجب ہے۔

"قضی" یہاں پر فقہائے تشریحی "قانوں، فرمان اور فیصلہ دینے کے معنی میں ہے اور واضح سی بات ہے کہ نہ تو خدا لوگوں کی اطاعت اور تسلیم کا محتاج ہے اور نہ ہی پیغمبر اکرم کو ان سے کسی قسم کا طمع، بلکہ حقیقت میں خود ان لوگوں کا اپنا فائدہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات اپنے علم و معرفت کے محدود ہونے کی وجہ سے وہ باخبر نہیں ہوتے لیکن خدا کو جانتا ہے اور اپنے پیغمبر کو بھی جانتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح سے ایک ماہر طبیب بیمار سے کہتا ہے کہ میں اس صورت میں تمہارا علاج کر دوں گا جب تم میری ہدایت کو بسر و جہت قبول کرو گے اور اپنی طرف سے خود مختار نہیں ہو گے۔ درحقیقت یہ بات بیمار کے باسے میں طبیب کی دل شفقت اور انتہائی دل سوزی کی دلیل ہوتی ہے اور خدا تو اس قسم کے طبیب سے بدرجہ اولیٰ اور تر ہے۔

اس لیے آیت کے آخر میں اس نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، "جو شخص خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ راجح گمراہی کا شکار ہو گا۔" (وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا)

وہ راہ سعادت کھوئے گا اور بے راہ رہی اور بدعتی کا شکار ہو جائے گا۔ کیونکہ اس نے مہربان خدا اور اس کے رسول کے فرمان کی پرواہ نہیں کی جو نیر دسعادت کا ضامن ہے، اس سے بڑھ کر اور واضح گمراہی کیا ہو سکتی ہے؟

اس کے بعد زید اور اس کی بیوی زینب کی اس مشہور داستان کو بیان کیا گیا ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے متاسف مسائل میں سے ایک ہے اور ازواج رسول کے مسئلہ سے مربوط ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: "اس وقت کو یاد کرو جب اس شخص کو جسے خدا نے نعمت دے رکھی تھی اور تم نے (بھی اسے رسول!) اسے نعمت دی تھی اور تم کہتے تھے کہ اپنی بیوی کو روکے رکھو اور خدا سے ڈرو، (وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ عَلَيْهِ) اس وقت کہ آپ نے واسق اللہ)۔"

نعمت خدا سے مراد وہی ہدایت اور ایمان کی نعمت ہے جو زید بن حارثہ کو نصیب ہوئی تھی اور پیغمبر کی نعمت یہ تھی کہ آپ نے اسے آزاد کیا تھا اور اپنے بیٹے کی طرح اسے عزت بخشی تھی۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زید اور زینب کے درمیان کوئی جھگڑا ہو گیا تھا اور یہ جھگڑا اس قدر طول پکڑ گیا کہ نوبت جہائی اور طلاق تک جا پہنچی۔ اگر "تقول" کی طرف توجہ کی جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ فعل مضارع ہے اور اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ آنحضرت بارہا بلکہ ہمیشہ اسے نصیحت کرتے اور روکتے تھے۔

کیا زینب کا یہ نزاع زید کی سماجی حیثیت کی بنا پر تھا جو زینب کی معاشرتی حیثیت سے مختلف تھی؟ کیونکہ زینب کا ایک مشہور و معروف قبیلہ سے تعلق تھا اور زید آزاد شدہ تھا۔ کیا زید کی اخلاقی سمتوں کی وجہ سے تھا؟ یا ان میں سے کوئی بات بھی نہیں تھی بلکہ دونوں میں روحانی اور اخلاقی موافقت اور ہاں پہلی نہیں تھی؟ کیونکہ ممکن ہے دو افراد اچھے تو ہوں لیکن لکڑ نظر اور سلیقہ کے لحاظ سے ان میں اختلاف

ہو، جس کی بنا پر وہ اپنی ازدواجی زندگی کو آئندہ کے لیے جاری نہ رکھ سکے ہوں؟

بہر حال مسئلہ اس حد تک پیچیدہ نہیں ہے۔ اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے۔ تم اپنے دل میں ایک چیز کو چھپانے لگے تھے جسے خدا آشکار کرتا ہے اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو مالا محض خدا زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس سے ڈرو (و تخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ و تخشی الناس واللہ احق ان تخشاه)۔

مفسرین نے اس مقام پر بہت سی باتیں کہی ہیں اور بعض لوگوں کی تعبیرات میں لاپرواہی اور نا فہمی کے سبب دشمن کے ہاتھ بہانے آگئے، حالانکہ ان قرآن سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس آیت کا مفہوم زیادہ پیچیدہ نہیں ہے کیونکہ آیات کے شان نزول اور تاریخ میں یہ بات موجود ہے کہ پیغمبر کی نظر میں تھا کہ اگر ان میاں بیوی کے درمیان صلہ صفائی نہیں ہو پاتی اور نہ تطلق تک باپینچی ہے تو وہ اپنی چھوٹی زاد زینب کی اس ناکامی کی تلافی اپنے ساتھ نکاح کی صورت میں کر دی گئے، اس کے ساتھ آپ کو یہ غلط فہمی لاحق تھا کہ لوگ رد و جہہ کی بنا پر آپ پر اعتراض کریں گے اور مخالفین ایک طوفان بدتمیزی کھڑا کریں گے۔

پہلی وجہ تو یہ تھی کہ زینب آنحضرت کا منہ بولا بیٹا تھا اور زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق منہ بولے بیٹے کے بھی وہی احکام ہوتے تھے جو حقیقی بیٹے کے ہوتے ہیں۔ مجملہ ان کے یہ بھی تھا کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے بھی شادی کرنا حرام سمجھا جاتا تھا۔ دوسری یہ کہ رسول اکرم کیونکر اس بات پر تیار ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنے ایک آزاد کردہ غلام کی مطلقہ سے عقد کریں جبکہ آپ کی شان بہت بلند و بالا ہے۔

بعض اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہ ارادہ حکم خداوندی سے کیا ہوا تھا اور آیت کے بعد وائے حصے میں بھی اس بات کا قرینہ موجود ہے۔

اس بنا پر یہ مسئلہ ایک تو اخلاقی اور انسانی مسئلہ تھا اور دوسرے یہ زمانہ جاہلیت کی دو غلط رسموں کو توڑنے کا ایک نہایت ہی مؤثر ذریعہ تھا۔ یعنی منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے ازدواج۔ اور آزاد کردہ غلام کی مطلقہ سے عقد۔

مسلم ہے کہ پیغمبر کو ان مسائل میں نہ تو لوگوں سے ڈرنا چاہیے تھا اور نہ ہی نفا کے مکر ہونے اور زہریلے پروپیگنڈا سے خوف زدہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن بہر حال ایک نظری بات ہے کہ انسان اس قسم کے مواقع پر خصوصاً جہاں بیوی کے انتخاب کا مسئلہ ہو تو خوف و وحشت کا شکار ہو ہی جاتا ہے، خاص کر جب یہ احتمال ہو کہ ایک بیٹا کھڑا ہو جائے گا اور آپ کے مقدس مشن کی ترقی اور اسلام کی پیش رفت کے لیے رکاوٹ کھڑی ہو جائے گی اور یہ بات ضعیف الایمان افراد کو متزلزل کر دے گی اور ان کے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں گے۔

اس لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے۔ جس وقت زینب نے اپنی حاجت کو پورا کر لیا اور اپنی بیوی کو چھوڑ دیا تو ہم اسے تمہاری زوجیت میں لے آئے تاکہ منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے مطلقہ ہونے کے بعد مومنین کو ان سے شادی کرنے میں کوئی مشکل نہ ہو۔ فلما قضی زید منہا ووطئ زوجنا کما لکی لایکون علی المؤمنین حرج فی ازواج ادعیاء ہم اذا قضوا منہن ووطئوا۔

یہ کام ایسا تھا جسے انجام پانا چاہیے تھا اور خدا کا فرمان انہما پاکر رہتا ہے؟ (وکان امر اللہ مفعولاً)۔

ادعیاء "دعویٰ" کی مع ہے جو منہ بولے بیٹے کے معنی میں ہے، وطر "ضرورت اور اہم حاجت کے معنی میں ہے اور زینب کی طلاق اور عدائی کے بارے میں اس تفسیر کا انتخاب حقیقت میں لطف بیان کی وجہ سے ہے تاکہ "طلاق" کا لفظ جو عورتوں کے لیے بلکہ مردوں کے لیے بھی عجیب ہے، مزاحمت کے ساتھ بیان نہ ہو، گویا یہ دونوں ایک دوسرے کے احتیاج مند تھے کہ ایک مدت تک مشترکہ زندگی بسر کریں اور جب یہ احتیاج ختم ہوگئی تو ان کے درمیان عدائی واقع ہوگئی۔

"زوجنا کما" ہم اسے آپ کی زوجہ میں لے آئے، کی تفسیر اس بات کی دلیل ہے کہ ازدواج، عدائی طرف سے تھا۔ اسی لیے تاریخ میں آیا ہے کہ "زینب" رسول خدا کی دوسری بیویوں پر فخر و مباہات کرتی اور کہتی تھیں۔

"زوجکنا اهلو کنا و زوجنی اللہ من السماء" "پیغمبر سے تمہارا نکاح تو تمہارے رشتہ داروں نے کیا ہے لیکن میرا نکاح اللہ نے آنحضرت کے ساتھ آسمانوں میں کیا ہے۔ لہ

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن ہر قسم کے شک و شبہ کو دور کرنے کے لیے پوری صراحت کے ساتھ اس شادی کا اصل مقصد بیان کرتا ہے جو زمانہ جاہلیت کی ایک رسم توڑنے کے لیے تھی یعنی منہ بولے بیٹوں کی مطلقہ عورتوں سے شادی نہ کرنے کے سلسلے میں بیخود ایک کلی مسئلہ کی طرف اشارہ ہے کہ پیغمبر کا مختلف عورتوں سے شادی کرنا کوئی عام ہی بات نہیں تھی، بلکہ اس میں کوئی ایک مقاصد کا ذکر نا مقصود تھا جو آپ کے مکتب کے مستقبل میں انجام سے تعلق رکھتا تھا۔

"کان امر اللہ مفعولاً" کا جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ اس قسم کے مسائل میں دو ٹوک فیصلہ کر دینا چاہیے اور کرنے کا کام ضرور انجام پذیر ہونا چاہیے۔ ایسے مسائل میں جو کلی اور بنیادی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں، ان کے سلسلے میں دنیا کے شور شرابے اور جہال کے سامنے ہتھیار نہیں ڈال دینا چاہیے۔

مذکورہ بالا آیت کی واضح تفسیر کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے ضمن میں جو اجازات دشمن یا نادان دست لگاتے ہیں، وہ بالکل بے بنیاد ہیں اور انشاء اللہ ہم نکات کی بحث میں اس بارے میں مزید وضاحت کریں گے۔

آخری زیر بحث آیت گوشتہ مباحث کی تکمیل کے سلسلے میں یوں کہتی ہے، خدا نے جو چیزیں پیغمبر پر واجب کر دی ہیں اس کے بارے میں ان کے لیے کسی قسم کی سختی اور حرج نہیں ہے: (ماکان علی النبی من حرج فیما فرض اللہ لہ)۔

جب خداوند عالم انہیں کوئی حکم دیتا ہے تو اس کے بارے میں کسی قسم کی رد و رعایت جائز نہیں ہے کسی قسم کے چون چرا کے بغیر اس پر عمل درآمد ہونا چاہیے۔

آسمانی رسموں کو خدائی احکام کے اجراء میں اور دھڑ دھڑ کی باتوں پر بھی کان نہیں دھرنا چاہیے، غلط سیاسی نفا یا غلط قسم کے آداب و رسوم کو جو ماحول پر چھائے ہوئے ہیں، نہ نظر نہیں رکھنا چاہیے۔

لہ کامل ایضاً علیہ مسئلہ قابل توجہ رہے کہ پیغمبر اکرم کی زینب سے شادی باپنجوی بیوی ہی ہوئی (حوالہ مذکورہ)۔

کیونکہ بعض اوقات اس قسم کے احکام انہی غلط رسومات کو مٹانے اور غلط اور سواکن بدعتوں کا قلع قمع کرنے کے لیے ہوتے ہیں، انہوں نے لایا جنہوں لومۃ لاشعہ (اندھ ۵۲/۲) کا مصداق ہوتے ہوئے دنیا کی کسی سرزنش اور شور و غوغا خاطر میں نہ لاکر حکم انہی پر کاربند ہونا چاہیے۔

اصولی طور پر اگر ہم یہ چاہیں کہ جب تک زمان خدا کے لیے سب کی رضا اور خوشنودی حاصل کر لیں، اس وقت تک کچھ نہ کریں تو یہ بات قطعاً نامکن ہے، کیونکہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو صرف اس وقت راضی ہوتے ہیں جب ہم ان کی تمام خواہشات کے سامنے سر تسلیم خم کر لیں یا ان کے مکتب کے پیروکار ہو جائیں، جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔

”ولن ترضی عنہم الا الیہود ولا النصارى حتی تتبع ملتہم۔“

”یہود و نصاریٰ ہرگز تجھ سے راضی نہیں ہوں گے، جب تک تو ان کے دین کی غیر مشروط پیروی نہ کرے۔“

(البقرہ ۱۲۰/۶)

زیر بحث آیت کے بارے میں بھی معاملہ کچھ اسی طرح کا تھا، کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زینب سے شادی کر لینے پر اس ماحول کے عام لوگوں کی نظر میں وہ داخل نہیں تھے ایک تو مذکورہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے شادی جو ان کی نگاہ میں گئے بیٹے کی مطلقہ سے نکاح کرنے کے مترادف تھا اور یہ ایسی بدعت تھی، جسے ہر حالت میں توڑنا چاہیے تھا اور دوسرا ایک باوقار شخصیت یعنی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسے شخص کا ایک آزاد شدہ غلام کی مطلقہ سے شادی کرنا۔ کیونکہ یہ چیز پیغمبر کو ایک غلام کے ہم پلہ قرار دیتی تھی اس غلط خیال کو بھی ہر صورت ختم ہونا چاہیے تھا اور اس کی جگہ انسانی احترام کو لینا چاہیے تھی اور میاں بیوی کا ”کفر“ ہونا صرف ایمان اسلام اور تقویٰ کے بنیاد پر استوار ہونا چاہیے تھا، اور یہی ہو کر رہا۔

اصولی طور پر کسی رسم درواج کو توڑنے اور غیر انسانی آداب و رسوم کو ختم کرنے سے ہمیشہ ہنگامہ کھڑا ہوتا ہے۔ لہذا پیغمبروں کو کبھی ایسے ہنگاموں کی پروا نہیں کرنا چاہیے۔ اسی لیے بعد والے جہاد میں جہاد میں ذرا کیا گیا ہے: انبیاء کے بارے میں یہ خدائی سنت گذشتہ امتوں میں بھی جاری رہ چکی ہے: (سنتہ اللہ فی الذین خلصوا من قبلہ)۔

گویا اسے رسول اوصاف آپ ہی ان مشکلات میں گرفتار نہیں ہیں، بلکہ تمام انبیاء و غلط رسم و رواج کو توڑتے وقت ان مشکلات سے دوچار ہوتے رہتے۔

اس معاملہ میں سب سے بڑی مشکل صرف یہ نہیں تھی کہ ان دو غلط رسوں کو توڑا جائے، بلکہ آنحضرت کی شادی کا مسئلہ بھی میں آجانے کی وجہ سے عیب جوئی کے لیے دشمن کے ہاتھ میں ایک اور پاد بھی آتا تھا جس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

اس قسم کے بنیادی مسائل کے فیصلہ کن ہونے کو ثابت کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے:

خدا کا حکم ہمیشہ جاتا اور صحیح صحیح پروگرام کے مطابق ہوتا ہے اور اسے نافذ العمل ہونا چاہیے اور وہ کان امر اللہ قد اؤمقہ و اولہ ہو سکتا ہے کہ ”قد اؤمقہ و اولہ“ کی تعبیر زمان الہی کے متنی ہونے کی طرف اشارہ ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں حکمت اور مصلحت کو توجہ نظر رکھا گیا ہو۔ لیکن زیادہ مناسب یہی ہے کہ اس سے دونوں معانی مراد لیے جائیں یعنی زمان خدایا و کتاب پر مبنی ہے اور وہ بغیر کسی حیل و حجت کے نافذ العمل بھی ہے۔

ہر چیز میں ربات یہ کہ تاریخی کتابوں میں ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زینب سے ازواج کے سلسلے میں کھانے کی دعوت لایا عمومی بندوبست کیا، جو اس سے پہلے کسی شادی کے موقع پر دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ اس طرح سے گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ آپ کسی طرح بھی بے جوہ اور فضول رسم و رواج سے مرعوب نہیں، بلکہ اس خدائی حکم کے نفاذ پر فخر کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کی نگاہ میں یہ بھی تھا کہ اس طرح سے زناہ جاہلیت کی رسم کو توڑنے کی آواز تمام جزیرۃ العرب کے رہنے والوں کے کانوں تک پہنچ جائے۔

چند اہم نکات

۱۔ جھوٹے افسانے پیغمبر اسلام کی زینب کے ساتھ شادی کی داستان قرآن نے پوری صراحت کے ساتھ بیان کر دی اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اس کا ہدف منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے شادی کے ذریعے دور جاہلیت کی ایک رسم کو توڑنا تھا، اس کے باوجود دشمنان اسلام نے اسے غلط رنگ نہ کر کے ایک عقیدہ داستان میں تبدیل کر دیا۔ اس طرح سے انہوں نے پیغمبر اکرم کی ذات والا صفات کو اکودہ کرنے کی ناپاک جسارت کی ہے اور اس بارے میں مشکوک اور جعلی احادیث کا سہارا لیا ہے۔ ان داستانوں میں ایک یہ بھی ہے کہ جس وقت رسول اکرم زید کی احوال پرسی کے لیے اس کے گھر گئے اور جو بی بی آپ نے دروازہ کھولا تو آپ کی نظر زینب کے حسن جمال پر جا پڑی تو آپ نے فرمایا:

” سبحان اللہ خالق السموات والارض اللہ احسن الخالقین “

” منزه ہے وہ خدا جو نور کا خالق ہے اور جاوید و برکت ہے وہ اللہ جو احسن الخالقین ہے “

ان لوگوں نے اس جملے کو زینب کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لگاؤ کی دلیل قرار دیا ہے، حالانکہ عصمت و نبوت کے مسئلے سے قطع نظر بھی اس قسم کے افسانوں کی مخنثیہ کے واضح شواہد ہمارے پاس موجود ہیں:

پہلا یہ کہ حضرت زینبؓ، رسول پاکؐ کی چھوٹی بیٹی تھیں اور خاندانی ماحول میں تقریباً آپ کے سامنے بڑھی پٹی تھیں اور آپ ہی نے یہ کے لیے ان کی خواستگاری کی تھی۔ اگر نہ بیٹہ ہر سے زیادہ حسین تھیں اور بالفرض اس کے حسن و جمال نے پیغمبر اکرم کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیا تھا تو ذرا تو اس کا حسن و جمال ڈھکا چھپا تھا اور نہ ہی اس ماجرے سے پہلے ان کے ساتھ آنحضرت کا عقیدہ کوئی مشکل امر تھا۔ بلکہ اگر دیکھا جائے تو زینب کو زید کے ساتھ شادی کرنے سے دلچسپی نہ تھی، بلکہ اس بارے میں انہوں نے اپنی مخالفت کا اظہار صراحت کے ساتھ بھی کر دیا تھا اور وہ اس بات کو کمالاً ترجیح دیتی تھیں کہ زید کی بجائے رسول اللہ کی بیوی بنیں، کیونکہ جیسا کہ حضرت زید کے لیے زینب سے خواستگاری کرنے آئے تو وہ نہایت خوش ہو گئیں، کیونکہ وہ یہ سمجھ رہی تھیں کہ آپ ان سے اپنے

لہ عظیم مفسر طبری مروجہ مع البیان میں اس طرح نقل کرتے ہیں کہ:

” فتزوجوا رسول اللہ وما اولد علی امرؤۃ من نسائہ ما اولد علیہا، ذبح شاة و اطعم الناس الخبز و اللحم، حتی امتد النہار۔“

(مجمع البیان جلد ۳ ص ۲۱۱)

لیے خواستگاری کی غرض سے تشریف لائے ہیں، لیکن بعد میں قرآن کی آیت کے نزل اور خدا و پیغمبر کے سامنے تسلیم نہ کر سکتے ہوئے زید کے ساتھ شادی کرنے پر راضی ہو گئیں۔

تو ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے توہم کی کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ آپ کو زینب کے حالات سے باخبر تھے؟ آپ ان سے شادی کی خواہش رکھتے ہوئے بھی اقدام نہیں کر سکتے تھے؟

دوسرا یہ کہ جب زید نے اپنی بیوی زینب کو طلاق دینے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کیا تو آپ نے بار بار اسے نصیحت کی اور طلاق دینے کے لیے روکا اور یہ چیز بجا بنے خود ان افسانوں کی نفی کا ایک اور شاہد ہے۔

پھر یہ کہ خود قرآن صراحت کے ساتھ اس شادی کا مقصد بیان کرتا ہے تاکہ کسی قسم کی دوسری باتوں کی گنجائش باقی نہ رہے۔

چوتھا امر یہ ہے کہ آیت بالا میں خداوند عالم اپنے پیغمبر سے فرماتا ہے کہ زید کی مطلقہ بیوی کے ساتھ شادی کرنا جس میں کوئی خاص بات تھی جس کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے ڈرتے تھے، جبکہ انہیں صرف خدا سے ہی ڈرنا چاہیے خوف خدا کا مسئلہ واضح کرتا ہے کہ یہ شادی ایک فرض کی بجائے آزادی کے طور پر انجام پائی تھی کہ خدا کی ذات کے لیے شخصی کام کو ایک طرف رکھ دینا چاہیے تاکہ ایک خداوندی مقدس ہدف پورا ہو۔ اگرچہ اس سلسلے میں کوردل دشمنوں کی زبان کے زخم اور منافقین کی افشاں طرازی کا پیغمبر کی ذات پر لازم ہی کیوں نہ آتا ہو۔ پیغمبر اکرم نے حکم خدا کی اطاعت اور غلط رسم کو توڑنے کی یاد دہانی میں یہ ایک بہت بڑی قیمت ادا کی ہے اور اب تک کہہ رہے ہیں۔

لیکن سچے رہبروں کی زندگی میں ایسے لمحات بھی آجاتے ہیں، جن میں انہیں ایثار اور خدا کا کام کی شہادت دینا پڑتا ہے، اور وہ اس قسم کے لوگوں کے اتہامات اور الزامات کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ تاکہ اس طرح سے وہ اپنے اصل مقصد تک پہنچ سکیں۔

البتہ اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب کو بالکل ہی نہ دیکھا ہوتا اور نہ ہی پہچانا ہوتا اور نہ ہی آپ کے ساتھ ازدواج کے بائے میں رغبت کا اظہار نہ کیا ہوتا اور نہ ہی انہیں طلاق دینے پر تیار نہ ہوتے (نبوت و عصمت کے مسئلہ سے ہٹ کر) پھر تو اس قسم کی گفتگو اور ان توہمات کی گنجائش ہوتی، لیکن پیغمبر کی توجہ دیکھی دکھائی تھی لہذا ان تمام امکانات کی نفی کے ساتھ ان افسانوں کا جعل اور ان گھرت ہونا واضح ہو جاتا ہے۔

علاوہ ازیں نبی اکرم کی زندگی کا کوئی لمحہ یہ نہیں بتاتا کہ آپ کو زینب سے کوئی خاص لگاؤ اور رغبت ہو، بلکہ دوسری بیویوں کی طرح اور شاید ان میں سے بعض دوسری بیویوں کی نسبت ان سے کم رغبت رکھتے تھے اور ان افسانوں کی نفی پر یہ ایک اور دلیل ہے۔ آخری بات جس کی طرف ہم میاں پر اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں یہ ہے کہ ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ اس غلط رسم کو مٹانا تو ضروری تھا، لیکن اس کی کیا ضرورت تھی کہ خود آنحضرت ہی اس کے لیے عملی اقدام اٹھائیں۔ آپ یہ بھی کر سکتے تھے کہ اس مسئلے کو قاتل کی صورت میں بیان کر دیتے اور دوسروں کو اپنے منہ بولے بیٹوں کی مطلقہ بیویوں سے شادی کرنے کی ترغیب دلاتے۔

لیکن توجہ رکھنا چاہیے کہ بعض اوقات ایک جاہلانہ اور غلط رسم کا خاتمہ خاص کر شادی بیاہ کے سلسلے میں اور وہ بھی ایسے افراد سے جو دنیا کی نگاہوں میں کم حیثیت ہوتے ہیں، صرف گفتگو سے ممکن نہیں ہوتا، بلکہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر یہ کام اچھا ہے تو

پیغمبر اسے خود کیوں نہیں انجام دیتے؟ اپنے آزاد شدہ غلام کی مطلقہ بیوی سے خود شادی کیوں نہیں کرتے؟ وغیرہ۔

اس قسم کے مواقع پر ایک عملی نمونہ اس طرح کے تمام اعتراضات کو ختم کرتا ہے، فیصلہ کن انداز میں وہ غلط رسم ٹوٹ جاتی ہے قطع نظر اس کے کہ یہ عمل بذات خود ایک قسم کی خدا کا ہی اور ایثار بھی تھا۔

۲۔ حق کے سامنے جھک جانا ہی عین اسلام ہے؛ اس میں شک نہیں کہ انسان کا فکری اور روحانی استقلال اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ غیر مشروط طور پر ہر کسی کے سامنے تسلیم فرم کر دے، کیونکہ وہ بھی اس کی طرح کا انسان ہے اور ہو سکتا ہے کہ کئی مسائل میں وہ جس کے سامنے جھکنا چاہتا ہے، غلطی میں مبتلا ہو۔

لیکن جب مسئلے کا سلسلہ عالم اور حکیم خدا اور اس کے پیغمبر تک جا پہنچتا ہو، جو خدا کے حکم کے ساتھ بولتا اور اس کے حکم کے مطابق خدا اٹھاتا ہو تو اب مکمل طور پر تسلیم فرم کرنا گمراہی کی دلیل ہوگا، کیونکہ اس کا حکم اور زمان ہر قسم کے شائبہ تک سے پاک ہوتا ہے۔ نیز اس سے قطع نظر کہ اس کا زمان خود انسان ہی کے مفاد میں ہوتا ہے اور خدا کی پاک ذات کو کوئی چیز بھی فائدہ نہیں پہنچاتی۔ تو کیا پھر بھی ممکن ہے کہ کوئی عقلمند انسان اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد اپنے مفادات اور مصالح کو پامال کر دے؟

ان سب باتوں سے ہٹ کر، ہم اس کی ملکیت میں اور ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے، اس کا دیا ہوا ہے اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے علاوہ ہم اور کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ اس لیے قرآن مجید میں بہت سی ایسی آیات دکھائی دیتی ہیں جو اس مسئلے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

کوئی آیت کہتی ہے:

” اسنان قول المؤمنین اذا دعوا الى الله ورسوله ليحكم بينهم ان يقولوا سمعنا واطعنا واولئك هم المفلحون۔ (نور۔ ۵۱)

” انبیاء کے حقیقی پیروکار وہی لوگ ہیں جو خدا اور اس کے رسول کا حکم سن کر کہتے ہیں، ہم نے سنا اور اطاعت کی۔“

” فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا في انفسهم حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما“

(نساء/ ۶۵)

” تمہارے پروردگار کی قسم وہ ایمان کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے، جب تک کہ تمہارے اپنے اختلافات میں حاکم اور فیصلہ کرنے والا تسلیم نہ کریں۔ اور پھر تیرے کیے ہوئے فیصلے سے ذرہ برابر بھی ناراضی کا اظہار نہ کریں اور مکمل طور پر تسلیم فرم لیں۔“

کبھی قرآن کہتا ہے:

” ومن احسن ديناً لمن اسلم وجهه لله وهو محسن“ (نساء/ ۱۲۵)

”کس شخص کا دین اس شخص سے بہتر ہے جو اپنے پورے وجود کے ساتھ پروردگار کے سامنے جھک گیا، جبکہ وہ نیکو کار بھی ہے۔“

اصولی طور پر اسلام تسلیم کے مادہ سے لیا گیا ہے اور وہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے۔ اس بنا پر ہر شخص جو حق کے سامنے تسلیم خم کرتا ہے اسی قدر شرح اسلام سے بہرہ مند ہے۔ اس سلسلے میں لوگوں کی کئی قسمیں ہیں:

ایک گروہ صرف ان امور میں ذریعہ حق تعالیٰ کے سامنے جھکتا ہے، جن میں اس کا اپنا مفاد ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ لوگ مشرک ہوتے ہیں جنہوں نے اپنا نام ”مسلم“ رکھا ہوا ہوتا ہے۔ ان کا کام ”خومن ببعض و نکفر ببعض“ کے مصداق احکام الہی کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر وہ ایمان بھی لاتے ہیں تو حقیقت میں اپنے مفاد کے لیے ایمان لاتے ہیں کہ حکم خدا پر۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے، جن کا ارادہ اور خواہش خدا کے ارادے اور خواہش کے تابع ہوتی ہے۔ جس وقت ان کے مفادات ذریعہ حق سے متصادم دکھائی دیتے ہیں تو وہ اپنے مفادات سے دستکش ہو کر ذریعہ خدا کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ یہی سچے مؤمن اور سچے مسلمان ہوتے ہیں۔

تیسرا گروہ مذکورہ دونوں گروہوں سے برتر اور افضل ہوتا ہے، یہ لوگ اصولی طور پر وہی کچھ چاہتے ہیں جو خدا چاہتا ہے اور وہی ارادہ کرتے ہیں جو خدا کرتا ہے۔ یہی ان کی تمنا اور منتہا ہے مقصود ہوتا ہے، وہ اس مقام پر پہنچ چکے ہوتے ہیں کہ صرف اسی چیز کو پسند کرتے ہیں جسے خدا پسند کرتا ہے اور اس چیز سے نفرت کرتے ہیں، جس سے خدا نفرت کرتا ہے۔

یہی لوگ اس کی باگاہ کے خواص، مخلصین اور مقربین ہوتے ہیں۔ جن کا سلسلے کا سارا وجود رنگ تو حید میں رنگا ہوتا ہے، اس کی محبت میں غرق اور اس کے جمال میں محو ہوتا ہے۔ سہ

۱۔ اس سلسلے میں ایک اور بحث بھی جلد ۲ میں سورہ نسا کی آیت ۶۵ کے ذیل میں ہو چکی ہے۔

۳۹- الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ۝

ترجمہ

۳۹- (گذشتہ پیغمبر کہ) جو خدائی پیغامات کی تبلیغ کرتے تھے اور (صرف) اسی سے ڈرتے تھے اور خدا کے علاوہ کسی سے خوف نہیں کھاتے تھے اور یہی کافی ہے کہ خدا حساب لینے والا اور ان کے اعمال کا اجر دینے والا ہے۔

تفسیر

سچے مبلغ کون ہیں؟

پہلی زیر بحث آیت میں اس گفتگو کی مناسبت سے جو گذشتہ آیات میں سے آخری آیت میں پیغمبروں کے بارے میں گزری تھی، انبیاء کے عمومی فرائض میں سے ایک اہم ترین فرائض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ وہ (گذشتہ انبیاء) ایسے لوگ تھے جو خدائی پیغامات کی تبلیغ کرتے تھے اور اس سے ڈرتے تھے اور خدا کے علاوہ کسی سے خوف نہیں کھاتے تھے!

(الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ)۔

اُسے کو بھی پروردگار کے پیغاموں کی تبلیغ کے سلسلے میں کسی سے فرہ بھر بھی نہیں گھبراتا چاہیے، خدا اُسے کو حکم دیتا ہے، کہ ایک جاہلانہ رسم کو منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے شادی کر کے توڑیں اور زید کی مطلقہ بیوی زینب کے ساتھ شادی کر لیں اور اس فرض کی ادائیگی میں کسی قسم کی پریشانی اور گھبراہٹ کا اظہار نہ کریں، کیونکہ نہ گھبراتا پیغمبروں کی سنت ہے۔

اصولی طور پر پیغمبروں کا کام بہت سے مراحل میں اس قسم کی رسومات کو توڑنا ہے۔ اگر وہ تھوڑے سے بھی خوف اور وحشت کا نشانہ کریں گے تو یقیناً اپنے فرائض کی بجا آوری میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ انہیں فیصلہ کن انداز میں آگے بڑھنا چاہیے اور بد زبان لوگوں کی نازیبا باتوں کو برداشت کرنا چاہیے، لوگوں کی افواہوں اور شور و غوغا کرنے والے کینہ فطرت اور مفسد لوگوں کی سازشوں کی پردہ کیے بغیر اپنے منصوبوں کو پائے تکمیل تک پہنچانا چاہیے۔ سب حساب و کتاب خدا کے پاس ہے۔ اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا

تے نہیں ڈرتے جبکہ گذشتہ آیات میں ہے کہ تم اپنے دل میں ایسی چیز چھپائے ہوئے تھے جسے خدا نے آشکارا کر دیا تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ تمہیں خدا سے ڈونا چاہیے ”وختشوا الناس واللہ احق ان تخشوا“ لیکن درحکات کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔

پہلا یہ کہ اگر جناب پیغمبر کو کسی قسم کا خوف تھا تو وہ صرف اس بنا پر کہ خدا اس رسم کو توڑنا بہت سے لوگوں کے لیے ناقابل برداشت اور جس کی وجہ سے وہ اپنے نیکان میں بیانی اسلام کے بارے میں متزلزل ہو جائیں۔ درحقیقت اس قسم کی خشیت کی بازگشت خوف خدا کی طرف ہوتی ہے۔

دوسرا یہ کہ انبیاء کرام خدا کی پیغام کی تبلیغ میں ہرگز خوف اور وحشت کا شکار نہیں ہوتے لیکن اپنے ذاتی اور مخصوص مسائل میں ایسے خطرناک حالات سے دوچار ہونے کے وقت خوف و اضطراب کے اظہار میں کوئی حرج نہیں، جیسے لوگوں کی زبانوں کے زخم یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح عصا کے اڑنا یا بن جانے کے بعد اضطراب کا اظہار کیونکہ انسانی فطرت کے تقاضوں کے پیش نظر خوف اور وحشت کا اظہار اگر وجہ انفرادی نہ بنے تو کوئی عیب کی بات نہیں ہے، شجاع ترین افراد بھی اپنی زندگی میں اس قسم کی صورت حال سے بچا رہتے ہیں۔ محبوب خوف تو وہ ہوتا ہے جو اجتماعی زندگی میں خدا کی فریضہ کی انجام دہی اور ذمہ داریوں کے نبھانے کے وقت پیدا ہوتا ہے۔

۴۔ کیا انبیاء بھی تقیہ کرتے ہیں؟ کے فریضے میں تقیہ کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے ”ولا یخشون احدًا الا اللہ“

لیکن توجہ رکھنا چاہیے کہ ”تقیہ“ کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے ایک قسم کا نام ”تقیہ خوفی“ ہے جس کی مذکورہ بالا آیت میں انبیاء کی دعوت اور ابلاغ رسالت کے سلسلے میں نفعی کی گئی ہے۔ لیکن تقیہ کی کچھ اور اقسام بھی ہیں جن میں سے ایک تقیہ ”تقیہی“ اور پریشانی ہے اور تقیہ ”تقیہی“ سے مراد یہ ہے کہ انسان کبھی فریبی مخالفت کا دل جیتنے کے لیے اپنے عقیدے کو چھپاتا ہے تاکہ اسے نگرہی و نظری طور پر اپنا ہم نما بنا سکے۔

اور ”تقیہ پریشانی“ سے مراد یہ ہے کہ کبھی ہدف اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے منصوبوں اور ان کے مقدمات کو چھپایا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ عام ہو جائیں اور دشمن ان سے آگاہ ہو جائیں تو ہوسکتا ہے کہ وہ منصوبے ناکام ہو جائیں۔

انبیاء کرام خصوصاً پیغمبر اسلام کی زندگی تقیہ کی اس قسم سے بھر پوری پڑی ہے کیونکہ سب کو معلوم ہے کہ بہت سے مواقع پر جب آپ میدان جنگ کی طرف روانہ ہوتے تو اپنے مقصد کو چھپائے رکھتے، جنگ کے تمام منصوبے مکمل طور پر معروض بنائے رہتے اور استخبار کا انداز یعنی مقصد کو چھپائے رکھنا جو تقیہ کی ایک قسم ہے، تمام مراحل میں نافذ ہوتا۔

بعض اوقات کسی حکم کے بیان کرنے میں ایک مرحلہ وار روش سے بھی استفادہ کرتے جو تقیہ کی ایک قسم ہے، مثلاً ”تعمیر بآسودگی حرمت، اور ”شرب غمر“ (شراب پینے) کا مسئلہ ہے تو یہ ایک ہی مرحلہ میں بیان نہیں ہوئے، بلکہ زمانہ اہلی سے کسی مراحل میں صورت پذیر ہوئے ہیں۔ یعنی زیادہ بلکہ مرحلے سے شرح ہو کر اپنے آخری اور اصلی حکم تک جا پہنچے۔

کیا ہے یہی کافی ہے کہ خدا خود بندوں کے اعمال کا محافظ، محاسب اور ان کا جزا دینے والا ہے، اور کئی بار اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان راہ میں انبیاء کے ایثار و قربانی کے حساب کی بھی حفاظت کرتا ہے، اس کا اجر بھی دیتا ہے اور دشمن کی نازیبا گفتگو یا وہ سرواں کا محاسبہ کر کے انہیں کیفر کر دیا کرتا ہے۔

حقیقت میں ”کفی باللہ حسیباً“ کا جملہ اس امر کی دلیل ہے کہ خدا ہی رسول کو اپنے دین کی تبلیغ میں پریشانی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ان کی زمتموں، تکلیفوں اور مشقتوں کا حساب کرنے اور جزا دینے والا خود خدا ہے۔

خدا ہم نکات

۱۔ ”تبلیغ سے مراد“ اس سے مراد ابلاغ اور پہنچانا ہے اور جب تبلیغ ”رسالات اللہ“ سے ربط پیدا کرے گا تو ہم یہ ہو جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے وحی کے ذریعے سے پیغمبروں کو تعلیم دی ہے وہی وہی لوگوں کو تعلیم دین اور اسے استدلال، انذار، ایشاد اور مظلوم نصیحت کے ذریعہ لوگوں کے دلوں میں جاگزیں کریں۔

۲۔ ”خشیت کا معنی“ اس کا معنی ایسا خوف ہے جو تعظیم اور احترام کے ساتھ ہو۔ اس بنا پر اس کا خوف کا معنی الگ ہو گا جو ہمیں یہ خصوصیت۔ پائی جاتی ہو اور کہیں کجا یہ لفظ مطلق خوف کے معنی میں بھی آتا ہے۔

محقق طوسی کی بعض تاویلات میں ان دو الفاظ کے فرق کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے جو درحقیقت اس کے سرافراز منی کی غماز ہے کہ اس کے لغوی معنی کی۔ وہ کہتے ہیں ”خشیت اور خوف“ اگرچہ لغت میں ایک ہی معنی دیا تقریباً ایک معنی میں ہیں۔ لیکن صاحب دل افراد کے نزدیک ان دونوں کے درمیان فرق ہے اور وہ یہ کہ ”خوف“ اس مجازات اور مزاسے باطنی فطرت اور پریشانی کے معنی میں ہے کہ انسان گناہ کے ارتکاب یا اطاعت میں کوتاہی کی وجہ سے جس کی توقع رکھتا ہے اور یہ کیفیت اکثر لوگوں کی ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اس کے مراتب بہت مختلف ہیں اور اس کا اعلیٰ مرتبہ بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔

لیکن ”خشیت“ ایسا ایسی کیفیت ہے جو خدا کی عظمت اور اس کی بہت کے ارتکاب اور اس کے فیض کے انوار سے دھلا کر محروم رہنے کے خوف کے کسی انسان پر طاری ہوتی ہے اور یہ ایسی حالت ہے جو سوائے ان لوگوں کے جو ذات پاک کی عظمت اور اس کے مقام کبریائی سے واقف ہیں اور انہوں نے اس کے قرب کی لذت چکھی ہوئی ہو، کسی اور کو حاصل نہیں ہوتی۔ اسی لیے قرآن نے اس حالت کو عالم اور آگاہ بندوں کے ساتھ مخصوص کیا ہے اور کہا ہے:

”استعجابتہم اللہ من عبادہ العلماء“

”اللہ سے خشیت کرنے والے بس علماء ہی ہیں۔“

۳۔ ایک سوال کا جواب: ہو سکتا ہے، کہا جائے کہ یہ آیت اس گذشتہ جملے کی متناہی ہے جو گذشتہ آیات میں بیان ہو چکا ہے، کیونکہ یہاں ہے کہ خدا کے انبیاء صرف خدا ہی سے ڈرتے ہیں کسی اور

بہر حال تفسیر کا ایک بہت ہی وسیع معنی ہے یعنی مقصد کے حصول کو خطرے میں پڑنے سے بچانے کے لیے تہیہ و تدبیر چھانا اور یہ ایسی چیز ہے، جسے تمام عقلمندانے عالم نے اپنا یا بوجہ اور خدائی رہبر اپنے مقدس مشن کو کامیاب کرنے کے لیے مراحل پر اپناتے ہیں۔ جبکہ توحید کے بہرہ و حضرت ابراہیم علیہ السلام کی داستان میں ہے کہ جس دن بت پرست لوگ عید کے مراسم کی ادائیگی کے لیے شہر سے باہر جا رہے تھے تو آپ نے اپنے مقصد کو مخفی رکھا تاکہ موقع سے فائدہ اٹھا کر بتوں کو پاش پاش کر دیں نیز "مومن آل فرعون" نے ستاس مواقع پر حضرت موسیٰ کی مدد کرنے اور انھیں قتل ہونے سے بچانے کے لیے اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھا جس کی وجہ سے قرآن نے انھیں عظمت کے ساتھ یاد کیا ہے۔

بہر حال صرف "خوف والا تقیہ" ہی پیغمبروں کے لیے جائز نہیں بلکہ تقیہ کی دوسری اقسام بھی۔ اگرچہ اس سلسلے میں بہت سے سخن ہائے گفتنی ہیں لیکن امام جعفر صادق علیہ السلام کے ایک جامع زمان کے ساتھ اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

«التقیة دینی و دین الہائی، و لا دین لمن لا تقیة لہ و التقیة عس اللہ فی الارض، لان مؤمن ال فرعون لو اظہر الاسلام لقتل»

"تقیہ میرا دین ہے آباد ابداد کا دین ہے۔ جو شخص تقیہ نہیں کرتا اس کا دین نہیں ہے، تقیہ خدا کی مضبوطی کا حال ہے کیونکہ اگر فرعون اپنے ایمان کو ظاہر کرتے تو یقیناً قتل ہو جاتے (ظہور کی صورت میں دین موسیٰ کی حفاظت کے سلسلے میں پیغام حق کا فریضہ انجام نہ پاسکتا)۔"

تقیہ کے بارے میں ہم تفصیل بحث جلد نمبر ۸ میں سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۷۷ کے ذیل میں کر چکے ہیں۔

۵۔ تبلیغی امور میں کامیابی کی شرط: قاطعیت، خلوص اور خدا کے علاوہ کسی سے نہ ڈرنا ہے۔

جو لوگ خدائی امور کے مقابلہ میں سرکہ و سرک کی خواہشات اور مختلف گردہوں کے بے نیا اور جانات کو پیش نظر رکھتے ہیں اور اپنی ناشائستہ تاویلوں کے ذریعے حق و عدالت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، وہ کبھی بنیادی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے۔ کوئی نعمت ہدایت کی نعمت سے بڑھ کر نہیں ہے اور کوئی خدمت اس نعمت کو کسی انسان کو دینے سے افضل نہیں ہے۔ اسی بنا پر اس کا اجر و ثواب سب سے بڑھتا ہے۔

ہم ایک حدیث میں امیر المؤمنین سے پڑھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ:

"جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ کو طرف بھیجا تو فرمایا، جب تک کسی کو حق کی دعوت نہ دے وہ اس وقت تک جنگ نہ کرنا۔"

«وابد اللہ لمن یدعی اللہ علی یدک رجلاً خیر مما طلعت الشمس وغربت»

"یعنی خدا کی تم اگر تمہارے ہاتھوں ایک شخص کو ہدایت مل جائے تو یہ تمہارے لیے ان تمام چیزوں سے بدرجہا بہتر ہے جن پر سورج طلوع و غروب کرتا ہے۔" لہذا اس لیے ضروری ہے کہ سچے مبلغین لوگوں سے بے نیاز اور اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے دار سے بے خوف ہو کر اپنا فریضہ تبلیغ انجام دیں۔ کیونکہ "نیاز" اور "خوف" ہی ان کے انکار و ارادہ پر ہر حالت میں اثر انداز ہوں گے۔ ایک مبلغ زبانی "و کفی باللہ حسیبا" کے تقاضوں کے پیش نظر صرف یہ سوچتا ہے کہ اس کے اعمال کا حساب لینے والا اللہ خدا ہے۔ اور یہی عزمان و آگاہی اسے اس نشیب فراز والے راستے میں مدد دیتی ہے۔

۴۔ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ۗ

ترجمہ

۴۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ اللہ کے رسول اور خاتم و آخری پیغمبر ہیں۔ اور خدا ہر چیز سے آگاہ ہے۔

تفسیر

ختم نبوت:

یہ آیت اس سلسلہ کی گفتگو کی آخری کڑی ہے جو زمانہ جاہلیت کی ایک غلط رسم کو توڑنے کے لیے خدا نے زید کی مطلق بیوی سے پیغمبر اکرم کے عقد کے بارے میں بیان فرمائی ہے اور آخری جواب کے طور پر ایک مختصر لیکن چمکانا جواب دیا گیا ہے۔ منہی طور پر ایک اور اہم حقیقت کو ایک خاص مناسبت کی بنا پر ذکر کیا گیا ہے اور وہ ہے "ختم نبوت کا مسئلہ۔"

پہلے فرمایا گیا ہے "محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں" (ماکان محمد اباحد من رجالکم)۔

زید کے اور کسی اور کے ساتھ کسی دن لوگوں نے اسے محمد کے بیٹے کا نام دیا ہے تو یہ صرف ایک عادت اور دنیاوی رسم و رواج کے مطابق تھا، جسے اسلام کے آنے اور قرآن کے نازل ہوجانے کے بعد ختم کر دیا گیا ہے، یہ نظری اور قرابت داری کا رابطہ نہیں ہے، البتہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی بیٹے بھی تھے، جن کا نام "قاسم" "طیب" "طاہر" اور "ابراہیم" تھا لیکن مورخین کے مطابق "سب بالغ ہونے سے پہلے ہی دنیا سے چل بسے۔ لہذا "رجال" (مردوں) کا نام ان پر صادق نہیں آتا ہے

۱۔ تفسیر قرطبی، وتفسیر المیزان، زیر بحث یہ کے ذیل میں۔

امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کو بھی فرزند رسول کہہ کر پکارا جاتا تھا، اگرچہ وہ بالغ بھی ہو گئے تھے، لیکن اس آیت کے نزول کے وقت ابھی بچپن تھے، اسی بنا پر "ماکان محمد اباحد من رجالکم" کا جملہ منطقی باطن میں آیا ہے اور قطعی طور پر اس وقت سب کے حق میں صادق آتا ہے۔

اور اگر بعض تیسیرت میں خود پیغمبر اکرم سے منقول ہے:

"انا وعلى ابوا هذه الامة"

میں اور علی اس امت کے باپ ہیں۔

تو یقیناً اس سے مراد نبی باپ نہیں بلکہ پیر شہتہ تعلیم و تربیت اور سبیری کی بنیاد پر ہے۔

ان حالات میں زید کی مطلق بیوی سے شادی جس کا فلسفہ قرآن نے صراحت کے ساتھ غلط رسم کو توڑنا بیان فرمایا ہے، کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے موضوع بحث بنا کر کوئی اس کے خلاف لب کشائی کرے یا اسے اپنے غلط مقاصد کے لیے کوئی دستاویز بنا لے۔

آگے چل کر زید فرمایا گیا ہے کہ پیغمبر کا رابطہ تمہارے ساتھ صرف رسالت اور خاتمت کی بنا پر ہے کیونکہ "وہ خدا کے رسول اور خاتم النبیین ہیں" (ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین)۔

اسی بنا پر آیت کی ابتدا اگلی طور پر ہی رابطے کو منقطع کرتی ہے اور اس کی انتہا اس معنوی رابطے کو ثابت کرتی ہے جو رسالت اور خاتمت سے پیدا ہوتا ہے اور یہاں سے ہی آیت کے آغاز اور انتقام کا تعلق واضح ہو جاتا ہے۔ اس سے بٹ کر اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی ہے کہ آنحضرت باوجود یکہ کسی مرد کے باپ نہیں ہیں، لیکن ان کا تعلق باپ کے بیٹے کے ساتھ تعلق سے بھی زیادہ ہے، کیونکہ آپ کا تعلق ایک رسول کی حیثیت سے ہے جو امت کے ساتھ ہوتا ہے اور رسول بھی ایسا جو جاتا ہے کہ پھر کوئی پیغمبر نہیں آئے گا۔ لہذا قیامت تک کی جو ضرورتیں امت کو درپیش آسکتی ہیں، اچھی طرح سے اور انتہائی دل نوزی کے ساتھ انھیں پورا کرنا ہے۔

البتہ عالم اور آگاہ خدا سبھی وہ تمام چیزیں جو اس سلسلے میں ضروری تھیں، آپ کے اختیار میں دے دیں، خواہ وہ اصولی ہوں یا فروعی، گلی ہوں یا جنئی۔ اس لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے۔ "خدا ہر چیز سے عالم اور آگاہ تھا اور ہے" (وکان اللہ بکل شیء علیما)۔

یہ بحث بھی قابل توجہ ہے کہ "خاتم الانبیاء" کا معنی "خاتم المرسلین" بھی ہے۔ موجودہ دور کے نیا دین گھڑنے والے افراد مسئلہ ختم نبوت کو مفروضہ کرنے کے لیے یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ قرآن نے سرکار رسالت مآب کو "خاتم الانبیاء" کہا ہے "خاتم المرسلین" نہیں کہا، بالاعراض ایک بہت بڑا مناسبت ہے کیونکہ رسالت کا درجہ نبوت کے درجہ سے بالاتر ہے۔ (ذکر کیجیے گا)

ٹھیک اسی طرح جیسے ہم کہیں کو فلاں شخص سرزمین حجاز میں نہیں ہے تو یقیناً وہ کٹر میں نہیں ہوگا لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ وہ کٹر میں نہیں ہے تو ہم سکتا ہے کہ وہ حجاز کے کسی اور علاقہ میں ہو۔ اسی بنا پر اگر حضور گرامی کو "خاتم المرسلین" کا نام دیا جاتا تو تصور میں آسکتا تھا کہ شاید وہ خاتم الانبیاء نہ ہوں، لیکن جب فرمایا گیا ہے کہ وہ "خاتم الانبیاء" ہیں تو یقیناً خاتم المرسلین بھی ہیں۔ اور منطقی اصطلاح کے لحاظ سے "رسول" اور "نبی" کے درمیان "عام خاص مطلق" کی نسبت ہے۔

(ایک بار پھر غور کیجیے گا)

چند اہم نکات

۱۔ "خاتم" کیا ہے؟ "خاتم" دروزن قائم، ارباب لغت کی تصریحات کے مطابق اس چیز کے معنی میں ہے جس کے ذریعہ کسی چیز کو ختم کیا جائے یا جس سے کاغذات وغیرہ کی مہر لگائی جائے۔
 قدیم زمانے سے یہ معمول چلا آ رہا ہے کہ جس وقت کسی خط یا برتن یا گھر کے دروازہ کو بند کیا جاتا ہے تاکہ کوئی اسے کھول نہ سکے تو دروازے یا نفل لیا جائے اسے اوپر کو بند مہیا مادہ رکھ کر اس پر مہر لگادیتے ہیں، جسے موجودہ زمانے میں "لاکھ اور مہر" کہتے ہیں۔
 یہ اس صورت میں ہوتا ہے کہ اس کے کھولنے کے لیے یقیناً لاکھ اور مہر کو توڑا جائے۔ اور جو مہر اس قسم کی چیزوں پر لگائی جاتی ہے اسے "خاتم" کہتے ہیں۔ چونکہ گذشتہ زمانے میں اس مقصد کے لیے کسی بھی سخت اور سچی مٹی سے استفادہ ہوتا تھا لہذا لغت کی مشہور کتاب میں "خاتم" کے معنی میں لکھا گیا ہے کہ "مسیب و صناع علی الطینۃ" یعنی جو چیز مٹی پر لگائی جائے۔
 یہ سب کچھ اس بنا پر ہے کہ یہ لفظ "ختم" کی اصل سے "اختتام" کے معنی میں لیا گیا ہے اور چونکہ مہر لگانے کا کام خاتمے اور آخر پر قرار پاتا ہے لہذا "خاتم" کا نام اس ذریعے اور ذریعے کو دیا گیا ہے۔

اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ "خاتم" کا ایک معنی انگوٹھی ہے تو وہ بھی اسی بنا پر ہے کہ بہت سے لوگ اپنی مہر کے نقوش اپنی انگوٹھوں پر کندہ کرتے تھے اور انگوٹھی کے ذریعہ ہی خطوط وغیرہ پر مہر لگا دیتے تھے۔ اسی لیے پیغمبر اسلام ﷺ کو بھی "اور دوسری شخصیتوں کے حالات کے ضمن میں ان کی انگوٹھی کے نقش کی گفت گوئی ہوتی ہے۔ مرحوم کلینی نے کتاب "کافی" میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کیا ہے:

"ان خاتم رسول اللہ کان من فضیلة نقشہ محمد رسول اللہ"

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انگوٹھی چاندی کی تھی جس کا نقش "محمد رسول اللہ" تھا۔"

بعض تاریخوں میں آیا ہے کہ چھٹی ہجری کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے لیے نقش والی انگوٹھی بنوائی اور یہ اس لیے تھا کہ آپ سے صحابہ نے عرض کیا کہ بادشاہ ایسے خطوط کو نہیں پڑھتے جو مہر کے بغیر ہوتے ہیں۔

کتابت لغات میں بھی آیا ہے کہ جس وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعوت کو وسعت دینے اور روئے زمین کے سلاطین کو خط لکھنے کا ارادہ کیا تو حکم دیا کہ آپ کے لیے انگوٹھی تیار کی جائے جس پر محمد رسول اللہ ﷺ کندہ ہو۔ چنانچہ آپ اپنے خطوط پر اسی سے مہر لگاتے تھے۔

۲۔ اسان العرب اور تائوس اللغز ماؤہ ختم "الغلامتہ مایو صنع علی الطینۃ" ختم "وہ چیز ہوتی ہے جو گلی مٹی پر لگائی جاتی ہے۔

۳۔ اس روایت کو کتب میں نے سن کی جگہ ۱۰ میں نقل کیا ہے۔

۴۔ سفینۃ اہل علم ص ۱۰۴

۵۔ طبقات کبریٰ جلد ۱ ص ۱۰۴

اس بیان سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ لفظ خاتم کا موجودہ زمانے میں اگرچہ زینت اور زیور کے طور پر انگوٹھی پر بھی اطلاق ہوتا ہے لیکن اس کی اصل "ختم" سے لی گئی ہے جو "ختم" کے معنی میں ہے اور اس زمانے میں ان انگوٹھیوں کو کہا جاتا تھا جن سے خطوط پر مہر لگاتے تھے۔

علاوہ ازیں یہ مادہ قرآن مجید میں بھی متعدد مواقع پر استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ ختم کرنے اور مہر لگانے کے معنی میں ہے۔ مثلاً:

"السیور غنم علی انواہمہم وتکلفنا ایذہم" (یس ۶۵)

آج زینت کے دن ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے گت لگو کریں گے۔

یا

"ختم اللہ علی قلوبہم وعلی سمعہم وعلی ابصارہم غشاوۃ"

"خدا نے ان (منافقین) کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے (اس لحاظ سے کوئی نصیحت اس پر اثر نہیں کرتی) اور

ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔" (البقرہ ۱۷)

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاتمیت اور آپ پر سلسلہ انبیاء ختم ہونے کے بارے میں زبردستی آیت کی دلالت میں دوسرے ڈالے یا تو بالکل اس لفظ کے معنی سے بے خبر تھے یا پھر تجاہل مارنا سے کام لیا۔ ورنہ

جو شخص عربی ادب سے بخوبی بہت واقفیت رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ لفظ "خاتم النبیین" واضح طور پر ختم نبوت پر دلالت کرتا ہے۔

اس صورت میں اگر اس تفسیر کے علاوہ آیت کی کوئی تفسیر کی جائے تو سبک، ہلکا اور بیجا ذمہ مہم پیا کرے گی۔ مثلاً اگر یہ کہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسرے انبیاء کی انگوٹھی تھے، یعنی پیغمبروں کی زینت شمار جوتے تھے تو ہر ایک کو معلوم ہے کہ انگوٹھی انسان کا ایک عام زینین زیور ہوتی ہے جو کبھی بھی انسان کے برابر اور ہم پلہ قرار نہیں پاسکتی۔ لہذا اگر آیت کی یہ تفسیر کریں گے تو پیغمبر اسلام کو ان کے مقام و مرتبہ سے بہت گرا دیں گے۔ اس کے علاوہ یہ معنی لغت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔ اسی لیے توبہ لفظ لہرے قرآن میں آٹھ مقام پر جہاں کہیں بھی استعمال ہوا ہے، ہر جگہ "ختم کرنے" اور "مہر لگانے" کے معنی میں آیا ہے۔

۲۔ ختم نبوت کے دلائل: "واللہ وسلم کی خاتمیت کی دلیل اسی پر منحصر نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کی دوسری آیات بھی اس معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور روایات کو پشت سے موجود ہیں۔ مجملہ ان کے سورۃ انفام کی آیت ۱۹ میں ہم پڑھتے ہیں:

"واوحی الی ہذا القرآن لانتذکر بہ ومن بلغ"

"یہ قرآن مجھ پر وحی ہوا ہے تاکہ تمہیں اور ان دوسرے لوگوں کو جن تک یہ قرآن پہنچے میں ڈراؤں اور خدا کی طرف

دعوت دلاؤ۔

۳۔ ومن بلغ "واقام وہ لوگ جن تک یہ بات پہنچے، ان کی تفسیر کے مفہوم کی وسعت ایک طرف تو قرآن مجید اور پیغمبر اسلام کی عالمی رسالت کو واضح کرتی ہے اور دوسری طرف ختم نبوت کو۔

دوسری آیات جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عالمی دعوت کو ثابت کرتی ہیں مثلاً:

”تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعالمین نذیراً“

”جادید اور بابرکت ہے وہ خدا جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل کیا تاکہ وہ تمام اہل عالم کو ڈرائے۔“
اور شلاً

(الفرقان / ۱)

”وما ارسلناک الا کافّةً للناس بشیراً ونذیراً“ (سبا / ۱۸)

”مہ نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر (تاکہ لوگوں کو جنت کی خوش خبری دیں اور جہنم سے ڈرائیں)

اور ارشاد الہی ہے:

”قل یا ایہا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً“

”اے پیغمبر! کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا ہوں“ (اعراف / ۱۵۸)

”عالین“ ”ناس“ اور ”کافّة“ کے مفہوم کی دست بھی اس معنی کی موافقہ اس سے قطع نظر کہ ایک تو اس پر علماء اسلام کا اجماع ہے، دوسرے یہ مشہور روایات دین میں سے ہے اور تیسرے پیغمبر اسلام اور دیگر پیشواؤں سے کثرت سے روایات ملتی ہیں جو اس مطلب کو بہت واضح کرتی ہیں۔ نمونہ کے طور پر ہم ذیل کی چند روایات کو ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

ہم پیغمبر اکرم کی ایک مشہور حدیث میں پڑھتے ہیں جس میں آپ نے فرمایا ہے:

”حلالی حلال الی یوم القیامۃ و حرامی حرام الی یوم القیامۃ“

”میرا حلال قیامت تک حلال ہے اور میرا حرام قیامت کے دن تک حرام ہے۔“

یہ تعبیر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے شریعت محمدی بھی قائم و برقرار ہے۔

بعض مقامات پر مذکورہ بالا حدیث یوں بھی نقل ہوئی ہے:

”حلال محمّد حلال ابداً الی یوم القیامۃ و حرامہ حرام ابداً الی یوم

القیامۃ لایکون غیرہ ولا ینحی غیرہ“

”حلال محمد ہمیشہ کے لیے قیامت کے دن تک حلال ہے اور آپ کا حرام کیا ہوا، ہمیشہ کے لیے قیامت

کے دن تک حرام ہے۔ اس کے علاوہ نہ کچھ ہوگا اور نہ ہی کوئی آئے گا۔“

۲۔ مشہور حدیث ”منزلت“ جو اہل تشیع اور اہل سنت کی مختلف کتابوں میں حضرت علیؑ کے بارے میں وارد ہوئی ہے اس کے مطابق جب آنحضرتؐ جلگ تبوک میں شرکت کے لیے تشریف لے جا رہے تھے اور حضرت علیؑ کو مدینہ میں اپنی جگہ اپنانا سبب بنایا تھا تو یہ حدیث مسئلہ قیامت کو بھی مکمل طور پر واضح کرتی ہے، کیونکہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

۱۔ بحوالہ انوار مجلہ نمبر ۳۷ ص ۱۴، حدیث ۱۴۔

۲۔ احوال کافی جلد اول باب البدع والاربابی والفتاویٰ، حدیث ۱۹۔

”انت من منزلۃ ہارون من صوحی اذا استد لاجت عیدی“

”تو اعلیٰ تم میرے نزدیک وہی منزلت رکھتے ہو جو ہارون کو موسیٰ سے تھی لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے
داسی بنا، پر تمہارے پاس سوائے نبوت کے ہارون کے باقی تمام مناصب موجود ہیں، اہل

۳۔ یہ حدیث بھی مشہور ہے اور اہل سنت کے بہت سے منابع میں نقل ہوئی ہے، جس میں آپ نے فرمایا:

”مشل ومشل الانبیاء کمثل رجل یسخر بنیاناً فاحسنہ واجملہ فیحمل

الناس یطیعون بہ یقولون ما رأینا بنیاناً احسن من هذا الا هذه

اللبنة، فکنت انا تلك البنة“

”گورشتہ انبیاء کے مقابلے میں میری مثال اس شخص کی سی ہے کہ جو بہت ہی خوبصورت اور دلکش مکان تعمیر

کرسے، لوگ اس کے گرد بچکر لگائیں اور کہیں کہ اس سے بہتر کوئی عمارت نہیں، لیکن اس کی صرف ایک اینٹ کی جگہ خالی

چھ اور وہی آخری اینٹ ہوں۔“

یہ حدیث صحیح مسلم میں مختلف عبارتوں اور متروک روایوں سے نقل ہوئی ہے یہاں تک کہ ایک جگہ پر اس کے ذیل میں ایک جملہ

یہ بھی آیا ہے:

”وآنا خاستہ النبیین۔“

”میں خاتم الانبیاء ہوں۔“

ایک اور حدیث کے ذیل میں یہ جملہ بھی آیا ہے:

”جئت فنختمت الانبیاء۔“

”میں آیا اور انبیاء ختم ہو گئے۔“

نیز یہ صحیح بخاری کتاب المناقب میں سنن احمد ابن منیل، سنن ترمذی، سنن نسائی اور کئی دوسری کتب میں منقول ہے

اور نہایت ہی مشہور و معروف احادیث میں سے ہے۔ اسے شیعہ مفسرین، مثلاً مرحوم طبرسی اور اہل سنت مفسرین، جیسے مرحوم

قرطبی نے اپنی تفاسیر میں زیر بحث آیت کے ضمن میں نقل کیا ہے۔

۴۔ بیخ ابلاغ کے بہت سے خطبات میں بھی ختم نبوت کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جن میں سے خطبہ نمبر ۱۴

ہے جس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یوں تعریف و توصیف کی گئی ہے:

۱۔ اس حدیث کو صحیح الدین طبری نے ذخائر العقبیٰ ص ۱۴۱ مطبوعہ مکتبۃ القدس، میں بیان کیا ہے جس نے موافق عمرہ ص ۱۴۱ مطبوعہ مکتبۃ القاجو

میں تاریخ بغداد جلد ۱ ص ۱۴۱ مطبوعہ السعادة میں اور دوسری کتب مثلاً، کنز العمال، منتخب کنز العمال اور بیاض الحوقۃ میں بھی نقل کیا ہے (حدیث

منزلت کے سلسلہ میں مزید دماغت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد نمبر ۱ ص ۱۴۱ احزاب آیت نمبر ۱۴ کی طرف رجوع فرمائیں۔

۲۔ صحیح مسلم جلد ۱ ص ۱۴۱ (باب ذکر کون من انہم الذین اذکنا بل اغتسل)۔

” امین وحیہ و خاتم رسالہ و بشیر رحمتہ و نذیر نفاقتہ “
 وہ حضرت محمد مصطفیٰ (ص) کی لثارت دینے والے اور اس کے عذاب سے ڈلنے والے تھے۔

نیز خطبہ نمبر ۱۳۳ میں یوں فرمایا ہے:

” ارسلدہ جلی حین فترۃ من الرسل، وتنازع من اللسن، ففقنی بہ الرسل و ختم بہ السوح “

” خدا نے انہیں گذشتہ انبیاء کے درنقرت کے بعد بھیجا، ایسے وقت میں جب مختلف مذاہب کے درمیان نزاع اور ہنگام پیدا ہو گیا تھا، پس اللہ نے آپ کے ذریعے نبوت کی تکمیل فرمائی اور آپ ہی کے ذریعے وحی کو ختم کیا۔“

اور بیچ السلاخہ کے پہلے خطبہ میں گذشتہ انبیاء و رسلین کے لایزال عمل کو ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

” انی ان بعث اللہ سبحانہ محمدًا رسول اللہ لا نجاز عدتہ و اشعار نبوتہ “

” یہاں تک کہ خداوند تعالیٰ و سبحانہ نے اپنے رسول حضرت محمد کو اپنے وعدوں کی تکمیل اور سلسلہ نبوت کو ختم کرنے کے لیے مبعوث فرمایا۔“

۵۔ حجتہ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی عمر مبارک کے آخری حج اور آخری سال میں ایک جامع وصیت نامہ کی صورت میں لوگوں سے جو خطبہ بیان فرمایا، اس میں بھی ختم نبوت کے مسئلے کو صراحت کے ساتھ بیان کر دیا۔ آپ نے فرمایا:

” الا نلیبلغ شہادکم خاتمکم لانی نبی بعدی ولا امۃ بعدکم “

ماضین غائبین تک یہ بات ضرور پہنچا دی کہ نہ تو میرے بعد کوئی نبی ہے اور نہ ہی تمہارے بعد کوئی امت۔ پھر آپ نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اس حد تک بلند کیے کہ آپ کی انگلیوں کی سفیدی نظر آنے لگی اور بارگاہ خدا میں عرض کیا:

” اللہم اشہد انی قد بلغت “

” خدا یا گو اور ہنا کہ بے جو کچھ کہنا چاہیے تمہا کہہ دیا ہے۔“

۶۔ ایک اور حدیث میں جو کتاب کافی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے، اس میں ہے:

” ان اللہ ختم بنییکم النبیین فلا ینبئ بعدہ ابداً و ختم

بکتابکم الکتب فلا کتاب بعدہ ابداً “

” خدا نے تمہارے پیغمبر کے ذریعے سلسلہ انبیاء کو ختم کر دیا ہے۔ اس بنا پر ان کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا اور تمہاری آسمانی کتاب کے ساتھ آسمانی کتابوں کا سلسلہ ختم کر دیا ہے، لہذا اس کے بعد ہرگز کوئی کتاب نازل نہیں ہوگی۔“

اسلامی ماخذ میں اس سلسلے کی بہت زیادہ احادیث میں یہاں تک کہ کتاب ” معالم النبوة “ میں ۱۳۵ احادیث علماء اسلام کی کتب سے جمع کی گئی ہیں جو پیغمبر اور اسلام کے بزرگ پیشواؤں کی طرف سے اس سلسلے میں بیان ہوئی ہیں۔ سہ

۳۔ چند سوال اور ان کے جواب:

ختم نبوت کے سلسلے میں مختلف سوالات پیش آتے ہیں جن کا ہم ذیل میں جائز لیں گے۔

۱۔ ختم نبوت، ارتقاء سے کیونکر ممکن آہنگ ہے؟ پہلا سوال جو اس بحث میں سامنے آتا ہے کہ آیا ممکن ہے، انسانی معاشرہ متوقف ہو جائے اور کسی خاص منزل پر جا کر رگ جائے؟ کیا انسانی تکامل اور ارتقاء کی کوئی حد و حساب بھی ہے یا نہیں؟ کیا ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے کہ موجودہ زمانے کے انسان گذشتہ دور کے لوگوں سے علم و دانش اور تمدن و ثقافت کے اعتبار سے ناقص ہیں؟

تو ان حالات میں کیونکر ممکن ہے کہ دفتر نبوت کلی طور پر بند کر دیا جائے اور انسان اپنے ارتقائی مراحل میں نئے پیغمبروں کی رہبری سے محروم کر دیا جائے؟

ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ کبھی انسان اپنے فکر و تمدن کے بلوغ کے ایک مرحلے تک پہنچ سکتا ہے کہ آخری نبی، جو جامع اصول اور تعلیمات اسے دے، ان کی روشنی میں اسے کسی نئی شریعت کی ضرورت نہ رہے، بلکہ اپنی اصولوں سے سلسلہ استفادہ کرنے سے وہ اپنے سفر کو جاری رکھ سکے۔

بعینہ اس طرح جس طرح انسان تعلیم کے مختلف شعبوں میں نئے معلم اور مربی کا محتاج ہوتا ہے تاکہ مختلف تعلیمی ادوار کو گزار سکے لیکن جب ڈاکٹریٹ کے مرحلے تک پہنچ جاتا ہے اور کسی ایک علم یا چند علوم میں صاحب نظر مجتہد اور ماہر ہو جاتا ہے تو پھر اس منزل پر تعلیم جاری رکھنے کے لیے اسے نئے استاد کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس تعلیم کے بل بوتے پر اپنی تحقیقات میں لگا رہتا ہے جو سابقہ استادوں خاص کر آخری استاد کے پاس سے حاصل کی تھی، اس طرح سے وہ اپنے ارتقاء کے مراحل کو طے کرتا رہتا ہے۔ دوسرے غفلتوں میں راستے کی مشکلات کو ان کلی اصولوں کے ذریعے حل کرتا رہتا ہے جو اس نے آخری استاد سے حاصل کیے تھے۔ اس بنا پر یہ ضروری نہیں ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ نئی نیا دین آتا رہے (غور کیجئے گا)

بالغافل دیگر گذشتہ انبیاء میں سے ہر ایک نے انسان کے ارتقاء کے لیے کچھ نئے نئے تائے ہیں تاکہ وہ اس نشیب و فراز والے رستوں میں پیش رفت کر سکے، حتیٰ کہ پیغمبر آخر زمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد تک اس میں ایسی اہمیت اور لیاقت پیدا ہوئی

۱۔ اصول کافی جلد اول۔

۲۔ معالم النبوة، ” نصوص خاتمتہ “

کہ اس آخری پیغمبر کے لیے خدا کی طرف سے ایک مکمل اور جامع ترین لفتحه مل گیا جس کے ذریعے وہ راستے کی مشکلات کو سہل کر سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایک جامع اور مکمل لفتحه ہوتے ہوئے کسی دوسرے لفتحے کی ضرورت نہیں رہتی باور یہ حقیقتاً اس تعبیر کا بیان یا وضاحت ہے جو ختم نبوت کے بارے میں روایات آئی ہیں، جن میں آنحضرت کو قصر رسالت کی آخری اینٹ یا اس آخری اینٹ کارکنے والا بتایا گیا ہے۔

یہ سب دلائل تو کسی نئے دین کی نئی سلسلے میں تھے، رہا رہبری اور امامت کا مسئلہ جو ان قوانین اور اصول کے نفاذ کی مکمل نگرانی اور اہدایات کے لیے لوگوں کی دستگیری کا نام ہے تو یہ ایک الگ مسئلہ ہے اور اس سے انسان کسی بھی وقت بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اسی لیے سلسلہ نبوت کے خاتمے سے سلسلہ امامت ختم نہیں ہو سکتا کیونکہ ان اصولوں کی تشریح اور وضاحت اور انہیں ظاہری وجود عطا کرنے کے لیے امامت کی ہر حال ضرورت ہے جس سے استفادہ خدا کے کسی معصوم پیشوا اور رہبر کے بغیر ناممکن ہے۔

۲۔ ثابت قانون اور بدلتی ضرورتیں؛ پہلے سوال میں پیش ہونے والے نظریہ ارتقاء سے قطع نظر یہاں پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ہر ایک جانتا ہے کہ مختلف زمان اور مکان کے تقاضے بھی مختلف ہوا کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انسان کی ضروریات ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں، جبکہ قائم الانیاء کی شریعت کے قوانین ثابت اور لازوال ہیں، تو کیا یہ قوانین ہر دور کے انسان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟

ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا بھی اچھی طرح جواب دیا جاسکتا ہے اور وہ یہ کہ اگر تمام اسلامی قوانین جزوی مثبت کے حامل ہوتے اور ہر موضوع کے لیے علیحدہ علیحدہ جزوی احکام معین کیے جوتے ہیں تو اس سوال کی گنجائش بنتی، لیکن چونکہ اسلام میں کچھ ایسے احکام بھی ہیں جن کے اصول کلی اور نہایت ہی وسیع دائرہ کے حامل ہیں جو بدلتی ہوئی ضروریات اور ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، لہذا اس قسم کے اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

مثلاً زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے درمیان قانونی رابطے بڑھ رہے ہیں اور ہر روز نئے نئے معاہدے وجود میں آ رہے ہیں جن کا قرآن کے نزول کے وقت بالکل وجود نہیں تھا، مثلاً اس زمانے میں "بیمہ" نام کی کوئی چیز نہیں تھی جس کی آج ایک نہیں، بلکہ کئی قسمیں ہیں۔

اسی طرح مختلف قسم کی کمپنیاں ہیں جو موجودہ دور میں ضروریات زمانہ کے تحت معرض وجود میں آئی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اسلام میں ایک کلی اصول موجود ہے جو سورہ مائدہ کی آیت ۱۰۵ میں "معاہدوں پر عمل کرنا ضروری ہے" کی صورت میں موجود ہے۔ ارشاد ہوتا ہے،

۱۔ البتہ اسلام میں میرے رشتے جتنے بھی ہیں، جو ایک خاص حد میں محدود ہیں، میرے خاص جریہ کا مسئلہ ہے، قتل غلامانہ محض کی دیت کا معاوضہ خاص قسم کے رشتہ داروں سے متعلق ہونا، لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ اس مسئلے سے صرف متاثر ہوتا ہے۔

۱۔ یا ایہا الذین امنوا اوفوا بالعقود

۲۔ اسے وہ لوگو اچھا ایمان لائے ہو اپنے معاہدوں پر عمل کرو

یہ حکم ہر قسم کے باہمی معاہدوں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ البتہ اس کی اصول کے لیے اسلام نے کچھ کلی شرائط بھی مقرر کی ہیں جنہیں مت نظر رکھنا ہوگا۔

اس بنا پر اس سلسلے میں ایک ثابت اور پایدار کلیہ موجود ہے۔ اگرچہ اس کے معادین بدلتے رہتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ہر روز اس کا ایک نیا مستزاد مل جائے۔

دوسری مثال اسلام میں "قانون لاضرر" کے نام سے ایک مسلم قانون موجود ہے اور اسلامی معاشرہ میں جو حکم بھی کسی کے لیے ضرر اور نقصان کا سبب بن رہا ہو، اس قانون کے ذریعے اس کا سدباب کیا جاسکتا ہے اور اس طرح سے بہت سے مسائل کا حل نکالا جاسکتا ہے۔ ان سب سے قطع نظر معاشرتی نظام کی حفاظت اور واجب کا مقدمہ بھی واجب ہوتا ہے اور "اہم ترین کو اہم پر مقدم کیا جائے" یہ چند ایک مسائل ایسے ہیں جو بہت سے مشکل ترین مسائل کو حل کر سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ وہ تمام وسیع اقتدارت جو "ولایت فقیر" کے ذریعے اسلامی حکومت کو حاصل ہیں، ان کے ذریعے اسلام کے کلی اصولوں کے اندر وہاں مشکلات کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے۔

البتہ ان امور میں سے ہر ایک کو تفصیل سے بیان کرنے کے لیے ایک لمبی تفصیل کی ضرورت ہے، خصوصاً جبکہ اجتہاد کا دوازہ بھی کھلا ہوا ہے اور اجتہاد کا معنی ہے اسلامی مابعد سے اسلامی احکام کا استنباط، لیکن ہم یہاں اس تفصیل میں نہیں جاتے کیونکہ اس طرح سے ہم اپنے مقصد سے ڈور ہٹ جائیں گے، لیکن پھر بھی ہم نے اشارہ کر دیا ہے جو مذکورہ بالا اعتراض کا جواب ہو سکتا ہے۔

۳۔ غیبی فیض سے محرومی، ایک اور سوال یہ ہے کہ وحی کا نزول ہوا عالم غیب اور ماوراء طبیعت سے ارتباط، عالم بشریت کے لیے خدا کی طرف سے ایک بہت بڑا احسان اور اعزاز ہے اور تمام بچے مومنین کے لیے امید کا دریچہ ہے۔

تو کیا اس ارتباط کا منقطع ہو جانا اور امید کے اس دریچے کا بند ہو جانا پیغمبر خاتم کے بعد آنے والے انسانوں کے لیے ایک منظم محرومی نہ ہوگی؟

اس سوال کا جواب بھی ذیل کے نکتے کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے:

اولاً وحی اور عالم غیب سے رابطہ و حقیقت حقائق کے اور اک کے لیے ہے اور جب کہنے کی باتیں بھی جاچی ہوں اور روز قیامت تک کی ضروریات کے تمام کلی اور جامع اصول پیغمبر اسلام علیہ وآلہ وسلم کے ذرائع کی روشنی میں بیان ہو چکے ہوں تو پھر اس رابطہ کے منقطع ہو جانے سے کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوگا۔

ثانیاً: جو کچھ نبوت کے خاتمے کے بعد ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا ہے، وہ ہے "نئی شریعت کے لیے وحی" یا سابق شریعت کی تکمیل

ذکر عالم طبیعت کے ماوراء ہر قسم کے رابطہ کا انقطاع، کیونکہ اگر علیہم السلام بھی عالم غیب سے رابطہ رکھتے ہیں اور وہ بچے مومنین بھی جو

تہذیب نفس کے ذریعے اپنے دلوں سے جاہلوں کو دور کر کے کشف و شہد کے مناسب پرفائز ہو چکے ہیں۔

مشہور فیلسوف صدر المتالیہین شیرازی "مفاتیح الغیب" میں یوں رقم طراز ہیں:

”وحی“ اس معنی کے لحاظ سے کہ فرشتہ ماموریت اور پیغمبری کے لیے کان اور دل پر نازل ہوتا ہے، تو یہ سلسلہ اگرچہ منقطع ہو چکا ہے اور کسی پر فرشتہ نازل نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی کو کسی قسم کے فرمان کے نفاذ پر مامور کرتا ہے کیونکہ اکملت لکم دینکم کے حکم کے مطابق جو کچھ اس راستے سے انسان تک پہنچنا چاہیے تھا، وہ پہنچ چکا ہے، لیکن الہام و اشراق کا دروازہ ہرگز بند نہیں ہوا اور نہ ہی ہوگا کیونکہ اس دروازے کا بند ہونا ممکن ہی نہیں۔ سہ اصولی طور پر یہ رابطہ نفس کے ارتقاء، روح کی جلا اور ایمان کے صفا کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پیر صوفی حضرت نبوت اور رسالت کے ساتھ نہیں ہوتی بلکہ جس وقت بھی اس کے مقدمات اور شرائط فراہم ہو جائیں یہ معنوی رابطہ قائم ہو جاتا ہے اور بنی نوع انسان اس فیض سے محروم تھی اور نہ ہی ہوگی۔ (مغز کیبے گا)

۲۱- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ذُكِّرُوا بِاللَّهِ ذِكْرًا كَثِيرًا
 ۲۲- وَسَيَحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا
 ۲۳- هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا
 ۲۴- تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهُ سَلَامٌ وَأَعَدَّ لَهُمْ أَجْرًا كَرِيمًا

ترجمہ

- ۲۱- اے وہ لوگ جو ایمان لائے ہو! خدا کو بہت یاد کرو۔
 ۲۲- اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔
 ۲۳- وہ وہی ہے جو تم پر درود اور رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تمہارے لیے رحمت کا تقاضا کرتے ہیں، تاکہ تمہیں (جہالت، شرک اور گناہ کی تاریکیوں سے) ایمان، علم اور تقویٰ کے، نور کی طرف رہنمائی کرے، وہ مؤمنین پر بہت ہی مہربان ہے۔
 ۲۴- ان کا تحیہ، سلام ہے جس دن وہ اس سے ملاقات کریں گے اور خدا نے ان کے لیے نہایت ہی قیمتی جزا مقرر کر رکھی ہے۔

تفسیر

خدا اور فرشتوں کا درود:

گذشتہ آیات میں تبلیغ رسالت کے سلسلہ میں پیغمبر اسلام کی سنت ذمہ داریوں کے بارے میں گفتگو تھی۔ اب مندرجہ بالا میں اس تبلیغ کے دامن کو سارے معاشرے میں وسعت دینے کے لیے مؤمنین کی کچھ ذمہ داریوں کو بیان کیا گیا ہے اور ان سب کی طرف روتے سخن کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ "اسے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو خدا کو زیادہ سے زیادہ یاد کیا کرو" یا "یہاں اللہ تعالیٰ نے اذکر واللہ ذکرا کے پیرا"۔

اور صبح و شام اس کی تسبیح کیا کرو: (و سبحوه بكرة و اصیلاً)۔

چونکہ مادی زندگی میں ان کے لیے غفلت کے عوامل بہت زیادہ ہیں اور شیاطین کے دوسوں کے تیر ہر طرف سے چل رہے ہیں ان سے تہو آنا ہونے کے لیے "ذکر کثیر" کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ "ذکر کثیر" اپنے حقیقی معنی کے لحاظ سے یہ ہے کہ پورے وجود کے ساتھ خدا کی طرف توجہ جو، ذکر صرف زبانی۔

ایسا ذکر کثیر جو انسان کے تمام اعمال پر سایہ نگیں ہو اور اس پر نور اور روشنی ڈال رہا ہو، اس طرح سے قرآن پاک تمام مؤمنین کو اس بات کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے کہ وہ ہر حالت میں یاد خدا میں مصروف رہیں۔ عبادت کے وقت اسے حضور قلب اور خلوص دل سے یاد کریں، اگر گناہ کے مقامات پر پہنچیں تو اسے یاد کر کے گناہوں سے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اگر لغزش ہو جائے تو توبہ کریں اور راہ حق کی طرف پلٹ آئیں۔ نعمت کے وقت اسے یاد کریں، اس کے شکر گزار ہوں، بلا و مصیبت کے وقت اسے یاد کریں۔ صابروں کا کریں

ظاہر ہے کہ اس کی یاد کو کبھی دل سے نہ بھلائیں جو زندگی کے ہر شعبہ میں صیغ اور الہی طرز عمل کا سبب ہے۔

ایک حدیث جسے صحیح ترمذی اور مستدرک احمد بن حنبل میں ابوسعید خدری کی وساطت سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا گیا ہے میں ہے کہ لوگوں نے آنحضرت سے سوال کیا،

"اے العباد! افضل درجہ عند اللہ یوم القیامۃ؟"

"قیامت کے دن اللہ کے نزدیک کس بندے کا درجہ سب سے افضل اور سب سے برتر ہوگا؟"

قرآپ نے ارشاد فرمایا،

"الذاکرون اللہ کثیراً"

"جو لوگ خدا کو زیادہ یاد کرتے ہیں"

ابوسعید کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا،

"یا رسول اللہ! ومن الغازی فی سبیل اللہ"

"یا رسول اللہ! کیا اس قسم کے لوگ راہ خدا میں جہاد کرنے والوں سے بھی بلند مقام کے مالک ہیں؟"

آپ نے فرمایا،

"لوضرب بسیفۃ فی الکفار والمشرکین حتی ینکسر ویختضب

دمہ المکان الذاکرون اللہ افضل درجۃ منہ"

"اگر اپنی تلوار سے کفار و مشرکین کے پیکر پر اس قدر ضربیں لگائیں کہ تلوار ٹوٹ جائے اور خون سے رنگین

ہو جائے تب بھی وہ لوگ جو خدا کو زیادہ یاد کرتے ہیں، ان سے افضل ہیں"۔

کیونکہ خاص جہاد میں خدا کے ذکر کثیر کے بغیر ناممکن ہے۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر کثیر ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور اگر بعض روایات میں تسبیح حضرت فاطمہ الزہرا سلام اللہ علیہا

(۲۲ مرتبہ اللہ اکبر، ۲۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۲۳ مرتبہ سبحان اللہ) اور مفسرین کے بعض اقوال میں ذکر کثیر سے مراد "صفات علیا" اور

"اسمائے حسنی" اور پروردگار کو ان چیزوں سے پاک بیان کرنا جو اس کے لائق نہیں یا اس قسم کے دوسرے امور ہیں تو یہ سب ذکر کے

داخل مصداق کا بیان ہیں نہ کہ آیت کے مفہوم کو خصوصیت سے ان مصداق میں سے کسی کے ساتھ محدود کر دیا جائے۔

جیسا کہ آیات کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے، "ہر صبح و شام خدا کی تسبیح" سے مراد یہ ہے کہ تسبیح کو دن رات جاری رکھا جائے

اور ان واقعات کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنا دراصل دن کے آغاز اور اختتام کے طور پر ہے۔ یعنی لوگوں نے اس کی تفسیر ناصح

اور دھروہ سے کہے تودہ میں اس کا ایک مصداق ہے۔

اس طرح سے "خدا کا ذکر کثیر اور ہر صبح و شام اس کی تسبیح" پروردگار کی طرف دائمی توجہ اور اسے ہر عیب و نقص سے مبرا جاننے

بغیر نہیں ہو سکتی۔ نیز ہم سب جانتے ہیں کہ خدا کی یاد انسان کی روح کے لیے اسی قدام ہے جس قدر ہم کے لیے پانی اور غذا۔ چنانچہ

سورہ رعد کی آیت ۲۸ میں آیا ہے:

"الابد کما تظمن القلوب"

"آگاہی جو کہ صرف خدا کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان و سکون حاصل ہوتا ہے"

دلوں کے سکون و اطمینان کا نتیجہ بھی وہی ہے جو سورہ فجر کی آیات نمبر ۲۶-۲۷ میں آیا ہے:

"یا ایہا النفس المطمئنة ارجعی الی ربک راضیة مرضیة، فناد علی فی عبادع

واد خلی جنتی"

"اے نفس مطمئنة! اپنے پروردگار کی طرف پلٹ جا، جب کہ توبہ سے راضی ہے، وہ تجھ سے راضی ہے پھر میرے بندوں

زمرے میں شامل ہو کر میری بہشت میں داخل ہو جا۔

بعد والی آیت درحقیقت ذکر اور دائمی تسبیح کا نتیجہ اور رحمت غائی ہے، خدا فرماتا ہے۔ وہ وہی توبہ جو تم پروردگار رحمت

جیسا ہے اور اس کے فرشتے بھی تمہارے لیے رحمت کا تقاضا کرتے ہیں تاکہ تمہیں وہ جہالت، کفر اور شرک کی تاریکیوں سے ایمان و تقویٰ کی نور کی طرف رہنمائی کرے اھوالذی یصلیٰ علیکم و ملائکتہ لیخرجکم من الظلمات الی النور۔

”کیونکہ وہ مؤمنین کی بابت رحیم و مہربان ہے“ اور اسی بنا پر ان کی ہدایت اور بہری اس نے اپنے ذمہ لے لی ہے اور اپنے فرشتوں کو بھی ان کی امداد پر مامور کیا ہے: (وکان بالمؤمنین رھیماً)۔

”یصلیٰ“ ضلالت کے بارے سے ہے، یہاں توجہ اور مخصوص عنایت کے معنی میں ہے۔ یہ عنایت خدا کے بارے میں توڑنے رحمت ہے اور فرشتوں کے بارے میں استغفار اور تقاضا ہے رحمت ہے۔ جیسا کہ سورہ مؤمن کی آیت میں ہے: ویستغفرون للذین آمنوا یعنی عالمین عرش مؤمنین کے لیے استغفار کرتے ہیں۔

بہر حال یہ آیت ان مؤمنین کے لیے بشارت عظیم اور بڑی نید ہے جو ہمیشہ خدا کی یاد میں رہتے ہیں، کیونکہ آیت رحمت کے ساتھ کہتی ہے کہ وہ اللہ کی طرف سیر و سلوک میں تنہا نہیں ہیں بلکہ لفظ ”یصلیٰ“ فعل مضارع ہے جو استمرار پر دلالت کرتا ہے اور اس بات کا متقاضی ہے کہ مؤمنین ہمیشہ خدا اور اس کے فرشتوں کی رحمت کے زیر سایہ رہتے ہیں اور رحمت کے اس سائے میں ظلمت کے پردے شقی ہوتے ہیں اور علم و رحمت، ایمان اور تقویٰ کے نور ان کے قلب و ذریعہ پر روشنی کرتا ہے۔

جی ہاں! اسالکین راہ حق کے لیے یہ آیت بہت بڑی بشارت ہے اور انہیں نید دیتی ہے کہ محبوب کی طرف سے زبردست کشش موجود ہے تاکہ بے چارے عاشق کی کوشش کسی نہ کسی نتیجہ تک پہنچ جائے۔ وہ راہِ خدایں قدم اٹھانے والے مجاہدین کے لیے ضمانت ہے کیونکہ ایسے لوگوں کا شمار خالص اور نخلص افراد کے زمرے میں ہوتا ہے جنہیں گمراہ کرنے سے شیطاں نے پہلے دن ہی اپنے عجز و ناتوانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

”فبعزتک لا غویبہم اجمعین الا عبادک منهم المخلصین“

”خدا اذنا! تیری عزت کی قہمب کو گمراہ کروں گا سوائے تیرے نخلص بندوں کے۔ (ص ۸۲-۸۳)“

”وکان بالمؤمنین رھیماً“ کے جملے میں ”وکان“ فعل ماضی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ خدا کی طرف سے ہمیشہ مؤمنین پر ایک خاص رحمت رہتی ہے اور یہ اس بات کی ایک اور تائید ہے جو آیت کے آنا میں ہے۔ یہ خدا کی خاص رحمت ہی ہے کہ وہ مؤمنین کو اہام، شہوات اور شیطانی دوسلوں کی تاریکیوں سے نکال کر نقیبن والہیمان کے نور کی طرف راہنمائی کرتا ہے کیونکہ اگر اس کی رحمت شامل حال نہ ہو تو خطرناک اور پیچیدہ راستہ کبھی طے نہ ہو سکے۔

موجودہ سلسلے کی آخری آیت میں مؤمنین کے مقام اور ان کی جزا کی عمدہ اور مختصر عبارت میں تصویر کشی کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: فدائ فرشتوں کا تحیر ان کے لیے جس دن اقامت (وہ اس سے ملاقات کریں گے، سلام ہے، و تحییتہم لیوم یلقونہ سلام)۔

تحییت ”مادہ حیات“ سے ”سلامتی“ اور ”ایک اور زندگی“ کے لیے دعا کرنے کے معنی میں ہے (مزید وضاحتیں نیچے فرزند جلد ۹ صفحہ ۵۳۳ اور ذمہ کی طرف رجوع کریں)۔

یہ ایسا سلام ہے جو عذاب اور ہر قسم کے درد و رنج اور پریشانی سے محفوظ ہے اور سکون والہیمان سے ملا ہوا ہے۔ اگرچہ بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ ”تحییتہم“ مؤمنین کو آئیں میں درد و سلام پہنچ کرنے کی طرف اشارہ ہے، لیکن اگر گذشتہ آیات کو دیکھیں جن میں خدا اور ملائکہ کی اس جہان میں صلوات اور رحمت کی گفتگو تھی تو اس کا ظاہر یہ بتایا ہے کہ ”یہ تحییت بھی اس کے فرشتوں کی جانب سے آخرت میں ہوگا۔ جیسا کہ سورہ مد کی آیت ۲۳-۲۴ میں ہے۔

”والملائکۃ یدخلون علیہم من کل باب سلام علیکم بما صبرتم“

”اس دن فرشتے مؤمنین پر ہر دروازے سے وارد ہوں گے اور ان سے کہیں گے، تمہارے صبر کی وجہ سے تم پر سلام ہو“

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے معنی طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ یوم یلقونہ شے مراد قیامت کا دن ہے لقا، اللہ کے دن کا نام دیا گیا ہے۔ عام طور پر یہ تعبیر قرآنی آیات میں اس معنی میں استعمال ہوتی ہے۔

اس تحییت کے بعد جو رحیقیت آغاز کار سے مربوط ہے اس کے انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے ”خدا نے ان کے لیے بڑا قیمتی اجر فرمایا کرکھائے“ (واعدا لہم اجر کربیماً)۔

یہ ایک ایسا صلہ ہے جس میں اختصار کے باوجود تمام چیزیں جمع ہیں اور خدا کی تمام نعمتیں اور ہر قسم کی بخششیں اس میں بھی ہوئی ہیں۔

چند ایک نکات

۱- بہر حال میں خدا کی یاد: جس وقت خدا کا نام لیا جاتا ہے، عظمت، قدرت، علم اور رحمت کی ایک دنیا کے دل میں روشنی ہوتی ہے کیونکہ وہ اسما حسنیٰ اور اعلیٰ صفات کا حامل، تمام کمالات کا مالک اور ہر قسم کے نقص و عیب سے منزہ و مبرا ہے۔

اس حقیقت کی طرف دائمی توجہ انسانی مزاج کو نیکیوں اور پاکیزگیوں کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور برائیوں اور قیامتوں سے روکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کی صفات کا عکس انسانی رذیل میں نکلی کرتا ہے، ایسے عظیم مجبور کی طرف توجہ اس کی بارگاہ میں دائمی حضور کے احساس کا موجب بنتی ہے اور اس احساس کے ذریعے ہی گناہوں سے انسان کا فاصلہ بڑھ جاتا ہے اور وہ روز بروز ان سے دور ہوتا جاتا ہے۔

اس کی یاد ہمیشہ اس کی نگرانی کی یاد آوری، اس کے حساب و کتاب اور جزا کی یاد، اس کے عمل و انصاف اور رحمت و رزق کی یاد ہے۔ ایسی یاد ہے جو روح کو صفا اور دل کو نور و حیات عطا کرتی ہے۔

اس بنا پر اسلامی روایات میں آیا ہے کہ ہر چیز کی ایک مقدار میں ہے، سوائے یاد خدا کے کہ جس کا کوئی مدد حساب نہیں۔ اسلئے کانی کی روایت کے مطابق امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: ”ما من شیء الا اولہ حد ینفخ الیہ الا الذکر، فلیس لحد ینفخ الیہ ہر ایک چیز کی ایک حد ہوتی ہے کہ جب وہ اس تک پہنچ جائے تو ختم ہو جاتی ہے، سوائے یاد خدا کے کہ جس کی کوئی مدد

نہیں ہے۔

پھر مزید فرماتے ہیں:

” فرض الله عزوجل الفرائض فمن اداهن فهو محمدين وشهر رمضان فمن صامه فهو محمده والحج فمن حج حده، الا الذكرو فان الله عزوجل لمريض منه بالقليل ولم يجعل له حدا ينتهي اليه، شق مثلا: يا ايها الذين امنوا اذكروا الله ذكرا كثيرا وسبحوه بكرة واصيلا“
”خدا نے واجب نمازوں کو فرض کیا ہے جو ان کو ادا کر دے اس نے ان کی حد کو پورا کر دیا، ماہ رمضان کے جو روزے رکھے اس کی حد انجام پاگئی، جو شخص (ایک مرتبہ) حج بجالائے تو وہی اس کی حد ہے ہوا ہے۔“ ذکر خدا کے کہ خدا اسکی تعلیل مقدار سے راضی نہیں ہوتا اور اس کے کثیر کے لیے بھی حد کا قائل نہیں۔ پھر آپ نے اپنی گفتگو کے شاہد کے طور پر آید ”یا ایہا الذین امنوا اذکروا الله ذکرا کثیرا“ تلاوت فرمائی۔ لہ

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اسی روایت کے ذیل میں اپنے والد گرامی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے بارے میں نقل کرتے ہیں۔

”آبجائبات کثیر الذکر“ تھے۔ جس وقت بہان کے ساتھ چل رہے ہوتے تو وہ ذکر خدا کر رہے ہوتے اور کھانا کھاتے وقت ذکر خدا میں مشغول رہتے، یہاں تک کہ جب لوگوں سے باتیں کر رہے ہوتے تو میں ذکر خدا سے غافل نہ ہوتے۔“

آخر میں یہ پرمغز حدیث اس جملہ کے ساتھ ختم ہوتی ہے و

” والبيت الذي يعترف به القرآن، ويذكر الله عزوجل فيه تكثير بركته، وتخصره الملائكة، وتهجر منه الشياطين، ويضيء لاهل السماء كما يضيء الكوكب الدرر لاهل الارض“

”جس گھر میں قرآن کی تلاوت اور خدا کی یاد ہو، اس میں برکت زیادہ ہوتی ہے فرشتے اس میں حاضر ہوتے ہیں اور شیطان اس سے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں، اور وہ گہرا ایل آسمان کیوں چمکا دکھائی دیتا ہے، جیسے ایل زمین کو چمکتا ستارہ نظر آتا ہے۔“

اس کے برعکس جس گھر میں تلاوت قرآن اور ذکر خدا نہیں ہوتا اس کی برکتیں اٹھ جاتی ہیں اور فرشتے ہجرت کر جاتے ہیں اور شیطان آڑا کوڑا لٹتے ہیں۔

لہ کافی جلد ۱ کتاب الدعاء باب ذکر اللہ عزوجل :-

لہ کافی جلد ۱ کتاب الدعاء باب ذکر اللہ عزوجل :-

یہ موضوع اس قدر اہم ہے کہ ایک حدیث میں یاد خدا کو دنیا و آخرت کی تمام نیر کے ہم پیر قرار دیا گیا ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

” من اعطى لسنا اذا كرا فنقد اعطى خير الدنيا والاخرة“

”جس شخص کو خدا نے ذکر کرنے والی زبان عطا کی ہے گویا اس کو دنیا و آخرت کی جھلکی دے دی گئی ہے۔ لہ

یاد خدا کی اہمیت کے سلسلے میں روایات اس قدر زیادہ ہیں کہ اگر ہم چاہیں کہ ان سب کو میاں جمع کر دیں تو ہم اپنے موضوع سے خارج ہو جائیں گے۔ اس گفتگو کو ہم حضرت صادق آل محمد کی ایک مختصر مگر جامع حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

” من اكثر ذكر الله عزوجل اظله الله في حقيقته“

” جو شخص زیادہ یاد خدا کرے تو خدا اسے اپنے لطف و کرم کے سامنے میں بہشت بریں میں بھیج عطا فرمائے گا۔“

اچھ لوگ اس سلسلے میں آگاہی حاصل کرنا چاہتے ہیں انھیں اصول کافی جلد دوم کے ان ابواب کی طرف رجوع کرنا چاہیے جو ذکر اللہ کے بارے میں ہیں، خصوصاً جس باب میں بتایا گیا ہے کہ اس شخص کو کبھی آفات و مہلکات کا تعلق لگتا ایسے لفظی ذکر اور حرکت زبان سے نہیں ہے۔

اس بات کو ایک بار پھر دہرانا ضروری ہے کہ ان سب نیرات و برکات کا تعلق لگتا ایسے لفظی ذکر اور حرکت زبان سے نہیں ہے بلکہ جو غور و فکر اور عمل سے خالی ہو بلکہ مقصود وہ ذکر ہے جس سے فکر کے سوتے چھوٹتے ہوں اور جس کا رد عمل انسانی اعمال سے واضح ہو جیسا کہ روایات میں اس معنی کی تصریح ہوئی ہے۔ لہ

۲۔ لقاء اللہ کیا ہے؟ ہم نے کہا ہے کہ قرآن مجید میں عام طور پر یہ تعبیر قیامت کی طرف اشارہ ہے اور چونکہ پروردگار کے بارے میں کسی ملاقات کوئی مفہوم نہیں کھتی کیونکہ وہ جسم ہے، نہ ہی عوارض جسم کا حامل، لہذا بعض مفسرین مجرب اصطلاح کے مطابق یہاں مضاف کو مقصد مان کر کہتے ہیں کہ ”لقاء شواب اللہ“ یا ”خدا کے فرشتوں کی ملاقات“ ہے۔ لیکن یہاں پر ”لقاء“ کو ”لقاء اللہ“ کے حقیقی اور دل کی اکھ کے ساتھ دیکھنے کے معنی میں بھی لیا جاسکتا ہے۔

کیونکہ قیامت کے دن تمام پردے ہٹ جائیں گے اور خدا کی عظمت اور اس کی نشانیاں ہر زمانے سے زیادہ روشن اور واضح طور پر جلوہ گر ہوگی۔ انسان باطنی شہود اور دل کی آنکھوں کے ساتھ دیکھنے کے مقام پر پہنچ جائے گا اور ہر شخص اپنی معرفت اور عمل صالح کی مقدار کے مطابق اس شہود کے عالی مرتبہ پر فائز ہوگا۔

اسی مناسبت سے جناب فخر رازی نے اپنی تفسیر میں نہایت ہی قابل توجیہات بیان کی ہے جسے ہماری مذکورہ گفتگو کے ساتھ ملایا جاسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

اس دُنیا میں انسان مادی امور اور تلاش معاش میں مستغرق ہونے کی وجہ سے عام طور پر خدا سے غافل ہو جاتا ہے لیکن

لہ کافی جلد ۱ کتاب الدعاء باب ذکر اللہ عزوجل :-

لہ کافی جلد ۱ کتاب الدعاء باب ذکر اللہ عزوجل :-

لہ تفصیل صدوق مطابق نقل تفسیر المیزان جلد ۱، ص ۲۴۳۔

قیامت میں جب یہ تمام امور برطرف ہو جائیں اور انسان فکر و مشاغل سے بے نیاز ہو جائے گا تو اپنے پُرسے وجود کے ساتھ پلہ پلہ ہر کار عالم کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ اور یہی "لقاء اللہ" کا معنی ہے۔ لہذا یاد رہے جو کچھ ہم عرض کر چکے ہیں اس سے واضح ہو جائے کہ بعض مفسرین نے یہاں پر جحوت اور فرشتہ موت سے لڑائی کے لئے کی طرف اشارہ سمجھا ہے، نہ تو وہ مذکورہ آیات سے مناسبت رکھتا ہے اور نہ ہی ان جیسی دوسری قرآنی آیات کی تعبیرات سے خصوصاً "یلقونہ" میں معنوں کی ضمیر فرد کی صورت میں آئی ہے جو اس ذات پاک خداوند تعالیٰ کی طرف اشارہ ہے، بلکہ چونکہ قبض کرنے والے فرشتوں کے لیے جمع کا صیغہ ہوتا ہے اور اس سے قبل کی آیت میں لفظ "لکم" جمع کی صورت میں آیا ہے اور یہ کہ کوئی کلمہ مقدمہ مانا جائے۔

۳۔ مؤمنین کی جزا ابھی سے تیار ہے: "اعد لہم اجرًا کثیرًا" کا مجملہ واضح کرتا ہے کہ بہشت اور اس کی نعمتیں ابھی سے پیدا ہو چکی ہیں اور مؤمنین کے انتظار میں ہیں، لیکن ممکن ہے یہاں پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا تو ایسے لوگوں کے لیے مناسب ہوتا ہے جو محدود قدرت کے مالک ہوتے ہیں اور باہر ماز قدرت کے وقت فراہم کرنا چاہیں تو نہ کر پائیں لیکن پروردگار کی قدرت غیر محدود ہے، وہ جس وقت کسی چیز کا ارادہ کرے تو حکم دیتا ہے "ہو جا" تو وہ فوراً ہو جاتی ہے وہاں ایسی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تو پھر اس آیت میں اور قرآن کی دوسری آیات میں تیار ہونے کا کیا مقصد ہے؟

حج، ایک نئے کی طرف توجہ اس شکل کو صل کر دیتی ہے اور وہ یہ کہ کسی چیز کو تیار کر کے رکھنا ہمیشہ قدرت کے محدود ہونے کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ کسی دل کو گمانے اور زیادہ سے زیادہ دلی طمینان اور بعض اوقات زیادہ سے زیادہ اترام دکھانے کی بنا پر ہوتا ہے۔ لہذا ہم کسی مہمان کو دعوت دیتے ہیں اور کچھ مدت پہلے اس کی تواضع کے وسائل تیار کرنے میں مصروف ہو جائیں، تو ہم اس کے لیے زیادہ احترام اور اہمیت کے قائل ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر ہم اس کے آنے کے بعد تواضع اور پذیرائی کے وسائل منیا کرنے میں لگ جائیں تو یہ خود ایک قسم کی بے اعتنائی، بے پرواہی اور ناقدری شمار ہوگی۔

لیکن اس کے باوجود یہ بات اس سے مانع نہیں ہوگی کہ باایمان افراد اپنی خود سازی، معرفت اور پاکیزگی عمل میں جتنی زیادہ کوشش کریں گے، خدا کی طرف سے اجر و ثواب بھی اتنا تکامل اور ارتقا پیدا کرتا جائے گا۔

۲۵۔ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا
وَنَذِيرًا

۲۶۔ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا
۲۷۔ وَبَشِيرًا لِّلْمُؤْمِنِينَ بِأَنَّ لَهُم مِّنَ اللَّهِ فَضْلًا
كَبِيرًا

۲۸۔ وَلَا تَطِيعِ الْكٰفِرِينَ وَالمُنٰفِقِينَ وَدَعِ اذٰلٰهُم وَا
تَوَكَّلْ عَلٰى اللّٰهِ وَكفٰى بِاللّٰهِ وَكِيلًا

ترجمہ

۲۵۔ اے پیغمبر! ہم نے تجھے گواہ، خوشخبری دینے والا اور انداز کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔

۲۶۔ اور تجھے اللہ کے حکم سے، اسی کی طرف دعوت دینے والا اور روشنی عطا کرنے والا چراغ قرار دیا ہے۔

۲۷۔ اور مؤمنین کو بشارت دے کہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے عظیم فضل اور اجر ہے۔

۲۸۔ اور تو کفار و منافقین کی اطاعت نہ کر اور نہ ہی ان کے آزار اور اذیتوں کی پرواہ کر خدا پر توکل کر اور یہی کافی ہے کہ خدا (تیرا) حامی اور مدافع ہے۔

۱۔ تفسیر کبیر از فضال الدین رازی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

تفسیر

رسول اللہ صبراً و فرزاناً ہیں،

ان آیات میں رُودے سخن پیغمبر اسلام کی طرف ہے لیکن اس کا نتیجہ مومنین کے لیے ہے اور یہ آیات ان گزشتہ آیات کی تکمیل کرتی ہیں جن میں مومنین کی معین ذر واریوں کے بارے میں گفت گو کی گئی ہے۔

ان چار آیات میں سے پہلی دو آیات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پانچ اوصاف بیان ہوئے ہیں اور دوسری دو آیات میں پانچ ذمہ داریوں اور فرائض کا تذکرہ ہے جو سب آپس میں مربوط اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں پہلے فرمایا گیا ہے۔ "اے پیغمبر! ہم نے آپ کو شاہد اور گواہ کے طور پر بھیجا ہے" (یا ایہا النبی اننا ارسلناک شاہداً)۔

آنحضرت ایک طرف سے تو امت کے اعمال پر گواہ ہیں کیونکہ آپ ان کے اعمال کو دیکھتے ہیں۔ جیسا کہ ہم ایک اور جگہ پڑھتے ہیں:

"وقل اعملوا فسیرى الله عملکم ورسولہ والمؤمنون"
"کہہ دیجئے کہ عمل کرتے رہو خدا اس کا رسول اور مومنین (آئمہ معصومین) تمہارے اعمال کو دیکھتے ہیں"

(توہرہ ۱۰۵)

پیغمبر اکرم اور ائمہ علیہم السلام کے پاس امت کے اعمال کے پیش ہونے سے ان کے بارے میں ان کے علم و آگہی کی بات ثابت ہو جاتی ہے جن کی تفصیل اسی آیت کے ذیل میں، تفسیر نوز مہلہ شہم میں آچکی ہے۔

دوسری طرف آپ گزشتہ انبیاء پر شاہد ہیں جو خود اپنی امت کے گواہ تھے:

"فکیف اذا جفنا من کل امۃ بشہید و جئنا بک علیٰ حطو لاد شہیداً"
"اس دن ان کی حالت کیسی ہوگی جس دن ہم ہر امت کے لیے ان کے اعمال پر گواہ طلب کریں گے اور آپ کو ان کے اعمال پر گواہ قرار دیں گے؟" (نساء ۴۱)

اور تیسری طرف آپ اپنے وجود مقدس، اوصاف حمیدہ، اخلاق حسنہ، اصلاحی پروگرام، روشن باطنی اور اعمال صالح کی وجہ سے اپنے مکتب کی حقانیت اور پروردگار کی عظمت و قدرت کے گواہ ہیں۔

پھر دوسری اور تیسری صفت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا "ہم نے آپ کو بشارت دینے اور ڈرانے والا قرار دیا ہے" (و ہمیشہ تو تذکرہ)۔

نیک لوگوں کو پروردگار عالم کے بے انتہا اجر و مہیشہ کی سعادت و سلامتی اور قابض فخر کا میانی کا مرانی کی بشارت یعنی خوش خبری

دینے والا اور کفار و منافقین کو خدا کے دردناک عذاب، تمام بڑی مہربانیوں کے منیاع اور دنیا و آخرت میں بد بختی کے گڑھوں میں جا گرنے سے ڈرانے والا۔

جیسا کہ ہم پہلے ہی کہ چکے ہیں کہ خود امید کو بجز ایک دوسرے سے ملنا اور باہم مساوی ہونا چاہیے۔ کیونکہ وجود انسانی کا ادھار حصہ تو فریاد کے حصول سے لگاؤ لگتا ہے اور دوسرا نصف حصہ نقصان سے بچنے کی خواہش رکھتا ہے۔ "بشارت کا سبب پہلا حصہ اور اندر کا سبب دوسرا حصہ ہے۔ وہ لوگ جو اپنے منصوبوں کا مول میں صرف ایک حصے پر انحصار کرتے ہیں دراصل انھوں نے انسان کی حقیقت کو سمجھا ہی نہیں ہے اور نہ ہی انھوں نے اس کی اس حرکت کے اسباب و دلیل کی طرف کوئی توجہ کی ہے۔" لہ

بعد والی آیت رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چوتھی اور پانچویں صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے۔ "ہم نے آپ کو اللہ کے حکم کے مطابق اس کی طرف دعوت دینے والا قرار دیا ہے اور روشنی عطا کرنے والا جبرائیل بھی" (و داعی الی اللہ باذنہ و سراجاً منیراً)۔

چند قابل توجہ نکات

۱۔ رسالت مآب کا مقام شہود: آپ کے تمام اوصاف سے پہلے آیت میں اس مقام کا ذکر ہوا ہے کیونکہ یہ مقام صرف پیغمبر کے وجود اور ان کی رسالت کا محتاج ہوتا ہے اس کے علاوہ اسے کسی قسم کے تشبیہ اور مقصد کی ضرورت نہیں ہوتی اور جس وقت آپ اس مقام و منزلت پر منصوب ہو جائیں گے تو آپ کا ذکر ہوا بالاجبات سے شاہد ہونا مسلم ہو جائے گا، البتہ مقام "بشارت" و "انذار" دو ایسے مقامات ہیں جو اس کے بعد وجودی صحت اختیار کرتے ہیں۔

۲۔ خدا کی طرف دعوت کا مرحلہ: کہنے کا ذریعہ ہے۔ جب ترغیب اور تنبیہ کے ذریعے حق کو قبول کرنے کی آمادگی پیدا ہو جائے گی تو پھر خدا کی طرف دعوت شہد ہوگی، اور صرف ایسے ہی مقام پر دعوت مؤثر ہوگی۔

۳۔ دعوت اذن الہی سے: باوجودیکہ آنحضرت کے تمام کام خدا کے اذن و فرمان سے انجام پاتے ہیں لیکن یہاں پر صرف دعوت کو اذن پروردگار سے مقید کیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء کا شکل ترین اور اہم ترین کام کی طرف

دعوت دینا ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ لوگوں کو ان کی خواہشات نفسانی کے برعکاس صحیح راستے پر چلانا ہوتا ہے۔ لہذا اس مرحلے پر خدا کے اذن و فرمان اور مادی و دنیوی امور کا مشاغل مال ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنے صحیح انجام کو پہنچے۔ منجانبہ بھی واضح ہونا چاہیے کہ پیغمبر اپنی طرف سے نہیں بلکہ جو کچھ کہتے ہیں، اذن خدا سے کہتے ہیں۔

۱۔ اس سلسلے میں سورہ بقرہ کی آیت ۱۱۹ کے ذیل میں ہم تفصیل برفہ دور ہم زبانی اصول کے عنوان سے کہ چکے ہیں، (مجاہد و دیگر)

۲۔ یہ احتمال ہے کہ "بشارت" کی قید گزشتہ تمام اوصاف کی طرف لٹوتی ہو۔ لیکن آیت کا ظاہر یہ بتاتا ہے کہ صرف "داعی الی اللہ" کی طرف لٹوتی ہے۔

۲۔ آپ کا سراج منیر ہونا، سراج کا معنی "چراغ" اور "منیر" کا معنی "نور افشاں" ہے اور پیغمبر گرامی کے معنات معانی کے دلائل اور دعوت کی صداقت کی نشانیوں کی طرف اشارہ ہے۔ وہ ایسا روشن چراغ ہے جو اپنا گواہ خود آپ سے تاریکیوں کو دور کرتا ہے اور آنکھوں اور دلوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ جس طرح آفتاب آمد دلیل آفتاب ہوتا ہے، ان کا وجود بھی ان کی حقیقت کی دلیل ہے۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید میں چار مرتبہ لفظ سراج آیا ہے جن میں سے تین مقامات پر "سراج" کے معنی میں آیا ہے جو سورہ نور کی آیت ۱۰ میں فرمایا گیا ہے:

« وجعل القمر فیہن نوراً وجعل الشمس سراجاً »
 "خدا نے چاند کو آسمان کا نور اور سورج کو چسراج فرمادیا ہے"

جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے کہ "سراج" اصل میں چراغ کے معنی میں ہے جو گذشتہ زمانے میں قیتلے اور مسوں کے تیل سے جلتا تھا اور جو دور میں بجلی وغیرہ کی قوت سے نور اور روشنی کا سرچشمہ ہے، لیکن معنات میں راجع کے بقول یہ لفظ تدریجاً نور اور روشنی کے ہر منبع پر یوں جلتے لگا اور سورج اس کا اطلاق اس بنا پر ہے کہ اس کا نور عوامی کے لئے ہے اور چاند کی طرح کسی اور منبع سے نور حاصل نہیں کرتا۔

پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود گرامی آفتاب تابان کی طرح ہے جو جہالت، شرک اور کفر کی ظلمتوں کو انسان کی روح کے افق سے دور کرتا ہے، لیکن جس طرح نابینا افراد سورج کی روشنی سے استفادہ نہیں کر سکتے اور جس طرح چمکا ڈر کی آنکھیں اس روشنی کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتیں اور وہ اس سے اپنے آپ کو چھپائے رکھتی ہے، وہی طرح دل کے اندر سے اور سٹ و دھم افراد بھی اس نور سے کبھی استفادہ نہیں کر سکتے۔ نہ پہلے اور نہ اب اور ابوجہل جیسے لوگ اپنی آنکھیاں کانوں میں مٹھو لیتے ہیں تاکہ رسول پاک کے قرآن پڑھنے کی آواز نہ سن سکیں۔ ہمیشہ ظلمت اور تاریکی اضطراب اور وحشت کا سبب ہوتی ہے، جبکہ نور اور روشنی سکون اور اطمینان کا باعث چھدرات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور بیابان کے درختوں سے عام طور پر رات ہی کی تاریکی میں ایسے ٹھکانوں سے باہر آتے ہیں۔

تاریکی انتشار کا سبب ہے اور نور اجتماع کا باعث ہے۔ اسی بنا پر اگر کسی تاریکی حالت میں بیابان کے اندر ایک چراغ روشن کر دیا جائے تو ٹھوڑی دیر میں انواع و اقسام کے حشرات اس کے گرد جمع ہو جائیں گے۔

روشنی اور نور درختوں کی نشوونما، پھولوں کی پرورش، پھولوں کے پکنے وغیرہ تمام حیاتی فعلیتوں کا سرمایہ ہے۔

وہت پیغمبر کو ایک منبع نور کے ساتھ تشبیہ دینا ان تمام مفہیم کو ذہن میں منقش کر دیتا ہے۔

آپ کا وجود گرامی باعشر سکون ہے، دین و ایمان کے چوروں اور معاشرے کے بے رحم مگر بھیڑیوں کے بھاگ جانے کا سبب ہے، دل کی تسلی کا سرمایہ اور ایمان و اخلاق کی روحانی پرورش اور نشوونما کا ذریعہ ہے۔ غرضیکہ آپ ہی کے دم قدم سے زندگی اور اس کی جہل کا مڑو ہے اور آپ کی تاریخ زندگی اس امر کا زندہ شاہد ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ زیر بحث آیات میں سے دو آخری آیتوں میں آنحضرت کی پانچ اہم ذمہ داریوں کو بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ

آپ کی پانچ صفات بیان کرنے کے بعد، پہلے مرحلے پر فرمایا گیا ہے۔ "مؤمنین کو بشارت دیجئے کہ ان کے لیے خدا کی طرف سے فضل اور عظیم اجر ہے، اور لبش المؤمنین بان لہم من اللہ فضلاً کبیراً"۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پیغمبر کی بشارت کا مسئلہ صرف نیک مویشی کے اعمال کے محدود جزا تک ہی محدود نہیں بلکہ خداوند عالم ان پر اپنے فضل و کرم کی اس قدر بخشش کرے گا کہ عمل اور اجر کے درمیان توازن کا معیار بالکل بدل جائے گا، جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات اس پر شاہد ماثق ہیں۔ قرآن یک جگہ فرماتا ہے: "من جاد بالحسنۃ فلہ عشر مثالیھا" (انعام- ۱۲۰)

قرآن دوسری جگہ فرماتا ہے،

« مثل الذین ینفقون اموالہم فی سبیل اللہ کمثل حبۃ انبثت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ واللہ یضاعف لمن یشاء »
 (بقرہ/ ۲۶۱)

جس کے مطابق کبھی راہِ خدا میں خرچ کرنے کا اجر سات سو گنا اور کبھی ہزار گنا سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات ثواب اس سے بھی اور بڑھا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے:

« فلا تحلفوا نفس ما اخف لہم من قرۃ اعین »
 کوئی شخص نہیں جانتا کہ کس قدر ثواب اس کے لیے چھپا کر رکھا گیا ہے۔ جو ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا باعث ہوگا۔ (المحمدہ/ ۷)

اس طرح سے خدا کے ایک فضل و کرم کی طرف نشاندہی کی گئی ہے جو کسی کے دہم و گمان میں نہیں آسکتا بلکہ اس سے بھی بڑھ تراور بالاتر ثواب کی نشان دہی کی گئی ہے۔

قرآن اس کے بعد دوسرے اور تیسرے حکم کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: "کفار اور منافقین کی اطاعت نہ کرو، ولا تقطع الکافرین و المنافقین"۔

اس میں شک نہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہرگز کفار اور منافقین کی اطاعت نہیں کرتے تھے، لیکن معاملہ اس قدر اہم ہے کہ تاکید تو پیغمبر کو کی جا رہی ہے لیکن تشبیہ دوسروں کو۔ کیونکہ پیغمبر دوسروں کو رستے میں جو اہم خطرات ڈیریش ہوتے ہیں وہ یا تو بڑے بازی ہوتی ہے اور یا پھر سختبار ڈال دینا ہوتی ہے اور ان خطرات کا سرچشمہ یا تو دھمکیاں ہوتی ہیں یا پھر مختلف طریقوں سے لالچ ہوتا ہے حتیٰ کہ کبھی کبھار تو انسان اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے ان دوسروں میں سے کسی ایک کو اپنا ہی لینا چاہیے، جن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دہر کی تمام صحت منافع ہو جاتی ہے اور تمام کوششوں پر اپنی چھ جاتا ہے۔

تاریخ اسلام سے پتہ چلتا ہے کہ کفار اور منافقوں کے مختلف گروہوں نے بار بار کوشش کی کہ پیغمبر اسلام کو بھی مذکورہ صورت حال سے دوچار کر دیں۔ چنانچہ کبھی تو انھوں نے کہا کہ تمہیں کو بڑا بھلا لڑکھن اور کبھی یہ پیش کش کی کہ ایک سال ہم آپ کے بیٹوں کی عبادت کریں اور ایک سال آپ ہمارے بیٹوں کی۔ کبھی کہتے تھے کہ ہمیں مزید ایک سال کھ بھلت دیں کہ اسی طرح عمل جاری رکھیں، پھر آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ کبھی پیش کش کرتے کہ آپ ان غریبوں و فقیروں کو اپنے اطراف سے ہٹا دیں تاکہ مالدار اور با اثر لوگ آپ کے ہم نوا بن سکیں۔ اور

کسی مالی امداد کی پیشکش کرتے کبھی عہد اور منصب و مقام اور خوبصورت عورتوں کی لالچ دیتے۔

ظاہر ہے کہ یہ سب چیزیں اسلام کی سریع اور تیز پیش رفت اور کفر و نفاق کی بچ کئی کی راہ میں خطرناک جال تھی، اگر آپ ان میں سے کسی کو مان لیتے، اپنی اپنی طرف سے ذرہ بجزئی اور ہبکا دکا دکا نظر کرتے تو اسلامی انقلاب کی بنیادیں متزلزل ہو جاتیں، اس کی علامت دھڑام سے گر جاتی اور آپ کی کوئی کوشش کسی بھی نتیجہ کو نہ پہنچ پاتی۔

پھر پوچھتے اور پوچھیں حکم میں فرمایا گیا ہے: "ان کے آزار اور تکلیف بخانے کی پردہ نہ کریں، خدا پر توکل کریں، اور یہی کافی ہے کہ خدا آپ کا حامی اور نافع کرنے والا ہے" (وعدہ اذا هم وتوکل علی اللہ وکفی باللہ وکفیلًا)۔

آیت کا یہ حصہ واضح کرتا ہے کہ انھوں نے پیغمبر اسلام پر چلنے اور تسلیم فرم کرنے کے لیے سخت دباؤ ڈالا اور انوارِ باقیا کے آزار و تکلیف سے دوچار کر دیا اور وہ آزار کبھی تو زبان کے ذریعے زخم لگا کر اور بزبان کر کے اور کبھی جسمانی طور پر دھکے پیچا کر، کبھی آپ کا وہ آپ کے ایمان و انصاف کا اقتصادی ماحصرہ کر کے، غرضیکہ انھوں نے اذیتیں پہنچانے کے لیے کوئی ذوقناک و زنگشت نہ کیا۔ البتہ کہہ میں قیام کے دوران اذیتوں کا طریقہ اور تھا اور مدینہ میں اور تھا۔ کیونکہ "اذی" ایک ایسا لفظ ہے جو آزار اور تکلیف کی تمام قسموں کی نشاندہی کرتا ہے۔ راجب مفردات میں کہتے ہیں کہ "اذی" ہر قسم کے ضرر کے معنی میں ہے جو کسی زندہ چیز یا اس سے وابستہ افراد کو پہنچے۔ وہ ضرر برہا ہے، جسمانی ہو یا جانی، ذہنی ہو یا اخروی۔

البتہ یہ لفظ قرآنی آیات میں خصوصیت کے ساتھ زبانی ایثار اور تکلیف پہنچانے کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورہ توبہ کی آیت ۱۱ میں ہے:

"ومنہما الذین یؤذون النبی ویقولون هو اذی"

"ان میں بعض لوگ پیغمبر کو اذیت پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ خوش بختی انسان ہیں اور ہر شخص کی بات پر کان دھرتے ہیں"

لیکن دوسری آیات میں یہ لفظ جہانی تکلیف کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورہ نسا کی آیہ نمبر ۱۱ میں ہے:

"والذان یأتیھا منکر فاذوھما"

"وہ مرد اور عورتیں جو اس بُرے عمل اذنا کا ارتکاب کرتے ہیں، انہیں آزار دو (ان پر شرعی عداوتی کرو)"

تاریخ کہتی ہے کہ رسولِ فلاحی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صدر اسلام کے مسلمانوں نے طرح طرح کی محکامہ لیف کا پابندی کی طرح ٹٹ کر تیار کیا اور کبھی کسی کے آگے نہیں ٹھکے۔ تنگ حاکم کو تسلیم نہیں کیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے مقاصد جلیلہ میں کامیاب کامران ہو گئے۔

اس مستقامت اور کامیابی کی وجہ صرف خدا پر توکل اور اس کی پاک ذات پر اکتفا تھا۔ وہ خدا جس کے ارادے کے آگے تمام مشکلات کا ذرہ ہو جاتی ہیں اور لقبیل شاعر،

اگر تیرے عالم بچند نہ جاسی شیردگی تا نخواہر خدای

"اگر ساری دنیا کی تلواریں حرکت میں آجائیں، جب تک خدا نہ چاہے، کسی کی ایک رگ بھی نہیں کاٹ سکتیں۔"

جی ہاں! انسان کا سارا اور جائے پناہ اس قسم کا خدا ہونا چاہیے اور بس!

جو کچھ ہم کہہ چکے ہیں، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ زیرِ بحث آیت کا مضمون محکم جہاد سے منسوخ نہیں ہوا۔ جیسا کہ بعض مفسرین کا خیال ہے، بلکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ آیات محکم جہاد کے کافی عرصہ بعد اور سورہ احزاب سے مستشرق واقعات کے ضمن میں نازل ہوئی ہیں اور ہر دور میں واجب العمل اور لازم الاجرا ہیں۔ تاکہ خدائی پیشوا اپنی تمام تر قریں مخالفین کے اذیت تک کاموں کو اہمیت دینے میں صرت نہ کریں۔ کیونکہ اگر وہ ان کی پردہ نہ کریں اور اپنی فعال صلاحیتیں ان کے مقابلے میں صرف کر دیں گے تو دشمن اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ کیونکہ دشمن تو چاہتا ہی ہے کہ مخالف کے اذہان و انکار کو ابھارے تاکہ اس طرح سے اس کی طاقت خراج کر دے۔ یہی وہ منزل ہے جس کا واحد عمل بے اعتنائی اور "دخ اذھاہ" واسے فرمان پر عمل درآمد ہے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ مذکورہ بالا پانچوں احکام جو آخری دو آیات میں ذکر ہوئے ہیں، ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ مؤمنین کو با ایمان قوتوں کے جذب کرنے کے لیے بشارت دینا، کفار اور منافقین سے کسی قسم کی سوسے بازی نہ کرنا اور نہ ہی ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا، ان کے آزار و تکلیف کی پردہ نہ کرنا اور خدا کی ذات پر توکل کرنا، مجموعی طور پر ان میں مقصد تک پہنچنے کا راز و راز شہید ہے اور یہ راہ حق کے راہیوں کے لیے ایک مکمل اور جامع دستور العمل ہے۔

۴۹۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ
شَطْرَ طَلْقَتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ فَمَا لَكُمْ
عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُونَهَا فَيَنْعُوهُنَّ وَسِرَّحُوهُنَّ
سَرَاحًا جَمِيلًا ۝

ترجمہ

۴۹۔ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم مؤمن عورتوں کے ساتھ نکاح کرو، اور ہم بستر ہونے سے پہلے انہیں طلاق دے دو تو تمہاری وجہ سے ان پر کوئی عِدَّت نہیں ہے کہ جس کا تم حساب رکھو، انہیں مناسب ہدیہ دے کر شائستہ طریقے سے رخصت کر دو۔

تفسیر

طلاق کے کچھ احکام:

اس سورہ (احزاب) کی آیات کو صاف طور پر مختلف حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے بعض میں تو بیعتِ بستر کو خطاب کیا گیا ہے اور بعض میں تمام مؤمنین کو۔ اسی لیے کبھی "يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ" آیا ہے تو کبھی "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا" ان آیات میں لازمی احکام ایک دوسرے کے مقابلے میں آئے ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ پیغمبر کی ذات بھی ان احکام میں موردِ نظر تھی اور تمام مؤمنین بھی۔

زیر نظر آیت ان میں سے ہے، جن میں روئے سخن سب اہل ایمان کی طرف ہے، جبکہ گذشتہ آیات میں ظاہر دے سخن صرف رسول کریم کی طرف تھا اور پھر آئندہ آیات میں دوبارہ پیغمبر کو خطاب کی نوبت آئے گی اور اس سے "لف ونشررتباً"

کی اصطلاح کے مطابق اس سورہ کا ایک حصہ تشکیل پاتا ہے۔

خدا داتا ہے: "اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، جس وقت ایمان دار عورتوں سے نکاح کرو اور ہم بستی سے پہلے ہی انہیں طلاق دے دو تو تمہاری وجہ سے ان پر کوئی عِدَّت نہیں ہے کہ جس کا حساب تم بے نظر رکھو؛ (یا ایہا الذین آمنوا) اذا نكحتم المؤمنات شطراً لطلاقتموهن من قبل ان تمسوهن فمالکم علیہن من عدۃ تعتدونہا)۔

یہاں پر خدا مطلقہ عورتوں کی عِدَّت کے حکم میں ایک استثناء بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ اگر دخول سے پہلے طلاق واقع ہو جائے تو پھر عِدَّت رکھنا ضروری نہیں ہے۔ اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت سے پہلے عِدَّت کا حکم بیان ہو چکا ہے۔

"مؤمنات" کی تعبیر اس بات کی دلیل نہیں کہ غیر مومن یا غیر مسلم عورتوں سے نکاح کلی طور پر ممنوع ہے۔ جو سکتا ہے یہ ان کی اولیت کی طرف اشارہ ہو، اسی بناء پر یہ آیت کتابیہ عورتوں سے نکاح متوقف (متحد) کی روایات اور مشہور فقہاء کے فتاویٰ سے متصاف نہیں ہے۔

یاد رہے کہ "لکم" (تمہارے لیے) اور اسی طرح "تعتدونہا" (عِدَّت کا حساب کرتے ہو) کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے عورت کا عِدَّت رکھنا دراصل مرد کا ایک قسم کا حق شمار ہوتا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے۔ ایونکو جو سکتا ہے کہ عورت واقع میں ماملہ ہو، اور عِدَّت کو ترک کر کے دوسرے مرد سے ازدواج سبب بن جائے کہ بچے کی کیفیت فیروانج ہو، لہذا مرد کا حق پامال ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ عِدَّت کا ایک اور فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے مرد اور عورت دونوں کو اس بات کی فرصت مل جائے گی کہ اگر طیش اور غصے کی وجہ سے نوبت طلاق تک جا پہنچی ہو تو وہ اس عِدَّت میں اپنے اس فیصلے پر نظر ثانی بھی کر سکیں۔ یہ عورت اور مرد دونوں کا حق ہے۔

رہا یہ اعتراض جو بعض لوگ کرتے ہیں کہ اگر عِدَّت مرد کا حق ہے تو اس کو ساقط بھی کیا جاسکتا ہے۔ ان کا یہ اعتراض ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ فقہ میں بہت سے ایسے حقوق ہیں، جن کو ساقط نہیں کیا جاسکتا۔ مثل اس حق کے جو میت کے لہانہ گان کو اس کے مال میں مائل ہوتا ہے یا وہ حق جو فقراء کو زکوٰۃ میں حاصل ہوتا ہے، ان میں سے کسی ایک کو بھی ساقط نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے بعد ان عورتوں کے احکام میں سے ایک اور حکم کو بیان کرتا ہے، جن کو ہم بستی سے پہلے طلاق ہو جائے۔ اس کی کتبِ صحیحہ بقرہ میں بھی اشارہ ہو چکا ہے، فرمایا گیا ہے: انہیں مناسب ہدیہ کے ساتھ، بہرہ مندرک (فخشوہن)۔

اس میں شک نہیں کہ عورت کو مناسب ہدیہ دینا اس مقام پر واجب ہوتا ہے، جہاں اس کے لیے مہر معین نہ ہوگا ہو۔ جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۳۶ میں آیا ہے:

"لا جناح علیکم ان طلقتم النساء ما لم تمسوهن او تغروهن فربما یتدبروا فربما یتدبروا"

تم پر گناہ نہیں ہے کہ اگر تم عورتوں سے اختلاط سے قبل یا تعین مہر سے پہلے کسی وجہ سے طلاق دے دو،

لیکن اس موقع پر انہیں مناسب ہدیہ کے ساتھ بہرہ مندرک۔

اسی بناء پر زیر بحث آیت اگرچہ مطلق ہے اور ایسے مواقع میں اس میں شامل ہیں، جن میں مہر کا تعین ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ لیکن

۳۰۔ بقرہ کی آیت کے تفسیر سے موجودہ آیت کو ایسے موقع کے لیے مخصوص کیا جائے گا، جہاں مہر مقرر نہ ہوا ہو۔ کیونکہ اگر مہر معین ہو گا لیکن ذوق نہ ہو تو آدھا مہر ادا کرنا واجب ہے (جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۳۴ میں آیا ہے)۔

لیکن بعض مفسرین اور فقہانے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ ”مناسب ہدیہ دینے“ کا حکم موجودہ آیت میں ایک عمومی حکم ہے جہاں تک کہ وہ مواقع بھی شامل ہیں، جن میں مہر مقرر کیا گیا ہے، البتہ اگلے مواقع پر مستحب ہوتا ہے اور جن مقامات پر مقرر نہیں کیا گیا وہاں پر واجب ہوتا ہے، چنانچہ بعض آیات اور روایات میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

اور اس ہدیے کی مقدار کیا ہونی چاہیے؟ قرآن مجید اسے اجمالاً بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”مناعا بالمعروف“

”مناسب ہدیہ“ (بقرہ ۲۳۶)

اسی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے:

”علی الموسع قدرہ وعلی المقتر قدرہ“

جو شخص استطاعت رکھتا ہے اس کی استطاعت کے مطابق جو تنگ دست ہے اس کی اپنی استطاعت کے مطابق۔

اسی بنا پر اگر اسلامی روایات میں گھر، ملازم اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کا ذکر آیا ہے، یہ اس کیلئے کے مصداق ہیں جو شوہر کی استطاعت اور بیوی کے حالات کے مطابق مختلف ہوتے ہیں۔

اسی آیت کا آخری حکم یہ ہے کہ ”مطلقہ عورتوں کو مناسب طریقے پر رخصت کر دو اور ان سے اپنے انداز میں عدائی اختیار کرو“۔ (دوسرے سوا حجاب جیل)۔

”سراج جمیل“ کا معنی ہے محبت و احترام کے ساتھ علیحدہ کر دینا اور ہر قسم کی سختی، ظلم اور بے احترامی سے اجتناب کرنا۔ خلاصہ یہ کہ جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۳۶ میں آیا ہے کہ بیوی کو یا تو مناسب طہ پر اپنے پاس رکھنا چاہیے یا پھر نیر و خوبی کے ساتھ اسے رخصت کر دینا چاہیے؛

”فامساک بمعروف او تسریح باحسان“

زوجیت کو برقرار رکھنا بھی انسانی معیار کے مطابق ہونا چاہیے اور ایک دوسرے سے علیحدگی اور عدائی بھی۔ نہ یہ کہ یہ

۵۵۔ مثلاً سورہ بقرہ کی آیت ۲۳۱ اور اس سلسلے کی متعدد روایات و مسائل الشیعہ کی کتاب ”مناح“ کے ”ابواب ہجرت“ میں سے باب ۵۰ (جلد نمونہ) میں بھی موجود ہیں، نمونہ ان کے ایک روایت میں مختصر عمل عدالت ملام فرماتے ہیں:

”لکل مطلقہ متعة الا المتلعة“

ہر مطلقہ کے لیے مناسب ہدیہ ہونا چاہیے، سوائے اس عورت کے جو اپنا مہر یا کوئی اور چیز دے کر طلاق لینے میں اپنے شوہر کی رضامندی حاصل کرتی ہے۔

شوہر علیحدگی کا ارادہ کرے تو اپنی بیوی کے بارے میں ہر قسم کی بے مہربانی، ظلم و زیادتی، بدزبانی، سختی و درشتی کا مظاہرہ کرے، کیونکہ یہ یقیناً غیر اسلامی طریقہ کار ہے۔

بعض مفسرین نے ”سراج جمیل“ کو اسلامی تقاضوں کے مطابق طلاق انجام پانے کے معنی میں لیا ہے اور جو روایت علی بن ابراہیم کی تفسیر اور ”عیون الاخبار“ میں آئی ہے، اس میں بھی یہی معنی بیان ہوا ہے۔ لیکن یہ بات مہربانہ ہے کہ ”سراج جمیل“ اس معنی میں محدود نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس کا ایک واضح مصداق ہے۔

بعض دوسرے مفسرین نے ”سراج جمیل“ کو گھر سے باہر جانے کی اجازت اور نقل مکانی کے معنی میں سمجھا ہے۔ کیونکہ یہاں عورت عدالت رکھنے کی پابند نہیں ہے۔ اسی بنا پر اس کو آزاد چھوڑ دینا چاہیے، تاکہ وہ جہاں جانا چاہے جا سکے۔

لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ”سراج جمیل“ اور اس قسم کی دوسری تعبیرات قرآن کی دوسری آیات میں سختی کہ ان عورتوں کے بارے میں بھی جنہیں عدالت گزارنی چاہیے وارد ہوئی ہیں۔ لہذا یہ محض تعبیر نظر آتا ہے۔

”سراج“ کے اصل اور لغوی معنی کے سلسلہ میں اور یہ کہ وہ کیوں متعارف اطلاقات میں چھوڑ دینے اور طلاق دینے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اسی سورہ (احزاب) کی آیت ۲۸ کے ذیل میں ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

۵۔ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ الَّتِي
 آتَيْتَ أَجُورَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا
 آفَاءَ اللَّهِ عَلَيْكَ وَبَنَاتٍ عَمَّكَ
 وَبَنَاتٍ خَالَكَ وَبَنَاتٍ خَالَتِكَ الَّتِي
 هَاجَرْنَ
 مَعَكَ وَامْرَأَةً مُؤْمِنَةً إِنْ
 وَهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ
 إِنْ أَرَادَ النَّبِيُّ أَنْ يَسْتَنْكِحَهَا
 خَالِصَةً لَكَ مِنْ
 دُونِ الْمُؤْمِنِينَ قَدْ عَلِمْنَا مَا
 أَنْفَضْنَا عَلَيْهِمْ
 فِي أَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ
 أَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا
 يَكُونَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ۗ وَكَانَ
 اللَّهُ عَفُورًا رَحِيمًا

ترجمہ

۵۔ اے پیغمبر! ہم نے آپ کی ان بیویوں کو حلال کیا ہے، جن کا حق مہر آپ
 ادا کر چکے ہیں اور اسی طرح وہ کنیزیں جو غنیمت کے ذریعے ہم نے آپ کو
 بخشیں ہیں اور آپ ان کے مالک ہوئے ہیں آپ کے چچا کی بیٹیاں، بھوپھیوں کی بیٹیاں، مائٹوں کی
 بیٹیاں اور خالوں کی بیٹیاں کہ جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہے،
 اور جس وقت کوئی باایمان عورت خود کو پیغمبر کے لیے بہہ کر دے (اپنے لیے مہر
 کا تقاضا نہ کرے) نبی چاہے تو اس سے بیاہ کر سکتے ہیں، لیکن اس قسم کا نکاح صرف

آپ کی ذات کے لیے جائز ہے نہ کہ دوسرے مومنین کے لیے۔ ہمیں معلوم
 ہے کہ ان کے لیے ہم نے ان کی بیویوں اور کنیزوں کے بارے میں کون سا حکم
 مقرر کیا ہے (اور ان کی مصلحت کس بات کا تقاضا کرتی ہے) یہ اس بنا پر ہے
 تاکہ (دادائے رسالت میں) آپ کسی مشکل سے دوچار نہ ہوں، اور خدا بخشنے والا، اور
 بڑا مہربان ہے۔

تفسیر

آپ کے لیے کن عورتوں سے نکاح جائز ہے؟

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس سورہ کی آیات کا ایک حصہ پیغمبر اسلام اور ان کی ذمہ داریوں کو "لف و نشر مرتب" کی
 صورت میں بیان کرتا ہے، لہذا گذشتہ آیت میں عورتوں کو طلاق دینے کے سلسلے میں کچھ احکام ذکر کرنے کے بعد یہاں
 روئے سخن نبی پاک کی طرف کرتے ہوئے سات ایسے مواقع کو بیان کیا گیا ہے، جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
 کے لیے نکاح جائز ہے۔

۱۔ پہلے فرمایا گیا ہے۔ اے پیغمبر! ہم نے آپ کے لیے آپ کی بیویوں کو حلال کیا ہے، جن کا حق مہر آپ ادا کر
 چکے ہیں (یا اذہا النبی انما احللنا لک ازواجک السلاتی اتیت اجورہن۔)

ان بیویوں سے مراد بعد واسے عجلوں کے قرینے کے مطابق وہ عورتیں ہیں جن کی پیغمبر اکرم کے ساتھ کسی قسم کی رشتہ داری
 نہیں تھی، لیکن انہوں نے آپ سے نکاح کیا اور شاید حق مہر ادا کرنے کا مسئلہ بھی اسی بنا پر تھا، کیونکہ رسم یہ تھی کہ غیر رشتہ داروں
 میں شادی کے موقع پر حق مہر نقد ادا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں حق مہر ادا کرنے میں جلدی کرنا خصوصاً اس صورت میں جب بیوی
 کو اس کی ضرورت ہو، بہتر ہے لیکن واجب نہیں ہے اور طرفین کی باہمی رضامندی کی صورت میں شوہر کے ذمہ سائے کا سارا
 یا کچھ حصے کی ادائیگی طوتی بھی کی جاسکتی ہے۔

۲۔ "وہ کنیزیں جو غنائم اور انفال کے ذریعے خدائے آپ کو بخشیں ہیں اور وہ مملکتیں ہیں" (۱۲) احزاب - د

"افاء اللہ" = فہ (۱) (بروزن شہد) کے مادہ سے ہے اور ایسے مال کو کہا جاتا ہے جو بغیر مشقت کے ہاتھ
 آئے۔ اسی لیے جنگی غنیمتوں اور اس طرح انفال (قدرتی وسائل دولت، جو اسلامی حکومت کی ملکیت ہوتے ہیں اور ان

کا کوئی فرد واحد مالک نہیں ہوتا، پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

راغب مفردات میں کہتے ہیں "فی" بازگشت اور اچھی حالت کی طرف لوٹنے کے معنی میں ہے اور اگر "باریہ" کو "فی" کہا جاتا ہے تو اس لیے کہ وہ برگشت اور لوٹنے کی حالت رکھتا ہے، آگے چل کر کہتے ہیں، بغیر کسی تکلیف اور محنت و مشقت کے عامل شدہ مال کو بھی "فی" کہتے ہیں، کیونکہ وہ اپنی تمام خیر و خوبی کے باوجود بھی سائے کی مانند عارضی اور ختم ہونے والا ہوتا ہے۔

یہ ٹیک ہے کہ جنگی غنائم میں کبھی کبھی زحمت اور شہقت زیادہ اٹھانا پڑتی ہے۔ لیکن چونکہ پھر میں دوسرے اموال کی نسبت سرور دی و شہقت تھوڑی ہوتی ہے اور بعض اوقات بہت سے اموال ایک سلسلے میں ہاتھ آجاتے ہیں، لہذا انہیں "فی" کہتے ہیں۔ کیا یہ حکم حضرت کی ازواج میں سے کس کے بارے میں صادق آتا ہے؟ اس ضمن میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آپ کی بیویوں میں سے ایک باریہ قبیلہ غنائم میں سے اور دوسری ازواج "صفیہ" اور "جویریہ" انفال میں سے تھیں جنہیں پیغمبر اکرم نے غلامی کی تہ سے آزاد کر کے اپنی زوجیت کے لیے قبول فرمایا اور غلاموں کو تدریجاً آزاد کرنے اور ان کا انسانی مقام ان کی طرف لوٹانے کے لیے یہ امر بذات خود اسلام کے عوسی پر و گراموں کا ایک جہتہ تھا۔

۳۔ "آپ کے چچا کی بیٹیاں، پھوپھیوں کی بیٹیاں، ماموں اور خالوں کی بیٹیاں، جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہے، یہ بھی آپ پر طلال ہیں اور بنات عتق و بنات عماتک و بنات خالک و بنات خالاتک الملاقیٰ حاجرن معاک۔"

تو اس طرح سے تمام رشتہ داروں میں سے صرف چچا زاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد اور خال زاد و عورتوں سے اس شرط کے ساتھ ازواج جائزہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہجرت کی ہے۔

ان چچا زادوں میں محدودیت واضح ہے، لیکن "مہاجرہ" کی شرط اس لیے ہے، کیونکہ اس زمانہ میں ہجرت ایمان کی دلیل تھی اور ہجرت نہ کرنا کفر کی۔ یا اس بنا پر ہے کہ ہجرت انہیں زیادہ اعزاز دیتی تھی اور آیت میں بھی ان عالی مقام اور صاحب فیلت عورتوں کو بیان کرنا مقصود ہے جو آپ کی زوجیت کے لیے مناسب اور موزوں ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چاروں مواقع جو ایک کلی حکم کے طور پر آیت میں ذکر ہوئے ہیں، آیا پیغمبر کی بیویوں میں صدق خارجی بھی رکھتے ہیں یا نہیں؟ صرف ایک مقام جسے ذکر کیا جا سکتا ہے، وہ ہے آپ کا اپنی پھوپھی زاد زینب بنت جحش کے ساتھ نکاح، جس کی داستان اسی سورہ میں گزر چکی ہے، کیونکہ جناب زینب، جحش کی بیٹی تھیں اور عیش آنحضرت کی پھوپھی کا شوہر تھا۔

۱۔ بیان پر "م" مفرد اور "عمات" جمع کی صورت میں آیا ہے اسی طرح "خال" مفرد اور "خالات" جمع آیا ہے۔ مفسرین نے اس کی تہی و تہا بیان کی ہیں، جن کو فاضل مقداد نے کنز العرفان میں بھی نقل کیا ہے، لیکن سب سے بہتر وجہ یہ ہے کہ "عم" اور "خال" عام طور پر بنت حرب میں ہم نہیں کی صورت میں استعمال ہوئے ہیں۔ جبکہ "عمہ" اور "خالہ" اس طرح نہیں ہیں اور بہا، ہالفت کا عام طریقہ ہے۔ (تہیہ ماسئد اگے صلو پر)

۲۔ "تجس وقت کوئی ایمان دار عورت اپنے آپ کو پیغمبر کے لیے بہرہ کر دے (اور اپنے لیے کسی قسم کے حق مہر کا مطالبہ نہ کرے)، اگر پیغمبر یا میں تو اس سے عقد کر سکتے ہیں اور امراة مؤمنہ ان و ہبت نفسہا للنبی ان اراد التبیح ان یستنکحہا۔"

"لیکن اسے پیغمبر! اس قسم کا نکاح صرف آپ کے لیے جائز ہے نہ کہ باقی مومنین کے لیے؛ (خالصۃ لک من دون المؤمنین)۔"

"ہم جانتے ہیں کہ ہم نے ان کے لیے ان کی بیویوں اور کنیزوں کے بارے میں کون سا حکم مقرر کیا ہے اور ان کی مصلحتوں کا کیا تقاضا ہے؟ (قد علمنا ما فرضنا علیہم فی ازواجہم و ما ملکت ایمانہم)۔"

اسی بنا پر اگر ہم نکاح سے متعلق کچھ مسائل میں ان کے لیے بعض مواقع پر پابندی لگا دیتے ہیں تو اس کی بھی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے اور ان میں سے ہر ایک حکم اور قانون باقاعدہ حساب کتاب کے تحت ہے۔

پھر فرمایا گیا ہے: یہ اس بنا پر ہے کہ (فرعینہ رسالت کی ادائیگی کے سلسلے میں) آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو (اور آپ اس فریضہ کی بجائے آدری میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کر سکیں)؛ (لکیلا یکون علیک حرج)۔

"اور خدا بخشنے والا رحیم ہے؛ (وکان اللہ غفوراً رحیماً)۔"

چند اہم نکات

۱۔ رسول اللہ کی ایک خصوصیت: اس میں شک نہیں کہ حق مہر کے بغیر بیوی بنانے کی اجازت صرف پیغمبر اکرم کو ہے اور یہ آپ کے عنقادات میں سے ہے اور آیت بھی اس سلسلے میں بالکل واضح ہے۔ اسی بنا پر کوئی شخص یہ حق نہیں رکھتا کہ وہ کسی عورت سے مہر (تھوڑا ہو یا زیادہ) کے بغیر عقد کرے۔ حتیٰ کہ اگر

صیغہ عقد جاری کرتے وقت حق مہر کا ذکر نہ کیا گیا ہو اور کسی قسم کا قرینہ بھی نہ ہو تو "مہر المثل" دینا چاہیے۔ "مہر المثل" سے مراد وہ حق مہر ہے جو اس عورت کے مختلف نوعیتوں کے تحت عام طور پر اپنے لیے مقرر کرتی ہیں۔

۲۔ اس حکم کا خارجی مصداق: اس کلی حکم نے پیغمبر اسلام کے بلے میں کوئی خارجی مصداق بھی پیدا کیا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض مفسرین مثلاً ابن عباس اور کچھ دیگر

حضرات کا نظریہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کیفیت کے ساتھ کسی عورت سے نکاح نہیں کیا اور مذکورہ بالا حکم آپ کے لیے ایک ایسا کلی حکم تھا، جس سے کسی بھی استفادہ نہیں کیا گیا۔ جبکہ بعض دوسرے مفسرین نے آپ کی ان تین چار ازواج کا نام لیا ہے، جو بغیر حق مہر کے آپ کی زوجیت میں آئیں۔ وہ "میمنہ بنت حارث" اور "زینب بنت خزیمہ" جن کا تعلق

(کچھ صوفاہی ماسئد) جسے ابن العربی نے بھی نقل کیا ہے (دیکھو کنز العرفان جلد ۲ ص ۲۳۱) اور آلوسی نے رد المحتار میں بھی اس وجہ کو باقی تمام درجات پر ترجیح دی ہے۔

انصار سے تھا، بنی اسد کی ایک خاتون "ام شریک بنت جابر" اور "خولہ بنت حکیم" تھیں۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ جب خولہ نے اپنے آپ کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بخش دیا تو جناب عائشہ کی احتجاج بلند ہوئی اور انھوں نے کہا:

" ما بال النساء يبذلن أنفسهن بلا مهر "

ان عورتوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ حق مہر کے بغیر اپنے آپ کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیتی ہیں؟

تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی لیکن جناب عائشہ نے حضرت رسالت مآب سے کہا:

" معلوم ہوتا ہے کہ انہی آپ کے مقصد کو بہت جلد پورا کر دیتا ہے تاہم آپ پر ایک قسم کی طنز تھی۔ "

تو آنحضرتؐ نے فرمایا:

" وانك ان اطعت الله سارع في حوالك "

" اگر تم بھی خدا کی اطاعت کرنے لگ جاؤ تو وہ تمھارے مقصد کو بھی جلد پورا کر دے گا۔ "

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی خواتین تو صرف روحانی اعزاز حاصل کرنے کی خواہاں تھیں، جو صرف رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہی نہیں حاصل ہو سکتا تھا۔ اس لیے وہ بغیر کسی حق مہر کے آپ کی زوجیت کے لیے آمادہ ہو گئیں، لیکن جیسا کہ ہم نے ابھی کہا ہے کہ تاریخی طور پر اس قسم کا خارجی مصداق مسلم نہیں ہے۔ جو چیز مسلم ہے وہ صرف یہ کہ خدا نے پیغمبر اکرم کو اس قسم کی اجازت دے رکھی تھی یا یہ سوال کہ اس کا فلسفہ کیا تھا؟ تو اس کی طرف بعد میں اشارہ ہو گا۔

۳۔ **ہبہ اور صبغہ کا نکاح**۔ اس آیت سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ صبغہ نکاح کا اجراء لفظ "ہبہ" کے ساتھ صرف ہے۔ ہبہ اور صبغہ کا نکاح: ہبہ کے ساتھ مخصوص تھا اور دوسرا کوئی بھی شخص اس قسم کے لفظ سے عقد نکاح جاری نہیں کر سکتا لیکن اگر عقد کا اجراء نکاح کے لفظ کے ساتھ انجام پائے تو ہبہ جائز ہے کہ حق مہر کا نام نہ لیا جائے، کیونکہ جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ حق مہر کے ذکر نہ کرنے کی صورت میں "مہر المثل" ادا کرنا چاہیے۔ (جس کی حقیقت وہی ہے جو مہر المثل کی تصریح میں گزر چکی ہے)۔

۴۔ **تعدد ازواج کا فلسفہ**: مذکورہ بالا آیت کا آخری جملہ واقع میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان مخصوص احکام کے فلسفہ کی طرف اشارہ ہے۔ وہ یہ کہ پیغمبر کے کچھ ایسے مخصوص حالات ہوتے ہیں جو دوسروں کے نہیں ہوتے اور یہی فرق بعض دوسرے احکام میں بھی فرق کا سبب بن جاتا ہے۔

لہٰذا تفسیر مجمع البیان ہی آیت کے ذیل میں تفسیر کر رہی ہیں جہاں لکھا ہے:

" والله ما أدى ريثك الا يسارع في حوالك "

" خدا کی قسم میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ خدا نے آپ کی کسی خواہش کو جلد پورا کر دیا ہو۔ "

اور آگے اسی نے "روح المعانی" میں مذکورہ آیت کے ذیل میں ذکر کیا ہے، چنانچہ اس قسم کی نامناسب اور بھیجی ہوئی گفتگو کا منہمک کسی پر پوشیدہ نہیں

آنحضرتؐ اپنی عظمت اور جلالتِ ہدٰی کے لیے اس موقع پر بھی بڑی خوش اسلوبی اور سادگی سے گزر جاتے ہیں۔

زیادہ واضح تفسیر میں قرآن کتابا ہے، مقصد یہ تھا کہ کچھ ان احکام کے ذریعے پیغمبر کے کاندھوں سے پابندیاں اور مشکلات ہٹا دی جائیں۔ یہ ایک ایسی لطیف تعبیر ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم کا متعدد اور مختلف قسم کی عورتوں سے شادی کرنا درحقیقت آپ کی زندگی کی اجتماعی اور سیاسی مشکلات کے ایک سلسلے کو حل کرنے کے لیے تھا۔

کیونکہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ جس وقت آنحضرتؐ نے نہ انہی اسلامِ بلند کی تو اس وقت آپؐ بیکر و تنہا تھے اور بہت مدت تک سوائے محدودے چند افراد کے آپ پر کوئی بھی ایمان نہیں لایا تھا۔ آپ اپنے زمانے اور اس دور کے تمام ہیوہ اور فضول نظریات اور عقاید کے ظلمات ڈٹ گئے سب نے جہاد کرنے کا اعلان کر دیا۔ لہٰذا فطری طور پر اس معاشرے کے تمام قبیلے اور قوم آپ کے خلاف متحد اور متفق ہو گئے۔

اب ضروری تھا کہ دشمنوں کے اس ناپاک اتحاد کو توڑنے کے لیے آپ اپنے وسائل بروئے کار لاتے جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مختلف قبائل کے ساتھ رشتہ ازدواج قائم کرتے، کیونکہ زمانہ جاہلیت کے عربوں کے درمیان حکم ترین رابطہ رشتہ داری کا رابطہ شمار ہوتا تھا اور کسی قبیلے کے داماد کو اس قبیلے والے ہمیشہ اپنے میں سے سمجھتے تھے اور اس کی حمایت کرنا اپنا فریضہ جانتے تھے اور اسے چھوڑ دینا گناہ تصور کرتے تھے۔

ہمارے پاس بہت سے قرآنی موجود ہیں جو واضح کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ کی یہ شادیاں بہت سے موارد میں سیاسی اہمیت کی حامل تھیں اور بعض شادیاں مثلاً زینب کے ساتھ ازدواج زمانہ جاہلیت کی غلط رسوم کو توڑنے کے لیے تھی جس کی تفصیل اسی آیت کی آیت ۲۴ کے ذیل میں بیان کی جا چکی ہے۔

اور کچھ دوسری شادیاں متعصب لوگوں اور سبٹ دھرم قوموں کی دشمنی میں کی گئی تھیں یا ان سے دوستی پیدا کرنے کے لیے تھیں واضح ہے کہ بخشش ۲۵ سال کی عمر میں جو کہ عنفوانِ شباب کا دور ہوتا ہے، ایک چالیس سالہ ہیوہ خاتون سے شادی کرتا ہے اور ۵۳ سال کی عمر تک اسی ہیوہ خاتون کے ساتھ ازدواجی زندگی بسر کرتا ہے اور اسی طرح وہ اپنی جوانی کی ہماری گزارنے کے بعد جب بڑھاپے کی خزاں میں قدم رکھتا ہے تو متعدد شادیاں کرتا ہے۔ تو اس کا یہ عمل یقیناً کسی فلسفے سے خالی نہیں ہے اور کسی بھی حساب سے اسے جنسی لگاؤ سے مستہم نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے باوجود کہ متعدد شادیاں اس زمانے کے عربوں میں ایک عام اور رسول کا طریقہ تھا۔ بلکہ بعض اوقات پہلی بیوی دوسری بیوی کی خواست نگاری کے لیے جایا کرتی تھی اور ازدواج کی تعداد پر کسی قسم کی پابندی نہیں تھی اور پھر آنحضرتؐ کے لیے عالم جوانی میں متعدد شادیاں کرنے سے نہ کوئی اجتماعی اور معاشرتی مسئلہ حاصل تھا نہ مالی حالت اور نہ ہی یہ کام کسی قسم کو کوئی عیب اور نقص شمار ہوتا تھا۔

پھر لطف کی بات یہ ہے کہ تاریخ میں کہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف ایک ہی باکرہ عورت سے شادی کی تھی، جن کا نام عائشہ ہے، باقی سب بیویاں ہیوہ تھیں، جو نظری طور پر جذبات کو ابھارنے کا باعث ہرگز نہیں بن سکتی تھیں۔

بلکہ عین تاریخوں میں یہاں تک بھی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عقد تو بہت سی خواتین سے ہوا۔ لیکن بات صرف یہ کہ ایک محدود رہی اور بس اسٹی کہ کئی صورتوں میں تو صرف بعض قبائل کی عورتوں کی خواستگاری کو کافی سمجھا گیا ہے۔ اس وقت وہ لوگ صرف اسی حد تک خوش تھے اور خرد مہا ہات کرتے تھے کہ ان کے قبیلہ کی کسی عورت کو پیغمبر کی زوجہ ہونے کا شرف اور اعزاز حاصل ہوا ہے۔ اس طرح سے ان کا معاشرتی تعلق پیغمبر اسلام کے ساتھ مزید محکم ہو جاتا اور وہ آنحضرت کی حمایت اور ان کا دفاع کرنے میں زیادہ مصمم ہو جاتے۔

پھر یہ کہ آنحضرت یقیناً مقیم نہیں تھے۔ اس کے باوجود آپ نے جماد الاول چھوڑی ہے وہ نہایت ہی کم ہے۔ حالانکہ اگر ان عورتوں سے یہ شادیاں جنسی جذبے کی تسکین کے لیے ہوتیں تو چاہیے تھا کہ آپ کے ہاں کثیر تعداد میں اولاد ہوتی۔ نیز یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ ان بیویوں میں سے بعض مثلاً حضرت عائشہؓ جس وقت آنحضرت کی زوجیت میں آئیں اس وقت بہت ہی کم سن تھیں اور کئی سال گزارنے کے بعد ایک بیوی ہونے کے قابل ہوئیں، تو یہ امر واضح کرتا ہے کہ اس قسم کی شادیاں سے شادی کرنے کا کچھ اور ہی مقصد تھا اور وہ وہی تھا، جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

اگرچہ دشمنان اسلام نے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متعدد ازدواج کو اپنے مطلب کا ثبوت قرار دے کر اپنے شدید ترین معاندانہ حملوں کا نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے اور کئی جھوٹے انسانے تراشے ہیں، لیکن ایک تو متعدد ازدواج کے ناسانے میں رسول اکرمؐ کی پیرائے سالی، دوسرا ان خواتین کے سن اور قبائلی کیفیت اور تیسرے وہ قرآنی بیانی ہو چکے ہیں، اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں اور منافقین کی سازشوں کو طشت از باہم کر دیتے ہیں۔

۵۱۔ تَرْجِي مَنْ تَشَاءُ مِنْهُمْ وَتُؤَيِّ إِلَيْكَ مَنْ تَشَاءُ وَمَنْ ابْتَغَيْتَ مِنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ذَلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ تَقْرَأَ عَلَيْهِمْ وَلَا يَجُزْنَ وَيَرْضَيْنَ بِمَا اتَّيَهُنَّ كَلَهُنَّ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي قُلُوبِكُمْ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَلِيمًا ۝

ترجمہ

۵۱۔ اپنی بیویوں میں سے جس کے (مقررہ وقت کو) آپ چاہیں مؤخر کر سکتے ہیں اور جسے چاہیں اپنے پاس ٹھہرا سکتے ہیں اور ان میں سے جن بعض کو آپ نے اپنے سے الگ کر دیا ہے، اگر چاہیں تو اپنے پاس جگہ دے دیں، آپ پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ خدائی حکم ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اور یہ اس بنا پر ہے کہ وہ غمگین نہ ہوں اور جو کچھ آپ انہیں دے دیں وہ اس پر راضی ہوں۔ اور خدا اس چیز کو اچھی طرح جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے اور خدا بندوں کے تمام اعمال اور ان کی مصلحتوں سے باخبر ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ علیم بھی ہے اور انہیں سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔

شان نزول

اسی سورہ کی آیت ۲۸ اور ۲۹ کی تفسیر اور ان کی شان نزول کے بیان میں معمر بن کے بقول پیغمبر اکرمؐ کی بعض بیویوں نے

آپ سے عرض کیا کہ ہمارے نان و نفقہ اور اخراجات میں اضافہ کیجئے۔ اچھو کہ ان کی نگاہ مال غنیمت پر لگی ہوئی تھی اور وہ یہ چاہتی تھیں انہیں اس سے زیادہ ملنا چاہیے اس پر مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں اور صراحت کے ساتھ ان کے گوش گزار کر دیا کہ اگر وہ دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہیں تو ہمیشہ کے لیے پیغمبر سے الگ ہو جائیں اور اگر خدا، رسول و رزقِ جزا کو چاہتی ہیں تو پھر اسی سادہ زندگی کے ساتھ نباہ کریں۔

اس کے علاوہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے اوقات کی تقسیم کے بارے میں بھی ان کے درمیان رقابت موجود تھی جو پیغمبر اکرم کریم پر لیشانیوں اور اہم مصروفیات کے ساتھ ساتھ زبردست مشکلات سے دوچار کیے ہوئے تھے اگر آپ ان کے درمیان ضروری عدالت قائم رکھتے، لیکن پھر بھی وہ بالکل سے باز نہ آتی تھیں، لہذا زیر نظر آیت نازل ہوئی اور سختی کو ان کے درمیان اپنے اوقات کی تقسیم میں پوری پوری آزادی دی گئی اور ساتھ ہی انہیں بھی خبردار کیا گیا کہ یہ خدائی حکم ہے لہذا اس سے نہ تو کسی کو پریشانی ہو اور نہ ہی اس سے کسی قسم کا غلط نتیجہ اخذ کر سکیں۔ لہ

تفسیر

ایک اور مشکل آسان ہوتی ہے؛

پیغمبر اسلام جیسا عظیم خدائی رہبر جو بہت حوادث اور مسائل میں گھرا ہوا ہو اور اس کے دشمن اس کے خلاف خطرناک داخلی اور خارجی سازشوں میں مصروف ہوں تو وہ اپنی شخصی اور خصوصی زندگی کی طرف اپنی فکر کو زیادہ مشغول نہیں رکھ سکتا۔ اسے اپنی گھریلو زندگی میں نسبتاً سکون اور آرام کا حامل ہونا چاہیے تاکہ وہ ہمیشہ مشکلات کے انہوے میں گھرا ہوا بسے ان کا سکون و اطمینان سے تلاش کر سکے۔ اگر کسی انسان کی خارجی زندگی آشفتمند و کشمکش کا شکار ہو اور گھریلو حالات بھی توجہ اپنی طرف مبذول کیے ہوئے ہوں تو ایسے طوفانی لحاظ انتہائی خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔

جیسا کہ زشتہ آیات کی تشریح میں ہم ثبوت پیش کر چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متعدد شادیاں زیادہ تر سیاسی اجتماعی اور انسانی ہمدردی کی بنا پر تھیں اور حقیقت کا رر رسالت کا ایک حصہ تھیں، لیکن اس کے باوجود بعض اوقات عورتوں کے درمیان اختلاف اور ان کی معمول کی زندگی ررقابتیں رسول اللہ کے گھر میں ایک طوفان کھڑا کر دیتیں اور آپ کی فکر و ذہن کو اپنی طرف مبذول کر لیتیں۔

یہی وہ منزل ہے، جہاں خدا اپنے پیغمبر کو ایک اور خصوصیت عطا فرماتا ہے، جس سے روزِ رزق کے جھگڑوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر کے آپ کو آسودہ خاطر اور فارغ البال کر دیا گیا۔ چنانچہ اس آیت میں ہم پڑھتے ہیں: اگر آپ چاہیں تو ان عورتوں میں سے

لے بیچ البسیان اور دوسری تغایر سے اتھماں۔

ہر ایک کے وقت کو مؤخر کر کے کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھیں تو ایسا کر سکتے ہیں اور بسے چاہیں اپنے پاس بچھ دے سکتے ہیں، ترجیحاً من تشاء ومنه و تو ووی الیٹ من تشاء۔

”ترجیحاً“ ”ارجاء“ کے مادہ سے تاخیر کے معنی میں ہے اور ”تو ووی“ ”ایواء“ کے مادہ سے کسی شخص کو اپنے پاس بچھ دینے کے معنی میں ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ تعدد ازواج کے سلسلے میں احکام اسلام کا حکم یہ بھی ہے کہ شوہر اپنے اوقات کو ان کے درمیان منصفانہ طور پر تقسیم کرے اور اگر ایک رات ان میں سے ایک کے ہاں ہے تو دوسری رات دوسری کے پاس رہے۔ اس سلسلے میں عورتوں میں کوئی تفرق نہیں ہے اور اس موضوع کو اسلامی فقہ میں ”حقِ قلم“ کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

رسول اسلام کے خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ طوفانوں اور بحرانیوں سے بھر پور زندگی کے مخصوص حالات کی بنا پر مذکورہ بالا آیت کی رُخ سے ”حقِ قلم“ کی رعایت، آیت کے ذریعے آپ سے ساقط ہو گئی تھی، خصوصاً جب آپ مدینہ میں موجود تھے۔ بیویاں بھی متعدد تھیں اور تقریباً ہر ماہ آپ کو کسی نہ کسی مسئلہ پر جگہ جگہ کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ مذکورہ آیت نے آپ کو مکمل اختیار دے دیا کہ آپ جس طرح چاہیں اپنے اوقات کو تقسیم کریں۔ لیکن اس اختیار کے باوجود آپ کو کوشش کر کے عدل و مساوات فرماتے، تاریخ اسلام میں اس کی مکمل تصریح موجود ہے۔

اس خدائی حکم سے پیغمبر اکرم کی بیویوں اور آپ کی داخلی زندگی کے ماحول کو سکون اور آرام ملا۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے: جس وقت ان میں سے بعض کو ایک طرف کر دیں اور پھر چاہیں کہ انہیں اپنے پاس بچھ دیں تو بھی آپ پر کوئی گناہ نہیں، (ومن ابتغیت من عزلت فلا جناح علیہ)۔

اس طرح سے نہ صرف یہ کہ ابتداء میں آپ کو اختیار ہے، بلکہ اسے جاری اور برقرار رکھنے میں بھی آپ کا یہ اختیار برقرار ہے اور اصطلاح کے مطابق اس اختیار کو ”تختہ استمراری“ کہتے ہیں نہ کہ ”تختہ ابتدائی“ اور اس وسیع اور کھلے اختیارات کے حامل حکم کے بعد آپ کا اپنی بیویوں کے سلسلہ میں ہر قسم کا عذر ختم ہو جاتا ہے اور آپ اپنی فکر کو مکمل طور پر رسالت کی عظیم ذمہ داریاں سنبھالنے کی طرف متوجہ کر سکتے ہیں۔

ازواجِ پیغمبر کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ انہیں رسول کی زوجہ ہونے کے اعزاز کے علاوہ ایک اور اعزاز بھی حاصل ہے اور وہ یہ کہ اوقات کی تقسیم کے سلسلے میں آنحضرت کو جو خصوصی اختیارات حاصل ہیں، وہ اس کے سامنے تسلیم فرم کر لیں، جو ایک قسم کے ایثار اور فداکاری کا کھلا ثبوت ہے اور اس طرح ان پر نہ کوئی اعتراض وارد ہو سکتا ہے اور نہ ہی یہ کوئی مجبوبات ہے۔ کیونکہ انہوں نے حکم خدا کو تسلیم کیا ہے۔ خدا فرماتا ہے: ”یہ خدائی حکم ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے ہے، اور یہ کہ کبھی ٹھنڈک نہ ہوں، بلکہ آپ جو کچھ انہیں دیں وہ سب اسی پر راضی ہوں، اذ خالک اذنی ان تقرا هیئہن ولا یحزن ویبصرن بعا انت ہیئہن کلہن۔“

کیونکہ؛

یہ ان سب کے لیے ایک عمومی حکم ہے اور اس میں کسی قسم کا فرق روا نہیں رکھا گیا۔

شائینا یہ حکم خدا کی طرف سے ہے جو نہایت اہم مصلحتوں کی بنا پر جاری کیا گیا ہے۔ اسی بنا پر انہیں یہ حکم خوش خوش قبول کر لینا چاہیے اور پریشانی کے بجائے اظہارِ مسرت کرنا چاہیے۔

لیکن اس کے باوجود جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوشش کرتے کہ تقسیم اوقات کے سلسلے میں عدل و مساوات کو مدنظر رکھا جائے۔ البتہ چند ایک موارد ایسے بھی ملتے ہیں کہ جہاں پر مساوات کو نظر انداز کر دیا گیا، لیکن اس کی سبب کچھ خاص اور ہنگامی حالات تھے اور یہ ازواجِ رسول کی خوشنودی کا ایک اور سبب تھا کہ وہ دیکھتی تھیں کہ باوجودیکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکمل اختیارات موصول ہیں، لیکن پھر بھی حتی الامکان مساوات کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آیت کے آخر میں اس سلسلہ کلام کو اس جملے پر ختم کیا گیا ہے، جو کچھ تمہارے دلوں کے اندر ہے اسے خدا جانتا ہے اور وہ بندوں کے تمام اعمال اور مصلحتوں سے باخبر ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ حکمِ علم بھی ہے اور بندوں کو عذاب و سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔

(واللہ یعلم ما فی قلوبکم وکان اللہ علیما حلیمًا)

جی ہاں خدا جانتا ہے کہ تم خدا کے کس حکم پر دلی طور پر راضی ہو اور اسے تسلیم کرتے ہو اور کس کو ناپسند کرتے ہو؟ وہ جانتا ہے کہ تم کن بیویوں کی طرف زیادہ میلان رکھتے ہو اور کن کی طرف متنوع مائل ہو؟ اور ایسے میلانات کون کونسی طرح حکمِ خدا کا ٹھوکتے ہو؟

اسی طرح وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کون لوگ پوشیدہ جگہوں میں بیٹھ کر پیغمبر کے بارے میں اس قسم کے خدائی احکام پر اعتراض کرتے رہتے ہیں اور دل میں بھی آپ پر مشرطن ہیں اور کون خندہ پیشانی کے ساتھ ان سب کو قبول کرتے ہیں۔

اس بنا پر ”قلوبکم“ کی تعبیر بہت وسیع ہے۔ اس میں پیغمبر اسلام اور ان کی بیویاں بھی شامل ہیں اور وہ تمام مومنین بھی جو ان احکام کے نئے تسلیم و رضا کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ یا اعتراض اور انکار تو کرتے ہیں لیکن اسے ظاہر نہیں کرتے۔

کیا یہ حکم آپ کی سب بیویوں کے بارے میں تھا؟

اسلامی فقہ میں خصائصِ پیغمبر کے باب میں یہ مسئلہ زیر بحث چلا آ رہا ہے کہ آیا بیویوں کے درمیان اوقات کی مساوی تقسیم پیغمبر اسلام پر بھی اسی طرح واجب ہے جس طرح دوسرے مومنین پر یا نہیں اور یا آپ استثنائی اور اختیاری حکم کے حامل ہیں؟

ہمارے تمام فقہاء اور اہل سنت کے کچھ فقہاء کے درمیان مشہور یہ ہے کہ آپ اس حکم سے مستثنیٰ تھے، اور اس کی دلیل میں وہ زیر بحث آیت کو پیش کرتے ہیں، جس میں خدا کہتا ہے:

”ترجی من تشاء منهن وتووعی الیک من تشاء“

”جیسے آپ چاہیں تاخیر میں ڈال دیں اور جسے چاہیں اپنے پاس رکھ لیں“

کیونکہ یہ جملہ پیغمبر اکرم کی تمام ازواج کے بارے میں گفتگو کرنے کے بعد آیا ہے، لہذا اس بات کا متقاضی ہے کہ جمع مؤنث کی ضمیر ”ھن“ ان سب کی طرف لوٹے اور اسی مطلب کو فقہاء اور بہت سے مفسرین نے قبول کیا ہے۔

لیکن بعض حضرات اس ضمیر کو ان بیویوں کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں، جنہوں نے حتیٰ تہ کے بغیر اپنے آپ کو رسول اللہ کے سپرد کر دیا تھا۔ حالانکہ اولاً تو تاریخی اعتبار سے یہ ثابت نہیں کہ اس حکم نے کوئی خارجی موضوع پیدا بھی کیا ہے یا نہیں؟ اور بعض کا نظریہ ہے کہ صرف ایک ہی مورد تھا جس میں صرف ایک خاتون اس صورت سے رسالتِ مآب کی زوجیت میں داخل ہوئیں، بہر حال اصل مسئلہ تاریخی لحاظ سے ثابت اور مسلم نہیں۔

ثانیاً یہ تفسیر ظاہر آیت کے خلاف ہے اور علماء نے اس آیت کی شان نزول کا جو ذکر کیا ہے، اس سے بھی مطابقت نہیں رکھتی۔ اسی بنا پر قبول کر لینا چاہیے کہ مذکورہ بالا حکم عام ہے اور سب ازواج کے بارے میں ہے۔

۵۲۔ لَا يَجِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدِ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَعْرَبْتَهُمْ إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ رَقِيبًا ۝

ترجمہ

۵۲۔ اس کے بعد آپ پر کوئی اور عورت حلال نہیں ہے اور نہ ہی آپ اپنی بیویوں کو دوسری بیویوں سے تبدیل کر سکتے ہیں کہ کسی کو طلاق دے کر دوسری بیوی کو اس جگہ لے آئیں، ہر چند ان کا حسن و جمال آپ کو بھلا لگے، سوائے ان عورتوں کے جو کینز کی صورت میں آپ کے ملک میں آجائیں اور خدا ہر چیز کا ناظر اور نگہبان ہے (اس طرح سے ہم نے قبائل کے اس دباؤ کو تجھ سے اٹھا لیا ہے کہ آپ ان کے ہاں سے بیوی کا انتخاب کریں)۔

تفسیر

ازواج رسول کے بارے میں ایک اور اہم حکم،

اس آیت میں ازواج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مربوط احکام میں سے ایک اہم حکم بیان ہوا ہے، خدا فرماتا ہے: اس کے بعد آپ پر کوئی دوسری عورت حلال نہیں ہے اور آپ کو حق نہیں پہنچتا کہ ان بیویوں کو دوسری بیویوں سے تبدیل کر لیں۔ اگرچہ ان کا حسن و جمال آپ کو بھلا لگے۔ سوائے ان عورتوں کے جو کینز کی صورت میں آپ کے اختیار

میں جائیں اور خدا ہر چیز پر ناظر اور نگہبان ہے: لَا يَجِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدِ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَعْرَبْتَهُمْ إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ رَقِيبًا ۝

مفسرین اور فقہاء نے اس آیت کی تفسیر میں بہت کچھ گفتگو کی ہے اور اسلامی مآخذ میں بھی اس بارے میں مختلف روایات آئی ہیں۔ ہم پہلے تو اس آیت کا ظاہر مطلب بیان کریں گے جو اس سے پہلے اور بعد میں آنے والی آیات کے باہمی ارتباط سے پیدا ہوتا ہے (مطلع نظر اس کے کہ مفسرین اس بارے میں کیا کہتے ہیں) پھر دوسرے مطلب کی طرف جائیں گے۔

”من بعد“ کی تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے بعد آپ کے لیے کوئی نئی شادی حرام ہے۔ اسی بنا پر لفظ ”بعد“ یا ”بعد زانی“ کے معنی میں ہے، یعنی اس زمانے کے بعد آپ کے لیے کوئی نئی شادی حرام ہے۔ لہذا کسی نئی بیوی کا انتخاب نہ کریں۔ یا بعد اس کے کہ آپ نے اپنی بیویوں کو گذشتہ حکم خداوندی کے مطابق اختیار دے دیا ہے کہ یا تو آپ کے گھر میں سادہ زندگی گزاریں یا پھر علیحدہ ہو جائیں تو انہوں نے اپنی مرضی سے آپ کی زوجیت کو ترجیح دی ہے، تو اب اس کے بعد کسی اور عورت سے آپ کو شادی نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی ان میں سے کسی کو طلاق دے کر کسی اور بیوی کو اختیار کریں۔ بالفاظ دیگر نہ تو ان کی تعداد میں اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی موجودہ بیویوں کو تبدیل کر سکتے ہیں۔

چند ایک نکات

۱۔ اس حکم کا فلسفہ: یہ حد نبوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے کوئی نقص شمار نہیں ہوتی، بلکہ یہ ایک ایسا حکم ہے، جس کا فلسفہ بہت ہی گہرا ہے، کیونکہ تاریخی شواہد کی بنا پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبائل ازد اور قبائل کی جانب سے مسلسل زور دیا جا رہا تھا کہ آپ اپنی زوجیت کے لیے ان کا رشتہ قبول فرمائیں اور مسلمان قبائل کا ہر شخص اس بات پر فخر محسوس کرتا تھا کہ ان کے خاندان کی کوئی عورت پیغمبر اسلام سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو، یہاں تک کہ جیسا ابھی بیان ہو چکا ہے کہ بعض عورتیں حق مہر کے بغیر تیار تھیں کہ اپنے آپ کو ”ہبہ“ کے عنوان سے آنحضرت کے حلقہ ازدواج میں دے دیں اور غیر مشروط طور پر آپ سے شادی کر لیں۔

البتہ ان قبائل سے رشتہ ازدواج ایک حد تک آنحضرت کی ذات اور ان کے سیاسی، سماجی اور اجتماعی مقاصد کے لیے گرہ کشا تھا، لیکن فطری بات ہے کہ کوئی چیز اگر حد سے گزر جائے تو خود ایک شکل بن جاتی ہے، چونکہ قبیلے کی یہ خواہش تھی کہ آپ کو رشتہ دیں اور اگر بنی اکرم بھی ان سب کی خواہشات کو پورا کرنے لگ جائے اور کچھ عورتوں کو صرف عقد کی صورت میں نہ کہ شادی اور بیاہ کی شکل میں اپنے دائرہ اختیار میں لے آتے تو اس سے بہت سی مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ اسی لیے تو فدائے حکیم ایک حکم قانون کے ذریعے آپ کو اس اقدام سے روک رہا ہے اور ہر قسم کے نئے ازدواج یا موجودہ عورتوں کی تبدیلی سے منع کر رہا ہے۔

اس دوران میں شاید کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے مقصود تک پہنچنے کے لیے یہ بہانہ بناتے تھے کہ آپ کی بیویاں عام

طور پر جوہ ہیں اور ان میں سن رسیدہ خواتین بھی پائی جاتی ہیں۔ جو حسن جمال سے محروم ہیں، لہذا مناسب ہے کہ آپ کسی حسین و جمیل عورت سے شادی کر لیں۔ قرآن خاص کر اس مسئلے کو مد نظر رکھ کر یہ بات زور دے کر کہتا ہے کہ اگر صاحب جمال عورتیں بھی ہوں تب بھی آپ ان سے حتیٰ ازواج نہیں رکھتے۔

علاوہ ازیں جن شناسی کا تقاضا بھی ہے۔ کیونکہ آپ کی بیویوں نے آپ کے ساتھ جن و نفا کا ثبوت دیا اور دنیا کی ہر چیز پر سادہ اور روحانی زندگی کو ترجیح دی، خدا ان کے مقام کی حفاظت کے لیے پیغمبر اکرم کو اس قسم کا حکم دے رہا ہے۔ باقی بائیسوں کے بارے میں آنجناب کا مجاز و مقدار ہونا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور پاک درحقیقت آزاد عورتوں کی وجہ سے مشکلات میں مبتلا تھے۔ لہذا اس امر کی ضرورت نہیں تھی کہ اس حکم کو کینیزوں کے بارے میں بھی محدود کر دیا جائے۔ اگرچہ تاریخ بتاتی ہے کہ اس استثناء سے بھی استفادہ نہیں کیا گیا۔ یہ تقادہ منہجوم جو آیت کے ظاہر سے واضح ہوتا ہے۔

۲۔ مخالف روایات: متعدد روایات میں سے بعض تو سند کے لحاظ سے ضعیف اور بعض قابل غور ہیں ان کے مطابق لا یحل لک النساء من بعد، کا جملہ ان عورتوں کی طرف اشارہ ہے، جن کی تحریم سورہ نساء کی آیہ ۲۳ اور ۲۴ میں بیان ہو چکی ہے (یعنی ماں، بیٹی، بہن، چھوٹی اور خالہ وغیرہ، ان روایات کے بعض کفریوں میں یہ عراست ہوتی ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ کچھ عورتیں تو دوسرے لوگوں پر ملال ہوں، لیکن وہی رسالت مآب پر حرام ہوں؟ کوئی عورت آپ پر حرام نہیں، سوائے ان کے جو سب پر حرام ہیں۔ لہ

البتہ بعین نظر آتا ہے کہ یہ آیت ان آیات کی طرف اشارہ ہو جو سورہ نساء میں گورچی ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ان روایات میں سے بعض میں عراست کے ساتھ آیا ہے کہ "من بعد" سے مراد سورہ نساء میں حرام شدہ عورتوں کے علاوہ ہے۔

اس بنا پر بہتر یہی ہے کہ ان روایات کی تفسیر سے چشم پوشی اختیار کی جائے جو اخبار اعدا میں سے ہیں اور اصطلاحی الفاظ میں "اس کا علم اس کے اہل یعنی معصومین پر چھوڑ دین، کیونکہ وہ روایات ظاہر آیات کے ساتھ میل نہیں کھاتیں اور ہمیں آیت کے ظاہر پر عمل کرنے کا حکم ہے اور مذکورہ اخبار روایات غلطی ہیں۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ بہت سے حلقوں کا نظریہ ہے کہ زیر بحث آیت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ہر قسم کی نئی شادی کرنے کو حرام قرار دیا، لیکن بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا اور آپ کو ازدواج کی اجازت مل گئی۔ لیکن آپ نے اس سے استغناء نہیں کیا۔ حتیٰ کہ وہ اس آیت "انا احللتک ازواجک اللاتی اجورھن..." کو مذکورہ حکم کا ناخوشیانتے ہیں جو زیر بحث آیت سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ لیکن ان کا نظریہ ہے کہ اگرچہ وہ آیت قرآن میں اس سے پہلے لکھی ہوئی ہے لیکن نازل اس کے بعد ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ فاضل مقداد "کنز العرفان" میں نقل کرتے ہیں کہ علماء کے درمیان مشہور فتویٰ اور نظریہ یہی ہے۔ لہ

لہ تفسیر ذائقین جلد ۱ ص ۲۹۵، ۲۹۶

لہ کنز العرفان جلد ۱ ص ۲۹۵

یہ نظریہ ایک تو مذکورہ بالا روایات کے ساتھ واضح تضاد رکھتا ہے۔ دوسرے ظاہر آیات کے ساتھ بھی ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ آیات کا ظاہر بتاتا ہے کہ "انا احللتک ازواجک" والی آیت زیر بحث آیت سے پہلے نازل ہوئی ہے اور نسخ کا مسئلہ قطعی و یقینی دلیل کا محتاج ہے۔

بہر حال آیت کے ظاہر سے زیادہ قابل اطمینان اور واضح ثبوت ہمارے پاس موجود نہیں ہے اور آیت کے مطابق ہر قسم کی نئی شادی یا بیویوں کی تبدیلی، اس اور والی آیت کے نزول کے بعد پیغمبر اکرم کے لیے حرام ہو گئی تھی اور اس حکم میں بہت بڑی مصلحت پوشیدہ ہے، جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

۳۔ آیا نکاح سے پہلے عورت کو دیکھا جاسکتا ہے؟ مفسرین کی ایک جماعت نے "ولو اعجبتک حسنہن" کے جملے کو اس مشہور حکم کی دلیل سمجھا ہے جس کی طرف اسلامی روایات میں اشارہ ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ جو شخص کسی عورت سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، اسے نکاح سے پہلے اس سے نہ دیکھ سکتا ہے کہ جس سے اس کی شکل عورت اور جسمانی ساخت واضح ہو سکے۔

اور اس حکم کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان ابھی طرح دیکھ بھال کر اپنی بیوی کا انتخاب کر سکے تاکہ بعد کی ندامت اور پشیمانی سے بچ جائے جس سے عہد و پیمان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے، جیسا کہ روایت میں ہے کہ حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب میں سے ایک شخص سے فرمایا: جو شادی کرنا چاہتا تھا۔

"انظر الیہا فانک اذا جلدت ان ید و ید و ید تکما"

"پہلے سے اس عورت کو دیکھ لیں، کیونکہ یہ چیز سبب بنے گی کہ تمہارے درمیان عورت اور الفت پائندار رہے۔" لہ

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ سے سوال کیا گیا:

"کیا مرد کسی عورت کے ساتھ شادی کرنے کی غرض سے اسے غور سے دیکھ سکتا اور اس کے چہرے اور پشت کی طرف نگاہ کر سکتا ہے؟ تو فرمایا:

"نعم لا بأس ان ینظر الزجل الی المرأۃ اذا اراد ان یتزوجھا ینظر الی خلفھا والی و جہہا"

"ہاں کوئی حرج نہیں کہ جس وقت انسان کسی عورت سے نکاح کرنا چاہے اسے دیکھے اور اس کے چہرے اور پشت کی طرف نگاہ کرے۔" لہ

لہ تفسیر قرآنی جلد ۱ ص ۵۳

لہ وسائل الشیخ جلد ۱۳ ابواب مقدمات النکاح باب مقدمات حدیث ۲

البتہ اس سلسلے میں احادیث بہت موجود ہیں۔ لیکن بعض میں یہ تصریح ہوئی ہے کہ اس موقع پر شہوت اور لذت کی غرض سے نگاہ نہیں ہونی چاہیے۔

یہ بھی واضح ہے کہ یہ حکم ان مواقع کے ساتھ مخصوص ہے، جب انسان واقف اس عورت کے بارے میں تحقیقات کرنا چاہے کہ اگر اس میں مطلوبہ شرائط پائی جائیں تو اس سے شادی کرے گا، لیکن اگر کسی نے ابھی تک شادی کا فیصلہ ہی نہیں کیا، تو وہ صرف شادی کے احتمال یا تجسس کے تاثر عورتوں کی طرف نظر نہیں کر سکتا۔

البتہ بعض مفسرین نے زیر بحث آیت میں یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ یہ ان نگاہوں کی طرف اشارہ ہے، جو اتفاقیہ طور پر کسی عورت پر جا پڑتی ہیں تو اس صورت میں یہ آیت مذکورہ حکم پر دلالت نہیں کرے گی، بلکہ اس حکم کا مسک صرف روایات ہوں گی۔ لیکن "ولسو اعجلت حسنہن" اگرچہ ان کا حسن آپ کو معلوم ہو، کا جملہ اتفاقیہ اور غیر ارادی نگاہوں کے ساتھ بھی ہم آہنگ نہیں ہے۔ لہذا اس کی دلالت اس سے پہلے واسطے حکم پر بعید نظر نہیں آتی۔

۵۳- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ
النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ لَكُمْ إِلَى طَعَامٍ
غَيْرِ لُظْرَيْنِ إِنَّهُ وَلَكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَادْخُلُوا
فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوا وَلَا مُسْتَأْنِسِينَ
لِحَدِيثٍ إِنَّ ذَلِكُمْ كَانَ يُؤْذَى النَّبِيَّ
فَيَسْتَحْيِي مِنْكُمْ وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ
وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَسْأَلُوهُنَّ مِنْ
وَرَاءِ حِجَابٍ ذَلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ
وَقُلُوبِهِنَّ وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ
اللَّهِ وَلَا أَنْ تُنكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِهِ أَبَدًا
إِنَّ ذَلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمًا
۵۴- إِنَّ تَبْدُ وَاشْيَاءًا أَوْ تَخْفُوهُ فَنَانَ اللَّهُ كَانَ
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا

ترجمہ

۵۳- اے ایمان لانے والو! پیغمبر کے گھروں میں داخل نہ ہونا، مگر یہ کہ تمہیں کھانا
کھانے کی اجازت دی جائے اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ مقررہ

وقت سے پہلے نہ آؤ اور) کھانے کے وقت کی انتظار میں نہ بیٹھو، لیکن جب تمہیں دعوت ہو تو داخل ہو جاؤ اور جس وقت کھانا کھا لو تو نکل جاؤ اور (کھانا کھالینے کے بعد) بحث و مباحثہ اور باتیں کرنے کے لیے نہ بیٹھو۔ یہ عمل پیغمبر کو پریشان کرتا ہے مگر وہ تم سے شرم کرتے ہیں لیکن خدا حق (کے بیان کرنے) سے نہیں شرماتا اور جس وقت وسائل زندگی میں سے کوئی چیز (عاریتاً) ان (رسول کی بیویوں) سے طلب کرو تو درمیان میں پر وہ مائل ہونا چاہیے یہ کام تمہارے اور ان کے دل کو زیادہ پاک رکھتا ہے۔ اور تم حق نہیں رکھتے کہ پیغمبر خدا کو آزار (واذیت) پہنچاؤ اور نہ ہی کبھی ان کے بعد ان کی بیویوں کو اپنی زوجیت میں لانا، کیونکہ یہ کام خدا کے نزدیک بہت بڑی جسارت ہے۔

۵۴۔ کسی چیز کو ظاہر کر دیا مخفی رکھو، خدا ہر چیز سے آگاہ ہے۔

شان نزول

اس آیت کی شان نزول کے بارے میں مفسرین نے یوں نقل کیا ہے:

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زینب بنت جحش سے ازدواج کے موقع پر دعوت دیمہ کا اچھا ناما بندوبست کیا۔ اہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ یہ اہتمام اس بنا پر تھا۔ تاکہ زمانہ جاہلیت کی اس غلط رسم کو توڑا جائے جو منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی کے ساتھ نکل کی حرمت کے سلسلہ میں تھی اور اس رسم کو دو لوگ اور فضیلہ کن انداز میں ختم کر دیا جائے تاکہ معاشرے میں یہ سلسلہ پوری طور پر واضح ہو جائے۔ نیز زمانہ جاہلیت کی اس غلط رسم کو بھی ختم کر دیا جائے کہ آزاد کردہ غلاموں کی مطلقہ یا بیوہ سے نکاح محبوب ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاص خادم انصاری کہتے ہیں کہ آپ نے مجھے حکم دیا کہ میں آپ کے اصحاب کو کھانے کی دعوت دوں چنانچہ میں نے سب کو دعوت دی اور وہ ٹولوں کی صورت میں آکر کھانا کھاتے اور مجھ سے باہر نکل جاتے۔ یہاں تک کہ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! اب کوئی شخص باقی نہیں رہ گیا ہے کہ جسے میں نے دعوت دی ہو اور وہ نہ آیا ہو۔ تو آپ نے

فرمایا کہ بس ٹھیک ہے، اب دسترخوان بڑھاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا تو سب لوگ اٹھ کر بیٹھے گئے۔ لیکن تین افراد اسی طرح آپ کے حجرے میں بیٹھے رہے اور بحث و مباحثہ اور گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ جب ان کی گفتگو لمبی ہو گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اٹھ کر بیٹھے اور میں بھی آپ کے ہمراہ کھڑا ہو گیا تاکہ وہ لوگ متوجہ ہو جائیں اور اٹھ کر بیٹھے جائیں، پیغمبر اکرم باہر آ گئے تھے کہ جناب عائشہ کے حجرے تک پہنچ گئے اور پھر لوٹ گئے۔ میں بھی آپ کی خدمت میں آیا اور دیکھا کہ وہ لوگ اسی طرح بیٹھے ہوئے ہیں تو زیر نظر آیت نازل ہوئی اور اس قسم کے مسائل کے سلسلے میں ضروری احکام کی تعلیم دی۔ لے

نیز بعض قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی ہمارے اور کبھی دوسرے لوگ معمول کے مطابق چیزیں عاریتاً لینے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعض بیویوں کے پاس آتے۔ اگرچہ وہ اس زمانے کی سادہ زندگی کے مطابق کسی غلط کام کے مرتکب نہیں ہوتے تھے، لیکن اندراج رسول کی قدر و منزلت کے پیش نظر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔ اور مومنین کو حکم دیا گیا کہ جب رسول اللہ کے ہاں ان کی کسی بیوی سے کوئی چیز لینا چاہیں تو پر دے کی ادب سے لیں۔

ایک اور روایت میں ہے:

رسول اللہ کے بعض منافقین نے کہا:

”پیغمبر کیونکر ہماری بعض بیوہ عورتوں کو اپنے نکاح میں لے آئے ہیں۔ بخدا جب اس دُنیا سے ان کی آنکھیں

بند ہوں گی تو ہم ان کی بیویوں سے شادی کریں گے۔“

اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور آپ کے بعد آپ کی بیویوں سے شادی کی کلی طور پر ممانعت کر دی گئی اور اس سازش

کو بھی ناکام بنا دیا گیا۔ لے

تفسیر

اس آیت میں ایک بار پھر دسے سخن مومنین کی طرف ہے اور کچھ مزید احکام خصوصاً جو پیغمبر اکرم اور خاندان پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معاشرت کے ادب سے متعلق ہیں۔ مختصر و واضح اور صریح جملوں میں بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ۱۔ وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ پیغمبر کے گھروں میں بغیر اجازت کے ہرگز داخل نہ ہونا مگر جب تمہیں کھانا کھانے کے لیے اجازت ملے دی جائے اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ صحیح وقت پر آؤ نہ کہ پہلے سے آ جاؤ اور کھانے کے وقت کے انتظار میں بیٹھے رہو: دیا ایھا الذین آمنوا لا تدخلوا بیوت النبی الا ان تیؤذن لکم الی طعام عنین ناظرین انما یتلوا

لے مجھ ابسیان عبد مصعب آہ مذکورہ کے ذیل میں۔

تہ مجھ ابسیان عبد مصعب ۳۳۳۔

تہ ”اناہ“ الی یافنی کے ماورے کسی چیز کا موقع ہانے کے معنی میں ہے، لیکن یہاں پر کھانے کی تیاری کے معنی میں ہے۔

قرآن اس طرح سے معاشرت کے ایک اہم ادب کو بیان کرتا ہے اور وہ بھی ایسے ماحول میں جہاں پر اس کا بیت کو نماز رکھا جاتا تھا۔ اگرچہ گفتگو پیغمبر اکرم کے گھر کے بارے میں ہے، لیکن تم ہے کہ یہ حکم آپ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ کسی بھی موقع پر کسی گھر میں بھی بغیر اجازت کے داخل نہیں ہونا چاہیے جیسا کہ سورہ نور کی آیت ۲۴ میں بھی آیا ہے، حتیٰ کہ خود پیغمبر اکرم کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ جس وقت اپنی بیٹی حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے گھر میں جاتے تو باہر کھڑے ہو کر اجازت لیتے، بلکہ ایک دن جابر بن عبد اللہ انصاری آپ کے ساتھ تھے، جہاں آپ نے اپنے لیے اجازت مانگی وہاں جا کر کے لیے ہی اجازت طلب کی اور پھر اندر گئے۔

علاوہ ازیں جس وقت مدعوین کو کھانے کی دعوت ہو تو انہیں وقت شناس ہونا چاہیے اور بے موقع دخل صاحب خانہ کے لیے اسباب زحمت فراہم نہیں کرنے چاہئیں۔

اس کے بعد دوسرے حکم کو پیش کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: "لیکن جب تمہیں دعوت دی جائے تو اندر جاؤ اور جب کھانے سے فارغ ہو جاؤ تو نکل جاؤ" (ولکن اذا دعيت فادخلوا فاذا طعمتم فانقثروا)۔

یہ حکم درحقیقت گزشتہ حکم کی تاکید اور تکمیل ہے یعنی نہ تو اس گھر میں بے وقت داخل ہونا چاہیے، جہاں دعوت دی گئی ہے اور نہ ہی دعوت قبول کرنے میں بے پردہی سے کا آ لینا چاہیے اور نہ ہی کھانا کھانے کے بعد بہت دیر تک وہاں بیٹھے رہنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ان امور کی خلاف ورزی میزبانی کے لیے جو جب زحمت ہے اور اخلاقی اصولوں کے بھی خلاف ہے۔

تیسرے حکم میں فرمایا گیا ہے: "کھانا کھانے کے بعد دل کی اور گفتگو کی مجلس پیغمبر کے گھر میں (اور کسی بھی دوسرے میزبان کے گھر میں نہ جاؤ) (ولا مستأنسین لحديث)۔

البتہ ممکن ہے کہ خود میزبان اس قسم کی مجلس خلوص و محبت کا خواہاں ہو تو ایسی صورت اس حکم سے مستثنیٰ ہے، گفتگو کو دل کی جہاں صرف کھانا کھانے کی دعوت دی گئی ہے، ذکر غیب شپ کی۔ تو اس قسم کے مقام پر کھانا کھانے کے بعد مجلسوں کو ترک کر دینا چاہیے خصوصاً جبکہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر جیسا گھر ہو۔ جو عظیم ترین خدائی فرائض کا انجام پانے کا مرکز ہے۔ ضروری ہے کہ ایسے مقام پر اسباب زحمت فراہم نہ کیے جائیں، جن سے وقت ضائع ہو۔ اس کے بعد اس حکم کی قلت کو یوں بیان کیا گیا ہے: "یہ کام پیغمبر خدا کو اذیت و آزار پہنچاتا ہے، مگر وہ تم سے شرم کرتے ہیں۔ لیکن خدا سچ بیان کرنے میں در رعایت سے کام نہیں لیتا، (ان ذالک مردکان لیسو ذی الشبی فیستجی منکم واللہ لایستجی من الحق)۔

البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں اس لیے اس حکم سے مستثنیٰ نہیں کرتے جو ذاتی نہیں ہوتے، کیونکہ یہ اچھا نہیں لگتا کہ انہیں اپنے بارے میں آپ بات کرے۔ البتہ دوسروں کے بارے میں ہو تو بات کرنا بھی مناسب ہوتا ہے۔

یہ آیت بھی ایسے ہی موقع کی مناسبت سے ہے۔ اخلاقی اصولوں کا تقاضا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنا دفاع خود کریں بلکہ مخالفان کا دفاع کرے۔

پھر جو حکم پر دے کے سلسلے میں ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے: "جس وقت ازواج رسول سے ضروریات زندگی کی کوئی چیز طلب کرنا چاہو تو پردہ کی اوٹ میں طلب کرو" (واذا سألتموهن متاعاً فاسألوهن من وراء حجاب)۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ عربوں اور بیت سے دوسرے لوگوں میں سے معمول تھا کہ بوقت ضرورت ضروریات زندگی کی کئی چیزیں وقتی طور پر ہسالیوں سے عاریتاً لیا جاتی تھیں اور پیغمبر اکرم کا گھر بھی اس طریقہ کار سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ کبھی کبھار لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں سے بھی چیزیں عاریتاً لیتے۔ واضح رہے کہ ازواج رسول کا لوگوں کی نگاہوں کے سامنے آنے والا کچھ اسلامی حجاب کے ساتھ ہی کوئی اچھی بات نہیں تھی، لہذا حکم ہو گیا کہ آئندہ کے لیے یا تو پردہ کے پیچھے سے اگر چیز لیا کریں۔ یا پھر دروازے کے پیچھے سے۔

یہاں پر جو نکتہ قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ اس آیت میں "حجاب" سے مراد عورتوں کا عام پردہ نہیں ہے۔ بلکہ اس پر ایک اضافی حکم ہے جو ازواج رسول کے ساتھ مخصوص ہے اور وہ یہ کہ لوگ اس بات کے پابند تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصی حرمت کے پیش نظر جب کبھی آپ کی بیویوں سے کوئی چیز لینا چاہیں تو پردے کے پیچھے سے لیا کریں اور ازواج رسول پر دے کے ساتھ ہی لوگوں کے سامنے نہ آیا کریں۔

البتہ یہ حکم صرف ازواج رسول سے متعلق ہے اور عام عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ یعنی وہ اسلامی حجاب کے ساتھ عام لوگوں کے سامنے آ سکتی ہیں۔

اس بات کا شاہد یہ ہے کہ لفظ "حجاب" روزمرہ کے استعمال میں عورت کے پردے کے معنی میں آتا ہے، لیکن لغت میں اس کا یہ مفہوم نہیں ہے اور نہ ہی ہمارے فقہاء نے اسے اس مفہوم میں استعمال کیا ہے۔

"حجاب" لغت میں اس چیز کے معنی میں ہے جو درمیانوں کے درمیان عامل ہوتی ہے۔

اسی بنا پر جو پردہ انترتوں، دل اور پھیپھڑے کے درمیان موجود ہے اسے "حجاب حاجز" کا نام دیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں بھی یہ لفظ ہر جگہ پردہ یا کاٹ کے معنی میں استعمال ہوا ہے مثلاً سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۲۵ میں ہے:

"جعلنا بینک وبین الذین لایؤمنون بالآخرة حجاً بنا مستوراً"

"ہم نے تیرے اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے پر شیبہ: دیا ہے"

سورہ ص کی آیت ۲۲ میں ہے:

"حجج توارت بالحجاب"

"یہاں تک کہ سورج اتنی کے پردے کے پیچھے پنہاں ہوا"

یہ سورہ شوریٰ کی آیت ۵۱ میں آیا ہے:

"وما کان لبشر ان ینکلم اللہ الا وحیاً او من وراء حجاب"

کسی انسان کے لیے ممکن نہیں ہے کہ خدا اس سے بات کرے، مگر وحی کے ذریعے یا اس پر وہ (غیب) سے۔
فقہاء کے کلمات میں قدیم الایام سے اب تک عورتوں کے پردے کے بارے میں عام طور پر دستبردار کا لفظ استعمال ہوا ہے اور اسلامی روایات میں بھی یہی یا اس سے ملتی جلتی تعبیر آئی ہے اور عورتوں کے پردے کے بارے میں لفظ "حجاب" کا استعمال الہی اصطلاح ہے جو زیادہ تر ہمارے ناسانے میں رائج ہوئی ہے اور اگر کسی تاریخ میں یہ روایت میں بھی مل جائے تو بہت کم ایسا ہوگا۔

دوسرا شاہد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خصوصی خادم انس بن مالک کہتے ہیں کہ میں اس آیت حجاب کے بارے میں سب سے زیادہ آگاہ ہوں، کیونکہ جب جناب نبیب کریم نے شادی ہوئی اور وہ آپ کے گھر میں گئیں تو آپ نے دعوتِ ولیمہ کا بندوبست کیا، لوگوں نے کھانا کھالیا، لیکن کچھ لوگ کھانا کھانے کے بعد اسی طرح بیٹھے بائیں کرتے رہے۔ تو اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی: یا ایہا الذین آمنوا لاتدخلوا بیوت النساء من ورائی حجاباً۔

تو اس وقت پردہ ڈال دیا گیا اور لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔

ایک اور روایت میں اس کہتے ہیں:

"ارحی السریین ویند؟"

"بیغیر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے اور اپنے درمیان پردہ ڈال دیا اور لوگوں نے جب یہ دیکھا تو اٹھ کھڑے ہوئے اور منتشر ہو گئے۔"

جوئے اور منتشر ہو گئے۔"

اسی بنا پر اسلام نے مسلمان عورتوں کو پردہ نشینی کا حکم نہیں دیا اور عورتوں کے بارے میں "پردہ نشین" یا اس قسم کی دوسری تعبیریں اسلامی حیثیت نہیں رکھتیں، جو کچھ کہیں مسلمان عورت کے لیے ضروری ہے، وہی اسلامی پردہ ہے، لیکن ازواجِ رسول کا معاملہ کچھ اور ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن بہت زیادہ تھے اور غدار پرست ٹولہ اسی ٹوہ میں لگا رہتا تھا کہ کوئی موقع ملے اور ازواجِ رسول کو اپنی تہمت کا نشانہ بنائیں، تاکہ اس طرح سے سیاہ دل لوگوں کے ہاتھیں دستاویز ہوجائے۔ لہذا انہیں یہ خاص حکم دیا گیا ہے یا دوسرے لفظوں میں اُمت کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ازواجِ رسول سے کوئی چیز طلب کرتے وقت ان سے پرشے کی اوٹ میں بات کیا کریں۔ خصوصاً "وراء" کی تعبیر اس معنی کی گواہ ہے۔

اسی لیے قرآن مجید اس حکم کے بعد اس کے فلسفے کو بیان کرتا ہے۔ "یہ تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے بہتر ہے؟ (ذالکم اظہر لقلوبکم وقلوبہن۔)

اگرچہ تعلیل کی یہ قسم استنباطی کے منافی نہیں لیکن وہ فاسلٹھون" میں امر کے وجوب میں ظہور کو بھی متزلزل نہیں کرتی کیونکہ اس قسم کی تعلیل بعض اوقات دوسرے واجب احکام میں بھی آئی ہے۔

پانچویں حکم کو اس صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ تم حق نہیں رکھتے کہ رسول خدا کو تکلیف پہنچاؤ اور مساکن لکھ

ان تشوڈ وارسول اللہ۔

اگرچہ اذیت ناک اور تکلیف دہ عمل خود اسی آیت میں بیان ہو گیا ہے اور وہ ہے بے موقع دخل پینیر اسلام کے گھر جانا، کھانا کھانے کے بعد بیٹھ جانا اور ان کے لیے مشکلات پیدا کرنا اور شانِ نزول والی روایات میں بھی آیا ہے کہ بعض دل کے اندھوں نے قسم کھائی تھی کہ آنحضرت کی وفات کے بعد آپ کی بیویوں سے متفرک کر کے یہ ایک اور تکلیف دہ بات تھی۔ لیکن آیت کا مفہوم ہر حالت میں عام ہے اور ہر قسم کی تکلیف اور اذیت پہنچانے سے منع کرتا ہے۔

آخر میں چٹا اور آخری حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ کی ازواج کے ساتھ شادی کی حرمت کے بارے میں یوں بیان ہوا ہے۔ تم ہرگز یہ حق نہیں رکھتے کہ رسول اللہ کے بعد آپ کی بیویوں کو اپنے حلقہ ازواج میں لاؤ، کیوں کہ یہ کام خدا کے نزدیک بہت بڑی جلدت والا ہٹلہر ولا ان تکحوا ازواجہ من بعدہ ابداً ان ذالکم کان عند اللہ عظیمہا۔

یہاں پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ خدا نے کس طرح پیغمبر اکرم کی بیویوں کو آپ کے بعد شادی کے حق سے محروم کر دیا۔ جبکہ

بوقت وفات آپ کی کچھ بیویاں جوان ہی تھیں؟

اس سوال کا جواب حرمت کے فلسفے کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ:

۱) قرآن مجید آیت کی شانِ نزول سے معلوم ہو چکا ہے کہ بعض لوگ آنحضرت سے انتقام لینے اور آپ کی ذاتِ اقدس کی توہین کرنے کے لیے اس قسم کا ارادہ کر چکے تھے۔ اس طرح سے وہ چاہتے تھے کہ آنحضرت کی عزت اور عظمت پر ضرب لگائیں۔

۲) ثانیاً: اگر یہ مسئلہ بائز ہوتا تو کچھ لوگ رسول اکرم کی بیوہ کو اپنے حلقہ زوجیت میں لے آنے کے بعد ممکن تھا کہ اس اقدام سے ناجائز مفاد حاصل کرتے اور اسے وہ معاشرے میں اپنی جھوٹی شہرت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ قرار دیتے یا اس عنوان سے کہ رسول اللہ کے گھر ٹھوٹا ملا سے باخبر ہیں اور ان کی تعلیمات اور مکتب کی خصوصی معلومات انہیں حاصل ہیں۔ لہذا اسلام میں تحریف کا ارتکاب کرتے۔ یا منافق لوگ، معاشرے میں ایسی باتیں پھیلانا شروع کر دیتے جو آنحضرت کے شانِ شانِ زہتیں۔ (محرر کیجئے گا)

اس متوقع خطرے کو اس وقت تقویت ملتی ہے، جب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں نے اپنی پ کو اس کام کے لیے بالکل تیار کر لیا تھا۔ حتیٰ کہ بعض لوگوں نے اس کا زبانی طور پر اظہار بھی کر دیا تھا اور کچھ لوگوں نے شاید ابھی دل میں رکھا ہوا تھا۔ اس سلسلے میں جن اشخاص کا بعض اہل سنت مفسرین نے یہاں پر نام لیا ہے ان میں سے ایک ظلمہ بھی تھا۔

وہ خلا جو عوام اور لشکارا اسرار سے آگاہ ہے اس نے اس قبیلے سازش کو ظاہر کرنے کے لیے ایک فیصلہ کن حکم صادر فرمایا، جس سے ان تمام امور کا مکمل طور پر سدباب ہو گیا۔ اور اس کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لیے ازواجِ رسول کو

”ام المؤمنین“ کا لقب دے دیا تاکہ لوگ جان لیں کہ ان سے عقد کرنا اپنی ماں سے ازدواج کرنے کے مترادف ہے۔ مذکورہ وجوہات کی بنا پر واضح ہو جاتا ہے کہ ازدواج رسول پر کیوں واجب قرار دے دیا گیا تھا کہ وہ اس محدودیت کو خوش خوشی گلے گائیں؟

انسان کی زندگی میں بعض اوقات ایسے اہم مسائل پیش آجاتے ہیں، جن کی خاطر اسے فداکاری اور قربانی کی مثالیں قائم کرنا پڑتی ہیں اور اپنے بعض مسلم حقوق سے بھی دست بردار ہونا پڑتا ہے، خاص طور پر جب عظیم اعزازات کے ساتھ عظیم اور سنگین ذمہ داریاں بھی ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ ازدواج رسول نے جب آپ سے عقد کر لیا تو انہیں ایک نہایت ہی عظیم اعزاز مل گیا۔ جب اس قدر عظیم اعزاز انہیں نصیب ہو گیا تو انہیں اسی قدر ایثار و قربانی کا مظاہرہ بھی کرنا چاہیے تھا۔

اس بنا پر ازدواج رسول، آپ کے بعد اسلامی اُمت کے درمیان نہایت ہی قابل احترام زندگی بسر کرتی رہیں اور اپنی اس کیفیت سے بہت ہی خوش تھیں اور نئے ازدواج سے محرومی کو اس اعزاز کے مقابلے میں حقیر اور ناچیز سمجھتی تھیں۔ خداوند عالم دوسری آیت میں لوگوں کو بڑی سختی کے ساتھ خبردار کرتے ہوئے کہتا ہے ”ہاگر کسی چیز کو تم آشکار اور ظاہر کرو یا مخفی رکھو، خدا ہر حال ان تمام امور سے آگاہ ہے“ (ان تبتدوا شیئاً او تخفوه فان اللہ کان بکل شیء علیماً)۔

یہ لگان ذکر و ذکر خدا اپنے پیغمبر کے بارے میں ازیت ناک اور تکلیف دہ منصوبوں سے باخبر نہیں، وہ تو ان سے بھی باخبر ہے جنہوں نے دل کا عمل زبان پر جاری کیا ہے اور ان سے بھی جو دل میں رکھتے تھے، غرض کہ سب کو اچھی طرح سے جانتا ہے اور وہ ہر شخص سے اس کے کام اور نیت کے مطابق سلوک کرے گا۔

چند نکات

چونکہ زیر بحث آیات میں رسول پاک کی طرف سے ایک دعوت کے اس موقع پر مسلمانوں کے کچھ فرائض کا ذکر ہوا ہے۔ لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ”مہمان نوازی“ مہمان کا حق اور میزبان کے فرائض کے سلسلے میں اسلامی تعلیمات کا ایک گوشہ بیان کیا جائے۔

۱۔ مہمان نوازی: اسلام مہمان نوازی کے مسئلے کو خاص اہمیت دیتا ہے، یہاں تک کہ ایک حدیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

”الضیف دلیل الجنة“

مہمان جننت کا راہنما ہے۔

مہمان کی اہمیت اور احترام اس قدر زیادہ ہے کہ اسلام میں اسے ایک آسمانی ہدیہ کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے،

ارشاد پیغمبر ہے:

”اذا اراد اللہ بقوم خیراً اھدی الیہم ھدیۃ“
قالوا وما تلک الھدیۃ؟

قال الضیف، ینزل برزقہ، ویرتحل بذنوب اھل البیت“

”جب خدا کسی قوم کی بہتری چاہتا ہے تو اس کی طرف انمول تحفہ بھیج دیتا ہے“

”لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ وہ انمول تحفہ کیا ہے۔“

فرمایا مہمان، جو اپنا رزق لے کر آتا ہے اور گھر والوں کے گناہ لے کر جاتا ہے اور وہ بخشنے جاتے ہیں۔

قابل توجہ یہ ہے کہ کسی لمحے پیغمبر اکرم سے عرض کیا:

میرے ماں باپ آپ پر قربان جائیں۔ میرا طرز عمل یہ ہے کہ مکمل وضو کرتا ہوں، نماز قائم کرتا ہوں، زکوٰۃ بر عمل ادا کرتا ہوں اور مہمان کی خدمت پیشانی سے خدائی خوشنودی کے لیے تواضع کرتا ہوں۔

تو آنحضرت نے ارشاد فرمایا:

”یحیح یحیح، ما الجھنم علیک سیل ان اللہ قد سیراک من الشح“

ان کنت كذلك“

”کیا کہنا، مرجا، واہ واہ، جہنم کے راستے تم پر بند ہیں اور اگر تیری حالت یہی ہے تو خدا نے تجھے ہر قسم کے نخل سے پاک کر دیا ہے۔“

اس سلسلے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، لیکن اختصار کو مدنظر رکھ کر اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۲۔ میزبانی میں سادگی: اسلام کی نظریں نہ صرف یہ کہ اچھا کام نہیں، بلکہ باقاعده طور پر اس سے منع بھی کیا گیا ہے۔ اسلام کا یہ حکم ہے کہ میزبانی اور خاطر تواضع سادہ قسم کی ہو اور اس نے مہمان کی اور میزبانی کے حقوق و فرائض کی نشاندہی کے طور پر ایک نہایت ہی منفعت مند ہندی کر دی ہے اور وہ یکہ میزبان کے پاس جو کچھ موجود ہے اس سے پہلو تہی نہ کرے اور مہمان بھی اس سے زیادہ کی توقع نہ رکھے۔ اسی سلسلے میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

”المؤمن لا یحتمل من اخیہ، وما ادری ایہما اعجب؟ التذی“

یکتف اھا اذا دخل علیہ ان یتکلف لہ، او المتکلف لایخیه؟

”مومن اپنے مومن بھائی کے ساتھ بے تکلف ہوتے ہیں، میں نہیں جانتا کہ ان دو میں سے کون سا شخص

زیادہ عجیب ہے، آیا وہ جو اپنے بھائی کے پاس جا کر اسے تکلف میں ڈال دیتا ہے یا وہ جو خود سے مہمان کے

یہ کھف میں پڑ جاتا ہے؟ لے

سلطان فاری رضی اللہ عنہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

”ان لا تتكلف للضيف ماليين عندنا وان تقدم اليه ما حضرنا“

”جو چیز ہمارے پاس نہیں ہے اس کے لیے ہمارے واسطے کھف نہ کریں اور جو موجود ہے اس سے پہنچی نہ کریں“ لے

۳۔ مہمان کا حق: ہم بتا چکے ہیں کہ اسلام کی نگاہ میں مہمان ایک آسمانی تحفہ اور خدائی عنایت ہے۔ اس کی عزت میں اسی طرح حتیٰ کہ امیر المؤمنین علیہ السلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں کہ:

”من حق الضيف ان تمشي معه فتخرجك من حريمك الى البز“

”مہمان کے حقوق میں سے یہ ہے کہ اسے خدا حافظ کہنے کے لیے گھر کے دروازے تک جائیں۔ لے اور کھف میں پڑے بغیر اس کے آرام و آسائش کے وسائل فراہم کیے جائیں۔ حتیٰ کہ ایک حدیث میں ہے کہ:

”قال رسول الله ان من حق الضيف ان يعد له الخلال لے

”مہمان کے حقوق میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسے خلال تک ہتیا کریں۔“

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مہمان کو گوارا شریعہ ہوتے ہیں اسی بنا پر حکم دیا گیا ہے کہ ان سے کھانا کھانے کے بارے میں نہ پوچھا جائے بلکہ دسترخوان بچھا دیا جائے، اگر ضرورت ہوگی تو کھالیں گے، جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

”لا تغفل لاختلاف اذ دخل عليك اكلت اليوم شيئا ولكن قرب اليه ما عندك فان الجواد كل الجواد من سذل ما عنده“

”جب تمہارا مہمان تمہارے پاس آئے تو اس سے یہ نہ پوچھو کہ آج تم نے کھانا کھا یا ہے یا نہیں، بلکہ جو کچھ تمہارے پاس ہو، اس کے لیے حاضر کرو۔ کیونکہ صحیح معنوں میں سنی ہی ہوتا ہے جو اس چیز کے خدج کرنے کی بزدلی نہ کرے جو اس کے پاس ہے۔ لے

خدا کی بارگاہ میں سیزان کے فرائض میں سے یہ بھی ہے کہ جو کھانا اس نے تیار کیا ہے اسے حقیر نہ سمجھے، کیونکہ نعمت خدا جو

لے بحار الانوار جلد ۵، صفحہ ۲۵۵۔

لے بحار الانوار جلد ۵، باب ثالث۔

لے بحار الانوار جلد ۵، صفحہ ۲۵۵۔

لے بحار الانوار جلد ۵، صفحہ ۲۵۵۔

بھی دو سمنز اور محترم ہوتی ہے۔ لیکن ضرورت مند اور کھف کے دلدادہ لوگوں کے ہاں معمول ہے کہ دسترخوان کو جتنا بھی کھا لیں سے بھر دیں، پھر بھی کہتے ہیں کہ یہ تو کچھ ہی نہیں۔ یا کہتے ہیں کہ آپ کے شایان شان کھانا تیار نہیں ہوا وغیرہ۔ اس طرح مہمان کا بھی فرض بقا ہے کہ وہ اسے حقیر اور معمولی نہ سمجھے۔

ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

”هلا امرؤ واحتتمر لآخيه ما حضره وهف امرؤ واحتقر من اخيه ما قدم اليه“

”میزبان نے اپنے بھائی کے لیے جو کچھ تیار کیا ہے، اگر وہ اسے حقیر سمجھے وہ بھی ہلاک ہوگا۔ لے اور جو مہمان تیار شدہ چیز کو حقیر سمجھے وہ بھی ہلاک ہوگا۔ لے

اسلام نے مہمان کی قدر دانی اور احترام کے بارے میں بہت زیادہ تاکید کی ہے۔ یہاں تک کہ فرمایا گیا ہے کہ جب مہمان تمہارے پاس آجائے تو آسنے پر اس کی مدد کرو، لیکن گھر سے جاتے وقت اس کی مدد نہ کرو، مبادا اس کے دل میں خیال آجائے کہ آپ اس کے جانے کی ترکیبیں کر رہے ہیں۔ لے

۴۔ مہمان کی ذمہ داری: ہمیشہ حقوق اور فرائض برابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی جس طرح مہمان کے لیے میزبان کی ذمہ داری ہے، جتنا پھر جو کچھ مذکورہ بالا احادیث میں بیان ہو چکا ہے، اس کے علاوہ بھی مہمان کا فرائض ہے۔ جو کچھ اسے صاحب خانہ اپنے گھر میں پیش کرے، اسے قبول کرے، مثلاً جو کچھ بیٹھنے کے لیے حاضر کرے اسے قبول کرے، امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

”اذا دخل احدكم على اخيه في رحله فليقعد حيث يأمر صاحب الرجل فان

ما بالرجل عرف بعورة بيته من السائل عليه“

جس وقت تم میں سے کوئی اپنے مسلمان بھائی کے گھر میں داخل ہو تو جہاں وہ بیٹھنے کے لیے کہے وہیں بیٹھ جائے، کیونکہ صاحب خانہ اپنے گھر کی کیفیت اور ان حصوں سے خبریں لے سکتا ہے، لہذا چاہئے زیادہ واقف ہوتا ہے۔ لے

خلاصہ یہ کہ مہمان کو لازمی اور میزبانی کے آداب و فرائض اور اسلامی معاشرے میں اس کی خصوصیات بہت بحث طلب ہیں۔ جو لوگ اس سلسلے میں مزید وضاحت چاہتے ہیں، انہیں بحار الانوار کی جلد ۷، کتاب العشرة کے باب ۱۱ سے لے کر ۱۶ تک

لے بحار الانوار جلد ۷، صفحہ ۲۵۵۔

لے بحار الانوار جلد ۷، صفحہ ۲۵۵ (حدیث ۱۲۷)۔

لے بحار الانوار جلد ۷، صفحہ ۲۵۵۔

اور کتاب "محبت البیت" جلد ۳ باب فضیلت الصفاۃ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مادیت پرستی کے اس دور میں یہ قدیم انسانی اور اخلاقی رسم محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ بعض معاشروں میں تو تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ اور شنیدیں آیا ہے کہ جب وہاں کے لوگ اسلامی ممالک میں آتے ہیں اور ان علاقوں میں کھٹے دل سے مہمان نوازی کے رُوح پر درناظر دیکھتے ہیں اور ممالوں کے ساتھ گرمجوشی اور مہربانیت کے سلوک کا مشاہدہ کرتے ہیں تو دنگ رہ جاتے ہیں کہ کس طرح یہ لوگ اپنے گھر میں موجود زندگی کے بہترین وسائل اور قیمتی غذائیں ایسے ممالوں کی خاطر تواضع کے لیے وقف کر دیتے ہیں جن سے تھوڑا بہت رابطہ ہے یا جن سے سفر کے دوران مختصر سی آشنائی ہوتی ہے۔ لیکن اگر اسلامی روایات کو مدنظر رکھا جائے کہ جن کا مقولہ "سا جنتہ میں ان ہوا ہے تو واضح ہو جاتا ہے کہ اس قدر ایشیا و ہندو کا رسی کی کیا وجوہات ہیں اور پتہ چل جاتا ہے کہ اس بارے میں معنوی اور روحانی پہلو کو مدنظر رکھا جاتا ہے، جو مادیت کے پرستاروں کی سوچ اور حساب سے بالاتر ہے۔

۵۵۔ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِي آبَائِهِنَّ وَلَا ابْنَائِهِنَّ وَلَا إِخْوَانِهِنَّ وَلَا ابْنَاتِهِنَّ وَلَا إِخْوَاتِهِنَّ وَلَا نِسَائِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانِهِنَّ وَالَّذِينَ اللَّهُ ابْتَلَاهُمْ كَانُوا عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا ۝

ترجمہ

۵۵۔ ان (ازواجِ رسول) پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنے آباءِ اجداد، اولاد، بھائیوں، بھتیجیوں، بھانجیوں، مسلمان عورتوں اور اپنے غلاموں سے (بغیر حجاب و پردہ کے ملیں)۔ اور اللہ کا تقوا سے اختیار کرو، کیونکہ خدا ہر چیز سے آگاہ ہے۔

شانِ نزول

بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ آیہ حجاب (گذشتہ آیت) کے نازل ہونے کے بعد ازواجِ رسول کے آباء و اولاد اور دیگر رشتہ داروں نے آپ کی خدمتِ اقدس میں عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ہم بھی ان کے ساتھ پردے کی اوٹ میں رہ کر بات کیا کریں؟ تو اس پر زیر نظر آیت نازل ہوئی اور انہیں حجاب دیا کہ یہ حکم تمہارے لیے نہیں ہے۔

تفسیر

قانونِ حجاب سے مستثنیٰ موارد:

چونکہ گذشتہ آیت میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں کے حجاب کے بارے میں ایک صلیح حکم آیا تھا

جس سے یہ گمان پیدا ہوتا تھا کہ ان کے محرم بھی اس حکم پر عمل کرنے کے پابند ہیں اور انھیں بھی ازواج رسول سے پردے میں ملاقات کرنا پائیے تو اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور اس حکم کی تشریح کر دی گئی۔

خدا فرماتا ہے: پیغمبر کی بیویوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنے باپ، اولاد، بھائیوں، بھتیجیوں، بھانجیوں، مسلمان عورتوں، اپنے غلاموں کے ساتھ بغیر حجاب کے ملاقات کریں، الا جناح علیہن فی ابائہن ولا ابناہن ولا اخواتہن ولا ابناہن ولا اخواتہن ولا ذنائبہن ولا ما ملکت ایمانہن۔

دوسرے لفظوں میں ان کے محرم جو ان چہرہ پر منحصر ہیں، وہ مستثنیٰ ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ کچھ اور افراد بھی تو ہیں جن کا ان چہرہ پر نام نہیں آیا مثلاً چچے اور ماموں وغیرہ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید جو نوحہ اپنی تمام دباغت کو اعلیٰ صورت میں محفوظ رکھتا ہے اور اصول فصاحت میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کوئی اضافی لفظ گفتگو میں نہ لگے پائے، لہذا یہاں پر چچاؤں اور ماموں کے ذکر سے اجتناب کیا ہے۔ کیونکہ بیبیوں اور بھانجیوں کے ذکر سے چچاؤں اور ماموں کا محرم ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ محرمیت ہمیشہ دونوں طرف سے ہوتی ہے، جس طرح کسی کا بھتیجا اس کا محرم ہوتا ہے اسی طرح وہ بھی بھتیجے کے ساتھ محرم ہوگی اور معلوم ہے کہ ایسی عورت انسان کی چھوٹی شمار ہوگی۔ نیز جس طرح بھانجیاں اس کا محرم ہوتی ہیں وہ بھی بھانجے کی محرم ہوگی اور معلوم ہے کہ ایسی عورت اس کی خالہ شمار ہوگی۔

جس طرح چھوٹی اور خالہ بھتیجے اور بھانجے کی محرم ہوگی تو چچا اور ماموں بھی تو بھتیجے اور بھانجی کے محرم ہوں گے۔ (کیونکہ چچا اور چھوٹی، نیز ماموں اور خالہ کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے) اور یہ اس قرآن کے گہرے نکات میں سے ہے۔
(مؤرخ کیجیے گا)

یہاں پر ایک اور سوال پیش آتا ہے کہ شوہر کا باپ اور شوہر کا بیٹا بھی تو عورت کے محرم شمار ہوتے ہیں تو پھر یہاں پر ان کا ذکر کیوں نہیں آیا، جبکہ سورہ نوز کی آیت ۴ میں ان کو محرم کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں گفتگو صرف آنحضرت کی بیویوں کے بارے میں ہے اور معلوم ہے کہ ان آیات کے نزول کے وقت نہ تو آپ کے والد گرامی زندہ تھے نہ ہی اجداد اور نہ ہی آپ کا کوئی بیٹا تھا۔ (پھر مؤرخ کیجیے گا)۔ لہ

رضاعی بھائی بہنوں اور اس قسم کے دیگر افراد کا ذکر نہ کرنا بھی اسی بنا پر ہے کہ وہ بھی بھائی بہنوں اور دوسرے مردوں کے ضمن میں شمار ہوتے ہیں، لہذا ان کا علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

آیت کے آخر میں گفتگو کے لہجے لہجہ "خائب" سے خطاب کی طرف تبدیل کر کے ازواج رسول کو مخاطب کرتے

۱۰۰ مورخین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عین بیٹل کا ذکر کیا ہے، قائم اور عبداللہ دین کا لقب طیب اور طاہر تھا، یہ دونوں حضرت خیر کے بیٹے ہمارک سے تھے اور مکہ میں پچیس ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ اور تیسرے حضرت ابراہیم جو انھوں کو پیدا ہوئے اور ۱۶ یا ۱۷ ماہ سے زیادہ زندہ نہیں رہے۔ یہ مالان میں سے کوئی بھی سورہ احزاب کے نزول کے وقت وجود نہیں تھا۔ ابراہیم اس واقعے کے بعد ہوئے اور پچیس ہی میں دنیا سے اٹھیں بند کر گئے۔ (اسلامی تاریخ اور تاریخ و رجال کی دوسری کتب کی طرف رجوع فرمائیں)۔

برئے قرآن کہتا ہے۔ "تقویٰ اختیار کرو، کیونکہ ظاہر چیز سے آگاہ ہے" اور کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ہے، (واقعتاً اللہ ان اللہ کان علیٰ کل شیء شہیداً)۔

کیونکہ حجاب اور اس قسم کے امور گناہ سے محفوظ رہنے کا ذریعہ ہیں اور بس۔ مقصود تو درحقیقت وہی تقویٰ ہے۔ اگر وہ نہ ہوتو یہ ذرائع بھی کوئی فائدہ نہیں دے سکتے۔

یہاں پر اس نکتے کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "ذناہن" (ان کی عورتیں) ہم مذہب اور مسلمان عورتوں کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ جس طرح سورہ نوز کی تفسیر میں ہم بتا چکے ہیں کہ مسلمان عورتوں کے لیے اچھا نہیں ہے کہ وہ غیر مسلم عورتوں کے سامنے بغیر پردہ کے آئیں، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ چیزیں اپنے شوہروں سے جا کر بیان کریں۔ لہ

باقی رہا "ما ملکت ایمانہن" کا جملہ تو جیسا سورہ نوز کی تفسیر میں ہم کہہ چکے ہیں کہ اس کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں کینزلی بھی شامل ہیں اور غلام بھی، لیکن بعض روایات کے مطابق یہ حکم کینزول کے ساتھ مختص ہے۔ اسی بنا پر ممکن ہے کہ ان کا ذکر عورتوں کے کلی ذکر کے بعد اس لحاظ سے ہو کہ غیر مسلم کینزلی بھی اس حکم میں شامل ہوں (مؤرخ کیجیے گا)۔

گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔

تفسیر

آنحضرت پر درود و سلام،

گزشتہ آیات میں پیغمبر اسلام کی رحمت کی حفاظت کے لیے اور انہیں کسی قسم کی تکلیف اور آزار نہ پہنچانے کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے اور ان آیات میں پہلے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ خدا اور اس کے فرشتوں کا خصوصی تعلق اور گواہی بیان کیا گیا ہے۔ پھر اسی سے متعلق مومنین کو حکم دیا گیا ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ کو دکھ پہنچانے والوں کے لیے دردناک عذاب اور ان کے منحوس انجام کی خبر دی گئی ہے۔ آخر میں ان لوگوں کے عظیم گناہ کا تذکرہ کرتا ہے جو مومنین کو تہمت کے ذریعے تکلیف پہنچاتے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے۔ "خدا اور فرشتے نبی پر رحمت اور درود بھیجتے ہیں ان اللہ و ملائکتہ یصلون علی النبی"۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تہمت اس قدر بلند و بالا ہے کہ عالم ہستی کا آفریدگار اور حق تعالیٰ کے فرمان کے مطابق اس کائنات کی تدبیر کرنے والے فرشتے اس پر درود بھیجتے ہیں۔ اب جبکہ ایسا ہے تو تم بھی اس وسیع پیغام سے ہم آہنگ ہو جاؤ۔ اسے وہ لوگو! جو ایمان لائے جو ان پر درود بھیجو اور انہیں سلام کرو اور ان کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دو" (یا ایھا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیماً)۔

وہ عالم آفرینش کا ایک انمول گوہر ہیں اور اگر خدا کی مہربانی سے تمہیں میسر ہیں تو مبارک انہیں ارزاں سمجھ لو، مبارک اس کی عظمت اور مقام کو ذرا بخش کر دو جو خدا اور اس کے فرشتوں کے نزدیک ہے، وہ ایک ایسا عظیم الشان ہے، جو تمہارے ہی درمیان کھڑا ہے، لیکن وہ ایک عام انسان نہیں، بلکہ ایسا انسان ہے، جس کا وجود پوری کائنات کا خلاصہ ہے۔

چند قابل توجہ نکات

۱۔ "صلوات" کی جمع "صلوات" ہے اور جس وقت اس لفظ کو خدا کی طرف نسبت دی جائے تو رحمت نازل کرنے اور رحمت بھیجنے کے معنی میں ہوگا اور جب اس کی نسبت فرشتوں اور مومنین کی طرف ہو تو پھر طلب رحمت کے معنی میں ہوگا۔

۲۔ یہ عیب حسن اتفاق ہے کہ ان آیات کی تفسیر کی ابتدا شب میلاد رسول، ۱۰ ربیع الاول ۱۲۰۰ھ میں ہوئی ہے۔

۳۔ راجب نے معذرت میں اس معنی کو رد کیے نقلوں میں پیش کیا ہے۔

۵۶۔ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلٰی النَّبِيِّ
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا
تَسْلِيمًا

۵۷۔ اِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ
فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا
۵۸۔ وَالَّذِينَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ
بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدْ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّ
اِثْمًا مُّبِيْنًا

ترجمہ

۵۶۔ خدا اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں۔ اب سے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، تم بھی ان پر درود بھیجو اور سلام کرو اور ان کے فرمان پر سر تسلیم خم کرو۔

۵۷۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت پہنچاتے ہیں، خدا انہیں دنیا اور آخرت میں اپنی رحمت سے دور کر دیتا ہے اور اس نے ان کے لیے خوار کر دینے والے عذاب تیار کر رکھا ہے۔

۵۸۔ اور جو اہل ایمان مردوں اور عورتوں کو بلا وجہ اذیت پہنچاتے ہیں، وہ بتان اور واضح

۲- "تصلون" کو فعل مضارع کی صورت میں لانا اس کے استمرار کی دلیل ہے، یعنی ہمیشہ خدا اور فرشتے اس پر رحمت بھیجتے اور درود بھیجتے رہتے ہیں، مسلل اور جاودانی رحمت اور درود۔

۳- "صلوا اور صلوا" کے درمیان کیا فرق ہے؟ مفسرین نے اس پر بہت بحث کی ہے، لیکن جو کچھ ان دو الفاظ کے لغوی مفہوم اور قرآنی آیت کے ظاہری معنی سے معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ "صلوا" پیغمبر اکرم پر طلبِ رحمت اور درود بھیجنے کا حکم ہے۔

۴- "صلوا" تو وہ یا تو پیغمبر اسلام علیہ وآلہ وسلم کے احکام اور فرامین کے سامنے تسلیمِ فم کرنے کے معنی میں ہے جیسا کہ سورہ نسا کی آیت ۶۵ میں آیا ہے:

"ثُمَّ لَا يَجِدُ فِيهَا مِنْكُمْ مُرْتَابًا قَضَيْتَ وَيَلْمُوكَ لِيَمَانًا"

"مومن وہ ہیں جو آپ کے فیصلے کو دل و جان سے قبول کریں، حتیٰ کہ آپ کے کسی فیصلے میں ذرہ بھر

بھی ناراضی کا اظہار نہ کریں۔ بلکہ مطلق طور پر تسلیم کریں؟

نیز ایک روایت میں ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے ابولعبید نے عرض کیا: پیغمبر اکرم پر صلوات بھیجنے کو تو میں سمجھ گیا ہوں، لیکن اس تسلیم کا کیا معنی ہے؟ تو امام نے فرمایا:

"هو التسليم له في الامور"

"ہر کام میں ان کے سامنے تسلیمِ فم کرنا۔"

یا پیغمبر اکرم پر "التسليم لبارسول الله" اور اس قسم کے کسی طریقے سے سلام بھیجنے کے معنی میں ہے، جس کا مفہوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہِ خداوندی سے سلامتی کی درخواست کرنا ہے۔

ابو حمزہ ثمالی، پیغمبر اکرم کے کعب نامی ایک صحابی سے نقل کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ہم نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا: آپ پر سلام کرنا تو ہم جانتے ہیں، لیکن صلوات کس طرح بھیجنی ہے؟ تو آپ نے فرمایا یوں کہا کرو:

"اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ وَعَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ"

مجید، وبارک علی محمد و آل محمد و آل محمد کما بارکت علی ابراہیم و آل ابراہیم

انک حجید مجید

اس حدیث سے پیغمبر اکرم پر درود و صلوات کی کیفیت میں واضح ہو جاتی ہے اور سلام کا معنی بھی۔

۵- صحیح البیہان، اسی آیت کے ذیل میں اور دوسری حدیث شیعہ اور سنی کتابوں میں متعدد طریقوں سے قریب قریب ایک جیسے جملوں کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔ صحیح البیہان میں آیات کے ذیل میں یہ حدیث شیعہ اور اہل سنت کی کتابوں میں متعدد طریقوں سے تقریباً ایک جیسی جملوں کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔

۱- اگرچہ سلام کے یہ دونوں معانی مختلف نظر آتے ہیں، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو دونوں ایک ہی نقطے کی طرف پلٹتے ہیں۔ اور وہ ہے پیغمبر اکرم کے حضور قرآنی اور عملی تسلیم کیونکہ جو شخص ان پر سلام بھیجتا ہے اور خدا سے ان کی سلامتی طلب کرتا ہے تو درحقیقت وہ ان سے اپنے عشق اور محبت کا ثبوت دیتا ہے اور انہیں واجب الاطاعت پیغمبر کے طور پر تسلیم کرتا ہے۔

۲- یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ رسول اکرم پر صلوات بھیجنے کی کیفیت کے سلسلے میں بے شمار شیعہ اور سنی روایات میں صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ "محمد" پر صلوات بھیجنے وقت "آل محمد" کا اضافہ بھی کرو۔

۳- درمنثور میں صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، ابن مردودہ اور دیگر راویوں نے کعب بن عجرہ سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا:

"اما السلام عليك فتد علمنا فكيف الصلاة عليك؟"

"آپ پر سلام کرنا تو ہم جانتے ہیں، لیکن فرمائیے صلات کیسے بھیجی جائے؟"

تو آپ نے فرمایا: یوں کہو:

"اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ وَعَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ"

مجید، اللہم بارک علی محمد و علی آل محمد کما بارکت علی ابراہیم و آل ابراہیم

انک حجید مجید۔

۴- سیوطی تفسیر درمنثور کے مؤلف، نے اس حدیث کے علاوہ اٹھارہ دوسری احادیث بھی نقل کی ہیں، جن میں تصریح ہوئی ہے کہ صلوات میں "آل محمد" کا بھی ذکر کرنا چاہیے۔

ان احادیث کو اہل سنت کی مشہور و معروف کتب اور صحابہ کی ایک جماعت سے نقل کیا گیا ہے، جن میں ابن عباس، طلحہ، ابو سعید خدری، ابو ہریرہ، ابوسعید الخدری، ابرہہ، ابن مسعود، کعب بن عجرہ اور امیر المؤمنین حضرت علی شامل ہیں۔

۵- برادران اہل سنت کی مشہور حدیث کی کتاب صحیح بخاری میں اس بارے میں متعدد احادیث نقل ہوئی ہیں۔ مزید وضاحت کے لیے قارئین کرام اصل کتاب کی طرف رجوع فرمائیں۔

۶- صحیح مسلم میں بھی اس سلسلے میں درود آیات آئی ہیں۔

۷- کعب کی بات ہے کہ اس کتاب میں باوجودیکہ ان دو احادیث میں محمد و آل محمد کا کئی بار نام نہ نہ ہوا ہے، لیکن باب کا جو عنوان منتخب کیا گیا ہے وہ باب الصلاة علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم (ذکر آل کے بغیر) ہے۔

۸- تفسیر درمنثور آیت مذکورہ کے ذیل میں تفسیر المیزان جلد ۱۰ صفحہ ۱۰۰ کے مطابق:

۹- صحیح بخاری جلد ۱۰ صفحہ ۱۰۰

۱۰- صحیح مسلم جلد ۱۰ باب الصلاة علی النبی

۱۱- پاکستان میں بی بی ریوی، ڈی، اخبارات، کتب، رسائل اور تقاریر میں خصوصاً موسیٰ صاحبان جب آنحضرت کو کرتے ہیں تو صلی اللہ علیہ وسلم (بغیر آل کے ساتھ پر)

یہ کتب بھی قابل توجہ ہے کہ بعض اہل سنت اور متقدمین روایات میں "محمد" اور "آل محمد" کے ذمیان لفظ "علی" کے ساتھ تک بھی نہیں ہے اور صلاۃ کی کیفیت اس طرح ہے، "اللہم صل علی محمد و آل محمد" اس گفتگو کو ہم اسلام کے عظیم الشان پیغمبر کی ایک اور حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں، "ابن جریر کی اپنی کتاب صواعق میں نقل کرتے ہیں کہ آنجناب نے ارشاد فرمایا:

"لا تصلوا علی الصلاة البتراء فقالوا وما الصلاة البتراء؟ قال تقولون اللہم صل علی محمد و آل محمد و آل محمد و آل محمد" "مجھ پر بھی (ناقص اور) دم بریدہ صلوٰت نہ بھیجا کرو۔"

اصحاب نے عرض کی: حضور! وہ ناقص صلوٰۃ کیا ہے؟ فرمایا: اگر فقط اللہم صل علی محمد کہو اور اس سے آگے نہ بڑھو اور رک جاؤ بلکہ چاہیے کہ یوں کہا کرو، "اللہم صل علی محمد و آل محمد" لہ

اپنی روایات کی بنا پر اہل سنت کے بزرگ فقہاء کی ایک جماعت حضور ختمی مرتبت کے نام کے ساتھ "آل محمد" کے اضافہ کو نماز کے تشہد میں واجب سمجھتی ہے۔

۵۔ آیارسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلاۃ بھیجا واجب ہے یا نہیں، اگر واجب ہے تو کہاں کہاں واجب ہے؟ یہ وہ سوال ہے، جن کا جواب فقہانے دیا ہے۔

تمام فقہاء شیعہ اسے نماز میں پہلے اور دوسرے تشہد میں واجب سمجھتے ہیں اور اس کے علاوہ باقی تمام مقامات پر مستحب جانتے ہیں۔ علاوہ ان احادیث کے جو اہل بیت کے طریقوں سے اس سلسلے میں ہم تک پہنچی ہیں، کتب اہل سنت میں بھی وہ روایات کم نہیں جو وجوب پر دلالت کرتی ہیں۔

ان میں سے ایک مشہور روایت میں حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔

"سمعت رسول اللہ یقول لا یقبل صلاۃ الا بصلیہوں، وبالصلیة علی"

"میں نے رسول اللہ سے سنا انھوں نے فرمایا کہ نماز طہارت اور نماز پر دو بھیجے بغیر قبول نہیں ہوگی۔"

فقہاء اہل سنت میں سے امام شافعی دوسرے تشہد میں صلاۃ پڑھنا واجب سمجھتے ہیں اور امام احمد دوسرے کئی فقہاء کے بارے میں وہ طرح کی روایات نقل ہوئی ہیں، البتہ امام ابوحنیفہ جیسے بعض افراد اسے واجب نہیں سمجھتے۔

(پچھلے صفحہ کا پتہ عاشر، ہی لکھتے اور لہتے ہیں، "آلہ" ان نہیں کرتے، تعجب ہے (مترجم)

۱۔ صواعق محرقة ص ۱۲۱۔

۲۔ علامہ سلی کتاب تذکرہ کی بحث تشہد میں اس قول کو تمام علماء شیعہ کے علاوہ امام احمد بن حنبل اور بعض شافعیوں سے بھی نقل کرتے ہیں۔

۳۔ تذکرہ علماء علی جلد ۱ ص ۱۲۱۔

لطف کی بات یہ ہے کہ حضرت امام شافعی اس فقرے کو اپنے شعر میں نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں، یا اہل بیت رسول اللہ احبکم فرض من اللہ وفي القرآن انزلہ کفاکم من عظیمہ التدرانکم من لصل علیکم لاصلاۃ لہ "اے اہل بیت رسول! تمہاری محبت خدا کی جانب سے قرآن میں واجب قرار دی گئی ہے۔" تمہارے مقام کی عظمت کے لیے میں کافی ہے کہ جو شخص تم پر درود بھیجے اس کی نماز باطل ہے۔"

لہذا والی آیت حقیقت میں گوشت آیت کے نقطہ مقابل کو بیان کرتے ہوئے کہتی ہے۔ جو لوگ خدا اور اس کے رسول کو ایذا اور تکلیف پہنچاتے ہیں، خدا انہیں دنیا اور آخرت میں اپنی رحمت سے دور کر دیتا ہے اور ان کے لیے ذلیل و خوار کرنے والا عذاب تیار کیے ہوئے ہے، (ان الذین یؤذون اللہ ورسولہ لنعہم اللہ فی الدنیا والآخرۃ و عدلہم عذابا مہینا)۔

پروردگار کو ایذا پہنچانے سے کیا مراد ہے؟ کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ مراد کفر والحادیہ ہے، جو خدا کو عصیانگ کرتا ہے کیونکہ خدا کے بارے میں آزاد اور اذیت کا استعمال درحقیقت خدا کے غضب کے علاوہ کوئی دوسرا مفہوم نہیں ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ خدا کو ایذا دینے سے مراد رسول خدا اور مومنین کو ایذا پہنچانا ہو اور یہاں پر خدا کا ذکر اس مطلب کو اجاگر کرنے کے لیے ہے۔ لیکن پیغمبر اسلام کی ایذا کا ایک وسیع مفہوم ہے اور اس میں ہر وہ کام شامل ہے جو آپ کو ایذا پہنچانے خواہ وہ کفر والحادیہ ہو یا احکام الہی کی مخالفت، نیز آپ کی طرف ناروا نسبتیں اور تمسخریں یا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں اپنے گھر و عورتوں کو اس وقت آپ کے لیے زحمت پیدا کرنا جیسا کہ اسی سورہ کی آیہ ۵۳ میں بھی گزر چکا ہے۔ یعنی "ان ذالک کان یؤذون النبی..... تمہارا یہ کام پیغمبر کو تکلیف دیتا ہے۔"

یا وہ امر جو سورہ توبہ کی آیت ۶۱ میں آچکا ہے کہ پیغمبر اکرم کو آپ کی مشفقانہ گفتگو کی وجہ سے دشمن آپ پر سادہ لوحی اور خوش فہمی کا الزام دیتے تھے، جیسا کہ ارشاد الہی ہے:

"ومنہم الذین یؤذون النبی ویقولون ہواذن"

"ان میں سے کچھ لوگ وہ بھی ہیں جو نبی کو تکلیف پہنچاتے اور کہتے کہ وہ خوش فہم انسان ہیں جو ہر ایک

کی بات پر کان دہر لیتا ہے۔"

اور اسی قسم کی دوسری باتیں۔

بیان تک کہ اس آیت کے ذیل میں وارد ہونے والی روایات سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ خانہ زبان رسالت خصوصاً حضرت

۱۔ کتاب الغدیر، میں ان اشعار کی نسبت امام شافعی کی طرف "شرح المسواہب زرقانی" جلد ۱ ص ۱۱۱ میں ایک اذ

۲۔ جماعت سے بھی نقل کی گئی ہے۔

صلی اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دختر نیک اختر حضرت فاطمہ الزہراء علیہا السلام کو تکلیف دینا بھی اسی آیت میں شامل ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری جز ۱۰ ج ۱۰ ص ۱۰۰ میں آیا ہے کہ رسول خدا نے فرمایا۔

”فاطمہ بضعة منی فمن اغضبها اغضبنی“

فاطمہ میرا جگر کا ٹکڑا ہے، جو شخص اسے غضب ناک کرے گا، وہ مجھے غضب ناک کرے گا۔ لہٰذا یہ حدیث صحیح مسلم میں اس طرح آئی ہے،

”ان فاطمة بضعة منی یؤذینی ما اذاه“

”فاطمہ میرا ٹکڑا ہے جو چیز اسے تکلیف دیتی ہے، وہ مجھے تکلیف دیتی ہے۔“

آنحضرت کا اس سے ملنا جلتا زمان حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں بھی ہے، یہ

باقی رہا زبردست آیت میں لفظ ”تو جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، اس کا معنی ہے ”رحمت خدا سے دوری“ یہ بالکل رحمت اور سزا کے مترادف ہے، جس کا بیان اس سے پہلی آیت میں ہو چکا ہے۔

”لعن“ اور رحمت الہی سے دھتکا جانا اور وہ بھی خود خدا کی طرف سے کہ جس کی رحمت بے پایاں اور وسیع ہے، حقیقت عذاب کی بدترین قسم ہے، خصوصاً جب کہ رحمت سے یہ دوری دینا اور آخرت دونوں میں ہو۔ (جیسا کہ اسی آیت میں ہے) اور شاید اسی بنا پر ”لعن“ کا ذکر عذاب مہین سے پہلے ہوا ہے ”اعذت“ (تیار کر چکا ہے) کی تعبیر اس عذاب کی تاکید اور اہمیت کی دلیل ہے۔

اس سلسلے کی آخری آیت مومنین کی ایثار کے بارے میں گفتگو کرتی ہے اور خدا اور پیغمبر کے بعد اس امر کی حد سے زیادہ اہمیت بتاتی ہے، خدا تعالیٰ فرماتا ہے، جو لوگ صاحب ایمان مردوں اور عورتوں کو اس کا کسی وجہ سے جو انہوں نے انجام نہیں دیا آزار پہنچاتے ہیں وہ بہتان اور آشکارا گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں، (والذین یؤذون المؤمنین والمؤمنات بغیر ما کنتم سبوا فعدوا لہن وبالبنات واولادہن ما کفرتن)۔

کیونکہ مومنین، ایمان کی وجہ سے خدا اور اس کے رسول کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، اسی وجہ سے یہاں پر خدا اور رسول کے بعد اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

”بغیر ما کنتم سبوا“ کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ کسی ایسے گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے جو آثارِ داوید کا سبب ہو۔ بیس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جس وقت ان سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے جو حد، تقاضا یا تعزیر

لہ صحیح بخاری جز ۱ ص ۱۰۰

لہ صحیح مسلم جلد ۱ باب العتقائل نامہ۔

تہ مجمع البسیان اس آیت کے ذیل میں۔

کا موجب ہو تو پھر ان پر حدود و تقاضا وغیرہ کے اجراء میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بھی یہ چیزیں شامل نہیں ہیں۔

”بہتان“ کو ”اشعر مبین“ پر مقدم کرنا اس کی اہمیت کی وجہ سے ہے، کیونکہ بہتان کا شمار عظیم ترین اذیتوں میں ہوتا ہے اور اس کا زخم نیزے اور فخر کے زخم سے بھی زیادہ سخت ہوتا ہے، جیسا کہ کئی عرب شاعر نے کہا ہے،

جراحات السنان لها التقیام ولا یلتام ما یرح اللسان

نیزے کے زخم تو مندمل ہو سکتے ہیں، لیکن زبان کے زخم نہیں مل سکتے۔

اسلامی روایات میں اس بات کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ہم پڑھتے ہیں۔

خداوند عز و جل ارشاد فرماتا ہے:

”لیأذن بحرب منی من اغضب عدی المؤمن“

”جو شخص میرے دشمن کو تکلیف پہنچاتا ہے، وہ میرے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے۔“

یعنی مفسرین نے کہا ہے کہ آیت کے لہجے سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں کچھ لوگ رہتے تھے جو مومنین کے خلاف غلط افواہیں پھیلاتے اور ان کی طرف ناروا باتیں منسوب کرتے تھے (جسے کہ خود پیغمبر اسلام بھی ان موذیوں کی زبان سے محفوظ نہیں رہ سکے تھے)۔ وہی لوگ جو دوسرے مسائروں خصوصاً موجودہ دور میں کم نہیں ہیں، ان کا کام نیک اور مقدس لوگوں کے خلاف سازشیں تیار کرنا، جھوٹ بولنا اور بہتان تراشی کرنا ہوتا ہے۔

قرآن مجید انہیں اپنے سخت ترین عملوں کا نشانہ بنا تا ہے اور ان کے اعمال کو بہتان اور واضح گناہ قرار دیتا ہے۔ بعد والی آیت میں بھی اس سلسلے میں بات ہوگی۔

ایک اور حدیث میں جسے امام رضا علیہ السلام اپنے جبراً محمد حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کرتے ہیں، اس طرح آیا ہے،

”من بہت مؤمناً او مؤمنة او قال فیہ مالیس فیہ اقامہ اللہ تعالیٰ یومر

القیامة علی تل من نار حتی یمخرج منھا قائلہ فیہ“

”جو شخص مومن مرد یا مومن عورت پر بہتان باندھے، یا اس کے بارے میں کوئی ایسی بات کرے جس میں نہیں ہے

تو خدا سے قیامت میں آگ کے ٹیلے پر قرار دے گا اور وہ اس وقت تک وہیں رہے گا، جب تک اپنے آپ کے

کی سزا نہ پائے۔“

لہ اصول کافی جلد ۲ ص ۲۵۰

لہ بحار اور جلد ۱ ص ۱۹۲

۵۹- يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لَأُزَوِّجُكَ وَبَنَاتِكَ وَ
 نِسَاءَ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ
 جَلَابِيبِهِنَّ ذَلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ
 وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝

۶۰- لَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ
 مَّرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ لَنُغْرِبَنَّكَ
 بِهِمْ شَرًّا لَا يَحَاطُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا ۝
 ۶۱- مَلْعُونِينَ أَيْنَمَا ثَقِفُوا أَخَذُوا وَقَتَلُوا
 تَفْتِيلًا ۝

۶۲- سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ
 لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۝

ترجمہ

۵۹- اے پیغمبر! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مؤمنین کی عورتوں سے کہہ دیجئے کہ وہ
 اپنی اور حضیباں اپنے اوپر ڈال لیا کریں تاکہ (وہ کینزدوں اور گناہ سے آلودہ عورتوں سے
 الگ) پہچانی جائیں اور کسی کی طرف سے انہیں دکھ اور تکلیف نہ پہنچے
 اور (اگر اب تک خطا اور کوتاہی سمزد ہوئی ہے تو) خدا ہمیشہ غفور رحیم ہے۔

۶۰- اگر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے اور اسی طرح وہ لوگ بھی جو
 مدینہ میں جھوٹی خبریں اور بے بنیاد افواہیں پھیلاتے ہیں یا اپنی کارستانیوں سے باز
 نہ آئے تو ہم آپ کو ان کے خلاف تیار کریں گے، پھر وہ تھوڑی سی مدت کے سوا
 آپ کے نزدیک اس شہر میں نہیں رہ سکیں گے۔

۶۱- اور ہر جگہ سے دھتکارے جائیں گے اور جہاں کہیں ملیں گے گرفتار کر لیے جائیں
 گے اور قتل کر دیئے جائیں گے۔

۶۲- گذشتہ اقوام میں خدا کی یہی سنت جاری رہی ہے اور آپ خدا کی سنت میں کسی قسم
 کی تبدیلی نہیں پائیں گے۔

شان نزول

تفسیر علی بن ابراہیم میں پہلی آیت کی شان نزول یہ بیان کی گئی ہے کہ اس زمانے میں مسلمان عورتیں مسجد میں جا کر رسول پاکؐ
 کے پیچھے نماز پڑھا کرتی تھیں۔ رات کے وقت جب وہ مغرب اور عشاء کی نماز کے لیے جائیں تو کچھ بے ہودہ اور ادا باش فوجوان ان
 کے راستے میں بیٹھ جاتے اور اخلاق سے گری ہوئی باتیں کر کے انہیں تکلیف پہنچاتے اور ان کا راستہ روکتے۔ اس سلسلے میں یہ
 آیت نازل ہوئی اور انہیں حکم دیا گیا کہ وہ اچھی طرح سے پردہ کریں تاکہ واضح ہو سکے کہ یہ مسلمان عورتیں ہیں اور کوئی شخص مزاحمت
 کے لیے بہانہ نہ بنا سکیں۔

اس کتاب میں دوسری آیت کی شان نزول اسی طرح لکھی ہے کہ مدینہ میں منافقین کا ایک ٹولہ تھا جن کا کام یہ تھا کہ
 جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعض عورتوں پر جنگ کے لیے قشریف سے جاتے تو وہ آپ کے ہاتھ میں مختلف
 افواہیں پھیلاتا، کبھی کہتا کہ پیغمبر قتل ہو گئے ہیں، کبھی کہتا انہیں قید کر لیا گیا ہے، وہ مسلمان جو جنگ کرنے کی توانائی نہ رکھتے تھے
 اس سے انہیں سنت پریشانی ہوتی۔ جب پیغمبر اکرمؐ کے پاس اس امر کی شکایت کی گئی تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور ان افواہ
 پھیلانے والوں کو سنتی سے تنبیہ کر دی گئی۔

تفسیر

زبردست انتباہ:

خداوند عالم نے گذشتہ آیات میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کو ایذا اور تکلیف پہنچانے کی ممانعت کے لیے یہاں پر اذیت کے ایک اور مورد کا ذکر کیا ہے اور اس سے نبی کے دو طریقے بیان کیے ہیں۔ سب سے پہلے صاحبِ ایمان عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ ایسا کام نہ کریں جس سے بدھنیت لوگوں کے ہاتھ کوئی بہانہ آسکے۔ اس کے بعد منافقین، چھیڑ خوانی کرنے والے ادا باشوں اور انوائیوں سے چھوٹے والے عناصر کو زبردست تنبیہ کی گئی ہے اور ایسی زبردست تنبیہ جس کی مثال قرآنی آیات میں بہت کم ملے گی۔

پہلے جہت میں فرمایا گیا ہے۔ "آسے پیغمبر! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مومنین کی عورتوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی چادریں اپنے اوپر اوڑھ لیا کریں تاکہ واضح ہو جائیں اور انہیں کوئی اذیت نہ پہنچا سکے" (یا ایفک الشجی قیل لآ زواجک و بنا تلک و نساء المؤمنین یدنین علیہن من جلابیہن ذالک ادنف ان یسرفن فلا یسؤذین)۔

"یسرفن" (بچانے جانے) سے کیا مراد ہے؟ مفسرین کے درمیان اس بارے میں دو نظریے پائے جاتے ہیں۔ جو ایک دوسرے سے متضاد بھی نہیں ہیں۔ پہلا یہ کہ اس زمانے میں معمول تھا کہ کمزیری سرا اور گردن کو چھپانے بغیر گھر سے باہر نکلتی تھیں۔ اور چونکہ یہ کیفیت اخلاقاً لائقا سے اچھی نہیں تھی، لہذا کبھی کبھی ادا باش اور بے ہودہ قسم کے نوجوان ان سے چھیڑ خوانی کرتے تھے، لہذا یہاں پر آزاد مسلمان عورتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اسلامی حجاب کی مکمل طور پر پابندی کریں تاکہ وہ کمزوروں سے جدا پہچانی جائیں اور بے ہودہ اور ادا باش افراد کے لیے چھیڑ خوانی کا کوئی بہانہ نہ بنیں۔

واضح رہے کہ اس گفتگو کا مقہوم یہ نہیں ہے کہ ادا باش اور بد قماش لوگوں کو کمزوروں سے چھیڑ چھاڑ کا حق حاصل ہو گیا ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ بد نظرت لوگوں کے ہاتھوں میں کبھی قسم کا بہانہ باقی رہنے نہ پائے۔

دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ مسلمان عورتیں پردے کے بائیں میں سہل انگاری اور بے پردہی نہ برتیں، جیسا کہ بعض لاابالی قسم کی عورتیں پردے کے ہوتے ہوئے بھی بے پردہ ہوتی ہیں اور ان کے جسم کے زیادہ تر حصے نمایاں ہوتے ہیں۔ جو بے ہودہ افراد کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔

"جلباب" سے کیا مراد ہے؟ مفسرین اور ارباب لغت نے اس کے چند ایک معانی ذکر کیے ہیں،

۱- "لمفہ" (چادر) اور بڑا سا کپڑا جو دوپٹے سے بڑا ہوتا ہے اور سر اور گردن اور سینہ وغیرہ کو چھپا دیتا ہے۔

۲- مقنعہ اور غمار (دو پٹہ اور اوڑھنی)۔

۳- لمبا اور ڈھیلا ڈھالا کرتہ۔ لے

• اگرچہ یہ معانی آپس میں مختلف ہیں، لیکن ان سب کی قدر مشترک یہ ہے کہ بدن کو ایسے کپڑے کے ذریعے چھپایا جائے تو چہرے کے "جلباب" (جیم پر زبر اور زردوں سے پڑھا جاتا ہے) لیکن زیادہ بہتر یہ نظر آتا ہے کہ اس سے مراد پہنے کا وہ کپڑا ہے جو دوپٹے سے بڑا اور چادر سے چھوٹا ہوتا ہے۔ جیسا کہ لسان العرب کے مؤلف نے بیان کیا ہے۔ اور "یمنین" (تریب کریں) سے مراد یہ ہے کہ عورتیں اور عینیوں کو اپنے بدن کے قریب کریں تاکہ وہ ٹھیک طرح سے انہیں چھپا سکے نہ کہ اسے آزاد چھوڑ دیں کہ جو کبھی ہٹ جائے اور بدن نظر آنے لگے۔ یعنی وہ اسے لپیٹے رکھیں۔

باقی رہی یہ بات کہ اس جملے سے بعض لوگ یہ استفادہ کرنا چاہتے ہیں کہ چہرے کو بھی چھپایا جائے، تو اس مفہوم کی کوئی دلیل نہیں ملتی اور بہت کم مفسرین نے اس آیت کے مفہوم میں چہرے کے چھپانے کو داخل سمجھا ہے۔ لہذا ہم اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ پردے کا حکم آزاد عورتوں کے لیے اس سے پہلے نازل ہو چکا تھا، لیکن بعض عورتیں سادہ لوحی کی وجہ سے اس کی پابندی نہیں کرتی تھیں۔ اسی لیے یہ آیت تاکید کر رہی ہے کہ اس کی پابندی کرنے میں خوب توجہ سے کام لیں۔

چونکہ اس حکم کے نازل ہونے سے بعض صاحب ایمان عورتیں گذشتہ زمانے کی بابت نگرانی پر گئیں، لہذا آیت کے آخر میں اضافہ کیا گیا ہے: "خدا ہمیشہ مغفور و رحیم ہے" (وکان اللہ غفوراً رحیماً)۔

اگر تم سے اب تک اس معاملے میں کوتاہی ہوئی ہے تو چونکہ جہالت اور نادانی کی وجہ سے تھی لہذا خدا تعالیٰ بخش دے گا۔ توبہ کرو، اس کی طرف لوٹ آؤ اور عفت و پاک دامنی اور حجاب کے فریضے کو اچھی طرح انجام دو۔

صاحب ایمان عورتوں کو پردے کی پابندی کا حکم دینے کے بعد دوسرے مسئلے یعنی ادا باش اور اراذل ازاد کی تکلیف وہ کارروائیوں کو بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔ اگر منافقین اور بیار دل لوگ نیز وہ افراد بھی جو زمین میں جھوٹی انوائیوں سے چھپاتے ہیں، اپنی کارستانیوں سے باز نہ آئے تو ہم بھی آپ کو ان کے خلاف اٹھائیں گے اور آپ کو ان پر مسلط کریں گے، پھر وہ ایک مختصر سی تدریج کے علاوہ اس شہر میں آپ کے ساتھ نہیں رہ سکیں گے؛ (ان لمن لدیننا المنافقون والذین فی قلوبہم مرضی والمرجفون فی المدینۃ لغن ینذک بہم شتلا یجاورونک فیہا الا قلیلاً)۔

لے ملاحظہ ہوں یہ کتب: لسان العرب، مجمع البحرین، مطروحات، مغرب، نظر الموطأ از تاج العروس۔

۳- حجاب کے نکلنے اور اس کی اہمیت، اسی طرح اہل حق کے دکھائی تک استثناء کیلئے اس سے پہلے تفسیر ترمذی کی جلد ۱۱ سورہ نور کی آیت ۳۱ و ۳۲ کے ذیل میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

۴- "قلیلاً" یہاں پر ایک مزدلف سے مستثنیٰ ہے اور تقدیری طور پر اس طرح تھا: "لا یجاورونک زماناً الا زماناً قلیلاً"۔

”مرد حقون“ ”ارجاف“ کے مادہ سے ہے اور ایسی افواہیں پھیلانے کے معنی میں ہے جو دوسروں کو دکھ دینے کے لیے گھڑی جائیں اور یہ لکھ دراصل ”ارجاف“ یعنی اضطراب اور تزلزل کے معنی میں ہے اور چونکہ افواہیں عام لوگوں میں اضطراب پیدا کرتی ہیں، لہذا یہ لفظ ان کے لیے بولا جاتا ہے۔

”فقد نذقت“ ”اعتراف“ کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے، کسی کام کے انجام دینے یا کسی چیز کے حاصل کرنے کی دعوت دینا، جس میں ترغیب و تشویق اور برا بھلا سمجھنا شامل ہے۔

آیت کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں تین گروہ تخریب کاری میں مشغول تھے، ان میں ایک ٹوڈ اپنے ناپاک عزائم پورا کرنا چاہتا تھا اور یہ کام باقاعدہ سوچی سمجھی اور منظم منصوبے کے تحت انجام دیتا تھا نہ کہ شخصی اور انفرادی صورت میں پہلے تو وہ منافقین تھے جو اسلام کے خلاف اپنی سازشوں سے اسے تباہ کر دینا چاہتے تھے۔

دوسرے وہ ادب باش اور آوارہ لوگ تھے، جنہیں قرآن پاک ”دل کے پیار“ قرار دیتا ہے (الذین فی قلوبہم مرض) جیسا کہ یہی تعبیر اسی سورۃ (احزاب) کی آیت ۳۲ میں بھی ہوا ہے جس کے مرعین و شبوت پرست افراد کے بارے میں آئی ہے:

”فلا تقضعن بالتقول فیطمع الذی فی قلبہ مرض“

”اے ازواجِ رسول! جس وقت بات کرو تو زہری کے ساتھ بات نہ کیا کرو، وگرنہ دل کے مرعین لوگ تمہارے بارے میں طمع کرنے لگ جائیں گے۔“

تیسرے وہ لوگ تھے، جن کا کام مدینہ میں افواہیں پھیلانا تھا، خصوصاً ایسے مواقع پر جب پیغمبر خدا اور لشکرِ اسلام جنگ کو جاتے تو وہ مدینہ میں رہ جاتے اور ان کے حوصلے پست کرنے اور ان کے دلوں کو کمزور کرنے کے لیے رسول پاک اور مومنین کی شکست کی خبریں پھیلا کر شروع کر دیتے تھے۔

بعض مفسرین کے بقول یہ یہودیوں کا گروہ تھا۔ بہر حال قرآن مجید نے تینوں گروہوں کو زبردست سزائش کی ہے۔ آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ تینوں تخریبی پروگرام منافقین کی کارستانیوں تھیں ان کو الگ الگ کر کے اس لیے پیش کیا گیا تاکہ ان کے طریقہ و واردات کو واضح کر کے بتا دیا جائے۔

بہر حال قرآن کتابا ہے کہ اگر انہوں نے اپنے اس قبیح اور ناشائستہ کام کو جاری رکھا تو ہم ان کے خلاف ایک عمومی حملے اور یورش کا حکم صادر کر دیں گے تاکہ مومنین کے ایک ہی سردار و اہل اقدام سے مدینہ کے تمام منافقین کی کج کنی ہو جائے اور پھر وہ بھی اس شہر میں رہنے کے قابل نہ رہ سکیں۔

اور جب وہ اس شہر سے نکال دیئے جائیں گے اور اسلامی حکومت کی حفاظت سے محروم ہو جائیں گے تو جہاں کہیں بھی ملیں گے دھر لیے جائیں گے اور قتل کر دیئے جائیں گے ”مسلونین ایذاً تغتوا اخذوا وقتلوا تقتیلوا“۔

”تغتوا“ ”تقتلوا“ اور ”تقتلوا“ کے مادہ سے بڑی مہارت کے ساتھ کسی چیز کو حاصل کرنا ہے جو کلچر کو ثقافت کہا جاتا ہے تو وہ بھی ان مضموم کی بنا پر ہے۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ اس عمومی حملے کے بعد کہیں بھی امان نہیں پاسکیں گے اور انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کر دیا جائے گا آیا اس آیت سے مراد یہ ہے کہ انہیں مدینہ سے باہر تلاش کر کے قتل کر دیا جائے؛ یا عمومی جلا وطنی کے حکم کے بعد اگر وہ میں رہ جائیں گے تو اس قسم کے انجام سے دوچار ہوں گے؛ اس بارے میں دو احتمال ہیں اور دونوں میں کسی قسم کا تضاد موجود نہیں، وہ اس سے کہ اس سازشی، بیار دل اور افواہیں پھیلانے والے تخریب کار ٹوڈے سے جب اسلامی حکومت اپنی حفاظت کی ذمہ داری اٹھانے لگی تو انہیں مدینہ سے نکل جانے کا حکم مل جائے گا تو پھر وہ وہیں پر رہ جائیں یا وہاں سے نکل جائیں، شجاع اور جاہل کجف مسلمان اہل کبھی بھی امان سے نہیں رہنے دیں گے۔

پھر آخری آیت میں فرمایا گیا ہے: یہ کوئی ناپاک نہیں ہے بلکہ یہ خدا کی ہمیشہ سنت سے جو گذشتہ اقوام میں بھی تھی، اگر جس وقت کوئی تخریب کار اور معتمد ٹوڈے بے شری کا مظاہرہ کرے اور سازشیں کرنے میں حصہ لے گا یا اتنا تو ان کے لیے عمومی حملے کا حکم صادر ہو جائے گا، ”سنۃ اللہ فی الذین خلوا من قبلہ“۔

اور چونکہ یہ حکم ایک فطری سنت ہے، لہذا اس میں کبھی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہو سکتی، کیونکہ تم خدا کی سنت کے لیے کبھی تغیر اور تبدیلی نہیں پاؤ گے: ”اولسن تجد لسنة اللہ تبدیلاً“۔

یہ تعبیر حقیقت میں اس تشبیہ کو صحیح معنوں میں عملی جامہ پہنانے کو واضح کرتی ہے کہ وہ جان لیں کہ یہ بات قطعی اور یقینی ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہو سکتی، لہذا انہیں چاہیے کہ کیا تو اپنے شریناک اعمال میں تبدیلی پیدا کریں یا پھر اس قسم کے درناک انجام کے انتظار میں رہیں۔

چند ایک نکات

۱- پہل خود سے کرنا چاہیے: جو حکم ان آیات میں اسلامی حکم کو مکمل طور پر غور رکھنے کے سلسلے میں آیا ہے اور قرآن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہے کہ یہ حکم پہنچاؤ تو پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنی ازواج کو کو نظر رکھا گیا ہے، پھر آپ کی اولاد پھر مومن عورتیں اور یہ اس بات کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ ہر قسم کی اصلاح کا آغاز اپنے آپ اور اپنے گھرانے سے کرنا چاہیے اور یہی لامحہ عمل بنی نوع انسان کے تمام مسلمین کے لیے ہے۔

بیویوں اور اولاد میں سے پہلے بیویوں کا اس لیے ذکر کیا ہے کہ وہ انسان کے سب سے زیادہ قریب ہوتی ہیں، جبکہ اولاد کی شادی ہو جاتی ہے اور وہ اپنے شوہروں کے گھر منتقل ہو جاتی ہیں۔

۲- دونوں طریقوں سے بچاؤ: چونکہ اجتماعی برائیوں کا عام طور پر ایک سبب نہیں ہوتا، بلکہ کئی اسباب ہوتے ہیں لہذا ان کا ہر طرف سے مقابلہ ہونا چاہیے۔ مذکورہ بالا آیات میں بدعاش اور آواز لوگوں کی شرارتوں سے نمٹنے کے لیے صاحب ایمان عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ایسا کوئی کام نہ کریں، جس سے ان کے ہاتھ کوئی بہانہ آجائے اور دوسری طرف چھوڑ چھاڑ کرنے والوں کو زبردست سزائش اور تشبیہ کے ساتھ روکا گیا ہے اور یہ ایک دائمی

اور عمومی طریقہ ہے کہ دوست کی اصلاح کرنا پائیے اور دشمن کا طاقت کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیے۔

۳۔ مسلمانوں کی طاقت و پوزیشن: ان آیات کی سخت اور طاقت پر مبنی تفسیلات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے گئی تو دین میں مسلمانوں کی پوزیشن پورے طور پر مستحکم ہو گئی۔ اب صرف ان منافقین کی طرف سے مخالفت ہوتی تھی جو بطور ناشائستہ مسلمانوں کی صفوں میں گھسے ہوئے تھے، یا پھر ادبائش و آوارہ لوگ تھے یا پھر افواہیں پھیلانے والے، لہذا اس موقع پر آنحضرت نے ان سے طاقت کی زبان میں بات کی اور خبردار کیا کہ اگر وہ اپنے زہریلے پردہ پھینڈے اور ناپاک سازشوں سے دست بردار نہ ہوتے تو ایک ہی حملہ سے ان کا حساب چکا دیا جاتے گا، چنانچہ اس فیصلہ کن اور سوچی سمیٹی تہیہ نے اپنا اثر دکھا دیا۔

۴۔ فساد کو جڑ سے کاٹ دو: اسلام کے خلاف سازش کرنے والے منافقوں، مسلمانوں کی ناموس سے جھڑپ خانی کرنے والوں اور افواہیں پھیلانے والوں کی فتنہ پر بازیوں سے نمٹنے کے لیے مندرجہ بالا آیات نے جو طریقہ کار بتایا ہے، آیا وہ تمام زبانون میں اور تمام اسلامی حکومتوں کے لیے بھی اپنانا جائز ہے؟ اس بارے میں بہت کم مفسرین نے بحث کی ہے، لیکن یوں نظر آتا ہے کہ یہ حکم باقی اسلامی احکام کی طرح کسی زمان و مکان اور اشخاص کے ساتھ اختصا نہیں رکھتا۔

اگر واقعاً زہریلا پردہ پھینڈنا اور سازش حد سے گزر جائے اور ایک تحریک کی صورت اختیار کرے اور اسلامی معاشرے کو صحیح سمتوں میں خلافت سے دوچار کر دے تو کیا عروج ہے کہ اسلامی حکومت مندرجہ بالا آیات کے حکم کو نافذ کر دے اور لوگوں کو فساد کی جڑیں کاٹنے کے لیے ایک جھنڈے سے متوجہ کرے۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ اور اس قسم کے دوسرے امور خاص کر جنہیں تبدیل نہ ہونے والی سنت کہا گیا ہے، ان کا فائدہ انسان از خود نہیں کر سکتا بلکہ صرف اور صرف مسلمانوں کے ولی و سرپرست اور عالم شریعت کی اجازت سے نافذ کیا جا سکتا ہے۔ ان آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ قرآن نے خدا کی تبدیلی نہ ہونے والی سنتوں میں سے ایک اور یہ چیز گذشتہ امتوں میں بھی تھی۔ اس میں یہی تفسیر قرآن مجید کے ایک اور مقام پر بھی آتی ہے۔

مجملاً ان کے اسی سورہ احزاب کی آیت ۲۸ میں زمانہ جاہلیت کی ایک غلط رسم کو توڑنے کی اجازت صادر کی گئی ہے کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے عقد جائز ہے، پھر فرمایا گیا ہے:

”پیغمبر کے لیے جرم اور گناہ نہیں ہے کہ وہ اسرائیلی کو نافذ کریں چاہے جو بھی ہو“

پھر مزید ارشاد ہوتا ہے،

”سنۃ اللہ فی الذین خلوا من قبل وکان امر اللہ قد اقام مقدر وراہ“

یہ پروردگار کی سنت ہے جو گذشتہ اقوام اور انبیائے ماسلف میں بھی تھی اور خدا کا فرمان ثابت اور اٹل

معیار پر قائم ہے۔

سورہ فاطر کی آیت ۴۲ میں کفار اور مجرم اقوام کو بلاکت کی تہیہ کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے،

”فہل ینظرون الا سنۃ الاولین فلن تجد لسنة اللہ تبدیلاً ولن تجد لسنة اللہ تحویلاً“

”کیا وہ اسی جنس انجام کا انتظار کرتے ہیں، کہ جس نے پہلی قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، لیکن آپ کبھی سنت الہی میں تبدیلی نہیں پائیں گے اور نہ ہی سنت الہی کے لیے کوئی تغیر ہے۔“

سورہ مؤمن کی آیت ۸۵ کے مطابق گذشتہ اقوام میں سے ہر دھرم کفار تحسب تباہ کن عذاب کا مشاہدہ کیا تو اس موقع پر ایمان کا اظہار کیا، لیکن ایسا ایمان ان کے لیے مفید ثابت نہ ہو سکا۔ ارشاد ہوتا ہے،

”سنۃ اللہ الٰہی قد خلت فی عبادہ وخصم ہذا لک الکافرون“

”یہ خدائی سنت ہے جو گذشتہ زمانے میں بھی اس کے بندوں میں جاری ہو چکی ہے اور وہاں کفار نقصان اور خسارے میں گرفتار ہوئے۔“

یہ سورہ فتح کی آیت ۲۲ میں مؤمنین کی کامیابی، کفار کی شکست اور جنگوں میں ان کے لیے یار و مددگار نہ ہونے کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے،

”سنۃ اللہ الٰہی قد خلت من قبل ولن تجد لسنة اللہ تبدیلاً“

”یہ پروردگار کی سنت ہے جو گذشتہ زمانے میں بھی تھی اور خدا کی سنت ہرگز تبدیل نہیں ہوتی۔“

نیز سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۷۷ میں جہاں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بلاکت کرنے یا ان کا کام تمام کرنے کی سازش کو بیان فرمایا گیا ہے،

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے،

”اگر وہ اپنے اس منصوبے کو عملی جامہ پہناتے تو وہ بھی آپ کے بعض زیادہ دیر باقی نہ رہتے“

”سنۃ من قد ارسلنا قبلك من رسلنا ولا تجد لسنة لستنا تحویلاً“

”یہ ان پیغمبروں کی سنت ہے، جنہیں ہم نے آپ سے پہلے بھیجا ہے اور آپ ہماری سنت میں کوئی تبدیلی نہیں دیکھ پائیں گے۔“

ان آیات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ ایسے مواقع پر ”سنت“ سے مراد خدا کے ”تشریحی“ یا ”تجویزی“ ثابت اور اساسی قوانین ہیں، جن میں کبھی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ دوسرے لفظوں میں عالم تکون و تشریح میں خداوند عالم کے کچھ اصول و قوانین ہیں، جن میں کسی وقت بھی تبدیلی رونما نہیں ہوتی اور یہ ان اصول کے ساختہ و پرداختہ قوانین کی طرح تبدیلی کا شکار نہیں ہوتے یہ قوانین اقوام گذشتہ پر بھی حکم فرماتے اور آئندہ بھی نافذ رہیں گے۔

انبیاء کی مدد کرنا، کفار کو شکست دینا، خدائی احکام پر ضروری عمل کرنا خواہ ماحول اسے ناپسند کرے، عذاب الہی کے

نازل ہونے کے وقت توبہ کا مفید نہ ہونا اور اس قسم کے دور کے امور ان دائمی مشقتوں کا حصہ ہیں۔

اس قسم کی تعبیریں ایک طرف تو رواج کے تمام راہیوں کی جو مسدود فرمائی کرتی ہیں اور ان میں سکون کی نعمت حاصل کرتی ہیں اور دوسری طرف انبیاء کے اتحاد اور نظام آفرینش اور انسانوں کی زندگی کے نظام پر حاکم قوانین کے بچساں ہونے کو واضح کرتی ہیں جو درحقیقت دلائل توحید میں سے ہے۔

۶۳- يَسْأَلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ۗ قُلْ اَسْمَاعِلُهَا
عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُونُ
قَرِيْبًا ۝

۶۴- اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ۝
۶۵- خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ۗ لَا يَجِدُوْنَ وِلِيًّا
وَلَا نَصِيْرًا ۝

۶۶- يَوْمَ تَقْلُبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ
لِيَلِيْنَا اَطْعَمَنَا اللّٰهَ وَاَطْعَمَنَا الزُّسُوْلًا ۝
۶۷- وَقَالُوْا رَبَّنَا اِنَّا اَطْعَمْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرٰآءَنَا
فَاَصْلُوْنَا السَّبِيْلًا ۝

۶۸- رَبَّنَا اِنَّهُمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعٰذَابِ وَ
الْعَنْهَمُ لَعْنًا كَبِيْرًا ۝

ترجمہ

۶۳- لوگ آپ سے قیامت (کے وقت) کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہہ دیجیے: اس کا علم صرف خداوند عالم کے پاس ہے۔ اور آپ کو کیا معلوم کہ شاید قیامت نزدیک ہو۔

۶۲۔ خدا نے کافروں پر لعنت کی ہے اور انہیں اپنی رحمت سے دُور رکھا ہے (اور ان کے لیے جلانے والی آگ تیار کر رکھی ہے۔
۶۵۔ وہ اس میں اب تک رہیں گے اور وہاں ان کا نہ کوئی سرپرست ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔

۶۶۔ وہ دن جس میں ان کے چہرے (جہنم کی آگ کے باعث) تبدیل ہو جائیں گے (اور وہ اپنے کیے پر پچھتائیں گے اور کہیں گے اے کاش ہم نے خدا اور پیغمبر کی اطاعت کی ہوتی۔

۶۷۔ اور کہیں گے خداوند! ہم نے اپنے بڑوں اور وڈیروں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں گمراہ کیا۔

۶۸۔ پروردگار! تو انہیں دُگنا عذاب دے اور ان پر بڑی لعنت فرما۔

تفسیر

قیامت کب آئے گی؟

گذشتہ آیات اشارہ اور منافقین کے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں ان آیات میں ان کے تخریبی منصوبوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تو وہ استہزاء اور مغرور پن کے طور پر اور کبھی سادہ دل لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کر کے یہ سوال پیش کرتے تھے کہ قیامت ان اوصاف کے ساتھ جو محمدؐ بیان کرتے ہیں، کب برپا ہوگی؟ ارشاد ہوتا ہے: ”لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں (یسئلک الناس عن الساعة)۔“

یہ احتمال بھی ہے کہ بعض مومنین بھی تحقیق اور جستجو کی غرض سے یا معلومات میں اعانہ کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس قسم کا سوال کرتے ہوں، لیکن بعد والی آیات کی طرف توجہ کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ پہلی تفسیر آیت کے معنی سے زیادہ قریب ہے۔

اس بات کی کوہ ایک اور آیت ہے جو اس بارے میں سورہ شوریٰ میں آئی ہے،
”وما یدریک لعل الساعة قریب یتعجل بہا الذین لا یتؤمنون
بہا والذین آمنوا مشفقون منها ویعلمون انہا الحق“
”آپ کو کیا معلوم شاید قیامت قریب ہو، لیکن جو لوگ اس پر ایمان نہیں رکھتے اس کے لیے جلدی کرتے ہیں البتہ مومنین اس سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ حق ہے۔“

(شوریٰ ۷۸)

اس کے بعد موجودہ آیت میں انہیں اس طرح جواب دیا گیا ہے: ”اے پیغمبر! کہہ دیجیے اس بات کا علم صرف خدا کے پاس ہے اور خدا کے علاوہ دوسرا کوئی بھی اس سے آگاہ نہیں!“ (قل انما علمہا عند اللہ)۔
خواہ دعا بیدار مل ہوں یا ملک مقرب کوئی بھی میاں باخبر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔
پھر فرمایا گیا ہے: ”آپ کو کیا معلوم شاید قیامت نزدیک ہو؟“ وما یدریک لعل الساعة تکون قریبا۔

اسی بنا پر ہمیشہ قیامت کے انتظار میں رہنا چاہیے اور اصولی طور پر اس کے محض رہنے کا فلسفہ بھی یہی ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو امان میں نہ سمجھے اور قیامت کو دور خیال نہ کرے اور خود کو عذاب اور خدائی سزا سے محفوظ تصور نہ کرے۔
اس کے بعد کفار کو تنبیہ اور اس کے دردناک عذاب کی نوعیت کا ایک گوشہ پیش کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ”خدا نے کافروں کو اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور ان کے لیے جلانے والی آگ فراہم کر رکھی ہے!“ (ان الله لعن الکافرین واعدلہم سعیرا)۔

”وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس جلانے والی آگ میں رہیں گے اور اپنے لیے کوئی سرپرست اور مددگار نہ پائیں گے“
رخالدین فیہا ابدا لا یجدون ولیا ولا نصیرا)۔
خدا ہی تو ہے جو کسی کی مدد کرتا ہے تاکہ وہ اپنے مقصد تک پہنچ جائے، لیکن قیامت کے دن کفار کا نہ تو کوئی ولی ہوگا اور نہ ہی کوئی نصیر۔

اس کے بعد قیامت میں ان کے دنیاک عذاب کے ایک حصے کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ”اس دن کو یاد کرو جب ان کے چہرے جہنم کی آگ کے سبب بدل جائیں گے (یوم یقلب وجوہہم فی النار)۔
یہ تفسیر یا تو چہرے کے رنگ کے لحاظ سے ہو کہ کبھی وہ سُرخ اور نیلے ہو جائیں گے اور کبھی زرد اور پٹھرہ یا آگ کے شعلوں پر ہونے کے لحاظ سے، یعنی کبھی ان کی ایک سمت آگ پر ہوگی اور کبھی دوسری سمت (عاوانا اللہ)
یہ وہ مقام ہے، جہاں ان کی حسرت بھری آہیں بلند ہوں گی اور وہ فریاد کر کہیں گے اے کاش ہم نے خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہوتی!“ (یسئلون بی الیتنا اطعنا اللہ واطعنا الرسول)۔
اگر ہم اطاعت کرتے تو اس قسم کے دردناک انجام سے دوچار نہ ہوتے۔

اور کہیں گے پُروردگارا! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی تھی، انہوں نے ہمیں گمراہ کیا ہے» (روقا نوارینا انا اطعنا سادتنا وکبراءنا فاصفلونا السبیلا)۔
 "سادہ" - "سید" کی جمع ہے جو بڑے مالک کے معنی میں ہے، جس کے ذمہ اہم شہروں یا ملک کا نظم و نسق ہوتا ہے۔ اور "کبراء" "کبیر" کی جمع ہے اور بڑے لوگوں کے معنی میں ہے، خواہ یہ زندگی عمر کے لحاظ سے ہو یا علم کی وجہ سے یا معاشرتی طور پر۔

اس لحاظ سے لفظ "سادہ" معاشرے کے اہم افراد اور سرداروں کی طرف اشارہ ہے اور "کبراء" وہ لوگ ہوتے جو ان کے ماتحت رہ کر ان کے معاون اور مشیر کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ وہ کہیں گے کہ حقیقت میں ہم نے خدا کی اطاعت کے بجائے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی تھی اور انبیاء کی اطاعت کے بجائے "کبراء" کی اطاعت کی تھی اس لیے مختلف لغزشوں اور بدبختیوں کا شکار ہو گئے۔

دانش رہے کہ ان کے نزدیک "سیادت" اور "بزرگی" کا معیار صرف طاقت، لائٹھی، غیر شرعی مال و ثروت اور مکر و فریب تھا اور یہاں پر دو قبیلوں کا انتخاب اس لیے ہے کہ وہ کسی حد تک اپنے غدر کی توجیہ کریں گے اور کہیں گے کہ ہم ان کے ظاہری جاہ و جلال اور رعب و دبدبہ سے سرعوب ہو گئے تھے۔

اس موقع پر یہ گمراہ جنہی غصے میں پاگل ہو جائیں گے اور خدا سے اپنے گمراہ کرنے والوں کے لیے سخت عذاب کا مطالبہ کریں گے اور کہیں گے "خدا وندا! انہیں دو گنا عذاب دے۔ ایک تو ان کی اپنی گمراہی پر اور دوسرا ہمیں گمراہ کرنے پر" (ربنا اذقہم ضعفین من العذاب)۔

"اور ان پر بہت بڑی لعنت بھیج، (واللہم لعننا کبیرا)"

یقیناً وہ عذاب اور لعنت کے مستحق ہیں۔ لیکن "عذاب مضاعف" اور "لعن کبیر" کا استحقاق دوسروں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی وجہ سے رکھتے تھے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ سورہ اعراف میں ہے کہ جس وقت یہ گمراہ پیر و کار اپنے سرداروں اور پیشواؤں کے لیے کئی گنا عذاب کا تقاضا کریں گے تو ان سے کہا جائے گا:

"لکل ضعف ولکن لا تعلمون" (اعراف آیت ۳۸)

"ان کے لیے بھی کئی گنا عذاب ہے اور تم اسے لیے بھی نہیں تم جانتے نہیں ہو۔"

۱۔ "الرسول" اور "السبیلا" کے آفریں ہوائے ہے "الف اطلاق" کہلاتا ہے (جو کلام اور سوزی اکٹھے نہیں ہو سکتے) اور یہ آیتوں کے اعراض کی ہم آہنگی کے لیے ہے۔

۲۔ قابل توجہ یہ ہے کہ زمر بحث آیات میں "ضعیف" اور سورہ اعراف کی آیت میں "ضعف" آیا ہے۔ لیکن "ضعف" کے مفہم میں زور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ دونوں ایک ہی معنی کے حامل ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے کفر و ضلال کے عذاب کا کئی گنا ہونا تو واضح ہے۔ لیکن ان گمراہ پیر و کاروں کے عذاب کا کئی گنا ہونا کس بنا پر ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا ایک گناہ تو گمراہی کی جسے ہوگا اور دوسرا گناہ ظالموں کو تقویت پہنچانے اور ان کی کمک کرنے کی وجہ سے ہوگا۔ کیونکہ ظالم لوگ ایسے کسی کام کو آگے نہیں بڑھا سکتے، بلکہ ان کے یار و مددگار ان کے میدان کی آگ کو بھڑکانے اور ان کے ظلم و کفر کے ثور کو مزید گرم کرنے کے لیے وہ کام کرتے ہیں۔ پھر بھی باہمی تناسب سے پیشواؤں اور سرداروں کا عذاب زیادہ سخت اور دردناک تر ہوگا۔

اس بارے میں ہم اسی سورہ کی آیت ۳۰ کی تفسیر میں زیادہ تفصیل کے ساتھ گفتگو کر چکے ہیں۔

۶۹- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ
أَذَوَّأَ مُوسَىٰ فَبَرَّاهُ اللَّهُ مِمَّا قَالُوا وَكَانَ
عِنْدَ اللَّهِ وَجِيهًا ۝

۷۰- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا
سَدِيدًا ۝

۷۱- يُصَلِّحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ
ذُنُوبَكُمْ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ
فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ۝

ترجمہ

۶۹- اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا، جنہوں نے
موسیٰ کو تکلیف پہنچائی اور خدا نے موسیٰ کو اس چیز سے مبرا کیا جو وہ ان کے
حق میں کہتے تھے اور وہ خدا کے نزدیک آبرو مند اور (با عظمت) تھے۔

۷۰- اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، خدا سے ڈرو اور حق بات کرو۔

۷۱- تاکہ خدا تمہارے اعمال کی اصلاح کرے اور تمہارے گناہوں کو بخش دے
اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا، وہ عظیم کامیابی سے
سرفراز ہوگا۔

تفسیر

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ناروا تہمتیں،

گذشتہ آیات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احترام اور آپ کو کسی قسم کی اذیت نہ دینے کے حکم کے فورا
بعد ان آیات میں روئے سخن مؤمنین کی طرف کر کے قرآن کہتا ہے۔ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو۔ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ، جنہوں
نے موسیٰ کو اذیت پہنچائی۔ لیکن خدا نے موسیٰ کو ان تمام ناروا نسبتوں سے مبرا اور پاک قرار دیا اور وہ بارگاہ خداوندی میں آبرو مند
اور عظیم منزلت کے مالک تھے (یا ایہا الذین آمنوا لا تکونوا کالذین اذوا موسیٰ
فبرآہ اللہ مما قائلوا وکان عند اللہ وجیہا)۔

اذیت پانے والے انبیاء میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتخاب اس بنا پر ہے کہ بنی اسرائیل کے لوگوں نے
جب تکلیف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی اتنی کسی اور نبی کو نہیں پہنچائی۔ پھر کچھ تکلیفیں ایسی تھیں جو ان منافقین کی تکلیفوں سے
بلتی جلتی تھیں جو وہ رسول اسلام کو دیتے تھے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو تکلیف دینے سے کیا مراد ہے؟ قرآن مجید نے اسے کیوں مجمل طور پر
بیان کیا ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں علماء نے کئی احتمال ذکر کیے ہیں۔
جن میں سے یہ بھی ہیں کہ:-

۱- ایک روایت کے مطابق حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ ایک پہاڑ کی چوٹی پر گئے اور حضرت ہارونؑ کی دہاں بردفات
جوگنی، آفاہیں پھیلائے والے بنی اسرائیلیوں نے ان کی موت کا الزام حضرت موسیٰ پر رکھا، مگر خدا نے حقیقت امر کو واضح کر
دیا اور پروپیگنڈا کرنے والوں کی قلعی کھول دی۔

۲- جیسا کہ سورہ قصص کی آخری آیات کے ذیل میں ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ مکار قارون نے زکوٰۃ سے بچنے اور
فقر و مسکین کے حقوق ادا نہ کرنے کے لیے ایک سازش تیار کی اور وہ یہ کہ ایک بدکار عورت کو تیار کیا گیا کہ وہ اپنے
غیر مشروح ردالبط کے نام پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تہمت لگائے، لیکن خدا کی مہربانی سے نہ صرف یہ کہ سازش کارگر
ثابت نہ ہوئی، بلکہ اس شیطانی منصوبے کے برخلاف اس عورت نے حضرت موسیٰ کی پاکدامنی کی گواہی دے کر قارون کی
سازش کو طشت از باہم کر دیا۔

۳- حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں کے ایک ٹوٹے نے انھیں جاوہ، جنوں اور خدا پر جھوٹ کی نمت باندھنے کا الزام
دیا، لیکن خدا نے انھیں واضح معجزات کے ذریعے ان ناروا نسبتوں سے مبرا اور پاک قرار دے دیا۔

۴- بنی اسرائیل کے جاہلوں کی ایک جماعت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو برس وغیرہ جیسے چند ایک جسمانی عیوب

سے مہم کیا کیونکہ آپ نہانے دھونے کے وقت اپنے کپڑے لوگوں کے سامنے نہیں اتارتے تھے، چنانچہ ایک دن انھوں نے نہانے کی غرض سے لوگوں سے دُور جا کر کپڑے اتارے اور ایک پتھر پر رکھ دیئے اور وہ پتھر کپڑے کے چل دیا اور بنی اسرائیل نے ان کے بدن کو دیکھا یا کہ اس میں کوئی عیب نہیں ہے۔

۵۔ بنی اسرائیل کی حیل سازی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تکلیف کا ایک عامل تھی۔ کبھی تو وہ تقاضا کرتے کہ انھیں خدا کا دیوار کرایا جائے، کبھی کہتے کہ من و سلویٰ جیسی غذا ہمارے لیے مناسب نہیں ہے، کبھی کہتے کہ ہم اس بات کے لیے تیار نہیں ہیں کہ بیت المقدس میں داخل ہو کر علاقہ کے ساتھ جنگ کریں، تو اور تیسرا پروردگار ہاں جگہ کو فتح کرو۔ پھر ہم بعد میں آ بائیں گے۔

لیکن جو کچھ آیت کے معنی میں زیادہ قریب ہے وہ یہ ہے کہ آیت ایک کلی اور جامع حکم بیان کرتی ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مختلف طریقوں سے اذیت پہناتے تھے، جو مدینہ کے لوگوں کی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دی گئی بعض اذیتوں کے مشابہتیں، افزا ہیں پھیلائے طرح طرح کے جھوٹ گھڑتے اور آپ کی ایک بیوی کی طرف ناروا نسبت جیسی اذیتیں کہ جس کی تفصیل سورہ لوزی کی تفسیر (تفسیر نمونہ جلد ۸، ذیل آیہ ۲۰ تا ۲۱) میں گزر چکی ہے۔ یا جیسے وہ اعتراضات جو رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زینبہؓ سے ازدواج کے بارے میں تھے۔ یا وہ تکلیفیں جو آپ کے گھر میں آ کر پہناتے یا غیر مذہب طریقے سے آپ کو بیکار کرنے کے سلسلے میں اذیتیں تھیں۔

باقی رہا محرومیت وغیرہ کی نسبت یا بدنی عیوب کی بات اگرچہ یہ تہمتیں حضرت موسیٰ کے بارے میں تھیں۔ لیکن ”یا ایہا الذین امنوا“ کا خطاب پیغمبر اسلام کے بارے میں مناسبت نہیں رکھتا، کیونکہ مومنین نے نہ تو حضرت موسیٰ کو اور نہ ہی حضرت محمد مصطفیٰ کو محرومیت سے کبھی مہم کیا اور اس طرح جسمانی عیوب کا اہتمام بالفرض حضرت موسیٰ کے پاس میں تھا۔ اور خدا نے انھیں متبرک کیا، لیکن پیغمبر اسلام کے بارے میں تاریخ کوئی مثال پیش نہیں کرتی۔

بہر حال اس آیت سے یہ استفادہ ضرور کیا جاسکتا ہے کہ جس وقت کوئی شخص بلاگاہ خداوندی میں آبرو مند اور صاحب قدر و منزلت ہو تو خداوند عالم موزی لوگوں کی ناروا تہمتوں سے اس کا دفاع اور حمایت خود کرتا ہے۔ لہذا لیکر انسان کا اپنا دامن صاف ہو اور اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی آبرو مندی کا بھی پاس کرے، تو وہ بھی یقیناً انسان کی پاک دامن کو مناسب موقع پر بظاہر ہرگز دیتا ہے۔ اگرچہ بدخواہ قسم کے لوگ تہمت لگانے میں اڑیڑی چوٹی کا زور دے دیں کیوں نہ لگائیں۔ ہم نے اس بات کی تصدیق پاک دامن یوسف علیہ السلام کی داستان میں دیکھی ہے کہ کس طرح خدا نے انہیں عزیز مصر کی زوجہ کی خطرناک تہمت سے بری کر دیا۔

اسی طرح جناب عیسیٰ کی والدہ حضرت مریم کے بارے میں ہے کہ جن کے نوزاد شیخواری نے ان کی پائی دامال اور عفت کی گواہی دی اور ان پر طہینت اسرائیلیوں کی زبان بند کر دی جو انھیں مہم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطاب زمانہ پیغمبر کے مومنین سے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ ان کے بعد بھی عرصہ وجود میں قدم رکھیں اور ایسا کام کریں جو آپ کی روح مقدس کو رنجیدہ اور آزرده کر دے، آپ

کے دین کو حقیر سمجھیں، آپ کی تمام زحمات کو برباد کریں، آپ کی میراث کو چھلویں۔ تو یہ آیت ان کے لیے بھی ہوگی۔ اسی لیے بعض روایات جو اہل بیت سے وارد ہوئی ہیں ان میں ہے کہ ”جن لوگوں نے حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کو تکلیف پہنائی ہے وہ بھی اس آیت کے مشمول ہیں۔“

اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ جب ہم خدا کے عظیم پیغمبروں کے حالات کی طرف توجہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ بھی جاہل اور منافق قسم کے لوگوں کی زبان کے زخم سے محفوظ نہیں تھے تو کسی کو یہ توقع نہیں رکھنا چاہیے کہ پاک اور مومن لوگ اس قسم کے افراد سے محفوظ رہیں گے، جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں،

”ان رما الناس لا یحلف والستہم لا تضبط“
”نہ تو تمام لوگوں کی خوشنودی حاصل کی جاسکتی ہے اور نہ ہی تمام لوگوں کا منہ بند کیا جاسکتا ہے۔“
اور آخر میں فرماتے ہیں،

”کیا انھوں نے موسیٰ علیہ السلام پر کئی طرح کی تہمتیں نہیں لگائیں اور انھیں تکلیف نہیں پہنچائی؟ یہاں تک کہ خدا نے انہیں تمام اتہامات سے بری قرار دے دیا۔“

اعمال کی دستی کے لیے حق بات کیا کرو:

جبہ افزا پھیلائے داؤں اور زبان سے ایذا پہنچانے والوں کے بارے میں گفتگو ہو تو اس کے بعد والی آیت ایک حکم صادر کرتی ہے جو حقیقت اس عظیم معاشرتی مسئلے کا علاج ہے، چنانچہ خدا فرماتا ہے: ”اے وہ لوگو! جو ایمان لے آئے ہو، خدا کا تعویٰ اختیار کرو اور حق بات کہا کرو، (یا ایہا الذین امنوا اتقوا اللہ و قولوا قولا سدیداً)۔“

”سدید“ ”سد“ کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے ”محکم اور استوار“ جس میں کسی قسم کا خلل پیدا نہ ہو سکے اور وہ قول جو حق اور واقعے کے مطابق ہو، جو محکم ”سد“ (بند) کی طرح باطل کی موجوں کو روک دیتا ہے۔
یعنی مفسرین نے اسے ”صواب“ (درست) کے معنی میں لیا ہے اور بعض نے جھوٹے وعدوں سے پاک ہونے کا نیز بعض نے ظاہر اور باطن کے ہم آہنگ ہونے اور صلاح و درشتاد“ وغیرہ کے معنی میں اس کی تفسیر کی ہے۔ یہ سب معانی مذکورہ بالا جامع معنی کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

بعد والی آیت ”قول سدید“ اور ”حق بات“ کا نتیجہ یوں بیان کرتی ہے۔ ”خداوند عالم تعویٰ اور حق بات

لے فرشتے مہم مشت۔

لے تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۳۰۹

کہنا، پرتھارے اعمال کی اصلاح کرنا اور تھارے گناہوں کو معاف کر دینا ہے، ایصلح لکم اعمالکم و یغفر لکم ذنوبکم۔

حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ، اصلاح زبان کی بنیاد اور حق بات کا سرچشمہ ہے اور حق بات اصلاح اعمال کے موثر عوامل میں سے ہے، اور اصلاح اعمال گناہوں کی بخشش کا سبب ہے، کیونکہ:

«ان الحسنات یذہبن التیئات»

• نیک اعمال گناہوں کو ختم کر دیتے ہیں۔ (بخاری/۱۱۴)

علماء اخلاق نے کہا ہے کہ زبان بدن کا سب سے زیادہ بابرکت عضو اور اطاعت، ہدایت اور اصلاح کا سب سے موثر وسیلہ ہے اور اس کے باوجود بدن کے سب سے زیادہ خطرناک اور سب سے زیادہ گناہگار عضو بھی شمار ہوتا ہے۔

یہاں تک کہ تیس گناہان کبیرہ اس جھوٹے سے عضو سے جنم لیتے ہیں۔

ایک اور حدیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

«لا یتقیہ ایمان عبد حتی یتقیہ قلبہ ولا یتقیہ قلبہ

حتی یتقیہ لسانہ»

• کسی بندے کا ایمان اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا جب تک اس کا دل راست نہ ہو اور دل

اس وقت تک سیدھا نہیں ہو سکتا، جب تک اس کی زبان سیدھی نہ ہو۔

ایک اور قابل توجہ حدیث ہے جو امام زین العابدین علیہ السلام سے مروی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

«ہر شخص کی زبان روزانہ صبح کے وقت تمام دوسرے اعضاء کی اعمال پر پرسی اور خیریت دریافت کرتی ہے اور

۱۔ امام غزالی نے "حیاء العلوم" میں ایسی لغزشیں جو زبان سے سرزد ہوتی ہیں یا گناہان کبیرہ جن کا تعلق زبان سے ہوتا ہے

ذکر کیے ہیں۔ ۱۔ جھوٹ۔ ۲۔ طیبت۔ ۳۔ چغزل خوری۔ ۴۔ زبان سے منافقت کا اظہار۔ ۵۔ بے جا مدح و ثنا

(خوش آمد)۔ ۶۔ بد زبانی اور گالی دینا۔ ۷۔ غف اور غلط اشار۔ ۸۔ مزاح میں حد سے تجاوز۔ ۹۔ مسخرہ پن اور استہزاء۔ ۱۰۔ دُعا

کے راز فاش کرنا۔ ۱۱۔ وعدہ خلافی کرنا۔ ۱۲۔ بے جا لعنت کرنا۔ ۱۳۔ لڑائی جھگڑا۔ ۱۴۔ باطل امور میں گفتگو۔ ۱۵۔ زیادہ باتیں کرنا۔

۱۶۔ ایسے امور کے بارے میں گفتگو کرنا جو انسان سے متعلق نہیں ہیں۔ ۱۷۔ شراب، ہوا اور گناہ کی دوسری معنوں میں تعریف کرنا۔ ۱۸۔ ایسے

مسائل کے بارے میں سوال اور جستجو جو انسان کے اہاک سے لڑا رہیں۔ ۱۹۔ بات کرنے میں قطع اور تکلیف سے کام لینا۔ اس کے علاوہ

دس اور چیزیں کا نام اٹھا کر کرتے ہیں۔ ۱۔ تمسک لگانا۔ ۲۔ جھوٹی گواہی دینا۔ ۳۔ ناشائی اور بے بنیاد افواہیں پھیلانا۔ ۴۔ خود ستائی

۵۔ بے جا امر۔ ۶۔ گفتگو میں سختی کرنا۔ ۷۔ زبانی ایذا رسانی۔ ۸۔ ایسے شخص کی مذمت کرنا جو مذمت کا مستحق نہ ہو۔

۹۔ زبان کے ساتھ کفرانِ نعمت کرنا۔ ۱۰۔ باطل کا پرچار۔

۱۱۔ بھارالانوار جلد ۱، صفحہ ۷۔

کہتی ہے، کیف اصبحتم؟

• تم نے کیسے صبح کی؟

• وہ سب زبان کے اظہارِ محبت کے جواب میں کہتے ہیں: بخیر ان ترکتنا!

• خیریت ہے، اگر تو نے بہتے دی۔

پھر وہ مزید کہتے ہیں: تجھے ہم خدا کی تم دے کر کہتے ہیں کہ ہمارا خیال رکھنا۔

• اسما نشاب بلیک و نعاقب بلیک

• ہمیں تیرے ذریعے ثواب ملے گا اور تیری ہی وجہ سے عذاب ملے

• اس سلسلے میں بہت سی روایات ہیں جو سب کی سب زبان کے انتہائی زیادہ اثرات پر دلالت کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ انسانی نفوس کی تہذیب اور اصلاح اخلاق میں زبان کا بڑا کردار ہے۔ اسی بنا پر ایک حدیث میں ہے:

«ما جلس رسول اللہ علی هذا المنبر قط الا تلا هذه الآية یا ایہا الذین

امنوا اتقوا اللہ وقولوا قولا سديدا»

• جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اس منبر پر تشریف لیا ہوتے، تو اس آیت کی تلاوت

فرماتے، اے وہ لوگو! جو ایمان لاتے ہو، خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور سچی بات کہو۔

آیت کے آخر میں قرآن کہتا ہے: "جو شخص خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا، وہ بہت بڑی کامیابی سے

بھگتا رہے گا، ومن یطع اللہ ورسولہ فقد فاز فوزا عظیما»۔

کونسی کامیابی اس سے بالاتر ہوگی کہ انسان کے اعمال پاک ہوں، اس کے گناہ بخشے جائیں اور بارگاہ رب العزت میں سرخرو

اور سرزاز ہو کر پیش ہو۔

خدا ہمیشہ غفور و رحیم ہے۔

تفسیر

نوع بشر کا بہت بڑا اعزاز

سورہ احزاب کی یہ دونوں آخری آیات ان اہم مسائل کی تکمیل کرتی ہیں جو اس سورہ میں ایمان، عمل صالح، جہاد، ایثار، عفت و پاک دامنی، ادب اور اخلاق کے سلسلے میں آئے ہیں اور یہ بھی واضح کرتی ہیں کہ انسان کس قدر ممتاز حیثیت کا مالک ہے کہ خدا کی عظیم ذمہ داری کو اٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اگر اپنے وجود کی قدر و قیمت کو نہ سمجھتا اور اس سے جاہل ہو جائے تو کس طرح اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتا ہے اور اسلئے انسانوں میں جاگرتا ہے۔

پہلے تو انسان کے تمام عالم خلقت میں اہم ترین اور عظیم ترین اعزاز کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ہم نے اپنی امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی؟ (انا عرضنا الامانۃ علی السماوات والارض والجبال)۔

لیکن عالم خلقت کے ان عظیم اور بڑے موجودات نے اس امانت کے بوجھ کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور اپنی ناتوانی کا اظہار کیا اور اس کام سے ڈرتے تھے (فنا بین ان یحملنہا واشفقن منہا)۔ واضح ہے کہ ان کا انکار تجرک کی وجہ سے نہیں تھا، جیسا کہ شیطان اور آدم کو سجدہ کرنے سے اس کی روگردانی کرنے کے سلسلے میں بیان ہوا ہے،

الجب واستحکبر (بقروہ ۱۲۶)

بلکہ ان کا انکار "اشفاق" یعنی ایسے خوف ہراس کے ساتھ تھا، جس میں تو جبر بھی تھی اور ضروع و خشوع بھی۔ لیکن اسی اشاق میں انسان جو عالم آفرینش کا مجرب ہے، آگے بڑھا اور اس نے اس کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا؛ (وحملہا الانسان)۔ لیکن افسوس کہ اسی ابتداء ہی میں اس نے اپنے اوپر ظلم کیا اور اپنی قدر و منزلت کو نہ پہچانا اور جو کچھ اس امانت کے اٹھانے کے لائق تھا اسے انجام نہیں دیا؛ (ارثۃ کان ظلوماً جہولاً)۔

عظیم مفسرین نے اس آیت کے سلسلے میں بہت کچھ گفتگو کی ہے اور "امانت" کے معنی کی حقیقت معلوم کرنے اور بیان کرنے میں بہت زیادہ کوشش کی ہے اور مختلف نظریات کا اظہار کیا ہے، جن میں سے ہم بہترین نظریہ کو ان قرآنی کی جستجو سے منتخب کرتے ہیں، جو خود آیت میں پچھے ہوئے ہیں۔

بنیادی طور پر معانی اور مفہوم سے سبریز اس آیت میں یہ پانچ نکات زیادہ قابل غور ہیں۔

۷۲۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاِمَانَةَ عَلَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَبَايَنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا

۷۳۔ لَيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقَتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوبَ اللّٰهُ عَلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا

ترجمہ

۷۲۔ ہم نے امانت (ذمہ داری اور ولایت الہیہ) کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا، انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے لیکن انسان نے (اس کا بوجھ) اپنے کندھوں پر اٹھالیا، وہ بہت ہی ظالم اور جاہل تھا (اس نے اس مقام کی قدر و منزلت کو نہ پہچانا اور اپنے اوپر ظلم کیا)۔

۷۳۔ مقصد یہ تھا کہ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کی صفیں مومنین سے جدا ہو جائیں اور خدا (ان) کو عذاب دے، اور اپنی رحمت صاحب ایمان مردوں اور با ایمان عورتوں پر نازل کرے اور

۱- امانت الہی سے کیا مراد ہے؟

۲- اسے آسمان و زمین اور پہاڑوں کو پیش کرنے کا کیا مقصد ہے؟

۳- کیوں اور کس طرح ان موجودات نے اس امانت کے اٹھانے سے انکار کر دیا؟

۴- کس طرح انسان اس امانت کے بوجھ کا حامل ہوا؟

۵- کیوں اور کس طرح وہ "غسلوم" اور "جہول" ٹھہرا؟

"امانت" کے متعلق مختلف تفاسیر ذکر ہوئی ہیں، جن میں سے یہ بھی ہے کہ، اس سے مراد ارادے کی آزادی اور اختیار ہے جو ان کو باوجود ان سے ممتاز اور نمایاں کرتی ہے یا مراد عقل ہے جس پر ثواب و عذاب کا دار مدار ہوتا ہے۔ "امانت مراد" صفت جو ہر ایک کمال جو معرفت اور عمل صالح کے ذیلے حاصل ہوتا ہے یا اس سے مراد انسانی جسم کے اعضاء و جوارح "ہیں، مثلاً آنکھ خدا کی امانت ہے، جسے محفوظ رکھنا چاہیے اور اسے گناہ کی راہ میں صرف نہیں کرنا چاہیے۔ کان، ہاتھ، پاؤں اور زبان میں سے ہر ایک خدا کی امانت ہے، جن کی حفاظت کرنا ہر انسان پر واجب و لازم ہے۔

یا مراد وہ امانتیں ہیں جو انسان ایک دوسرے سے لیتے ہیں۔ اور عہد و پیمان کو پورا کرنا بھی مراد ہو سکتا ہے۔

یا مراد اللہ کی معرفت ہے۔

یا مراد "خدا کی واجبات اور فرائض الہی ہیں مثلاً نماز، روزہ اور حج وغیرہ۔

لیکن اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ ان تفاسیر کا آپس میں کوئی تضاد نہیں، بلکہ بعض کو ایک دوسرے میں مدغم کیا جاسکتا ہے، بعض لوگوں نے اصل مطلب کے کچھ حصوں کو اور بعض نے تمام گوشوں کو جاگرایا ہے۔

ایک جان جو اب کے حصول کے لیے ہمیں انسان پر ایک نظر ڈالنا چاہیے کہ اس کے پاس کونسی ایسی چیز ہے، جو نہ تو انسان اور زمین میں ہے اور نہ ہی پہاڑوں کے پاس؟

انسان ایک ایسی مخلوق ہے، جس میں انتہائی زیادہ استعداد موجود ہے اور وہ اس استعداد سے استفادہ کرتے ہوئے "خلیقۃ اللہ" کا مصداق آتم بن سکتا ہے اور کب معرفت، تہذیب نفس اور کمالات کے ذریعے عزت و افتخار اور اعزازات کی بلندیوں کو چھو سکتا ہے اور فرشتوں سے بھی آگے نکل سکتا ہے۔

یہ استعداد ارادہ و اختیار کی آزادی کے ساتھ ساتھ ہے۔ یعنی یہ ایک ایسا راستہ ہے جسے اس نے صفر سے شروع کیا ہے اور لائق ہی منزل مقصود کی طرف بڑھتا جا رہا ہے اور اپنے ہی ارادے اور اختیار سے اسے لے کر تباہ بنا رہا ہے۔

آسمان و زمین اور پہاڑ بھی ایک طرح کی معرفت الہی کے حامل ہیں، وہ خدا کا ذکر اور تسبیح بھی کرتے ہیں اور اس کی عظمت کے سامنے گڑ گڑانے والے اور سجدہ گزار بھی ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ ذاتی، تنہائی اور چہرے شکل میں ہے۔ اسی بنا پر ان کے وجود میں نکال اور ارتقا نہیں ہے۔

صرف ایک موجود ایسا ہے، جس کی نزولی اور صعودی قوس لائقا ہی ہے اور غیر محدود طور پر ارتقائی بلندیوں تک پرواز کر سکتا ہے اور ان تمام کاموں کو اپنے ارادہ و اختیار سے انجام دیتا ہے اور وہ "انسان" ہے۔ یعنی یہ ہے وہ

خدا کی امانت اٹھانے والا جس کے اٹھانے سے تمام موجودات نے انکار کر دیا۔ یوں اکیلے اُس نے میدان میں متحرک سے اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ اسی لیے ہم بعد والی آیت میں دیکھتے ہیں کہ انسان کو تین گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے، مومن، کافر اور منافق۔ اسی بنا پر ایک مختصر سے جملے میں کہا جاسکتا ہے کہ امانت الہی وہی غیر محدود صورت میں ارتقائی قابلیت ہے، جس میں ارادہ اور اختیار کی آمیزش ہوتی ہے، جس سے وہ انسانیت کے کمال اور خدا کی خاص بندگی کے مقام تک پہنچ کر ولایت الہیہ کو قبول کرنا ہے۔

لیکن یہ صرف اس امر کو "امانت" سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے، جبکہ ہماری ساری زندگی اور ہمارا سب کچھ خدا کی امانت ہے؟ درحقیقت یہ چیز انسان کے اس اہم اور عظیم امتیاز کی بنا پر ہے، وگرنہ خدا کی باقی نعمتیں بھی اسی کی امانت ہیں، لیکن اس کے مقابلے میں ان کی بہت ہی کم اہمیت ہے۔

یہاں پر امانت الہی کا ایک اور مفہوم لیا جاسکتا ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ "امانت الہی" سے مراد "عہد اور ذمہ داری" کو قبول کرنا ہے۔

اسی لیے جن لوگوں نے امانت کو ارادہ و اختیار کی آزادی کی صفت سمجھا ہے، انھوں نے اس عظیم امانت کے صرف ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اسی طرح جن لوگوں نے اس کی تعبیر "عقل" یا "اعضاء بدن" یا "لوگوں کی آپس کی امانتیں" یا "فرائض و واجبات" یا "تمام شرعی احکام کی ادائیگی بیان کی ہے، ان میں سے ہر ایک نے ایک عظیم پھل وار درخت کی صرف ایک شاخ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے اور اس کا ثمر حاصل کیا ہے۔

یا امانت کے پیش کرنے سے مراد اشتیاق کا باہمی موازنہ کرنا ہے، یعنی جب اس امانت کا ان کی استعداد سے موازنہ کیا تو انھوں نے زبان حال کے ساتھ اس عظیم امانت کو قبول کرنے سے اپنی عدم اہلیت کا اعلان کیا۔

دوسرا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے اور اس طرح سے آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں نے زبان حال سے پکار کر کہا کہ اہی امانت کا بوجھ اٹھانا ہمارے بس کی بات نہیں۔

یہاں سے تیسرے سوال کا جواب بھی واضح ہو گیا کہ کس طرح ان موجودات نے اس عظیم امانت کے اٹھانے سے انکار کیا اور بڑے ادب کے ساتھ اپنا خوف و ہراس ظاہر کر دیا۔

میں سے ان کی اس امانت الہی کے اٹھانے کی کیفیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔

کیونکہ انسان اس طرح سے پیدا کیا گیا ہے جو ایفائے وعدہ اور ذمہ داری کے بوجھ کو اپنے کندھوں پر اٹھا سکتا ہے، خدا کی ولایت کو قبول کر سکتا ہے، عبودیت اور کمال کے جاوہ پر گامزن ہو سکتا ہے اور اس راہ کو پروردگار کی مدد سے اپنے ہی پاؤں کے ساتھ لے کر سکتا ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ اہل بیت اطہار علیہم السلام کے ذریعے پہنچنے والی متعدد روایات بتاتی ہیں کہ اس امانت الہی سے مراد "امیر المؤمنین علی اور ان کی اولاد و اجداد علیہم السلام کی ولایت ہے۔ تو اس کا مقصد یہ ہے کہ انبیاء کرام اور ائمہ اطہار کی ولایت درحقیقت اس ولایت مطلقہ الہیہ کی ایک طاقتور شاخ ہے اور اولیاء خدا کی ولایت کو قبول کیے بغیر عبودیت تک رسائی اور ارتقا کی جاوہ پیمانی قطعاً ناممکن ہے

امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے جب کسی نے "عرض امانت" والی آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

"الامانة المولایة من ادعاها بغیر حق کفر"

"امانت وہی ولایت ہی تو ہے، جس کا ناحق دعویٰ کرنے والا مسلمانوں کے زمرے سے خارج ہو جاتا ہے۔" ۱

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے جب اس آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال ہوا تو آپ نے فرمایا:

"الامانة المولایة، والانسان موابو الشرور المنافق"

"امانت وہی ولایت ہے اور انسان جس کی ظلم و جہول سے توصیف کی گئی ہے، بہت سے گناہوں کا مرتکب اور منافق ہے۔" ۲

ایک اور جگہ جس کی طرف یہاں پر اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، یہ ہے کہ ہم سورہ اعراف کی آیت ۱۰۲ کے ذیل میں عالم ذر کے بارے میں بتا چکے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب خدا نے انسان سے عالم ذر میں توحید کا اقرار لیا تھا وہ انسان کی فطرت، استعداد اور سرشت کے ذریعے تھا۔ درحقیقت عالم ذر، عالم استعداد و فطرت کا دوسرا نام ہے۔

اسی طرح خدائی امانت کے قبول کرنے کے بارے میں بھی یہی کہنا ہوگا کہ یہ قبولیت کسی مقررہ قاعدہ کلیہ کے تحت یا محض تکلف کی بنا پر نہیں تھی بلکہ عالم استعداد کے مطابق ایک تکنیکی قبولیت ہے۔

اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ ہے انسان کے "ظلم و جہول" ہونے کا مسئلہ۔ کیا انسان کی توصیف ان دو الفاظ کے ساتھ جو ظاہر طور پر اس کی مذمت کر رہے ہیں، اس امانت کے قبول کرنے کی وجہ سے ہے؟

یقیناً اس سوال کا جواب منفی ہے، کیونکہ اس امانت کو قبول کر لینا انسان کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔ اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ اتنا بڑا اعزاز حاصل کر لینے کے بعد اس کی مذمت کی جائے؟

یا تو یہ توصیف اس بنا پر ہے کہ انسان بہت سیسیان کا شکار ہوتا ہے اور اپنی ذات پر ظلم کرتا رہتا ہے اور آدمیت کی قدر و منزلت سے نا آشنا ہے، جس کام کی ابتدا ہی سے نسل آدم میں "قابل" کے ذریعے بنیاد پڑ چکی تھی اور قابل کے نقوش قدم پر چلنے والوں نے اسے آگے بڑھایا اور اب تک اسے جاری رکھے ہوئے ہے۔

۱۔ تفسیر بیان جلد ۳ ص ۳۳۳۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۲۔ تفسیر بیان جلد ۳ ص ۳۳۳۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

وہ انسان جسے عرش کی لمبیلوں سے صدا آتی رہتی ہو، وہ بنی آدم جس کے سر پر "کرمنا" کا تاج سجایا گیا ہو، وہ انسان جو "لاخ جاعل فی الارض خلیفة" کے مصداق زمین میں خدا کا نمائندہ ہوندا بشر جو علم اور سجد ملائکہ ہو وہ "ظلم و جہول" نہیں تو اور کیا ہوگا کہ جو اپنی ان عظیم اقدار کو طاق نسیان میں رکھ کر خود کو اس عالم کا امیر بنا لے اور شیاطین کی صف میں شامل ہو کر اسفل السافلین کی اہتقاہ گہرائیوں میں جا کرے۔

لیکن بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس اخوانی راستے پر چلنے والے لوگ عرصہ دراز سے چلتے آ رہے ہیں۔ جو انسان کے "ظلم و جہول" ہونے کی قوی دلیل ہے۔ حتیٰ کہ خود حضرت آدم علیہ السلام جو بسلسلہ آدمیت کی پہلی کڑی اور پہلا عصمت کے مقام پر فائز تھے، اپنے اوپر ظلم کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں۔ بارگاہ خدایں عرض کرتے ہیں:

"ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا و ترحمنا لنکونن من الخاسرین"

(سورہ اعراف ۲۳)

درحقیقت اس عظیم امانت کی عظمت کے ایک گوشے کو فراموش کرنے کی بددلت ہی ان سے ترک اولیٰ سرزد ہوا تھا بہر حال اعتراف کرنا پڑے گا کہ انسان جو ظاہر چھوٹی اور کمزوری مخلوق ہے، لیکن تخلیق عالم کا ایک ایسا مجرب ہے، جس نے اس عظیم امانت کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھایا ہے، جسے اٹھانے سے زمین و آسمان اور پالا عا جزا گئے تھے۔ ہاں اس کے مقام پر عظمت اسی صورت میں ہے کہ وہ اپنے اس مقام کو قبول جائے۔

بعد والی آیت حقیقت میں انسان کے سامنے اس امانت کو پیش کرنے کی عہدت ہے اور اس حقیقت کا بیان ہے کہ انسان اس عظیم خدائی امانت کا بار اٹھانے کے بعد تین حصوں میں بٹ گئے۔ منافق، مشرک اور کافر۔ چنانچہ خدائی امانت ہے۔ مقصد یہ ہے کہ خدا منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو ان کے کیفر کرنا تک پہنچائے نیز خدا صاحب ایمان مردوں اور با ایمان عورتوں پر رحمت نازل کرے، خدا ہمیشہ سے غفور رحیم ہے (العیاذ باللہ المتفتن والمتفات والمشرکین والمشرکات ویسویب اللہ علی المؤمنین

۱۔ جو کچھ ہم نے آیت کی تفسیر میں کہا ہے، اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس امر کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ ہم آیت میں کسی چیز کو مقررہ نہیں۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے اور انہوں نے آیت کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ آسمان زمین اور پہاڑوں کے سامنے امانت پیش کرنے سے مراد ان ہی رہنے والوں کے سامنے امانت پیش کرنا ہے، لیکن ملاحظہ اور منہ تھوڑے کے سامنے ہی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ جن چیزوں نے امانت کو قبول کرنے سے انکار کیا انہوں نے اسے ادا کرنا اور قبول کرنے کو انہوں نے خیانت کا ارتکاب کیا، یہ تفسیر صرف تقدیر کی احتیاج کی بنا پر غلط ظاہر ہے، بلکہ اس لحاظ سے بھی قابل اعتراض ہے کہ فرشتے بھی ایک طرح کی مخلیق پر عمل پیرا ہیں اور ایک حصہ امانت کے حامل ہیں۔ ان سب باتوں سے قطع نظر، پہاڑیں رہنے والوں کو فرشتوں سے تعبیر کرنا عجیب و غریب ہی ہے۔

(ملاحظہ کیجئے گا)

والسُّؤْمَاتِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا ذَلِيلًا)۔

عربی قلمہ کے تحت "لیعذب" کی "لام" کو کونسی لام ہے؟ اس سلسلے میں دو احتمال ہیں،
۱- ایک یہ کہ "لام غایت" ہے جو کسی چیز کے انجام کو بیان کرنے کے لیے ذکر ہوتی ہے۔ اس بنا پر آیت کا مفہوم یوں ہوگا:

۱- اس امانت کو اٹھانے کا انجام یہ ہوا کہ ایک گروہ نے نفاق کی راہ اختیار کی اور ایک گروہ نے شرک کی، اور اس خدائی امانت میں خیانت کرنے کی وجہ سے اس کے عذاب میں گرفتار ہوئے اور اہل ایمان کا ایک گروہ اس امانت کو ادا کرنے اور اپنے ذائقے پر قائم رہنے کی بنا پر رحمت الہی کا مستحق قرار پایا۔
۲- دوسرا یہ کہ یہ لام علت ہے اور اس میں ایک جملہ مقدم ہے۔ اس بنا پر آیت کی تفسیر یوں ہو گی:
"امانت کو بیٹھنے کے لیے مقدمہ تھا کہ تمام انسان آزمائش کی کٹھالی میں قرار پائیں اور ہر شخص اپنے اپنے باطنی حالات کو ظاہر کر کے اپنے استحقاق کے مطابق جزا اور سزا پائے۔"

چند اہم نکات

۱- اہل نفاق کو مشرکین پر مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ منافق اپنے آپ کو "آئین" ظاہر کرتا ہے۔ حالانکہ وہ خائن ہوتا ہے۔ لیکن مشرک کی خیانت واضح ہے۔ اس لیے منافق عذاب کا زیادہ مستحق ہوتا ہے۔
۲- ان دونوں گروہوں کو مؤمنین پر مقدم کرنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ گورشتہ آیت کا آخری حصہ "ظلم اور جہول" پر ختم ہوتا ہے اور ظلم و جہول "منافق اور مشرک کے ساتھ مناسب ہے۔ منافق ظالم اور مشرک جاہل ہے۔"
۳- لفظ "اللہ" منافقین اور مشرکین دونوں کے عذاب کے بارے میں ایک مرتبہ آیا ہے اور مؤمنین کی جزا کے سلسلے میں بھی ایک مرتبہ آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انجام کے لحاظ سے پہلے دونوں گروہ ایک جیسے ہیں اور مؤمنین کا معاملہ ان سے بالکل جدا ہے۔

۴- مؤمنین کے بارے میں "جزا" کے بجائے "توبہ" کا لفظ آیا ہے۔ اس کی زیادہ تر وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ انھیں زیادہ تر خوف اپنی ان لغزشوں کی وجہ سے ہوتا ہے جو کبھی کبھی ان سے سرزد ہوتی ہیں۔ لہذا خداوند تعالیٰ انہیں اطمینان دلاتا ہے کہ ان کی لغزشوں کو معاف کر دیا جائے گا۔

یا اس بنا پر ہے کہ خدا کا بندوں کی توبہ قبول کرنے کا مقصد اس کی رحمت کی طرف بازگشت ہوتا ہے اور معلوم ہے کہ لفظ "رحمت" میں ہر قسم کی جزا اور بخشش بھی ہوتی ہے۔

۵- پروردگار کی "غفور و رحیم" کے ساتھ توصیف یا تو اس لیے ہے کہ یہ کلمہ "ظلم" اور "جہول" کے مقابلے میں یا پھر مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کے بارے میں توبہ کی مناسبت سے۔

اب جبکہ ہم فضل پروردگار سے سورہ احزاب کے اختتام کو پہنچ گئے ہیں، اس نکتے کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں کہ اس سورہ کے آغاز و انجام کی ہم آہنگی نہایت ہی قابل غور ہے۔ کیونکہ یہ سورہ احزاب (یا غیر کو خدا کا تقویٰ اختیار کرنے اور کفار منافقین کی اطاعت سے رکنے اور خدائے علیم و حکیم کی ذات پر تکیہ کرنے سے شریع ہوئی ہے اور انسان کی زندگی کے عظیم ترین مسئلے یعنی امانت الہی کے اٹھا لینے کے ذکر پر اور پھر انسانوں کو تین گروہوں (منافق، کافر اور مؤمن) میں تقسیم کرنے اور خدائے غفور و رحیم کا ذکر کرنے پر ختم ہوئی ہے۔

ان دونوں مباحث کے درمیان ان تینوں گروہوں سے متعلق گفتگو ہوئی ہے کہ انہوں نے امانت الہی کے ساتھ کس طرح سلوک کیا ہے؟ جو سب ایک دوسرے کی تکمیل اور ایک دوسرے کو واضح کرتی ہیں۔

پروردگار! ہمیں ایسے لوگوں میں سے قرار دے، جنہوں نے تیری امانت کو غلوں دل کے ساتھ قبول کیا اور عشق کی حد تک اس کی حفاظت کی اور اپنے فریضے سے عہدہ برا ہوئے۔

خداوند! ہمیں ایسا مؤمن بنا، جس پر تیری رحمت اور مغفرت نازل ہوئی ہے۔ منافقین اور مشرکین سے قرار نہ دے کہ جو "ظلم و جہول" ہونے کے باعث عذاب کے مستحق ٹھہرے ہیں۔

خداوند! اس دور میں جبکہ "احزاب کفر" دوبارہ "مدینہ اسلام" کا محاصرہ کر چکے ہیں۔ ان پر اپنے غیظ و غضب کا خوفناک طوفان نازل فرما اور ان کے تصور و محلات کو ان کے سروں پر گرا دے اور ہمیں ایسی طاقت و استقامت عطا فرما کہ ان حساس لمحات میں پھاڑ کی طرح ڈٹ جائیں اور اپنے جان و دل سے "مدینہ اسلام" کی پاسداری کریں۔ آمین یا رب العالمین!

سورہ احزاب تمام شد

تفسیر نمونہ کی سترھویں جلد کا اختتام بروز جمعہ ۲۲ ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ کو ہوا۔

تفسیر نمونہ

جلد ۱۰

کا ترجمہ

اس تحقیر پر تفسیر — سید صفدر حسین نجفی فرزند سید علامہ سرور نقوی (رحمہم)
کے ہاتھوں

برسکان _____ سیٹھ نواز شمس علی ۸۱، اسی ماڈل ٹاؤن لاہور
 بوقت _____ ۱۰ بج کر ۲۵ منٹ
 بتاریخ _____ ۲۳ جمادی الثانی ۱۳۶۶ھ
 بمطابق _____ ۱۳ فروری ۱۹۴۶ء
 شبِ جمعہ

اقتسام پذیر خواہا۔

الحمد لله واخسرًا والمصلوة علی النبی والہ ابداً اشدًا۔

سید صفدر حسین نجفی



ادارہ امانیہ قرأت کالج

تشریح و تفسیر

یہ کتاب قرآن مجید پاک (تفسیر نمونہ جلد ۹)
 کے تحت تشریح و تفسیر کے تحت تفسیر ہے
 تصدیق کرتا ہوں کہ قرآن مجید پاک (تفسیر نمونہ جلد ۹)
 یا فقط غلط نہیں ہے۔

واللہ اعلم بالصواب
 حافظ محمد طفیل (سلفی لائسنس)

مدیر/مدیر

امامیہ قرأت کالج

اندر واپس پورہ واڑہ - لاہور

اشعار سے پہلے

زیر نظر اشاریہ تفسیر نمونہ کے قارئین اور محققین کی سہولت کے لیے خود مصباح القرآن ٹرسٹ نے مرتب کروایا ہے۔
یاد رہے کہ فارسی کی اصل اشاعتوں میں اشاریہ موجود نہیں ہے۔ اس طرح مصباح القرآن ٹرسٹ کو اس سلسلے میں پہل کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہو رہا ہے۔

ہماری کوشش ہوگی کہ آئندہ دیگر جلدوں کی اشاعتوں میں بھی اشاریہ شامل کر کے انہیں مفید تر بنایا جائے۔

اشاریوں کی عام رُوکش سے بہت کر زیر نظر اشاریہ میں تفسیر میں موجود قرآنی لغت کے زیادہ دقت طلب الفاظ کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ جن کتابوں سے مؤلف مہتمم نے استفادہ کیا ہے ان کی تفصیلی فہرست بھی پیش کرنی گئی ہے۔

عالم پیری میں یہ کٹھن اور بزرگانہ کام مہتمم سید شکیل حسین موسوی نے انجام دیا ہے۔ خدا تعالیٰ ان کی توفیقات میں اضافہ کرے اور انہیں خدمتِ اسلام اور قرآن کے لیے طولِ عمر سے نوازے۔

آپ کی آراء اور تنقید اس سلسلے کو بہتر اور موثر بنانے کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

انچارج

شعبہ تصحیح و ترتیب

مصباح القرآن ٹرسٹ

اشاریہ

تفسیر نمونہ جلد ۹

ترتیب و ترتین ----- سید شکیل حسین موسوی

سید محمد حسین زیدی الباہروی

مضامین:

۷۶۰	اصول و عقائد
۷۶۶	احکام
۷۶۸	اخلاقیات
۷۶۹	اقوام گذشتہ
۷۷۰	شخصیات
۷۸۶	علماء و دانشور
۷۸۷	کتب سماوی
۷۸۸	کتب تاریخ و تفسیر و سیر
۷۹۱	لغات قرآن
۷۹۸	متفرق موضوعات
۸۱۲	مقامات

اصول و عقائد

اسمائے باری تعالیٰ

اللہ	۲۰۲، ۱۸۹، ۱۳۶، ۱۳۱، ۱۲۷، ۱۰۹، ۰۲۹
	۳۰۹، ۲۷۵، ۲۶۸، ۲۳۶، ۲۳۱، ۲۲۵
	۳۹۲، ۳۷۸، ۳۶۳، ۳۵۰، ۳۳۳، ۳۳۵
	۶۶۹، ۶۵۳، ۶۴۲، ۶۰۶، ۵۷۹، ۵۴۵
	۷۷۷، ۷۷۷، ۷۷۷، ۷۷۷
بصیر	۳۵۲، ۳۵۰
حق	۳۵۲، ۳۵۰
حکیم	۲۶۰، ۲۳۸، ۲۳۵، ۲۱۵، ۲۱۰، ۲۰۴، ۲۸۳، ۲۳۱
	۵۴۱، ۳۵۲، ۳۵۰، ۳۱۳، ۳۰۹، ۲۷۹
حلم	۶۹۵
حمید	۳۵۲، ۳۵۰، ۳۲۳
خبیر	۶۲۱، ۵۴۲، ۳۶۳، ۳۵۲، ۳۵۰، ۳۳۵
رب	۵۰۷، ۴۷۷، ۳۰۳، ۱۸۹، ۱۶۰، ۱۲۶، ۷۶
رحمن	۳۷۷، ۳۰۶، ۳۸
رحیم	۲۹۰، ۳۷۷، ۳۰۶، ۲۹۸، ۲۹۳، ۵۳، ۲۸
	۷۷۷، ۶۸۸، ۵۴۵
رقیب	۷۰۰
سبحان	۳۱۵

سیح

شہید

عزیز

علی

علم

غفور

غنی

قدیر

قوی

کبیر

لطیف

وکیل

ولی

توحید

توحیدِ خالص، خیر کی طرف دعوت دینے والے
آنکھ زور۔

اللہ کا کرم ہے کہ ہدایت کیلئے پیغمبر بھیجتا ہے
ہم ان کے پاس پے درپے آیاتِ قرآن
بھیجتے رہے۔

۳۵۲، ۳۵۰، ۲۶۸، ۱۸۰

۷۱۷

۳۰۹، ۳۳۸، ۳۳۵، ۲۹۸، ۲۹۳، ۲۳۱

۳۹۰، ۳۸۵، ۳۵۲، ۳۵۰، ۳۱۳

۳۵۲، ۳۵۰

۶۹۵، ۵۴۱، ۳۶۳، ۲۷۵، ۲۶۸، ۱۸۰

۷۰۵

۷۷۷، ۶۸۸، ۵۸۵، ۵۴۵، ۵۳

۳۵۲، ۳۵۰، ۳۲۳

۶۶۹، ۶۵۳

۵۸۵

۳۵۲، ۳۵۰

۶۲۱، ۳۳۵

۶۷۷، ۵۴۱

۵۷۱

۱۰۹	اللہ ہی جسے چاہتا ہے ہدایت فرماتا ہے ہم نے بہت سی ایسی بستیوں کو جو نعماتِ دنیا پر مغرور ہو گئی تھیں ہلاک کر ڈالا۔
۱۱۷	۱۲۱
۱۲۱	کہاں ہیں وہ جنہیں تم میرا شریک جانتے تھے؟ اللہ ان شرکاء سے منتر ہے جن کے وہ قائل ہیں، تیرا رب جانتا ہے جو کچھ ان کے سینوں میں ہے۔
۱۲۶	اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کی طرف پلٹنا ہے۔
۱۲۷	اول دآخر اسی کی حمد ہے، وہی حاکم ہے اسی کی طرف پلٹنا ہے۔
۱۳۰	اگر اللہ قیامت تک رات ہی رکھنا چاہے تو کون ہے جو تمہارے لیے دن کی رات سکے، یا وہ دن ہی رکھنا چاہے تو رات کون لاسکتا ہے۔ تم سنتے سمجھتے کیوں نہیں؟ جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس سے آخرت کا کھم تلاش کر، فساد نہ کرنا، اللہ فسادوں کو پسند نہیں کرتا۔
۱۳۱	۱۳۷
۱۳۷	اللہ کے سوا کسی اور معبود کو مت پکارو، اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔
۱۴۰	سورہ قصص کی آخری آیات میں توحید کو واضح کیا جو دین کی اصل بھی ہے اور فرع بھی۔
۱۴۳	اللہ بے نیاز ہے۔
۱۸۰	

۲۰۲	جسے مستحق سمجھتا ہے، عذاب دیتا یا رحم فرماتا ہے ہم نے اس (لوٹو کی) بستی کی کھلی نشانی عقل مندوں کے لیے چھوڑ دی۔
۲۲۰	ہم نے عاو، ثمود، قارون، فرعون، ہامان کو ہلاک کر دیا وہ ہم پر کیسے سبقت لے جا سکتے تھے! اللہ کا ذکر بڑا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُسے جانتا ہے۔
۲۲۶	۲۳۶
۲۳۶	اُسے بندو جو ایمان لائے ہو! کسی کے دباؤ میں نہ آؤ۔ میری زمین دین ہے (ہجرت کرو) میری ہی عبادت کرو۔
۲۶۸	کتنے جاندار ہیں اپنا رزق نہیں اٹھا سکتے، اللہ ہی انہیں رزق دیتا ہے۔
۲۶۹	اللہ آسمانوں، زمینوں، شمس و قمر کا خالق ہے، روزی کی نگلی و فراخی، بارش، سب اسی کے ہاتھ میں ہے۔
۲۷۶	۲۷۹
۲۷۹	لائی حمد و ستائش وہی اللہ ہے اللہ نیکو کاروں کے ساتھ ہے
۲۸۴	انسان شہودِ باطنی سے اس کی عظمت کو پہچانے گا اللہ آفرینش کا آغاز کرتا ہے، حمد و ستائش اسی کے لیے ہے۔
۳۱۰	اللہ کے پاک و خالص دین کی طرف رُوح کرو، یہی وہ فطرت ہے جس پر انسان کو پیدا کیا گیا، یہی محکم و استوار دین ہے۔
۳۲۳	

- ۳۱۵ اللہ پاک ومنتزہ ہے۔
اللہ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، تم روئے زمین پر پھیل گئے، تمہارے سکون کے لیے ارجح پیدا کیں، زمین و آسمان پیدا کیے، تمہارے رنگ و زبان مختلف بنائے، خدا نے واحد ہی مالک حقیقی ہے۔
- ۳۲۰ توحید ایک فطری اصول ہے
توحید انسان کی قوی، داخلی قوتِ جاذبہ ہے۔
- ۳۲۴ جبّت و فطرت کی بحث۔
ضرر پہنچے تو اللہ کو پکارتے ہیں۔ دفع تکلیف کے بعد ایک گروہ مشرک ہو جاتا ہے۔
- ۳۵۲ اللہ جس کی چاہتا ہے روزی تنگ یا کشادہ فرما دیتا ہے، اس میں مومنین کے لیے نشانیاں ہیں۔
- ۳۶۰ اللہ تو وہ ہے جو پیدا کرتا، روزی دیتا، مارتا اور جلاتا ہے۔ کیا کوئی اور بھی یہ کام کر سکتا ہے کوئی اس کا شریک نہیں۔
- ۳۶۱ اللہ کے حکم سے ہوا بارش کی خوشخبری لاتی ہے، کشتیاں چلتی ہیں، رسول روشن دلیلوں کے ساتھ آئے۔ جب نصیحت کا اثر نہ ہوا تو انتقام لیا۔
- ۳۸۶ تا ۳۸۹ اللہ وہ ہے جس نے تمہیں کمزور (بچہ) پیدا کیا، پھر جوانی دی، پھر ضعفِ پیری اور موت دی۔
- ۳۹۲ تا ۳۹۳ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے

- آسمانوں کو بغیر ستون پیدا کیا، زمین میں پہاڑ بنائے، پانی نازل فرمایا، نباتات کے جوڑے پیدا کیے۔ کیا اللہ کے علاوہ بھی کسی نے کچھ پیدا کیا؟
- ۴۲۰ ہم نے نعمان و حکمت دی اس کا شکر ادا کرو
۴۲۲ نعمان نے بیٹے سے کہا کسی کو اللہ کا شریک نہ بناؤ
۴۲۳ میرا شکر ادا کرو اور والدین کا شکر یہ ادا کرو
۴۲۹ جو کچھ زمین و آسمان میں ہے اسے تمہارے لیے مسخر کیا۔ تمہیں ظاہری و باطنی نعمتوں سے نوازا۔
- ۴۳۳ زمین و آسمان کا خالق کون؟ اللہ۔ درخت، قلم، سمندر سیاہی بن جائیں، اللہ کی صفات لکھیں تو وہ ختم نہ ہوں گی۔ اللہ حق ہے۔
- ۴۵۱ اسمائے سنیٰ، تمام مراحل عبادت میں نفی شرک اور لزوم توحید پر قوی دلائل۔
- ۴۵۸ کشتیاں اللہ کے حکم سے چلتی ہیں، مومنین گھر لیتی ہیں تو یہیں یاد کرتے ہیں، لیکن نجات کے بعد کچھ شکر گزار رہتے ہیں اور کچھ کفر اختیار کر لیتے ہیں۔
- ۴۵۹ مصیبت کے وقت خالص توحید انسان کے دل کا احاطہ کر لیتی ہے۔
- ۴۶۲ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو
۴۶۳ اللہ نے آسمانوں اور دونوں کو چھ دنوں (ادوار) میں پیدا کیا۔

- ۴۷۰ پانچ علوم جو اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں وہی جو اس جہان کے امور کی تدبیر کرتا ہے، خلقت کا آغاز کرتا ہے اور پھر اسے پلٹا دیتا ہے۔ اللہ آشکار و مخفی سے باخبر ہے، اللہ مہربان ہے۔
- ۴۸۲ اللہ نے ہر شے عمدہ پیدا فرمائی، انسان کو مٹی سے بنایا اور اس کی نسل کو بے قدر پانی سے پیدا کیا، موزوں جسم بنایا، پھر اپنی روح کو اس میں داخل فرمایا۔ کان، آنکھیں اور دل بنائے تاکہ تم شکر کرو۔
- ۴۹۰ تا ۴۹۱ اللہ نے کسی شخص کے وجود میں دو دل پیدا نہیں کیے، نہ تمہاری بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو، تمہاری مائیں بنایا، نہ منہ بولے بیٹوں کو حقیقی بیٹے بنایا۔ تم غلط بات کرتے ہو، اللہ حق بات کرتا ہے۔
- ۵۲۶ تمام انبیاء کے فرائض میں شامل تھا، بلکہ وہ پابند تھے کہ سب سے پہلے توحید کی دعوت دیں۔
- ۵۶۱ اللہ پر ایمان لانے والو! اس کی نعمات کو یاد کرو اور وہ وقت بھی یاد رکھو جب لشکرِ عظیم تم پر چڑھا آیا تو تم نے فرشتوں کے ذریعہ انہیں تر و بالا کر کے تمہیں فتح دی۔
- ۵۶۵

عدل

- عدلِ خدا یہ ہے کہ نیکی کی جزا بڑھا کر دیتا ہے مگر گنہگار کو اس کے عمل کی ذرہ بھر زیادہ سزا نہ ہوگی۔
- ۱۵۸ ہم صاحبانِ ایمان و عمل کو اچھا بدلہ دیں گے اور ان کے گناہوں کو چھپالیں گے۔
- ۱۸۰ اللہ جسے مستحق جانتا ہے عذاب دیتا ہے اور رحم فرماتا ہے۔
- ۲۰۲ سب کو ان کے گناہوں کے سبب پکڑا، ہم نے ظلم نہیں کیا۔ وہ خود ہی ظالم تھے۔
- ۲۲۶ اللہ ایسا نہ تھا جو ان پر ظلم کرتا۔ انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا۔
- ۳۰۵ کفار و مشرکین کے ساتھ بھی عدل ہوگا۔ اتنی سزا ہی ملے گی جتنی کے مستحق ہیں۔
- ۳۷۳
- یہ اللہ کا لطف و کرم ہے کہ ہدایت کے لیے پیغمبر بھیجتا ہے۔
- ۱۰۰ کتاب میں جو کچھ تم پر نازل کیا گیا ہے اسے پڑھا کرو۔
- ۲۳۶ کہہ دیجیے نبوت کے لیے میرے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے۔
- ۲۵۹ تا ۲۶۳ اقرباء، مساکین اور مسافروں کا حق ادا کرتے رہو۔
- ۳۶۱، ۳۶۰

اے رسول! صبر کرو، اللہ کا وعدہ سچی ہے ۲۹۵، ۲۹۴
اسے نبی تقویٰ اختیار کرو، کفار و مشرکین
کی اطاعت نہ کرو۔

۵۴۱

پیغمبر مومنین کی جانوں سے اولیٰ ہے اور اس کی
ازواج ان کی مائیں شمار ہوتی ہیں، دوستوں سے
نیکی کرو، اپنے اموال ان پر خرچ کرو۔ ۵۴۶
اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تینوں سے عدلیا
تمہارے لیے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین
نمونہ ہے۔ ۵۸۵

وہ اللہ کے پیغامات کی تبلیغ کرتے اور صرف
اسی سے ڈرتے تھے اور کسی سے خوف نہیں
کھاتے تھے۔ ۶۵۳

محمدؐ کسی مرد کے باپ نہیں بلکہ اللہ کے رسول
ہیں اور خاتم النبیین ہیں۔ ۶۵۸

امامت

ہمارا ارادہ ہے کہ مستضعفین پر احسان کریں
زمین کا وارث اور اہل زمین کا پیشوا بنائیں
توحید خالص، خیر کی دعوت دینے والے،
ائمہ نور ہیں۔ ۹۱

ہم نے ان (نبی اسرائیل) میں ائمہ قرار دیے
جو ہمارے حکم سے انہیں ہدایت کرتے ہیں۔ ۵۲۳

ہم نے بار امانت (ولایت اللہ) کو آسمانوں، زمین اور

ہمازوں پر پیش کیا، وہ ڈر گئے اور انکار کیا،
لیکن انسان نے اسے اٹھالیا۔ ۷۵۵ تا ۷۶۹

قیامت

فرعون کا، نادر مبارک و معاد ۸۹
قیامت کے دن کوئی ان کا مددگار نہ ہوگا
وہ قیامت کے دن داعی الی النار ہوں گے،
ان کے چہرے مکروہ و سیاہ ہوں گے۔ ۹۱
قیامت کے دن وہ اپنے گروہ کے آگے چلے گا
اور انہیں آگ میں داخل کرے گا۔ ۹۳
وہ دن کہ اللہ نڈا دے گا: "کہاں ہیں وہ جنہیں
تم میرا شریک بناتے تھے۔ ۱۲۲، ۱۲۱

اس دن کا خیال کرو جب اللہ فرمائے گا کہ
تم نے مرسلین کے ساتھ کیا کیا، اس دن خبریں
پروردہ رہیں گی، سوال بھی نہ کر سکیں گے۔ ۱۲۶

سب کچھ اسی کی طرف لوٹ جائے گا
جو اللہ سے ملاقات کا یقین رکھتا ہے اسے اس
کی اطاعت کرنا چاہیے، یقیناً اللہ کا مقررہ
وقت آنے والا ہے۔ ۱۸۰

افتراد کرنے والوں سے قیامت میں پوچھا جائے گا
جیسے اس نے پہلی بار پیدا کیا، اسی طرح دوسری
دوبارہ پیدا کرے گا۔ اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔
جنہوں نے آخرت کا انکار کیا معذب ہوں گے۔ ۲۰۲

کیا نہیں دیکھتے کہ اللہ پیدا کرتا اور واپس لوٹاتا ہے؛ ۲۰۰
ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا اور میری طرف
لوٹ کر آنا ہے۔ ۲۶۸

بہت سے لوگ (قیامت اور) اپنے رب
کی نقاد کے مُنکر ہیں۔ ۳۰۳
کیا ممکن ہے کہ ہم خاک ہو جانے کے بعد زندہ
ہو جائیں؟ ۳۰۶

تم سب اسی کی طرف لوٹ جاؤ گے۔ قیامت
میں مجرم مایوس ہوں گے، ایک دوسرے کا ساتھ
چھوڑ دیں گے۔ ۳۱۰
جنہوں نے لٹائے آخرت کی تکذیب کی وہ عذاب
الہی میں حاضر کیے جائیں گے۔ ۳۱۱

قیامت کو ساعت کیوں کہا گیا ہے؟ ۳۱۳
وہ مردہ زمین کو زندہ کرتا ہے، اسی طرح تم بھی
قیامت میں اٹھائے جاؤ گے۔ ۳۱۵
وہی خلقت کا آغاز کرتا ہے، پھر اُسے
لوٹائے گا، یہ اس کے لیے آسان ہے۔ ۳۲۵ تا ۳۲۷

اس دن سے پہلے جو ضرور آئے گا، اپنا رخ
پائیدار دین کی طرف کیے رہو۔ ۳۷۸، ۳۷۰
مردہ زمین کو زندہ کر دیا۔ اسی طرح قیامت
میں مردوں کو زندہ کرے گا، وہ صاحب
قدرت ہے۔ ۳۸۰، ۳۷۹

تم سب کی بازگشت میری طرف ہے
۳۲۵

۳۲۵

گنہگار قسم کھا کر کہیں گے کہ ہم برزخ میں
ایک ساعت سے زیادہ نہیں ٹھہرے اور
ایک حقیقت سے محروم تھے، لیکن عذر
بے فائدہ اور توڑ بھول۔ ۳۹۵، ۳۹۴

کافر کے کفر پر غم نہ کرو، ان سب کی بازگشت
ہماری طرف ہے۔ ۴۳۴

تمام کاموں کی عاقبت اللہ کی طرف ہے ۴۳۸، ۴۳۷
موت کے بعد تم سب کا اٹھنا ایک فرد کی
مثال سے زیادہ نہیں۔ ۴۵۵

اس دن باپ بیٹے کا نہ بیٹا باپ کا بوجھ
اٹھائے گا، اللہ کا وعدہ سچی ہے۔ وقت
قیامت کو دہی جانتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا
کہ کہاں مرے گا۔ ۴۶۳

اس جہان کے امور کی بازگشت اللہ کی
طرف ہے، دُنیا ختم ہو جائے گی۔ ۴۷۸
تدبیر امور کے دن سے قیامت کا دن مراد ہے ۴۸۳
قیامت میں پچاس موقف، وہ دن جس کا طول
پچاس ہزار سال ہے۔ ۴۸۵

کیا ہم مرنے کے بعد زمین میں گم ہو کر بھی زندگی
پالیں گے۔ وہ تو اپنے رب کی ملاقات کا انکار
کرتے ہیں۔ ۴۹۸

موت کا فرشتہ رُوح قبض کرے گا، پھر اللہ کی
طرف پلٹ جاؤ گے، تیرا وعدہ سچی ہے، ہمیں
بٹا دے۔ ہم چاہتے تو جبری ہدایت کرتے۔ ۵۰۶ تا ۴۹۹

اللہ قیامت کے دن ان میں فیصلہ کر دے گا ۵۲۹، ۵۲۳
قیامت کا علم صرف اللہ کے پاس ہے،
شاید قیامت نزدیک ہو۔ ۷۴۷، ۷۴۸

شفاعت و توسل

”ولا تدع مع الله الها آخر“ کا مضمون
شفاعت و توسل کی نفی نہیں کرتا۔ دیگر مثالیں۔ ۱۶۸، ۱۶۹

معجزہ

معجزات اللہ کے پاس ہیں، اسی کے حکم سے
نازل ہوتے ہیں۔ ۲۵۹
من پسند معجزات ۲۶۷

جنت

جو ایمان لائے، عمل صالح کیے، ان کے لیے
بہشت ہے، اس میں ہمیشہ رہیں گے، جو
بہت اچھا بدلہ ہے۔ ۲۶۸

جو ایمان لائے، عمل صالح کیے، وہ جنت
میں مسرور و شادال ہوں گے۔ یہ صبر و توکل
والے لوگ ہیں۔ ۳۱۲ تا ۳۱۴

نیک عمل مومنین کے لیے باغات بہشت ہیں ۳۰۶
صاحبان ایمان کے لیے دائمی بہشت ہے ۵۰۸

۴

جہنم

کیا کافروں کا نھکانہ جہنم نہیں ہے؟ ۲۸۲
عذابِ جہنم کا مزہ چکھو ان اعمال کی وجہ
سے جو تم نے کیے تھے جو فاسق ہو گئے
ان کے لیے ہمیشہ کی آگ ہے۔ ۴۹۹
اللہ نے کافروں پر لعنت کی ہے اور ان
کے لیے جلانے والی آگ تیار کی ہے، وہ
ہمیشہ اس میں رہیں گے، ان کے چہرے
بگڑ جائیں گے، وہ بچتا نہیں گے۔ ۷۴۸، ۷۴۹

توبہ

جنہوں نے توبہ کر لی، ایمان لائے اور اعمال
صالح کیے، وہ فلاح پائیں گے۔ ۱۲۸

احکام

نماز

نمازیوں کے پیشوا ائمہ نور ہیں ۹۱
نماز قائم کرو، یہ فرض و منکر سے روکتی ہے،
فضائل نماز و اقوال رسول و ائمہ۔ ۲۳۶ تا ۲۳۵
نماز قائم کرو، مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ۔
۲۳۲، ۲۳۵

نماز زیادہ سے زیادہ پڑھا کرو، لقمان کی
بیٹے کو وصیت۔ ۲۳۳، ۲۳۵

ایمان والوں کو ہماری آیات یاد دلانی جاتی
ہیں تو سجدہ میں گر پڑتے ہیں، وہ قائم اللیل
ہیں، خوف و امید سے رب کو پکارتے ہیں

راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں ان کیلئے جڑا ہے۔ ۵۰۷، ۵۰۸
نماز اسلام کی اصل ہے۔ (امام محمد باقر) ۵۱۶، ۵۱۷
حکم نماز پر رسول پاک کی حدیث (معاذ بن جبل سے) ۵۱۷
پیغمبر کی بیوی نماز ادا کرو ۶۲۳

روزہ

روزہ دوزخ کی آگ کے لیے سپر ہے۔

روزہ کی اہمیت پر حضور پاک کی ایک حدیث،
(امام محمد باقر) ۵۱۷
(بذریعہ معاذ بن جبل) ۵۱۷

روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں، اللہ نے
انسانیت کے لیے مغفرت اور اجر عظیم
میتا کر رکھا ہے۔ ۶۲۵

زکوٰۃ

زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے پیشوا ائمہ نور ہیں ۹۱
جو رمضان اللہ کے لیے زکوٰۃ دیتے ہیں وہ
دن گن اجر پانے والے ہیں۔ ۲۶۱

زکوٰۃ اسلام کی فرع ہے۔ (امام محمد باقر) ۵۱۶، ۵۱۷
زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے حضور پاک کی حدیث

(بذریعہ معاذ بن جبل) ۵۱۷
پیغمبر کی بیوی زکوٰۃ ادا کرو ۶۲۳

جہاد

مومن کا جہاد نہ صرف باسیف ہے بلکہ ایمان
کی حفاظت، آلودہ معاشرہ سے بچنا، فقر و
تنگ دستی میں صابر و شاکر رہنا بھی ہے۔ ۱۸۰ تا ۱۸۲

جن لوگوں نے ہماری راہ میں جہاد کیا، ہم ضرور
انہیں ہدایت کریں گے۔ ۲۸۳

جہاد بالنفس یا بالسیف، حکم جہاد اور اس
کے مضمون کی بحث۔ ۲۸۷

جہاد و اخلاص۔ مسلمان دوسروں کا دست نگر
کیوں ہے۔ ۲۸۸ تا ۳۰۷

جہاد اسلام کی بلند چوٹی ہے (امام محمد باقر) ۵۱۶، ۵۱۷

پروردہ

اسے نبی کی بی بی یا اپنے گھروں میں قرار پکڑو
لوگوں کے سامنے نہ نکلا کرو۔ ۶۲۲

احکام طلاق

مومنوں کا نکاح کے بعد ہم بستری سے پہلے طلاق پر
عدت نہیں انہیں شائستہ طریق سے رخصت کرو ۲۸۳

اطاعتِ رسول

۶۲۲ اسے نبی کی بی بیو! اللہ اور رسول کی اطاعت کرو

اطاعتِ والدین

ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ نیکی کرنے کی وصیت کی، البتہ ان کے کہنے پر شرک نہ کریں۔ انسان کو وصیت کی کہ میرا اور والدین کا شکر ادا کرو۔ اگر وہ شرک کی دعوت دیں تو شرک نہ کرو، مگر شائستہ سلوک پھر بھی جاری رکھو۔ ۲۲۵، ۲۲۴

اعمالِ صالح

جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے، ہم انہیں صالحین میں داخل کریں گے۔ ۱۸۴

امر بالمعروف

بیٹا! امر بالمعروف کرو (وصیت لقمان) ۴۳۵

انفاق اور ادائیگی حقوق

۴۶۲ اقرباء، مساکین اور مسافریں کو ان کا حق دے دو

نہی عن المنکر

۴۳۵ بیٹا! نہی عن المنکر کرو، لوگوں سے بے اعتنائی نہ کرو، زمین پر غرور سے نہ چلو، یہ اللہ کو پسند نہیں۔

اخلاقیات

اخلاقِ حسنہ

حضرت شعیب کی بکریوں کو حضرت موسیٰ کا پانی پلانا۔ ۶۶

حضرت شعیب کا اجر دینے کے لیے حضرت موسیٰ کو بلانا۔ ۶۸، ۶۷

بحث کے دوران گفتگو میں الفاظ، حرکات و سکنات، لب و لہجہ میں دل نشین روشنی اختیار کرو۔ ۲۲۷، ۲۲۶

والدین کا شکر یہ ادا کرو پہاڑ جیسی استقامت کے ساتھ لوگوں سے حسن سلوک کرو۔ ۴۲۹

۴۲۶، ۴۲۵ نیک عمل و حسن اخلاق گھروں کو آباد اور عروں کو طویل کرتے ہیں۔ (امام جعفر صادقؑ) ۴۲۲

۴۲۲ فروتنی و تواضع انسان کی دینت ہیں (حضرت علیؑ) عمل کی ترازویں رکھنے کو حسن عمل سے بہتر

۴۴۲ کوئی شے نہیں۔ (رسول پاک) ملاقات کشادہ روئی سے کرو ۴۲۲

سہان نوازی

۷۱۲ یہاں جنت کا رہنا ہے۔ (رسول پاک)

اخلاقِ رذیلیہ

معجزہ کو جادو سے تعبیر کرنا، سچ کو جھوٹ کہنا ۸۳ تا ۸۵
زکوٰۃ کی ادائیگی کے مطالبہ پر قارون کا بھڑک اٹھنا ۱۵۲
بے حیائی و بداخلاقی کی ترکیب، قوم کو طعنے ۲۱۵
قوم شعیب کی بداخلاقیاں اور انجام ۲۲۵ تا ۲۲۷
انبیاء کی روشن دلیلوں کا انکار، آیات الہی کو جھٹلانا اور استہزاء کرنا۔ ۳۰۵

غنا سے اخلاقی تباہ کاریوں کی رغبت ہوتی ہے ۴۱۷
زمین پر غرور و تکبر سے چلنا ۴۳۰
غرور و غفلت انسان کی دامن گیر نہ ہوں ۴۶۷
نبی کی بی بیو! گھر میں قرار پکڑو، درجہ جاہلیت کی طرح لوگوں کے سامنے مت نکلا کرو۔ ۶۲۲

مدینہ میں ادب و ادب اور ادب لوگوں کا مسلم عورتوں کو پریشان کرنا، جھوٹی افواہیں پھیلانا، ۴۳۱، ۴۳۰
یہودیوں کا ایک گروہ جو اذیت ناک افواہیں پھیلاتا ۴۳۲

اقوام سابقہ

ابراہیم کی قوم

۱۹۸، ۱۹۹ ابراہیم نے قوم سے فرمایا اللہ سے ڈرو اس کی عبادت کرو، رزق طلب کرو، شکر ادا کرو، پیچھے نہ کھڑی کے بت کیوں پوجتے ہو؟

۲۰۷ قوم کا اس کے سوا جواب نہ تھا کہ ابراہیم کو قتل کرو یا جلا دو۔

تم نے اللہ کو چھوڑ کر بتوں کا انتخاب کیا، قیامت میں ایک دوسرے کا انکار کرو گے، لعنت بھیجو گے، تمہارا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ ۰۸

اہل کتاب

اہل کتاب سے سخت نہ کرو، مگر احسن طریقہ سے سوائے ان لوگوں کے جو ظلم کے مرتکب ہوئے ۲۰۶، ۲۰۷
اہل کتاب جن کی مشرکین نے حمایت کی، اپنے قلعوں سے باہر کھینچ لیے گئے، قتل ہوئے، قید ہوئے، انہوں نے اپنے اموال مومنین کے قبضہ میں دے دیے۔ ۰۶

بنی اسرائیل

۲۰۹ فرعون ان کے بیٹوں کو قتل کر دیتا اور لڑکیوں کو کنیز بنالیتا۔

حضرت موسیٰ کی ولادت سے قبل رہبر سے محروم رہے، نجات کے لیے کوئی کوشش نہ کر سکے، موسیٰ پیدا ہوئے تو انہیں رہبر ملا، آزاد ہوئے، دشمن خراب ہوا۔ ۰۹۲

قوم نوح، عاد و ثمود اور ان جیسی دوسری اقوام کا ذکر۔

موسیٰ کو کتاب (تورات) عطا کی، اسے نبی اسرائیل کی ہدایت کا ذریعہ قرار دیا اور ان میں ائمہ و پیشوا مقرر فرمائے۔

۵۲۳

شعیب کی قوم

ہم نے شعیب کو مدین کی طرف بھیجا۔ کہا اللہ کی عبادت کرو، فساد نہ کرو، مگر تکذیب کی اور دلزلہ سے مارے گئے۔

۳۱۳، ۳۱۴

عاد و ثمود

شیطان نے ان کے بد اعمال ان کی آنکھوں میں سجاویسے تھے، ہم نے انہیں ہلاک کر دیا ان کے ویرانے تمہارے سامنے ہیں۔

۲۲۶

لوط کی قوم

لوط نے فرمایا، بے حیا قوم مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو، قطع نسل کرتے ہو۔ قوم نے کہا کہ سچا ہے تو ہم پر عذاب نازل کر۔

۱۹

نوح کی قوم

ہم نے نوح کو بھیجا۔ ۹۵۰ برس تبلیغ کی پھر قوم کو طوفان لے گھیر لیا، بیشک وہ ظالم تھے۔ ہم نے نوح اور کشتی والوں کو بچا لیا۔

۱۹۵ تا ۱۹۸

شخصیات

ائمہ نور و نار

متقین کے پیشوا دین حق کی طرف بلاتے، نماز پڑھتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔

۹۱

رہبران ضلال و مگر اسی ائمہ نار ہیں۔ وہ اپنی راستے کو حکم خدا پر مقدم جانتے ہیں۔

۹۲

کسی کو ہدیہ دینے کا مقصد اگر زیادہ منفعت کا حصول ہو تو یہ رُبانے حلال ہے۔ اگر

زیادہ منفعت ملے کر لی جائے تو رُبانے حرام ہے۔

۳۶۶، ۳۶۵

درجیت پر لکھا ہے کہ قرض کا ابراہیم گنا اور صدقہ کا دس گنا ہے۔

۳۶۷

سمندری مخلوق کی زندگی کا مدار بھی بارش پر ہے۔ بارش نہ ہو تو بڑے بھر میں فساد پراپا ہوتا ہے، اور یہ جب ہوتا ہے جب لوگوں کے

۳۷۱

گناہ کثیر ہو جاتے ہیں۔

۳۷۱

طبعی موت مرنے والوں کی نسبت گناہ سے مرنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔

۳۷۵

آسیہ

فرعون کی مومنہ بیوی، اولاد زینب سے محروم، اس نے حضرت موسیٰ کی پرورش پر اصرار کیا اور کامیاب ہو گئی۔

۳۶

ابراہیم علیہ السلام (نبی)

پھر ہم نے ابراہیم کو بھیجا۔ آپ نے قوم سے کہا کہ اللہ سے ڈرو، اس کی عبادت کرو، اسی سے رزق طلب کرو اور اس کا شکر ادا کرو،

۱۹۸، ۱۹۹

پتھر اور لکڑی کے بت کیوں پوجتے ہو؟ قوم نے کہا اسے قتل کرو یا جلا دو۔ ہم نے اسے آگ سے بچا لیا۔ اس واقعہ میں صاحبان

۲۰۷

ایمان کے لیے نشانیاں ہیں۔ تم نے اللہ کو چھوڑ کر بتوں کا انتخاب کیا۔

قیامت میں انکار کرو گے، ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے، پھر تمہارا ٹھکانا دوزخ ہوگا

۲۰۸ تا ۲۱۰

لوط ابراہیم پر ایمان لائے۔ ابراہیم نے کہا میں اپنے رب کی طرف لوٹنے والا ہوں جو غالب و

صاحب حکمت ہے۔ ہم نے اسے اسحق و یعقوب عطا کیے، خاندان کو نبوت و کتاب عطا کی وہ

۲۱۲، ۲۱۱، ۲۰۸

آخرت میں صالحین سے ہوگا۔

۲۱۳، ۲۱۲

حضرت ابراہیم پر اللہ کی عظیم برکات جب فرشتے ابراہیم کو بیٹے کی خوشخبری دینے آئے تو یہ بھی کہا کہ ہم لوط کی بیٹی کے ظالموں کو ہلاک کریں گے۔ کہا وہاں تو لوط بھی ہیں۔

۲۱۹

کہا انہیں بچا لیں گے۔

۵۶۰

اور ہم نے ابراہیم سے عہد لیا

حضرت ابراہیم (فرزندِ آنحضرت)

بچپن میں ہی رحلت فرمائے

ابو حمزہ ثمالی

رسول پاک پر درود بھیجنے کا طریقہ ارشاد رسول کے مطابق، بیان کیا۔

ابو حنیفہ

حُرمِ شہداء سے متفق

ابو ذر غفاری

آنحضرت کی حدیث ذکر اللہ کے راوی

ابو سعید خدری

جب آیت الٰہی ذی القدر نازل ہوئی تو رسول پاک نے فدک جناب فاطمہ کو بخش دیا۔

۴۳

آیہ تطہیر نبی پاک کیلئے نازل ہوئی آنحضرت کی ایک اور حدیث کے ناقل

ابو سہل سہری

حدیث جو رجحوتی نایات گھڑنے میں مشہور تھا

ابوطالب علیہ السلام

محسن اسلام و رسول پاک۔ آپ کے ایمان کی بحث ۱۱۳ تا ۱۱۶

ابوالباقہ

یہودی قرظیہ سے گفتگو کی، توبہ کی

احمد بن حنبل

فاسقین ہی فنا کے پیچھے جاتے ہیں

ام سلمیٰ (ام المؤمنین)

فرمایا میں تمہارے مردوں اور عورتوں کی ماں ہوں

آیہ تطہیر کی شرح میں روایت، آنحضرت نے

فرمایا کہ تو میرے گران افراد میں شامل نہیں۔ ۶۲۸، ۶۲۹

ام شریک بنت جابر (ام المؤمنین)

قبیلہ بنی اسد سے تھیں۔ بقول بعض مفسرین

بلامرغہ رسول میں آئیں۔

انس بن مالک (خادم رسول)

صحابی رسول اکرم

آیت حجاب زینب سے شادی کے ولیمہ پر

نازل ہوئی۔

انس بن نظر (صحابی)

جنگ احد کا ایک شہید

بجیرار اہلب

شام سے مدینہ آکر اسلام قبول کیا

بشر بن غالب

امام حسین سے ائمہ نور و ناری کی حدیث کو روایت کیا

تمیم الداری

علاء سے یہود کا ایک فرد جو قرآن سن کر ایمان لایا

جابر بن عبد اللہ انصاری

خانہ جناب سیدہ پر رسول پاک نے اندر آنے

کی اجازت لی۔ جابر ہمراہ تھے، پھر ان کیلئے

اجازت لی اور داخل خانہ ہوئے۔

جادو و عبدی

علاء سے یہود کا ایک فرد جو قرآن سن کر ایمان لایا

جعفر بن ابوطالب

مہاجر حبشہ۔ ان کے ہمراہ ۳۲ مدینہ منورہ میں

حبشہ سے مدینہ آئے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام (امام ششم)

طواسین ثلاثہ، سورہ قصص، طہ اور شعرا کی

ہر شب جمعہ تلاوت کرنا اللہ کی دوستی کا

موجب ہے۔

۱۱ اشہ، اٹھارہ سال کی عمر سے اور استویٰ

۱۰۸ اشہ موعظیں ظاہر ہونے کا زمانہ ہے۔

گروہ اول یعنی ائمہ نور اللہ کے فرمان کو مخلوق

کی رائے اور اپنے ارادہ پر مقدم جانتے ہیں۔ ۹۱، ۹۲

ہم صابر ہیں اور ہمارے شیعہ ہم سے زیادہ صابر

ہیں کیونکہ وہ اسرار و رموز کو جانے بغیر صبر کرتے ہیں

اہل و عیال کی معاش، اعتراف کی مدد، انفاق راہ

خدا، حج و عمرہ کی سجاوڑی دنیا طلبی نہیں طلب

آخرت ہے۔

وہ دولت مندی جو تجھے دوسروں کے سلب

حقوق سے باز رکھے، اس فقر سے بہتر ہے جو

تجھے گناہ پر آمادہ کرے۔

اس سورہ قصص آیت ۱۳۸، آیت نے دنیا

میں میری تمام آرزوؤں کو ختم کر دیا ہے اور

بیروزی آخرت بھی مشکل ہے۔

ماہ رمضان کی تیسویں شب میں جو سورہ روم و

سورہ عنکبوت کی تلاوت کرے، خدا کی قسم وہ

اہل جنت سے ہے۔

انسان فحش و منکر سے جس قدر بچا ہے اسی قدر

اس کی نماز قبول ہوتی ہے۔

قیامت میں سب سے پہلے نماز کا حساب

لیا جائے گا۔

جب معترض مقابل بوسیدہ بڑی لائے کہ اسے

کون کیسے زندہ کرے گا تو رسول پاک نے فرمایا

وہی جس نے اسے پہلی بار پیدا کیا تھا۔

امام نے ایک شکی مزاج کو توحید کی ہدایت فرمائی

فطرت سے توحید مراد ہے

فطرت سے مراد اسلام، ولایت اور اولیائے

الہی کی رہبری کو قبول کرنا ہے۔

غنا اور ہود لعب کے اہل محفل پر اللہ لطف و کرم

نہیں فرماتا۔

باطل بات غنا ہی ہے۔ حرمت غنا پر فرقان ۷۲

کا حوالہ۔ غنا عذاب میں، آلام و مصائب و

بدبختی کا سبب ہے۔

گانے والی عورت، اسے اجرت دینے والا

کمانی کھالے والا، ملعون ہیں۔

حکمت یہ ہے کہ نقان اپنے امام زمانہ اور

خدائی رہبر کی معرفت رکھتے تھے۔

نقان کو حکمت عطا ہونے پر آپ کی حدیث

اعضا و وجوہ ارج پر واجبات کے بارے میں

آپ کی حدیث۔

- ۴۴۱ سکوت فکر کے آرام و راحت کا باعث ہے
- ۴۴۲ تواضع ایک بلند مقام و مرتبہ ہے
- ۴۴۲ نیکو کاری و حسن خلق گھروں کو آباد اور عمروں کو زیادہ کرتے ہیں۔
- ۴۴۲ ہر عمل نیک کا ثواب قرآن مجید میں بیان ہوا ہے سوائے سجدے کے، اس لیے کہ اس کا ثواب بہت زیادہ ہے جو آنکھوں کی روشنی اور ٹھنڈک ہے۔
- ۵۱۳، ۵۱۲ آئمہ کی قسمیں ہیں، ایک دعوت حق اور دوسری دعوت مگرابی دینے والے۔
- ۵۲۷ جو صبر کرے اور جزا خدا سے چاہے وہ دشمنوں کی شکست سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرے گا، جبکہ اجر آخرت اس کے علاوہ ہے۔
- ۵۳۰ تمہارے لیے رسول پاک کی زندگی اسوۂ حسنہ ہے
- ۶۰۳ اگر انسان اللہ کو دلوں میں سو بار یاد کرے تو یہ ذکر کثیر ہے۔
- ۶۰۳ عالم کا ایک گناہ بخشا جانے سے پہلے جاہل کے ستر گناہ بخشے جائیں گے۔ عالم کی تو بہ بعض مراحل میں قبول نہ ہوگی۔
- ۶۱۹ ایمان اسلام کے ساتھ ساتھ ہے، لیکن ممکن ہے اسلام ایمان کے ساتھ نہ ہو، آنحضرتؐ کی ایک اور حدیث۔
- ۶۲۷ جو شخص رات کو تسبیح فاطمہ پڑھے تو یہ ذکر کثیر ہے
- ۶۳۹

- ۶۵۶ تفسیر میرا دین اور اللہ کی مضبوط ڈھال ہے
- ۶۶۰ رسول اللہ کی انگوٹھی کا نقش محمد رسول اللہ تھا
- ۶۶۵ اللہ نے تمہارے پیغمبر پر سلسلہ انبیاء کو ختم کر دیا
- ۶۷۲ ہر چیز کی حد ہوتی ہے مگر یاد خدا کی کوئی حد نہیں
- ۶۷۲ یاد خدا کے بارے میں طویل حدیث۔ جس گھر میں تلاوت اور یاد خدا ہو وہاں زیادہ برکت ہوتی ہے۔
- ۶۷۴ جو اللہ کو زیادہ یاد کرے گا اللہ اسے لطف و کرم کے ساتھ بہشت میں بھیجے گا
- ۶۷۵ نکاح کی نیت سے نکاح سے پہلے عورت کا چہرہ اور پشت دیکھ سکتے ہیں۔
- ۷۰۳ ممانی پر ایک حدیث امام
- ۷۱۳ ممان سے یہ نہ پوچھو کہ کھانا کھاؤ گے، بلکہ جو موجود ہو اسے فوراً پیش کرو۔
- ۷۱۴ میزبان نے جو ما حضرت تیار کیا اگر وہ اسے حقیر سمجھے تو ہلاک ہوا، ممان کو جو کچھ پیش کیا اگر وہ اسے حقیر سمجھے تو ہلاک ہوا۔ میزبانی پر ایک اور حدیث۔
- ۷۱۵ سٹو کا مفہوم ہر کام میں رسول پاک کے سامنے برتے ہوئے تسلیم کرنا ہے۔
- ۷۲۲ امانت کا مفہوم ولایت ہے اور جسے ظلم و جہول کہا گیا ہے وہ بہت سے گناہوں کا مرکب اور منافق ہے۔
- ۷۵۲

جمیل بن معمر

زمانہ جاہلیت کا ایک ذہین فرد جو کہتا تھا کہ میرے سینہ میں دودل ہیں۔

۵۵۳

جویریثہ (ام المؤمنین)

آپ انفال میں سے تھیں

۶۹۰

حدیث میانی

ایک جاں نثار صحابی رسولؐ

۶۰۱

حوقیل

مومن آل فرعون، بنجار۔ حضرت موسیٰ کو شہر سے نکل جانے کا مشورہ دیا۔

۶۳

حسین بن خالد

امام علی رضا کی حدیث کا راوی

۴۲۱

امام حسین بن علیؑ (شہید کربلا)

ایک امام ہدایت کی طرف اور ایک گمراہی کی طرف بلاتا ہے، بشر بن غالب نے آپ سے روایت کیا

۹۲ شہداء نے کربلا کے بارے میں آپ نے سورہ احزاب تلاوت فرمائی۔

۵۹۱

جناب خدیجہ الکبریٰ (ام المؤمنین)

ان کی عیب جوئی رسول پاک کو ناگوار گزری اور آپ نے ان کی مدح فرمائی۔

۲

خوفو (بادشاہ مصر)

خوفو فرعون کا مقبرہ قاہرہ کے نزدیک اہرام مصر میں ایک ہے۔ اس کی تعمیر میں ایک لاکھ مزدوروں نے بیس سال کام کیا۔

۲

جناب خولہ بنت حکیم (ام المؤمنین)

بقول بعض مفسرین بلا مہر رسول پاک کی زوجیت قبول فرمائی۔

۱۲

زاذان

بیان کیا کہ جناب امیر سوہاگردوں کو آیت "تک دارالانزہ" سنا کر برتری و فساد سے بچنے کی تلقین فرماتے تھے۔

۷

زرارہ

امام محمد باقرؑ کے ایک صاحب علم صحابی

۲ امام سے روایت کی کہ اللہ نے فطرت انسانی میں اپنی معرفت و شناخت کا جذبہ رکھا ہے۔

۲

زینب بنت جحش (أم المؤمنین)

رسول پاک کے عقد میں آنے کا حال ۶۳۲ تا ۶۵۰، ۶۹۰

زینب بنت حزمیمہ (أم المؤمنین)

بقول بعض مفسرین بلا رسول پاک کے عقد میں آئیں۔ ۶۹۱

سلمان فارسی

اہل کتاب تھے۔ قرآن سنا اور اس پر ایمان لائے ۱۰۳

حضرت شعیب علیہ السلام

اہر سقایت دینے کے لیے حضرت موسیٰ کو بلایا اور ان سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا۔ ۷۳

ہم نے شعیب کو مدین کی طرف بھیجا فرمایا خدا کی عبادت کرو، یوم آخرت کی امید رکھو، فساد نہ کرو، مگر انہوں نے جھٹلایا تو انہیں زلزلے لے ڈالا۔ ۲۲۵

شیطان

موسیٰ نے فرمایا یہ شیطانی عمل تھا، بیشک شیطان گمراہ اور دشمن ہے۔ ۵۳

اگر شیطان انہیں بھڑکتی ہوئی آگ کی طرف دعوت دے تو پھر بھی اس کی پیروی کریں گے۔ ۲۳۲، ۲۳۶، ۲۳۷

کہیں یہ زندگی تمہیں فریب نہ دے اور شیطان دھوکہ میں نہ ڈالے۔ ۳۶۶

صفورا

حضرت شعیب کی چھوٹی صاحبزادی ۶۵ تا ۶۹
زوجہ حضرت موسیٰ ۷۱ تا ۷۳
حضرت موسیٰ سے نکاح اور مہر ۷۲، ۷۵

صفیہ بنت حسی (أم المؤمنین)

انفال میں سے تھیں ۶۹۰

ضرار

جنگ احزاب میں شریک نامی بہادر ۵۹۵

طلحہ رضی

کتا تھا میں بعد وفات رسول ان کی کسی زوجہ سے شادی کروں گا۔ ۷۱۱

جناب عائشہ (أم المؤمنین)

ایہ تطہیر کی شرح میں آپ کی روایت رسول اکرم نے فرمایا پیچھے تہہ خیر رضو ہو مگر ان میں شامل نہیں ہو ۶۲۹

(بطور طنز) اللہ کے رسول، اللہ آپ کے مقصد

کو بہت جلد پورا کر دیتا ہے۔ ۶۹۲

جناب عبداللہ (فرزند رسول)

بچپن ہی میں فوت ہو گئے ۶۱۸

عبداللہ ابن سلام

علمائے یہود کا ایک فرد۔ قرآن سن کر ایمان لائے ۱۰۳

عبداللہ ابن عباس

اعانت مجرمین کے بارے میں حضرت موسیٰ کے قول کا حوالہ دیا۔ ۶۰

حضرت ابوطالب کی وفات کے وقت یہ شیر خوار بچے تھے۔ ۱۱۳

سورہ قصص کی آخری آیت کے مخاطب تو رسول پاک ہیں مگر مراد عام لوگ ہیں۔ ۱۶۳

روایت کیا کہ اسے رسول ہم تمہارے دین میں اس لیے داخل نہیں ہوتے کہ مخالفین

ہیں اٹھالے جائیں گے اور قتل کر دیں گے ۲۸۵

نعمت ظاہر و باطن پر آنحضرت کی حدیث بیان کی آپ کے حوالہ سے ذکر منثور میں آنحضرت کی حدیث بیان ہوئی۔ ۵۱۶

آنحضرت لے بلا مکرسی زوجہ کو قبول نہیں فرمایا ۶۹۱

حضرت علی ابن ابی طالب

دُنیا اس اونٹنی کی طرح ہے جو دوہنے والے سے اپنے بچے کے لیے دودھ پچا لیتی ہے،

وہ آل محمد ہیں کہ مصائب کے بعد اللہ ان میں مہدی کو پیدا فرمائے گا۔ ۳۷

گردہ منافقین کے بارے میں فرمایا کہ وہ آنحضرت کی وفات کے بعد بھی باقی رہا۔ ۹۳

جب آنحضرت مبعوث ہوئے تو کوئی عرب آسمانی کتاب نہیں پڑھتا تھا۔ ۹۷

اگر کوئی دُنیا کو ایک ذریعہ جانتے ہوئے اس کی طرف دیکھے تو یہ اس کی آنکھ کو بینا کر دیتی ہے مگر جو اسے مقصد قرار دے کر دیکھے تو اسے اندھا کر دیتی ہے۔ ۱۳۹

تندرستی، قوت، فراغت، جوانی اور خوشی کو فراموش نہ کرو۔ ان پانچ نعمتوں کے ذریعہ اپنی آخرت طلب کر لےجی انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی جوئی کا قسم اس کے دست کے قسم سے بہتر ہو، یہی ہوس اقتدار ہے۔ ۱۵۵

آپ بازار میں لوگوں کو داریا آخرت پر توجہ فرماتے، غلو اور فسادنی الارض سے منع فرماتے۔ ۵۶

قسم ہے اس ذات پاک کی جس نے آنحضرت کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، تم شدت سے آزمائے جاؤ گے، وغیرہ۔ ۹۱، ۷۸

اللہ نے ایمان کو شرک کی نجاست سے اور نماز کو تکبیر سے پاک کرنے کے لیے فرض کیا۔ ۲۳۲

نماز ہر پڑھنے والے کے لیے تقرب الہی کا وسیلہ ہے۔ نماز کے بارے میں آپ کی وصیت۔

اللہ سے ڈرو کیونکہ نماز تمہارے دین کا ستون ہے ۲۳۳

کوئی شہر دوسرے شہر سے بہتر نہیں۔ بس تیرا شہر ہے جو تجھے قبول کرے اور ترقی کے اسباب فراہم کرے۔ ۲۴۰

اللہ نے پیغمبر بھیجے کہ انسان سے پیمانِ فطرت کا مطالبہ کریں۔ ۳۵۲

میں نے اپنے اللہ کو اس بات سے پہچانا کہ کبھی گریں کھل جاتیں اور کبھی ارادے ٹوٹ جاتے ہیں۔ ۳۹۲، ۳۹۲

جو شے انسان کو یاد خدا سے غافل اور شہوات نفسانیہ میں داخل کر دے وہ جوئے اور قمار کا حکم رکھتی ہے۔ ۳۱۸

کانوں کے ذریعہ اعصاب پر ہیجان انگیز اثرات فروتنی اور تواضع انسان کی زینت ہے ۳۱۸

دنیا کی فریب کاری پر آپ کی وحدشیش علم غیب اور علم رسول پر آپ کی حدیث ۳۶۹

ہماری اور ہمارے دشمن کی دوستی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتی، اللہ نے انسان کے لیے دو دل قرار نہیں دیے۔ ۵۳۸

میں تیرے ہی ذریعہ تجھ سے شفاعت کا خواستگار ہوں۔ (دُعائے کمیل) ۴۸۲

جب جنگ کی آگ بھڑکتی تو ہم رسول پاک کی طرف پناہ لیتے، کوئی شخص ان سے زیادہ دشمن کے قریب نہ ہوتا۔ ۵۸۸

”اور جو شہادت کے منظر ہیں“ یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ۵۹۰

صبر و شکیبائی اسلامی حکام پر واجب ہے کیونکہ اللہ پیغمبر کو صبر کا حکم دیتا ہے۔ ۶۰۳

فرمان رسول کے مطابق درود بھیجنے کا طریقہ بیان فرمایا۔ ۷۲۳

حضرت علی بن الحسین زین العابدین (امام چہارم)

ہم اہل بیت میں برابر اور ہمارے پیروشل مولیٰ کے ہیں۔ ۳۷

ایک عالم محمد بن مسلم کو ہشام اموی سے تعاون کرنے پر سزائے فرمائی۔ ۵۹

جو حکم ازواجِ پیغمبر کے بارے میں جاری ہوا ہم اس بات کے زیادہ حق دار ہیں۔ ۶۲۰

ہر شخص کی زبان صبح کو تمام دوسرے اعضاء کا مال پوچھتی ہے تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم بخیریت ہیں اگر تو نے خیریت سے رہنے دیا۔ ۷۲۷، ۷۲۷

حضرت علی بن موسیٰ رضا (امام ہشتم)

عمل شیطان سے مراد قبلی و سبطی کی لڑائی ہے نہ کہ موسیٰ کا قبلی کو مارنا۔ دیگر کلمات کا مفہوم ۵۸

عذابِ مہین کا سبب غنا و راک رنگ ہے ۴۱۴

کیا نہیں فرمایا کہ دیکھے جانے والے ستونوں کے بغیر آسمان کو پیدا کیا، ستون تو ہیں مگر دیکھے نہیں جاسکتے۔ ۴۲۱

سکوت درہلے حکمت میں سے ایک دروازہ ہے ۴۳۱

عودۃ الوثقی علی ابن ابی طالب ہیں۔ (حدیث رسول) ۴۳۷

امانت وہ ولایت ہے جس کا ناسخ دعویٰ کرنے والا اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ ۷۵۲

علی بن محمد (سید)

نسخ ادیان کی تشریح ان سے بھی منسوب ہے

عکرم بن ابو جہل

فتح مکہ کے بعد مکہ سے بھاگنے اور واپس آکر ایمان لانے کا واقعہ۔ ۴۶۲

جنگِ احزاب میں شرکت کی عمرو بن عبدود

جنگِ احزاب میں شریک ایک بہادر مشرک

عمرو کی بہن

میں معترف ہوں کہ میرے بھائی کا قاتل ایک کرم شخص ہے۔ ۵۹۸

حضرت عیسیٰ ابن مریم

اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم سے عہد لیا

جناب فاطمہ الزہراء علیہا السلام

رسول پاک نے آیت ”اتی ذی القربیٰ“ نازل ہونے پر جناب فاطمہ علیہا السلام کو جاگیر فدک عطا فرمائی۔ ۳۲۳، ۳۲۳

فرعون

فرعون کو اپنی فوجی طاقت پر فخر تھا ہم تجھ سے موسیٰ و فرعون کا تقصہ بیان کرتے ہیں جس نے لوگوں کو گروہوں میں تقسیم کر کے کمزور کر دیا، ان کے بیٹوں کو قتل کیا اور عورتوں کو خدمت کے لیے زندہ رکھا۔ ہم نے فرعون و ہامان کو وہ چیز دکھادی جس کا انہیں خوف تھا۔ ۲۷ تا ۲۷

فرعون نے عوام میں قبلی و سبطی کی گروہ بندی کی۔ ان کے درمیان منافرت پھیلانی۔ ۲

ایک طبقہ پر ظلم کے پہاڑ گرانے۔ قتل و خوریزی کی۔ ۳

فرعون کا خواب، بنی اسرائیل کی نسل کشی اور دیگر مفاسد۔ ۳۲۳

ہم فرعون و ہامان اور ان کی افواج کو اسی انجام سے دوچار کریں گے جس کا انہیں خوف ہے۔ ۵

فرعون سے اس کی بیوی نے کہا کہ یہ میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اسے قتل نہ کرو۔ اپنے وزیر ہامان سے کہا کہ ایک برج تیار کر کہ میں اس میں بیٹھ کر موسیٰ کے خدا کو دیکھوں۔ فرعون بطور ایک گمراہ معبود

قارون

قارون کو اپنی دولت پر بھروسہ دناز تھا ۲۵ قارون قوم موسیٰ سے تھا۔ ہم نے اسے بہت سے خزانے دیے کہ دولت کے صندوق کوئی طاقتور گروہ بھی نہ اٹھا سکتا تھا۔ قوم نے کہا تکبر نہ کر کہ اللہ تکبرین کو دوست نہیں رکھتا۔ ۱۳۶ یہ دولت میں نے اپنے علم سے حاصل کی۔ اللہ نے اس سے پہلے بھی دولت مندوں کو ہلاک کیا۔ ۱۳۷ قارون کو قوم کی طرف سے نصائح ۱۳۷ تا ۱۳۸ قارون سچ دہج سے نکلا۔ طالبانِ دُنیا نے حرص کی اور مال کی تمنا کی، اہل علم نے کہا واسے جو تم پر پھر اسے دھنسا دیا۔ ۱۵۰ تا ۱۴۲ موسیٰ نے قارون سے زکوٰۃ ادا کرنے کو کہا تو اس کا نقاب اُلٹ گیا۔ ۱۵۲

جناب قاسم (فرزند رسول)

بچپن میں رحلت فرمائی ۶۱۸

کعب بن اسد

یہودی قرظہ کا سردار ۶۱۰

کعب بن عجرہ

فرمانِ رسول کے مطابق طریقِ درود کے راوی ۷۲۲، ۷۲۳

لقمان

ہم نے لقمان کو حکمت دی۔ انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا شکر نہ کرنا۔ ۴۲۳ لقمان کون تھے؟ ایک مرد حکیم و دانا! ۴۲۰ لقمان کی حکمت کا ایک نمونہ۔ بیٹے سے گفتگو ۴۲۲

لوط علیہ السلام

قوم سے کہا ایسی بے حیائی کا کام کرتے ہو جو تم سے پہلے کسی نے نہیں کیا، قطع نسل کرتے ہو۔ قوم نے کہا کہ اگر سچے ہو تو عذاب نازل کرو۔ خدا یا اس قوم کے مقابلہ میں میری مدد فرما۔ فرشتوں نے کہا تم نہ کرو، ان پر عذاب کریں گے، تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو بچالیں گے، سوائے تمہاری بیوی کے۔ ۲۲۰

لیث

حضرت شعیب کی بڑی بیٹی، زورخروسی، صفورا کی بہن ۷۵

ماریہ قبطیہ (أم المؤمنین)

غنا غم میں سے تھیں ۶۹۰

امام مالک

فاسق ہی غنا کے پیچھے جاتے ہیں ۴۱۵، ۴۱۶

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ساعتِ غفلت (درمیانِ مغرب و عشاء) میں نماز نافلہ پڑھو۔ ۵۵

تم موسیٰ و فرعون و بنی اسرائیل کے واقعات کو نہیں دیکھ رہے تھے۔ یہ غیبی خبریں تمہیں اللہ نے دی ہیں۔ ۹۳

کفار اگر تمہارے پیغام کو قبول نہیں کرتے تو اپنی ہوس کی پیروی کرتے ہیں۔ ۱۰۱

میرا رب ہدایت لے کر آنے والے کو اور گمراہ کو بھی خوب جانتا ہے۔ ۱۶۰

حرمِ خدا کی طرف بازگشت کا وعدہ ۱۶۱، ۱۶۲

کتاب سے مراد یہ ہے کہ سرگزشتِ انبیائے ماسلف سے آپ کو مطلع کیا گیا سورہ قصص آیات ۲۴ تا ۲۶۔ ۱۶۳

تیس ماہِ رمضان کو سورہ دم و عنکبوت کی تلاوت کا ثواب۔ ۱۷۲

آنحضرت نے پہلے تین ہارماں کے ساتھ اور پوتھی بارباپ کے ساتھ نکلی کرنے کو فرمایا۔ ۱۸۷

ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے ۸۸

جو شخص کسی رسم بد کی بنیاد رکھتا ہے اس پر عمل کرنے والوں کے گناہ میں برابر کا شریکیت ۹۲

اچھی و بُری رسوم کی بنیاد رکھنے والوں کو ان رسوم پر عمل کرنے والوں کا اجر بھی ملے گا، جبکہ عالمین کے ابراہیم کی بھی نہ ہوگی۔ ۱۹۳ تا ۱۹۴

تم میری تکذیب کرتے ہو! پہلی اُمتوں نے بھی نبیوں کی تکذیب کی، ۱۳م مجھ پر تبلیغ واجب ہے۔ ۹۶

اللہ کیسے پیدا کرتا اور اعادہ کرتا ہے؟ ۲۰۰، ۱۰۰

جس کی نماز اُسے فحشاء و منکر سے نہیں روکتی اسے نماز کا کوئی فائدہ نہیں۔ جو حکم نماز کی اطاعت نہیں کرتا اس کی نماز نہیں۔ ۳۸

آخر کسی دن اس کی نماز اُسے بُرائی سے روک دے گی۔ ۲۹

بہترین عمل یہ ہے کہ مرے وقت تیری زبان ذکرِ الہی میں مشغول ہو۔ ۴۰

فہمادیکھو کہ میرے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے اللہ کافی ہے۔ ۵۹

بہشت کے بہت ہی مصطفیٰ محل پاکیزہ گفتگو کرنے والوں کے لیے ہیں۔ ۲۷۲

سورہ روم کی تلاوت کا ثواب

۲۹۲

عورت کے لیے کوئی شے اس کے شوہر کی مانند نہیں ہے۔

۳۳۴

قرآن میں جہاں بھی لفظ قنوت آیا ہے اس کے معنی اطاعت ہیں۔

۳۳۷

ہر پیدا ہونے والا فطرتاً اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ دنیا کی چھ منٹوں میں سے تین دنیا اور تین آخرت میں ملتی ہیں۔

۳۷۵

مردے اور بہرے تیری بات نہیں سنتے، زندہ ہیں مگر دُور ترہ، کان ہیں مگر سماعت نہیں، لہذا نصیحت بے اثر۔

۳۸۷

سورہ لقمان کی تلاوت کرنے والے قیامت میں حضرت لقمان کے رفیق ہوں گے۔

۴۰۵

گانے والی کینیزوں کی خرید و فروخت، تربیت اور آمدنی حرام ہے۔

۴۱۵، ۴۱۰

شیطان پہلا شخص ہے جس نے گانا گایا

۴۱۴

لحمان نبی نہ تھے، خدا دوست اور غور و فکر کرنے والے بندہ تھے۔

۴۳۱، ۴۳۰

حضرت لقمان کے بارے میں ایک طویل حدیث زمین پر تکبر سے چلنے والے پر زمین اور اس کے اندر اوپر کی چیزیں اس پر لعنت کرتی ہیں۔

۴۴۰

حقیقی بخون وہ ہے جو غور سے شانے جنگ کر چلتا ہے۔

۴۴۱، ۴۴۰

جو لباس پہن کر تیری دکھائے وہ قارون کا ساتھی ہے۔

۴۴۰

عمل کی ترازویں رکھنے کو سخنِ خلق سے بہتر کوئی شے نہیں۔

۴۴۲

اسلام، رزق و روزی نعمتِ ظاہر ہیں۔ بُرے اعمال کی پردہ پوشی نعمتِ باطن ہے (ابن عباسؓ) ۴۴۵

۴۴۵

امیر المؤمنین سید الاوصیاء کی ولایت عروہ الوثقی ہے ۴۴۷

۴۴۷

ایمان کے دو حصے ہیں، آدھا صبر، آدھا شکر اللہ نے صالح بندوں کے لیے ایسی نعمت فراہم کی ہیں جو کسی نے دیکھی نہ سنی اور نہ ہی کوئی انہیں نگر و خیال میں لاسکتا ہے۔

۵۱۲

نماز مشاہد پر آنحضرتؐ کی حدیث (راوی ابن عباسؓ) ۵۱۶

۵۱۶

نماز، روزہ، زکوٰۃ، انفاق پر احادیث (راوی معاذ بن جبل)

۵۱۷

صبر کو ایمان سے وہی نسبت ہے جو سر کو بدن سے ہے۔

۵۲۰

اے رسولِ تعویٰ اختیار کرو، کفار و مشرکین کی اطاعت نہ کرو۔

۵۲۱

کوئی حقیقت ایمان تک نہیں پہنچ سکتا جب تک اپنی خواہشات کو میری لائی ہوئی شے کے تابع نہ کرے۔ (دو اور حدیثیں)

۵۵۲

اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے انبیاء اور تم سے عدلیا۔

۵۶۰

کل ایمان سارے کفر و نفاق کے مقابلہ میں آگیا

ہے، اب ہم ان سے جنگ کریں گے، ان میں جنگ کی سکت نہیں رہی۔

۵۹۳، ۵۹۷

جنگِ احزاب میں حضرت علیؑ کو آگاہ کر کے روانہ فرمایا۔

۵۹۶

اے علیؑ! تمہارا آج کا عمل ساری امت کے عمل پر بھاری ہے۔

۵۹۷

رسول اللہؐ اسوہ اور قدوہ ہیں

۶۰۲

اللہ کو زیادہ یاد کرو جنت کے باغات کی طرف بڑھو، یہ باغات مجالسِ ذکر ہیں۔

۶۰۳

جب مرد بیری کو بیدار کرے اور دونوں وضو کر کے سجدہ ادا کریں تو ان کا شمار اللہ کو یاد کرنے والوں میں ہوگا۔

۶۰۵

اللہ کے نزدیک قیامت میں افضل ترین درجہ اللہ کو زیادہ یاد کرنے والوں کا ہوگا۔

۶۰۹

اللہ کو بہت زیادہ یاد کرنے والے جہاد کرنے والوں سے افضل ہیں۔

۶۱۰

جس شخص کو اللہ نے ذکر کرنے والی زبان دے دی تو اُسے دنیا و آخرت کی ہر بھلائی عطا فرمادی۔

۶۱۱

آپ کے لیے کن عورتوں سے نکاح جائز ہے ۶۸۹ تا ۶۹۱

۶۸۵

عائشہؓ اگر تم بھی اطاعتِ خدا کرو تو تمہارے مقاصد بھی جلد پورے ہوں گے۔

۶۹۲

اے رسولؐ آپ اپنی بی بیوں کے اوقات

مقدم و مؤخر کر سکتے ہیں۔ اللہ کا حکم ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

۶۹۵ تا ۶۹۹

ان بی بیوں کے علاوہ مزید ازدواج آپ کے لیے حلال نہیں سوائے کینیزوں کے۔ اس حکم کا فلسفہ مخالف روایات۔

۷۰۰ تا ۷۰۳

نکاح کے لیے قبل نکاح عورت کو دیکھ لیں تاکہ اُلفت و محبت پائیدار ہو۔

۷۰۳

سماں جنت کا رہنا ہے۔

۷۱۲

سماں انمول تحفہ ہے۔ اپنا رزق لے کر آتا ہے۔ اہل خانہ بخشے جاتے ہیں۔ اگر تم سماں نواز ہو تو تم پر جہنم کے دروازے بند ہیں۔

۷۱۳

سماں کو خلال بھی مہیا کرو

۷۱۴

اللہ اور فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں، مومنوں تک بھی درود بھیجو۔ جو لوگ اللہ اور رسولؐ کو دکھ پہنچاتے ہیں، اللہ انہیں دنیا و آخرت میں رحمت سے دور فرمادیتا ہے، ان کے لیے عذاب ہے۔

۷۲۰ تا ۷۲۴

مجھ پر دمِ بریدہ سلام نہ بھیجو

۷۲۴

فاطمہؓ میرا مگر ماں ہے جس نے اسے غضبناک کیا اس نے مجھے غضبناک کیا۔

۷۲۵

کسی بندہ کا ایمان اس وقت تک صحیح نہیں جب تک دل اور زبان صحیح نہ ہوں۔

۷۲۶

ازواجِ رسول اور مومن عورتیں رسول پر چادر ڈال کر نکلیں تاکہ وہ کینڑوں اور عام عورتوں سے الگ پہچانی جائیں اور انہیں دکھ نہ پہنچے۔
۷۲۸ تا ۷۳۳

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام (امام پنجم)

عین دن سے زیادہ نہ گزرے تھے کہ حضرت موسیٰ کو اللہ نے ان کی والدہ کے پاس لوٹا دیا۔
۵۲، ۵۱

قیامت میں اس اُمت سے بھی اس کے امام کو چُنا جائے گا۔
۱۲۵

آخرت تک پہنچنے کے لیے دُنیا ایک اچھا وسیلہ ہے اللہ نے فطرتِ انسانی میں اپنی معرفت کا جذبہ رکھا ہے۔
۳۵۲

دن اور رات میں سورہ لقمان کی تلاوت کے فضائل ۳۰۵

عذابِ مہین کا سبب غناء و رگ ہے۔
۳۱۳

نعمتِ ظاہر و خیمبر اللہ کی معرفت اور توحید اور نعمتِ باطن ہم اہل بیت کی ولایت کا پیمانہ ہے۔
۳۳۵

نمازِ اسلام کی اصل، زکوٰۃ فرع اور جہاد بلند چوٹی ہے اللہ بندہ سے اُسے عطا کی ہوئی عقل کے مطابق حساب لے گا۔
۵۱۶

محمد بن مسلم زہری (ایک دیندار عالم)
۶۱۹

امام علی بن العسین نے اسے ہشام بن عبد الملک اموی کی معاذت سے پرہیز کی ہدایت کی۔
۶۳

ملک الموت

اللہ فرشتوں کے ذریعہ تدبیر امور کرتا ہے۔ ان فرشتوں میں ایک گروہ قبضِ ارواح کرنے والا ہے۔ سرفرست ملک الموت ہے۔
۵۰۲ تا ۵۰۳

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام (امام پنجم)

برہہ زمین کی زندگی کا مفہوم ایسے لوگوں کی پیدائش ہے جو اصولِ عدل کو زندگی بنشتے ہیں۔ ایسے عدل زمین کی زندگی ہے۔
۳۱۹

ہشام بن حکم سے فرمایا کہ حکمت سے مراد فہم و عقل ہے۔
۳۲۶

ہشام کے لیے آپ کے ارشادات لقمان حکیم سے ملتے ہوئے۔
۳۲۳ تا ۳۲۲

حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام

کوزر پچھنے طاقتور دشمن کے یہاں پرورش پائی
۲۵

ہم تم سے موسیٰ دفرعون کا قصہ بیان کرتے ہیں
۲۷

مادر موسیٰ کو وہی کی کہ اسے دریا میں ڈال دو، ہم لوٹا دیں گے، چنا بچھو ایسا ہی ہوا۔
۳۰

موسیٰ کو فرعون کے محل میں پہنچا دیا۔
۳۱ تا ۳۷

موسیٰ آغوشِ مادر میں
۳۹

موسیٰ کے ہاتھوں ایک قبلی کا قتل
۵۲

قبلی کا قتل اور مقامِ عظمت
۵۸، ۵۷

حضرت موسیٰ کا ترقیل کے مشورہ پر مصر سے نکلنا۔ مدین کو روانگی۔
۶۳ تا ۶۱

مدین میں داخلہ حضرت شعیب سے ملاقات
۶۷ تا ۶۹

حضرت شعیب کا جنابِ صفورا کو حضرت موسیٰ کے نکاح میں دینا اور شرائطِ مہر
۷۱ تا ۷۵

حضرت موسیٰ کی مدین سے مصر کی طرف مہل و عیال روانگی۔ کوہ طور اور معجزات۔
۷۶ تا ۸۲

موسیٰ فرعون کے مقابلہ میں، موسیٰ کے معجزات اور فرعونوں کا انکار۔
۸۳ تا ۸۵

ظالموں کا انجام۔ پھلپ نسلوں کی ہلاکت کے بعد موسیٰ کو کتاب دی۔
۹۳ تا ۹۵

ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، بنی اسرائیل کا ہادی بنایا۔ بنی اسرائیل میں امام دہادی مقرر کیے
۵۲۳ تا ۵۲۸

مومنو! ان جیسے نہ ہو جانا جنہوں نے حضرت موسیٰ کو تکلیف دی حضرت موسیٰ پر حضرت ہارون کی موت کا الزام۔ قارون نے ایک بدکار عورت کے ذریعہ الزام لگایا اور دیگر واقعات
۴۲ تا ۴۵

یہ مسموٰۃ بنت حارث (اُم المؤمنین) بعض مفسرین کے بقول آپ نے بلاسر رسولِ پاک کی زوجیت قبول فرمائی۔
۶۹۱

سجاشی

نجران کا عیسائی بادشاہ
۱۰۳

نضر بن حارث

ایک تاجر جو ایرانیوں کے قتلے سنا تا تھا۔
۳۰۹، ۳۱۰

نعیم بن مسعود

ایک نو مسلم جس کے سیاسی کردار سے اجزاب میں بھڑوٹ پڑ گئی۔
۵۹۹

نمرود

ایک گمراہ مہبود
۱۲۳

حضرت نوح علیہ السلام

آپ نے ۹۵۰ برس تبلیغ کی، ظالم قوم کو طوفان نے گھیر لیا۔ نوح اور کشتی والوں کو نجات ملی، دوسروں کے لیے نشانی قرار پائی۔
۱۹۵ تا ۱۸۱

اور ہم نے نوح سے عہد لیا
۵۶۰

نوفل

جنگِ اجزاب میں شریک ایک نامی بہادر
۹۵

ولید بن عقبہ	۵۱۳
انمن کان مومنا کمین کان فاسق میں فاسق کا مصداق۔	۵۱۳
وارث	
قبیلہ بنی مازن کا ایک فرج جس نے حضور سے وقتِ قیامت کا سوال کیا۔	۴۶۸
ہامان	
فرعون کا وزیر جسے فرعون نے بروج بنانے کا حکم دیا	۸۶، ۲۹
حبیبہ	
جنگِ احزاب میں شریک ایک مشہور بہادر	۵۹۵
علماء و دانشور	
اکوسی۔ صاحبِ تفسیر روح المعانی	۴۵۳، ۳۳۷، ۳۰۹
	۶۹۲، ۶۹۱، ۵۷۷، ۵۱۲
آئن سٹائن۔ سائنسدان، متوفی ۱۹۵۵ء سائنسدانوں اور مفکرین کے کارناموں کا سبب ان کا مذہبی غور و فکر ہے۔	۳۰۱
ابن حجر مکی۔ مفسر	۷۲۳

ابن عربی	۶۹۱
ابن منظور۔ مصنف لسان العرب	۳۱۴
ابو حنیفہ (امام) فقیہ	۷۲۳، ۴۱۵
ابوالفتوح رازی۔ مفسر	۳۷۹، ۳۵۶، ۳۰۹
احمد حنبل (امام) فقیہ	۷۲۳، ۴۱۵
الفریڈ ایڈر۔ محقق	۳۳۹
بخاری (امام) محدث	۶۳۵، ۵۱۲
برسوتی۔ ناضل	۵۱۴
بلاذری	۲۵۱
بیہقی (سنن) محدث	۶۶۰
تانگی۔ دو۔ کینیٹن۔ محقق	۲۵۰
ترمذی۔ محدث	۴۱۵
ثعلبی۔ مفسر	۶۲۸
جنگ۔ محقق	۲۵۰
حاکم ابوالقاسم۔ جناب امیر کی حدیث بیان کی	۶۹۱
حاکم نیشاپوری	۵۹۹
حلی (علامہ) درود کی وضاحت	۷۲۳
راغب (صاحب مفردات) ۱۹۸، ۳۳۷، ۳۷۴، ۳۸۸	۳۸۸، ۳۷۴، ۳۳۷، ۱۹۸
	۶۱۸، ۵۸۹، ۵۶۱، ۵۰۹، ۴۶۱، ۴۱۲
	۷۲۵، ۶۸۲، ۶۹۰، ۷۳۱
زبیدی۔ صاحب تاج العروس	۳۱۴
زرارہ۔ عالم دین	۳۵۲
سگند فرزند۔ فلسفی	۳۳۹

کتاب آسمانی

تورات

سمائل کنگ۔ عالم معاشرت، موجودہ نسل انسانی کے اسلاف بھی کسی مذہب کے معتقد تھے۔	۲۴۸
سیوطی۔ مفسر (درمشور)	۷۲۳
شافعی (امام) محدث	۷۲۳، ۴۱۵
صدر المتالین۔ فلاسفر	۶۶۷
طبرسی۔ مفسر	۶۶۳، ۶۲۶، ۵۱۳، ۵۱۲، ۳۰۹
طبری۔ مؤرخ	۵۱۳، ۳۵۲
طوسی (شیخ) مفسر	۴۰۴، ۲۹۶
غزالی (امام) فلسفی	۷۲۶
فخر رازی۔ مفسر	۳۳۳، ۳۵۶، ۳۳۷، ۳۲۶، ۳۰۹
	۶۷۵، ۴۷۹
فرید وجدی۔ دائرۃ المعارف	۳۲۶
قرطبی۔ مفسر	۶۶۳، ۴۱۴، ۳۰۹
کلینی۔ صاحب کافی	۲۵۱
کول ٹائم۔ دانشور	۳۳۹
مانک (امام) فقیہ	۴۱۵
مسلم (امام) محدث	۶۲۲، ۵۱۲
مقلاو (فاضل)	۷۰۲، ۶۹۱
ویل ڈیورنٹ۔ (مؤرخ) دین ایک ایسا منظر ہے جو ہر انسان کی فطرت سے اُبھرتا ہے	۲۴۸
نیٹن۔ سائنسدان	۳۲۶

قرآن مجید

سورہ قصص

سورہ قصص کے مضامین

تلاوت سورہ قصص کے فضائل

سورہ عنکبوت کے مضامین

سورہ عنکبوت کی وجہ تسمیہ

سورہ عنکبوت تلاوت کرنے کے فضائل

ابتدائی آیات کی شان نزول

۲۹۲	سورہ روم کے مضامین
۲۹۵	سورہ روم کی شان نزول
۲۹۳	تلاوت سورہ روم کے فضائل
۲۹	یہ کتاب مبین کی آیات ہیں
۱۰۳	ہم ان لوگوں پر پے در پے قرآن کی آیات بھیجتے رہے۔
۱۰۳	جنہیں ہم نے پہلے کتاب دی تھی وہ قرآن پر ایمان لائے ہیں۔
۱۰۳	جس نے تجھ پر قرآن نازل کیا وہی انجام تک پہنچا دے گا۔
۱۶۰	تجھے یہ توقع نہ تھی کہ یہ کتاب تجھ پر نازل کی جائے گی، یہ تیرے رب کی رحمت ہے۔
۱۶۱	قرآن میں چار احکام، اللہ کی چار صفات جو لازم عقیدہ توحید ہیں۔
۱۶۵	جو کچھ تم پر وحی کیا گیا اس کی تلاوت کیا کرو
۲۳۶	قرآن ایک معجزہ ہے۔ دلائل و نکات
۲۵۳ تا ۲۵۱	کیا قرآن بطور معجزہ کافی نہیں ہے؟
۲۶۷ تا ۲۶۰	اعجاز قرآن پر لحاظ علم غیب
۳۰۰	ہم نے قرآن میں ہر قسم کی مثالیں پیش کی ہیں۔ تم آیات پیش کرتے۔ کیا فرکتے ہیں تم بھولے ہو۔
۳۹۹ تا ۳۹۵ تا ۳۹۳	سورہ لقمان کے مضامین، حروف مقطعات، آسمانوں کی تخلیق، اللہ کی صفات، موت، قیامت
۳۰۴	اعلام القرآن
۲۰۵	سورہ لقمان تلاوت کرنے کی فضیلت
۲۰۶	یہ کتاب حکیم کی محکم آیات ہیں۔ مطالب سے لبریز ہیں اور نیک لوگوں کے لیے ہدایت و رحمت
۲۲۱	قرآنی معجزہ، ستون جو دیکھے نہیں جاسکتے
۲۴۲	سورہ سجدہ کے نام، سجدہ لقمان و دیگر
۲۴۲	سورہ سجدہ کی تلاوت کے فضائل
۲۴۲	سورہ سجدہ کے مضامین، مبداء و معاد، انذار و بشارت۔
۲۴۶، ۲۴۵	یہ وہ کتاب ہے جس میں شک و تردید نہیں
۲۴۸، ۲۴۷	سورہ احزاب۔ و خیر تسمیہ و فضیلت
۵۲۸، ۵۲۷	سورہ احزاب کے مضامین
۵۳۰، ۵۲۹	سورہ احزاب میں ادراج البیہ کی تسدید پر آیات کی شان نزول۔
۶۱۴	

کتب تفسیر و تاریخ و سیر

۲۷۹	آفریدگار جہاں
۶۳۱، ۵۹۸، ۵۹۷	استحاق الحق
۵۱۴، ۴۶۲	اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ
۵۱۷، ۴۷۲، ۴۴۰، ۴۳۳، ۴۲۶، ۱۲۹	اصول کافی
۶۷۲، ۶۶۵، ۶۶۳، ۶۵۷، ۶۲۷، ۶۱۹	
۷۲۸، ۷۰۸، ۶۷۵، ۶۷۳	
۷۸	

۶۳۲	المراجعات
۵۱۶	اعالی
۵۹۴، ۵۹۳، ۴۴۱، ۲۸۲، ۲۳۳، ۲۱۰	بحار الانوار
۶۶۳، ۶۶۲، ۶۵۷، ۶۰۲، ۵۹۸، ۵۹۷	
۷۳۶، ۷۲۷، ۷۱۵ تا ۷۱۲، ۶۹۳، ۶۹۳	
۴۱۸	تاثير موسیقی بر روان و اعصاب
۷۳۱، ۴۱۵، ۴۱۴	تاج العروس
۲۴	تاریخ القرآن
۶۶۳	تاریخ بغداد
۳۴۸	تاریخ تمدن
۷۲۳	تذکرہ علامہ حلی
۳۵۶، ۲۹۵، ۸۸، ۶۸	تفسیر ابو الفتوح رازی
۳۶۸، ۲۲۳، ۱۳۸، ۱۳۵، ۹۰	تفسیر المیزان
۶۲۶، ۵۹۲، ۵۲۸، ۵۱۶، ۵۰۶	
۶۷۵، ۶۷۱، ۶۵۸، ۶۳۴	
۵۵۸، ۴۵۳، ۳۳۸، ۳۳۷، ۳۲۱، ۱۱۵	تفسیر بہان
۶۵۲	
۴۳۳	تفسیر برضاوی
۴۰۴، ۳۵۶، ۳۰۹، ۲۹۵	تفسیر تبیان
۱۵۵	تفسیر جامع الجامع
۶۳۰، ۵۱۶، ۵۰۶، ۴۶۸، ۴۱۵، ۲۸۵	تفسیر زینب
۷۲۳، ۶۷۱	
۵۷۷، ۵۵۴، ۵۱۳، ۲۲۳	تفسیر روح البیان
۹۱۷ تا ۹۱۴، ۱۰۰، ۹۰	تفسیر روح المعانی
۵۱۶ تا ۴۴۴، ۴۱۷	
۵۵۷، ۵۵۶، ۵۵۵	
۴۸۵، ۴۶۱، ۱۱۵، ۹۲	تفسیر صافی
۱۲۹، ۱۰۸، ۷۲، ۵۲	تفسیر علی ابن ابراہیم
۴۸، ۴۵۲	
۲۹، ۳۰، ۹، ۲۹، ۵، ۱، ۳	تفسیر فی ظلال القرآن
۷۸۹، ۵۷۷، ۵۵۴	
۶۱، ۴۱۴، ۲۷۳، ۲۱۷، ۱۶۱	تفسیر قرطبی
۵۸۹، ۵۷۷، ۵۵۵، ۵۴۷	
۰۰۳، ۶۹۲، ۶۵۸	
	تفسیر فی
۱۱۴، ۹۰، ۵۱، ۳۴، ۳۳	تفسیر کبیر
۶۲۹، ۱۶۱، ۱۵۵، ۱۵۲	
۵۰، ۶۴۳، ۴۶۱	
۱۵۲، ۱۰۳، ۳۷، ۳۳، ۲۶	تفسیر مجمع البیان
۲۳۹، ۲۳۸، ۱۸۷، ۱۶۱	
۴۳۱، ۴۰۵، ۳۳۸، ۲۹۵	
۴۵، ۴۳۱، ۴۳۹، ۴۳۳	
۴۸۷، ۴۷۶، ۴۷۵، ۴۷۰	
۳۸، ۵۱۷، ۵۱۳ تا ۵۱۲	
۵۸۹، ۵۷۶، ۵۵۵، ۵۴۷	
۶۵۶، ۶۳۳، ۶۳۹، ۶۲۶	
۶۹۶	

۶۲۱/۶۳۰	شواہد التنزیل	۱۱۲۹۰۷۲۰۵۸۰۵۳۰۳۷۰۲۶	تفسیر فراشتلین
۷۲۳/۷۱۰/۵۵۵/۵۵۴	صحیح بخاری	۳۱۷۰۲۹۵۰۲۹۳۰۲۳۹۰۱۶۶۰۱۳۰	
۶۷۰	صحیح ترمذی	۲۲۶۰۳۰۵۰۳۶۷۰۳۵۲۰۳۳۸۰۳۲۹	
۷۲۶/۷۲۳/۶۶۳	صحیح مسلم	۵۳۸۰۵۱۷۰۵۰۵۰۳۸۵۰۳۶۹۰۳۳۰	
۷۲۳/۶۶۳	صواعق محرقة	۷۰۲/۶۰۳/۶۰۳/۵۹۱/۵۵۳	
۶۶۰	طبقات کبریٰ	۷۴۵/۷۲۹	
۵۸	عیون الاخبار	۳۳۰/۲۹۳/۲۶	ثواب الاعمال
۲۵۲	فتوح البلدان بلاذری	۳۳۸	جامع شناسی (سیموئیل کینگ)
۵۹۸	فروغ ابدیت	۶۱۷	جوہر الکلام
۱۹۸	فرہنگ عمید	۵۹۸	حبیب السیر
۶۶۰	قاموس اللغات	۶۷۵	خصائل صدوق
۳۳۱	قصص القرآن	۳۲۶	ذاتۃ المعارف
۷۳۱	قطر المحيط	۳۰۲	دنیا کم می بینم
۷۱۱/۶۰۷/۵۹۳/۵۷۴/۵۶۷	کامل ابن اشر	۳۳	دیوان پردین اعصامی
۶۳۷/۶۲۳		۶۶۰/۶۰۵/۶۰۳/۳۱۵/۳۷۵/۲۱۷	سفینۃ البحار
۷۲۵	کتاب الخدیج	۷۲۳	سنن ابن ماجہ
۳۵۲/۳۵۱/۳۱۹	کتاب کافی	۷۲۳	سنن ابن مردودہ
۷۰۲/۶۹۱/۶۹۰/۶۱۵	کنز العرفان	۷۲۳	سنن ابوداؤد
۶۶۳	کنز العمال	۷۲۳/۶۶۳	سنن ترمذی
۷۳۱/۷۰۹/۶۶۰/۵۸۸/۳۱۳	لسان العرب (ابن منظور)	۷۲۳/۶۶۳	سنن نسائی
۷۳۱	مجمع البحرين	۶۳۳/۶۱۱/۶۰۱/۵۷۴/۲۰۹	سیرت ابن ہشام
۷۱۵/۷۱۳/۶۳۸	مجملۃ البیضاء	۷۲۵	شرح المواہب زدقانی
۵۹۸	مستدرک (حاکم)	۵۹۷	شرح فتح البلاغہ (ابن ابی حدید)

۶۷۰/۶۶۳/۵۵۴/۲۵۴	مسند احمد حنبلی	۶۷۰/۶۶۳/۵۵۴/۲۵۴	استوحی، مادہ استواء، کمال خلقت اور اس کا اعتدال۔
۶۶۵	معالم النبوت	۶۶۵	
۶۶۷	مفاتیح الغیب	۶۶۷	اسوہ (بروزن عودہ) تاسی، اتقاد، پیروی
۳۱۳/۳۸۸/۳۷۴/۳۳۷/۲۹۸	مفردات (راغب)	۳۱۳/۳۸۸/۳۷۴/۳۳۷/۲۹۸	اشحہ، مادہ اشح، شح کی جمع، ایسا بخل جس میں حرص شامل ہو
۵۸۹/۵۶۱/۵۰۹/۳۶۱/۳۱۳		۵۸۹/۵۶۱/۵۰۹/۳۶۱/۳۱۳	اشد، مادہ شدت، طاقتور
۷۳۱/۶۹۰/۶۸۲/۶۲۵/۶۱۸	فتوح کنز العمال	۷۳۱/۶۹۰/۶۸۲/۶۲۵/۶۱۸	افصح، مادہ افصح، کسی چیز کا خالص ہونا، مراد سخن خالص
۶۶۳	من لایحضرہ الفقیہ	۶۶۳	افلت، غیر حقیقی معبود
۳۶۹	نہج البلاغہ	۳۶۹	افسد، افراد کی جمع، معنی دل افزونگی، روشنی بھنگی
۲۷۰/۲۳۳/۱۳۰/۱۳۹/۹۷/۳۷/۳۶		۲۷۰/۲۳۳/۱۳۰/۱۳۹/۹۷/۳۷/۳۶	اقسط، زیادہ نصفانہ
۶۶۳/۶۶۳/۵۸۸/۳۶۸/۳۶۲/۳۵۲		۶۶۳/۶۶۳/۵۸۸/۳۶۸/۳۶۲/۳۵۲	اقصر، مادہ اقصر، صاف و مستقیم کرنا۔ کھڑا کرنا
۳۱۳/۳۱۲/۲۳۵/۱۵۳/۱۵۳/۷۸/۵۵	وسائل الشیخہ	۳۱۳/۳۱۲/۲۳۵/۱۵۳/۱۵۳/۷۸/۵۵	التقط، مادہ التقط، کسی شے کو بغیر تلاش و کوشش پالینا۔ کم شدگی کے بعد واپس ملنے والی چیز کو کھنڈتے ہیں۔
۷۰۳/۶۵۲/۳۳۱/۳۱۸/۳۱۵	یاتیح المبرورۃ	۷۰۳/۶۵۲/۳۳۱/۳۱۸/۳۱۵	السننہ، تیز و تند زبان، سخت لہجہ میں بولنا
۶۶۳		۶۶۳	امتعن، مادہ متع، وہ ہدیہ جو عورت کے شایان شان ہو۔

لغات قرآن

(۱)

۷۰۹	آفست، (ایٹاس سے مشتق ہے، مشابہ کرنا)	۷۰۹	آتی، مادہ اتی، بانی، بروقت۔ یہاں کھانا تیار کرنے کے معنی میں۔
۳۰۷	اٹار، مادہ اٹور، (بروزن غور) پراگندہ کرنا	۳۰۷	اوثان، وثن، (بروزن صنم) کی جمع۔ پتھر جن سے انسانی صورتیں بنا کر انہیں پوجا جائے
۵۰۲	ابصرنا، ہم نے دیکھا	۵۰۲	ایمن، جانب راست، دائیں طرف
۶۳۷	ادعیاء، دعویٰ کی جمع۔ منہ بولا بیٹا	۶۳۷	
۶۸۲	اذی، ہر طرح کی جسمانی و روحانی تکلیف	۶۸۲	
۳۳۵	اسبغ، مادہ اسبغ، نعمت فراوان	۳۳۵	

- تقویٰ، باطنی ذمہ داری اور جہاد ہی کا احساس ۵۲۲
 تلقاد، مصدر یا اسم مکان۔ یہاں سمت کے
 معنی میں ہے۔ ۶۳
 تَلَک، اسم اشارہ ۳۰
 تصید، مادہ، صید، ایشیائے
 عظیم کا تزلزل و اضطراب۔ ۳۲۱
 تنوع، مادہ، نو، وزنی چیز جس کا اٹھانا مشکل ہو ۱۳۸
 تویدی، مادہ، ایوان کسی شخص کو اپنے پاس
 جگہ دینا۔ ہم نشینی ۶۹۷
- (ث)
- ثاوی، مادہ، ثوی، مستقل طور پر قیام کرنا ۹۶
 ثقفا، مادہ، ثقف ثقافت کسی شے کو
 مہارت سے حاصل کرنا۔ ۷۳۲
- (ج)
- جائمہ، مادہ، جہم، (بروزن شہم، گھٹنوں
 کے بل زمین پر بیٹھنا۔ ۲۲۷
 جان، موجود چیز جو نظر نہ آتی ہو۔ ۸۰
 جحد، وہ چیز جس کا انسان مقتدر ہو مگر
 بظاہر انکار کرے۔ ۲۵۰
 جذوۃ، آگ کا انگارہ ۷۹
 جروز، (بروزن شتر) برابر زمین جہاں سے
 تمام ہریالی ختم کر دی گئی ہو۔ ۵۳۳

(ب)

- باس، سختی۔ یہاں جنگ مراد ہے ۵۸۱
 بالحق، حق کے ساتھ، عین واقعیت ۳۱
 بصائر، بصیرت کی جمع۔ بینائی، مگر یہاں مراد ہیں
 اللہ کی نشانیاں جو دلوں کو منور کرتی ہیں۔ ۹۱
 بضع، کم از کم تین، زیادہ سے زیادہ دس سال مراد ہیں ۲۹۷
 بطرت، مادہ، بطر، (بروزن بشر) دولت و
 نعمت کی بنا پر غرور و سرکشی۔ ۱۱۶
 بغتۃ، مادہ، بغت، (بروزن وقت) حادثہ ناگہاں ۲۶۳
 بقعۃ، زمین کا حصہ جو اطراف زمین سے متاثر ہو ۷۹۷

(ت)

- تبعج، مادہ، برج، وہ چیز جو سب کے سامنے ہو ۶۲۳
 تتجافی، مادہ، جفار، اٹھانا، دور کرنا ۵۰۹
 تعیت، مادہ، حیات، ایک اور زندگی کے لیے
 دُعا کرنے کے معنی میں۔ ۶۷۲
 تخلقون، مادہ، خلق، پیدا کرنا، بنانا ۱۹۹
 ترحی، مادہ، ارجا، تاخیر ۶۹۷
 تذودان، مادہ، ذود، منح کرنا، روکنا، دفع کرنا۔ ۶۶
 تعشوا، مادہ، عشی، دُنیا میں فساد کرنا، مفاسد اخلاقی ۲۲۷
 تصعر، مادہ، عصر، اونٹ کی ایک بیماری ۳۳۸
 تطہیر، پاک کرنا ۶۲۵

- جلباب، چادر، مقننہ سے، دوپٹہ، اور مٹھی
 لمبا اور ڈھیلا کرنا۔ ۷۳۰
 جنوب، جنب کی جمع، پہلو، کر وٹ ۵۱۰
- (ح)
- حاصب، طرفان جس میں سنگریزوں کی بارش ہو ۲۲۹
 حجاب، مادہ، حجب، وہ شے جو دو چیزوں
 کے درمیان حائل ہو۔ ۷۰۹
 حجج، حجۃ کی جمع، ایک سال ۷۲
 حکم و علم، عقول و فہم اور علم وہ آگہی
 جس میں جہل کا شائبہ نہ ہو۔ ۵۴
 حمیر، حمار کی جمع، معنی گدھا ۲۳۹
 حذیف، مادہ، حنف، باطل سے حق کی طرف
 یا کجی سے راستی کی طرف میلان ۳۲۳
 حیوان، (بروزن قربان) حیات، زندگی ۲۸۰

(ح)

- خاتمہ، (بروزن حاتم) ایسی چیز جو کسی شے کو
 ختم کرنے والی ہو۔ دستاویزات پر لگائی
 جانے والی نمبر۔ ۶۶۰
 خاطی، وہ شخص جو اپنا کام اچھی طرح نہ کرے
 اور غلطی وہ جو کام تو اچھی طرح کرے
 مگر اتفاقاً غلطی ہو جائے۔ ۶۶

- ختار، مادہ، اختر، (بروزن پتر) عمدگشتی
 (صیفہ مبالغہ) ۶۳
 خردول، رانی، ایک بہت چھوٹا دانہ ۳۶
 خزو، مادہ، خزیر، بلندی سے گرنے والے پانی
 کی آواز۔ ۰۹

- خسفت، زمین میں دھنسا ۲۹
 خشیت، ایسا خوف جو اللہ کی عظمت و ولایت
 کی بنا پر اس کے خاص بندوں کو
 ہوتا ہے۔ ۶۴

- خطب، کام، مقصد ۶۶

(ذ)

- ذرع، دل یا خلق ۳۲

(س)

- ربطنا، مادہ، ربط، مقام حفظ و تقویت ۲۹
 رجذ، عذاب حقیقی، معنی اضطراب و بے چینی ۳
 رجس، ناپاک شے، طبع انسان، حکم عقلی یا
 شریعت کی رو سے ہر طرح ناپاک ۲۵
 روم، معین و یادگار ۱۲
 رعا، راعی کی جمع معنی چوپان، گڈریا ۶۷
 رکون، قلبی میلان، ظاہری شرکت ۲۹

۶

(نر)

زاغت: مادہ 'زین' ایک طرف جھکنا
(خوف کی حالت میں) ۵۶۹

(س)

سادہ: سید کی جمع، مانگ و مختار بہت بڑا مانگ ۷۴۰
ساعة: چیخ، تصور، جیسا کہ آواز (ساعت
صفری، دو سطلی و کبریٰ کے معنی میں
پر دیکھیں۔ ۲۱۳سحوان: حضرت موسیٰ کے دو بڑے مجرے
عصا و دید برفضا مراد ہیں۔ ۱۰۰سراج: مادہ 'سرح' پھل اور پتوں والا پودا ۶۱۶
سراجا جمیلا: محبت و احترام کے ساتھ
علیہ و کرنا۔ طلاق کا کنایہ بھی ہے۔ ۶۸۶سلا لہ: ہر چیز کا خالص نچوڑ۔ یہاں آدمی کا
نطفہ مراد ہے۔ ۴۹۳سلفو کو: مادہ 'سلف' (بروزن خلق) کسی چیز کو
غیض و غضب سے کھولنا۔ ۵۸۳سلموا: ہر کام میں حضور کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ۷۲۲
سمعنا: ہم نے سنا ۵۱۲

سواہ: مادہ 'تسویہ' تکمیل کرنا ۲۹۳

سوی: مادہ 'سار' بد حال ہونا ۲۲۲

(ش)

شاطبی: ساحل ۷۹
شفیع: ناصر، مددگار ۴۸۳

(ص)

صلوات: اس کی جمع صلوات ہے۔ اللہ سے
نسبت دی تو معنی ہیں رحمت نازل
کرنا فرشتوں اور انسانوں سے نسبت
دی تو معنی طلب رحمت ہوں گے۔ ۷۲۱صلوا: آنحضرت پر طلب رحمت اور درود
بھیجے کا حکم۔ ۷۲۲صیاصی: صیاصیہ کی جمع، قلعے، حربہ جنگ،
بیل کے سینک، پنجہ مرغ کا خار ۶۰۸

(ض)

ضاق: راستہ طے کرتے وقت اڈنٹ کے دو
قدموں کا فاصلہ۔ ۲۲۲

(ط)

طوفان: مادہ 'طواف' انسان کو گھیر لینے والا
حادثہ۔ آگ، پانی اور شب کی تاریکی
پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ ۱۹۸

(ظ)

ظلل: غلطی (بروزن تک) کی جمع۔ بادل
سابان، پہاڑ ۲۶۱
ظنون: اچھے اور بُرے گمان ۵۶۹

(ع)

عسلی: امید ۱۲۸
عصبہ: دس سے چالیس افراد کا گروہ جنہوں
سے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہوں۔ ۱۳۸عمد: (بروزن قر) عمود کی جمع۔ ستون ۴۲۱
عورة: مادہ 'عار' وہ شے جسے ظاہر کرنا
ننگ و عار ہوتا ہے۔ ۵۷۵

(غ)

غابریں: غابریہ کی جمع۔ قافلہ میں ساتھیوں
سے پیچھے رہ جانے والا۔ ۲۲۱غرف: 'غرف' کی جمع۔ بلند عمارت، بالا خانہ ۲۷۲
غورور: (بروزن جسور) فریب، دھوکہ دینے
والی چیز۔ ۴۶۸

(ف)

فاحشہ: مادہ 'فحش' نازیبا و ناپسندیدہ بات ۲۱۶

فارغ: خالی جگہ۔ ہر شے سے خالی ۴۹
فحشاء: مخفی گناہ جو قوائے شہوانیہ کے تحتانجام پاتے ہیں۔ ۲۳۶
فرحین: 'فرح' کی جمع۔ وہ شخص جو کچھ پالینے
پر مغرور و خوش ہو جائے۔ ۱۳۹فطرت: مادہ 'فطر' (بروزن بدر) کسی چیز کو اس
کے طول سے چیزنا۔ مجازی طور پر بمعنی
خلقت مستعمل ہوتا ہے۔ ۲۳۴

فی: بازگشت۔ اچھی حالت کی طرف لوٹنا ۶۹۰

(ق)

قانت: مادہ 'قنوت' اطاعت جس میں ششوع و
خشوع بھی ہو۔ ۲۳۷
۶۲۷قصر: مادہ 'قصر' (بروزن حر) ٹھنڈک، خشکی ۵۱۱
قصرن: مادہ 'وقار' معنی بوجھمادہ 'قرار' معنی ٹھہراؤ ۶۲۳
قصیہ: مادہ 'قص' کیفیت شے کی جستجو، قصہ ۴۹

قیمہ: ثابت، استوار ۴۷۲

(ک)

کبراء: کبریا کی جمع۔ بڑے لوگ، خواہ زندگی
علی یا معاشرتی یا عمر کے اعتبار سے ہو ۶۳۰

کتاب: کتاب میں سے لوح محفوظ مراد ہے قرآن ۳۱

کسف: جمع کسف (بروزنِ حجلہ) بمعنی قطعہ
یہاں بادل کے ٹکڑے مراد ہیں

۳۸۲

(ل)

لعو: کذب، لہو وغنا
۱۰۸
لقار اللہ: ملاقاتِ حسی نہیں بلکہ ملاقاتِ روحانی
۱۸۲
مراد ہے۔

لنبو متھم: مادہ 'تبوئہ' کسی کو مستقل

۲۷۲ سکونت دینا۔

(م)

ماوی: مادہ 'اوی' (بروزنِ قوی) مبالغہ۔

۵۱۵ انضمام، مکان، مسکن

۳۸۲ مبلس: مادہ 'ابلاس' یا 'اسامیدی'

۳۱ مبین: بطور لازم و متعدی دونوں طرح مستعمل ہے

مختال: مادہ 'خیال' اور 'خیلاء' وہ شخص جو

۳۳۸ دوسروں پر اپنی برتری ظاہر کرے۔

مواضع: مریض (بروزنِ خمیر) کی جمع، دودھ

پنسلے والی عورت۔ دودھ پلانے

۵۰ کی جگہ، پستان۔

مرحبقون: مادہ 'ابحاف' دکھ پہنچانے والی

۷۳۲ اغوا ہیں۔

مرسح: (بروزنِ فرح) نعمت سے پیدا ہونے والا

۳۳۸ غرور منشی۔

مصفر: مادہ 'صفو' (بروزنِ سفر)

۳۸۸ زور رنگ۔ خالی

۵۱۰ مضاجع: مضجع کی جمع، بستر، فرش، استراحت

معوقین: مادہ 'عوق' (بروزنِ شوق) روکنا

۵۸۱ بغض رکھنا۔

مفاتح: مفتوح (بروزنِ مکتب) کی جمع، ایسی

جگہ جہاں کوئی چیز ذخیرہ کی جائے یعنی

صندوق وغیرہ۔

۱۳۸ مفتوح: چابی

۸۴ مفتری: مادہ 'فری' تمہت، دروغ

۹۱ مقبوح: مادہ 'تبح' زشتی، رسوا، ہتکارا ہوا

مقتصد: مادہ 'مقتصد' کام میں اعتدال،

۳۶۲ ایفائے وعدہ۔

۳۱ من: حرف جار تعبیضیہ تھوڑا سا

۳۵ منت: نعمت و عطایا کا بخشنا

منکر: آشکارگانا کیوں جو قوتِ عقلیہ کے

۲۳۶ تحت کیے جائیں۔

مذہبین: مادہ 'اناب' وضعی معنی توحیدی فطرت

۳۳۵ کی طرف لوٹ آنا۔

مہین: غرار و رسوا کرنے والا، ضعیف،

۳۹۳، ۳۱۲ حقیر، ناچیز۔

۵۹۱ میثاق: ایسا عہد جو قسم کے ساتھ ہو۔

(ن)

۲۱۶ نادعی: مادہ 'ندا' مجلس عمومی، تفریح گاہ

ناکس: مادہ 'نکس' (بروزنِ نکس) اوندھے منہ ہونا

۵۰۲ یہاں سر نیچا کرنے کے معنی میں ہے۔

نبد نہمو: مادہ 'نبد' (بروزنِ نبض) بے قدر و

۹۰ بیکار چیز کو دور بھینکانا۔

۵۸۹ نحب: (بروزنِ عمد) نذر، عمد، بیان

نزعنا: مادہ 'نزع' کسی چیز کو اس کی جگہ سے

۱۳۳ جذب کرنا۔ یہاں ہر گروہ سے گواہ لانا مراد ہے

۴۱۳ نعیبہ: مادہ 'نعبت' ہر طرح کی بہت سی نعمات

۷۳۲ نغزینک: مادہ 'اغز' ترغیب، تشویق، براگتھ کرنا

۲۹۳ نفخ: پھونکانا

۱۱۱ نکلن: تمکین دینا

(و)

۷۹ وادی: درہ، سیلاب کی پہاڑی، گزرگاہ

۳۳۳ وجہ: صورت، مگر صورت باطنی مراد ہے، روئے دل

ودق: (بروزنِ خلق) غبار کی مانند ذرات،

۳۸۳ قطرات آب۔

۱۰۵ وصلنا: مادہ 'وصل' ارتباط دینا متصل کرنا

۶۳۷ وطر: ضرورت اور اہم حاجت، مراد زینب کی طلاق

۵۶ وکز: تمکمارنا

(ی)

۳۱۲ یبلس: مادہ 'ابلاس' شدت یا اس سے طاری

ہونے والا غم و اندوہ۔

۶۲ یتوقب: مادہ 'توقب' انتظار کرنا

یتوفا کھ: مادہ 'توفی' (بروزنِ تصدی)

۵۲۱ واپس لینا۔

۱۱۱ یجبی: مادہ 'جبایہ' جمع کرنا

۳۱۳ یحبرون: مادہ 'حبر' (بروزنِ قشر) اثر خوب

یدنین: قریب کریں، مراد چادر کو قریب کریں،

۷۳۱ لپیٹ لیں۔

۳۰۱ یستخفک: مادہ 'خفت' سبکی

یستصرخ: مادہ 'استصرخ' مدد کے لیے

۶۲ پکارنا، شور مچانا

یستعتبون: مادہ 'عتب' (بروزنِ حتم)

۳۹۸ دلی بے چینی۔

۶۷ یصدر: صدر سے مشتق، خارج ہونا

یصدعون: مادہ 'صدع' وضعی معنی برتن توڑنا

۳۷۲ پھاڑنا، پراگندگی۔

یصلی: مادہ 'صلو' یہاں توجہ اور مخصوص

۶۷۲ عنایت مراد ہے۔

۳۰۰ یطبع: مادہ 'طبع' ٹھہر گانا

۱۷۹ یفتنون: مادہ 'فتن' سونے کو آگ میں پٹانا

- یقینت، ماوہ، قنوت، اطاعت ۶۱۷
 یمدہ، ماوہ، مدار، سیاہی جس سے لکھا جائے
 (رنگ کوئی بھی ہو) ۳۵۳
 یمہدون، ماوہ، ممد، (بروزن، عمد، گوارہ، جھولا ۳۷۲
 یونکون، ماوہ، انک، (بروزن، نکر، کسی چیز کی
 حقیقی شکل کو بدل ڈالنا۔ ۳۷۶

متفرق موضوعات

آزمائش (مختلف طریق سے)

جماد، آلودہ معاشرہ میں ایمان کی حفاظت
 مغربی میں قناعت وغیرہ۔ ۱۷۷

آئمہ نور و نار

آئمہ نور کو ہدایت یافتہ لوگوں اور آئمہ نار کو
 گمراہوں کا پیشوا بنایا۔ ۹۱

آیہ تطہیر

- آیہ تطہیر کی تفسیر میں مفسرین کا اختلاف
 دلائل اور معنی کی بحث ۶۲۷ تا ۶۲۷
 آیہ تطہیر عصمت کی دلیل ہے، نیز کن افراد
 کے بارے میں ہے۔ ۶۲۸، ۶۲۹
 آیہ تطہیر میں اللہ کا ارادہ تشریحی ہے یا تکوینی؛ ۶۳۲

ازواجِ نبی کی خصوصیات کی تفصیل ۶۲۲ تا ۶۲۲

استقلالِ روح اور اس کی اصلیت

بدن سے جدائی کے بعد روح کا باقی رہنا اور
 اس پر بحث۔ ۵۰۳

اسلام میں عورت کا مقام

سورۃ احزاب کی آیت ۳۵۔ عورت کو مرد کی طرح
 نیک صفات میں شریک فرمایا ہے۔ ۶۳۶ تا ۶۳۹
 اللہ کی بارگاہ میں عورت و مرد برابر ہیں ۶۳۰

اصلاحِ احوال اور بچاؤ کے طریقے

آنحضرتؐ نے پہلے بی بیوں، بیٹیوں اور مومن
 عورتوں کو پابند کیا، پھر لوگوں کی شرارت
 سے نکلنے کا ارادہ فرمایا۔ بنی قریظہ کی جلاوطنی ۶۲۳ تا ۶۲۶

افستراء

محمدؐ نے اللہ پر ٹھوٹا باندھا۔ قولِ مشرکین ۳۷۸

انفس و آفاق میں اللہ کی آیات

تمہیں مٹی سے پیدا کیا، روئے زمین پر پھیلا دیا،
 تمہارے لیے ازواج پیدا کر کے تسکین بخشی،
 زمین و آسمان کو خلق کیا۔ مختلف رنگ و زبان دیے
 ان سب میں عالمین کیلئے نشانیاں ہیں۔ ۳۲۱ تا ۳۲۶

انسان کے نفس و خارج میں سونا جاگتا،
 شب و روز کی تنگ و دو، اللہ کی نشانیاں ہیں ۳۲۸ تا ۳۱۱

انکارِ حق کیلئے بہانے

جب ہر عقلِ شرک و دیت پرستی کے باطل
 ہونے کا حکم لگاتی ہے اور ظلم و نا انصافی کو
 قابلِ نفرت قرار دیتی ہے، پھر کیوں انکار
 کرتے ہیں؟ ۹۹

اس پیغمبرؐ کو موتی جیسے معجزات کیوں نہیں دیے
 ۱۰۰

ایک اور عظیم کامیابی

بنی قریظہ پر فتح

بنی قریظہ اور بنی نضیر کا مدینہ سے اخراج
 اور اس کے بعد بنی قریظہ سے جنگ۔ ۱۰۹
 بنی قریظہ سے جنگ کے اسباب و واقعات
 کی تفصیل و نتائج۔ ۱۱۱

ایک بڑی رسم کا ٹوٹنا

زینب بنت جحش کا زید سے نکاح، طلاق
 اور پھر آنحضرتؐ کے حوالہ عقد میں آنا ۶۳۳ تا ۶۳۳
 عقدِ زینب سے متعلق جھوٹے انسانے ۶۳۹ تا ۶۳۹
 حق کے سامنے جھک جانا ہی عینِ اسلام ہے ۱۱

ایک عجیب پیشگوئی

ایران کی فتح اور روم کی شکست پر مشرکین مکہ خوش ہوئے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا بہت جلد رومی فتح پائیں گے۔

۲۹۶

بحث کے لیے بہترین روش اختیار کرو

گفتگو میں الفاظ، حرکات و سکنات اور لب و لہجہ میں ایسی روش اختیار کرو جو مقابل کے دلنشین ہو جائے مگر یہ روش ظلم کے ساتھ نہ ہو۔

۲۴۷ تا ۲۴۶

بدکاروں کا انجام

کبھی سوچو کہ یہ کائنات بے مقصد پیدا نہیں کی اور زوال کی طرف رواں دواں ہے۔

۳۰۵

بنی اسرائیل کے خود پرست سرمایہ دار

ان میں ایک حضرت موسیٰ کا چچا زاد قارون بھی جسے خدا نے بے شمار دولت دی، وہ منکبر ہو گیا۔

۱۳۷

بہت سی سبق آموز باتیں

پیغمبرانِ خدا مظلوموں کے حامی رہے۔ بسا اوقات معمولی سا عمل خیر بہت بڑی سعادت کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ مردانِ خدا کا معمولی نیکی کا اجر عطا کرنا۔ موسیٰ کا نیک تربیت پانا۔

۷۰۶۹

پہاڑ جیسی استقامت کے لوگوں سے محسن سلوک کرو

اللہ رائی کے دانے کے برابر عمل کا بھی اجر دے گا۔

۳۳۶ تا ۳۳۰

تربیتی اور اصلاحی سنزائیں

ہم قیامت کے آخری عذاب سے پہلے اصلاح کے لیے انہیں چھوٹے عذاب میں مبتلا کریں گے تاکہ وہ اللہ کے سلسلے پلٹ آئیں، اگر پھر بھی فائدہ نہ اٹھایا تو انجام عذاب ختم ہے۔

۵۱۹ تا ۵۲۱

ترکِ اولیٰ کی مثالیں

حضرت موسیٰ کا قبطی کو قتل کرنا۔ حضرت آدمؑ کا ترکِ اولیٰ۔

۵۸۱۵۷

تعمیرِ بُرج

فرعون نے اپنے وزیر ہامان سے ایک بُرج تعمیر کرنے کو کہا تاکہ اس پر چڑھ کر موسیٰ کے خدا کو دیکھے۔

۸۷

تمام اشیاء کس طرح فنا ہوں گی؟

لوضوح فنا پر ایک بحث

۱۶۷

خاتم کے معنی

خاتم کے معنی، اعتراضات کی روا اور بحث ۱۰۶۶۰

ختم نبوت

ختم نبوت کے معنی، مفہوم اور تشریح ۶۵۸، ۵۹

ختم نبوت ارتقا سے ہم آہنگ

علم و عرفان میں انسان کا ارتقا اور دیگر دلائل ۶۶۵ تا

ختم نبوت کے دلائل

قرآنی آیات اور احادیث ۶۶۱ تا ۶۵

خدا اور فرشتوں کا درود

اسے لوگو! اللہ کو یاد کرو۔ وہی تم پر درود اور رحمت بھیجتا ہے۔ ۶۷۰ تا ۳

خدا صاحبِ قدرت ہے

مردے اور برے تیری بات نہیں سکتے، روح مردہ ہے، نصیحت بے اثر ہے۔ ۳۸۷ تا ۳۹۳

خدا کو بہت یاد کرو

ذکر خدا کرنے کی تاکید میں حضرت ابو ذرؓ نے آنحضرتؐ کی حدیث۔

جنگِ احزاب کے چند اہم پہلو

جنگ کی اہمیت، لشکروں کی تعداد، حضرت علیؑ کی تاریخی جنگ۔

۵۹۲ تا ۵۹۸

جنگِ احزاب سے روکنے والا گروہ

اللہ جنگ سے روکنے والوں کو جانتا ہے، وہ تمہارے بارے میں بخیل ہیں، لرزہ براندام ہیں، اللہ نے ان کے اعمال ضبط کر لیے۔ اگر وہ تمہارے ساتھ بھی ہوتے تو تھوڑی سی جنگ کے سوا کچھ نہ کر پاتے۔

۵۷۹ تا ۵۸۲

چلنے پھرنے کے آداب

زمین پر نکتہ کی چال نہ چلو

۳۳۰

حق طلب اہل کتاب

علمائے یہود و نصاریٰ کا ایک گروہ جو آیات قرآن سن کر ایمان لایا اور پھر اس پر قائم رہا۔ ۱۰۲ تا ۱۰۷

حدوثِ تائش ہر حال میں اللہ کے لیے ہے

زندہ سے مردہ اور مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے وہی قیامت میں سب کو قبروں سے نکالے گا۔ پس وہ لائقِ حمد ہے۔

۳۱۷

خدا کی دس صفات

غنی، حمید، عزیز، حکیم، سمیع، بصیر، خیر، متقی
علی اور کبیر۔

۳۵۸ تا ۳۵۲

خدا کے آثارِ رحمت کو دیکھو

ٹھنڈی ہوائیں، بارش، مردہ زمین کی زندگی،
کشتیوں کا چلانا، قیامت میں مردوں کا زندہ
ہونا، رحمت سے استفادہ کرو، شکر گزار بن جاؤ

۳۸۶ تا ۳۸۱

خدا کے علم کی وسعت

اللہ سے ڈرو اور اس دن سے جب باپ
بیٹے کے اور بیٹا باپ کے کام نہ آئے گا۔
اللہ کا وعدہ سچی ہے، وہی جانتا ہے کہ ماں
کے شکم میں کیا ہے اور کون کہاں مرے گا۔

۳۶۵ تا ۳۶۲

خدا فی رہبروں کا صبر و استقامت

آگاہ و نا آگاہ، دوست و دشمن سب سے پہنچنے
والے رنج و غم پر صبر۔

۵۲۹

خلقتِ انسانی کے حیران کن مراحل

آدم اول کی مٹی سے خلقت، بے قدر پانی کے
ذریعہ نسل کا پھیلاؤ، رحمِ مادر میں ارتقاء آکھ
کان اور دل جیسی نعمات

۳۹۵ تا ۳۹۱

خواہشات پرستی مگر اہی کا سبب

ہوائے نفس کا عقل کی آنکھوں پر ضخیم پردہ،
ہوائے نفس انسان سے ادراکِ حقیقت
چھین لیتی ہے۔

۱۰۲

وہ لوگ حنرف ہوائے نفس کی پیروی کرتے تھے ۱۲ تا ۱۲۵

درسِ خدا شناسی کا مکمل نصاب

انسان کی مٹی سے تخلیق، اہل خانہ کی باہمی

۳۳۲ تا ۳۳۱

دل میں خدا زبان پر ثبت

کشتی میں سوار ہو کر مصیبت میں اللہ کو
پکاریں، ساحل پر آکر آمادہ کشتی! نہیں
اپنا انجام جلد معلوم ہو جائے گا۔

۲۸۲ تا ۲۷۹

دوسروں کے دلوں میں نفوذ کا طریقہ

مسائلِ علمی پر عبور، ادائے مطلب میں توازن
اور عقل و فکر کی بلندی۔

۲۵۸ تا ۲۵۴

دوسروں نے کیا پیدا کیا

زمین و آسمان، پہاڑ، پانی، نباتات کو تو اللہ نے
پیدا کیا، پھر دوسروں نے کیا پیدا کیا؟

۳۲۳ تا ۳۲۰

دو سوال اور ان کا جواب

اگر اتنی قدرت حاصل کر لو کہ آسمان میں چڑھ
جاؤ، پھر بھی احاطہ قدرت سے نہیں نکل سکتے ۲۰۵، ۲۰۶

دولت کے بارے میں اسلام کا موقف

آنحضرت کے اقوال سے بھی ثابت ہے کہ دولت مندی
حصولِ آخرت کے لیے ہوتی مستحسن ہے۔ ۱۵۲

دینِ خلیف

دینِ فطرت جس میں فطرتِ انسانی (تکوین) اور
امور شرعی (تشریح)، دونوں قوی بازوؤں کے
مانند ہیں۔ ۲۴۳

دینِ قیم اور آئینِ محکم

ایسے دین کی طرف رجوع کریں جس میں کجی نہیں ۳۷۷، ۳۷۸

رحمتِ الہی سے مایوس لوگ

زمین میں چل پھر کر دیکھو، اس نے کیا کیا
پیدا کیا۔ وہ آخرت میں بھی زندہ کرے گا۔
جو لوگ آیاتِ الہی اور اس کی نقاد سے
منکر ہوئے وہ رحمتِ خدا سے مایوس ہیں۔ ۳۰۱ تا ۳۰۲

۵

رسولِ اکرم اور مومنین کو اذیت دینے وا

اللہ اور اس کے رسول کو دکھ پہنچانے
والوں کو اللہ دنیا و آخرت میں اپنی رحمت
سے دور کر دیتا ہے اور انہیں بتلائے
عذاب کرے گا۔ مومنین کو دکھ پہنچانے
والے بہتان اور واضح گمراہی میں ہیں۔ ۲۰ تا ۲۷

رسولِ پاکؐ چراغِ فروزاں ہیں

اسے پیغمبر ہم نے تمہیں گواہ، بشیر، نذیر،
داعی الی اللہ اور روشن چراغ بنا کر بھیجا
ہے۔ مومنین کو بشارت دیکھیے کہ اللہ کے
پاس عظیم فضل و اجر ہے۔ کفار کی اطاعت و
آزار کی پردہ نہ کرو۔ اللہ پر توکل رکھو، یہ
کافی ہے کہ وہی تمہارا حامی ہے۔ ۶۷ تا ۶۷

رسولِ پاکؐ کے گھرانے کے آداب

مومنو! بغیر اجازت مت آؤ، دعوت پر بلا نہیں
تو آؤ۔ کھانا کھا کر فوراً چلے جاؤ، کچھ مانگنا ہو
تو پردہ کے پیچھے سے مانگو اور ازواجِ نبوی
سے کبھی نکاح نہ کرنا۔ ۷ تا ۷

رنگینی دنیا کا فریب

جو نعمات دنیا پر مغرور ہو کر سرکشی پر اتر آئے
ہم نے انہیں ہلاک کر دیا۔ ان کے گھر دیران
ہو گئے۔ آخر کار ہم ہی ان کے وارث ہوئے۔ ۱۱۸۰۱۱۷

زبان سے سرزد ہونے والے گناہان کبیرہ

امام غزالیؒ نے جھوٹ، غیبت، چغل خوری
مناقت و غیرہ بیس گناہ لکھے ہیں۔ ۷۲۶

زمین کی سیاحت میں حکمتیں پوشیدہ ہیں

ظالم قوموں کا عبرت ناک انجام، دوسروں کے
تجربات سے استفادہ وغیرہ۔ ۳۷۷، ۳۷۸

سختیوں میں فطرت انسانی کے جوہر کھلتے ہیں

تمہارے پاس سب نعمات اللہ کی بخشی ہوئی
ہیں۔ جب کوئی بلا نازل ہوتی ہے تو تم اسی
کو پکارتے ہو۔ ۲۸۳، ۲۸۴

سود

تم جو سود پر دیتے ہو کہ مال بڑھے تو اللہ کے
نزدیک اس میں افزائش مال نہیں ہوتی۔ ۳۶۱

شب و روز کا وجود نعمتِ عظیم ہے

محض رات ہوتی تو کسبِ معاش کیونکر ہوتا
اور دن ہی ہوتا تو پرسکون و راحت رات
کیسے تیسراتی۔ ۱۳۲، ۱۳۳

شرائطِ ظم

شرائطِ ظم پر بحث۔ کیا جناب صفورا کا
مہر زیادہ تھا۔ ۷۵، ۷۴

شکر

شکر اور کفرِ ظمِ عظیم ہیں ۲۸۶

صرف وحی الہی کی پیروی کرو

تقویٰ اختیار کرو، کفار و مشرکین کی پیروی
نہ کرو، جو وحی ہوتی ہے اس کی پیروی کرو،
اللہ پر توکل رکھو۔ ان مشرکین و منافقین
مدینہ کی سازش نہ کرو۔ آیت کا عمومی خطاب ۵۴۲ تا ۵۴۳

طبقاتی تفاوت

فرعون نے سبطیوں کو ظلام و کینز بنایا اور قبطیوں
کو کلیدی آسامیوں پر لگایا۔ عوام طبقات
میں بٹ گئے۔ ۳۲

ظالموں کے ہر گروہ کی سزا مختلف تھی

۲۹ فرعون کا بنی اسرائیل کے بیٹوں کا قتل کرنا
۹۸ یقیناً اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا
تم حق کو پس پشت ڈال دیتے ہو۔ کیا اس سے
بڑا ظلم بھی کوئی ہو سکتا ہے۔ ۱۰۱
حضرت شعیبؑ کی قوم زلزلہ، عادی و نمود برقِ خالط
لوطؑ کی قوم پتھروں کی بارش سے ہلاک ہوئی۔ ہامان و
فرعون نیل میں ڈوبے۔ قارون زمین میں غرق ہوا۔ ۲۳۶ تا ۲۳۰

ظاہر بین لوگ

توحید پرست انسان کی نظر اس دنیا کی گمراہی کو
دیکھتی ہے۔ مادہ پرست اسے بے مقصد
واقعات کا مجموعہ سمجھ کر صرف ظاہر کو دیکھتا ہے ۳۰۱

ظلم

ظلم و ضلالت کے درمیان ربط پر لطیف اشارہ ۴۲۲
شکرِ ظلمِ عظیم ہے ۴۲۳

ظہار

تم بیویوں سے ظاہر کرتے ہو تو وہ تمہاری
مائیں نہیں بن جاتیں ۵۴۹

عابدِ شب زندہ دار

جن کے پہلو رات کو بستر سے نہیں گتے، مراد
رات بھرا اللہ کی عبادت کرنے والے و تہجد گزار

عالمِ خواب کے عجائبات

کیفیاتِ خواب کی بحث میں مختلف دانشوروں
کے نظریات "نیند اب بھی پراسرار ہے"

عذابِ الہی کی طلبی

یہ عذابِ الہی کی جلدی کر رہے ہیں۔ اس کا
وقت مقرر ہو چکا ہے۔ آخر کار وہ ناگمانی
نازل ہوگا۔ عذاب آئے گا تو ان پر چھا
جائے گا اور وہ دروناک دن ہوگا۔ ۲۵۹، ۲۵۸

عظمتِ قرآن اور مبداء و معاد

قرآن کی منزل رب العالمین کی طرف سے
ہے، اس میں کوئی شک و تردید نہیں، انفراد
نہیں بلکہ حق ہے ۷۸

عظیم ترین افتخار

حضرت یوسفؑ و سلیمانؑ جیسے ذیشان اور دیگر
پیغمبروں کی صالحین سے ملحق کرنے کی خدائے آرزو

عظیم جزائیں جو پوشیدہ ہیں

صاحبانِ ایمان کے سامنے جب آیات پڑھی جائیں تو وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔ ان کے لیے ایسی جزا ہے جسے وہ خود بھی نہیں جانتے۔

۵۱۶ تا ۵۰۷

غورو فریب کی قسمیں

دنیا کے ذوقِ برق کا مشاہدہ وغیرہ

۲۶۸

غنا کی حرمت

غنا و راگ رنگ نفاق کو ایسے پروان پر چھٹانا ہے جیسے پانی سبزہ کو (حدیث) گانا شیطان کا جال ہے۔ گویا عسین و مومنین کی ضد میں گویے کی گواہی قبول نہیں۔

۲۱۶ تا ۲۱۳

غنا کی حرمت کا فلسفہ

اخلاقی تباہ کاریوں کی رغبت، شراب کا جانشین اعصاب پر مضر اثرات، یادِ الہی سے غفلت کانوں کے ذریعہ اعصاب پر ہوجانے والا اثرات

۲۱۹ تا ۲۱۷

غنا کی حقیقت

طرب انگیز آئینوں، سروں، لہو اور باطل کو غنا کہا ہے۔ وہ آواز جو قوتِ شہوانی کو ہوجانے میں لائے۔

۲۱۷، ۲۱۶

فرد و جماعت کی تربیت میں نماز کا اثر

گناہوں کو دھو دیتی ہے، آئندہ گناہوں سے روکتی ہے، غفلت، تکبر، خود بینی کو دور کرتی ہے۔ فضائلِ اخلاق اور کمالِ روحانی کی پرورش کرتی ہے۔

۲۳۲، ۲۳۱

فدائی الارض اور ہوسِ اقتدار کا نتیجہ

آخرت صرف ان کے لیے مخصوص ہے جو ہوسِ اقتدار نہیں رکھتے، فساد نہیں کرتے بلکہ ایسا ارادہ بھی نہیں رکھتے۔

۱۵۵

فضول و عوے

یرے اندر دودل ہیں (جمیل بن عمر) منافقین کی پیروی اور عجبی الہی کا اتباع کرنے سے ایسے حالات پیدا ہوتے ہیں۔

۵۵۹ تا ۵۴۷

فیضانِ خداوندی اور ناشکر انسان

تکلیف میں پکارنا، راحت میں شکر کرنا، کیا ان کے پاس شکر کی کوئی دلیل ہے؟ رحمت ہو یا زحمت، ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرو۔

۳۵۹ تا ۳۵۳

قابلِ اطمینان سہارا

اپنی نوح کو اللہ کے سپرد کر دینے والے نیک شخص نے مضبوط و محکم وسیلہ اختیار کر لیا۔

۲۳۹ تا ۲۳۶

قانونِ حجاب سے مستثنیٰ افراد

پنجمی کی ازواج پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنے باپ، اولاد، بھائیوں، بھتیجیوں، بھانجیوں، غلاموں اور مسلمان عورتوں سے بغیر حجابِ ملاقات کریں۔

۷۱۸

قدرتِ خدا کی حدود سے فرار ممکن نہیں

کیا بد کردار ہمارے قابو سے نکل جائیں گے؟ جو جہاد کرتا ہے تو اپنے ہی لیے قیامت پر یقین رکھنے والے کو اطاعت کرنا چاہیے۔

۱۸۲ تا ۱۸۰

قلوبِ با ایمان

ان کے ایمان کا جوہر صبر و ضبط اور اللہ کے دیے ہوئے رزق کو اس کی راہ میں خرچ کرنا ہے

۱۰۷

قیامت میں مجرمین پر کیا گزرے گی

جنہوں نے لقائے آخرت کی تکذیب کی وہ عذابِ الہی میں حاضر کیے جائیں گے۔

۳۱۲ تا ۳۱۱

کامیابوں میں ساتھ مشکلات میں نہیں

ایسے لوگ ہر منافق میں کمزوری ایمان بھی منافقت ہے۔

۱۸۹

کفر و فح

جو کافر ہو جائے اس کے گھر سے نکلیں نہ ہو سب کی بازگشت جانی طرف ہے۔ ہماری آیات، علامتیں، کفر کے سوا کوئی انکار نہیں کرتا۔

۵۹

کیا صاحبِ ایمان اولاد بنا رہیں؟ ہرگز نہیں، ناسقان کے لیے؟ ان کی آگ ہے۔ وہ نکلنا چاہیں گے مگر لوٹا دیے جائیں گے۔

۰۸

کیا انبیاء بھی تقیہ کرتے ہیں

تقیہ کی اقسام، اخفا سے اور آنحضرتؐ کا تقیہ حضرت ابراہیمؑ کا تقیہ

۶۵۶، ۵۵۵

کیا نکاح کی نیت سے عورت کو قبل نکاح دیکھ سکتے ہیں

چہرہ و پشت پر نگاہ کر سکتے ہیں۔ (رسول پاکؐ اور آنحضرتؐ کا تقیہ)

۴۰۷، ۴۰۶

کیا کلمہ حسنه میں ایمان و توحید شامل ہیں

اللہ کی خوشنودی ہر جہاں سے بہتر ہے ۱۵۹

گرداب بلا

کشتیاں سمندر کے سینہ پر خدا کے حکم و نعمت و برکت سے چلتی ہیں۔ جب امواج میں گھر جاتے ہیں تو ہمیں یاد کرتے ہیں۔ نجات کے بعد کچھ شکر گزار اور کچھ کافر ہو جاتے ہیں۔ ۲۶۳

گفتگو کے آداب

سکوت نکر کے آرام و راحت کا باعث ہے ۲۴۱

گناہ و فساد کا باہمی ربط

دروغ گوئی سے اعتماد اور خیانت سے تعلقات باہمی کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ قطع رجمی عمر کو کم کرتی ہے، بد عملی کا فرد اور معاشرہ دونوں پر بُرا اثر۔ ۲۴۳ تا ۲۴۶

گناہگاروں کا انجام

فرشتوں نے ابراہیم کو بیٹے کی خوشخبری دی۔ ٹوٹا کے پاس آئے تو وہ رنجیدہ ہوئے، بستی والوں کو عذاب کیا۔ بیوی کے علاوہ ٹوٹ اور اُن کے عیال کو بچایا۔ ۲۲۰ تا ۲۲۳

لاشعوری مذہب

مذہب کا انکار کرنے والے اپنے عقیدہ کو مذہب بنا لیتے ہیں جیسے لینن کی قبر کی زیارت کرنا، مارکس ولینن کو منترہ عن النطا جاننا۔ ۳۵۱

لوگوں کے اعمال کا سرچشمہ فساد ہیں

ان کے عمل باعثِ فساد ہوئے۔ زمین میں چل پھر کر دیکھو ان کا انجام کیا ہوا۔ قیامت اگر رہے گی۔ اچھے اور بُرے اعمال کا فائدہ و نقصان خود انہی کو ہے۔ اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔ ۲۴۰ تا ۲۴۴

ماضی اور حال کے قارون

داستانِ قارون، دولت کا ایک مثالی نمونہ، قرآن مجید کی سات آیات میں بیان ہوا، عملِ نمائش دولت کا جنون۔ ۱۵۰ تا ۱۵۳

مال باپ کا احترام

مال نے حمل کی تکلیف اٹھائی ۲۲۶، ۲۲۵
ان کا شکر ادا کرو ۲۲۸

ماہرینِ نفسیات کا تجزیہ نفسی

انسانی حس کے خواص و عمل جن میں حس قدسی زیادہ اہم ہے۔ ۲۵۱، ۲۵۲

مبلغین صادق

سابقہ انبیاء کو بھی دشواریاں پیش آئیں، پس اسے رسول بیہودہ رسومات کو توڑنے میں کسی کی پرواہ نہ کر۔ ۲۵۲، ۲۵۳

مٹی سے خلقتِ آدم کی کیفیت

مٹی سے بنایا جانا ثابت ہے۔ دوسری بہت سی آیات اس پر دلیل ہیں۔ ۲۹۶، ۲۹۷

مجرموں کی مدد گناہِ عظیم ہے

اسلامی فقہ میں از کتاب گناہ میں اعانت از کتاب گناہ کے برابر ہے۔ دیگر ضاعتیں ۵۸

مستضعفین

ہمارا ارادہ ہے کہ مستضعفین پر احسان کریں۔ زمین کا وارث اور اہل زمین کا پیشوا بنائیں۔ ۲۰، ۲۹
کی عالمگیر حکومت، حق باطل پر اور ایمان کفر پر غالب ہو کر رہے گا۔ ۳۶

مستضعفین اور مستکبرین کی تشریح

معاشرتی آداب

کتابہ روئی سے ملاقات کرو ۲۲

مکڑی کے جالے سے کمزور امید گاہیں

اللہ کے سوا معبود، مکڑی کے جالے سے کمزور پر انحصار۔ کاش وہ جانتے جسے وہ پکارتے ہیں، اللہ جانتا ہے۔ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو ستمی پر پیدا کیا جو اہل ایمان کے لیے نشانیاں ہیں۔ ۲۳۱ تا ۲۵۵

مکہ مقام امن

سنگلاخ و دیرانہ مقام کو جائے امن بنایا۔ تمام دنیا کی بہترین پیداوار سے یہاں رزق پہنچایا۔ ۱۲

منافقین و ضعیف الایمان احزاب میں

منافق و بیمار دل لوگ کہتے تھے کہ رسولؐ نے جھوٹے وعدوں کے سوا کچھ نہیں دیا۔ یہاں بنا کر گھر جانے کی اجازت مانگنا۔ یہ لوگ شرک کو قبول کر لیتے۔ اللہ سے جہاد کا پیمانہ کیا تھا۔ باز پرس ہوگی۔ موت سے فرار کا کوئی فائدہ نہیں۔ اللہ کے علاوہ کوئی سرپرست و یاور نہیں۔ ۵۷ تا ۸

منہ بولے بیٹے

اللہ منہ بولے بیٹوں کو تمہارے حقیقی بیٹے قرار نہیں دیتا۔
۵۴۹ تا ۵۵۱

مؤذت و رحمت

تمہارے لیے ازواج کو خلق فرمایا کہ تسکین و راحت حاصل کرو۔ مؤذت و رحمت کی بحث
۳۲۲ تا ۳۲۳

مؤمنین

ایمان والوں ان کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے موسیٰ کو تکلیف دی۔ ان کے اتہام سے اللہ نے موسیٰ کو بری کیا۔ وہ آبرو مند رہے۔ اللہ سے ڈرو اور حق بات کہو۔
۷۴۲

مؤمنین اور جنگِ احزاب

جو اللہ کی رحمت اور روز قیامت کی امید رکھتے تھے رسول پاک کی زندگی ان کے لیے اچھا نمونہ تھی۔ احزاب کو دیکھ کر کہا کہ یہ تو وہی ہے جس کا اللہ نے ہم سے وعدہ کیا ہے۔ ان کا ایمان بڑھ گیا۔ کچھ شہید ہوئے کچھ غنم شہادت ہیں۔
۵۸۷ تا ۵۹۳

سینہ ازم کے فوجی اور سیاسی اقدام
۵۹۸

نصیر بن مسعود کی داستان اور دشمن کے لشکر میں پھوٹ۔
۵۹۹ تا ۶۰۱

جنگِ احزاب کے نتائج
۶۰۲

مہمانی اور میزبانی کے آداب

خلوص، سادگی، رسول پاک اور ائمہ کے اقوال کی روشنی میں۔
۷۱۲ تا ۷۱۶

میاں بیوی کی باہمی محبت

اگرچہ زوجین کا تعلق معاہدہ باہمی پر ہے لیکن بسا اوقات رشتہ داری کے تعلق پر سبقت لے جاتا ہے۔
۳۳۳

میدانِ احزاب میں کرہمی آزمائش

عرب کی تمام مسلم دشمن طاقتیں کثیر لشکر لے کر چڑھ آئیں۔ اللہ نے بارش اور آمدھی کا طوفان بھیجا، دشمنوں کو برباد کر دیا، تمہیں فتح بخشی۔
۵۶۷ تا ۵۷۰

ندامت اور بازگشت کا تقاضا

ہم خاک ہو کر پھر کیسے زندہ ہوں گے۔ اس طرح وہ اپنے رب کی ملاقات کا انکار کرتے ہیں۔ جب وہ حاضر ہوں گے تو کہیں گے کہ ہمیں واپس پلٹا دے تاکہ عمل صالح بجالائیں
۵۹۹ تا ۶۰۴

۶

والدین کے ساتھ نیکی کرو

ماں باپ سے جذباتی تعلق انسان کے اللہ سے تعلق پر فوقیت نہیں رکھتا۔
۸۷ تا ۸۹

مخلوق کی اطاعت میں خالق کی نافرمانی روا نہیں
۸۸

وحی کی تابلیشِ اول

حضرت موسیٰ کا حضرت شعیب کی خدمت میں دس سال رہ کر تربیت حاصل کرنا۔
۷۷

ہجرت کرنا

مومنوں کو اللہ کے دباؤ میں نہ آؤ، میری زمین وسیع ہے۔ ہجرت کرو، وہاں جا کر میری عبادت کرو۔
۲۶۹ تا ۲۷۲

ہدایت

کیا ہدایت کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم نے ان سے پہلے بہت سے نافرمانوں کو ہلاک کر دیا اور یہ ان کی ویران بستیوں سے گزرتے ہیں۔ کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ہم پانی کو خشک زمینوں پر برساتے ہیں، پھر وہ اور چوپائے زمین سے اُگی ہوئی اشیاء دکھاتے ہیں۔
۵۳۱ تا ۵۳۳

نبیوں سے اللہ کا میثاق

ہم نے نبیوں سے، تم سے، نوح، ابراہیم، موسیٰ اور علیؑ سے عہد لیا۔
۵۶۰ تا ۵۶۶

نمائشِ ثروت کا جنون

قارون کی زینت دیکھ کر لوگوں نے حرص کی، صاحبانِ علم نے کہا کہ واسے ہو تم پر۔ قارون کو غرق کر دیا۔ حرص کرنے والے پشیمان ہوئے۔
۳۴۳ تا ۱۵۰

نوعِ بشر کا سب سے بڑا اعزاز

امانت سے مراد ارادہ کی آزادی، عقل و فہم، اللہ کی معرفت، ارتقائی قابلیت، عہد و ذمہ داری کو قبول کرنا۔ امیر المؤمنین کی ولایت ظلم و جبر اور انسان نسیان کا شکار ہوتا ہے۔ پس اپنی ذات پر ظلم کرتا ہے۔
۷۵۲

جو اس امانت کو اٹھانے کے قابل نہیں وہ ظلم و جبر میں۔ مراد یہ ہے کہ اللہ منافق و مشرک مردوں کو کبیر کر دار تک لے جائے گا۔
۷۵۳

نیکیو کار کون ہیں؟

متقین، مؤمنین، محسنین، گویا کمالِ انسانی کے عین مدارج پر فائز لوگ۔
۶۰۶ تا ۴۰۹

اللہ جسے چاہے ہدایت فرماتا ہے، کیفیتِ قلب کو خوب جانتا ہے۔ اس موضوع پر دیگر آیاتِ قرآن۔

ہر حال میں خدا کی یاد

آنحضرتؐ اور ائمہ کے اقوال۔ ذکر اللہ کثیراً ۶۷۳ تا ۶۷۵
نقد اللہ مومنین کی جزا بھی سے تیار ہے ۶۷۵، ۶۷۶

ہر قبیلہ کا ایک جدِ اہبت

عزیز قریش کا، لات بنی ثقیف کا، منات اوس و خزرج کا۔

ہماری کامیابی کا دن

تمہاری کامیابی و فتح کب ہوئی؟ فرما دیجیے کامیابی کے دن ایمان لانا مفید نہ ہوگا۔ اس وقت مکت نہ ملے گی، پس اسے رسول تم اللہ کی رحمت کا انتظار کرو۔ وہ اُس کے عذاب کا انتظار کریں۔ ۵۳۲

یدبر الامر

حفاظ استفادہ اور اصل مفہوم پر بحث ۳۸۶ تا ۳۸۹

مقامات

احقاق

یمن کے قریب ہے

۲۲۷

حجر

ایک بستی

۲۲۷

سدوم

قوم لوط کی بستی

۲۲۳

سلع

ایک پہاڑی جہاں جنگِ خندق واقع ہوئی

۵۹۴

طور

حضرت موسیٰؑ کو معجزات عطا ہونے کی جگہ

۹۶

مدین

شام کے جنوبِ یلیج عقبہ سے جانبِ شرق ایک مقام۔ مدین حضرت ابراہیمؑ کے ایک بیٹے کا نام بھی ہے۔

۶۹

آج کل اس کا نام معان ہے جو اردن کے جنوب مغرب میں ہے۔

۲۲۶

مکہ

تمام دنیا کی پیداوار سے یہاں بہترین رزق پہنچایا سارا عرب بدامنی میں تھا۔ ہم نے حرم کو

۲۸۵

مقام امن بنایا۔

یثرب

مدینہ کا قدیمی نام

۵۷۶

مِصْبَاحُ الْقُرْآنِ مَرْسُطٌ

ایک تعارف

قرآن آئینِ اسلام، فرد اور معاشرے کی بہترین سعادت کا حامل دستورِ الہی، مسلمانوں کا فخر اور معنی میں عظمت و صداقت کا معجزہ ہے۔ قرآن کے بغیر مسلمان اور اسلامی معاشرے کا کوئی تصور نہیں۔

قرآن کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے معلم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ پاک ہے۔ اپنے بعد امت کو نبی اسلام پر باقی رکھنے کے لیے بھی پیغمبرِ خدا نے رہنمائی فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

”انی تارك فيكم الثقلين كتاب الله وعترتي اهل بيتي ما ان تمسكتهم بهما قلن تضلوا بعدي“

ترجمہ: ”میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترتِ اہل بیت۔ اگر تم ان دونوں کے دامن سے وابستہ رہے تو میرے بعد گمراہ نہیں ہو گے۔“

اسے نیا دیکھ کر کے پیش نظر ”مِصْبَاحُ الْقُرْآنِ مَرْسُطٌ“ کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اسے فکر کے تحت ”مِرسُط“ نے اب تک جو کتب شائع کی ہیں، ان کی فہرست پیش خدمت ہے۔

(ادارہ)

